بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِقَوْمٍ یَتَفَکَّرُوْنَ (القرآن)





سہ ماہی

مجلہ

افکارِ عالیہ مئو

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ نمبر

ادارہ تحقیقات ونشریات اسلامی

جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن یوپی۔ الہند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حبیب حسن منصل حق مبارکپوری
جامعہ سلفیہ، بنارس
۲۷/۶/۲۰۱۲
بشکریہ
مولانا عبدالرحمن محمد یحیی
استاذ
جامعہ عالیہ عربیہ مئو

سہ ماہی

مجلہ افکارِ عالیہ مئو

ادارہ تحقیقات ونشریات اسلامی، جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

Quarterly Majallah *AFKAR-E-ALIA*, Mau

April 2012 to *June* - 2013

ڈاکٹر مقتدیٰ احسن ازہری رحمہ اللہ نمبر

شمارہ: ۱،۲،۳،۴،۲	اپریل ۲۰۱۲ء تا جون ۲۰۱۳ء	جلد: ۹، ۱۰

بدل اشتراک

سالانہ 100/-

غیر ممالک سے 25 ڈالر امریکی

منی آرڈر فارم پر اپنا خریداری نمبر اور پتہ صاف انگریزی میں پن کوڈ نمبر کے ساتھ لکھیں

Ph: فون:

E-Mail:
afkar_jamiaalia@yahoo.com
jamia_aliaarabia@yahoo.com

Website: www.jaamau.org

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ

منیجر مجلّہ افکار عالیہ

عالیہ نگر، مئوناتھ بھنجن

Manager
Majallah AFKAR-E-ALIA
Alia Nagar, Maunath Bhanjan
275101 (U.P.) INDIA

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا کلی اتفاق ضروری نہیں

اس دائرہ میں سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم زر تعاون ارسال کر کے تجدید کرالیں۔

پرنٹر پبلیشر مولانا مظہر احسن ازہری نے سرفراز آفسیٹ پریس سعیدی روڈ، مئو سے چھپوا کر دفتر ''مجلّہ افکار عالیہ'' عالیہ نگر، مئو سے شائع کیا۔

Printer, Publisher- Moulana Mazhar Ahsan Azhari printed at Sarfaraz offset press, Saieedi Road, Maunath Bhanjan, and published at office Majallah AFKAR-E-ALIA, Jamia Alia Arabia, Alia Nagar, Maunath Bhanjan (U.P.)

آبشار

بزم حرا

بزم صفہ

پیغامات و تاثرات

مطلع افکار

خوشۂ افکار

منظومات

عبداللطیف اثری جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

بزمِ حرا

حضرت ابراہیمؑ کی امتیازی خصوصیات

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلَّهِ حَنِيفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، شَاكِراً لِأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ، وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ، ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (النحل:۱۶/۱۲۰-۱۲۳)

ترجمہ: بے شک ابراہیم علیہ السلام لوگوں کے پیشوا (یا تمام کمالات کا مجموعہ) اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار وتابعدار اور یک طرفہ مخلص تھے اور وہ (جیسے قریش کے کافر سمجھتے ہیں) مشرک نہیں تھے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکرگزار تھے۔ اللہ نے ان کو (رسالت سے نوازنے کے لئے) چن لیا تھا اور انہیں سیدھی راہ کی رہنمائی کی تھی۔ ہم نے ان کو دنیا میں بھلائی دی تھی اور آخرت میں بھی وہ بے شک ہمارے نیک بندوں میں سے ہے۔ پھر ہم نے آپ کی جانب وحی کی کہ آپ ابراہیم کی ملت کی اتباع کریں اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کئی صفات کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ہم نے ابراہیم کو دنیا میں بھی بھلائی دی تھی اور آخرت میں بھی ان کا شمار اللہ کے صالح بندوں میں ہے، پھر جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ اگرچہ آپ امام المرسلین ہیں اور آپ کی پوری زندگی دنیائے انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ ہے، پھر بھی آپ ملت ابراہیمی کی اتباع کیجئے۔

قرآن کریم میں صراحۃً صرف دو پیغمبروں کی زندگی کو اسوہ بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور دوسرے حضرت ابراہیمؑ ہیں۔

یہاں ایک سوال ذہن میں آتا ہے کہ آپ ﷺ تو خاتم النبیین ہیں۔ رسول الانس والجن ہیں، امام المرسلین ہیں۔ سید ولد آدم ہیں۔ اس لئے آپ کی زندگی کو اسوہ بنانے کا حکم ہوا لیکن حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کو اسوہ بنانے کا حکم کیوں ملا۔ اور آپ کو امام وپیشوا کیوں بنایا گیا۔ اس کا جواب سورہ بقرہ آیت ۱۲۴ میں یوں دیا گیا ہے۔ وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً۔ ابراہیمؑ اپنے رب کی تمام امتحانات میں کامیاب وکامراں ہوئے اس لئے ان کو اس مقام ومرتبہ سے نوازا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امتحان کے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا قرآن میں کئی مقامات پر اس کا ذکر ہے۔ آپ کی پوری زندگی آزمائش ہی سے عبارت تھی۔ ہر محبوب چیز کو حق کی خاطر آپ نے قربان کیا ہے اور ہر وہ مصیبت وپریشانی جس سے آدمی بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے یہ پریشانی راہ حق میں آپ نے برداشت کی ہے۔ اس لئے آپ کو لوگوں کا امام وپیشوا بنایا گیا ہے اور آپ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ ان آیات میں آپ کی جن صفات کا ذکر ہوا ہے وہ یہ ہیں۔ آپ اکیلے ایک امت تھے۔ یعنی جب دنیا میں کوئی مسلمان نہ تھا آپ اکیلے اسلام کے علمبردار تھے۔ امام وپیشوا تھے۔ فرمانبردار وقانت تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے شکرگزار تھے۔ مجتبیٰ تھے۔ صراط مستقیم کے راہی تھے۔ دنیا میں عزت وآبرو مال واولاد اور دیگر بھلائی پانے والے تھے۔ صالح تھے۔ مشرکین میں سے نہ تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی ونصرانی بھی نہیں تھے جیسا کہ یہود ونصاریٰ سمجھتے تھے قرآن نے صاف اعلان کردیا ہے مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِياً وَلَا نَصْرَانِياً وَلَكِن كَانَ حَنِيفاً مُسْلِماً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آل عمران:۶۷) اور رسول اللہ ﷺ کو ابراہیمی طریقہ اختیار کرنے کا صاف حکم قرآن میں موجود ہے: وَقَالُواْ كُونُواْ هُوداً أَوْ نَصَارَى تَهْتَدُواْ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفاً وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (البقرۃ:۲/۱۳۵) یہودی کہتے ہیں یہودی بنو تو راہ راست پاؤ گے عیسائی کہتے ہیں عیسائی بنو تو ہدایت پاؤ گے ان سے کہو نہیں بلکہ سب کو چھوڑ کر ابراہیم کا طریقہ اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھے۔ درود شریف میں محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی ذکر حضرت ابراہیم کی وہ امتیازی خصوصیت، جس میں کوئی بھی آپ کا شریک نہیں ہے۔ سورہ ہود میں حضرت ابراہیمؑ کو حلیم، اواہ اور منیب بھی بتایا گیا ہے۔

ان آیات کا مقتضا یہ ہے کہ اپنے اندر حضرت ابراہیمؑ کی صفات کو پیدا کیا جائے۔ اور ان صفات کی توفیق بخشی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کیا جائے۔

☆☆☆

مولانا مظہر احسن ازہری
جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

شہداء اللہ فی الارض

قال عبدالعزیز بن صهیب سمعت انس بن مالك رضی الله عنه یقول مروا بجنازة فاثنوا علیها خیرا فقال النبی ﷺ وجبت ثم مروا باخری فاثنوا علیها شرا فقال وجبت فقال عمر بن الخطاب رضی الله عنه ما وجبت قال: هذا اثنیتم علیه خیرا فوجبت له الجنة وهذا اثنیتم علیه شرا فوجبت له النار انتم شهداء الله فی الارض (صحیح البخاری ج۱ ص ۱۸۲ کتاب الجنائز باب ثناء الناس علی المیت)

ترجمہ: عبدالعزیز بن صہیب کہتے ہیں میں نے حضرت انس بن مالک سے سنا ہے وہ کہہ رہے تھے کہ صحابہ کے پاس سے ایک جنازہ گزرا لوگ اس کی تعریف کرنے لگے اور اس کی خوبیاں بیان کرنے لگے کہ (کیا ہی اچھا یہ آدمی تھا) آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا واجب ہوگئی۔ پھر دوسرے جنازہ کا گزر ہوا تو لوگ اس کی مذمت کرنے لگے اور اس کی برائی بیان کرنے لگے (کہ کتنا خراب آدمی تھا) آپ ﷺ نے پھر فرمایا واجب ہوگئی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا چیز واجب ہوگئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا جس میت کی تم لوگوں نے تعریف کی ہے اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور جس میت کی تم نے مذمت کی ہے اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔

اسی مفہوم کی ایک اور حدیث بخاری شریف ہی میں ہے اس میں ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس سے یکے بعد دیگرے تین جنازے گزرے ان میں سے دو کی تعریف کی گئی اور ایک کی مذمت کی گئی حضرت عمرؓ ہر بار وجبت کہتے رہے۔ ابوالاسود نے جب ان سے کہا ما وجبت یا امیر المومنین تو کہا کہ میں نے اس وقت وہی کہا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس مسلمان کی اچھائی پر چار شخص گواہی دے دیں اللہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔ ہم نے کہا اور اگر تین آدمی گواہی دیں آپ نے فرمایا تین پر بھی، پھر ہم نے پوچھا اگر دو مسلمان گواہی دیں آپ نے فرمایا کہ دو پر بھی۔ پھر ہم نے یہ نہیں پوچھا کہ اگر ایک آدمی گواہی دے تو۔

مستدرک حاکم میں نضر بن انس عن ابیہ کی روایت میں یہ ہے کہ میں حضور ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک جنازہ وہاں سے گزرا۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کس کا جنازہ ہے لوگوں نے کہا کان یحب الله ورسوله ویعمل بطاعة الله ویسعی فیها۔ هذه جنازة فلاں بن فلاں یہ فلاں بن فلاں کا جنازہ ہے جو اللہ اور رسول سے محبت رکھتا تھا اللہ کی اطاعت میں کام کرتا اور اس میں کوشاں رہتا تھا۔

مستدرک حاکم ہی میں حدیث جابر میں یوں ہے کہ بعض لوگوں نے کہا نعم المرأ لقد کان عفیفا مسلما یہ شخص بہت اچھا تھا پاک دامن مسلمان تھا اور دوسرے جنازے کے لئے کہا گیا بئس المرء کان ان کان لفظا غلیظا یہ آدمی برا تھا۔ بداخلاق اور سخت کلامی کرنے والا تھا۔

مذکورہ احادیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اس دنیا سے کوچ کرنے والوں کے حسنات کو بیان کیا جائے اور ان کی لغزشوں سے صرف نظر کیا جائے۔ انسان خطاونسیان کا پتلا ہے غلطیاں ہوتی رہتی ہیں اب جب کہ وہ دنیا سے چلا گیا ہے تو اس کا اچھے انداز میں ذکر کیا جائے، اس کی خوبیوں کو، طاعت کے کاموں کا تذکرہ کیا جائے اور جو چوک ہوئی ہو اسے اللہ کے حوالے کردیا جائے۔ اللہ غفور رحیم ہے امید ہے کہ اسے اپنے دامن عفو وکرم میں جگہ دے گا۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ نیک وصالح مسلمان کی شہادت کا بڑا وزن اور اعتبار ہے اور اس کے مطابق جزا وسزا مرتب ہوتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے ثناء الناس علی المیت باب مقرر کر کے جہاں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ایک مسلمان کی گواہی کا کیا وزن وویلو ہے۔ امت محمد یہ کے لوگوں کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ زمین پر اللہ کے گواہ ہیں۔

میت کی خوبی وتعریف کرتے ہوئے اس بات کا البتہ دھیان رہے کہ کہیں اس کی جھوٹی تعریف نہ ہو یا اس کی تعریف میں مبالغہ نہ ہو یا ایسی تعریف نہ ہو جس سے دوسرے کی تنقیص وحق تلفی کا پہلو نکلتا ہو۔ اسی طرح اس کے صرف انہی کارناموں کا تذکرہ کیا جائے جو حقیقت میں اس نے انجام دیا ہو۔ دوسرے کے کام کو اس کا کام بتا کر اس کی خوبی بیان کرنا نہ میت کے لئے مفید ہوگا اور نہ بیان کرنے والے ہی کے لئے فائدہ مند ہوگا بلکہ الٹا اسے نقصان ہوگا۔ میت کے سلسلے میں صرف یہی نہیں ہے کہ اس کی خوبیوں کی تعریف کی جائے بلکہ اس کی جانب سے کئے گئے عہد و پیمان کو پورا کیا جائے۔ اس کے دوستوں کی عزت کی جائے۔ اس کے لئے دعائے خیر کی جائے۔ اور اس کے ذمہ اگر قرض ہے تو اس کی ادائیگی کی صورت پیدا کی جائے۔

☆☆☆

ABDUL RAHMAN
UBAIDULLAH AL-RAHMANI
Rani Pura. Mubarakpur
Distt: Azamgarh 276404
U.P. INDIA Mob: 9935740760

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عبدالرحمٰن عبیداللہ الرحمانی
رانی پورہ۔مبارکپور،اعظم گڈھ۔یو،پی۔الہند
الجوال:۹۹۳۵۷۴۰۷۶۰

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری رحمہ اللہ تعالیٰ سے تعارف وتعلق جامعہ رحمانیہ بنارس میں راقم کے عہد طالب علمی سے شروع ہوااور اس کے بعد اس تعلق کی نوعیت مختلف الجہات رہی۔ سفر،حضر میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ موصوف نے تدریس کے ساتھ،تالیف وترجمہ کا کام بھی بلا کسی تضییع وقت کے تسلسل کے ساتھ جاری رکھا،ممبئی کے ایک سفر میں ناچیز نے مشاہدہ کیا کہ ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کی سیرۃ سے متعلق کتاب کا ترجمہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی یہ بات کہ ۴۰ سال کی عمر کے بعد انسان کی قوت عمل کمزور ہونے لگتی ہے،اس مرحلہ کو پہنچنے سے پہلے انسان اپنی پوری قوت ونشاط کے ساتھ خود سے متعلق کام انجام دے سکتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کمزوری آتی جاتی ہے۔ انھوں نے اس نکتہ کو سامنے رکھ کر اپنے وقت کا بھرپور اور صحیح استعمال کیا۔ علم سے تعلق رکھنے والے اس راہ پر مستقل مزاجی سے گامزن ہوکر دنیاوی شہرت وعزت اور اخروی کامیابی سے ہمکنار ہوسکتے ہیں۔ وفقنا اللّٰه جميعا

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ سہ ماہی مجلّہ افکار عالیہ کے ذمہ داران ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے حالات زندگی بالخصوص علمی کاوشوں سے متعلق خاص نمبر شائع کرنے جارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو حسن قبول عطا فرمائے اور ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا صحیح انداز میں تعارف ہوسکے۔ واللہ الموفق

عبدالرحمٰن عبیداللہ رحمانی

۲۰۱۲/۷/۱۵ء

AL-JAMIA-TUS-SALAFIAH
(Markazi Darul-Uloom)
VARANASI-INDIA

الجامعۃ السلفیۃ
(مرکزی دار العلوم)
بنارس-الهند

تاریخ: ۲۶؍۱۰؍۱۴۳۳ھ
۱۲؍۹؍۲۰۱۲ء

ڈاکٹر [illegible] حسن ازہری رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ ایسی نابغۂ روزگار شخصیات میں سے تھے جو ایک عالَم کو فائدہ پہنچاتی ہیں، آپ ہند و بیرون ہند کے جامعات اور یونیورسٹیوں سے اخذ واستفادہ کے بعد ہندستان کی عظیم مرکزی درسگاہ جامعہ سلفیہ بنارس کے لیے اس طرح وقف ہو گئے کہ جامعہ سلفیہ اور آپ لازم وملزوم کی شکل اختیار کر گئے۔

راقم کو اس عبقری شخصیت سے تلمذ کی سعادت حاصل ہے۔ ۴۰-۴۲ رسال کا عرصہ جو آپ نے بنارس میں گزارا اس عرصہ میں مختلف حیثیتوں میں آپ کی رفاقت کا شرف ملا، آپ کی شفقتیں اور ہدایتیں ہمیشہ میرے لیے مشعل راہ بنیں۔

آپ صرف جامعہ سلفیہ یا جماعت اہل حدیث ہند ہی کی امیدوں کا مرکز نہ تھے بلکہ ملک اور بیرون ملک میں آپ ایک شناخت رکھتے تھے، آپ نے اپنے قلم، اپنی فکر اور اپنے تجربے سے قوم وملت اور امت کو جو فائدہ پہنچایا دنیا اس کی معترف ہے اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

افسوس کہ یہ عظیم شخصیت جس سے ملک وملت کو کافی توقعات وابستہ تھیں آناً فاناً سب کو الوداع کہہ گئی، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ کی بساط سونی پڑ گئی، جامعہ سلفیہ اپنے مربی ومحسن سے محروم ہو گیا، اور ذمہ داران کے سامنے یاس وقنوط کے بادل چھا گئے۔

البتہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیچھے شاگردوں کی شکل میں اور تحریروں کی صورت میں جو عظیم سرمایہ چھوڑا ہے اس سے بڑی حد تک ہماری اشک شوئی ہوتی ہے۔ مجلہ افکار عالیہ نے ڈاکٹر صاحب کی حیات وخدمات پر جس خصوصی شمارے کی اشاعت کا پروگرام بنایا ہے وہ بھی آپ کی خدمات کے اعتراف کا بہترین مظہر ہے۔

میری دعا ہے کہ یہ خصوصی شمارہ خوب سے خوب تر ہو، اور ڈاکٹر صاحب موصوف کی علمی وعملی زندگی کے مختلف گوشے سامنے آئیں تاکہ موجودہ اور آئندہ نسلیں نصیحت اور رہنمائی حاصل کریں، ان کے عزائم میں توانائی اور حوصلوں میں بلندی آئے، اور آپ کے علمی ودعوتی مشن کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بنیں۔

ووفقنا الله لما يحبه ويرضاه.

۲۶/۱۰/۱۴۳۳ھ
۱۲/۹/۲۰۱۲ء

شاہد جنید محمد فاروق
صدر جامعہ سلفیہ، بنارس

بی-۱۸/۱-جی، جامعہ سلفیہ مارگ، ریوری تالاب، بنارس ۲۲۱۰۱۰ (الهند) تلیفون: ۲٤٥٢٢٤٢، ٢٤٥٢٢٤١، ٢٤٥١٤٩٢-٥٤٢-٩١+ فاکس: ٢٤٥٢٢٤٣-٥٤٢-٩١+
B.18/1-G, JAMIAH SALAFIAH MARG, REORI TALAB, VARANASI-221 010. (U.P.) INDIA. TEL. +91-542-2451492, 2452241, 2452242
FAX: +91-542-2452243. GRAM: "DARUL-ULOOM" VARANASI. e-mail: sceretary@jsvaranasi.com Web: www.jsvaranasi.com

ABDUL HANNAN M. ZAMAN FAIZI
Jamia Serajul Uloom Al-Salafia
Jhanda Nagar, P.O. Krishna Nagar
Distt. Kapil Vastu - Nepal
Ph./Fax (00977-76) 20128



عبد الحنان محمد زمان الفیضی
جامعة سراج العلوم السلفية بجهنڈانغر
کرشنانغر، کپل وستو، نیبال

Dated ....

التاریخ ۲۰ ستمبر ۲۰۱۲ء

رفیق گرامی مکرمی ومحترمی جناب شیخ مظہر احسن ازہری حفظہ اللہ وتولاہ
ناظم جامعہ عالیہ عربیہ، مئوناتھ بھنجن

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج گرامی؟

اللہ کرے آنجناب بخیر وعافیت ہوں، الحمد للہ میں بھی جس حال میں ہوں خیریت سے ہوں۔

عزیزم مولوی عبد المنان سلفی رسلمہ اللہ کے پاس عزیز گرامی مولانا حافظ عبد اللطیف اثری صاحب، مدیر مجلہ ''افکار عالیہ'' کے آئے فون سے یہ خوش خبری ملی کہ آپ ذمہ داران جامعہ عالیہ رفیق گرامی عالیجناب ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کی حیات وخدمات پر ''افکار عالیہ'' کا خصوصی نمبر شائع کرنا چاہتے ہیں، آپ حضرات کے اس عزم وحوصلہ سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ آپ لوگ محترم ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمات کو اجاگر کرنے کا ارادہ رکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

حقیقت ہے کہ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کی شخصیت بڑی پہلودار ہے، میں انھیں زمانہ طالب علمی سے بہت قریب سے جانتا ہوں، وہ مدرسہ فیض عام مئو میں میرے ہم عصر تھے، میں ان سے دو ایک سال آگے تھا، پھر جب ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۶ء تک مجھے جامعہ سلفیہ، بنارس میں تدریسی خدمت کا موقعہ ملا تو اس مدت میں بھی مجھے ان کی رفاقت نصیب ہوئی اور بعض مواقع پر انھوں نے میری بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی۔ فجزاہ اللہ خیرا۔

ڈاکٹر صاحب کی جو خاص خوبی میں نے محسوس کی وہ ان کی محنت ومشقت، جد وجہد اور وقت کا انضباط واستغلال تھا، وہ کبھی بھی بیکار نہیں رہتے تھے، ہمہ وقت لکھنا پڑھنا ان کا مشغلہ ہوتا تھا، آج کے علماء وطلبہ کے لئے ان کی زندگی کے اس پہلو میں بہت عبرت اور سبق موجود ہے۔

ضرورت ہے ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کی حیات وخدمات کے گوشوں کو وسیع پیمانہ پر عام کیا جائے، اس سلسلہ میں آپ حضرات کی کاوش قابل قدر ہے، میں اس پر آپ کو اور جامعہ کے جملہ ذمہ داران اور مجلہ کے ایڈیٹر صاحبان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ حضرات کی اس کاوش سے متاثر ہو کر مئو کے دیگر مدارس نیز جامعہ سلفیہ بنارس کے ذمہ داران کو بھی اس جانب توجہ کا موقعہ ملے گا۔

میری صحت دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے، پیرانہ سالی کے عوارض سے پریشان رہتا ہوں، اللہ تعالیٰ سے میری صحت وعافیت کے لئے دعا فرماتے رہیں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محتاج دعا
عبد الحنان
عبد الحنان فیضی

أنيس الرحمن أعظمي العمري المدني

سابقا

١)الأمين العام لجمعية أهل الحديث لعموم الهند

٢)أمير جمعية أهل الحديث لولاية تاملنادو

٣)نائب رئيس الجامعة المحمدية منصورة

٤)نائب شيخ الجامعة السلفية (بنارس)

حاليا

مدرس في كلية "برستون العصرية والاسلامية

خطيب مسجد أهل الحديث جارمينار(مدراس)

تاریخ:

محترم جناب ناظم صاحب حفظہ اللہ

جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ خیریت مزاج گرامی؟

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔یاد فرمائی کا شکریہ معلوم ہوا کہ جامعہ عالیہ عربیہ کے ترجمان ''افکار عالیہ'' کا خصوصی شمارہ شائع کرنے والے ہیں جو برادر محترم ڈاکٹر حافظ مقتدی حسنؒ کی حیات وخدمات کے تعارف پر مشتمل ہوگا۔جزاکم اللہ۔یقیناً ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے بہت سے گوشے ہیں جو خاصے لوگوں کو نہیں معلوم ہیں ان کے شاگرد اوران کے متعلقین کے مضامین سے یہ گوشے سامنے آئیں گے اور لوگ پڑھ کر ان کی شخصیت سے واقف ہوں گے اوران کو اپنانے کی کوشش کریں گے آپ حضرات کی خدمات میں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف میں خصوصی شمارہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔

میں قیام بنارس کے دوران ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بہت قریب رہ کر ایک عرصہ گزارا ہوں جماعت اور جامعہ سلفیہ کے ساتھ ان کا تعلق بہت گہرا تھا،شب وروز انہوں نے جماعت اور جامعہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔جماعت اور جامعہ کے لئے ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ان کا دور میری معلومات کی حد تک جامعہ کا سنہرا دور تھا۔ملک اور بیرون ملک انہوں نے جماعت وجامعہ کو بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ان کے شاگرد۔ان کی خدمات کے ہمیشہ معترف رہیں گے۔صوت الجامعہ اور محدث کے ذریعہ اپنے وقیع مضامین سے جماعت وجامعہ کے وقار کو بہت اونچا کیا۔ڈاکٹر صاحب ہمہ گیر شخصیت تھے اپنے دور میں انہوں نے جامعہ میں کئی یادگار کانفرنس کرائیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے جیسے دسیوں کو بنانے کی کوشش کرتے تھے،اپنے شاگردوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے تھے،ان کی تصنیفات پر مقدمہ لکھ کر ان کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار کرتے۔اپنے شاگردوں کی دلداری بھی ان کو عزیز تھی۔ کبھی کسی شاگرد کی تقریب عقد میں شرکت کے لئے گھر کے سارے لوگوں کے ساتھ نیپال کا دشوار گزار سفر کیا،کبھی کسی عزیز شاگرد کی خواہش پر محراب سنانے کے لئے پورا رمضان گھر سے باہر گزار دیا۔

ہماری طرح محترم ڈاکٹر صاحب کو بھی دن رات کے چوبیس ہی گھنٹے ملے تھے لیکن انہوں نے نظم کی کچھ ایسی پابندی کی تھی کہ ان گھنٹوں میں وہ اتنے کام کر ڈالتے تھے جو ہم جیسوں سے دو گنے وقت میں بھی نہیں ہو پاتے ۔صحت ہو کہ بیماری کبھی گھر میں رہ کر نہیں گزارا۔عرق النسا کے شدید درد میں بھی دیوار کا سہارا لے کر لنگڑتے ہوئے دفتر پہنچتے،درسگاہ پہنچتے،اور اپنی ذمہ داری کو پوری کرتے۔ایسی جامع کمالات شخصیت کا لوگوں میں تعارف ہونا چاہئے ان کی حیات وخدمات پر لکھنا چاہئے،ان کے درجنوں شاگرد ایسے ہیں کہ ان کی خدمات کے تعارف پر ایک ایک کتاب تصنیف کر سکتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے تکرار ہو جائے اس لئے سب کے مضامین جمع کر کے ایک کتاب یا رسالہ شائع کرنا زیادہ مفید ہوگا۔

برادر گرامی قدر ڈاکٹر صاحب کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پر ہونے والا نہیں ہے۔محترم ڈاکٹر صاحب کی خدمات کی صرف فہرست تیار کرنے کے لئے کئی صفحے درکار ہیں خدمات کی تفصیل ذکر کرنے کے لئے کئی کتابوں کی ضرورت ہے۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه واكرم نزله جزاه الله عنا خير الجزاء.

انیس الرحمن اعظمی

انیس الرحمٰن اعظمی عمری مدنی

اداریہ

مطلعِ افکار

مفکر جماعت ڈاکٹر حافظ مولانا مقتدیٰ حسن ازہریؒ کی تعلیمی، ادارتی، تدریسی، صحافتی، تنظیمی، تصنیفی، تحقیقی، دعوتی، جماعتی، ملی، سماجی، رفاہی، دینی، علمی وادبی خدمات اور حالات زندگی پر مشتمل ''افکار عالیہ'' کا یہ شمارہ حاضر خدمت ہے، ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ شمارہ انتہائی تاخیر سے منظر عام پر آرہا ہے لیکن ع

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد ہی ذمہ داران جامعہ نے نمبر شائع کرنے اور آپ کی خدمات کا تعارف کرانے کا منصوبہ بنایا تھا اور اس پر پیش رفت بھی ہوئی تھی، لیکن جب بعض ان حضرات سے رابطہ ہوا جو ان کے بالکل قریبی مانے جاتے ہیں تو انھوں نے ہمت افزائی کے بجائے سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ مجھے ان کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور اگر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ان کے روابط کا سچا تذکرہ کردیا جائے تو شاید وہ خود تعجب میں پڑ جائیں گے۔ علاوہ ازیں اس بارے میں ہمیں یہ سمجھ کر بھی نظر انداز کیا گیا کہ یہ کام تو جامعہ سلفیہ کا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جامعہ سلفیہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی جو قلبی وابستگی تھی اس کے پیش نظر اب بھی سب کی نگاہیں اس کی جانب مرکوز ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے رفیق خاص ڈاکٹر عبدالعلی ازہری صاحب بھی اتنے پرامید تھے کہ مجھے پوری کوشش کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے متعلق اپنی کوئی تحریر برائے اشاعت دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ جامعہ سلفیہ نے اس سلسلے میں پیش رفت کی بھی تھی۔ متعلقین کو خطوط بھی لکھے تھے کچھ احباب نے مضامین بھی ارسال کئے۔ بعض خطوط کو تو میں نے خود علی گڈھ میں متعلقہ افراد کو پہنچایا ہے لیکن پھر کیوں دیر ہے، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

جب چند ایک کو چھوڑ کر کسی نے بھی مجھے لائق اعتناء نہ سمجھا تو میرے ارادے میں بھی تزلزل آگیا اور اپنی کمزوری وکم مائیگی پر افسوس کرتے ہوئے دوسرے کاموں میں لگ گیا۔

ایک دن مجھے ڈاکٹر عبدالعلی ازہری حفظہ اللہ کا پیغام ملا کہ مجھ سے کسی خاص مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی علمی وقابل فخر شخصیت کے پیش نظر میں اسی دن ان کے در دولت پر حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے جامعہ سلفیہ سے محدث کے ''ازہری نمبر'' کے بارے میں اپنی تگ ودو پیش کش کی روداد درد بھرے انداز میں سنائی اور پھر مجھ سے کہا کہ آپ حضرات چونکہ ''افکار عالیہ'' کا ازہری نمبر شائع کرنا

چاہتے تھے اس لئے کمر بستہ ہوجائیں اور میں آپ لوگوں کے ساتھ مکمل تعاون کروں گا۔ ناظم اعلیٰ صاحب سے بھی بات ہوچکی ہے وہ آپ کو اس سلسلے میں خصوصی ہدایات دیں گے۔ ''افکار عالیہ'' کے سلسلے میں کوئی بھی میرا نہ معاون ومددگار ہے نہ شریک کار ومشیر اور نہ ہی میرا کوئی اعتبار ووزن ہے اس لئے نمبر مرتب کرنے کی ہمت میں اپنے اندر نہیں پارہا تھا لیکن ایک بڑے محقق وعالم، عربی وانگریزی کے اسکالر کے منہ سے یہ سن کر کہ وہ مجھ پر اعتماد کررہے ہیں مجھے کافی مسرت ہوئی اور میں دوبارہ اس کام میں لگ گیا۔ اور ہندوستان ونیپال سے لے کر کویت۔ قطر۔ سعودی عرب۔ عرب امارات۔ نیوزی لینڈ وغیرہ جہاں جہاں بھی ڈاکٹر صاحب کے مشہور ومعروف تلامذہ تھے اور اب وہ عالم اسلام کی معروف ومعتبر شخصیتیں ہیں، سے رابطہ قائم کیا اور پھر جو کچھ حاصل کرسکا وہ آپ کے سامنے ہے۔

اس ضمن میں ناظم اعلیٰ جامعہ عالیہ عربیہ جناب مولانا مظہر احسن صاحب برابر میرا تعاون کرتے رہے اور مشورہ دیتے رہے اس راہ کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتے رہے اور اہل قلم سے رابطہ کرتے رہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء

یہ بات ملحوظ رہے کہ اس شمارے میں صرف انہیں حضرات کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو ڈاکٹر صاحبؒ کے قریبی رشتہ دار ہیں یا ان کے ایسے تلامذہ ہیں جنھوں نے آپ کے زیر اشراف کام کیا ہے اور آپ کی علمی وصحافتی مشغولیات کو بالکل قریب سے دیکھا ہے۔

آپ کے حالات زندگی اور علمی کاوشوں وخدمات کے سلسلے میں تکرار سے بچنے کی پوری کوشش کی گئی ہے لیکن اگر کہیں تکرار نظر آئے تو وہاں اس کے ضمن میں کچھ مفید چیزوں کا اضافہ یا کسی شبہے وغلط فہمی یا خلاف حقیقت بات کی تردید ہے۔ جس سے وہ تکرار کے حکم میں نہیں ہے۔ اسی طرح آپ کی علمی خدمات وکاوشوں کے بیان میں بظاہر تکرار نظر آئے تو اسی مصلحت کو پیش نظر رکھا جائے۔

خصوصی نمبر میں عام طور پر متعلقہ شخصیت ہی کے حالات بیان کئے جاتے ہیں لیکن اس میں ایک مضمون ڈاکٹر صاحب کے والدین کے متعلق بھی ہے جن کے حقیقی محنت کا ممدوح ثمرہ تھے۔

اس نمبر میں آپ کی زندگی وعلمی کارناموں کے تقریباً تمام گوشے مختصر انداز میں آگئے ہیں پھر بھی یہ نمبر آپ کے علمی کمالات کا ایک ہلکا سا عکس ہے۔ آپ نے مستقبل میں کام کرنے کا ایک خاکہ تیار کیا تھا ضرورت ہے کہ اس خاکہ میں رنگ بھرا جائے۔ جس رجسٹر پر آپ نے اس کی تفصیل درج کی تھی اس رجسٹر کا تو پتہ نہیں، جس پر افسوس اس بنا پر نہیں ہے کہ اس میں کیا تھا کیونکہ اس نمبر کے بغور مطالعہ سے آپ کو ساری باتیں معلوم ہوجائیں گی لیکن حیرت اس پر ضرور ہے کہ دوسری جماعتوں سے منسلک حضرات اپنی محبوب شخصیتوں کے علمی کمالات کو اجاگر کرتے ہیں اور اس میں مبالغہ آرائی سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ہم علمی کمالات کے اعتراف میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ آپ کے حالات زندگی پر لکھے ہوئے بعض مضامین کی حصول یابی ہی ممکن نہ ہوسکی جب کہ مضمون

نگار کی کوشش بھی اس سلسلے میں رائگاں ہوگئی۔فیا للاسف

ڈاکٹر صاحب نے شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ کے ترجمہ وتلخیص واشاعت کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا۔تلخیص میں شامل کرنے والے حصہ پرنشان بھی لگا لیا تھالیکن اس کے بعد کام کس حد تک آگے بڑھا تھا اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔وابستگان چمن ازہری کا یہ فرض بنتا ہے اوران سے سچی عقیدت کا تقاضا بھی یہ ہے کہ کم ازکم اس کام کومکمل کرلیا جائے۔ڈاکٹر صاحب سب کے تھے سب کے ساتھ تعاون کرنا اورسب کی ہمت افزائی کرنا ان کی ایک مخصوص صفت تھی لیکن اب ان کا کون ہے۔یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

یہ نمبر دراصل ڈاکٹر عبدالعلی ازہری ومولانا مظہر احسن ازہری کی پرخلوص تعاون،اخلاص اورتشجیع کا مظہر ہے ڈاکٹر صاحب اور مولانا ازہری صاحب روزانہ اس کے پیش رفت کی رپورٹ لیتے رہے اور جلد از جلد اس کی اشاعت پرزوردیتے رہےاس لئے ان کاقلبی شکریہ ادا کرنا میرا فرض منصبی ہے۔ علاوہ ازیں جامعہ کے دیگر ذمہ داران واراکین مجلس منتظمہ کاشکریہ کہ انھوں نے وسائل کا انتظام کیا۔ساتھ ہی ساتھ جملہ اہل قلم ومضمون نگار حضرات وشعراء کا بھی شکریہ جن کےتعاون کے بغیرنمبر کی اشاعت ممکن ہی نہ تھی۔

جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ساتھ ڈاکٹر صاحبؒ کا جوتعلق تھااس کی ادنیٰ جھلک اس شمارے میں آپ کوضرور ملے گی۔جمعیۃ کے بعض موجودہ وسابق ذمہ داران کے تاثرات بھی شمارہ کی زینت ہیں لیکن افسوس کہ آپ سے منسوب ادارہ جس کے لئے آپ نے اپنا سب کچھ قربان کردیا ہے اور ڈاکٹر صاحب اور وہ ادارہ لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور دونوں کوایک دوسرے سے کوئی جدا نہیں سمجھتا،کی شمولیت برائے نام ہے۔اللہ کرے کہ وہ ادارہ کوئی جامع ووقیع نمبر ترتیب دے کر ازہری شناسی و قدردانی کا حق ادا کرسکےاس طرح ان کی خدمات کا کماحقہ تعارف ہوسکے۔

اس نمبر کی تیاری میں اوربھی دیگر علمی شخصیات سے رابطہ ہوا تھا لیکن افسوس کہ کسی بنا پر بار بار کے وعدہ ویقین دہانی کے باوجود ان کے رشحات قلم ہمیں موصول نہ ہوسکے جب کہ ہم نے اخیر تک اپنی کوشش جاری رکھی،اگر ان کے مضامین بھی شامل اشاعت ہوجاتے تو یہ نمبر اور بھی وقیع ہوجاتا۔اس نمبر میں ڈاکٹر صاحب کے بعض خطوط بھی شامل کئے گئے ہیں۔زیادہ تر خطوط پروفیسر مختار الدین آرزو کے نام لکھے گئے ہیں اور ہمیں یہی خطوط دستیاب بھی ہوسکے۔ پروفیسر آرزو کے پاس ڈاکٹر صاحب کے سوسے زیادہ خطوط تھے جن کوحسب ضرورت دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن افسوس کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہے اور ازہری نمبر جس کے دیکھنے کے وہ بے حد مشتاق تھے اسے نہ دیکھ سکے۔

اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے حسنات کوقبول فرمائے اور ان کے علمی خدمات کوان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے۔آمین

(عبداللطیف اثری)

ڈاکٹر حافظ عبدالعلی ازہری
مسلم کالج لندن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وبہ نستعین

دو سال سے اوپر کا عرصہ گزر گیا جب کہ ہمارے محترم دوست، جماعت اہل حدیث کی آبرو اور جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم کے صدر اور استاذ ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری ہم سے جدا ہوکر اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ إنا للہ وإنا الیہ راجعون اللّٰھم اغفر له، وارفع درجته فی المھدیین واخلفه فی عقبه فی الغابرین، واغفر لنا وله یا رب العالمین، وافسح له فی قبره، ونور له فیه۔ آمین

اس مخلص اور وفا شعار عالم دین اور مفکر اسلام کے ساتھ ان کے انتقال کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہندوستان کے علماء اور خاص طور پر جماعت اہل حدیث کے مخلصین کی ناقدری اور جمعیۃ اور جماعت کے ذمہ داروں کی احسان فراموشی اور ناشکری کی زندہ مثال ہے۔ مرحوم نے اپنی زندگی کے چالیس سال جماعت کی خدمت میں گزارے، انھوں نے جامعہ ازہر سے ایم۔ اے کرنے کے بعد ہندوستان واپس ہونے کا فیصلہ کیا اور یہاں پہنچنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد بنارس میں مرکزی دارالعلوم سے منسلک ہو گئے۔ یہ دارالعلوم اس وقت ابھی ''مرکزی'' تھا۔ پورے ملک کے سربرآوردہ علماء اس کی ترقی کے لئے جدوجہد میں مشغول تھے۔ شروع میں سبھی نے اس کو آگے بڑھانے اور عرب دنیا میں اس کا تعارف کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری -رحمہ اللہ- نے مصر میں اپنے اساتذہ سے احساس ذمہ داری اور وفا شعاری کا جو سبق سیکھا تھا، اسی پر قائم رہے، دارالعلوم میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو اپنی تحریر سے عرب علماء کو متاثر کر سکے، ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کا وجود ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ انہوں نے اپنا پورا وقت خطوط لکھنے اور دارالعلوم کا جواب جامعہ سلفیہ بن گیا تھا، تعارف کرانے میں لگایا اور اتنی محنت و جانفشانی سے کام کیا کہ چند ہی سالوں میں وہ عالمی ادارہ بن گیا ان کی ان مخلصانہ کوششوں کو اس وقت کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید سلفی -رحمہ اللہ- نے پہچانا اور ان کی قدر کی، ان کو ساتھ لے کر عرب ملکوں کا سفر کیا اور بڑے بڑے علماء اور شیوخ اور سرکاری عہدیداروں سے ملاقات کی۔ جامعہ سلفیہ کو آگے بڑھانے اور اسے ''جامعہ'' بنانے میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کیا ہے اس سے انکار وہی کرسکتا ہے جو بصارت اور بصیرت سے عاری ہو۔

مولانا عبدالوحید سلفیؒ کے انتقال کے بعد جامعہ کی فضا تبدیل ہوگئی وہ بڑے بڑے علماء سب گزر گئے جنھوں نے اس کی بنیاد رکھی تھی اس کے کچھ حقیقی بہی خواہان دوسرے علمی واشاعتی کاموں میں لگ گئے یا بنارس سے دوسری جگہ منتقل ہوگئے اور بعض نے عرب ممالک میں ملازمت اختیار کرلی۔

عرب اساتذہ جن کے موجود رہنے سے جامعہ کا وقار بڑھا تھا عربی زبان سکھانے میں جو خاص معاون ومددگار تھے اور جن کے جذبۂ سلفیت وعلمی قابلیت کی وجہ سے تعلیم میں چار چاند لگ گیا تھا وہ بھی ملکی حالات کی بنا پر رخت سفر باندھ کر جامعہ کو الوداع کہہ چکے تھے۔ جامعہ کے وہ قابل قدر فارغین جو عربی لکھنے وبولنے اور تحقیقی وتصنیفی کاموں میں دلچسپی ومہارت رکھتے تھے حالات سازگار دیکھ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے عرب یونیورسٹیوں کا رخ کرلیا تھا اسی طرح کے اور دیگر مسائل بھی تھے جن کا ذکر خلاف مصلحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ومصلحت کہ کچھ سالوں کے بعد جامعہ کے قابل قدر استاذ صاحب تصانیف کثیرہ علم اسماء الرجال وجرح وتعدیل کے ماہر مولانا رئیس احمد ندوی کو بھی اللہ نے اپنے پاس بلالیا اور اس طرح جامعہ کا علمی چمن خزاں رسیدہ ہوگیا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب سخت مضطرب تھے ان کو اس کا احساس ہوچلا تھا کہ اب جامعہ زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے اپنے خدشات اور بے چینی کا اظہار چند اوراق پر ثبت کئے جن کو میں نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اپنے آپ کو کس قدر بے بس محسوس کررہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''محدث'' میں یہ اعلان ہوا کہ مرحوم کی زندگی اور خدمات سے متعلق ایک خصوصی شمارہ شائع کیا جائے گا اور ان کے احباب اور جاننے والوں کی خدمت میں خطوط کے ذریعہ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ کچھ لکھ کر ''محدث'' کو بھیج دیں۔ میرے پاس بھی خط آیا پھر ناظم صاحب نے فون پر بھی بات کرکے اس بات پر زور دیا کہ میں ضرور کچھ لکھوں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی پانچ دہائیوں پر مشتمل رفاقت کی اہم باتوں کو اکٹھا کرکے ''محدث'' کو روانہ کردیا۔ لیکن ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ ایک سال کے بعد جب مجھے ہندوستان جانے کا موقع ملا۔ میں نے سوچا کہ بنارس جاکر حقیقت کا پتہ چلایا جائے میں اور ڈاکٹر صاحب کے ایک اور ساتھی بنارس گئے اور براہ راست ناظم صاحب سے بات کی۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ بروقت کوئی خصوصی شمارہ نکالنے میں کچھ مجبوری ہے اور کچھ پیچیدگی ہے۔

جب میں جامعہ سلفیہ سے مایوس ہوگیا ادھر ڈاکٹر صاحب کی خدمات ومحنت شاقہ کا تعارف کرانے کا میرا شوق جنون کی حد تک پہونچ رہا تھا پھر میں نے اپنے دیرینہ ساتھی اور ہمدم اور ڈاکٹر صاحب کے رفیق مولانا مظہر احسن ازہری سے درخواست کی کہ وہ جامعہ عالیہ عربیہ جس کی نظامت کی ذمہ داری ان کے سر پر ہے اور وہ اسے بحسن وخوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ماشاء اللہ انجام دے رہے ہیں۔ اور جامعہ روز افزوں ترقی پذیر ہے، درخواست کی کہ اس سے نکلنے والے میگزین ''افکار عالیہ'' کا ڈاکٹر صاحب سے متعلق خصوصی نمبر نکالنے کی مہربانی کریں۔ انھوں نے یہ تجویز منظور کرلی اور اس کے ایڈیٹر مولانا عبداللطیف اثری کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اس کام کو کریں۔

مولانا عبداللطیف اثری حفظہ اللہ کی یہ حق تلفی ہوگی اور ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی اگر میں یہ بتاتا نہ چلوں کہ گزشتہ سال جب ہم لوگ بنارس سے ناکام ونامراد واپس آئے تو وہ میرے پاس تشریف لائے اور درخواست کی کہ میں اپنا مقالہ انہیں دیدوں تاکہ وہ اسے ''افکار'' میں شائع کرسکیں۔ میں نے معذرت کرلی۔ کیونکہ مجھے پوری توقع تھی

کہ جامعہ سلفیہ کی جانب سے مستقبل قریب میں نمبر ضرور شائع ہوگا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا ہم اب بھی پر امید ہیں کہ ایک وقیع نمبر ضرور شائع ہوگا۔

یہ ہے وہ پس منظر جس کی بنیاد پر ڈاکٹر ازہری -رحمہ اللہ- سے متعلق خصوصی شمارہ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو سے شائع ہونے والے میگزین سہ ماہی مجلہ ''افکار عالیہ'' سے نکل رہا ہے۔ اسے منظر عام پر لانا ضروری تھا تاکہ کچھ سادہ لوح لوگوں کے دل میں یہ سوال نہ پیدا ہو کہ ڈاکٹر صاحب نے اگر چہ اپنی عربی تعلیم مدرسہ عالیہ سے شروع کی لیکن انھوں نے کبھی اس میں تدریسی خدمات انجام نہیں دیں بلکہ وہ چالیس سال تک جامعہ سلفیہ سے منسلک رہے۔ اس طرح بہت سے لوگوں کی زبانیں بند ہوجائیں گی اور ان کو پتہ چل جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب صرف جامعہ سلفیہ ہی کے نہ تھے بلکہ وہ سب کے تھے اور جامعہ عالیہ عربیہ تو خیر ان کا اپنا ادارہ تھا وہ اس سے بے تعلق کیسے ہو سکتے تھے۔ اور جامعہ عالیہ عربیہ کے ہوش مند ذمہ داران ان کی خدمات سے چشم پوشی کیسے کر سکتے تھے۔

میں اس موقع پر جامعہ عالیہ عربیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا مظہر احسن ازہری کا خلوص دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنے قاہرہ کے ہم سفر کی یاد تازہ رکھنے کے لئے جدوجہد کی اور اس کے لئے وسائل مہیا کئے۔ اسی طرح جامعہ کے دوسرے تمام اراکین کا شکر گزار ہوں جنھوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سلسلے میں اپنا تعاون پیش کیا۔ خصوصی شکریہ مولانا عبداللطیف اثری کا جنھوں نے ہر اس شخص سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جس سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق تھا اور کچھ لکھنے کی درخواست کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔

قاہرہ میں ڈاکٹر صاحب نے چھ سال تک جن احباب کے ساتھ وقت گزارا تھا انھوں نے آپ سے متعلق اپنی یادیں قلم بند کیں جنھیں آپ اس شمارے میں پڑھیں گے ان میں سب سے پہلے جامعہ عالیہ عربیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا مظہر احسن ازہری حفظہ اللہ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر قاہرہ جانے کی تیاری شروع کی اور کافی پاپڑ بیلنے کے بعد دونوں ارض کنانہ پہنچ گئے اور جب تک ڈاکٹر صاحب ہندوستان واپس نہیں گئے ان کا ساتھ باقی رہا۔ پھر شعیب بھائی ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق پان سے ہوا۔ پھر یہ دونوں یارِ غار یا یار پان ایسا اکٹھا ہوئے کہ آخر وقت تک ساتھ رہے۔ میں نے جب شعیب بھائی سے ڈاکٹر صاحب سے متعلق اپنی یادیں قلم بند کرنے کی درخواست کی تو انھوں نے فوراً قبول کر لیا اور کہا کہ یہ تو ڈاکٹر صاحب کا میرے اوپر حق ہے تیسرے ساتھی ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی ہیں جو قاہرہ میں ریڈیو پر ہم لوگوں کے ساتھ کام کرتے تھے اور اب جدہ ریڈیو سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے جدہ سے شائع ہونے والے روزنامہ ''اردو ٹائمز'' میں ڈاکٹر صاحب کے جنازہ کا آنکھوں دیکھا حال شائع کیا جدہ میں بیٹھ کر وہ مولانا مظہر ازہری سے قدم قدم کی رپورٹ لیتے رہے اور اسے لکھتے رہے۔

اسی طرح میں ان تمام مقالہ نگاروں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ادارہ افکار عالیہ اور ہماری درخواست پر اپنے تاثرات بھیجے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے اور دنیا میں ان کو صحت وعافیت سے رکھے اور آخرت میں ان کو اپنے ان نیک بندوں میں شامل کرے جن پر اس کے انعام کی بارشیں ہوں گی۔ مع الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا۔



پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی
علی گڑھ

ہمارے مولانا ہمارے مقتدا

محترم ومکرم مولانا عبداللطیف اثری مدظلہ
مدیر افکار عالیہ مئوناتھ بھنجن
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
امید ہے کہ آپ کا مزاج عالی بخیر ہوگا بحمد اللہ خاکسار بعافیت ہے آپ کا شکر گزار ہوں کہ اپنے مقتدا پر ایک تاثراتی مضمون لکھ سکا۔ آپ کی محبت بھری ضد نے لکھوالیا ہے ورنہ نہ جانے کب لکھا جاتا۔ ان کا حق تو مجھ پر واجب ہی تھا۔ امید کہ آپ کو مضمون پسند آئے گا۔ آپ کو پورا مدیرانہ اختیار ہے کہ اس میں تبدیلی یا ترمیم کردیں نہ کریں تو میں ممنون ہوں گا۔ افکار و تاثرات میں تبدیلی اچھی چیز نہیں ہوتی۔
والسلام
محمد یٰسین مظہر صدیقی
۲۸/۱/۲۰۱۲ء

ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا ایک عظیم فرد ہمارے مولانا ہمارے مقتدا تھے، اپنی ذات سے انجمن اور کمالات سے مایۂ فخر، وہ روایتِ مشرقی کے پروردہ عالمِ دین تھے اور جدید روایت تحقیق کے پرداختہ محقق وعارفِ علوم اسلامیہ بھی۔ اپنی ابتدائی اٹھان سے وہ اسلامی ہندی تعلیم گاہ سے فارغ التحصیل بھی اور عالمِ اسلام کی عظیم جامعہ ازہر کے سند یافتہ بھی، ان دونوں اداروں کی تعلیم وتربیت اور تہذیب وتعمیر پر جدید ہند کی عظیم ترین جامعہ۔ مسلم یونیورسٹی۔ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ تعلیم وتربیت اور تہذیب وتطہیر کے ان اداروں نے ان میں علم وفضل کے ساتھ ساتھ وسعتِ نظر وصلابت بھی پیدا کردی۔ اردو، فارسی اور عربی کے عظیم ترین مآخذ ومصادر خاص کر قرآن وحدیث کے بیش بہا سرمایے نے ان کو توازن واعتدال بھی بخشا۔ جدید مراکزِ تدریس وتربیت نے ان کو مسلکی عصبیت، اداری فرقہ پرستی اور علاقائی تعصب کی آلائشوں سے پاک کیا۔ ان طہارت خانوں میں بنیادی محرک اور اصل عامل کتاب وسنت کی صحیح تعبیرات اور عادلانہ تشریحات کا عامل ہی کارگزار تھا۔ عرب ممالک اور دوسرے عالمِ اسلام کے علاوہ دنیائے جدید کے دوروں، سفروں اور تجربوں نے ان کو ملی یک جہتی کا درس دیا۔ بلاشبہ خود ان کی اپنی سادہ فطرت، تواضع وانکسار، فضائلِ اخلاق اور خالص تدین نے ان کو مجموعۂ صفات بنایا تھا۔ ان کے علمی وتحقیقی کمالات اور تالیفی وتصنیفی اکتسابات نے ان میں مجموعی تناظر میں کتاب وسنت کے مطالعہ وتحقیق کا ذوق پیدا کیا۔ وہ نہ صرف ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے لئے سرمایۂ افتخار تھے بلکہ عالمِ اسلام کے لئے مایۂ ناز اور دین وعلم کے لئے طرۂ امتیاز تھے۔ ملتِ اسلامیہ کی زوال زدہ سائیکی کا یہ المیہ بڑا دلدوز ہے کہ ان کو ایک خاص مسلک کا عالم اور ایک مخصوص چھاپ کے ادارے کا سربراہ

بنا کر رکھ دیا۔ اس المیہ کے بڑے مجرم کردار ہمارے تمام طبقات ومسالک اور ادارے ہیں جن میں ان کے اپنے لوگ آگے آگے ہیں۔ اور دوسرے بھی ان سے پیچھے نہیں بلکہ وہ ان سے بھی آگے جانے کی ریس میں ہیں۔ معاملہ احساسِ زیاں کے جانے کا ہی ٹھہرا ہے۔

چالیس برسوں کو محیط ''نبوی عرصہ'' میں ہم نے ''اپنے مولانا اپنے مقتدانا'' کو بہت سے رنگوں میں دیکھا۔ ''ہمارے مولانا اور مقتدانا'' پر شاید لغوی ادیب وظاہر بین مبصروں کو اعتراض ہوگا مگر بقول حضرت جگر مرادآبادی میرا مذاق اسے صحیح سمجھتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کو ہر رنگ میں پایا یا دیکھا کیونکہ انسان تو خود بھی اپنی ذات وصفات کے ظاہر ہی کا اسیر رہتا ہے۔ جتنے بھی رنگوں میں ان کا، ان کی ذات کا، ان کی صفات کا مشاہدہ وتجربہ کیا وہ سارے رنگ بڑے دلآویز وجمیل تھے۔ ان کی بشری صفات وخصائل میں بھی کمزوری، اتار، جزر، بدنمائی اور گراوٹ کے بالمقابل صلابت وطہارت کی بلندی پائی، وہ بلاشبہ ایک مردِ جلیل وجمیل تھے اور ان کا جمال وجلال دراصل ان کے اندرون سے پھوٹتا تھا اور سب کو سرشار کرتا تھا۔ وہ ہم سب کے مقتدائے اعظم ﷺ کی توصیف مردمومن کے عین مطابق روشن جبیں، خندہ رو اور تابناک چہرے والے تھے۔ اتنی طویل مدت میں مختلف اوقات اور گوناگوں مواقع پر ان کی تابناکی، تابندگی اور تبسم وفرحتِ فراواں کے سوا کچھ نہ دیکھا وہ دوسرے علماء ومشائخ، صالحین وابرار اور دانشور ودکاترہ کی طرح کبھی ترش رو اور تکدر خونظر نہ آئے۔ ان کے نزدیک تقویٰ وطہارت اور دینداری اور علمیت کا معیار کدورت، خشونت، یبوست اور خشمگی نہ تھا۔ جیسا کہ آج کل کے تمام مسالک وافکار کے علماء ومشائخ اور جدید دانشوروں میں ہر عام وخاص کو روزانہ تجربہ ہوتا ہے۔ سیکڑوں ملاقاتوں اور زیارتوں میں اتنی خندہ روئی، طلاقتِ روئے انور کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ ان کے اندرون کا روشن عطیہ تھا۔

ان کی فطرت کی سادگی جس طرح ان کے چہرے کو روشن وتابندہ اور جسم وبدن کو فرخندہ وخجستہ رکھتی تھی۔ اسی طرح ان کی زبان وبیان کو بھی پاک وصاف اور خوبصورت وجمیل بنائے رکھتی تھی، ان کے تبصروں وتنقیدوں میں بھی حسن وجمال ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک کا احترام کرتے تھے اور اس سے زیادہ ہر ایک سے محبت کرتے تھے، نفرت وعناد انھوں نے سیکھا نہ تھا، لہٰذا وہ کیسے کرتے۔ اختلاف وکبیدگی کا اظہار بھی ان کی زبان سے پھولوں کی تراوش رکھتا تھا۔ طنز وتعریض وتنقید میں بھی لطف وعنایت کا عنصر ہوتا۔ ایک بار اپنی جماعت کے امیر وشیخ کے بارے میں تبصرہ کیا کہ ''آپ نے بھی کس عظیم آدمی کا نام لیا، اب دیکھئے ناشتہ ملتا ہے یا نہیں'' وہ بعض اکابر ملت اور مشائخ جماعت کے باب میں بلاشبہ تنقید وتعریض سے کام لیتے تھے لیکن ان کا مقصد غیبت نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان کی کرتوت سے جماعت وملت کو بچانا اور دوسروں کو ان کے شر وفساد سے آگاہ کرنا ہوتا تھا وہ بھی خوش کن انداز میں۔

ہمارے مقتدا کا دل ودماغ ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی فرقہ پرستی اور مسلکی عصبیت سے داغ داغ تھا۔ وہ اسلام ودین اور ملت وامت کے وسیع تر مفاد وحسین ترین تناظر میں سوچتے اور منصفانہ اس پر عمل کرتے تھے۔ مقتدا حسن ازہری کتاب وسنت کے مطالعہ اور اپنی تربیت وتعلیم کے عطیہ کے سبب ایک خاص مسلکِ اسلام پر چلتے تھے۔ اپنے مسلک ومذہب کے بارے میں ان کو شرحِ صدر تھا اور اس پر

صلابت وایمانداری سے گامزن رہنے کو صحیح تر سمجھتے تھے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ ملت اسلامیہ ہندیہ اور عالم اسلام کے دوسرے مسلم اقوام وملل کے طریقوں اور مسلکوں کو بھی قابل قدر جانتے تھے۔ ان کا یہ مسلکِ اعتدال وتوازن دراصل محدثین کرام، فقہاء اسلام اور علماء دین کے سلفِ صالحین کے مسلک سے مستعار تھا۔ تمام فقہی مسالک۔ حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ، اہل حدیث/ ظاہریہ اور دوسروں۔ میں وہ حق کو دائر گردانتے تھے۔ قدیم محدثین وعلماء کے علاوہ ممکن ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی تحریروں اور تحقیقوں نے ان کے فکر ونظر پر اثر ڈالا ہو۔ کتاب وسنت کی اصولی تشریح وتعبیر میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں، صرف جزئیات وسنن میں کچھ اختلافات ملتے ہیں۔ مقتدائے حسن خوب واقف تھے کہ یہ عربی کا اختلاف ہے، اردو کا نہیں اور وہ اس کو مخالفت وعناد کے معنی میں نہیں لیتے تھے۔ وہ یہ بھی خوب سمجھتے تھے اور اس پر عمل بھی کرتے تھے کہ سنتوں میں تنوع، گونا گونی اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ صحابۂ رسول اکرم ﷺ میں سے کسی کی بھی اقتدا دراصل سنت وحدیث کی متابعت ہے، تقلید شخصی نہیں، تمام فقہائے کرام اور محدثین عظام نے بھی اس اعلان کو بانگ دہل بیان کیا ہے کہ ہم صرف سنت وکتاب کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی واضح تصریحات ہیں کہ وہ شخصی تقلید کے صاف منکر تھے اور کتاب وسنت کے داعی، تقلید تو ان ہی دونوں سرچشموں کی ہوتی ہے۔ مولانا مقتدانا کا فکر وعمل دراصل اسی طریقۂ سلف صالحین کے مطابق تھا۔ ان کا تمسک اصح وصحیح ترین سے ان کے خیال میں تھا۔ وہ آج کل کے علماء ومفکرین منافرت وشقاوت کی مانند دوسروں کو برسر باطل، مخالفِ کتاب وسنت نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی نجی مجلسوں میں، شخصی ملاقاتوں میں ہی نہیں وہ عام مجالس علم وفن میں اور محافلِ مذاکرہ ومطالعہ میں بھی اس کا اظہار کرتے تھے زبان وبیان کی انمٹ شہادتوں کے علاوہ وہ تحریر ونگارش میں بھی اسی مسلکِ اعتدال اور مذہب محبت کے داعی تھے۔ ان کے بس میں جب تک رہا وہ اپنے اعمال وانتظام اور کارگذاری اور کارکردگی کے میدان میں اسلامی ملت کو جوڑنے کا کام کرتے رہے۔

مرکزی دارالعلوم سلفیہ کی تعمیر وترقی میں ہمارے مقتداومولانا کا کردار قائدانہ وعالمانہ اور مجددانہ تھا۔ دوسرے بزرگوں اور معماروں کے عطایا وخدمات سے انکار ہے، نہ ان کی گرانباری وتابندگی سے صرفِ نظر کیا جاسکتا ہے۔ مگر حضرت مقتدیٰ کی خدمات جلیلہ کا باب اس عظیم الشان اسلامی مرکز علم ودانش کا سب سے زیادہ تابناک باب ہے، وہ ان کی فکر ونظر کا، ان کے عمل وتحریر کا، ان کی تعلیم وتدریس کا اور ان کی محبت وعقیدت اور شیفتگی کا محور ومرکز تھا۔ یہ ان ہی کی عطایا وخدمات کا صلہ ہے کہ ایک مقامی درسگاہ کو قومی سطح کا ادارہ بنایا اور پھر اسے عالم اسلام کا نمائندہ بنا دیا۔ ان کی خدمات جلیلہ کے اس عظیم الشان پہلو اور جہت پر ایک دفتر تحقیق لکھا جاسکتا ہے اور یقیناً احسان شناس لکھیں گے بھی۔ ان کا ایک ادنیٰ مقتدی اور خادم صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کے دم سے اس ادارے کا بھرم قائم تھا اور امتیاز دائم ہوا تھا۔ اس کے امتیاز واختصاصِ علوم اسلامیہ اور عربی زبان وادب میں ان کی شخصی گراں قدر خدمات کے علاوہ علمی وتحقیقی فضا تھی۔ انھوں نے اپنے دورِ وکالت وسربراہی میں اپنے محبوب ادارے میں متعدد علمی، تحقیقی اور فنی مذاکرے اور سیمینار منعقد کرائے۔ ان میں امام ابن تیمیہؒ پر بین الاقوامی

سیمینار اور سیرتِ نبوی پر سلفی خدمات کا مذاکرہ اپنے معیار ونظام کے لحاظ سے منفرد تھے۔ وہ ایسے مذاکرات اور علمی مجالس میں ملت اسلامیہ ہندیہ کے اکابر ومشائخ کے ساتھ عرب علماء وفضلاء کو بھی جمع کرلیا کرتے تھے۔ ان عظیم اہلِ قلم وصاحبانِ دانش کو جمع کرنے کے ساتھ ان کا فراخدلانہ کارنامہ یہ تھا کہ وہ ہم جیسے طالبانِ علم کو بھی بلا لیتے تھے۔ مختلف مسالک ومذاہب کے علماء ومشائخ اور عرب وعجم کے صاحبانِ علم وتحقیق کے جمع کرنے میں ان کی بڑی مصالح مضمر تھیں۔ علوم وفنونِ اسلامی کے فروغ، ائمہ ومجتہدین کے افکارِ علم واسلام کی تحقیق اور سلف سے خلف کو جوڑنے کی سبیل تو تھی ہی، وہ ان کے ذریعہ ملتِ اسلامی کی وحدت واتحاد کے تصور کو عمل کا روپ دیتے تھے کہ مختلف پھولوں سے گلدستۂ امت تیار ہوا تھا۔ ہم جیسے نہ جانے کتنے طالبان حق تھے جنھوں نے ان مذاکراوں، سیمیناروں اور مجلسوں سے علم وتحقیق کے سبق کے ساتھ بلند نگاہی سیکھی۔ سب کے افکار وتحقیقات کی سماعت وبرداشت کی تاب بڑے بڑوں میں نہیں ہوتی، خوردوں میں بے علمی کے سبب اشتعال زیادہ ہوتا ہے مقتدائے بزم نے ان مجالس علمی کے ذریعہ ملتِ اسلامی کے پراگندہ اجزاء کو جمع کرنے اور دلوں کو جوڑنے کا عظیم کام کیا تھا۔

وقتی یا سالانہ یا دوسالہ سیمیناروں کا معاملہ عارضی اور وقتی دوا کا تھا کہ بیماریٔ فکر کو ٹھہر ٹھہر کر دور کیا جائے۔ وہ ان کے عارضی اثرات ونتائج سے بخوبی واقف تھے کہ ان وقتی مجالس سے فکر ونظر اور علم وتحقیق کا صرف ایک دروازہ کھولا جاسکتا ہے۔ ان کی فکر ونظر میں مستقل علاج اور پائیدار ''دوا'' کا نسخہ زیادہ کارگر، زیادہ موثر اور دور رس اثرات ونتائج کا حامل تھا۔ اس لئے وہ توسیعی خطبات اور تعلیم وتربیت کے تدریبی دروس وتعلیمات کا بھی انتظام کرتے تھے اور ماہرین فن کو بلاتے تھے۔ علماء ومشائخ مدرسہ اور صاحبانِ مکتب وجامعہ ایک خاص فکر ونظر اور ایک مخصوص طرزِ تعلیم وتربیت کے خوگر ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ عصری جامعات وجدید تعلیمی اداروں کے ماہرین فن وتحقیق کو بھی اسی محدود فکر ونظر کی بساط پر بٹھایا جاسکتا ہے۔ مقتدائے جامعہ سلفیہ نے اپنی وسعتِ نظر، تجربہ وعمل اور اخلاص ومحبت سے ان دونوں دھاروں کے اختلاط کا کامیاب تجربہ کیا۔ دونوں تعلیمی روایتوں کے ماہرین کو الگ الگ اور ساتھ ساتھ بلانے اور ان کے خطبات ومقالات سنانے کا تو اہتمام کیا ہی، انھوں نے عصری جامعات اور جدید یونیورسٹیوں سے ان ماہرین علم وتحقیق کو خاص طور سے دعوت سخن وتحریر دی جو دونوں کے جامع تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی اور دوسرے عصری تعلیمی اداروں میں برسرکار ''مولوی دکاترہ اور مدرسی فضلاء'' کا انتخاب کیا۔ متعدد صاحبانِ علم وفضل کے ساتھ وہ اس حقیر طالب علم کو بھی ضرور بلاتے تھے اور اس کی تحقیقات وافکار سے سب کو روشناس کراتے تھے۔ طلبائے جامعہ سلفیہ میں ان علمی اور تربیتی پروگراموں کا بہت گہرا اثر ہوا اور ان کی فکر اور سوچ اور علم ونظر کا رخ وسیع ہوا۔ اساتذہ ومشائخ دارالعلوم کو بھی جدید تحقیقات سے آگاہی ملی، اگرچہ ان کے علم وفضل میں ان سے کیا اضافہ ہوسکتا تھا۔ مگر یہ کیا کم تھا کہ وہ فریقین کے درمیان خلیج کو کم کرنے میں کامیاب ہوگئے اور صاحبانِ علم وفضل کے چہروں پر تکدر کی جگہ تبسم لے آئے۔ خاکسار راقم اور اس کے ہمراہی خادموں کا تاثر بلکہ تلخ تجربہ یہ تھا کہ

متعدد صاحبانِ جامعہ سلام وکلام کے بھی روادار نہ تھے خاکسار نے بعض اوقات ایسے خشک زاہدان سلف کو جا پکڑا اور ان کے گریز پا قدموں اور راہ بدلنے کے طریقوں پر روک لگائی۔ طنز وتعریض اور تنقید کی بجائے اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا تو گریز پا قدموں اور ترچھی نظروں نے بھی ہمارے قدم لئے اور محبت سے دیکھا بھی۔ حضرت مقتدا نے ایک شام خاص مجلس اساتذہ میں مہمانوں اور میز بانوں کو جمع کر کے اور محبت وشگفتگی سے کلام کر کے سخت مٹی کو نم کیا۔ وہ جو ابھی تک کھینچے کھینچے تھے بڑھ کر محبت سے ملنے لگے اور ان کے چہروں پر محبوبیت جھلکنے لگی۔ چاہنے والے تو پہلے ہی سے ٹوٹ کر ملتے تھے۔

ناگوار کو گوارا اور کڑوے کسیلے کو خوش ذائقہ بنانے کا فن مقتدائے جامعہ کا شخصی اکتساب یا علمی عطیہ تھا۔ شاید دونوں کا معاملہ تھا، اس کا تجربہ طلبہ واساتذہ دونوں کے منفرد ممتاز جلسوں میں ہوتا تھا کہ وہ نباض بھی تھے۔ اختلاف فقہی ہو یا فکر ونظر اور تعبیر وتشریح کا، حضرت مقتدا دو متصادم اور متناقض نظر آنے والے معاملات میں توازن پیدا کرتے تھے علمائے اہل حدیث کو بالعموم علمائے احناف سے حدیث شریف کے استخفاف وصرفِ نظر کی کم از کم شکایت ہمیشہ رہتی ہے۔ ایک مشہور عالم سلف نے نہ جانے کس دھن میں یہ لکھ دیا کہ علمائے ندوہ بالعموم استخفاف حدیث کے مجرم ہیں سوائے علامہ سید سلیمان ندوی کے، نوخیز ونوجوان اور ناتجربہ کار طلبائے جامعہ کے ایک پروگرام میں یہ خیال وفکر زبانی وتحریری طور سے حاضرین کے سامنے آیا۔ ہمارے ایک درد مند اور صلح جو اور نرم خو ساتھی کو طرارہ آ گیا اور انھوں نے اس کی تردید میں ایک گرما گرم عربی لہجہ میں تقریر کر دی۔ آخر میں یہ سوال اٹھایا کہ کیا آپ سب کے محترم استاذ اور ہمارے رفیق درس مولانا محمد رئیس ندوی بھی اس جرم میں شریک ہیں۔ فضا علمی سے جدالی اور منور سے مکدر ہو چلی تھی کہ خاکسار راقم کو ''اپنی صدارت ومشیخت کی'' بنا پر ایک ترکیب سوجھ گئی، خاکسار صدر مجلس نے بڑے ادب ودرد سے حاضرین مجلس کو مولانا داؤد غزنوی اور مولانا اسماعیل گودھروی کے بعض واقعات سنائے ان میں زور اس امر پر تھا کہ مختلف حدیثوں میں سے کسی پر مولانا غزنوی کا عمل تھا اور کسی دوسری پر مولانا گودھروی کا جبکہ دونوں ہم مسلک تھے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے اپنی کتابِ مستطاب میں ان دونوں بزرگوں اور دوسرے علماء وفضلاء کے اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ وہ دراصل اختلافات ہیں ہی نہیں۔ سنت وحدیث کی گونا گونی کے مظاہر ہیں۔ اور ان کی رنگارنگی پر تعامل وعمل کے مظاہرے ہیں۔ حضرت شاہؒ اور دوسرے علماءِ سلف ومحدثین امت کے حوالے سے یہ حقیقت بھی ان کے گوش گذار کی کہ صحابہ کرام، تابعینِ عظام، مجتہدین وفقہاءِ اسلام اور محدثین ومحققین انام نے بڑی کاوش ودلسوزی سے ثابت کیا ہے کہ مختلف ائمہ وفقہاء نے اپنے محبوب ومکرم رسول اور خاتم النبیین ﷺ کی تمام سنتوں کو زندہ وتابندہ رکھنے کی خاطر الگ الگ سنتوں پر عمل کیا۔ لہٰذا کسی پر نکیر نہیں کی جاسکتی۔ اب رہا افضل وغیر افضل کا معاملہ تو کوئی بھی ثابت شدہ اور صحیح سنت نبوی غیر افضل نہیں ہے۔ ہمارے مقتدائے مجلس نے اپنی تقریر وخطاب سے روشن خاکسار کی تائید کی اور سنت وحدیث کی ہمہ گیری پر خاص زور دیا۔

ایسی ہی ایک مجلس دوستاں میں مختلف مدارس کے فارغ التحصیل علماء اور دانشورانِ جامعات جمع تھے۔ ''مقتدانا''

اپنی خوش مزاجی اور شگفتگی اور لب ولہجہ کی نرماہٹ کے ساتھ محوِ گفتگو تھے اور مجلس زعفران زار تھی۔ علمی لطائف وظرائف اور نادر نادر تحقیقات پیش کی جارہی تھیں۔ ہر شخص گفتگو اور فرخندہ جبینی میں سبقت لے جانے کا کوشاں تھا۔ اچانک خاکسار کو ایک شرارت سوجھی، بہت متین وسنجیدہ لہجہ میں حضرت مقتدا سے ایک سوال طالب علمانہ پوچھ لیا۔ حضرت ہم احناف میں ایک سنت ہے جس پر ہمارا سختی سے عمل ہے، صرف معلومات کی وجہ سے سوال ہے کیا اہل حدیث بھی اس کے عامل ہیں۔ ہنسی اور قہقہوں میں اچانک اس سنجیدہ علمی سوال نے وقفہ ہی نہیں پیدا کیا بلکہ فضا کو سنجیدہ اور چہروں کو متین بنا دیا۔ مقتدائے مجلس نے بہت ادب واحترام سے خاکسارانہ سوال دریافت کیا تو عرض گزار ہوا کہ ہم احناف کھانے کے بعد شیرینی کے کھانے کو سنت سمجھ کر اس پر سختی سے عمل کرتے ہیں، کیا آپ بھی.....'' جملہ وسوال پورا نہیں ہوا تھا کہ قہقہوں سے چھت اڑگئی اور حضرت مقتدا نے ازراہِ طرب فرمایا: ''ہم اہل حدیث بھی اس سنت طعام پر عمل کرتے ہیں خواہ فرائضِ طعام ترک ہوجائیں'' واقعہ یہ تھا کہ مذاکرہ کے پہلے دن دونوں کھانوں کے بعد زبان شیرینی کو ترس گئی تھی اور نمکا نمکی شوریدگی میں بدل گئی تھی۔ مولانا نے بتایا کہ ظالم منتظموں نے میوہ جات، شیرینی اور پھل پھلاری تعداد ومقدار میں کم پائے تو کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ انصاف وعدل کا ایسا بے محابا استعمال دیکھ کر مولانا نے اسی وقت ان ظالموں کو بلایا کہ خاص مہمانوں اور مندوبوں کا معاملہ الگ ہے اور عام زائرین اور سامعین کا معاملہ الگ، لہٰذا کل سے مندوبین کرام کے لئے پورا انتظام رہنا چاہئے اور وہ ہوا بھی، مندوبین کے ایک اور التماس پر رضا کاروں کو ہدایت کی کہ ان حضرات کو نماز فجر کے لئے اسفار میں جگانا، غلس میں گل نہ مچانا۔ ان کا طرزِ عمل اور طرزِ ہدایت بھی بڑا کریمانہ تھا۔ نہ کسی فرد کی آبروریزی کی، نہ اسے رسوا کیا اور نہ اس کی تحقیر کی۔ ان کو عدل ومساوات کے ساتھ ساتھ اکرامِ ضیوف اور احترام ودلداری مہمانانِ گرامی کی نبوی ہدایتوں سے مالا مال کیا۔ اسی مذاکرے میں امیر اہل حدیث کے خطبۂ جمعہ کی بے اعتدالی پر وہ بہت بدحظ ہوئے اور خاکسار راقم سے اس کا اظہار بھی کیا۔ ان کو خاص قلق یہ تھا کہ حضرت خطیب نے مجمع میں موجود اپنے استاذ گرامی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا خیال بھی نہیں رکھا۔ وہ کوئی حق وباطل کا معرکہ نہ تھا کہ باطل کا سر کچلنا اور غلط کو غلط کہنا ضروری ہوتا۔ صرف ارجح اور پسندیدہ کا معاملہ تھا۔ حضرت مقتدیٰ ایسے تمام معاملات وامور میں رواداری اور خاطر احباب کا خیال رکھتے تھے کہ وہ بھی ایک طرز نبوی اور طریق سنت ہے۔ دوسروں کو محض تعصب سے تنگ کرنے کو برا جانتے اور بہت بدحظ ہوتے۔ وہ اپنے کرب وغم کا اظہار کبھی کبھی ظالموں سے بھی کردیتے تھے۔

احترامِ مسلک واکرامِ فقہاء ان کی اپنی عصبیت ومحبتِ مسلکی کے باوجود ان کی اسلامی شریعت تھی، ان کی زبان وتحریر سے کسی بھی طرح کی تحقیر وتوہین کسی کی بھی نہ سنی نہ پڑھی، وہ تو دوسروں کی نشتر زنی کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرتے تھے اور موقع بہ موقع جارح زبانوں اور مسموم مزاجوں کی سرزنش کرتے رہتے تھے اور ان کی لطافت بھری زجر وتوبیخ سے ان کے ہم مسلک زیادہ شادکام ہوتے۔ اسی جذبۂ احترام اسلامیت سے ان کی ایک خاص ادائے دلبری پھوٹی تھی جسے ہم لوگ اپنی زبان میں ''انکسار وتواضع مقتدانا کہا کرتے تھے۔ ان کی یہ خاص دلآویز ومحبت آگیں ادا ایک

طرف ان کو منکر کے خلاف سرشار مدافعت کر گئی تو دوسری طرف ان کے اندرون میں منکسر المزاجی بھر دی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے عہد کے تمام معاصر علماء وفقہاء اور اہل علم ودانش کا یکساں احترام کرتے اور ان کے آگے بچھ بچھ جاتے۔ یہ صرف ان جیسے نادرۂ روزگار شخصیات کا جگر تھا کہ وہ اپنے سے چھوٹوں، ہر طرح کے خوردوں کا احترام واکرام بلاتمیز کیا کرتے تھے۔

ہندی علماء وفضلاء میں عربوں کی محبت اور ان سے شیفتگی ان کی اسلامیت واحسان شناسی کے جذبوں سے ان کے دل ودماغ میں پیوست ہوئی ہے۔ عرب علماء و محققین اور مشائخ واکابر کی تعظیم وتکریم اسی جذبۂ خیر کے علاوہ ان کے علمی کارناموں اور تحقیقی دفتروں کے سبب بھی پیدا ہوئی ہے۔ ہندی جذبۂ عقیدت ومحبت میں ایک بڑی کارفرمائی ان کی عربی زبان دانی اور اس کی بے مثال فصاحت وبلاغت سے مرعوبیت کی وجہ سے بھی آئی ہے۔ حضرت مقتدا بھی عرب زبان وادب کے پارکھ، عرب علماء ومشائخ کے عقیدت مند، ان کے علمی وادبی اور تحقیقی کارناموں کے قائل ومقلد تھے۔ تاہم ان کو اکرام واحترامِ علماء و محققین میں عرب وعجم کا امتیاز نہیں کرتے دیکھا، وہ عجمی علماء کا بھی اپنے عرب مشائخ کی مانند ہی احترام کرتے تھے۔ اس باب میں جامعہ دارالسلام عمر آباد کے مولانا سعید کا عمری دامت برکاتہم کو بھی ہندی وعجمی نژاد علماء اور مہمانوں کا یکساں اکرام کرتے دیکھا۔ ورنہ بیشتر علماء ہند اور بعض بعض مفکرین اسلام اور حکمائے امت کو عرب علماء ومشائخ کے ادنیٰ افراد کے سامنے اپنے ہندی علماء کی تحقیر کرتے دیکھا ہے۔ مولانا مقتدا کو عام وطیرۂ مسلک کے خلاف اپنے معاصر علماء واہل علم کے لئے برسرعام اور برسر منبر کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہوئے اکثر پایا۔ خاکسار راقم ان سے ہر لحاظ سے چھوٹا تھا، عمر میں، علم میں، فن میں، تعلیم میں، ادب وتدین میں بھی، لیکن وہ اس کا اکرام اپنے بزرگ کی طرح کرتے۔ نواب سید صدیق حسن خاں کی خدمات پر منعقدہ سیمینار میں خاکسار ذرا تاخیر سے پہونچا اور بعد طہارت وآرام سیدھا جلسہ گاہ میں چلا گیا۔ وہ اپنے قابلِ قدر رفقاء کے ساتھ ڈائس پر تشریف فرما تھے اور جامعہ سلفیہ کے ایک محترم استاذ اپنا مقالہ پیش کر رہے تھے۔ خاکسار کو دیکھتے ہی وہ بسر وقد احترام سے کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے رفقاء کرام بھی، مقالہ نگار مقالہ خوانی بھول گئے کہ ہال میں ایک ہلچل مچ گئی تھی۔ انھوں نے برسر منبر اس خاکسار کا ایسا والہانہ استقبال کیا اور اپنے ساتھ ڈائس پر بٹھائے بغیر دم نہ لیا۔ مقالہ نگار کو بالآخر اس خاکسار کی تعریف بیان کر کے ہلچل مٹانی پڑی۔

اکرامِ ضیوف اور احترام اہل علم کا یہ ایک تنہا واقعہ نہیں ہے۔ وہ ایک سلسلۂ عقیدت ومحبت کا صرف ایک شاہد وگواہ ہے۔ وہ بزم میں، رزم میں، خلوت میں، جلوت میں ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کا مظاہرہ کرتے تھے کہ وہ ان کے اخلاص ومحبت کے سوتوں سے پھوٹتا تھا۔ خاکسار اکثر اس والہانہ خیر مقدم پر خجل وشرمندہ ہو جاتا اور عرض بھی کرتا کہ ''قدر ایاز بشناس'' تو ہنس کر فرماتے کہ ایاز کی قدر ہی تو کرتا ہوں۔ عرب علماء واکابر کے قیام وطعام کا انتظام بیشتر مدارس وجامعات میں الگ شاندار مقامات پر کیا جاتا ہے کہ وہ اول درجہ کے شہری ہوتے ہیں۔ ہندی وعجمی علماء ومشائخ کو دوسرے درجے کا شہری اور فروتر مقام کا شخص سمجھ کر عام مہمان خانوں میں بلکہ کونوں کھدروں میں رکھا جاتا

ہے۔ ان میں بھی مقام و مرتبت کے لحاظ سے دو درجے کئے جاتے ہیں: مفکرین اسلام اور مشائخ ملت کو بہتر مقامات اور عام اہل علم کو عوامی مقامات ملتے ہیں۔ خاکسار راقم کو متعدد دوسرے بزرگوں اور صاحبان مرتبت کے مانند متعدد مقامات و مدارس پر ایسے ہی تلخ اوقات کا سامنا کرنا پڑا۔

حضرت مقتدا اپنے عجمی برادروں اور ہندی مہمانوں کا بھی اسی طرح قیام وطعام کا بندوبست کرتے تھے جیسے عظیم ترین عرب علماء ومشائخ کا۔ اپنے شاندار مہمان خانے میں وہ دونوں کو ساتھ ساتھ ٹھہراتے اور ان کے لئے ویسی ہی اکرام ومحبت بھری سہولیات فراہم کرتے تھے۔ ایک عظیم عالمی سیمینار کے موقع پر خاکسار راقم اور اس کے ایک رفیق کو اس شاندار کمرے میں ٹھہرایا جس سے گزر کر شیخ عبداللہ عبدالمحسن الترکی کو اپنے کمرے میں جانا پڑتا تھا۔ حضرت شیخ ترکی کی فرمائش پر ان کو تنہائی کی مجلس وقیامگاہ دی گئی تھی کہ وہ خاکساروں کے درمیان سے گزرتی تھی۔ کئی دنوں کی مسلسل ملاقاتوں، زیارتوں، گفتگوؤں اور مباحثوں کی وجہ سے عرب علماء خاص کر حضرت ترکی سے بڑے مخلصانہ روابط ہو گئے تھے۔ وہ رفیق کریم سید ضیاء الحسن ندویؒ اور صدیق عزیز محسن عثمانی ندوی کی عربی دانی سے چند جملوں کے بعد ہی متاثر ہو کر پوچھ بیٹھے کہ آپ نے عربی کہاں سیکھی؟ خاکسار "بے علما" تھا اور زبان عرب میں عجمی گونگا، لیکن وہ اس گونگے و بے علمی سے بھی شفقت ومحبت کا برتاؤ کرتے تھے۔

حضرت مقتدا نے ان کے کان میں نہ جانے کیا سر پھونک دیا تھا کہ وہ اس کو علمی وعالم سمجھنے لگے اور پانچ علماءِ مسلم یونیورسٹی کا انتخاب پانچ موضوعات پر لکھنے کے لئے کیا تو خاکسار بھی ان میں شامل تھا۔ یہ عجیب ماجرا ہوا کہ ان تمام منتخب روزگار میں صرف خاکسار راقم نے ہی کتاب لکھ کر دی شیخ ترکی نے اس کا عربی ترجمہ کر کے شائع کروایا اور خوب وتعریف وتوصیف کر کے خاکسار کو دوسری کتابیں تصنیف کرنے کا حکم بھی عطا کیا۔ بلاشبہ اس میں حضرت مقتدا کی بندہ پروری تھی اور اس سے زیادہ حیرت ناک ذرہ نوازی یہ تھی کہ ان کی وساطت سے شیخ ترکی کا والا نامہ ملا جس میں جامعۃ الامام محمد بن سعود ریاض میں توسیعی خطبات دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ شیخ کا خط حضرت مقتدا کے گرامی نامے کے ساتھ بنارس سے علی گڈھ پہونچا۔ دونوں سے فطری طور سے خوشی ہوئی مگر حضرت مقتدا کے گرامی نامے کی عبارت پر فخر وناز بھی ہوا کہ کوئی تو ایسا بھی ہے جو خاکساروں کو مہ و پروین کے مقابل کرتا ہے۔

اپنے بڑوں اور بزرگوں میں سے اکثر کو صرف تحسین وتعریف اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ضرور بار بار دیکھا، بعض بعض اکابر واساتذہ اور مشائخ ومفکرین کی سرد مہری اور حوصلہ شکنی کا تلخ تجربہ کام ودہن اور ہمت کو مزہ دے گیا، علماء واساتذہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا ابوالعرفان ندوی، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی اور متعدد دوسرے علماءِ ندوہ ودیوبند اور بزرگانِ ملت کی شفقت پائی اور مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر سید نورالحسن جیسے عظیم شخص کی سرپرستی پائی۔ ان کے علاوہ متعدد دوسرے بزرگان امت اور دانشوران ملت خاکسار کے محسنوں ومربیوں میں ہیں۔ لیکن یہ طرۂ امتیاز صرف حضرت مقتدا کے سر بندھتا ہے کہ وہ اپنے ایک خورد کی تحریروں کا تعارف اور پرچار کیا کرتے تھے۔ انھوں نے خاکسار کے ایک

مضمون کو اردو سے عربی میں ترجمہ کر کے پہلے اپنے رسالہ جامعہ میں چھاپا پھر الگ کتابچہ بنا دیا۔ اس کی ایسی اشاعت ہوئی اور ایسی تحسین وتوصیف کی کہ ان کے بیان کے مطابق اس کی ایک طباعت ایک عرب ملک میں بھی ہوئی۔ مولانا مرحوم نے ہماری تاریخ اسلامی کے نصابی سلسلے کی جلد اول پر پندرہ صفحات سے زائد پر شاندار تعارف عربی میں چھاپا اور عربوں کو آ گاہ وششدر کیا، اردوداں حلقے میں وہ خاکسار راقم کے سفیر ووکیل تھے اور سب کو پڑھواتے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے افسر ریلوے صرف خاکسار مصنف سے ملنے اور مبارکباد دینے کے لئے تشریف لائے اور دوسروں نے بھی قدم چومے۔ ''تاریخ تہذیب اسلامی'' کے دوسرے حصہ کے وہ اور زیادہ قدرداں تھے لیکن مصروفیت کی وجہ سے اس پر لکھ نہ سکے مگر ہر بار کہا کرتے کہ دوسری جلد پر عربی تعارف لکھنا باقی ہے اور آپ کا وہ قرض بھی اتاردوں گا۔ اپنے احسان کو قرض ذاتی سمجھنے والا اور کوئی ہے۔

ہمارے کرم فرما مولانا عبداللطیف اثری مدظلہ کے زبردست اصرار وتقاضوں سے حضرت مقتدا نے خاکسار کی کتاب ''وحی حدیث'' کا اسی طرح طویل تعارف تحسین وتکریم کی زبان میں کیا تھا۔ وہ حدیث شریف کی اس جہت علمی کے سب سے بڑے قدرداں تھے۔ خاکسار کی کتابوں، رسالوں، مضامین وتحقیقات کی قدر کرتے تھے اور ان پر فخر کرتے تھے، یہ فخر وناز ہمارے لئے باعث ناز ہے۔ ان کی بندہ پروری اور ذرہ نوازی کا سلسلہ اسی پر ختم نہیں ہوتا، وہ خیر مسلسل اور احسان پیہم کے قائل اور اسی پر عمل پیرا تھے، اپنے سیمیناروں میں بلاتے، ہمارے مذاکروں میں تشریف لاکر عزت افزائی کرتے اور مشترکہ سیمیناروں میں دولتِ دل عطا کرتے، ان کے کرم وجود اور احسان واکرام کے سبب جامعہ سلفیہ کے دو بزرگوں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوریؒ اور مولانا عبدالرحمٰن فریوائیؒ سے بالخصوص اور بعض ''مستقیم وغیر مستقیم'' علمائے جامعہ سے محبت آ گیں اور علم پرور روابط استوار ہوئے جو سرمایۂ سعادت ہیں۔

طالب علموں اور علم وتحقیق کے جویاؤں کی سب سے بڑی خدمت غالباً ضروری کتابوں اور مآخذ کی فراہمی ہوتی ہے۔ مولانا مقتدیٰ کو جامعہ سلفیہ میں اور مولانا مرتضیٰ کو ندوۃ العلماء میں ایسا ہی مربی اور سرپرست پایا۔ دونوں کے نام اتفاق سے ہم قافیہ ہیں اور معنی کے لحاظ سے ایک مقتدا اور امام ہے اور دوسرے منتخب وچیدہ، اور دونوں اپنے اپنے مقتدیوں ومحبوبوں کے مربی ہوتے ہیں۔ خاکسار راقم کو کتابوں کی خرید وحصول دونوں کا ''ہوکا'' ہے۔ غالب کے بقول مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے، بلکہ زیادہ بھلا ہے حضرت مقتدا نے عرب ممالک اور دوسرے مقامات سے آنے والی ''کتب ہدایا'' کو تقسیم کرتے وقت خاکسار کا حصہ ضرور نکالا۔ خاکسار راقم صراحت کروالیتا کہ کون سے ہدایا ہمارے کتب خانہ علوم اسلامیہ کے لئے ہیں اور کون سے عطایا خاکسار کے لئے۔ بعد میں ان سے خاکسارانہ شکوہ بڑھتا گیا کہ وہ ان ''کتب ہدایا'' میں ہم دونوں کے حصے نکالنے میں کافی آنا کانی کرنے لگے ہیں۔ وہ معذرت خواہ ہوتے اور اپنے اصل اعذار بیان نہ کرتے کہ ان کے پیچھے دوسروں کے ہاتھ بلکہ دست وپا کارفرما تھے۔ البتہ جہاں تک موقع ملتا اور ممکن ہوتا وہ کتابوں کی فراہمی سے ہاتھ نہ

کھینچتے اور مآخذ ومصادر تو اپنے مرکزی کتب خانے سے عاریۃً دے دیتے یا ان کے فوٹو اسٹیٹ کرا کے بھیج دیتے اور ساتھ کر دیتے۔ اور اس پر مستزاد کہ وہ ان کے مصارف بھی نہ لیتے تھے۔ آئی او ایس کے ایک عظیم الشان پروجیکٹ (منصوبہ) اسلام کے علمی وفنی ورثہ کے تحت سیرت نبوی کے مآخذ پر خاکسار کو متعدد بنیادی کتب سیرت نہیں مل سکیں۔ ان کے کتب خانے میں تھیں اور ان میں سے بیشتر کے فوٹو اسٹیٹ عطا کئے، ضخیم کتابوں کو مستعار دیا۔ زیارتِ جامعہ سلفیہ کے دوران کتب خانہ وقت بے وقت کھلوا دیا اور مطالعہ کا انتظام کیا۔ خاکسار سے تو ان کو محبت وعقیدت بھی تھی، میں نے ان کو اپنے ناقدوں بلکہ بعض بعض حاسدوں اور فتنہ پردازوں کے لئے بھی کتب خانہ جامعہ سے کتابیں مستعار دینے، ان کی نقول فراہم کرنے اور ان کی علمی وفنی مدد کرنے کا بیکراں معاملہ دیکھا ہے۔ خیر کثیر کا یہ سلسلۂ مقتدا عجیب وغریب اور کراماتی لگتا ہے مگر وہ کراماتِ مقتدا ہے کسی غیر وعجیب کی کرامات نہیں ہے۔ طالب علموں، ریسرچ اسکالروں اور معمولی درجے کے جویاؤں کے ساتھ بھی ان کا یہی مربیانہ سلوک رہتا رہا ہے۔ علم وفضل بانٹنے میں بھی وہ سخی داتا تھے اور محبت واحترام سکھانے میں بھی کریم مقتدا تھے۔ اس باب میں ان جیسا کوئی نہ تھا۔

صلاحِ امت اور بہبودِ ملت ان کو بہت عزیز تھی اور اسلام کی اشاعت وترویج اس سے بھی عزیز تر۔ بنارس ہندو یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں اور تبلیغ واصلاح کے اداروں کے ذریعہ منعقد کردہ مفاہمت کے مذاکروں میں خود حصہ لیتے تھی۔ اور جہاں مناسب سمجھتے دوسروں کو ساتھ لے جاتے یا ان کو خود پر ترجیح دیتے تھے، ان کو اپنی عزت وجاہ سے شوکتِ دین عزیز تر تھی۔ ایسے ہی ایک موقعہ پر بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ وتقابلی ادیان کے زیر اہتمام ''سدبھاؤنا دوس'' منانے کا پروگرام ہوا۔ اس کے منتظمین نے مقتدائے جامعہ وامت سے درخواست کی کہ تمام اہم مذاہب وادیان کے مقرروں کی فہرست ہم نے مکمل کر لی ہے لیکن اسلام کے نمائندہ کے معاملہ پر ہم مشکل میں پڑ گئے ہیں، علماءِ کرام اور مشائخ طریقت سب ہی قابلِ احترام اور ہمارے بزرگ ہیں مگر وہ جو زبان بولتے ہیں وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور عوام خاص کر اخبار نویس اور دوسرے لوگ سادہ زبان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا تبصرہ بڑا عبرت ناک اور درس خیز تھا ''مولانا ہمیں ایسا عالم (ودوان) دیجئے جو ہمیں اسلام سمجھائے''۔ مولانا مقتدا نے کافی شرمندگی محسوس کی اور ایسے جوہر قابل کی تلاش کا وعدہ کیا جو عوامی زبان میں اسلام کی تعلیمات بیان کر سکے، آخر کار قرعۂ فال مجھ دیوانے کے نام نکلا اور مولانا نے منتظمین کو بتا کر مجھے حکمِ اذاں دے کر تیار کر لیا کہ ہندوستانی میں بولوں گا۔ خاکسار راقم نے اسی دوران ہندی اردو کی کتابیں پڑھ کر ہندوستانی بولنے کی تھوڑی سی مشق کر لی کہ فرمانِ الٰہی بھی تو قوم کی زبان میں بولنے کا ہے اور اس کی حکمت بتاتا ہے۔ ہمارے ہندی علماء ومشائخ بالعموم اس نسخۂ ہدایت اور حکیمانہ فرمان الٰہی کو نہیں سمجھتے، وقتِ اذان آیا تو خاکسار نے اسٹیج سے سادہ زبان میں اسلام کی بنیادی تعلیمات خاص کر برادران وطن اور دوسرے غیر مسلموں کے نزدیک قابل اعتراض باتوں کی وضاحت کی۔ صدرِ جلسہ سنسکرت یونیورسٹی کے وائس چانسلر

وینکٹ چلم صاحب اور دوسرے صدورِ جامعہ اور معزز شخصیات ڈائس پر تشریف فرما تھے مگر مقتدائے جامعہ نے بہ اصرار سامعین میں بیٹھنا پسند کیا، صدرِ جلسہ نے میری عرض معروض کے بعد مسرت آمیز لہجے میں پوچھا: ''یہ سرل، شدھ اور سندر بھاشا آپ نے کہاں سیکھی؟ تبلیغ کا ایک موثر موقعہ ہاتھ آ گیا، خاکسار نے عرض کیا: ''پنڈت کیشو رام شرما سے جو بعد میں مولانا غلام محمد قاسمی بن گئے تھے''۔ صدر نے حقیر کو کولیوں میں بھر لیا اور فرمایا ''کیا سندر بات کہی ہے، سب نے آپ کا بھاشن سمجھا اور پہلی بار جہاد کا مطلب سمجھ میں آیا'' حضرت مقتدا نے فرمایا کہ ایسی زبان تو ہم علماء نہیں بول پاتے اور مبارکباد دی۔ اصل مبارکباد کے حقدار تو وہ تھے جو واسطہ و وسیلہ بنے تھے۔ مقامی اخبارات اور ان کے عرائض نویسوں نے محبت سے گھیر لیا اور دوسرے دن کے ہندی اخباروں کو اسلامی بھاشن سے بھر دیا۔

وہ تالیف وتصنیف اور ترجمہ وتسہیل کے بھی مقتدا تھے۔ علوم اسلامیہ میں شاید ہی کوئی ان کے قلم سے بچا ہو، اردو عربی میں کثرت سے لکھتے تھے۔ ان کو ایک زود نویس مصنف ومترجم اور ان کے قلم کو ایک سیال قلم بجا طور سے کہا جا سکتا ہے۔ ان کی عربی، اردو تالیفات اور مضامین ومقالات کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہوگی۔ ان میں عام اصلاحی مضامین اور تحقیقات شامل ہیں۔ ان کے گونا گوں مشاغل اور انتظامی مصروفیات کے باوجود اتنے علمی کاموں کا وجود حیرت انگیز امر ہے اور قابلِ رشک بھی۔ دراصل ان کا علم حاضر تھا اور وہ ان کے وسیع وعمیق مطالعہ اور مسلسل کتب بینی کے علاوہ ان کے قوی حافظے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اصلاً مدرس ومعلم اور محقق وجویائے علم تھے اور ہمہ وقت علوم وفنون کے لطائف نکال لانے کے عاشق۔ تعلیم وتدریس کی بنا پر ان کو مسلسل سوالات واشکالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ ان کو تلاش وجستجو کے لئے مہمیز کرتا۔ ان کے موضوعات بڑے گونا گوں اور وسیع الجہات تھے، عام طور پر محقق ومصنفین چند موضوعات ومضامین کے متخصص ہوتے ہیں۔ اصلاحی اور تبلیغی قسم کے مضامین ومقالات میں وہ بڑی سادہ زبان استعمال کرتے اور اپنے عام قارئین کے مذاق وسطح کا خیال کرتے۔ علمی تحقیقات میں ان کی زبان وبیان میں رفعت وصلابت زیادہ ہو جاتی کہ تحقیقات عالیہ کے تقاضے دوسرے اور مخاطب بھی اہل علم ہوتے ہیں۔ خاکسار کا تجربہ ہے کہ ابتدا میں ان کی عربی انشاء خاصی بوجھل اور پیچیدہ ہوتی تھی اور غالباً اس پر عجمی زبان ومزاج کے اثرات تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی عربی انشاء ادبی اور بلند پایہ بنتی گئی اور اس میں ان کی نجی کاوش کے علاوہ ان کے عرب روایانے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ان کے علمی وتصنیفی کارناموں پر دوسرے لائق اہل علم خامہ فرسائی کریں گے کہ وہ ان کا حق ہے اور اس تاثراتی مضمون میں اکی زیادہ جگہ نہیں البتہ سب کو اس سے اتفاق ہوگا کہ ان کے علمی وتحقیقی مقالات ومضامین ہر لحاظ سے معیاری ہوتے تھے اور سب سے خراج تحسین لیتے تھے بحیثیت مصنف ومقالہ نگار ان کو بعض تلخ تجربات بھی ہوئے جیسے سب اہل قلم کو ہوتے ہیں۔ ان کے بعض مقالات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا، مترجم کی حیثیت سے ان کا شکوہ بجا تھا کہ ناشرین یا ان سے زیادہ مراجعہ کرنے والوں نے اصل مصنف کے تعبیرات ہی کو قابلِ گرفت سمجھ کر ان سے تبدیلی کی فرمائش کی جس کو انھوں

نے تحریف سمجھ کر قبول نہیں کیا البتہ ایسے مقامات پر توضیحات لکھ دیں اس کے باوجود بعض اہم تراجم خاص کر شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب قرۃ العینین کے ترجمہ میں رکاوٹوں نے ان کو خاصا کبیدہ خاطر کیا۔

مولانا مقتدیٰ حسن ازہری سے وہ عرب روایت کے مطابق مقتدیٰ یٰسین ازہری بھی بعض وجوہ سے بن گئے تھے۔ ان کے نام ونسب اور نسبت میں اضافہ ہوا ہو یا تبدل یا کمی، ان کی شخصیت اپنی جگہ ویسی ہی بانکی سجیلی اور فطری رہی۔ وہ ہمیشہ مقتدار ہے اور انسانِ مسلم کی طرح مسرتوں کے پھول بکھیرتے رہے۔ خود خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنا ان کا کام تھا، ان کا دوسرا کام لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔ خاکسار راقم کے لئے انھوں نے کئی بار اپنے ہاتھ سے سخت گرمی میں کھانے پکائے۔ یہ ان کا کام تھا۔ بلکہ کام سے زیادہ ان کی فطرت تھی اور یہ فطرتِ صحیحہ بڑی مشکل سے ارزانی ہوتی ہے۔ اس کے جناب الٰہی سے عطا ہونے کی واحد شرط رضائے الٰہی کی خالص طلب ہے جو کتاب وسنت کی مخلصانہ اور والہانہ پیروی کے بغیر کسی کو نہیں ملتی۔ وہ اپنی زبان، اپنے بیان، اپنے کام، اپنے عمل، اپنی تقریر اور اپنی تحریر اور جسم وروح کے ہر عمل وحرکت سے مسرت بانٹتے رہے۔ ان کے تنقیدی تبصروں، زبانی تراوشوں اور نجی گفتگوؤں میں اور اکثر وبیشتر عوامی اور علمی مجلسوں اور خطوط ومکاتیب میں ان کے نمونے ملے ہیں۔ ''ملفوظاتِ مقتدا'' کا کوئی مجموعہ مرتب کرتا تو بڑے بصیرت افروز اور مسرت خیز جملے، لطیفے اور ظریفے اہل ذوق کو ملتے۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی معرکہ آرا اور متنازعہ کتاب پر مولانا عبداللہ عباس ندوی نے جو تبصرہ لکھا اس کا تعاقب خاکسار نے کیا۔ اس پر ایک خاصا تیکھا تبصرہ ایک قاسمی مکتوب الیہ کے نام اپنے گرامی میں یوں کیا کہ ''ایک ندوی دوسرے ندوی کی کاٹ کر رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک دارالندوہ کی مجلس کا ممبر ہے جو رافضیوں کی حمایت کر رہا ہے اور دوسرا اپنے قتل کے درپے ہے''۔

مولانا مقتدا نے خاکسار کو خط کم لکھے اور لکھے تو صرف مطلب کے اور ان میں اپنے مقام ومرتبہ سے زیادہ خاکسار کی رعایت کی۔ وہ خاکسار کے احترام واکرام کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ محبت والفت کے تمام تر روابط وتعلقات کے باوجود ایک دوری بنائے رکھتے۔ خاکسار کو اپنی مصروفیات اور ان سے زیادہ کم آمیز فطرت کے سبب اس دوری کو دور کرنے کی توفیق کبھی نہ مل سکی۔ انھوں نے اپنی بیماری، آزاری اور دکھ درد کو اپنے سینے میں چھپائے رکھا اور اسے خون کے خلیوں میں گردش دیتے رہے۔ اور اس گردشِ بے مہار نے ان کے جسم وروح کو زخمی کر کے ان کو ہم سے چھین لیا۔ ان کے جانے سے بڑا غم اور بڑا قلق ہوا۔ جانا تو ہم سب کو ہے اور ہم سے پہلے بھی بہت جا چکے ہیں لیکن ان کی صحتِ جسمانی، قوتِ بدنی کے سبب خیال تھا کہ ابھی وہ رہیں گے۔ مگر کاتبِ تقدیر کا فیصلہ یہی تھا کہ وہ ہم ارضی مسکینوں کے ساتھ رہنے کے بجائے اپنے رب غفور کی مرضیات کے مسکنوں میں رہیں۔ ہم تو بس یہی کہہ کر اپنے کو تسلی دے سکتے ہیں کہ:

''ہم فیصلۂ رب کریم پر راضی ہیں، راضی برضا بھی ہیں لیکن اے مقتدا تمہارے جانے سے غمگین بھی بہت ہیں''۔



مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ

۱۰/ذی قعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء جمعہ کا دن تھا کہ اچانک جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی وفات کی اندوہناک خبر ملی، یہ خبر خرمن علم وادب پر بجلی بن کر گری اور پورے ملک میں رنج وغم کی ایک فضا پیدا ہوگئی، اور تعلیمی مراکز میں اس المناک حادثہ پر غم وافسوس کا اظہار ایک طبعی بات تھی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ نے مسلم خاندان کے بچوں کی طرح اپنی تعلیم کا آغاز مدرسہ سے کیا تھا، اور قرآن کریم کے حفظ کے ساتھ انہوں نے علوم اسلامیہ میں ایک ممتاز مقام پیدا کیا، مدرسوں کے ماحول سے گزرتے ہوئے اور تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے گزشتہ صدی ۱۹۶۰ء کے دہے میں مزید تعلیم ومطالعہ کے لئے جامعہ ازہر پہونچنے میں کامیاب ہوگئے، وہاں انہوں نے اپنے قیمتی اوقات کو تعلیم ومطالعہ اور مصری اساتذہ سے بھرپور استفادہ میں گزارا، اور عربی زبان وادب کے میدان میں امتیازی شان حاصل کرنے کے لئے جملہ ذرائع ووسائل کو مقصدیت کی روح کے ساتھ پیش نظر رکھا، اور اپنی بلند ہمتی سے کامیابی کی منزل تک پہونچے، اور وہاں سے واپس آکر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی، اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، وہ مسلم یونیورسٹی میں بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں سے شعبۂ عربی کو فائدہ پہونچا سکتے تھے، لیکن ان کے نزدیک زندگی کی کامیابیوں کا معیار یہ نہیں تھا، اس لئے انھوں نے اس جانب کوئی توجہ نہیں کی، اور جامعہ سلفیہ بنارس کی خدمت کو اور وہاں رہ کر طلبہ کی تعلیم وتربیت پر توجہ دینا اپنے لئے باعث سعادت سمجھا، بلکہ واقعہ یہ کہ وہ جامعہ سلفیہ کی وساطت سے دوسرے عرب ملکوں میں بھی معروف ومشہور ہوئے، خاص طور سے سعودی عرب کی جامعات اور وہاں کے علمی مراکز میں اپنے بلند علمی مرتبے کے لئے جانے پہچانے گئے اور وہاں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے پروگراموں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں مدعو کئے گئے، وہ اپنے علمی اور تحقیقی مقالات سے اور اپنے دینی بلند مرتبے سے علمائے عرب کی صفوں میں مقبول ہوئے اور قدر واحترام کی نظر سے دیکھے گئے، وہ خاص طور سے سماحۃ العلامۃ شیخ عبدالعزیز بن بازؒ وہاں کے دار الافتاء والشئون الاسلامیہ کے سربراہ اور مفتی اعظم کی نظروں میں ہندوستان کے ایک بڑے سلفی عالم کی حیثیت سے متعارف ہوئے اور ان کی شفقتوں اور قدردانیوں سے پوری طرح محظوظ ہوئے، یہی وجہ تھی کہ دار الافتاء کے زیر انتظام ایام حج میں توعیہ اسلامیہ کے پروگراموں میں ان کو مدعو کیا جاتا تھا، اور اس میں حصہ لینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے حجاج کو مناسک حج پر آگاہی کے لئے حرم شریف اور دیگر مقامات پر درس کے انتظامات کئے جاتے تھے، اس میں دیگر علماء کے ساتھ ڈاکٹر ازہری صاحب کو خاص طور سے بھیجنے کا نظم ہوتا تھا، توعیہ اسلامیہ کے مدعوئین سے عربی زبان

میں حج کے آداب ومسائل پر مضامین لکھوائے جاتے تھے، اور وہاں کے عربی جرائد میں شائع ہوا کرتے تھے۔

۸۲۔۸۳۔۱۹۸۴ میں مجھ خاکسار کو توعیہ اسلامیہ کی طرف سے مدعو کیا گیا، اور توعیہ کے پروگراموں میں حصہ لینے کا موقع ملا، اتفاق سے تینوں بار مجھے ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کے ساتھ قیام کرنے اور پروگراموں میں حصہ لینے کی سعادت حاصل رہی، حج کے پانچوں دنوں میں منی، مزدلفہ اور عرفات میں بھی ساتھ رہا، وہاں بھی حاجیوں کے خیموں میں جا کر تبادلۂ خیال اور حج کے مسائل وآداب کے بارے میں گفتگو کرنے کے مواقع حاصل رہے، ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ میرا بہت خیال کرتے تھے، اور جب بھی ندوۃ العلماء اور اس کے روح رواں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت نظری اور فکر عالی کا ذکر آتا تو بے ساختہ اپنی محبت وتعلق کا اظہار کرتے، "البعث الاسلامی" کے سلسلہ میں ان کے خیالات بہت اچھے اور قابل قدر تھے، وہ تواضعاً کہتے تھے کہ میں نے البعث الاسلامی سے بہت کچھ سیکھا ہے، اور اس کے نتیجہ میں میں آج جامعہ سلفیہ کی عربی صحافت سے پوری طرح وابستہ ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۵ء میں جب البعث الاسلامی کا سورج طلوع ہوا، اور س کی شہرت ان کے کانوں تک پہونچی تو وہ اس سے راہ راست واقف ہوئے، اس وقت وہ مئو کے مدرسہ "فیض عام" میں زیر تعلیم تھے، اور نہایت سادگی اور تواضع کی زندگی گزارنے والے طلباء میں ان کا شمار تھا، البعث الاسلامی کے دفتر میں ان کا ایک خط آیا کہ آپ نے جو عربی پرچہ نکالا ہے اگر چہ اس کا سالانہ چندہ پانچ روپئے ہے، مجھے بہت شوق ہے کہ میں اس پرچے کا خریدار بنوں، لیکن میرے پاس اتنی وسعت نہیں ہے کہ میں اس کا پورا سالانہ چندہ ادا کرسکوں، اس لئے مجھے ایک طالب علم کی حیثیت سے رعایتی چندہ پیش کرنے اور خریدار بننے کا موقع عنایت کریں، بلا تاخیر ان کے نام پر پرچہ جاری کردیا گیا، اور کافی دنوں تک جاری رہا، اپنی وسعت کے مطابق وہ اپنا رعایتی سالانہ چندہ ادا کرتے رہے، پھر جب وہ جامعہ ازہر سے فارغ ہوکر جامعہ سلفیہ سے عربی زبان وادب کے استاذ کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے تو ان کے دل میں عربی زبان میں ایک رسالہ نکالنے کا داعیہ پیدا ہوا، جامعہ سلفیہ نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی منظوری دے دی، اور ڈاکٹر ازہری کی ادارت میں ایک عربی ماہنامہ جاری ہوگیا انھوں نے مجھے اپنی خاص گفتگو میں بتایا کہ یہ دراصل آپ کے مجلّہ البعث الاسلامی کا فیض ہے، الحمدللہ یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا، اور وہ جامعہ سلفیہ سے نکلنے والے عربی رسالہ کے رئیس التحریر باقی رہے، اور نہ صرف اس کے معیار کو بلند کرنے میں انھوں نے بڑا کردار ادا کیا، بلکہ جامعہ میں عربی زبان وادب میں مہارت پیدا کرنے کا ذوق عام ہوا، اور اس کی ایک فضا پیدا ہوگئی، اور ادیب مرحوم نے اپنی زندگی عربی زبان وادب کے موضوع کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے اور ترقی دینے میں گزاردی، عربی زبان میں تعلیم وتربیت، تحقیق ومطالعہ اور مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کا اہتمام جاری رکھا، انھوں نے پی ایچ ڈی کا رسالہ عربی زبان میں لکھا اور ممتاز حیثیت سے کامیاب ہوئے، یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصنیفات عربی زبان میں ہیں، وہ جامعہ میں اپنے مضامین عربی زبان ہی میں پڑھایا کرتے تھے، اور کبھی اردو میں بھی درس دیا کرتے تھے، وہ تفسیر وحدیث کی کتابیں بھی پڑھاتے تھے، ان کی

تصانیف کی تعداد تقریباً تین درجن کتابوں پر مشتمل ہے، وہ ترجمہ کی مہارت بھی رکھتے تھے اور اردو کتابوں کو عربی میں اور عربی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا فن ان سے سیکھنے میں ان کے شاگرد پوری دلچسپی لیتے تھے، مختلف دینی اور علمی موضوعات پر ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں خاص طور سے اصلاح المساجد، المرأة في الاسلام، الصيام وعيد الفطر من منظور تربوي، رحمة للعالمین کا عربی ترجمہ۔اہل حدیث کی تحریک اس کا مفہوم اور مقصد عربی زبان میں تحریر کیا ہے، مختصر ''زادالمعاد'' کا ترجمہ اردو میں کیا، فتاوی ابن تیمیہ کا ترجمہ اردو میں جاری تھا، عربی صحافت پر خاص طور سے زور دیتے تھے اور طلبہ کو عربی لکھنے، بولنے اور تقریر کرنے کی ترغیب دلاتے تھے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے، وہ اپنے وقت کو زیادہ سے زیادہ علمی اور ادبی کاموں میں استعمال کرتے تھے، ان کے شاگردان سے وقت کی قدردانی اور وقت کی اہمیت کو سیکھ کر اس پر عمل پیرا ہوئے، اس کے نتیجہ میں انہیں کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی توفیق حاصل ہوئی، ان کی وفات کی خبر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پورے ملک میں اور خاص طور سے طبقۂ اہل حدیث میں پہونچ گئی، لوگوں نے ایک دوسرے کی تعزیت کرنا شروع کر دی، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے رنج وغم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، ملک سے باہر دوسرے ممالک میں بھی یہ خبر صاعقہ اثر اسی سرعت کے ساتھ پہونچ گئی، اور ان سے تعلق رکھنے والے حضرات پر حزن وغم کی ایک فضا چھا گئی، واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی رجل رشید اور عالم وادیب کی اہمیت کا اندازہ اس کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہوتا ہے، اور ایک بڑا خلا محسوس کیا جانے لگتا ہے، اکثر دیکھا گیا کہ کسی جانے والے کا خلا پر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، چند دنوں تک رنج وغم کا تذکرہ ہونے کے بعد دامن صبر میں پناہ مل جاتی ہے اور داغ فراق بتدریج مٹ جاتا ہے:

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اس کے باوجود انسان اپنی امتیازی صفات کے ساتھ زندہ رہتا ہے، اس کی مقصدیت، اس کی روح کی بے چینی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کے خوبصورت کارنامے اس کو دوام بخشتے ہیں۔اور اس کی خوبیوں کا چرچا ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم کا اصل وطن شہر مئو تھا، ۱۹۳۹ء میں ان کی پیدائش ہوئی اور والدین کی علمی اور اخلاقی تربیت نے ان کو بلندی عطا کی، اور علم حاصل کرنے کا شوق آخری درجہ تک حاصل ہوا، وہ تحصیل علم میں اس قدر مشغول ہوئے کہ ان کی توجہ کسی اور طرف نہ ہو سکی، اور علم وادب اور دعوت وارشاد میں حصہ لینے کا شوق پوری طرح غالب ہو گیا، اور علم کی راہ میں انہوں نے اپنے آپ کو فنا کر دیا، اور شدید محنت کے باعث وہ ۷۰ سال کی عمر تک پہونچتے پہونچتے دنیائے فانی سے دارالبقاء کی طرف روانہ ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے عفو وکرم اور رحمت ومغفرت کا بہتر سے بہتر معاملہ فرمائیں، اور ان کے درجات بلند ہوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں اور جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ فرمائیں۔آمین



ڈاکٹر عبدالعلی ازہری
مسلم کالج۔لندن

میرے دیرینہ ساتھی مخلص رہنما

وہ شمع بجھ گئی جس نے علم وادب کے ایوانوں میں روشنی پھیلا رکھی تھی۔ وہ بزم اجڑ گئی جس میں تشنگان علوم دینیہ اپنی پیاس بجھانے کا بحر بیکراں پاتے تھے۔ وہ انجمن بکھر گئی جس میں امن وسکون کے متلاشی اپنی راحت کا سامان پاتے تھے۔اب تو ہر طرف گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے، ویرانی ہی ویرانی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ میرے دیرینہ ساتھی، مخلص رہنما ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری کی ناگہانی موت نے یہی سماں پیدا کردیا ہے۔ آپ کی وفات کے بعد بہت سے لوگوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اس سلسلے میں اپنے جذبات کا اظہار کروں یہ میرا فرض تھا کہ میں ان کی عظیم شخصیت کے پوشیدہ رازوں کو لوگوں کے سامنے رکھوں، ان کے انتقال کے بعد کئی مرتبہ قلم اٹھانے کی کوشش کی لیکن قلم حرکت نہ کرسکا۔ ذہن میں یادوں کے دریچے کھلتے اور بند ہوتے رہے، لیکن انھیں کاغذ پر اتار نہ سکا، بچپن سے جوانی، پھر بڑھاپے پر محیط رفاقت کا طویل عرصہ نظروں کے سامنے ہے۔ یقین ہی نہیں ہوتا کہ آپ ہم سے جدا ہوگئے ہیں۔

سہ ماہی ''افکار عالیہ'' نے خصوصی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں اس کے مدیر محترم کا مکتوب گرامی بھی موصول ہوا جس میں حافظ صاحب کی علمی شخصیت اوراس کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے درخواست کی گئی ہے۔ ان کی زندگی کے بارے میں متعدد اہم شخصیات کے اظہار خیال شائع بھی ہو چکے ہیں۔

آج میں نے بڑی ہمت کرکے قلم اٹھایا ہے اور امید کرتا ہوں کہ یہ مقالہ پورا ہوجائے گا، یہ آپ بیتی بھی ہے یار بیتی بھی۔ میری زندگی کے ہر پہلو پر حافظ صاحب کا گہرا اثر ہے۔ میں اپنی شخصیت کو ان کا پرتو سمجھ رہا ہوں، اسی لئے اگر میں اپنے سلسلے میں کوئی بات کہوں تو قارئین اسے غور سے پڑھیں اوراس میں حافظ صاحب کی شخصیت کا اثر تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

میرا اور حافظ صاحب کا ساتھ بچپن سے شروع ہوا اور تقریباً چھپن سال تک قائم رہا، وہ میرے خالہ زاد بھائی تھے،اس رشتے کا خیال رکھتے ہوئے وہ کبھی کبھی ہمارے گھر تشریف لے آتے اور والدہ صاحبہ سے دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ میں ان سے بات کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ پھر مدرسہ عالیہ میں تیسری جماعت میں ہم دونوں کلاس فیلو ہوگئے اور وہیں سے ہماری دوستی اور رفاقت کی بنیاد پڑی اوران کی وفات تک قائم رہی، آپ

نے ابتدائی تعلیم کے بعد حفظ قران کی کلاس میں داخلہ لے لیا اور حفظ مکمل کرنے کے بعد عربی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے، اس وقت وہ سب سے کمسن حافظ تھے، اسی لئے وہ حافظ جی کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ یہ لقب ان کے حلقۂ احباب اور رشتہ داروں میں انھیں کے لئے خاص تھا اسی لئے میں انھیں ''حافظ صاحب'' کے نام سے یاد کرتا ہوں، اگر چہ وہ بعد میں علمی حلقوں میں ''ڈاکٹر صاحب'' اور ''ازہری صاحب'' کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔

حافظ صاحب نے اپنی بعض تحریروں میں اپنی والدہ اور نانا کا تذکرہ کیا ہے، ہمارے نانا مولانا محمد نعمان حاجی عبدالرحمٰن شہید کے صاحبزادے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے حرم شریف کے اندر اللہ تعالیٰ سے اپنی اولاد کے لئے علم ومعرفت کے حصول کی دعا کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبولیت کا شرف بخشا اور ان کے چاروں بیٹے محمد حامد (میرے دادا) محمد نعمان (میرے اور حافظ صاحب کے نانا) محمد ابراہیم اور ابوالقاسم محمد علی (مولانا عبدالعزیز عمری کے والد) سب نے علوم دینیہ میں فراغت حاصل کی اور میاں نذیر حسین سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ چاروں بھائیوں میں مولانا محمد نعمان کو اللہ تعالیٰ نے سب سے بلند مرتبہ عطا کیا، ان کے دو بیٹوں مولانا عبدالسبحان اور مولانا فضل الرحمٰن نے جامعہ دارالسلام سے دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کثیر افراد کو اپنے علم سے فائدہ پہنچایا۔ نانی کے انتقال کے بعد آپ جامعہ دارالسلام کے مؤسسین کی درخواست پر عمرآباد تشریف لے گئے جہاں آپ نے دوسری شادی کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو چار بیٹے اور ایک بیٹی عطا کی، بیٹوں میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور مولانا حافظ حفیظ الرحمٰن عمری اعظمی مدنی قابل ذکر ہیں جو اپنی تحقیقات سے علمی دنیا کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

حافظ صاحب کے والد محترم کا خاندان پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا بقول شخصے وہ سیف وسنان کے ماہر تھے لیکن خالہ مرحومہ کے اس خاندان میں داخلہ کے بعد اس کی قسمت بدل گئی اور اب اس خاندان میں کئی ایک عالم اور فاضل پائے جاتے ہیں، لیکن اس خاندان کا پہلا مبارک پودا حافظ صاحب کا تھا جنھوں نے حفظ قرآن اور دینی تعلیم مکمل کر کے ایک نہ مٹنے والا اثر چھوڑ گئے۔

درحقیقت نانا مرحوم بلکہ حاجی عبدالرحمٰن کے بچوں میں اللہ تعالیٰ نے وہ برکت رکھی تھی کہ اس خاندان کی بچیوں نے مئو کے بہت سے گھرانوں کی تقدیر بدل دی۔

حافظ صاحب نے اپنے مرحوم والد کے حوالے سے ایک دلچسپ بات بتائی۔ وہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے صرف اردو کی تعلیم حاصل کی تھی، جب حافظ صاحب حفظ قرآن کے درس میں قرآن مجید لے کر جو نولکشور لکھنؤ کا طبع شدہ تھا اپنے استاذ کے پاس گئے تو استاذ محترم نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ قرآن کا یہ نسخہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس کے غلاف پر ایک ہندو ''نولکشور'' کا نام لکھا ہوا ہے۔ حافظ صاحب نے گھر واپس جا کر اپنے والد صاحب کو یہ بات بتائی اور انھوں نے برجستہ کہا کہ اپنے استاد سے کہہ دو کہ یہ نام تو غلاف پر ہے لیکن قرآن کے اندر قارون، فرعون،

ہامان، ابلیس اور شیطان کا ذکر ہے اس کا کیا کیا جائے؟

مدرسہ عالیہ میں تیسری جماعت مکمل کرنے کے بعد میں مدرسہ فیض عام منتقل ہوگیا۔ پھر دو مہینے کے بعد ماموں مولانا فضل الرحمٰن عمری کی کوششوں سے جامعہ رحمانیہ بنارس چلا گیا جہاں صرف گنے چنے لڑکوں کو داخلہ ملتا تھا، کسی ایک طالب علم کے چلے جانے سے ایک جگہ خالی ہوئی تھی اور مجھے لے لیا گیا۔ دراصل والدہ مرحومہ میری تعلیم کے سلسلے میں کافی فکرمند رہتی تھیں اور مجھے اپنے والد کی طرح عالم بنانے کا خواب دیکھا کرتی تھیں۔ اور اپنے بھائی فضل الرحمٰن اور چچازاد بھائی مولانا عبدالعزیز عمری سے ہمیشہ درخواست کرتی رہتی تھیں کہ کسی اچھے مدرسے میں مجھے داخل کرادیں۔

میں بنارس چلا گیا، حافظ صاحب مئو میں رہ گئے، پھر بھی ہمارا رشتہ قائم رہا میں جب بھی مئو جاتا ملاقات ہوتی۔ پھر دو سال کے بعد مجھے گھر کی پریشانیوں کے باعث تعلیم چھوڑنی پڑی۔ میں نے دو سال گھر کے کام کاج میں حصہ لے کر گزارا اور گھر کی حالت اللہ کے فضل و کرم سے بہتر ہوگئی، کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ میں دوبارہ مدرسہ کا رخ کروں گا لیکن شاید میری والدہ اپنے رب سے اپنی خواہش پوری کرنے کی دعا کر رہی تھیں۔

مدرسہ فیض عام کے مہتمم مولانا محمد احمد۔ رحمہ اللہ۔ ایک زبردست عالم ہونے کے ساتھ انتہائی مدبر، دوراندیش اور مردم شناس شخص تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب کو جو اس وقت فیض عام میں زیر تعلیم تھے، مستقبل میں مدرسہ کی باگ دوڑ سنبھالنے کے لئے، تیار کرنے کی خاطر ماہوار پندرہ روپئے کا وظیفہ دے رکھا تھا اور مدرسہ سے کھانا جاری کروادیا تھا۔ حافظ صاحب نے ۱۹۶۰ء میں الٰہ آباد بورڈ میں عالم کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا تھا جس کے بعد ناظم صاحب نے ان کو وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ایک مدرسہ مرکز العلوم کے نام سے تھا جہاں یوپی بورڈ کے امتحانات کی تیاری بڑی مہارت سے کرائی جاتی تھی اور طلبہ چاہے پڑھائی میں کیسے بھی ہوں امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کرتے تھے۔ میرے کچھ ساتھی ٹانڈہ جانے کا منصوبہ بنا رہے تھے ان میں برادر محترم مظہر احسن ازہری بھی تھے۔ اچانک میرے دل میں خیال ابھرا کہ میں بھی ان کے ساتھ ٹانڈہ جاؤں۔ حافظ صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے میرا تذکرہ ناظم مولانا محمد احمد سے کیا، ناظم صاحب کئی بار مدرسہ عالیہ میں میرا امتحان لے چکے تھے اور تھوڑی بہت واقفیت ان کو میرے بارے میں تھی، انھوں نے حافظ صاحب سے کہا کہ اسے یہاں لاؤ، حافظ صاحب مجھے لے کر گئے۔ ناظم صاحب نے فرمایا: ''مجھے اپنے علاقہ (مئو میں پورب کا حصہ) سے کوئی امید نہیں، یہاں کے لوگ لکھنے پڑھنے سے دلچسپی نہیں رکھتے پچھم کے لوگوں کے اندر پڑھائی لکھائی کا شوق ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ لوگ تعلیم مکمل کرکے مدرسہ فیض عام کی دیکھ بھال کریں اور اسے ترقی دیں''۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ ٹانڈہ آپ کیوں جا رہے ہیں یہیں فیض عام میں پڑھیے فی الحال آپ کو پانچ روپیہ ماہانہ وظیفہ ملے گا اور مدرسہ سے کھانا بھی ملے گا، اس

طرح آپ کے گھر والوں پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا لیکن شرط یہ ہے کہ آپ عالم کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوں اس کے بعد آپ کو بھی مقتدیٰ حسن کی طرح پندرہ روپیہ وظیفہ ملنے لگے گا۔

اس طرح دوبارہ میں اور حافظ صاحب ایک مدرسہ میں اکٹھا ہو گئے لیکن بدقسمتی سے یہ ساتھ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا، حافظ صاحب کی یہ عادت تھی کہ کوئی مسئلہ ہو اس میں آگے آگے رہتے تھے ایک دن مدرسہ کے طلبہ نے یہ شکایت کی کہ باورچی نے دوپہر کا بچا ہوا چاول شام کے کھانے میں ملا دیا ہے اس لئے طلبہ کھانا نہ لیں۔ حافظ صاحب کو جب معلوم ہوا تو آپ نے بھی طلبہ کی تائید کی اور چونکہ اس طرح ہر مسائل میں اونچی آواز میں بولتے تھے اس طرح ان لوگوں کی آوازیں دب گئیں جنھوں نے یہ آواز اٹھائی تھی پھر کسی نے ایک اعلان لکھ کر دیوار پر چسپاں کر دیا کہ طلبہ کھانا مطبخ سے نہ لیں۔ کسی نے کھانا نہیں لیا۔ یہ ایک طرح کی اسٹرائک تھی۔ ناظم صاحب اسٹرائک سے بہت ڈرتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے طلبہ نے کسی مسئلے پر اسٹرائک کی تھی جس کے نتیجہ میں متعدد طلبہ کا مدرسہ سے اخراج عمل میں آیا تھا۔

ناظم صاحب کو اطلاع ملی تو وہ دوڑے ہوئے مدرسہ میں آئے۔ اور حالات کا پتہ لگانا شروع کیا۔ کچھ شرپسندوں نے حافظ صاحب کا نام بطور سرغنہ لے لیا حالانکہ نہ انھوں نے یہ تحریک چلائی تھی اور نہ اعلان لکھنے میں کوئی حصہ لیا تھا۔ ناظم صاحب نے اساتذہ کے ساتھ میٹنگ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ حافظ صاحب کا وظیفہ روک دیا جائے مدرسہ سے اخراج یا کھانا بند کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا، حافظ صاحب نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی اور ایک طویل خط ناظم صاحب کو لکھا جس میں حقیقی صورت حال رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا ناظم صاحب پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ حافظ صاحب کے والد ماجد کو جب واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے بھی ناظم صاحب کی طرح ایک اٹل فیصلہ کیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ اب تم وہاں نہیں پڑھو گے۔ حافظ صاحب دارالحدیث منتقل ہو گئے۔ یہ ان کا آخری سال تھا۔ انھوں نے فراغت مولانا عبداللہ شائق کے مدرسہ دارالحدیث سے کی جو فیض عام کا حریف سمجھا جاتا تھا۔ حافظ صاحب کے فیض عام چھوڑ دینے پر ناظم صاحب پر جو گزری اور جو دھچکہ لگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، انھوں نے مجھے بار بار بلا کر نصیحت کرنی شروع کر دی لیکن کبھی حافظ صاحب کی شان میں نازیبا الفاظ نہیں استعمال کئے، یہ کام ان کے نائب اور کمیٹی کے ایک ممبر کے حصہ میں آیا اور جب بھی یہ لوگ حافظ صاحب کے خلاف کوئی لفظ منھ سے نکالتے ناظم صاحب انھیں سختی کے ساتھ خاموش رہنے کا حکم دے دیتے۔

فیض عام میں ہمارے ساتھیوں میں مدرسہ اسلامیہ بھوارہ، مدھوبنی بہار کے چند بہت ہی مخلص، وفا شعار احباب تھے جن میں حافظ ثناء اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حافظ ثناء اللہ نے بہت زور لگا کر حافظ صاحب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ بھوارہ کے مدرسہ میں مدرس کے فرائض انجام دیں۔ حافظ صاحب چلے گئے لیکن چند مہینوں کے بعد جب مئو واپس آئے تو مولانا شمس الحق - رحمہ اللہ -

نے ان کو فیض عام میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لئے روک لیا۔ظاہر ہے یہ کام ناظم صاحب کے اشارے پر ہوا تھا۔ پچاس روپے مشاہرہ پر آپ نے فیض عام میں کام کرنا شروع کردیا۔ اتنی مختصر تنخواہ کافی نہیں تھی اس لئے مدرسہ سے واپسی پر گھر پر بھی کچھ کام کرنا پڑتا تھا۔ نیز ہر سال رمضان میں تراویح پڑھانے کی خاطر سفر کرتے تھے آپ جس علاقہ میں جاتے تھے وہ بھی غریب علاقہ تھا۔ان کی مدد بھی بہت معمولی ہوا کرتی تھی۔

فیض عام میں حافظ صاحب کی واپسی کے بعد ہم لوگوں کی زندگی کا ایک سہانا دور شروع ہوا۔ اس وقت مدارس عربیہ میں دو وقت پڑھائی ہوتی تھی صبح چھ یا سات بجے سے گیارہ بجے تک، پھر کھانے اور نماز کے وقفہ کے بعد ڈیڑھ بجے سے عصر کے وقت تک، بیچ کے وقفہ میں مدرسہ سے گھر جانا اور پھر واپس آنا مشکل تھا اس لئے حافظ صاحب وہیں مدرسہ میں رک جاتے تھے۔ میرے ساتھ ہماری خاندان ہی کے دو اور لڑکے زیر تعلیم تھے اور ان کو بھی مطبخ سے کھانا ملتا تھا۔حافظ صاحب کچھ پکانے کا سامان گھر سے لے آتے تھے مدرسہ کا کھانا بہت ہی معمولی ہوتا تھا۔ دال روٹی اور چاول، روٹی اور چاول چبائے بغیر کھا لینے میں عافیت تھی ورنہ روٹی میں مٹی اور چاول میں کنکر اتنی وافر مقدار میں ہوتے تھے کہ دانت ٹوٹنے کا خطرہ تھا۔لیکن مطبخ کی دال لاجواب ہوتی تھی۔ دال کے ساتھ سالن کی طلب ہوتی تھی لیکن اتنی بساط نہیں تھی کہ ہوٹل سے سالن خریدا جائے۔ روضہ کے مقام پر ایک ریسٹورنٹ تھا لیکن اس کا مالک بغیر روٹی کے صرف سالن بیچنے پر تیار نہ تھا۔اس کے خلاف ہم لوگ طرح طرح کی اسکیمیں بناتے رہے لیکن کبھی کسی اسکیم پر عمل نہیں ہوا۔ حافظ صاحب کبھی کبھی گھر سے آٹا لاتے تھے پھر اس کا حلوہ بنا کر منھ کا ذائقہ تبدیل کیا جاتا۔ایک آنہ کا گھی اور کچھ شکر، حافظ صاحب اپنی مہارت سے حلوہ تیار کرتے جس کی مقدار تو کم ہوتی تھی لیکن منھ کافی دیر تک میٹھا رہتا تھا۔

میں نے حافظ صاحب سے کوئی کتاب نہ پڑھی لیکن آپ نے مقامات حریری کا امتحان لیا تھا۔

اس دوران ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا، جس نے ہماری تعلیمی زندگی کا رخ بدل دیا اور ہمیں ایک نئی راہ ملی۔ وہ مصر جانے کی جدوجہد کا مرحلہ تھا، ۱۹۶۲ء میں سعودی عرب کی طرف سے مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کے قیام کا منصوبہ منظر عام پر آیا جس کا بڑا شور و غلغلہ مچا، میں نے ایک مجلس میں مئو کے کچھ علماء کو یہ کہتے سنا کہ اب جامعہ ازہر کا خاتمہ ہوجائے گا، ایک نئی اسلامی یونیورسٹی کھل گئی ہے وہی تمام علوم اسلامیہ کا مرکز بنے گی اور ازہر کو کوئی نہیں پوچھے گا، جب جامعہ اسلامیہ میں داخلہ کا اعلان ہوا تو مولانا محمد احمد ناظم مدرسہ فیض عام نے اپنی طرف سے جمعیت اہل حدیث کے سبھی بڑے عہدیداروں -صدر، ناظم اور اراکین- کو میرے سلسلے میں خط لکھ کر ان سے سفارش کی کہ اس لڑکے کے داخلہ کے لئے کوشش کریں، تمام بزرگوں کا جواب معذرت کی شکل میں آیا اور یہ کہہ کر دامن چھڑا لیا گیا کہ ہمیں اس سلسلے میں کوئی اختیار

حاصل نہیں۔ بعد میں ان سب ہی رؤسائے جمعیت کے لڑکے یا منظور نظر افراد مدینہ تشریف لے گئے۔ ایسے لوگ بھی گئے جن کی عمر داخلہ کے لئے شروط عمر سے تجاوز کر گئی تھی لیکن عمر گھٹا کر اور جھوٹ بول کر ان کو امیدواروں کی فہرست میں شامل کیا گیا اور ایسے لوگ بھی گئے جن کی علمی صلاحیت صفر تھی، مجھے بالکل خبر نہیں تھی کہ ناظم صاحب میرے لئے کوشش کررہے ہیں جب انھیں ہر طرف سے ناکامی ہوئی تو مجھے بلا کر اطلاع دی کہ میں نے تمہیں مدینہ منورہ کی یونیورسٹی میں بھیجنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا اور مجھے پورا یقین ہے کہ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ ناظم صاحب کا یہ آخری جملہ قرآن کریم کی آیت کا ترجمہ تھا:"وعسی تکرھوا شیئا وھو خیر لکم" اس جملے نے میرے دل میں یہ بات بٹھادی کہ جب بھی کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس میں کامیابی نہ ہو تو رنجیدہ نہیں ہونا چاہئے اور یہ یقین کر لینا چاہئے کہ مدبر کائنات نے اس سے بہتر کوئی چیز ہمارے لئے لکھ دی ہے۔

جامعہ ازہر میں داخلہ کی تحریک برادرم مظہر احسن نے شروع کی تھی، وہ بھی مدینہ منورہ جانے کی کوشش کررہے تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے شاہ سعود بن عبدالعزیز کو براہ راست خط لکھا تھا جس کا جواب انھیں یہ ملا کہ اس سلسلے میں دہلی میں سعودی سفارتخانہ سے رجوع کیا جائے۔ برادرم مظہر فیض عام سے فارغ ہونے کے بعد مزید علم کے حصول کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، وہ دارالعلوم دیوبند پہنچے اور وہاں ان کی ملاقات جامعہ ازہر کے مندوب شیخ عبدالوہاب مصری سے ہوئی جنھوں نے انہیں ازہر جانے کی دعوت دی مظہر صاحب سے شیخ صاحب کی خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پھر مظہر صاحب نے حافظ صاحب سے اس کا تذکرہ کیا اور وہ بھی میدان میں آگئے۔

جامعہ ازہر کے ایک اور مندوب شیخ عبدالتواب اسماعیل بریلی میں احمد رضا خاں صاحب کے مدرسہ میں تھے۔ شیخ عبدالوہاب کے توسط سے حافظ صاحب سے ان کا رابطہ ہوا اور خط وکتابت کا سلسلہ شروع ہوگیا انھوں نے بھی حافظ صاحب کی خواہش کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ پاسپورٹ حاصل کرنے کی کاروائی شروع کردو۔ اس وقت پاسپورٹ حاصل کرنا اور وہ بھی ایک مسلمان کے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا، مگر علم کے ان متوالوں نے کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر جدوجہد شروع کردی۔ تمام کارروائی اعظم گڈھ میں ہوئی تھی اعظم گڈھ میں ایک ایجنٹ سے ملاقات ہوگئی اور اس نے کام شروع کردیا۔ ان لوگوں کو کوئی معلومات نہیں تھیں اس لئے ایجنٹ کے اشاروں پر کام کرنا پڑتا تھا لیکن ایجنٹ ایماندار تھا اس نے کام پورا کرادیا اس میں تاخیر ضرور ہوئی لیکن پاسپورٹ بن گیا۔ اسی دوران میں نے ان دونوں بھائیوں سے عرض کیا کہ میں بھی مصر جانا چاہتا ہوں انھوں نے جواب دیا کہ ناظم صاحب تم کو وظیفہ دے کر پڑھارہے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ تم پڑھائی مکمل کرکے مدرسہ کی ترقی کے لئے کام کرو اس لئے تم پہلے ان سے اجازت لے لو پھر پاسپورٹ کی درخواست دی جائے گی۔ میں ناظم صاحب

سے ملا اور اپنا مدعا ان سے بیان کیا۔ اس اللہ کے مخلص بندے نے بلاکسی تردد کے یہ الفاظ زبان سے نکالے: ''میں کبھی بھی آپ کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ آپ شوق سے مصر جانے کی تیاریاں شروع کردیں''۔

ناظم صاحب نے جس فراخ دلی سے اجازت دی اور میری حوصلہ افزائی کی اس کے لئے میں اللہ رب العزت کے حضور یہ دعا کرتا ہوں کہ خداوند! تو اپنے اس نیک بندے کی ساری خطائیں معاف فرما اور اس نے میرے اوپر جو احسانات کئے ہیں ان کے اجر عظیم انھیں عطا کر۔ جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے اور ان کے درجات کو بلند کر۔ آمین

میری درخواست پاسپورٹ کے لئے پڑگئی اور میرا بھی اعظم گڈھ آنا جانا شروع ہوگیا، میرے دونوں پیش رووں کے پاسپورٹ بن کر آگئے۔ چونکہ میں نے تاخیر سے کارروائی شروع کی تھی اس لئے میرا پاسپورٹ دیر سے ملا میں نے عبدالتواب اسماعیل سے مراسلت شروع کردی اور انھوں نے میری کافی حوصلہ افزائی کی۔

پاسپورٹ ملنے کے بعد میں بھی سامان لے کر بریلی پہنچا تاکہ شیخ عبدالتواب سے ملاقات کروں اور قاہرہ کے لئے روانہ ہوجاؤں۔ میرے دونوں بزرگ بھائی قاہرہ جاچکے تھے، انھوں نے بحری جہاز سے سفر کیا کیونکہ وہ ہوائی سفر کے مقابلہ میں سستا تھا۔ میں جب بریلی پہنچا تو شیخ عبدالتواب اسٹیشن پر حافظ سعید عابدی کو دہلی کے لئے ٹرین پر بٹھا کر اپنے کمرے میں پہنچے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہا کہ تم بھی دہلی چلے جاؤ۔ میں بھی بھاگتا دوڑتا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور اسی ڈبے میں سوار ہوا جس میں حافظ صاحب تھے یہ میری میرے مستقبل کے دوست اور مخلص ساتھی حافظ سید سعید حسن عابدی سے پہلی ملاقات تھی۔

دہلی میں میں اپنے ماموں زاد بھائی پروفیسر نورالحسن سے ملا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے مصری سفارتخانے لے چلیں انھوں نے منظور کرلیا اور مجھے لے کر مصری سفارتخانہ گئے اور مصری ملحق ثقافی سے ملاقات کی۔ پروفیسر نورالحسن نے اپنی محنت اور لگن سے تعلیمی میدان میں کامیاب حاصل کی اور دہلی یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر اور ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ بنے۔ وہ میرا اور حافظ صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی میں آجاؤں اور عربی ڈپارٹمنٹ میں کام کروں۔ ۱۹۸۷ء میں عربی ڈپارٹمنٹ میں ریڈر کی جگہ خالی ہوئی تو انھوں نے فوراً درخواست کا فارم مجھے بھیج دیا، لیکن اس وقت میں سفر پر تھا۔ واپسی تک تاریخ ختم ہوچکی تھی لیکن میں نے فارم بھر کر فورا بھیج دیا اور انھوں نے میری درخواست رجسٹرار سے کہہ کر داخل کرائی لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد ان کا عارضۂ قلب کی وجہ سے انتقال ہوگیا اور ایک نہایت ہی قابل اور باصلاحیت شخص ہم سے جدا ہوگیا۔ ان کے انتقال کے بعد میری دہلی جانے کی خواہش سرد پڑگئی۔

میرے دونوں بھائی جو قاہرہ پہنچ گئے تھے اور وہاں سے میری راہ نمائی کرتے رہے، انھوں نے سفر کے دوران پیش آنے والی تکلیفوں کا ذکر کیا۔ پانی کے جہاز کا سفر ایک ہفتہ میں ختم ہوا تھا۔ انھوں نے مجھ کو ہدایت کی کہ

جیسے بھی ہو میں ہوائی جہاز سے سفر کروں۔ میں بمبئی پہنچا وہاں ایک ایجنٹ نے میری مدد کی۔ اس زمانہ میں سفر کے لئے طرح طرح کی منظوری درکار ہوتی تھی۔ ایک اہم دستاویز PForm کے نام کی تھی جس کے بغیر باہر جانے کا ٹکٹ نہیں خریدا جاسکتا تھا۔ یو پی کے باشندوں کے لئے اس کا ہیڈ آفس کانپور تھا۔ میں بمبئی پہنچ گیا تھا کسی طرح ایجنٹ نے اس مسئلے کو حل کیا۔ اس وقت رابطہ قائم کرنے کے لئے صرف خط وکتابت کا وسیلہ تھا، فون کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ میں نے ایجنٹ کے اندازے کے مطابق اپنے بھائیوں کو اطلاع دے دی کہ میں فلاں دن قاہرہ پہنچ رہا ہوں وہ لوگ ایر پورٹ آئے اور مجھے نہ پا کر واپس لوٹ گئے۔ میں جب قاہرہ پہنچا تو ان کو اطلاع نہیں تھی اس لئے کوئی مجھے لینے کے لئے نہ آسکا۔

سفر کے دوران کیرالا کے ایک مسلمان تاجر سے ملاقات ہوگئی جن سے کافی مدد ملی وہ اردو نہیں بول سکتے تھے۔ تھوڑی بہت انگلش جو مجھے آتی تھی اسی میں گفتگو ہوتی رہی۔ قاہرہ پہنچنے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ مجھے مدینۃ البعوث جانا ہے۔ انھوں نے ایک ٹیکسی بلائی اور مجھے اس میں بٹھادیا۔ مدینۃ البعوث پہنچنے کے بعد میں گیٹ کیپر کو بتا رہا تھا کہ میرے دو بھائی مقتدیٰ حسن اور مظہر احسن یہیں رہتے ہیں، مجھے ان کے پاس جانا ہے۔ اتنے میں ایک پاکستانی طالب علم شمس القمر نمودار ہوئے اور مجھے دیکھ برجستہ پوچھا۔ تم مظہر کے بھائی ہو؟ میں نے جواب دیا ہاں، انھوں نے وہیں سے بلند آواز میں مظہر صاحب کو بلایا جو ۱۴ نمبر کی عمارت میں گیٹ سے متصل کمرے میں رہتے تھے۔ حافظ صاحب کا کمرہ عمارت نمبر ۹ میں تھا مظہر صاحب نیچے اترے اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ حافظ صاحب کو اطلاع ملی تو وہ دوڑے ہوئے آئے اس طرح ہم تینوں قاہرہ میں اکٹھا ہوگئے۔ ہمارا مثلث بن گیا جس کے تینوں زاویے بہت ہی مضبوط تھے، اس مثلث کا ہر زاویہ جہاں بھی رہا اور جس کام میں ہاتھ ڈالا اس میں کامیابی ہوئی، قاہرہ کے قیام کے دوران ہم لوگ تمام دوسرے ہندوستانی طلبہ سے ہر میدان میں آگے رہے۔

پھر ۱۴ نمبر میں مجھے بھی کمرہ مل گیا۔ حافظ صاحب جس عمارت میں مقیم تھے وہ قریب ہی تھی۔ روزانہ ملاقات ہوتی اور ساتھ ہی جامعہ ازہر جاتے تھے مطبخ سے جو کھانا ملتا تھا وہ ہم لوگوں کے ذوق کا نہیں ہوتا تھا بالکل پھیکا بے مزہ۔ جس طرح فیض عام کی دال لاجواب تھی اسی طرح مدینۃ البعوث کا چاول انتہائی لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا تھا۔ تندوری نان ملتی تھی کبھی تازہ اور کبھی باسی اسے ہیٹر پر گرم کرکے کھانے میں مزہ آتا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اسے چبا کر کھایا جاسکتا تھا۔ مسئلہ سالن کا تھا۔ کوئی سبزی شوربے کے ساتھ ملتی تھی جس میں نمک کے علاوہ کوئی مسالہ نہیں ہوتا تھا سب سے خراب گوشت کی وہ بوٹی ہوتی تھی جو سالن کے ساتھ ملتی تھی۔ وہ کسی بھی طرح ہماری حلق سے نہیں اترتی تھی۔ اسے کھانے کے لائق بنانے کے لئے مسالہ ڈال کر دوبارہ تیار کیا جاتا تھا۔ اس وقت تک ہم لوگوں میں سے کسی کا داخلہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو

ہندوستانی مدارس کی ڈگریوں کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھی اور ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ کس کلاس میں ان لوگوں کو رکھا جائے۔ وظیفہ پہنچنے کے ساتھ جاری ہوجاتا تھا لیکن داخلہ نہ ہونے کی وجہ سے صرف پانچ مصری پاؤنڈ ہر ماہ ملتا تھا جس میں سے زیادہ تر پیسہ مسالہ جات اور گھی وغیرہ کی خریداری میں صرف ہوجاتا تھا۔ جب داخلہ ہوگیا تو وظیفے کی رقم سات پاؤنڈ ہوگئی وہ بھی کافی نہیں تھی۔ اس لئے آمدنی کے دوسرے ذرائع کی تلاش رہتی تھی، ایک ذریعہ قاہرہ ریڈیو کے اردو پروگرام کا تھا۔ کبھی کبھی کسی پروگرام میں حصہ لینے کا موقع مل جاتا تھا اور ڈیڑھ دو پاؤنڈ مزید مل جاتے تھے۔ اردو پروگرام میں حصہ لینے کی وجہ سے ہماری ملاقات اس میں کام کرنے والے ساتھیوں سے ہوتی جس میں سب سے نمایاں نام شعیب نگرامی کا ہے۔

شعیب نگرامی ندوۃ العلماء میں شیخ التفسیر مولانا محمد اویس ندوی نگرامیؒ کے صاحبزادے ہیں بہت ہی ملنسار اور خوش طبع، ہر ایک کی مدد کے لئے تیار، کسی کا کوئی بھی کام ہو شعیب بھائی اس کی مدد کے لئے ہر جگہ بلا تردد چلے جاتے اور اس کا کام کروادیتے تھے۔ انھوں نے میری جس طرح بے لوث مدد کی ہے میں اس کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ مختصر الفاظ میں یہ سمجھ لیجئے کہ قاہرہ میں جو کچھ میں نے حاصل کیا وہ سب شعیب بھائی کی مدد اور راہ نمائی سے ملا۔ انھوں نے مجھے ڈھکیل کر امریکن یونیورسٹی میں بھیجا۔ جہاں سے میرے لئے آگے کی راہیں کھلتی گئیں۔

میرے قاہرہ پہنچنے سے پہلے ہی حافظ صاحب کی شعیب بھائی سے ملاقات ہوچکی تھی اور ان کے درمیان دوستی کا رشتہ اچھا خاصہ مضبوط ہوچکا تھا جو حافظ صاحب کی زندگی کے آخر تک قائم رہا۔ دوستی کی بنیاد پان کے بٹوے پر تھی۔ حافظ صاحب مئو میں پان کھاتے تھے۔ یہ عادت انھیں وراثت میں والدین سے ملی تھی۔ ان کے گھر میں پان کھانے کی عادت برسوں پرانی تھی۔ جب وہ قاہرہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ پان کھانے کا رواج نہیں ہے نہ وہاں پان کی دوکان تھی نہ کوئی اس سے واقف تھا۔ اتنے میں شعیب بھائی اپنا پان کا بٹوہ لے کر نمودار ہوئے اور حافظ صاحب کو رسد کا سامان مل گیا اور ایک پان کا ہم سفر دستیاب ہوگیا۔ شعیب بھائی پان کھانے کی عادت لکھنؤ سے لے کر آئے تھے۔ پان کا پتہ مصر میں نایاب تھا اس کو چھوڑ کر اس کے اجزاء ترکیبی کا پتہ لگایا گیا اور سب چیزیں مل گئیں۔ بٹوے میں چھالیہ، کتھا، چونا اور تمباکو ہوتا تھا جو ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ دونوں ساتھیوں کے پاس الگ الگ بٹوہ تھا جو ان کے بریف کیس میں رہتا تھا۔ اس بٹوے نے ان لوگوں کی دوستی مضبوط سے مضبوط تر کردی۔ جہاں ملاقات ہو سب سے پہلے بٹوہ کھلتا تھا اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پہنچتا تھا۔

شعیب بھائی سے حافظ صاحب کی دوستی اتنی گہری ہوگئی کہ ان کو شعیب بھائی سے ملے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ شعیب بھائی جامعۃ القاہرہ میں پڑھتے تھے اور وہیں ہوسٹل میں رہتے تھے۔ مدینۃ البعوث سے جامعۃ القاہرہ کا فاصلہ کافی لمبا تھا، ڈائرکٹ کوئی بس نہیں تھی، بیچ میں بس بدلنی پڑتی تھی پھر بھی حافظ صاحب تمام پریشانیوں کو نظر

انداز کرتے ہوئے جامعہ القاہرہ پہنچ جاتے تھے۔ آپ آئے دن قاہرہ ریڈیو کی بلڈنگ پہنچ جاتے اور ترجمہ کرنے میں شعیب بھائی کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ریڈیو پر میرا تقرر ہو گیا۔ حافظ صاحب وطن لوٹنے کے لئے بے چین تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کو کام مل جائے تا کہ کچھ پیسے ہاتھ آ جائیں اور وہ گھر والوں کے لئے کچھ خریدی کر سکیں میں نے سیکشن کے انچارج سے درخواست کی کہ میری جگہ میرے بھائی کو دیدی جائے لیکن یہ بات اس کو پسند نہیں آئی اور مجھے آفر قبول کرنا پڑا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد حافظ صاحب کا بھی تقرر ہو گیا۔

۱۹۶۶ء میں ہم لوگوں نے کلیة اصول الدین سے ایم۔اے کر لیا اور حافظ صاحب نے ۱۹۶۷ء میں وطن واپسی کا پروگرام بنایا، لیکن جون میں اسرائیل اور عرب ممالک میں جنگ چھڑ گئی اور حافظ صاحب کو اپنا پروگرام ملتوی کرنا پڑا، پھر ۱۹۶۸ء کے شروع میں مصر میں پانچ سال قیام کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے۔

حافظ صاحب کے قاہرہ چھوڑنے کے بعد میں اور مظہر صاحب رہ گئے۔ میری دیکھ بھال کی ذمہ داری شروع ہی سے مظہر صاحب نے سنبھال رکھی تھی، چونکہ ہم دونوں ایک ہی عمارت میں رہتے تھے اس لئے کھانا پینا سب ساتھ ہوتا تھا۔ میں اور حافظ صاحب ریڈیو قاہرہ کے اردو پروگرام میں کام کر رہے تھے۔ اس وقت ہندی میں نشریات کا سلسلہ نہیں شروع ہوا تھا۔ ہندوستانی سفارتخانہ سے بار بار یہ اصرار ہو رہا تھا کہ ہندی زبان میں بھی پروگرام کا سلسلہ شروع ہو، مصری وزارت اعلام نے فیصلہ کیا کہ ہندی نشریات بھی شروع کی جائیں۔ اس کے پہلے اناؤنسر مظہر صاحب متعین ہوئے اس طرح ہم تینوں مئو والے قاہرہ ریڈیو پر کام کرنے لگے۔

۱۹۶۹ء میں مظہر صاحب کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اور وہ چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی روانگی کے وقت میں قاہرہ ایرپورٹ پر زار وقطار روتا رہا۔ مظہر صاحب نے جس طرح میرا خیال رکھا اور دیکھ بھال کی میں اس کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کو کھانا پکانے کا شوق تھا لیکن کھانے کا نہیں وہ پکاتے تھے اور میں کھاتا تھا۔ عید کے موقع پر ہمارے گھر میں طرح طرح کے پکوان بنتے تھے اور ہندوستانی طلبہ اس دن کا انتظار کرتے تھے۔ مہمانوں کی بھیڑ لگی ہوتی تھی۔ ان کو صرف اس وقت ''شاہی ٹکڑا'' ملتا تھا جس کو تیار کرنے میں ہمارے ایک ساتھی کو کافی مہارت حاصل تھی۔

مظہر صاحب کی روانگی کے وقت یہ مسئلہ کھڑا ہوا کہ میرے ساتھ فلیٹ میں کون رہے گا۔ ہم لوگوں نے مدینۃ البعوث چھوڑ کر دو کمروں کا ایک فلیٹ کرایے پر لے لیا تھا۔ حافظ سعید عابدی نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ وہ ہم لوگوں کے بعد قاہرہ پہنچے تھے لیکن بہت جلد ہی وہ ہمارے گروپ کے ممبر بن گئے۔ اور قاہرہ ریڈیو پر اردو پروگرام میں کام کرنے لگے۔ عابدی صاحب بہت ہی ملنسار وفا شعار اور جرأت مند انسان ہیں، حق بات کہنے میں کسی سے نہیں ڈرتے، اس وقت وہ جدہ ریڈیو پر کام کرتے ہیں اور

اردو اخبارات میں لکھتے رہتے ہیں۔انھوں نے ایک نہایت ہی اہم علمی خدمت انجام دی کہ موضوع اور باطل احادیث کو اکٹھا کیا اور ان پر تحقیق کے ساتھ مدلل بحث کی''موضوع اور منکر روایات'' کے نام سے اس کتاب کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو حد درجہ مفید ہیں۔حافظ صاحب نے اس پر تبصرہ بھی کیا ہے جو محدث کے دو شماروں میں شائع ہوا ہے۔

عابدی صاحب کے ساتھ میں تین سال تک رہا انھوں نے مجھے مظہر صاحب یا حافظ صاحب کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔سعید عابدی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہم سب سے پہلے ازہر سے پی.ایچ.ڈی. مکمل کی۔انھوں نے حمید الدین فراہی کے نظم قرآن سے متعلق نظریے پر مقالہ لکھا اور کامیابی کے ساتھ اپنے خیالات کا دفاع کیا، اس سلسلے میں ان کو کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔مقالہ مکمل ہونے کے بعد اور مناقشہ سے پہلے ان کے مشرف شیخ فتح اللہ بدران کا انتقال ہو گیا۔جس کی وجہ سے وہ اپنے مشرف اور مددگار سے محروم ہو گئے۔پھر اس کے بعد شیخ عبداللہ دراز نے جو کہ مناقشہ کمیٹی کے ممبر تھے ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن وہ بھی اچانک بیمار ہو کر بستر پر پڑ گئے۔مصر میں مناقشہ کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اخباروں میں اعلان ہو جاتا ہے کہ فلاں موضوع پر فلاں طالب علم کے رسالہ کا مناقشہ ہوگا۔اعلان عام ہوتا ہے اور ہر ایک کو دعوت دی جاتی ہے۔رسالہ کا مشرف اور دو ممتحن بیٹھتے ہیں اور طالب علم سے سوال کرتے ہیں، مشرف عام طور پر طالب علم کی طرف سے بولتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے، حافظ سعید صاحب مشرف سے اور ایک خیر خواہ سے محروم ہو چکے تھے اور ان کا مددگار صرف اللہ تعالیٰ تھا۔ممتحن نے اکیلا پا کر ان پر الٹے سید ھے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن وہ مرد مجاہد ڈٹا رہا، اور جہاں تک موضوع سے متعلق کوئی سوال تھا اس کا جواب دیا۔ایک ممتحن نابینا تھے۔نابینا حضرات کی یادداشت بہت تیز ہوتی ہے۔انھوں نے لمبی لمبی عبارتیں پڑھنی شروع کر دیں مجمع سے ان کی تائید کی جاتی رہی اور اللہ اکبر اور سبحان اللہ کے نعرے گونجتے رہے اور شیخ صاحب یہ خیال کئے بغیر کہ وہ ایک طالب علم کی چار سال کی محنتوں کا امتحان لے رہے ہیں، اپنی قابلیت کا مظاہرہ کرتے رہے۔حافظ سعید صاحب کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید ان کو فیل کر دیا جائے گا۔لیکن اللہ اپنے نیک بندوں کا عمل کبھی برباد نہیں کرتا، تین گھنٹے کے مناقشہ کے بعد جب ممتحن حضرات ہال سے کمرے میں واپس گئے تو ہم لوگوں کے دلوں سے یہ دعا نکل رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھی کو کامیاب کر دے۔اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا سن لی اور جب ممتحن حضرات واپس ہال میں آئے تو انھوں نے یہ اعلان کیا کہ طالب علم کامیاب ہو گیا اور اس کا رسالہ ٹھیک ہے۔

ہم تینوں نے بھی دکتوراہ کے لئے تسجیل کرائی لیکن مطلوب راہنمائی کے فقدان کی وجہ سے ازہر میں پی.ایچ.ڈی. نہ کر سکے۔حافظ صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کی اور میں نے ان کے بعد ۱۹۸۰ء میں احمد و بیلو یونیورسٹی نائیجیریا سے دکتوراہ مکمل کر سکا۔مظہر صاحب سعودی عرب میں تعلیمی سرگرمیوں میں

اتنا مصروف ہو گئے کہ انھیں اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

حافظ صاحب کا یہ کمال تھا کہ وہ برجستہ کسی بھی موضوع پر لکھ لیتے تھے اردو میں ہو یا عربی میں ان کا قلم روانی کے ساتھ چلتا تھا اور وہ موضوع کے ہر پہلو پر نہایت ہی مدلل انداز سے بحث کرتے تھے، اسلوب انتہائی سلیس اور آسان تھا چونکہ ان کا مقصد لوگوں تک اپنی بات پہنچانا ہوتا تھا اس لئے مشکل الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں سے گریز کرتے تھے آپ کی تحریروں میں معنویت اور گہرائی ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ آپ نے خود سے سیکھا تھا اردو کتابیں اور رسالوں کو غور سے پڑھتے اور ان سے لکھنے کا انداز سیکھتے۔ مصر جانے سے پہلے آپ نے اردو زبان میں لکھنے کی مہارت حاصل کر لی تھی۔ ریڈیو پر اردو پروگرام میں کام کرنے کی وجہ سے اس میں مزید ترقی ہوئی۔ مصر میں آپ نے عربی کتابوں کے مطالعہ سے اپنا اسلوب بنایا۔ مصر جانے سے پہلے شعر وشاعری میں دلچسپی لی۔ کچھ نظمیں لکھ کر فضا ابن فیضی کی خدمت میں پیش کیں لیکن مصر جانے کے بعد آپ کی یہ دلچسپی باقی نہیں رہی۔ میری شادی پر ''سہرا'' انھوں نے ہی لکھا تھا۔

مہمان نوازی ان کی اور ان کی اہلیہ کی فطرت بن چکی تھی۔ نائیجیریا میں ملازمت کے دوران ہر دو سال پر میرا وطن آنا ہوتا تھا۔ بنارس تک ہوائی سفر ہوتا تھا۔ آتے ہوئے اور جاتے ہوئے آپ کے گھر پر ہمارا قیام ہوتا تھا۔ واپسی میں مئو سے کچھ لوگ بھی ساتھ آ جاتے تھے اکثر ایک جشن کی صورت پیدا ہو جاتی تھی جس میں ان کے مدنپورہ اور باگڑ بلی کے احباب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی اہلیہ جو میری ماموں زاد بہن ہوتی ہیں بہت ہی لذیذ کھانا تیار کرتی تھیں۔ مصر جانے سے پہلے جب کہ گزر بسر بڑی مشکل سے ہوتا تھا ان کی فیاضی کا سلسلہ جاری تھا میں اکثر ان کے گھر پہنچ جاتا تھا اور شام کا کھانا ان کے ساتھ کھاتا تھا۔

میں نے پچھلی سطور میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ قاہرہ جانے سے قبل حافظ صاحب بڑی عسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا پہلا بیٹا واصف اختر جب چلنے دوڑنے لگا اور اپنی توتلی زبان میں باتیں کر کے اپنے والدین کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنے لگا چیچک یا خسرہ میں مبتلا ہو کر اپنے گھر والوں کو روتا ہوا چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ حافظ صاحب کو اپنے نور نظر کے کفن کے لئے ناظم صاحب سے پیشگی تنخواہ لینی پڑی۔ یاد رہے کہ فیض عام میں ان کی تنخواہ صرف پچاس روپئے ماہانہ تھی۔

حافظ صاحب کے توصیہ اور تزکیہ سے سیکڑوں طلبہ کا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور دوسری یونیورسٹیوں میں داخلہ ہوا لیکن جب ان کے اپنے بیٹے فوزان احمد کا وقت آیا تو انھیں داخلہ نہیں مل سکا آپ نے کسی سے سفارش اور التجا نہیں کی اور فوزان نے بھی خودداری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی ایک الگ لائن بنالی جو ان کے لئے بہت ہی موزوں ہے اور ان شاء اللہ وہ اس میں کافی ترقی کریں گے۔

قاہرہ سے لوٹنے کے بعد آپ کو جامعہ سلفیہ مرکزی دار العلوم میں تدریسی فرائض انجام دینے کی پیش

کش کی گئی جسے آپ نے قبول کرلیا اور آخری وقت تک اسی دینی مرکز سے وابستہ رہے۔ اس وقت دارالعلوم کے ناظم مولانا عبدالوحید سلفی تھے جو بہت ہی مخلص اور مردم شناس تھے، انھوں نے حافظ صاحب کی قابلیت اور صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور انھیں اپنا لیا ان کے آپسی تعلقات رئیس اور پڑوس کے بجائے دوستی میں تبدیل ہوگئے۔ ناظم صاحب کوئی بھی کام حافظ صاحب کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے حافظ صاحب کے ساتھ عرب ملکوں کے دورے کئے اور جامعہ سلفیہ کو علمی حلقوں میں متعارف کرایا۔

حافظ صاحب نے جامعہ سلفیہ کو اس کے موجودہ بلند مقام پر پہنچانے میں جو کردار ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا انھوں نے کبھی اپنے مفاد کا نہیں سوچا۔ جامعہ کے مفاد کو ہمیشہ آگے رکھا۔ جماعت اہل حدیث کا یہ المیہ رہا ہے کہ اس کے عہدیداران نے جمعیت کے نام پر عرب میں تعارف حاصل کرنے کے بعد اپنے ذاتی مفاد کے لئے کام کرنا شروع کردیا۔ حافظ صاحب اگر چاہتے تو وہ بھی کوئی ادارہ اپنے نام سے قائم کرکے جائداد بنالیتے اور گھر میں پیسے کا انبار لگا دیتے لیکن ایسا بھی ہوا کہ انھوں نے بغیر معاوضہ لئے جامعہ کی خدمت کی۔

مولانا عبدالوحید کے انتقال کے بعد جامعہ اپنے مخلص اور باوفا قائد سے محروم ہوگیا۔ حافظ صاحب پر ان کی جدائی کا بہت گہرا اثر پڑا۔ پھر بھی وہ جامعہ ہی سے وابستہ رہے اور کہیں اور جانے کا نہیں سوچا۔

حافظ صاحب کی شخصیت ان تمام صفات محمودہ سے آراستہ تھی جن کی اسلام تعلیم دیتا ہے۔ دینی جذبہ اور اسلام کے لئے غیرت وحمیت آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسلام پر کوئی تنقید آپ کو برداشت نہیں ہوتی تھی اور جہاں ممکن ہوتا زبان یا قلم سے اس کا جواب دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ہم لوگ مدرسہ عالیہ میں زیر تعلیم تھے لکھنؤ سے نیاز فتحپوری ''نگار'' کے نام سے ایک میگزین نکالتے تھے اور اس میں اسلام پر کیچڑ اچھالتے تھے۔ فضا ابن فیضی نیاز کی تحریروں سے کافی متاثر تھے۔ ایک مرتبہ اسی رسالے میں نیاز نے یہ دعوی کیا کہ قرآن کریم میں کہیں بھی پانچ نمازوں کا ذکر نہیں ہے۔ فضا صاحب اسی موضوع پر کسی سے بحث کر رہے تھے۔ حافظ صاحب اتفاق سے موجود تھے ان کی بھرپور تردید کی اور وہ آیتیں پڑھ کر سنائیں جن میں پانچوں نمازوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حافظ صاحب بہت ہی محنتی انسان تھے۔ کبھی اپنا وقت برباد نہیں کرتے تھے۔ مطالعہ سے ان کو عشق تھا۔ ابتدائی زندگی میں عسرت اور تنگی کے باوجود ''ترجمان'' اور ''اہلحدیث'' کے خریدار تھے، ہر مضمون بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتے اور طرز نگارش پر نظر رکھتے تھے جو جملہ یا تعبیر ان کو دلکش نظر آتی اسے ایک نوٹ بک پر تحریر کرلیتے اور اپنی تحریروں میں اسے نہایت ہی خوبی کے ساتھ شامل کرلیتے۔ ان کی یہ عادت آخر تک باقی رہی۔ مصر میں اور مصر سے واپسی کے بعد ان کے شوق مطالعہ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ مدینۃ البعوث میں ایک بلڈنگ کے ہال میں ایک

لائبریری تھی جس میں ادب اور دینیات کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں، آپ کو پتہ چلا تو آپ اپنا فارغ وقت اسی میں گزارنے لگے۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں وہاں جانا شروع کردیا لیکن زیادہ دنوں تک اسے قائم نہ رکھ سکا۔

کثرت مطالعہ نے آپ کی تحریروں میں پختگی اور گہرائی عطا کردی تھی۔ مناسب الفاظ کا انتخاب اور موضوع کے ہر پہلو پر جامع بحث آپ کے قلم کی خصوصیت تھی، دقت اور متانت آپ کے اسلوب پر غالب رہتی تھی۔ کوئی بھی کام لکھنے یا بولنے کا تیاری کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ خطبہ دینا ہو یا کسی جلسہ یا اجتماع میں تقریر کرنی ہو پوری تیاری کر کے جاتے تھے۔ میری دعوت پر وہ لندن تشریف لائے۔ جمعیت اہل حدیث کی برانچوں میں جگہ جگہ ان کا خطاب ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اجتماع میں جانے سے قبل اپنے نوٹس اور کاغذات پر جھکے ہوئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ یہاں کسی تیاری کی ضرورت نہیں یہاں کا عام آدمی علمی تقریر سننے کا عادی نہیں، ان کو گانے والے اور لطیفے اور کہانیاں سنانے والے علماء پسند ہیں پھر بھی انھوں نے یہ پسند نہیں کیا کہ بغیر تیاری کے کسی مجمع کو خطاب کریں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا حافظ صاحب کی یہ عادت بہت پرانی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں جب آل انڈیا اہلحدیث کا اجتماع نوگڑھ میں ہونا طے پایا ہم لوگ فیض عام میں زیر تعلیم تھے۔ جب ناظم صاحب کو یہ معلوم ہوا کہ دہلی میں سعودی سفیر یوسف الفوزان بھی کانفرنس میں شرکت کرنے والے ہیں تو انھوں نے مجھ کو بلا کر کہا کہ عربی میں ایک مختصر تقریر یاد کرلو کانفرنس میں تمہیں بولنا ہے۔ حافظ صاحب کو بھی یہ اشارہ ملا۔ انھوں نے فوراً تیاری شروع کردی اور مواد اکٹھا کر کے لکھنا اور یاد کرنا شروع کردیا۔ لیکن میں نے چند آیتوں اور حدیثوں کو قاضی عیاض کی ''الشفاء'' سے منتخب کر کے یاد کرنا شروع کردیا لیکن بغیر کسی ربط اور تسلسل کے، وہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ کانفرنس کے اجلاس ہنگامے کی نذر ہوگئے اور ہمیں اسٹیج تک پہنچنے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا ہوتا۔ حافظ صاحب تو تیار تھے لیکن میں مدرسہ فیض عام کی بدنامی کا سبب بن سکتا تھا۔

حافظ صاحب کے مطالعہ کے انہماک میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔ ملنے والوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ خاص طور سے مئو سے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان میں ان کے رشتہ دار بھی ہوتے تھے اور جاننے والے، جو کسی کام سے بنارس آئے تو آپ کی خدمت میں سلام کرنے حاضر ہوگئے۔ آپ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور کوئی ضرورت ہوتی تو اسے پورا کرتے، پھر اپنے کام میں لگ جاتے۔ فضول باتوں میں وقت برباد کرنا آپ کی عادت نہیں تھی۔ میں نائیجیریا سے اپنے آخری سفر میں مئو کے لئے جب بمبئی سے بنارس پہنچا تو معلوم ہوا کہ مئو میں کرفیو لگا ہوا ہے۔ میں اہل وعیال کے ساتھ تھا مجبوراً حافظ صاحب کے گھر میں قیام کرنا پڑا۔ تقریباً ۱۱/دن ہم لوگ بنارس میں پھنسے رہے ان کی اہلیہ انتہائی مہمان نواز خاتون ہیں۔ انھوں نے ہم لوگوں کو آرام پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ حافظ صاحب نے ہماری راحت کے لئے بھی وسائل مہیا کئے لیکن اس کے ساتھ اپنے معمول میں کوئی فرق

نہیں آنے دیا۔

بنارس اور جامعہ سلفیہ سے لگاؤ اس حد تک تھا کہ جہاں بھی ہوں ان کا ذہن اسی کی طرف لگا رہتا تھا جب لندن تشریف لائے تو مجھے امید تھی کہ کم از کم ایک ماہ ضرر قیام کریں گے لیکن وہ صرف دو ہفتے کا پروگرام بنا کر آئے تھے بدقسمتی سے ان کی ملاقات ان کے ایک قدر دان ڈاکٹر محمد سلیمان (قلمی نام: بہاء الدین) سے نہیں ہو سکی کیونکہ وہ نیوکاسل میں لندن سے ڈھائی تین سو میل دور رہتے تھے ڈاکٹر صاحب بیمار رہتے تھے اس لئے وہ حاضر نہیں ہو سکے اور حافظ صاحب کا سفر اتنا مختصر تھا کہ ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضری نہیں دے سکے۔ میں نے ان کو شمالی انگلینڈ کی جمعیۃ اہلحدیث کی برانچوں کا دورہ کرایا۔ اس سفر میں ہمارے ساتھ محترم شیر خاں جمیل احمد عمری بھی ساتھ تھے۔

ایک خاص صفت ان کی یہ تھی کہ ہر چیز کو بغور دیکھتے اور اس سے معلومات سے بھرپور نتیجہ نکالتے۔ یہ صفت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ ہم لوگوں کی نظروں کے سامنے کوئی واقعہ ہوجاتا ہے ہم اس کی طرف دھیان نہیں دیتے۔ حافظ صاحب ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ لندن کے سفر کے دوران باتھ شہر جانے کا اتفاق ہوا جہاں کے اسلامک سنٹر میں ماموں مولانا فضل الرحمٰن عمری کے پوتے رشاد اعظمی عمری ڈائریکٹر ہیں۔ انھوں نے ہم لوگوں کا خیر مقدم کیا اور مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ وہاں پر ہم لوگ ایک پارک میں سیر کر رہے تھے۔ رشاد نے فوٹو کھینچنے کے لئے لوگوں کو صف میں کھڑا کیا کچھ انگریز گزر رہے تھے رک گئے تا کہ فوٹو میں خلل نہ پڑے، حافظ صاحب اس چیز کو فوراً نوٹ کرلیا اور گورے لوگوں کے حسن اخلاق کی تعریف کی۔

آپ ضرورت سے زیادہ حساس تھے معمولی چیزوں سے متاثر ہوجاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ کسی کاغذ پر دستخط کرانے کے لئے مراقب البعوث کے آفس میں گئے اور اس کے سامنے اپنی درخواست رکھی۔ درخواست پر دستخط مطلوب تھی لیکن اس نے اسے بہت بڑا کام سمجھا اور کہا کہ "ای ذنب ارتکبت" یعنی مجھ سے کون سی خطا ہوگئی ہے جس کی یہ سزا مجھے مل رہی ہے۔ حافظ صاحب کو اس کی یہ بات بہت بری لگی اور کافی دیر تک ان کا موڈ بگڑا رہا اس طرح کے اور بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں جو ہم لوگوں کے لئے معمولی تھے لیکن ان کی عزت نفس اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس کو کچھ لوگوں نے غلطی سے حافظ صاحب کی ترش روئی قرار دیا ہے۔

ارباب علم وادب کا ضرورت سے زیادہ احترام کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں سے محبت کرتے تھے اور ان کے علم کی قدر کرتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا برتاؤ حد سے زیادہ مشفقانہ اور احترام سے بھرپور تھا۔ ابھی حال ہی میں ان کے ایک شاگرد نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ ڈاکٹر صاحب عمر میں بڑے تھے یا آپ، میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب ہر طرح سے مجھ سے بڑے تھے، عمر میں، علم میں اور تحریر وتقریر میں۔ لیکن یہ سوال آپ کے ذہن میں کیونکر آیا انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب جس عقیدت اور احترام سے آپ کا نام لیتے تھے اس سے ہم لوگوں کو یہ شبہہ ہوا کہ شاید آپ ان سے بڑے ہیں۔

یعنی آپ میرے پیچھے بھی احترام کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ یہ ان کی شخصیت کی عظمت اور بلندی کی دلیل تھی۔

ازہر میں آپ اپنے سب ہی اساتذہ کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خاص طور پر آپ کو دو شیوخ سے حد سے زیادہ عقیدت تھی۔ ایک ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی جو پیرس سے پی. ایچ. ڈی تھے اور سوشیولوجی میں ماہر تھے وہ "الاسلام ومشكلات الحضارة" پر درس دیتے تھے، وہ بہت ہی نپے تلے جملے استعمال کرتے تھے اور نہایت ہی فصیح انداز میں گفتگو کرتے تھے۔

دوسرے شیخ محمد الغزالی تھے جو کہ خطابت کے میدان کے شہ سوار اور دعوت کے میدان میں کام کرنے کا لمبا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی تقریر کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ جس مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے، مسجد کے باہر سننے والوں کا اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو جاتا کہ نماز پڑھنے میں دشواری تھی۔ جمال عبدالناصر کی حکومت چونکہ اسلام کے داعیوں سے ہمیشہ خوفزدہ رہتی تھی اس لئے وہ ایک مسجد پر شیخ الغزالی کو زیادہ عرصہ تک خطبہ دینے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ شیخ الغزالی اللہ والے تھے اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ حکومت پر بھی تنقید کرتے تھے اور غلط کام پر ٹوکنے سے کبھی نہیں ڈرتے تھے۔ چاہے وہ حاکم وقت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اس لئے ان سے تمام عرب حکام ڈرتے تھے، ان کو ان کی اسی جرأت کی بنا پر سعودی عرب سے نکال دیا گیا لیکن جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے بعد میں کانفرنس میں ان کو شرکت کی دعوت دی جانے لگی اور ایک دینی کانفرنس میں شرکت کے دوران ان کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا اور وہیں دفن کئے گئے۔ واللہ یحکم لا معقب لحکمہ"

حافظ صاحب باریش مصر میں داخل ہوئے اور باریش وہاں سے نکلے، یہ سعادت بہت کم ہندوستانی طلبہ کو حاصل ہوئی ہم لوگوں کے ساتھیوں میں صرف چار اشخاص اپنی داڑھیاں باقی رکھ سکے، دیوبند اور ندوہ اور دوسرے مدارس کے طلبہ قاہرہ میں وارد ہونے کے ساتھ ہی اپنے چہرے کو صاف کروا دیتے، دراصل وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ داڑھی والوں کو شک وشبہے کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے تمام شیوخ بشمول شیخ الازہر بے ریش تھے۔ آج صورتحال بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ نوے فیصد مصری جوان اور بوڑھے اپنے چہروں کو سنت نبوی سے آراستہ کئے ہوئے ہیں۔ حافظ صاحب کا یہ کمال تھا کہ جس وضع قطع کے ساتھ مصر میں داخل ہوئے تھے اسی کے ساتھ وہ وہاں سے نکلے صرف پوشاک بدلی جو وہیں تک رہی، مصر کے آزاد ماحول میں بہت سے لوگ بھٹک بھی گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ہم لوگوں کو محفوظ رکھا۔

حافظ صاحب اپنے لباس اور خارجی مظہر کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مصر جانے کے لئے انھوں نے اور مظہر صاحب نے شیروانی سلوائی تھی جب وہاں پہنچے تو اندازہ ہوا کہ شیروانی مصری ماحول میں بالکل ہی ناقابل قبول ہے، انھوں نے فوراً مجھ کو آگاہ کیا کہ میں شیروانی لانے کی غلطی نہ کروں بلکہ اگر ممکن ہو تو سوٹ سلوا لوں، جب میں قاہرہ پہنچا اور حافظ صاحب تشریف لائے تو مجھے ان کو پتلون اور شرٹ میں دیکھ کر تعجب ہوا۔ قاہرہ میں ہم لوگوں نے ٹائی لگانی اور سوٹ پہننا سیکھا۔ حافظ صاحب بڑے اہتمام سے

کمرے سے نکلنے سے پہلے کپڑے بدلتے، ٹائی باندھنے میں ان کو کمال حاصل تھا، ہمیشہ وہ اچھے کپڑوں میں اور سلیقے سے کسی بھی مجلس میں شریک ہوتے تھے، جب وہ ہندوستان واپس آگئے، سوٹ چھوٹ گیا اور اس کی جگہ شیروانی نے لے لی جو آپ ہر علمی یا اجتماعی مجلس میں پہن کر حاضری دیتے، مئو کے لنگی کے ماحول میں بھی آپ کی کوشش یہ ہوتی کہ لنگی کے بجائے پاجامہ پہن کر ادھر ادھر جائیں۔

ایک مرتبہ میں مئو گیا ہوا تھا اور وہاں مجلس ندائے وقت کے نام سے ایک تنظیم نے ایک جلسہ کا انتظام کیا، آپ اس کی روح رواح تھے۔ مجلس کا مقصد تھا معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں کو دور کرنا اور سماج کی اصلاح کرنا۔ اس کے ممبران کی کوششوں سے سگریٹ اور پان کے استعمال میں محسوس کمی ہوئی۔ بقرعید کے موقع پر گلیوں میں جو گندگی پائی جاتی تھی اس کا خاتمہ ہوا۔ شہر کے ذمہ داروں نے، ضلع مجسٹریٹ، پولیس انسپکٹر، محکمہ صحت کے ذمہ دار، سبھی نے ان کے کام کی تعریف کی اور مکمل ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس اجلاس میں ان سب کو دعوت دی گئی تھی۔ مجلس ندائے وقت کے ذمہ داروں نے مجھے ان باتوں سے اچھی طرح آگاہ نہیں کیا تھا۔ میں مئو کے لباس میں جلسہ گاہ پہنچ گیا۔ حافظ صاحب کی نگاہ میرے لباس پر پڑی تو ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے اور انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں گھر جا کر کپڑے تبدیل کر کے آؤں۔ لیکن میں سستی کی وجہ سے ان کی بات پر عمل نہیں کر سکا، پھر میں نے اپنی تقریر میں اس کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی جو ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کے مصداق حافظ صاحب کو اور برا لگا اور میری تقریر کے بعد جب وہ اسٹیج پر تشریف لائے تو میری تمام دلیلوں کا اپنی معقول باتوں سے صفایا کر دیا۔

آپ نے شروع ہی سے خوش خطی سیکھنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ مدرسہ عالیہ میں علامہ اقبال کا کوئی شعر خوبصورت انداز میں لکھ کر مولانا عبدالعلی رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کرتے۔ مولانا اس پر ماشاء اللہ بہت خوب وغیرہ کے ریمارکس لگا کر واپس کر دیتے۔ آپ کی تحریر عمدہ سے عمدہ ہوتی گئی۔ جامعہ سلفیہ کے درو دیوار ان کی حسن کتابت سے مزین ہیں اور صدا لگا رہے ہیں۔

تلک آثارنا تدل علینا
فانظروا بعدنا الی الآثار

حافظ صاحب حد سے زیادہ خود دار تھے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ کسی کی خاطر داری اس خیال سے کی کہ وہ ان کو تحفے اور ہدیے پیش کرے گا۔ آپ کی بڑی بیٹی گردے کی بیماری میں مبتلا ہو کر اس جہاں سے چل دی صرف ڈیڑھ لاکھ روپئے کی ضرورت تھی جسے وہ مانگ کر حاصل کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں کیا۔ انھیں اس سلسلے میں ان کے اپنے لوگوں سے طرح طرح کی شکایتیں اور لعن وطعن سننا پڑی لیکن آپ نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں برداشت کیا اور کسی بھی انتقامی کارروائی کا خیال بھی دل میں نہیں آنے دیا۔ ابھی حال ہی میں چند علماء کرام کی وفات ہوئی، ان کے شاگردوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کسی کی غیرت اور خودداری کا گیت گایا جب کہ وہ کسی کے بھی آگے ہاتھ پھیلانے سے باز نہیں رہے۔ کسی کے سر پر دل کی صفائی اور کدورت سے پاکی کا سہرا جمایا گیا جب کہ

ان کی پوری زندگی فتنہ پھیلانے اور لوگوں کے خلاف سازش میں گزری۔ مجھے امید ہے بلکہ یہ میری درخواست ہے حافظ صاحب کے شاگردوں سے کہ وہ آپ کے بارے میں غلو اور مبالغہ آرائی سے پرہیز کریں، ان کی خوبیاں سادہ لفظوں میں حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کردی جائیں، یہی آپ کے لئے کافی ہے۔

یہ عقیدت کے پھول تھے جسے میں ان کی نذر کرتا ہوں، یہ چھپن سال پر محیط رفاقت کی داستان ہے جو میرے اور ان کے درمیان قائم رہی، ہم دونوں نے کبھی اپنے آپ کو دوسرے سے جدا نہیں سمجھا۔

لندن سے میں برابر ان سے رابطہ کرتا رہتا تھا۔ ٹیلیفون کی سہولتوں نے اس میں بڑی آسانی پیدا کردی تھی اور جب آپ کے پاس اپنا موبائل ہوگیا تو پھر بات چیت میں مزید سہولت پیدا ہوگئی۔ مہینے میں کم سے کم ایک مرتبہ ضرور آپ سے بات ہوجاتی تھی۔ عید کے موقع پر میں نے ان سے فون پر بات کی، اس وقت انھوں نے اپنی صحت کے بارے میں کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ دہلی جانے سے تین روز قبل میں نے فون کیا تو وہ ناظم صاحب کے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس گئے تھے، ان کی اہلیہ نے مجھے اطلاع دی کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی ہے۔ وزن بہت گھٹ گیا ہے۔ اگلے دن میں نے فون کیا اور بات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کی رپورٹ کل ملے گی۔ گفتگو سے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ پھر دو دنوں کے بعد مئو سے اطلاع ملی کہ حافظ صاحب کی بیماری خطرناک ہوچکی ہے اور انھیں علاج کے لئے دہلی لے جایا گیا ہے۔ میں نے فوراً ڈاکٹر فوزان سلمہ کو فون کیا اور روزانہ حالات کا پتہ لگانے کے لئے ان کو فون کرتا رہا۔ وہ یا ڈاکٹر اطہر مجھ کو حالات سے مطلع کرتے رہے۔ حافظ صاحب نے ان لوگوں کو ہدایت کردی تھی کہ کسی کا فون ان کو نہ دیا جائے اور جو بھی فون کرے اس کو سلام پہنچا دیا جائے۔ اس طرح میری ان سے دہلی میں قیام کے دوران بات نہیں ہوسکی۔ جب ان کے بیٹوں اور رشتہ داروں نے ڈاکٹروں کے مشورہ پر مئو لے جانے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے پوچھا کہ مجھے مئو کیوں لے جارہے ہو۔ سفر کے دوران ان کی طبیعت ٹھیک لگ رہی تھی۔ ناظم اعلیٰ عبداللہ سعود نے یہ مشورہ دیا کہ بنارس لے آؤ یہاں یونیورسٹی کے چند ڈاکٹروں سے اپائنٹمنٹ بنوالیا گیا ہے جب آپ کو معلوم ہوا کہ بنارس جانے کا پروگرام ہے تو چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے۔ یہ تھی بنارس اور جامعہ سلفیہ سے ان کے دلی لگاؤ کی کیفیت۔

بہرحال عالم الغیب کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کانپور کے قریب پہنچنے پر ان کی وفات ہوگئی۔ صبح کا پانچ بجے کے قریب کا وقت تھا۔ فوزان سلمہ نے مجھے فوراً اطلاع دی اس وقت یہاں لندن میں سوا بارہ بجے رات کا وقت تھا۔ خبر سن کر ایسا محسوس ہوا کہ میں بہت اونچائی سے زمین کی طرف گر رہا ہوں ازہری مثلث کا سب سے مضبوط اور بنیادی زاویہ گر گیا تھا۔ اب بقیہ دونوں زاویوں میں وہ قوت اور طاقت باقی نہیں رہی۔



ابن احمد نقوی
نئی دہلی

یادِ یارِ مہرباں

محترمی مدیر افکار عالیہ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ نظر نواز ہوا۔
حسب ارشاد ڈاکٹر ازہریؒ پر ایک مختصر تاثراتی مضمون ارسال خدمت ہے۔ میری بدنصیبی کہ مجھے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں زیادہ نیاز حاصل نہیں رہا بس گاہے گاہے دلی آنے پر ملاقات ہوجاتی تھی۔ آپ نے ازہری نمبر نکالنے کا فیصلہ کرکے بڑا مستحسن کام کیا ہے، ان کے غیر مطبوعہ کام کی اشاعت کے لئے اگر جامعہ سلفیہ کو متوجہ کریں تو بہتر ہوگا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
نیازمند
ابن احمد نقوی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی اب صحیح طور پر یاد نہیں غالباً جامعہ سلفیہ بنارس میں ہوئی۔ غائبانہ تعارف تو تھا ہی۔ خاصی اپنائیت اور شفقت سے پیش آئے، بہت سی باتیں کرتے رہے، عربی ادب پر اپنی دو کتابیں بھی عنایت کیں اور کسی بھی طرح یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ایک عالم جلیل ایک عامی سے محو گفتگو ہے اور اس پر احسان کر رہا ہے۔ ان کے اس رویہ سے دل میں ان کے لئے عقیدت واحترام کا گہرا نقش بیٹھ گیا۔ پھر کئی بار اہلحدیث منزل (جامع مسجد دہلی) میں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی مجلس عاملہ کی میٹنگوں میں ان سے شرف نیاز حاصل ہوا، جب بھی ملے وہی اپنائیت، وہی گرم جوشی جوان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ اس کا گہرا اثر دل پر پڑا۔

جامعہ سلفیہ بنارس میں امام حرم شیخ عبداللہ السبیل تشریف لائے تھے۔ بہت بڑا اجلاس ہوا تھا وہاں ڈاکٹر ازہری بہت مصروف تھے اجلاس کی قرار دادیں مرتب کر رہے تھے جو بیشتر عربی میں تھیں، فرصت ملی تو پھر اسی تپاک سے ملے۔ قطعاً یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ اس وقت وہ عالم اسلام کے مقتدر علماء کے جھرمٹ میں ہیں۔ علامہ تقی الدین ہلالی کے ساتھ بیٹھے ہیں دیگر عرب فضلاء وعلماء سے محو گفتگو ہیں، اس ماحول میں کسی غیر اہم اور ایرے غیرے کے لئے وقت کیوں نکالیں۔ بات چیت ہوئی کہنے لگے نقوی صاحب میں اسٹیج کا آدمی نہیں ہوں۔ میری طبیعت تو یہی چاہتی ہے کہ کسی گوشہ میں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کروں۔ مجھے سب سے زیادہ ذہنی سکون اسی میں ملتا ہے ''فراغتے وکتابے وگوشہ چمنے'' میں نے مصرع عرض کردیا۔ بہت خوش ہوئے بولے آپ نے بڑی خوبصورتی سے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے عرض کیا کہ اسٹیج سے

بھی آپ جو کچھ فرمائیں گے وہ بھی سامعین کے لئے ارشاد وہدایت کا وسیلہ ہوگا۔ کہنے لگے اصل یہ ہے کہ اسٹیج پر بیٹھ جانے کے بعد آدمی کے ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا ہے قرطاس وقلم کی دنیا سکون وعافیت چاہتی ہے، اسٹیج شور وغوغا سے عبارت ہے۔ اسٹیج پر کھڑے ہوکر بلاغت کے جوہر دکھائے تب ہی آپ کی شناخت ہوگی۔ مجھے یہ سب پسند نہیں لیکن کیا کروں کہ یہ بھی میرے فرائض منصبی میں شامل کردیا گیا ہے، لہٰذا اس سے مفر بھی نہیں میں خاموش رہا۔ اہل علم اہل قلم کے لئے یہ مرحلہ سب سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے وہ محفل سے بھاگ کر خلوت گزیں ہونا چاہتے ہیں کہ کچھ علمی کام کرسکیں لیکن محفل اور اہل محفل ان کا دامن نہیں چھوڑتے اس سے نقصان علمی دنیا کا ہوتا ہے۔ ابوالکلام آزاد کو اگر سیاست کی ہنگامہ آرائیوں نے نہ گھیرا ہوتا تو اسلام کے علمی سرمایہ میں اور بھی گرانقدر اضافہ ہوتا۔ لیکن اس وقت سیاست بھی اتنی ہی اہم تھی۔ اگر ابوالکلام آزاد سیاست میں سرگرم عمل نہ ہوتے تو تحریک آزادی میں مسلمان بڑی حد تک تہی دامن ہوتے۔ ان کی سیاسی بصیرت نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی ظلمت فروشیوں سے دور رکھنے میں بڑا کام کیا، اور آج ابوالکلام آزاد علمی میدان میں متعدد کام تشنہ چھوڑ گئے لیکن تاریخ آزادی میں جس روشن باب کا اضافہ کرگئے اس کے لئے ملت کی آئندہ نسلیں ان پر سلام بھیجتی رہیں گی۔

ڈاکٹر ازہری کو سیاست سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ اول وآخر علمی میدان کے آدمی تھے۔ تدریس سے انہیں کسی حد تک لگاؤ تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ کہنے کا اہل نہیں ان کی علمی مجالس وتدریس میں شرکت کا شرف مجھے حاصل نہیں ہوا تاہم ان کے اکثر تلامذہ ان کے لئے سراپا سپاس ہیں کہ ان کی تدریس نے انہیں فکر ونظر کی نئی جہتیں عطا کیں۔ ڈاکٹر اطہر افضال جوان کے ہم وطن بھی ہیں وہ ان کی تدریسی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔ جناب ارشد امان اللہ جنھوں نے جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ماس کمیونی کیشن میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری حاصل کی اور آج انگریزی کے ابھرتے ہوئے صحافی ہیں اور قابل رشک حد تک خوبصورت انگریزی لکھتے ہیں انہیں بھی ڈاکٹر ازہری سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے اور وہ بھی اپنے استاذ سے اکتساب فیض پر فخر کرتے ہیں۔

دراصل ایک اچھے استاذ کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسے افراد کی تربیت کرے جو آئندہ علمی عظمتوں کے مشعل بردار اور فکری ندرت کے علم بردار بن کر ابھریں۔ ڈاکٹر ازہری نے یہ کام کمال مہارت سے انجام دیا۔ آج عالم اسلام میں ان کے ان تلامذہ کی بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے اس چراغ معارف ومعرفت سے اپنے چراغ روشن کئے اور آج خود صاحب کتاب اور صاحب چراغ بن کر کتاب وسنت کی راہوں میں ضیاپاشی کررہے ہیں۔

جامعہ سلفیہ میں تدریس وتالیف کے علاوہ جامعہ کے انتظامی ومالی امور بھی ڈاکٹر صاحب کے ذمہ تھا بہت سا وقت اس میں صرف ہوجاتا تھا۔ طویل مدت کے سفر کرنے پڑتے تھے اس لئے وہ علمی سرگرمیوں کے لئے زیادہ وقت نہیں دے پاتے تھے اگر یکسوئی میسر ہوتی تو بلاشبہ وہ عظیم تر علمی کارنامے انجام دے سکتے تھے۔ گردوپیش پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ بعض اوقات جبس وجلاوطنی علمی کارناموں کے لئے کس قدر بارآور ثابت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کو کلکتہ سے

نکال کر رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں انھوں نے ''تذکرہ'' جیسی گراں بہا تصنیف پیش کی پھر جب انہیں احمد نگر کے قلعہ میں محبوس کیا گیا تو انھوں نے ''غبار خاطر'' مرتب کی۔ یہ دونوں کتابیں آج کے دینی اور علمی میدان میں ادب عالیہ کا حصہ شمار ہوتی ہیں۔ جواہر لعل نہرو نے قید و بند کے دوران ہی ''ڈسکوری آف انڈیا'' اور ''تاریخ عالم کی جھلکیاں'' جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں جو ہندوستان کی تاریخ اور انگریزی ادب میں مایہ ناز اثاثہ تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ڈاکٹر ازہری کو بھی حبس اور جلاوطنی کا کرب سہنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تا کہ وہ یکسوئی سے علمی کام کر سکتے تاہم یہ ضرور ہے کہ اگر انہیں صرف علمی کاموں، تصنیف وتالیف کے لئے فارغ کر دیا جاتا تو وہ بہت سے ایسے کام کر سکتے تھے جو خواہش کے باوجود نہیں کر سکے۔

ایک دفعہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں اہلحدیث کمپلیکس میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ان سے کہوں کہ وہ سفر نامہ مصر مرتب کریں، وہاں وہ رہے جامعہ ازہر میں پڑھے وہاں کا ماحول دیکھا قاہرہ واسکندریہ میں قیام کیا کئی سال وہاں گذارے وہ اپنے تاثرات قلم بند کرتے تو مصر کے سیاسی علمی ومعاشرتی پہلوؤں پر ایک معتبر دستاویز مرتب ہو جاتی جو کچھ وہ لکھتے چشم دید ہوتا سنی سنائی نہ ہوتی۔ لیکن میٹنگ کی ہماہمی میں ان سے بات نہ ہو سکی اور ایک مفید مکالمہ رہ گیا اب حسرت ہوتی ہے کہ کاش ان سے اس موضوع پر بات ہوتی اور وہ اس پر قلم اٹھاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ تحریر سے انہیں طبعی مناسبت تھی اگر چہ تقریر کے میدان میں بھی ان کے علمی جوہر کھلتے تھے دل ودماغ روح کو روشنی وبالیدگی حاصل ہوتی تھی لیکن قلم ہاتھ میں لے کر خود ان کے ذہن کے گوشے اس طرح کھل جاتے تھے جیسے فردوس معارف کے دروازے کھل گئے ہوں۔ انھوں نے تصانیف بھی کیں، تالیفات بھی کیں، تراجم بھی کئے، کتابوں پر مقدمات بھی لکھے، تبصرے بھی قلم بند کئے غرض قلم کو ہر پہلو سے استعمال کیا اور خوب استعمال کیا۔ خود بھی لکھا دوسروں سے بھی لکھوایا حضرت فضا ابن فیضی مرحوم سے جب بھی ملاقات ہوئی ڈاکٹر ازہریؒ کا ذکر ہمیشہ ہوا۔ فضا صاحب ڈاکٹر ازہری کی علمی صلاحیتوں کا بری فراخدلی سے اعتراف کرتے تھے دوسری طرف خود ازہری صاحب حضرت فضا کے ایسے عقیدت مند تھے کہا کرتے تھے مجھے فخر ہے کہ میں فضا ابن فیضی کے وطن میں پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی کوشش سے جامعہ سلفیہ سے فضا صاحب کا مجموعہ ''سرشاخ طوبیٰ'' شائع کرایا۔ غالباً جامعہ سلفیہ کا ترانہ بھی ڈاکٹر ازہری کی فرمائش پر ہی لکھا گیا۔ ایسا خوبصورت ترانہ شاید کسی اور دینی جامعہ کو میسر نہ آیا ہوگا۔

فضا صاحب نے خاکسار راقم الحروف کو بھی ترغیب دی کہ ''فکر اقبال'' کی اشاعت کے لئے ڈاکٹر ازہری سے مراسلت کروں جو اس وقت جامعہ کے تصنیفی شعبہ کے سربراہ بھی تھے۔ ان کے اصرار پر میں نے ڈاکٹر صاحب کو عریضہ ارسال کیا۔ غیر متوقع طور پر بہت جلد جواب سے سرفراز کیا خوردنوازی سے سب سے پہلے میرے مضامین کی تعریف کی پھر اشاعت کے بارے میں بھی کچھ مشورے دئے، ان کے خط سے اندازہ ہوا کہ اگر چہ وہ اس وقت تصنیفی شعبہ کی سربراہی نہیں کر رہے تھے تاہم جس انداز سے انہوں نے خط لکھا اس سے ظاہر تھا کہ

وہ اپنے چھوٹوں کی علمی سرگرمیوں کی فراخدلی سے حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ (۱) اپنے تلامذہ کی کتابوں پر مقدمے اور تبصرے لکھتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کی تعریف بڑی خوش اسلوبی سے کرتے تھے۔ طبیعت میں عالمانہ وقار و تمکنت کے ساتھ انکسار بھی بہت تھا۔ مجلّہ ''افکار عالیہ'' نے از راہ عنایت میری کتاب ''فکر اقبال'' شائع کی اس میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کا طویل گراں قدر مقدمہ بھی شامل ہے۔ میں نے پڑھا تو حیرت بھی ہوئی اور فخر سے سر بلند بھی ہوا کہ ایک جید عالم اور مایہ ناز اہل قلم نے جس کا شمار سلفیوں کے اکابر میں ہوتا ہے مجھ جیسے نیم خواندہ کے بارے میں کس بلند آہنگی سے لکھا ہے طویل بھی جامع بھی اور فکر انگیز بھی۔ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کی مجلس عاملہ میں شرکت کے لئے بنارس سے تشریف لائے اور اہلحدیث کمپلیکس میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کے گراں قدر مقدمے پر اظہار تشکر کیا تو بڑے انکسار سے فرمایا ''میں بھلا آپ کے بارے میں کیا لکھ سکتا ہوں'' یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ قلم کے ساتھ زبان سے بھی میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

ایک مرتبہ اہل حدیث کمپلکس میں پھر ان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت کویت کے کوئی فاضل وہاں موجود تھے۔ میں سلام کر کے ایک گوشہ میں بیٹھ گیا۔ انھوں نے اس مہمان عرب سے میرا تعارف کرایا پھر میرے بارے میں انہیں بتاتے رہے اور کہا 'ھو باحث کبیر' میں سر جھکائے سنتا رہا کہ ایک عظیم المرتبت عالم کی یہ عظمت ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کو بھی دوسروں کے سامنے بڑا بنا کر پیش کرتا ہے۔ علم انسان کو وسعت فکر و نظر کے ساتھ وسعت قلب بھی عطا کرتا ہے۔ بعض عالم ایسے ہوتے ہیں جو صرف اپنی ذات میں گم رہتے ہیں اور اپنے علمی مرتبہ کے طرۂ پر پیچ و خم سے اوپر نہیں دیکھ پاتے لیکن ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ میں یہ بات تھی کہ ان میں خودشناسی کے ساتھ خوردشناسی کا جوہر بھی تھا۔ اسی لئے وہ ہر کہ ومہ میں مقبول تھے۔

مجالس میں بھی وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھتے۔ گفتگو اور بحث میں کھل کر حصہ لیتے تھے مفید مشورے دیتے تھے حاضرین ان کی بات کو پوری توجہ سے سنتے تھے۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں بھی وہ اسٹیج کی زینت ہوتے تھے۔ کبھی صدر مجلس ہوتے کبھی صدر استقبالیہ۔ مقررین کی صف اول میں ان کا نام ہوتا تھا ان کی شرکت، جلسہ یا کانفرنس کو ایک نیا اعزاز اور اعتبار بخشتی تھی۔ اس لئے خاصا وقت ان جلسوں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بھی صرف ہو جاتا تھا ان کی ذات ہر لحاظ سے ہمہ جہت اور ہمہ گیر تھی۔ جس میدان میں رہے ممتاز رہے جس کارواں کے ساتھ چلے امیر کارواں بن کر چلے، جس مجلس میں پہنچے صدر مجلس بن کر بیٹھے۔ علم اور اہل علم قلم اور اہل قلم اساتذہ اور تلامذہ خواص اور عوام سب نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا اور ان کی عبقریت کو سراہا۔ وہ چلے گئے اور اچانک ہی چلے گئے کسی کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ اس قدر جلد وہ بزم ہستی سے اٹھ جائیں گے۔ عمر بھی ایسی نہیں تھی جسے عصر حاضر کے پیمانے سے بڑی عمر کہا جائے۔ ستر سال کی عمر آج کل ریٹائرمنٹ کی عمر تو ہوتی ہے لیکن رخت سفر باندھنے کی نہیں ہوتی اب عمریں ۹۰، ۹۵ کی حد کو پہنچنے لگی ہیں۔ ہمارے سیاستدانوں کو دیکھئے بڑی تعداد ایسی ہے جو

(۱) یہ کتاب ادارہ تحقیقات ونشریات اسلامی جامعہ عالیہ عربیہ سے شائع ہو چکی ہے۔ جس پر ڈاکٹر ازہری کے تاثراتی کلمات بھی ہیں۔ (ع۔ل)۔

۸۰ کا ہندسہ پار کر چکے ہیں یا اس تک پہنچ رہے ہیں۔ خاصے فعال ہیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیماری کی خبر سن کر بھی یہ گمان نہیں تھا کہ وہ سفر آخرت پر روانہ ہو رہے ہیں۔ جس نے سنا، سناٹے میں آ گیا سلفیت کا یہ اتنا بڑا نقصان تھا کہ دل تڑپ اٹھے، ہر طرف تدمع عینی وتصدع قلبی کا سماں تھا، سب جانتے ہیں کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر نہیں جو آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن واپس جانا ہے خواہ ایک دن جئے ایک سال جئے یا اک سو سال واپسی بہر حال ہونی ہے۔ ڈاکٹر ازہریؒ نے طویل عمر تو نہیں پائی "اعمار امتی بین ستین وسبعین" کے دائرے میں رہے اور جوار رحمت میں چلے گئے، ان کے چلے جانے سے علمی میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے کون پر کرے گا، یہ ایسا سوال ہے جو ہر حساس قلب کو پریشان کر رہا ہے۔ گرد وپیش پر نظر ڈالئے تو کوئی نہیں جو آگے بڑھے اور اس بوجھ کو اٹھانے کا حوصلہ کرے۔ مسئلہ کسی انسان کے دنیا سے اٹھ جانے کا نہیں ہوتا مسئلہ قحط الرجال میں ایک عبقری کے داغ مفارقت دے جانے کا ہوتا ہے کہ اس کی جگہ پر کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہی اصل خسارہ ہوتا ہے، اس سے پہلے بھی علماء اور اہل قلم دامان رحمت میں جاتے رہے ہیں لیکن ایسی محرومی کا احساس نہیں ہوتا تھا کیونکہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جیسے امام علم وقلم موجود تھے اور ان کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ وہ کسی خلا یا خسارہ کا اندیشہ ہی پیدا نہیں ہونے دیتے تھے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اتنی جلدی اور اتنے غیر متوقع طور پر بزم ہستی سے اٹھ جائیں گے اور اپنے پیچھے بے کراں ویرانی چھوڑ جائیں گے۔

میں نے مولانا رفیق احمد سلفی (مدیر ماہنامہ التوعیہ) سے درخواست کی تھی کہ ڈاکٹر ازہریؒ کے اٹھ جانے سے جو قلمی خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائیں لیکن وہ اپنی موجودہ مصروفیات سے کنارہ کش ہونے کو تیار نہیں ہیں۔

ڈاکٹر اطہر افضال کو اللہ تعالیٰ نے علم اور قلم دونوں پر عبور عطا کیا ہے آج کل وہ حکومت ہند میں ایک اہم منصب پر فائز ہیں ان کی منصبی ذمہ داریاں ایسی ہیں کہ وہ علمی کاموں کے لئے مطلوب وقت نہیں دے سکتے نہ ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سرکاری منصب کو خیر باد کہہ دیں۔ نہ آج کے حالات میں یہ قرین مصلحت ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ قلم کا میدان بالکل ہی دشت بے سایہ وشجر ہے ماشاء اللہ کچھ اچھے لکھنے والے اور نو عمر اہل قلم موجود ہیں لیکن مستقبل قریب میں ایسا نظر نہیں آتا کہ کوئی اس جگہ کو پر کر سکے، جو مولانا رئیس الاحرار ندوی اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہما اللہ نے خالی کی ہے۔ تصنیف وتالیف جماعت اہلحدیث کا وہ میدان ہے جہاں دوسرے مشکل سے ہی ان کے مقابل ہو پاتے ہیں شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ کے بعد ڈاکٹر ازہریؒ جیسے اہل قلم تھے جنھوں نے اس پرچم کو سنبھالا ہوا تھا اب یہ محاذ ویران ہے اور پرچم سرنگوں ہے اس کی سربلندی کے لئے کون اٹھتا ہے نگاہیں منتظر ہیں دل مضطرب ہیں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی



شیخ صلاح الدین مقبول احمد
مدینۃ الجہراء۔کویت

استاذ گرامی
ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ
کچھ یادیں۔کچھ باتیں

مطالعہ سے قبل چند گزارشات:

● استاذ گرامی ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ (سابق صدر جامعہ سلفیہ، و مدیر مجلہ "صوت الامۃ" بنارس) کے بارے میں یہ تاثراتی مضمون مجلہ "افکار عالیہ" (مئو۔یو۔پی) کی تحریک پر قلم بند ہوا ہے۔راقم جیسے ان کے بہت سے شاگرد و محبین، ملک و بیرون ملک میں مختلف میدانہائے عمل میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ان سے سب کے اپنے تعلقات اور ان کے بارے میں اپنے خیالات ہوں گے۔ ع
بقدرِ پیمانہ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا

جامعہ سلفیہ (بنارس) سے فراغت کے بعد (مدینہ یونیورسٹی میں داخلے سے قبل) راقم کو تقریباً ڈیڑھ سال ان کی نگرانی میں جامعہ کی خدمت کا موقع ملا ہے۔اس مضمون میں اس نے ان کے بارے میں اپنے احساسات و تاثرات اور مشاہدات کی ترجمانی کی ہے۔وفورِ شوق میں علمی اصول وضوابط کی پابندی نہ رہ سکی ہو تو معاف فرمائیں "والعذر عند کرام الناس مقبول"

● ڈاکٹر صاحب کا فیض عام تھا، اس کا اثر اس مضمون میں اس طرح محسوس کریں گے کہ ادنیٰ سی مناسبت کے سبب بھی کچھ متعلقین کا تذکرہ آ گیا ہے:

امیر جمع ہیں احباب حال دل کہہ لے — پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

اس یاد دہانی کے بعد بھی اگر تطبیق حالات و واقعات میں پریشانی ہو، تو اسے سمجھ لیں کہ: ع مقطع میں آ گئی ہے سخن گسترانہ بات

● ڈاکٹر صاحب سے متعلق یادداشت میں کہیں کہیں طوالت محسوس ہو، تو راقم کی طرف سے اسے ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
اور جہاں یہ محسوس کریں کہ راقم نے اس مضمون میں کہیں کہیں بے محل اپنے حالات و کوائف کا بھی پیوند لگا دیا ہے تو اس کے لئے یہ شعر بھی گنگنائیں تو وہ بے جا نہ تصور کرے گا:

بڑا ہوشیار ہوتا ہے بکارِ خویش دیوانہ — ملا دیتا ہے ان کے حسن میں اپنا بھی افسانہ

ان گزارشات کے بعد دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب اور جملہ اساتذۂ کرام کو غریق رحمت فرمائے اور موجودین کو صحت و عافیت کے ساتھ اپنی اطاعت میں عمر طویل سے نوازے، اگر میرا کوئی عمل اس کی بارگاہ میں درجۂ قبولیت کو پہنچے تو اس کے اجر و ثواب میں میرے والدین اور چھوٹے بڑے تمام اساتذہ کو شامل فرمائے:

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین آباد! یرحم اللہ عبداً قال: آمینا!

روز جمعہ مبارک
۱۴۳۳/۵/۲۱ھ مطابق ۱۳/اپریل ۲۰۱۲ء

صلاح الدین مقبول احمد
(مدینۃ الجہراء۔کویت)

جامعہ رحمانیہ بنارس میں داخلہ کے لئے درخواست بھیج چکا تھا، لیکن قدیم طلبۂ جامعہ سلفیہ بنارس کی

شوال میں سوئے بنارس روانگی کے دن صبح تک مجھے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ یاس وامید کی کیفیت اور اپنے مقصد عزیز سے متعلق خیالات میں محو تھا کہ اسٹیشن کی طرف روانگی سے کچھ ہی دیر پہلے مولانا عبدالقدوس نسیم بنارسی (ناظم اعلیٰ جامعہ رحمانیہ۔ بنارس) کے دست مبارک کا تحریر کردہ نہایت خوشخط خطاب داخلے کا پیام مسرت لے کر باصرہ نواز ہوا۔

تیرے احساں کا نسیم صبح کو اقرار تھا
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا

سبحان اللہ! اس وقت میری خوشی کا عالم کیا تھا؟ اسے الفاظ کا جامہ پہنانا تو میرے لئے مشکل ہے، لیکن دل ہی دل میں بزعم خویش یہ امکانات روشن ہوگئے کہ مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کے پہلے زینے پر (براہِ جامعہ سلفیہ) قدم رکھ دیا، جس کے لئے مکتب درجہ چہارم و پنجم سے بلاناغہ دعائیں کرتا تھا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر یہ اعتراف نہ کروں کہ مولانا مقصود احمد سلفی (حال مدرس مدرسہ نورالہدیٰ اونرہوا۔ بلرام پور۔ یو، پی) کے تعاون، اور مولانا محمد عیسی (شنکر نگر۔ بلرام پور) کی وساطت سے داخلے کی کارروائی پہلی فرصت میں مکمل ہوگئی۔

اس سال (١٣٨٩ھ=١٩٦٩ء) جامعہ رحمانیہ کے آخری کلاس (جماعت رابعہ) میں صرف میرا، اور میرے ہونہار ونکتہ رس رفیق مولانا بدرالزماں نیپالی کا داخلہ ہوا تھا۔

جماعت رابعہ (جامعہ رحمانیہ) کے ہمارے قابلِ احترام اور ذی شان رفقائے درس کی فہرست درج ذیل ہے جو اپنے اپنے میدانہائے عمل میں کامیاب ترین نظماء، مصنفین و محققین، دعاۃ و مبلغین اور مدرسین کی حیثیت سے ملک و بیرون ملک میں معروف ہیں:

مولانا عبداللہ سعود سلفی (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس)
ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری (سابق شیخ الجامعہ، بنارس)
مولانا محمد عزیر شمس (معروف محقق، مکہ مکرمہ)
مولانا رفیع احمد عاقل (داعی ومبلغ، اسٹریلیا)
مولانا عبدالقدوس خیراللہ (سینیر مدرس، جامعہ محمدیہ مالیگاؤں)
مولانا الطاف الرحمٰن عبدالحلیم بنارسی (داعی، مدرس اور تاجر حیدرآباد)
ڈاکٹر بدرالزماں نیپالی (صدر جمعیۃ التوحید، کپل وستو۔ نیپال)
مولانا محمد عزیر املوی (عالمیت کے بعد تجارت میں مصروف ہوگئے)
صلاح الدین مقبول احمد (شعبۂ بحث وتحقیق، جمعیۃ احیاء التراث، الجہراء برانچ۔ کویت)

ہمارے ان رفقاء جامعہ رحمانیہ میں ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری (رحمہ اللہ) نے سوئے منزل روانگی میں سبقت فرمائی، اور ہماری درماندگی کا خیال نہ کرکے ہمیں کچھ بعد میں اطمینان سے آنے کے لئے چھوڑ گئے (انتم سبقتم ونحن بکم لاحقون) اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے۔

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام وقفس سے بہرہ مند

بقیہ تمام حضرات سے وقتاً فوقتاً ملاقات، یا دور و قریب سے مزاج پرسی ہوا کرتی ہے۔ مولانا محمد عزیر املوی سے بھی چند ماہ قبل رابطہ ہوا، خوش وخرم ہیں۔

اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

فاضل گرامی مولانا عبداللہ سعود (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس) نے اپنی مفید تحقیقی کتاب ''حج مبرور'' (۳۵۶۔ ۳۵۷) میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''اللہ نے مجھے بہت سے انعامات سے نوازا، ان میں ایک چیز یہ بھی ہے کہ مجھے دینی تعلیم کے دوران اچھے ساتھی ملے، ان میں عزیر شمس، صلاح الدین مقبول، شہاب اللہ جنگ بہادر، عبدالقیوم محمد شفیع، عبدالقدوس خیر اللہ، بدر الزماں نیپالی اور محمد رفیع، یہ سب علمی میدان کے شہسوار نکلے۔

ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس بھی میرے خاص ساتھیوں میں سے تھے اور آٹھ سال ہم دونوں نے ساتھ پڑھا ہے۔ اخیر دور میں جامعہ سلفیہ کے شیخ الجامعہ کے منصب پر بھی میرے رفیق کار رہے اور (۳۰ر مارچ ۲۰۰۳ء) میں انتقال کر گئے''۔

آج کے پر آشوب دور میں اپنے رفقاء کی رفاقت اور اساتذۂ کرام کے احسان کو کون یاد کرتا ہے۔

فاضل گرامی مولانا عبداللہ سعود کا ان رفقاء کاملین کی رفاقت کو نعمتوں میں شمار کرنا (اگر میرا نام فہرست سے نکال دیں تو) بالکل بجا ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل
نسیمِ صبح تیری مہربانی

استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب کا پہلا دیدار:

جامعہ رحمانیہ بنارس کا دارالاقامہ (ہاسٹل) محلّہ ''پانڈے حویلی'' کے رہائشی مکانات کے درمیان ایسی جگہ واقع تھا، جہاں کھیل کود کے لئے کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ طلبہ اکثر عصر و مغرب کے درمیان سیر و تفریح کے لئے مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ بنارس (ریوڑی تالاب) چلے جاتے تھے، وہاں ان کی اپنے علاقوں کے طلبہ سے بھی ملاقات ہوتی، اور کچھ کھیل کود کا موقع بھی فراہم ہوتا۔

۱۰ر شوال ۱۳۸۹ھ کے بعد جامعہ رحمانیہ بنارس میں داخلے کے ابتدائی ایام ہی رہے ہوں گے، جامعہ سلفیہ جانا ہوا، ''دارالحدیث ہال'' کے مغربی حصہ کے سامنے فیلڈ میں سینئر طلبہ والی بال کھیل رہے تھے، (ان میں فاضل گرامی ڈاکٹر ابوحماد صغیر احمد (مقیم ریاض) اب تک یاد ہیں) دیکھا کہ ایک صاحب اس ٹیم میں اپنی عمر کے اعتبار سے سینیر طلبہ سے بھی سینیر لگ رہے ہیں۔

حیرت کی بات یہ نہ تھی کہ وہ والی بال کھیل رہے ہیں بلکہ میرے لئے عجوبے کی بات یہ تھی کہ وہ عربی میں گفتگو کر رہے ہیں اور بال خود لینے کے لئے اپنی ٹیم کے رفقاء سے (أنــا، أنــا اول) جیسے کلمات کا استعمال کر رہے ہیں، اس طرح کھیل کے اصطلاحات کا استعمال عربی زبان میں سب سے پہلے میں نے انھیں صاحب سے سنا۔

بہر حال دریافت کرنے سے معلوم ہوا (شاید میرے رفیقِ درس فاضل گرامی مولانا محمد عزیر شمس (جو اپنے والد استاذ گرامی مولانا شمس الحق سلفی (شیخ الحدیث) کے ساتھ جامعہ سلفیہ ہی میں رہتے تھے اور انھیں پہچانتے تھے) نے بتایا) کہ یہ:

''مئو ناتھ بھنجن کے رہنے والے، جامعہ کے

استاذ، اور مجلہ الجامعۃ السلفیۃ (۱) کے ایڈیٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری ہیں'' (اس وقت انھیں ''حافظ صاحب'' یا ''ازہری صاحب'' کے خطاب سے یاد کیا جاتا تھا)

یہ شوال ۱۳۸۹ھ۔۱۹۶۹ء میں استاذ گرامی کا پہلا دیدار تھا، اور یہ کلمات جن کی صدائے بازگشت اب تک کانوں میں ہے۔

اللہ کی شان ملاحظہ فرمائیں کہ چالیس سال کے بعد جمعرات ۲۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو ''بترا ہاسپیٹل'' (دہلی) میں وفات سے چند گھنٹے قبل اس شعلۂ حرکت وعمل کو بے حس و حرکت، اور سوئے منزل روانگی کے لئے تیاری میں تیزی سے مصروف بھی دیکھا:

آخری دیدار کا منظر ابھی تک یاد ہے
سوچ کر دل اس کو محوِ نالہ وفریاد ہے

ڈاکٹر صاحب کا شہر میری نظر میں

مئو ناتھ بھنجن، برصغیر کی معروف مردم خیز سرزمین، ضلع اعظم گڈھ (یو۔پی) کا ایک علمی وصنعتی شہر ہے(۲) جو اب خود ضلع کا صدر مقام بن چکا ہے کہا جاتا ہے کہ اسے مشہور مغل بادشاہ شاہجہاں کی بیٹی شہزادی ''جہاں آرا'' نے اپنے نام پر ''جہان آباد'' کے نام سے بسایا تھا، شہزادی نے اپنی عنایت خاص سے ایک طرف پارچہ بافی کے ماہرین کو یہاں سمٹ کر آباد ہونے کی سہولیات فراہم کی تھیں، تو دوسری طرف جامع مسجد اور اس کے اردگرد طلبہ کے لئے دارالاقامہ کا قیام عمل میں لاکر اسے علم وفضل کا بھی ایک مرکز بنادیا تھا۔

شاید اس نیک بخت شہزادی (جہاں آرا بنت شاہجہاں) کی نیک نیتی کا اثر ہے کہ مئو کو آج تک ان دونوں خصوصیات کے اندر، ملک کے دیگر شہروں کے مقابلے میں امتیازی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ بانیوں کی تقوی شعاری اور نیک نیتی کا اثر ان کے اداروں، مدرسوں اور ان کے زیر اثر آبادیوں پر پڑتا ہے۔

مشاہیر مئو:

اس شہر کے تقریباً انیس خوش بختوں کو قائد سلفیت امیر اہل حدیث شیخ الکل میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ (۱۲۲۰۔۱۳۲۰ھ) کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا، جن کی شاگردی برصغیر ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں بھی علم وفضل کے باب میں اتھارٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔

● استاذ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے نانا اور استاذ گرامی شیخ انیس الرحمٰن اعظمی کے دادا مولانا محمد نعمان اعظمی کا شمار میاں صاحب کے دور اخیر کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔

● میاں صاحب کے مئوی شاگردوں میں روغن احمر کے موجد علامہ ابوالمکارم محمد علی بن فیض اللہ مئوی (۱۲۷۶ھ۔۱۳۵۲ھ) کو امتیازی مقام حاصل ہوا۔ خود ان کے والد گرامی مولانا فیض اللہ مئوی مشہور مجاہد مولانا سخاوت علی جونپوری (۱۲۷۴ھ) کے فیض یافتہ تھے۔ علامہ شبلی نعمانی (۱۳۳۲ھ)

(۱) جامعہ سلفیہ کے زیر اہتمام شائع ہونے والا مجلّہ پہلے صوت الجامعہ کے نام سے شائع ہوتا تھا پھر اس کا نام مجلۃ الجامعۃ السلفیۃ ہوگیا اور اب صوت الامۃ کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

(۲) اب مئو اعظم گڈھ سے الگ ضلع بن گیا ہے۔

، ملا حسام الدین مئو (۱۳۱۰ھ) اور مولانا ابوالحسنات عبد الغفور دانا پوری (۱۳۳۱ھ) جیسے اہل علم وفضل نے مولانا فیض اللہؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔

مولانا ابوالمکارم کے مشہور اساتذہ میں میاں صاحب کے بعد ملا حسام الدین مئوی ((۱۳۱۰ھ) اور حافظ عبداللہ غازیپوری (۱۳۳۷ھ) کا بھی شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح مولانا ابوالارشاد دبکاوی (۱۳۵۰ھ) مشہور صاحب طرز ادیب مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی (۱۳۴۵ھ) مولانا عبدالغفار آف علی جان دہلوی (۱۳۵۸ھ) اور استاذ گرامی مولانا عبدالمعید بنارسی کے والد محترم مولانا حکیم عبدالمجید بنارسی (۱۳۵۶ھ) وغیرہم مولانا ابوالمکارم کے مشہور رفقاء درس میں شامل ہیں۔

اہل ندوہ و دیوبند کے معروف پیرومرشد شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی (۱۳۱۳ھ) محقق حنفی عالم مولانا ابوالحسنات عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی (۱۳۰۴ھ) اور علمبردار سلفیت نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (۱۳۰۷ھ) سے تعلقات اور مولانا محمد بشیر سہوانی (۱۳۲۶ھ) شیخ حسین بن محسن الانصاری الیمنی (۱۳۲۷ھ) اور مولانا سلامت اللہ جیراجپوری (۱۳۲۲ھ) وغیرہ سے مولانا ابوالمکارم رحمہ اللہ کے دوستانہ مراسم تھے۔

مولانا ابوالمکارم کی تصنیفات کی تعداد تقریباً تیس (۱) ہے جن میں اکثر کتابیں اپنے معاصر علماء کی تردید وتنقید پر مشتمل ہیں۔ ان کی طبیعت حق جو نے (بلا لحاظ موافق ومخالف) سب کمزور دلائل کا جائزہ لیا۔ انھوں نے جہاں مشاہیر علماء احناف مولانا ظہیر احسن شوق نیموی (۱۳۲۲ھ) مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۳۲۳ھ) اور علامہ شبلی (۱۳۳۲ھ) وغیرہ کا مختلف فقہی وتاریخی امور میں تعاقب کیا، وہیں مشاہیر جماعت اہل حدیث اور اپنے سربرآوردہ احباب مولانا محمد بشیر سہسوانی (۱۳۲۶ھ) اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (۱۹۵۶ء) وغیرہ جیسے حضرات کی بعض تحقیقات کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا۔

یہ سرزمین ''مئو'' کی ایسی قدآور اور کوہ وقار علمی شخصیت ہے جس کی دعوتی وتصنیفی خدمات کو خاطر خواہ خراج عقیدت پیش کرنا ابھی ہماری جماعت پر باقی ہے۔ کاش ان کی کتابوں کا مجموعہ یا کم ازکم ان کے افادات شائع کردیے جاتے۔

جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد راقم نے ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ''شخصية فى سطور'' کے عنوان سے ''مجله الجامعة السلفية'' (بنارس) میں ایک سلسلہ سیر وتراجم شروع کیا تھا چودہ شخصیات تک پہنچ کر مدینہ یونیورسٹی جانے کے وقت منقطع ہوگیا اس میں مولانا ابوالمکارم مئوی رحمہ اللہ پر میرا مضمون (رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ) میں شائع ہوا تھا۔

مولانا ابوالمکارم اور ان کے معاصرین کی شخصیتوں میں گزشتہ صدی کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے، ویسے سرزمین مئو کبھی بھی ویران نہ تھی، اس کی زرخیزی نے اپنے مدارس کے ذریعے پورے ملک کو ہمیشہ سرسبز

(۱) مولانا ابوالمکارم کی تصنیفات کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مدنی نے موصوف کی مطبوع ومخطوط تصانیف کی تعداد نام بنام ۵۳ بتائی ہے۔

وشاداب رکھا ہے۔

دور حاضر میں مئو کے معروف و باوقار فضلاء میں ایسی شخصیتیں بھی ہیں، جن کا جماعت کے پاس کوئی ہم پلہ نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

فضؔا ابن فیضی

فضؔا صاحب کو دینی فضا وراثت میں ملی، جس نے انھیں عام شعراء کے مقابلے میں محتاط روش بنایا۔ اس کے باوجود ان کے فن کی توانائی نے انھیں بام عروج تک پہنچایا۔

میں نے اپنے منظوم رسالہ "پاکیزہ شاعری کی اہمیت وضرورت" میں فضا کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

فضا اپنی جگہ علم وادب کا اک ادارہ ہے
وہ بزم شعر وشعرا میں تو تابندہ ستارہ ہے
بہت دلکش ہے "شاخ طوبیٰ" ان کا اپنا مجموعہ
وہ طرز فکرِ اسلامی کا ہے مشہور موسوعہ

بجا فرمایا فاضل گرامی عتیق الرحمٰن صاحب نے:

"مئو کی سرزمین اگر چہ پارچہ بافی کے لئے شہرت خاص رکھتی ہے، تاہم علم وفن کے تاروپود کی ہنرمندی میں بھی اسے ید طولیٰ حاصل رہا ہے۔ ادب وزبان کی شناوری اور شعر وشعور کی موجوں سے کھیلنے کا فن انھیں اہل دہلی ولکھنؤ کی ہم رکابی کا شرف عطا کرتا ہے"۔

(استدارک: جون۔ جولائی۔ ۲۰۱۱ء)

یہ شرف جن فضلاء کا رہین منت ہے میری نظر میں فضؔا صاحب ان میں سرفہرست ہوں گے۔

جناب فضؔا سے مختصر ہی سہی، تین ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا:

پہلی بار "جامعہ عالیہ عربیہ" مئو کی زیارت کے موقع پر، جب وہ استقبالیہ پروگرام میں شریک تھے ان کی سادگی وسنجیدگی دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔

دوسری ملاقات دہلی میں ہوئی جب وہ اپنے اعزاز میں منعقد ایک پروگرام میں شرکت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ خرابی صحت اور اسہال کی شکایت کی وجہ سے وہ دیر تک استاذ گرامی مولانا عبدالحمید رحمانی کے ساتھ "ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر" (جوگابائی۔ دہلی) کے آفس میں رہے۔

اس وقت بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی کا دور چل رہا تھا، یاد ہے فضؔا صاحب نہایت پردرد لہجے میں اس حادثہ کا تذکرہ بار بار فرما رہے تھے۔ جس سے ان کی ہمدردانہ صفت اور بہی خواہانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

تیسری بار آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس مئو (۱۴۔۱۵ اپریل ۱۹۹۵ء) کے موقع پر افتتاحی نشست میں ہوئی۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دوسری نشست میں اپنا تازہ مجموعہ کلام (جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں) ہدیہ فرمایا، اس پر انھیں کے قلم سے ایک شعر لکھا ہوا تھا، جو اس وقت بالکل میرے ہی حسب حال تھا وہ کتاب شاید میری لائبریری میں محفوظ ہوگی۔

اس خوردنوازی سے میں بے حد متاثر ہوا۔ دل کی گہرائیوں سے ان کے لئے دعا نکلی۔ اتنی عظمتوں کے حامل، اور اتنے سادہ! اب ایسے لوگ ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتے۔

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

اس موقع پر فضاؔ صاحب کا لکھا ہوا کانفرنس کا ترانہ سنا، جامعہ سلفیہ اور دیگر بہت سے اداروں کے ترانوں نے فضاصاحب کی یادکو دوامیت وابدیت سے ہم کنار کردیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے۔

مولانا عبدالحکیم مجازؔ اعظمی

مولانا مجاز صاحب شریعت کے در وبست سے واقف، فن حدیث کے ماہر، جماعت کے نامور ادیب اور بے باک صحافی تھے۔ ''ترجمان'' (دہلی) کے مدیر رہے۔ ان کی حقیقت پسندانہ تنقیدوں اور بے لاگ تبصروں نے اپنوں اور بے گانوں میں کبھی کوئی فرق نہ کیا اور نہ ہی اپنے اصولوں کا کبھی سمجھوتہ کیا۔

شاعر کے یہ دو اشعار مولانا مجازؔ اعظمی ہی کے حسب حال ہیں:

کرتا رہوں گا جبر و تشدد پہ احتجاج
جب تک زباں میں طاقت عرض کلام ہے
لگتا رہے گا زخم جبین جمود پر
جب تک مرے قلم کی انی بے نیام ہے

مجازؔ صاحب کے بارے میں میں نے اپنے منظوم رسالہ ''پاکیزہ شاعری'' میں کہا ہے:

مجازؔ اعظمی کی شاعری کو شاعری کہئے
اثر انگیزی اسلوب کو بھی ساحری کہئے

مولانا ابوالاشبال احمد شاغف (مکہ مکرمہ) کے ''مجلہ افکار'' میں مطبوع ایک مضمون پر قول امام بخاری ''فیہ نظر'' کے اصطلاح کی تعیین میں بحث چھڑ گئی تھی، اس وقت مولانا مجازؔ اعظمی ومولانا عبداللطیف اثری نے اس پر لکھنے کے لئے متوجہ کیا تھا۔ لیکن اپنی مشغولیت کے باعث میں وقت نہ نکال سکا۔ اس مسئلہ کا حل قدیم ومعاصر مصادر ومراجع میں موجود ہے۔ گزشتہ سال میں نے ایک شعری مجموعہ بنام ''شاہراہِ دعوت'' تیار کیا۔ اصلاح کے لئے میری نظر مجازؔ صاحب پر بھی پڑی تھی۔ لیکن محمد الاعظمی اور ان کے صاحبزادہ گرامی مولانا اسعد اعظمی نے بتایا کہ وہ بیماری کے سبب اس لائق نہیں، پھر یہ کام ان کے دیرینہ رفیق ابن احمد نقوی نے انجام دیا۔ فجزاهم الله خيرا۔

مولانا مختار احمد ندوی

مولانا ندوی خاک مئو سے اٹھے، کلکتہ پر اپنا اثر چھوڑا، بمبئی میں سکونت اختیار کی اور مالیگاؤں کو تعلیم آباد بنادیا۔ زندگی بھر جمعیۃ اہل حدیث ہند اور مسلم پرسنل لا بورڈ سے متعلق ہی نہیں بلکہ صدارت ونیابت کے عہدوں پر فائز رہے۔

تعلیم وتربیت، بطور خاص تعلیم نسواں، نشر و اشاعت مساجد ومدارس کے سلسلہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا مجموعی طور پر پورے ملک میں کوئی جواب نہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے۔

جامعہ محمدیہ (مالیگاؤں) میں دوبار جانے کے لئے کوشش ہوئی ایک جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد اور دوسرے مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ (وما تشاء ون إلا ان يشاء

اللہ رب العالمین۔)

مولانا ندوی کی ذرہ نوازی و بلند اخلاقی مجھے زندگی بھر یاد رہے گی کہ وہ دوبار مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ایک بار ۱۹۸۲ء میں، جوکویت میں میرا پہلا سال تھا۔اس وقت مجھے نصیحت کی تھی کہ مسجد کی ملازمت کبھی نہ چھوڑنا۔ جو کچھ مجھے ملا ہے اسی کا دین ہے۔اسی ملاقات میں فرمایا تھا کہ میں تم سے بہت خوش ہوں۔میں نے کہا میں بھی آپ کی خدمات سے بہت خوش ہوں، ویسے بات کیا ہے؟ فرمایا کہ تم یہاں ہو لیکن تمہاری طرف سے اپنے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں سنی، ایک صاحب امارات میں ہیں جنھوں نے مجھے تنگ کر رکھا ہے۔

دوسری بار جب میں جنگ عراق وکویت کے بعد ''ابوالکلام آزاد اویکننگ سینٹر'' دہلی میں خدمت کر رہا تھا، تو مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس میں شرکت کے لئے آئے تھے، تو اکیلے تیسری منزل پر گئے، اور پہنچتے ہی بستر پر دراز ہوگئے، میں اس موقع پر جذبۂ شکر گزاری سے لبریز تھا، فرمانے لگے صرف تم سے ملاقات کے لئے آیا ہوں۔اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔

فاضل گرامی مولانا ارشد مختار (صاحبزادہ) نے مولانا ندوی کے بعد محمدیہ سوسائٹی کے ماتحت ملک میں پھیلے ہوئے اداروں کو سنبھالا، اوران کے انتظام وانصرام میں اپنی صلاحیت کا بہترین مظاہرہ کیا، جس پر وہ قابل مبارکباد ہیں۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

مولانا ندوی پر میرا مضمون ان کی وفات کے بعد ''الفرقان''، ''امتی'' اور ''صوت الامۃ'' وغیرہ میں شائع ہوا۔

مولانا محمد الاعظمی

میری نظر میں مولانا کی خوبی یہ ہے کہ علوم کتاب وسنت میں درک وبصیرت کے ساتھ تاریخ وثقافت، تحریک ودعوت اور جدید مسلکی وملی مسائل میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔ موجودہ دور کے سیمیناروں اور ان کے موضوعات میں دلچسپی مولانا کے ہم عمروں اور ہم عصروں میں تقریباً کالعدم ہے لیکن کئی سیمیناروں میں شرکت کا موقع ملا، تو مولانا کو وہاں اپنے مقالوں کے ساتھ حاضر پایا، اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے نوازے۔

ادھر تقریباً دس سال سے خلیجی ممالک میں کچھ قدر دانان حدیث نے مستند علماء حدیث سے سماع حدیث کا سلسلہ شروع کیا، تو ان کی نظر انتخاب مولانا اعظمی پر بھی پڑی۔اس مقصد کے لئے انھوں نے کئی سفر کئے، کویت تقریباً دوبار آنا ہوا، برادر گرامی شیخ عارف جاوید محمدی کے ساتھ ان سے سند بھی حاصل کی گئی۔

مزید تعارف ہوجانے کے بعد ان سے دعا سلام کا سلسلہ رہتا ہے۔کبھی کبھار تو وہ خود بھی خورد نوازی فرماتے ہیں، ابھی چند ماہ قبل قطر تشریف لائے ہوئے تھے۔یاد فرمایا بے حد خوشی ہوئی۔

اس عمر میں جو بھی ہمت ہے قابل داد ہے۔سفر میں فاضل گرامی مولانا اسعد اعظمی (صاحبزادہ) ان کے رفیق ہوا کرتے ہیں۔وہ اپنے والد گرامی کی اس خدمت پر بطور خاص

قابل مبارک باد ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے۔

میں نے ابھی ''مئو'' کے جن فضلاء گرامی کا تذکرہ کیا ہے ان میں مولانا محمد الاعظمی حفظہ اللہ کے علاوہ سب سوئے منزل روانہ ہو چکے ہیں۔ مولانا محمد الاعظمی ہمارے استاذ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ ازہری کے بھی استاذ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے اپنی اطاعت میں عمر طویل عطا فرمائے۔ اور مرحومین کو غریق رحمت کرے۔

محترم جناب ابن احمد نقوی نے مولانا مجاز اعظمی، فضا ابن فیضی اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؔ کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا:

''ان تین عبقری شخصیتوں کے اٹھ جانے کے بعد اب ہماری صفیں قد آور اور کوہ وقار اہل علم سے خالی ہوگئی ہیں۔ ان تینوں کی ذات وصفات سے جماعت اور جمعیۃ کو جو وقار حاصل تھا وہ شاید اب ماضی کی داستان بن جائے گا''

(ترجمان، دہلی جلد۳۲ شمارہ۴، ۲۹۔۱۶ فروری ۲۰۱۲ء ص۳)

مذکورہ بالا ان تینوں ذی وقار شخصیتوں کا تعلق ''مئو'' ہی سے ہے۔

ازاہرۂ مئو

ملک اور بیرون ملک میں سکونت پذیر اپنی جماعت کے معروف وقدیم ''ازاہرۂ ہند'' (فارغین ازہر) میرے علم کے مطابق ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ان میں تین کا تعلق اسی مردم خیز شہر ''مئو'' ہی سے ہے۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ (صدر جامعہ سلفیہ، ومدیر مجلہ صوت الامۃ)

مولانا مظہر احسن ازہریؔ (نائب صدر جامعہ سلفیہ وناظم اعلیٰ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو)

ڈاکٹر عبد العلی ازہریؔ (مقیم حال برطانیہ)

استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ مولانا مظہر اور ڈاکٹر عبد العلی کا تذکرہ اپنے ماحول میں لازم وملزوم ہوتا ہے۔ ان دونوں فضلاء مئو کی توصیف ہمارے ڈاکٹر صاحب بڑی وارفتگی سے فرمایا کرتے تھے۔

فاضل گرامی مولانا مظہر احسن ازہریؔ سعودی عرب میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہاں سے واپس آکر ''مئو'' ہی کو اپنی تگ وتاز کا مرکز بنایا۔

فاضل گرامی ڈاکٹر عبد العلی ازہریؔ کی ذہانت وفطانت ضرب المثل ہے۔ اپنے ماحول میں یہ بات حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں انھوں نے روانہ ایک پارہ قرآن حفظ کیا اور اسے تراویح میں سنایا اس طرح ایک مہینے میں اپنا حفظ مکمل کرلیا۔

جب وہ ایک مختصر مدت کے لئے ''الدار السلفیۃ'' (ممبئی) سے وابستہ ہوگئے تھے اس وقت استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب کو بڑی خوشی ہوئی تھی، اور وہاں سے برطانیہ چلے جانے کا ان کو بہت غم تھا کہ بحث وتحقیق کے میدان میں ایک عبقری شخص کو روکا نہ جاسکا۔

ان تینوں مئوی حضرت ''ازاہرہ'' کے ساتھ قدماء میں دو ازہریوں کا ذکر اور ہوتا ہے۔

ڈاکٹر سید سعید احمد عابدی (صدر شعبہ اردو، جدہ ریڈیو اسٹیشن) یہ نہایت پابند کتاب وسنت اور تقوی شعار خاندان کے چشم وچراغ ہیں، ان کا آبائی وطن ہمارا موضع (اونرھوا) ہی ہے۔

مدینہ یونیورسٹی کے زمانے میں انھوں نے ہم کئی طلبہ سے انٹرویو لے کر وقتاً فوقتاً اسے نشر کیا۔

میرا انٹرویو کب نشر ہوا مجھے نہیں معلوم، لیکن اسے مولانا محمد یحییٰ بن مولانا عبدالمتین بنارسی نے ایک رات کو سنا، اور صبح جا کر مولانا عبدالوحید رحمانی (شیخ الجامعۃ) سے بتایا کہ صلاح الدین نام کے ایک فارغ التحصیل نے جامعہ سلفیہ کا اپنے انٹرویو میں تعارف کروایا ہے اور اس کی تعریف کی ہے۔

مولانا عبد الرشید عبدالسلام ازہری بستوی (سابق صدر جامعہ ریاض العلوم دہلی) نہایت حلیم الطبع اور متانت وسنجیدگی کے پیکر تھے۔ مدینہ یونیورسٹی (سعودی عرب) سے وابستہ تھے۔ ہم تقریباً اٹھارہ طلبہ کا ریاض ایرپورٹ پر نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور اپنے کشادہ گھر میں چوبیس گھنٹے ٹھہرایا۔ ان کا گھر اس وقت سرائے عام اور دسترخوان صلائے عام بنا ہوا تھا۔

اسی قیام کے دوران ان کے ایک پاکستانی نژاد سعودی دوست شیخ محمد ایوب (امام مسجد حلۃ العنوز الریاض) آئے، اور تعارف کے بعد انھوں نے درخواست کی کہ ان میں سے کوئی صاحب ہمارے ساتھ چلیں اور ہماری مسجد میں تقریر کردیں۔ شیخ عبدالرشید نے بھی ان کی تائید کی۔ مختصر یہ کہ ہمارے رفقاء کو بھی مذاق سوجھا کہ بہت عربی بولتے تھے اب جاؤ، اور مجھے ان کے ساتھ جانے پر مجبور کیا گیا۔ بادل ناخواستہ گیا، اور چند منٹ میں نے کچھ کہا، نماز ظہر کے بعد مسجد کے پڑوس میں دعوت ہوئی، صاحب دعوت نے ایک ہزار اور ایک دوسرے حاضر شخص نے ڈھائی سو ریال کا تحفہ پیش کیا۔ یہ سعودی عرب میں میرے ورود کا پہلا دن، پہلی تقریر، پہلی دعوت اور پہلا تحفہ تھا۔

اب اس تقریر کی عمدگی کا حقیقت کے برعکس آج تک شہرہ اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی اس تقریر میں موجودگی کا بے سروپا سنئے۔

جامعہ سلفیہ (بنارس) میں یہ مشہور ہوگیا کہ اس نے ریاض میں بڑی عمدہ تقریر کی اور بہت انعام ملا۔

تعجب کی حد نہ رہی کہ ابھی مارچ ۲۰۱۲ء میں جالیات کی ایک بڑی مجلس میں میرے ایک عزیز نے میری موجودگی میں، میری تقریر کے بعد میرا تعارف کرواتے ہوئے بلا جھجک کہا کہ: "شیخ نے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے سامنے عربی میں برجستہ تقریر کی اور انعام حاصل کیا"۔

میں نے ان سے کہا کہ برائے کرم اس بے سروپا کو پروگرام کی کارروائی سے نکال دیں۔

کاتب تقدیر نے تو ایک لکھ کر بس کیا
ان رقیبوں نے اسے نقطہ لگا کر دس کیا

اس لطیفے کے بعد رجالِ اسانید ورواۃ حدیث کے سلسلے میں حضرات محدثین کے سخت شروط وضوابط کی افادیت پر یقین میں اضافہ ہوا۔ اور یاد آیا کہ اسی طرح ایک قصہ گو نے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین (رحمہما اللہ) کی موجودگی میں مسجد کے اندر ایک بے سروپا حدیث بیان کی اور کہا کہ میں نے اسے احمد اور یحییٰ سے سنا ہے۔

ان دونوں اماموں نے تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ امام ابن معین نے اس سے پوچھا کہ تم دونوں کو پہچانتے ہو، میں یحییٰ اور وہ احمد ہیں تو اس پر اس قصہ گو نے

کہا کہ تم جیسے چالیس احمد اور یحیٰ میرے پاس موجود ہیں۔

فاضل گرامی مولانا عبدالرشید ازہری رحمہ اللہ کے تذکرہ کی مناسبت سے یہ لطیفہ یاد آ گیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے۔

میری نظر میں جماعت کے یہ پانچ قدیم فارغین ازہر ہیں، جن کے اپنے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں ہیں، اور کامیابی وکامرانی نے ان کی قدم بوسی کی ہے۔ اس کاروان ذی قدر کے تین حضرات (بشمول ڈاکٹر صاحب) کا تعلق ان کے اسی علمی وصنعتی شہر ''مئو'' سے ہی ہے۔

مدارس مئو:

مدت قدیم سے ''مئو'' کو معتبر سلفی مدارس کا مرکز ہونے کی سعادت حاصل ہے۔ جامعہ سلفیہ اور اس کے بعد قائم ہونے والے سلفی اداروں سے قبل، مدارس مئو ہی کے فارغین تقریباً پورے ملک میں زمام تعلیم وتربیت، تدریس وافتاء، دعوت وتبلیغ اور تصنیف وتالیف سنبھالے ہوئے تھے۔ مختلف تعلیمی مراحل میں ہمارے شیوخ واساتذہ کی اکثریت انھیں مدارس کی فارغ التحصیل تھی، خود استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب نے بھی انھیں مدارس سے سند فراغت حاصل کی۔ یہاں پر تین ممتاز مدارس قابل ذکر ہیں:

جامعہ عالیہ عربیہ:

بہت پہلے بڑی آرزو کے بعد اس قدیم ادارہ کی زیارت کا موقع ملا۔ ایک مختصر استقبالیہ مجلس کا انعقاد ہوا، میں ایک نو وارد شخص تھا مجھے کیا خبر تھی کہ اس مجلس میں اپنے اپنے میدان کے بلند وقار مشاہیر وقت موجود ہیں۔ پہلی بار اسی مجلس میں مشہور زمانہ شاعر فضا ابن فیضی جماعت کے بے مثال ادیب ومحرر مولانا عبدالحکیم مجاز اعظمی، ماہر حدیث مولانا محمد الاعظمی اور معروف مدرس ومنتظم مولانا مظہر احسن ازہری وغیرھم سے شرف باریابی حاصل ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے، اور مرحومین کو غریق رحمت فرمائے۔

جامعہ اسلامیہ فیض عام:

اس اہم ادارہ کے ذمہ داروں میں مفتی حبیب الرحمٰن اعظمی اور اس وقت یہاں کے لائق مدرس مولانا محمد بنارسی وغیرہم سے ملک وبیرون ملک میں ملاقات رہی۔

اس اہم ادارہ اور اس کے ان حضرات ذمہ داران سے کچھ یادیں وابستہ ہیں جن کے اظہار کا اس وقت موقع نہیں۔ اللہ تعالیٰ ادارہ کو ترقی بخشے۔

جامعہ اثریہ دارالحدیث

یہاں کے ذمہ داروں میں جناب فخر العبید اعظمی، مولانا جمیل احمد، اور اس کے لائق وفائق مدرسین مولانا محمد احمد اثری بستوی اور مولانا عبدالشکور اثری وغیرہم سے یہاں بھی ملاقات ہوئی اور کویت میں بھی ملاقات ہوتی رہی۔

اسی سفر میں اپنے رفیق درس مولانا وحید الزماں رحمہ اللہ (نائجیریا) کے محلہ کھیدوپورہ میں بھی حاضر ہوا اور وہاں واقع مدرسہ ''جامعہ محمدیہ'' اور اس کے ذمہ داروں کی زیارت سے محظوظ ہوا۔

اب تو متعدد ادارے، کلیہ للبنات، وغیرہ قائم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ تمام اداروں کو قائم ودائم رکھے۔

ان اداروں میں بعض کے ذمہ داران بغرض تعارف وملاقات وطن میں اپنی موجودگی کے وقت غریب خانہ پر بھی تشریف لائے۔ فاضل گرامی مولانا شریف اللہ سلفی کی معیت میں بھی ایک بار کچھ حضرات تشریف لائے تھے۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

اپنے ان اہم سلفی اداروں کا چونکہ میں نے بیحد جذباتی انداز میں مشاہدہ کیا تھا، اس لئے وطن سے کویت واپسی کے بعد میں نے ان کا بھرپور تعارف کروایا۔ میں تو ایک بے فیض معمولی آدمی کر ہی کیا سکتا تھا لیکن بعض مدارس کی طلب پر کچھ درسی وغیر درسی کتابیں ضرور ارسال کروادی تھیں۔

مجھے بتایا گیا کہ کہا جاتا ہے کہ صلاح الدین کو مئو کے مدارس کے بارے میں معلومات نہیں ہیں، اس لئے ان کو سفارش نہیں کرنی چاہئے، غور وفکر کے بعد مجھے اب تک معلوم نہ ہوسکا کہ اس میں حرج کی کیا بات تھی۔ بہرحال:

رموز سلطنت خویش خسرواں دانند

جامعہ سلفیہ سے قبل مدارس مئو ہی کو مرکزیت حاصل تھی، ذمہ داران مدارس پر واجب ہے کہ وہ دوبارہ چمن بندی کریں، اور اپنی مستحکم تعلیم وتربیت کے ذریعہ تشنگان علوم نبوت کو ماضی کی طرح فیضیاب کریں۔ اللہ تعالیٰ اتفاق واتحاد اور توفیق سے نوازے۔

یرحم اللہ عبدا قال: آمینا

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

ہمارے اساتذۂ جامعہ سلفیہ:

جامعہ سلفیہ نے اس وقت مختلف شعبہ ہائے علم کے ماہرین اساتذۂ کرام کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیا تھا، جن کی علمی لیاقت وصلاحیت کا شہرہ پورے ملک میں تھا۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

ہمارے اساتذہ کرام میں اس وقت مولانا عبدالمعید بنارسی جیسے علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر اور درسی کتب نحو وصرف کے نامور مترجم، مولانا شمس الحق سلفی جیسے شیخ الحدیث، مولانا محمد رئیس ندوی جیسے محدث وناقد اور علم رجال واسانید کے محقق، مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی جیسے مفتی وقلم کار، مولانا محمد عابد رحمانی جیسے ماہر علوم وفنون، مولانا عبدالوحید رحمانی جیسے خوش گفتار وکردار، نفاست پسند اور مشفق شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جیسے منتظم اور عربی صحافت کے نقیب وامین موجود تھے۔

اسی سال عالمی شہرت یافتہ مقرر ومحرر مولانا عبدالحمید رحمانی، لائق مدرس مولانا عبدالسلام مدنی، اور فصیح اللسان استاذ مولانا عبدالرحمٰن لیثی، مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد جامعہ سلفیہ سے منسلک ہوئے۔

عالمیت کے آخری سالوں میں معروف سیرت نگار مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، مشہور مدرس مولانا عبدالحنان فیضی اور عربیت کے قادر الکلام استاذ مولانا انیس الرحمٰن اعظمی کا تدریسی عملہ میں اضافہ ہوا۔

اس وقت صدر جامعہ آبروئے جماعت شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری تھے اور نظامت کا فریضہ نہایت بخیر وخوبی خاندان تاج کے گل سرسبد مولانا عبدالوحید بن عبدالحق سلفی (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ) انجام

دے رہے تھے۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلهم
إذا جمعتنا یا جریر المجامع

یہاں ایک حقیقت کا انکشاف مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ استاذ گرامی مولانا عبدالحمید رحمانی اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری منتہی طلبہ کی تدریس پر متعین تھے، اس لئے ان دونوں حضرات سے ہم لوگوں کو کلاس میں استفادہ کا موقع نہیں ملا، پھر ڈاکٹر صاحب پی. ایچ. ڈی (Ph.D) کی ڈگری کے لئے علی گڑھ اور ۱۹۷۳ء میں کسی وقت مولانا رحمانی ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی حیثیت سے دہلی روانہ ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض رفقاء درس نے ان دونوں صاحبان کا تذکرہ اپنی فہرست اساتذہ میں نہیں کیا ہے۔

لیکن ان دونوں حضرات سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ کے کچھ مقامات ایسے ہیں کہ جب بھی ان سے سابقہ ہوتا ہے تو یہ حضرات فوراً یاد آ جاتے ہیں، لہٰذا مجھے یہ اعتراف کرنے میں فخر ہے کہ ان کی نصیحت وخیر خواہی کا اثر میری دعوتی وتصنیفی زندگی پر آج تک ہے۔

راقم نے استاذ گرامی مولانا رحمانی صاحب ہی کی تحریک پر ''جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث'' (مولفہ مولانا محمد اسماعیل سلفی) کی تعریب وتعلیق کی، کویت پر عراقی حملہ کے بعد وطن واپسی پر انھوں نے اس کے ذوق کے مطابق ''ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سنٹر'' دہلی کے نشریاتی ادارہ مجمع البحوث الاسلامیۃ کی خدمت کا موقع بہم پہنچایا۔

اسی زمانے میں راقم کی دو کتابوں ''زوابع فی وجه السنة: قديما وحديثا'' اوردعوة شيخ الاسلام شائع ہوئیں۔

استاذ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جامعہ سلفیہ میں:

ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ مولانا عبدالوحید سلفی جیسے تقوی شعار، تجربہ کار کی نگاہ دوربین نے ڈاکٹر صاحب کے اندر موجود جوہر صلاحیت کو تاڑ لیا تھا جب وہ ۱۹۶۸ء میں جامعہ سلفیہ سے منسلک ہوئے تو ناظم اعلیٰ نے ان پر بھرپور اعتماد فرمایا، انھیں کی ادارت سے ''مجلة صوت الجامعة'' (عربی) کا اجراء ہوا، ''إدارة البحوث الإسلامية'' کے قیام کے روز اول سے وہی اس کے نگراں، بلکہ روح رواں رہے، ملک وبیرون ملک میں ''مجلہ'' اور خطوط نویسی کے ذریعہ جامعہ کے تعارف کا حق ادا کیا اور اس کی تعلیمی، تربیتی اور ترقیاتی پالیسی طے کرنے میں ان کے مشوروں کا ہمیشہ خیال رکھا گیا اور آخر میں جامعہ کا منصب صدارت بھی ان کے لئے خاص ہوگیا۔

اپنے سلسلہ میں جامعہ کے اعتماد کی بحالی کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو اس کی خدمت کے لئے وقف کرکے دیا۔ تینتالیس سال کی طویل مدت میں بہت سے نرم وگرم حالات پیش آئے ہوں گے، بعض سعودی جامعات میں ان کی تقرری کے امکانات بھی روشن تھے، لیکن ایک بار ان کی زبان سے مدینہ یونیورسٹی کے زمانہ میں خود سنا کہ اتنی مدت تک جامعہ سلفیہ سے گونا گوں وابستگی

کے بعداب اسے خیر باد کہنا آسان نہیں۔

میرے خیال میں جامعہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ غیر معمولی موقف (هل جزاء الاحسان إلا الإحسان) (احسان کا بدلہ احسان) کا ایک مخلصانہ مظہر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جامعہ سلفیہ مولانا عبدالوحید سلفی (ناظم اعلیٰ) کی نظامت میں عالمی شہرت کا حامل دینی ادارہ گردانا جانے لگا۔ اس کی ترقی میں ان کے دو مشیر کاروں کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ایک مولانا عبدالوحید رحمانی (شیخ الجامعہ) اور دوسرے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (سابق صدر جامعہ) فرحمهم الله رحمة واسعة

ایں سعادت بزور باز ونیست

کارآمد شخصیات کو اپنے میدان میں کام کرنے کا موقع فراہم ہونا، بذاتِ خود اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے، اوران مواقع کا بجا طور پر استعمال کر کے بھرپور فائدہ اٹھالینا اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں، مشاہدہ میں ہے کہ کتنی باصلاحیت شخصیات موقع کی فراہمی کے باوجود بھی توفیق کمال سے محروم رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب کو جامعہ سلفیہ کا پلیٹ فارم ایسے وقت میں میسر فرمایا جب ملک کے طول وعرض میں اپنی جماعت کے پاس اس سے بہتر کوئی پلیٹ فارم نہ تھا، اپنی صلاحیت کے مطابق انھوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور زمین سے اٹھ کر شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ اللہ کی توفیق سے وہ اتنے اعزازات سے نوازے گئے جن میں سے چند کا حصول بھی صرف معدودے چند علماء معاصرین کے ہی حق میں آیا ہے۔

حافظ قرآن، مشہور زمانہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل، جامعہ ازہر کے سند یافتہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی.ایچ.ڈی، جامعہ سلفیہ کے استاذ اور ریکٹر، مجمع البحوث الإسلامیۃ کے روح رواں، ''مجلۃ الجامعۃ'' (عربی) کی چالیس سال سے زائد عرصہ تک کامیاب ادارت، چار سو سے زائد عربی مقالات، ساڑھے تین سو سے زائد اردو مضامین کے محرر، عربی، اردو، ہندی اور انگلش زبانوں میں دوسو سے زائد کتب ورسائل پر پیش لفظ، چالیس سے زائد اردو اور عربی کتابوں کی تصنیف، تحقیق اور ترجمے، ملک وبیرون ملک کی دسیوں کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت، جمعیۃ اہل حدیث ہند کی منعقد کردہ کانفرنسوں کی مجالس استقبالیہ کی صدارت، ماہر ادب عربی کی حیثیت سے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز، مسلم یونیورسٹی، مسلم پرسنل لاء اور آخر میں جامعہ سلفیہ کی صدارت: (ذالك فضل الله يوتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم)

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

رازہائے کامیابی:

اپنے میدان میں کارہائے نمایاں کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ متعلق افراد میں وہ صفات موجود ہوں جنھیں رازہائے کامیابی تصور کیا جاتا ہے، ان کے بغیر انسان اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے بھی عملی زندگی میں افراتفری کا شکار ہوگا۔ ان میں سے چند صفات وخصوصیات

مندرجہ ذیل ہیں جو استاذ گرامی میں موجود تھیں۔

اپنے مشن سے والہانہ وابستگی:

زندگی بھر مطالعہ، تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا مشغلہ رہا، اور یہ مشغلہ دم واپسیں تک باقی رہا۔ وفات سے ہفتہ عشرہ قبل جب علاج کے لئے انھیں بنارس سے دہلی منتقل کیا گیا تب بھی ان کے سامان سفر میں کتاب موجود تھی۔ اسی طرح سنا کہ مسلسل تکلیف میں اضافہ کے وقت بھی کہا کرتے تھے کہ اگر درد کم ہو جائے تو کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر لیتا۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

وقت کی قدر وقیمت

میری نظر میں اپنے ماحول کے علماء میں ڈاکٹر صاحب کو وقت کے استعمال میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ کلاس میں گئے آفس میں واپس آئے اور لکھنے پڑھنے میں مصروف۔

میں ڈاکٹر صاحب کے آفس میں کئی ماہ اپنے بستر کے ساتھ رہا ہوں۔ جب وہ آفس میں گھر سے تشریف لاتے اور روٹین ورک سے اکتا جاتے تو کبھی کبھار طنز ومزاح اور ظرافت کے موضوع سے متعلق ایک بوسیدہ سی کتاب خاموشی سے نکالتے پھر اسے پڑھ کر کتابوں کے درمیان رکھ دیا کرتے اور پھر مصروف ہو جاتے، ایک دن میں نے بھی اسے دیکھا پھر چھٹی کے اوقات میں میں بھی کبھی کبھار اسے پڑھ کر ویسے ہی رکھ دیا کرتا تھا۔

اسی طرح نظام الاوقات کی پابندی خواہ وہ کلاس سے متعلق ہو یا عام اجتماعات سے، ان کی زندگی کا خاصہ بن گئی تھی۔ بغیر کسی مطالبہ اور پریشر کے انھوں نے اپنے آپ کو پابندی وقت کا عادی بنالیا تھا۔

افسوس کہ آج پابندی وقت کے لئے آفسوں میں قانون بنایا جاتا ہے تب بھی لوگ اس کی پابندی سے عاجز نظر آتے ہیں۔

مستقل مزاجی:

کارہائے نمایاں کی انجام دہی کے لئے مستقل مزاجی بے حد ضروری وصف ہے۔ بطور خاص طویل المدت اعمال کی تکمیل کے لئے اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب جو کام شروع کرتے اسے بہت مستقل مزاجی سے پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ کی کتاب ''تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی مساعی جمیلہ'' کا عربی ترجمہ پہلے برسوں ''مجلّہ الجامعۃ'' میں قسط وار شائع ہوا۔ پھر ۱۹۷۷ء میں اس کا پہلا ایڈیشن کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ جس کی فہرست سازی کا شرف اس وقت اس راقم ہی کو حاصل ہوا تھا۔

مجلّہ ''صوت الامۃ'' کی تقریباً چالیس سالہ ادارت کے زمانے میں مسلسل اس کا اداریہ تحریر فرمایا، شاید کبھی ناغہ ہوا ہو، میرے نزدیک یہ ان کی مستقل مزاجی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

علمی ورفاہی میدانوں کے شہسوار کتنے علماء وفضلاء ہیں جنھوں نے کتنے اہم علمی اور رفاہی کاموں کی شروعات بیحد شوق وذوق سے کی، اور اپنے اپنے میدان

میں بہتوں کو ان سے کافی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن مستقل مزاجی کا فقدان ہی کہیئے کہ وہ اپنے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

نظم ونسق:

نظم ونسق خواہ وہ امور کی انجام دہی سے متعلق ضابطے ہوں، یا اپنے ماحول اور آفس میں ترتیب وتنظیم کا مسئلہ ہو، معاملہ کے دونوں پہلوؤں میں نہایت کامیاب تھے۔

قوانین وضوابط کی پابندی وہ خود فرماتے، اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے۔ جامعہ سلفیہ سے باہر بھی جو ذمہ داری انھیں کانفرنسوں وغیرہ سے متعلق سونپی جاتی وہ اس کی ادائیگی کی کوشش کرتے جمعیۃ اہل حدیث کے پاکوڑ کانفرنس کے وہ صدر استقبالیہ تھے۔ انھیں میں نے بڑی توجہ سے نظم ونسق کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھا۔

اسی طرح آفس وغیرہ کی ترتیب وتنظیم میں ان کے یہاں افراتفری کا منظر میں نے کبھی نہیں دیکھا، ہر چیز اپنی جگہ پر، جب چاہا اٹھالیا، میں نے کم ہی دیکھا کہ وہ کوئی کتاب یا کاغذ وغیرہ اپنے آفس میں دیر تک ڈھونڈھ رہے ہوں۔

کامیاب زندگی کے یہ عناصر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا لازمہ بن گئے تھے۔ سفر وحضر اور صحت ومرض تمام حالات میں عمر کے آخری ایام تک ان امور کی پابندی میں کوئی قابل ذکر فرق نہ آیا:

ہمارا نغمہ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

اسلوب نگارش:

استاد گرامی ڈاکٹر صاحب کا اسلوب نگارش عربی اور اردو دونوں زبانوں میں سادہ وشگفتہ، غیر مانوس الفاظ وتراکیب کی پیچیدگی سے دور، اور مافی الضمیر کی مکمل ادائیگی کا مظہر ہے۔ موقع ومحل اور موضوع کے اعتبار سے اس میں جذبات کی فراوانی کے ساتھ افہام وتفہیم کے ناصحانہ اقدار کی ترجمانی بہتر انداز میں موجود ہے۔

عربی ترجمانی:

اردو اور عربی دونوں زبانوں میں ان کی قوت تحریر مسلم ہے۔ دونوں زبانوں سے دونوں زبانوں میں ترجمے کا یکساں ملکہ، اور اس کی کثرت وفراوانی ان کے معاصرین میں کمیاب ہیں۔ ادق عبارتوں کی عام فہم ترجمانی، پیچیدہ انداز تحریر کی شگفتگی کے ساتھ وضاحت اور پھر ترجمہ میں اصل عبارت کی اثر آفرینی ان کی ترجمانی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ میں نے تو کئی جگہ اردو عبارت کے مفہوم کی تعیین ان کی عربی ترجمانی سے کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ترجمہ کا ممتاز ملکہ عطا فرمایا تھا، انھوں نے اس ملکہ کو پروان چڑھایا۔ مشہور زمانہ کتاب سیرت ''رحمۃ للعالمین'' مولفہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری اور تحریک اہلحدیث کے موضوع پر عمدہ اور باوثوق کتاب ''تحریک آزادی فکر'' مولفہ مولانا محمد اسماعیل سلفی وغیرہ جیسی اہم کتابوں کو عربی کا جامہ پہنا کر جہاں اس باب میں اپنی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا، وہیں عالم عرب کو برصغیر کے معروف مصنفین کی تخلیقات سے استفادہ کا موقع ملا۔

ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے یہاں ترجمانی کا کام مستقل تصنیف وتالیف پر غالب ہے۔

ہر گلے را رنگ بوئے دیگر ست

ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات پر ایک سرسری نگاہ:

اردو تصانیف عصر حاضر میں تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن، معاشرتی وعائلی نظام، تحریک وتاریخ، ادبِ عربی اور سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ کی اہمیت وضرورت پر مشتمل ہیں۔

عربی تالیفات میں اخلاق واقدار، ادبیت کے برگ وبار اور تاریخ کی روشنی میں عصر حاضر کے چند اہم واقعات وحادثات کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں سے دونوں زبانوں میں ترجمے کے موضوعات میں اصول تفسیر، حجیت حدیث، سیرت وتاریخ، جماعت وتحریک اور تہذیب وثقافت کا غلبہ ہے۔

مجلّہ کے اداریوں میں ملک اور عالم اسلام کے اہم واقعات وحوادث کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ موجود ہے، نازک مسائل میں اخبارات میں شائع شدہ بیانات کے ترجمے نذرِ قارئین کردیئے جاتے تھے۔

اگر ڈاکٹر کے صرف اہم مضامین اور اداریوں کو یکجا کردیا جائے تو سیکڑوں صفحات پر مشتمل مجموعۂ مقالات تیار ہوجائے گا۔ یہ بہت آسان کام ہے، ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر فوزان احمد سلمہ کو اس سلسلہ میں یاددہانی کرائی گئی ہے اللہ تعالیٰ توفیق سے نوازے۔

اخلاق وآداب اور خصوصیات:

ڈاکٹر صاحب نے جامعہ سلفیہ بنارس جیسے دینی و تعلیمی ادارہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا، اور زندگی کے آخری ایام تک یہی ادارہ ان کی تگ وتاز کا میدان رہا، پھر وہ اپنی خدمات کے سبب ایک سربرآوردہ شخصیت کے مالک تھے، اس لئے ان کا تعلق براہ راست ذمہ داران جامعہ بطور خاص ناظم اعلیٰ، اساتذۂ کرام، طلبہ اور دیگر ملازمین سے تھا، میری نظر میں ان کی شخصیت اپنے اخلاق وآداب کے تناظر میں اس پرآشوب دور میں بسا غنیمت تھی۔

- ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید سلفی اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان جامعہ سلفیہ کے مصالح سے متعلق گفتگو سننے کا موقع ملا، اس کے تعارف وتعاون کے سلسلہ میں خطابات و مکتوبات کے تبادلہ کا عمل بہت اہم، اور اس میں ان کا کردار بہت بلند تھا، ان دونوں حضرات نے ایک دوسرے کے مقام ومرتبہ کا لحاظ کیا، اور دونوں طرف سے ایک دوسرے کی ہمت افزائی وقدردانی ہوئی۔
- تمام اساتذۂ کرام کے ساتھ ان کے تعلقات بہتر تھے، ان میں سے کچھ ان سے جونیر، کچھ ہم عمر اور کچھ سینیر تھے، سینیر اساتذہ میں مولانا عبدالمعید بنارسی اور مولانا شمس الحق سلفی ان کے استاذ تھے، میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں کی بہت عزت کرتے تھے۔
- طلبہ کے ساتھ ان کا معاملہ ناصحانہ اور ابتدائی زمانہ میں سینیر طلبہ کے ساتھ بالکل برادرانہ تھا، ذہین طلبہ کی

تربیت کے لئے ان کے یہاں کافی گنجائش تھی۔ اسی کشادگی کا نتیجہ تھا کہ کئی لائق وفائق طلبہ کو ان کے مستقبل کی فکر کرتے ہوئے ایک بار اپنی مداخلت سے انھیں قانونی گرفت سے بچالیا، ان میں سے بعض معروفین آج ملک و ملت کے لئے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

● ملازمین کے ساتھ بھی ان کا معاملہ نہایت مشفقانہ تھا، بطور خاص پریس سے متعلق ملازمین تو انھیں کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ ان میں پریس مین غیر مسلم تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب علی گڈھ سے پی. ایچ. ڈی کی ڈگری لے کر واپس آئے اور انھیں لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کہنا شروع کیا، تو پریس مین صاحب (جو نہایت سادہ سے انسان تھے) سر درد کی دوا لینے ان کی خدمت میں پہنچ گئے، تو مسکرا کر فرمایا کہ آپ خود سے آئے ہیں یا کسی نے بھیجا ہے؟ آپ جایئے جایئے!

● میرے علم و تجربہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے ذاتی معاملات میں بھی بہت محتاط اور نظم ونسق کے عادی تھے، دوسرے اساتذہ کے برعکس اپنا ذاتی کام دوسرے کا سہارا لئے بغیر خود کرتے، سفر وحضر میں میں نے اس کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے۔

● انسان کی زندگی میں آزمائش کی گھڑیاں بھی آتی ہیں نازک ترین وقت میں کسی بھی پیش کش کا شکریہ ادا کرکے اپنی حالت پر صبر وقناعت کرلینا باعزت ہستیوں ہی کا خاصہ رہا ہے، اس وصف عزیز کی سب کے یہاں پذیرائی نہیں۔

گذر اوقات کرلیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

ان کی وفات سے چند ساعت قبل (بترا ہاسپٹل۔ دہلی) میں ان کے اقرباء نے بھی اسی وصف کا مظاہرہ فرمایا، پھر تاریخ کے کئی واقعات اپنی جھلک دکھا کر تیزی سے گزر گئے۔

کم ہیں وہ طائر کہ ہوں دام وقفس سے بہرہ مند

● ڈاکٹر صاحب دور دراز علاقوں میں کچھ یتیم اور فقیر طلبہ، اور مستحق متعارفین کی بھی امداد فرماتے تھے اور اپنے مستطیع شاگردوں کو بھی کبھی کبھار اس کی توجہ دلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس عمل کو قبول فرمائے۔

● استاذ گرامی ازہری صاحب ایک موحد گھرانے کے پروردہ، مسلکی مدرسہ کے فارغ التحصیل، جامعہ ازہر کے آزاد عالمی ماحول سے مستفید، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ جیسے عصری ادارہ کے فیض یافتہ اور جمعیۃ اہل حدیث سے وابستہ شخص تھے، ان تمام درسگاہوں اور تربیت گاہوں کا عکس جمیل بھی ان کی شخصیت پر پڑا۔ جو موقع بہ موقع اپنے اپنے مقام پر ظہور پذیر ہوا کرتا تھا۔

اسی تاثیر واثر کا کرشمہ تھا کہ وہ جماعتی، ملی اور غیر ملی اجتماعات میں نہایت کشادہ ظرفی سے شرکت فرماتے، اصولی بحث کرتے اور بڑی سنجیدگی سے اپنے موقف کی وضاحت فرماتے۔ انفعال اور افتعال کی اس گریز پائی کو بعض لوگوں نے ''صلح کلی'' سے تعبیر کیا ہے، جو ملی اور غیر ملی اسٹیجوں پر اپنا نظریہ پیش کرنے کے حق میں میرے نزدیک قابلِ ستائش ہے، مذموم نہیں، ورنہ پھر دوسروں کے سامنے اپنا موقف بیان کرنے کا کبھی موقع ہی نہیں مل سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کے حق میں شاعر کا یہ شعر بہت موزوں ہے۔

آزادہ رو ہوں میں، مرا مسلک ہے، صلح کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

اساتذۂ کرام کی خدمت تک رسائی اور سبب:

میں ایک دور افتادہ دیہات کا نحیف وناتواں طالب علم تھا، ملک کے طول وعرض سے آئے ہوئے سیکڑوں ذہین وفطین طلبہ جامعہ سلفیہ میں موجود تھے۔ میرے پاس تحصیل علم کے ذوق وشوق کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہ تھا جس سے اساتذہ کرام سے متعارف ہوکر ان کی خدمت کا شرف حاصل کرسکوں۔

میرے خیال خام میں ہوا یہ کہ جامعہ رحمانیہ کی جماعت رابعہ کے سالانہ امتحان میں میری پہلی پوزیشن آگئی، اور اسی طرح جامعہ سلفیہ میں عالمیت سال اول کے سالانہ امتحان میں بھی ہوا۔ پھر میں اساتذۂ کرام اور طلبہ کے درمیان متعارف ہوگیا۔ (اس کے بعد ہمیشہ مولانا محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ) کی پہلی پوزیشن آتی رہی، اور آخری سال کے علاوہ میری دوسری پوزیشن رہا کرتی تھی۔ سالِ آخر میں دوسری پوزیشن مولانا شہاب اللہ جنگ بہادر (امارات)، تیسری پوزیشن میری اور چوتھی پوزیشن مولانا عبداللہ سعود (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس) کی تھی۔

ہمارے سربرآوردہ رفقاء درس میں ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری (سابق شیخ الجامعہ بنارس) ڈاکٹر عبدالقیوم محمد شفیع (قطر) ڈاکٹر بدرالزماں نیپالی، مولانا رفیع احمد عاقل (اسٹرالیا) مولانا عبدالقدوس خیر اللہ (جامعہ محمدیہ مالیگاؤں) اور مولانا عبدالمجید صاحبزادہ (سراج العلوم جھنڈا نگر۔ نیپال) وغیرہم کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں)

مجھے بلاتفریق تمام اساتذہ کرام، بطور خاص تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی خدمت کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا عبدالمعید بنارسی جیسے اصول پرست اور نقاد مدرس (جن کے کلاس میں طلبہ اٹھنے بیٹھنے، اور کلاس کے باہر ان کے سامنے گزرنے سے گھبراتے تھے) کے معیار خدمت پر مدتوں پورا اترا (پھر یہ خدمت مولانا بدرالزماں نیپالی کی درخواست پر تعارف کے بعد انھیں سونپ دی) مولانا عبدالوحید رحمانیؒ (شیخ الجامعہ) کے حکم سے سال کے شروع میں طلبہ کو درسی کتابیں تقسیم کرنا اور ندوۃ الطلبۃ کی فیس جمع کرتا۔ مولانا محمد ادریس آزاد رحمانیؒ (مدیر محدث) فتوی نویسی فرماتے، مدتوں اس کی تبییض کا کام کرتا رہا، مولانا عبدالحمید رحمانیؒ (صدر ''ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر'' ۔ دہلی) کے مضامین اور لمبے لمبے خطوط کی تبییض، اور ڈاکٹر صاحب کے علی گڈھ چلے جانے کے بعد۔ مولانا رحمانی کی نگرانی میں مجلّہ کی اشاعت کے وقت پروف ریڈنگ کا کام بھی کیا ہے۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے سیرت کے موضوع پر جب رابطہ کے انعامی مقابلہ میں شرکت کے لئے ''الرحیق المختوم'' کی ابتدا کی تو ہم کئی سربرآوردہ طلبہ ان کے ساتھ متعاون رہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد قلت وقت کے سبب میرا تعاون جاری نہ رہ سکا۔

مولانا محمد رئیس ندوی کی مفید ترین کتاب ''اللمحات إلى ما في أنوار الباري من الظلمات'' کے نقش اول کے سیکڑوں صفحات کی تبییض راقم نے کی ہے،

اور ابھی تقریباً چالیس سال کے بعد اس کے دوسرے ایڈیشن پر مقدمہ لکھنے کا شرف مجھے بھی حاصل ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے احسانات:

عربیت میں مہارت اور جامعہ سلفیہ بنارس کے تمام معاملات میں دخیل ہونے کے سبب بھی طلبہ کے دلوں میں ان کا ایک عجیب سا رعب تھا، وہ منتہی طلبہ کو درس دیا کرتے تھے، اس لئے عالمیت کے ابتدائی سالوں میں کلاس کے اندر ان سے استفادہ کا موقع تو نہ ملا، لیکن میں یہ اعتراف کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ ان کی توجہ نے میری عربیت کے ذوق کو مزید جلا بخشا، اس کی تھوڑی تفصیل یوں ہے:

- ہم لوگوں کی درخواست پر عصر کے بعد عربی بول چال کے لئے وقت خاص کیا، پہلے دن مجھے یاد ہے کہ انھوں نے (واس) کا فل فارم پوچھا، میں عربی جرائد ومجلّات پڑھتا تھا تو فوراً بتا دیا (وكـالة الأنبـاء السعودية) بہت خوش ہوئے۔

- مجلّہ "صـــوت الامة" کی پروف ریڈنگ سے امتحان کا آغاز فرمایا، غور سے پڑھتے وقت مقالات میں نحوی وصرفی اغلاط کی بھی نشان دہی ہوجاتی تھی۔ اس نے مزید ذوق وشوق میں اضافہ کیا:

ڈاکٹر صاحب کے علی گڈھ جانے کے بعد، وقتی طور پر مجلّہ کی ترتیب کا کام مولانا عبدالحمید رحمانیؔ نے سنبھالا، آداب املاء، ہمزۂ وصل وفصل میں فرق اور تمیز وغیرہ رحمانی صاحب سے سیکھا۔

- ایک بار ڈاکٹر صاحب کی صدارت میں جمعرات کو "نادی الطلبۃ" (شعبہ عربی) میں تقریر کی باری تھی، محاسن اسلام پر رٹی رٹائی تقریر کی۔ اس پر ہمت افزائی کرتے ہوئے فرمایا (بـمـثـل هـذه الـمـناسبة يقال: فلان قتل الموضوع قتلاً)

دوسرے موقع پر تقریر میں عبارت (نـــقـــطة تـحـول) آئی۔ جسے میں نے اپنی کم علمی کے سبب (لـقطةُ تحولٍ) کہا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی تصحیح فرمائی اور اس کا معنی بتایا۔ انگلش میں وہ (Turning point) کے معنی میں ہے۔

ایک بار میں نے لفظ پر غور کئے بغیر اپنے مقالے میں (يهودون المسجد الاقصىٰ) کا جملہ استعمال کیا، اور اسے لاعلمی سے ملیامیٹ کے معنی میں سمجھا، انھوں نے اس کی تصحیح فرمائی اور بتایا کہ (تهـويـد) یہودی بنانے کے معنی میں ہے۔

- فراغت کے بعد تقریباً چودہ مہینوں تک جامعہ سلفیہ میں رہنے کا موقع ملا، لائبریری کی ترتیب وتنظیم کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے آفس میں رہ کر تقریباً علامہ سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی اور ان کے تیرہ شاگردوں پر (شـخـصـيـة فـي سطور) کے تحت مقالے لکھے جو ان کی نگرانی میں شائع ہوئے۔

انھیں مقالوں کے حوالہ سے امام عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (مـفـتـئ اعـظـم سـعـودی عـرب) کے سامنے تعارف ہوا۔ اور کئی سلفی علماء وفضلاء نے نام سن کر مجلّہ کے حوالہ سے پہچانا۔

● ارشاد باری:(هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ)(الرحمٰن:٦٠)

اور فرمان نبوی:"من لا يشكر الناس، لا يشكر الله" (صحيح رواه الترمذی عن ابی هريرة)

(جس کے اندر لوگوں کی شکر گزاری کا جذبہ نہ ہو، وہ اللہ کا شکر گزار نہ ہوگا) کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہوئے قلبِ ناتواں جذبۂ شکر وامتنان سے لبریز ہے کہ اللہ کی توفیق کے بعد استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب کی توجہ خاص سے، فراغت کے بعد جامعہ سلفیہ میں مولانا عبدالوحید سلفی (ناظم اعلیٰ) کی موافقت سے تقرری ہوئی۔

ہمارے سربرآوردہ رفقاء درس میں سے ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری عالمیت کے بعد ہی علامہ تقی الدین الہلالی کی خدمت میں مغرب چلے گئے تھے پھر وہیں سے مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا،فراغت کے بعد جامعہ سلفیہ آئے، اور اپنا وقت پورا کر کے سوئے منزل روانہ ہوگئے۔ فضیلت سے فراغت کے بعد مولانا عزیر شمس (مکہ مکرمہ) نے دہلی، پٹنہ،لکھنؤ،کلکتہ اور ملک کے دیگر اہم مکتبات سے استفادہ کے لئے بادیہ پیمائی کی اور مولانا بدرالزماں نیپالی نے دہلی کا رخ کیا۔

مولانا شہاب اللہ، مولانا عبدالقیوم اور مولانا عبدالقدوس وغیرہ جامعہ محمدیہ مالیگاؤں کے لئے منتخب ہوئے۔ یہ انتخاب شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانی اور ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ مولانا مختار احمد ندوی کی موجودگی میں ہوا۔شاید یہ سب کچھ سالانہ امتحان سے قبل ہی ہوگیا تھا۔

فراغت کے بعد کسے تمنا نہیں ہوتی کہ اس کی تقرری اسی ادارہ میں ہوجائے، جب کہ ادارہ بھی جامعہ سلفیہ جیسا ادارہ ہو جس کی شہرت اس وقت ملک وبیرونِ ملک میں عام ہوگئی تھی۔

انھیں تقرریوں کے زمانے میں امید وبیم کی کیفیت میں طالب علمانہ ذہنیت کے مطابق میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ مجھے کہاں جانا ہے؟انھوں نے اپنے معروف انداز میں فرمایا:تم کو اس سے کیا مطلب؟

ہمارے سربرآوردہ رفقاء درس کو مجھے چھوڑ کر ان کی تقرریوں سے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھے جامعہ ہی میں رکنا ہے اور مجھے بھی تعجب تھا کہ مولانا ندوی سے میرا معمولی تعارف بھی ہوگیا تھا وہ اس طرح کہ جامعہ میں منعقد کانفرنس میں کی گئی ان کی اردو تقریر کا میں نے عربی میں ترجمہ کیا تھا جو"مجلۃ الجامعۃ" میں انھیں کے نام سے شائع ہوا۔شاید ڈاکٹر صاحب نے ان کو بتایا ہو کہ یہ صلاح الدین کا ترجمہ ہے۔

جامعہ کے شعبۂ حساب (اکاؤنٹنسی ڈپارٹمنٹ) کے ماسٹر مولوی عبدالمنان (دارانگر بنارس) نے مجھ سے بذات خود بیان فرمایا کہ:

آج ہی ناظم جامعہ سلفیہ مولانا عبدالوحید سلفی "اصلاح المساجد" کی میٹنگ میں شرکت کے لئے مولانا مختار احمد ندوی کے ساتھ بابت پور ایرپورٹ کے لئے روانہ ہوئے تو انھیں الوداع کہنے کے لئے میں بھی ان کے ساتھ ایرپورٹ گیا تھا، راستہ میں مولانا ندوی نے ناظم اعلیٰ سے یہ درخواست کی کہ صلاح الدین کو بھی ہمارے یہاں جامعہ

محمد یہ میں بھیج دیا جائے۔ (یہ معروف تھا کہ ناظم اعلیٰ مولانا ندوی کی کوئی بات نہیں کاٹتے)

ناظم اعلیٰ نے ماسٹر عبدالمنان سے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ صلاح الدین کو بھی مالیگاؤں بھیج دیں۔

ماسٹر صاحب کا بیان ہے کہ میں نے ایرپورٹ سے واپس آ کر ڈاکٹر صاحب کو ناظم اعلیٰ کا پیغام پہنچایا، تو انھوں نے وقت کا اندازہ لگا کر کہ ناظم صاحب اب بمبئی پہنچ گئے ہوں گے، ٹیلیفون بک کرا کے ناظم صاحب سے بات کی اور کہا کہ صلاح الدین کی ہمارے یہاں ضرورت ہے۔

یہ ماسٹر عبدالمنان صاحب کا بیان ہے۔ استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب نے تو دور قریب سے کبھی بھی پوری زندگی اس احسان کا مجھ سے اشارتاً بھی تذکرہ نہیں فرمایا:

علامہ اقبال کا شعر کچھ ترمیم کے ساتھ ان کے اس احسان کے اعتراف میں پیش ہے:

تیرے احسانات کا شاگرد کو اقرار ہے
باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار ہے

اس پر آشوب دور میں ایسے محسنین ومخلصین کا وجود ناپید ہو رہا ہے اور ان کی رویت کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے

● ڈاکٹر صاحب نے اپنے مجلّہ ''صوت الامۃ'' میں راقم کی کتاب "زوابع في وجه السنة قديما وحديثا" پر کئی صفحات میں تبصرہ تحریر فرمایا، اور ہمت افزائی کرتے ہوئے اسے جامعہ سلفیہ کے قابل فخر فرزندوں میں شمار کیا۔

کویت کے آخری سفر میں برادر گرامی شیخ عارف جاوید محمدی کے تعاون خاص سے تیار کردہ اپنی دستاویزی کتاب "اهل الحديث في شبه القارة الهندية وصلتهم بالمملكة العربية السعودية، والبلدان الاخرى" پر (مسند وقت علامہ عبداللہ بن عقیل، ڈاکٹر بکر بن عبداللہ ابوزید (سابق وکیل وزارت عدل واسلامک فقہ اکیڈمی، جدہ) شیخ محمد ناصر العبودی، مولانا محمد اسحاق بھٹی، ڈاکٹر علی الشبل اور شیخ فلاح خالد المطیری وغیرہ کے ساتھ) پر مغز مقدمہ لکھا۔ جو ابھی طباعت کے دور سے گزر رہی ہے۔

اسی طرح "حجية الحديث النبوي" (عربی) مولفہ مولانا محمد اسماعیل سلفی کے مقدمہ میں رسالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' اور اس پر راقم کی تعریب وتعلیق اور اس کی اشاعت پر رقمطراز ہیں:

"وإني مدفوع إلى الاعتراف بأهمية هذا الكتاب، وأفرح فرح الأستاذ بانجاز التلميذ في مجال البحث والكتابة'' (میں اس کتاب کی اہمیت کے اعتراف پر مجبور ہوں، اور بحث وتحریر کے میدان میں شاگرد کے کام پر استاذ کی طرح خوش ہو رہا ہوں) ہمت افزائی کے اس ایک جملہ میں راقم کے لئے ان کی شفقت کی پوری تاریخ پوشیدہ ہے۔ اللہ انھیں غریق رحمت فرمائے۔

ظرافت:

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا ظریفانہ پہلو عام لوگوں پر شاید مخفی ہو، ہمیشہ تعلیم وتربیت، درس وتدریس، تالیف

وترجمہ اور صحافت میں مشغول شخصیت اور اپنے مقصد سے سنجیدگی کے ساتھ وابستہ طبیعت کو فرصت ہی کب ہوتی ہے کہ اپنے ظریفانہ وصف کو جلا بخشے۔

اپنے اپنے وقت پر ڈاکٹر صاحب کے یہاں حاضر جوابی اور برجستہ ظریفانہ تبصرے ایسے انداز میں نمودار ہوتے جو بیک وقت نصیحت اور طنز ومزاح دونوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتے۔

- ظرافت میں ڈوبی ہوئی (چھوٹے چھوٹے واقعات وحادثات اور اشعار پر مشتمل) ایک بوسیدہ کتاب ان کے آفس میں تھی، کبھی کبھار روٹین ورک سے اکتاتے تو خاموشی سے اسے پڑھ کر پھر کتابوں کے درمیان رکھ دیتے۔

آفس کے بعد میں نے بھی وہی شغل شروع کیا۔ ایک دن میں اسے پڑھ کر کمرے میں اکیلے ہنس رہا تھا کہ استاذ گرامی مولانا عبدالحنان فیضی (شیخ الحدیث سراج العلوم جھنڈانگر نیپال) نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھ لیا۔ تو فرمایا کہ تم کیا پڑھ کر ہنستے ہو مجھے تو ہنسی ہی نہیں آتی۔ مولانا ہمارے پڑوسی تھے اور بیمار چل رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بڑی نیک طبیعت ودیعت فرمائی ہے۔ آج بھی بیمار ہیں اللہ تعالیٰ انھیں شفائے کامل عطا فرمائے۔

- ڈاکٹر صاحب کے یہاں اردو وعربی دونوں زبانوں میں ادبی ذوق تو تھا ہی، اردو شاعری سے بھی یک گونہ مناسبت تھی۔ ایک بار جامعہ سلفیہ میں طلبہ کی جانب سے منعقد محفل مشاعرہ کے لئے انھوں نے بھی طبع آزمائی فرمائی، پاؤں میں اس وقت درد ابھرا ہوا تھا، خود تو حاضر نہ ہوئے، مجھ سے فرمایا کہ تم اسے سنا دینا، ظرافت آمیز ایک شعر سے آپ بھی محظوظ ہوں:

لگتا نہیں ہے دل مرا اجڑے دیار میں
جب سے مرے ہیں منتری ''متلا'' بہار میں

متلا جی بہار کے رہنے والے ریلوے منسٹر تھے جو انھیں ایام میں بم حادثہ کے شکار ہوئے تھے۔

یاد ہے، ڈاکٹر صاحب نے بے حد ظریفانہ لہجہ میں فرمایا کہ دیکھو جی (مرے، منتری، متلا) میں موسیقیت کتنی ہے؟

اس نظم میں مجھے کہیں کہیں سکتہ محسوس ہوا اسے میں نے خاموشی سے درست کر کے شام کو سنایا، دوسرے دن ملاقات کے وقت میں نے نظم واپس کی تو میرے قلم سے اس کی تبییض ہو چکی تھی۔ انھوں نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ کسی نے اس کی تو اصلاح کر دی ہے۔ ان کا اتنا ادب ملحوظ خاطر تھا کہ یہ کہنا بھی مناسب نہیں سمجھا کہ میں نے خود کی ہے بلکہ کہہ دیا (آزاد صاحب) استاذ گرامی مولانا آزاد رحمانی صاحب طرز انشاء پرداز، ادیب اور شاعر تھے۔

قابل ذکر ہے کہ ۱۹۷۸ء میں مدینہ یونیورسٹی جاتے وقت میں نے شاعری سے توبہ کر لی تھی، علامہ محمد اسحاق بھٹی (معروف سوانح نگار اور نامور صحافی) نے اس پر ظریفانہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ صحابہ کرام نے تو مدینہ میں بھی شاعری کی ہے، پھر ترک شاعری مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ کے شرائط میں بھی نہیں ہے تو پھر شاعری ترک کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ یہ تو ایک عالم کے لئے مزید اعزازی وصف ہے۔

حضرت کے اس تبصرہ کے بعد میں نے گزشتہ

سال (تینتیس سال کے بعد) پھر طبع آزمائی شروع کی جس کے نتیجہ میں چار مجموعے تیار ہوئے۔

(۱) مسدس شاہراہِ دعوت (۲) الوداع
(۳) محاسن اسلام (۴) پاکیزہ شاعری

پہلے دونوں مجموعے مطبوع ہیں:

- ۱۹۷۷ء کی بات ہے ایک شادی میں شرکت کے لئے پوری فیملی کے ساتھ ہمارے علاقہ میں تشریف لے گئے میں ہمراہ تھا۔ شام کو تقریر کا پروگرام رکھ دیا گیا، ڈاکٹر صاحب نے اپنی ایک کاپی نکالی اور مغرب سے قبل گاؤں سے باہر نکل گئے کہ چہل قدمی کرتے ہوئے معلومات کا استحضار کرلیں گے۔ اسی دوران ان کے ایک علیگیرین ملاقاتی مل گئے اور پورا وقت گفتگو میں صرف ہوگیا، واپسی پر نہایت ظریفانہ انداز میں فرمایا کہ فلاں صاحب مل گئے انھوں نے تو تقریر بھی یاد کرنے کا موقع نہ دیا"۔
- اسی سفر میں ایک یا دو دن کا قیام ہمارے موضع (اونرہوا، بلرامپور) میں رہا، طلبہ اور فارغین تو انھیں جانتے ہی تھے، عام لوگوں اور بزرگوں میں بھی جامعہ سلفیہ کے حوالہ سے ان کا تعارف بہت آسان تھا۔ تقریر ہوئی، لوگوں نے دعوتیں کیں۔ بے حد اخلاص کیشی سے لوگوں نے استقبال کیا۔ الوداع کے وقت دیہات کے سیدھے سادھے لوگ تحفہ وتحائف کے ساتھ حاضر ہوئے، ان لوگوں کی محبت اور سادگی دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے تاثر وظرافت کے ملے جلے لہجے میں فرمایا کہ "اب پتہ چلا کہ لوگ پیری مریدی کیوں کرتے ہیں"۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب میری موجودگی میں اس علاقہ کے دورہ کے موقع پر ایک یا دو بار گھر تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

- ڈاکٹر صاحب وضو کے وقت ہمیشہ (چپل) کا استعمال فرماتے اور وہی پہنے ہوئے نماز کے لئے بھی چلے جاتے، علی گڑھ میں بھی یہی دستور تھا یہ کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی لیکن طلبہ کو ایک موضوع مل گیا علی گڈھ کے طلبہ بھی عجیب ہوتے ہیں کہ دنیا کے سلگتے ہوئے مسائل کو چھوڑ کر چپل ہی کو موضوع بحث بنادیا۔
- علی گڈھ سے فراغت کے بعد جب واپس تشریف لائے تو سب انھیں ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ ان کی نگرانی میں کام کرنے والے غیر مسلم پریس مین صاحب سر درد کی دوا لینے خدمت میں حاضر ہوگئے تو نہایت اطمینان سے پوچھا کہ آپ خود آئے یا کسی نے بھیجا ہے۔ آپ جایئے جایئے!!
- ماسٹر آفتاب احمد بن مولانا نذیر احمد رحمانیؒ املوی (صدر شعبۂ حساب) بلا ناغہ آفس میں آکر ڈاکٹر صاحب سے بے تکلفانہ انداز میں محوِ گفتگو ہوجاتے، دونوں میں بڑا دوستانہ تھا۔

ہوا یہ کہ جامعہ رحمانیہ کی طرف سے (جو الہٰ آباد بورڈ سے ملحق ادارہ ہے) طلبہ کو ریلوے ٹکٹ کے لئے کنسیشن فارم دیا جاتا تھا، اس کا فائدہ جامعہ سلفیہ کے طلبہ بھی اٹھاتے تھے، فارمس ڈاکٹر صاحب کے یہاں آفس میں موجود تھے مجھے حکم ہوتا اور میں اسے طلبہ کو دے دیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ چند فارم ہیں اب انھیں کسی کو نہیں دینا ہے۔ چھٹی کے بعد ماسٹر آفتاب صاحب آئے اور ایک فارم

کے لئے بے حد اصرار کیا، اور کہا کہ کل ڈاکٹر صاحب آئیں گے تو میں خود انھیں بتادوں گا تم بالکل پریشان نہ ہو۔ میں نے بادل نخواستہ انھیں فارم دے دیا، صبح ڈاکٹر صاحب کو میں نے بتایا تو انھوں نے میری سخت گرفت کی، جس میں وہ حق بجانب تھے لیکن وہ پہلی وآخری گرفت تھی۔

اسی دوران حسب عادت ماسٹر آفتاب صاحب آفس میں آگئے اور دونوں ایک دوسرے سے ہنس کر ملے اور گفتگو میں مصروف ہوگئے۔

ایک طرف تو مجھے استاذ گرامی کی حکم عدولی پر افسوس تھا، دوسری طرف ان دونوں کا معاملہ دیکھ کر ہنسی بھی آئی۔ عربی مقولہ صحیح ہے (شر البلية مايضحك)

● ایک بار استاذ گرامی شیخ انیس الرحمٰن اعظمی کی رہائش گاہ پر ایک پکنک نما پروگرام کا اہتمام ہوا جس میں شیخ صاحب، ڈاکٹر صاحب، ان کے دونوں بچے (سلمان احمد، فوزان احمد) دو بھائی (عبدالرحمٰن، واز ہر) اور راقم کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، ڈاکٹر صاحب نے خود بڑی دلچسپی سے ''دہنکشی'' بنانے کا فریضہ انجام دیا، ہم لوگ صرف دوسرے اور تیسرے درجے کے معاون رہے۔ بہت انشراح صدر کے ساتھ گفتگو فرما کر واقعی پکنک کا ماحول بنا دیا تھا۔

کبھی کبھار وقت ملنے پر ہم کچھ الگ سے بھی ہلکی پھلکی باتیں کرلیا کرتے تھے۔ ان کے برادر خورد ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے بتایا کہ تم کو معلوم ہے کہ ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کا کتنا احترام کرتے ہیں اور ہمیشہ امید وبیم کی کیفیت رہتی ہے، ایک بار بغل میں پانی یا تیل رکھا ہوا تھا میں قریب سے گزر رہا تھا انھوں نے زور سے کہا دیکھو گر نہ پڑنا، بس میں خوف سے اسی میں گر پڑا۔

سب کو اس حکایت پر ناقابل برداشت ہنسی آئی، اور پکنک کا مزہ دوبالا ہوگیا۔

● جامعہ سلفیہ کے تعارف کے لئے ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب اور مولانا عبدالوحید رحمانی (شیخ الجامعہ) پہلی بار کویت تشریف لائے، رمضان المبارک کا مہینہ تھا ہمارے حلقہ کے احباب نے ان کے اعزاز میں پرتکلف افطار پارٹی کا اہتمام کیا، افطار کے بعد ڈاکٹر صاحب نے دعا پڑھی: (الحمدلله الذی أطعمنی وسقانی وجعلنی من المسلمین) ایک نوآموز طالب علم نے بہت خاموشی سے کہا کہ: شیخ! یہ ضعیف ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے برجستہ اس سے کہا کہ: "قولك صحيح، ولكننا ما درسنا حتى الآن كتب الشيخ الألباني" (یعنی: تمہاری بات صحیح ہے، لیکن ہم لوگوں نے ابھی شیخ البانی کی کتابیں نہیں پڑھی ہیں)

● مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ کے امارت و صدارت میں مئو کانفرنس جمعیۃ اہل حدیث ہند (اپریل ۱۹۹۵ء) کے صدر استقبالیہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے، مجھے بھی اس اجلاس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، میری آمد کی کسی کو خبر تو تھی نہیں، اور نہ ہی میں مشتہر خطیب ومقرر تھا، میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نیچے پنڈال میں کہیں بیٹھ گیا کسی نے اسٹیج پر خبر کردی، کئی بار اعلان ہونے کے بعد مجھے اسٹیج پر جانا پڑا، افتتاحی پروگرام شروع تھا، مجھے بھی چند منٹ کا موقع دیا گیا، تمام حضرات مقررین نے بیحد جوش وجذبہ کا مظاہرہ کیا۔ شاید پروگرام کے بعد ہم لوگ ڈاکٹر صاحب

کے پاس بیٹھے تقریباً اکثر لوگ ان کے شاگرد ہی تھے تو انھوں نے نہایت حکیمانہ وظریفانہ لہجے میں فرمایا کہ ''آپ لوگ تو دھواں دھار تقریریں کر کے چلے جائیں گے، لیکن اسے بعد میں اہل مئو کو جھیلنا پڑے گا۔'' (شنید ہے کہ واقعی طرفین میں مدتوں بحث ومناظرے ہوتے رہے)

ایک بار جامعہ سلفیہ میں ہاسٹل کے ایک سخت گیر نگراں نے نماز میں سستی کے سبب طلبہ کی ایک بڑی تعداد کے جامعہ سے اخراج کی سفارش کی، تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جامعہ سلفیہ جیسے ادارہ میں نماز کی سستی ناقابل برداشت ہے لیکن کوئی کارروائی کرتے وقت یہ بھی یاد رہے کہ جامعہ کا قیام صرف موذن پیدا کرنے کے لئے عمل میں نہیں آیا ہے۔

- ایک طالب علم پر نگاہ پڑی کہ وہ حالت نماز میں برابر اپنے کپڑے کی شکنیں درست کر رہا ہے تو فرمایا کہ نماز میں آئرن (استری) ہاتھ میں رکھا کریں تاکہ فوراً شکن درست کرلیا کریں (گلستان حدیث ۲۹۳)
- ایک مرتبہ نماز میں حاضری کے وقت ایک طالب علم نے کسی کا نام غلط پکار دیا، مسجد میں بیٹھے طلبہ ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے کھڑے ہوکر فرمایا: حاضری کے وقت کسی کا نام غلط پکارنا عیب نہیں، لیکن ایک دینی ادارے میں نماز جیسی بنیادی عبادت کے لئے نام پکارنا خود آپ لوگوں کے لئے عیب کا آئینہ دار ہے۔ (گلستان حدیث:۲۹۳)
- علی گڈھ قیام کے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے اطلاع دلوائی کہ پوری فیملی مئو جارہی ہے لہٰذا میں، عبد الجلیل (بمبئی والے) اور کسی اور کو لے کر چھٹی کے بعد نگرانی کے لئے گھر پر رہیں، چند روز کے بعد واپسی ہوجائے گی۔

تقریباً تیسرے دن مغرب کے بعد گھنٹی بجی، اوپر سے نیچے آکر میں نے دروازہ کھولا، تو دو نقاب پوش عورتیں تھیں، دروازہ کھلتے ہی بلا جھجھک اندر داخل ہوگئیں، میں نے یقینی طور پر یہ سمجھ لیا کہ فیملی مئو سے کسی وجہ سے جلدی واپس آگئی، ایک ام سلمان ہیں اور دوسری ان کی بڑی صاحبزادی زہرا بتول (رحمہا اللہ)

فوراً رفیع احمد صاحب (اسٹرالیا) کو آواز دی وہ بھی آئے، اور ہم لوگ بلا تاخیر گھر سے نکل کر جامعہ پہنچے، وہ امتحان کا زمانہ تھا تیاری میں مصروف ہوگئے، وہ دونوں عورتیں بھی ہم لوگوں کے گھر میں وجود پر ہکا بکا تھیں، نہ ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا اور نہ مجھ ہی کو یقین کی وجہ سے دریافت کی کوئی ضرورت تھی۔ بہرحال تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد اپنے رفیق درس مولانا محمد سالم بنارسی جامعہ میں آئے (انھیں پتہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی فیملی مئو گئی ہوئی ہے اور ہم لوگ نگرانی کے لئے ان کے گھر پر رہ رہے ہیں) اور کہا کہ تم لوگ عجیب آدمی ہو، وہ ہمارے گھر کی عورتیں ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے بچوں سے ملاقات کے لئے گئی تھیں اور تم لوگ گھر چھوڑ کر بھاگ آئے اور ان کو کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ان کی بات بالکل صحیح تھی معاملہ ایسے ہی ہوا، اب بطور خاص مجھے تو تین طرف سے شرمندگی کا سامنا تھا، ان عورتوں نے کیا سمجھا ہوگا، پھر ڈاکٹر صاحب کی فیملی اور خبر ہونے پر ڈاکٹر صاحب خود کیا سمجھیں گے؟

بہرحال دل کو اطمینان دلانے کے لئے یہی خیال

کیا کہ ڈاکٹر صاحب اس کے علاوہ کیا کہیں گے کہ تم اتنا آنے جانے کے باوجود بھی احساس نہ کر سکے کہ یہ کون لوگ ہیں؟

کویت میں پہلی اور پھر آخری ملاقات:

۱۹۸۲ء (رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ) کے ایام تھے جامعہ سلفیہ کے تعارف کے لئے مولانا عبدالوحید رحمانی (شیخ الجامعہ) اور ڈاکٹر صاحب کا کویت کے لئے یہ پہلا سفر تھا اور مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد میرا ابھی پہلا سال، میرے حلقۂ احباب نے افطار کی دعوت کا اہتمام کیا، مغرب وعشاء کے درمیان ایک تعارفی مجلس ہوئی، سلفی اخوان اور طلبہ سے ملاقات پر دونوں بہت خوش ہوئے، عشاء اور تراویح کی نماز مسجد ابوقتادہ (الجہرا) میں ادا کی، جس کا میں امام تھا، اور پھر ہوٹل کے لئے روانہ ہوئے۔

اسی سال مولانا عبدالحمید رحمانیؒ بھی تشریف لائے، حلقۂ احباب نے بے حد پذیرائی کی، ان سے بھی برابر ملاقات رہی۔

پہلی بار مولانا مختار احمد ندوی کے ساتھ استاذ گرامی شیخ انیس الرحمٰن اعظمی جامعہ محمدیہ مالیگاؤں کے تعارف کے لئے تشریف لائے تھے، ایک دن وہ ملاقات کے لئے اکیلے پہنچ گئے، بے حد خوشی ہوئی اور دوسرے دن مولانا ندوی نے بھی شرف بخشا۔

اسی دوران احباب کی رائے ہو رہی تھی کہ میں قسم المساجد سے "وزارة الاوقاف والشئون الإسلامية" کے آفس میں منتقل ہو جاؤں، لیکن وہاں صرف ادارتی کام تھا علمی نہیں، مولانا ندوی نے یہ سن کر نصیحت فرمائی کہ "مسجد مت چھوڑنا" مجھے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ مسجد ہی کی برکت ہے"۔

مولانا ندوی کی نصیحت کے بعد میں نے آفس میں منتقلی کا ارادہ ترک کر دیا اور کویت پر عراق کے ظالمانہ وغاصبانہ قبضے (۲/اگست ۱۹۹۰ء) تک قسم المساجد ہی سے منسلک رہا۔

کویت کی آزادی کے بعد ۱۹۹۳ء سے ادارۂ "بحث علمی" (زیر نگرانی جمعیۃ احیاء التراث الإسلامی۔ فرع الجہراء) سے وابستہ ہوا اور تادم تحریر وہیں ہوں، اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت کی کامیابیوں سے نوازے۔

- کویت میں ڈاکٹر صاحب سے آخری ملاقات ماہ مارچ ۲۰۰۹ء میں وزارة الاوقاف (کویت) کے زیر نگرانی مساجد کے کردار سے متعلق سیمینار میں شرکت کے لئے آمد کے موقع پر ہوئی۔ ان کے ساتھ مولانا اصغر علی سلفی (ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہل حدیث۔ ہند) بھی تھے۔ وقت کی قلت کے سبب استفادہ کا زیادہ موقع نہ ملا، "مرکز دعوة الجاليات" آفس میں ظہرانہ دیا گیا جس میں شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی بھی شریک تھے۔ برصغیر کے اداروں کے بارے میں گفتگو رہی۔

ایک دن تفریح کے طور پر معروف تاجر برادر گرامی عبدالعزیز خاں، مولانا کفایت اللہ، مولانا محمد انور سلفی اور راقم کے بہ شمول "برج الکویت (مینار کویت) میں دونوں مہمانوں کو ظہرانہ دیا گیا۔

ایک دن حلقۂ احباب نے بھی ان کے اعزاز میں صحراء (ڈزرٹ) کی استراحت میں ظہرانہ دیا، بہت خوش ہوئے۔

ان کی وطن واپسی کے بعد ان کی سیرت پر میرا مضمون مجلّہ ''امتی'' (اپریل ۲۰۰۹ء) میں شائع ہوا، جس کی مجلس مشاورت کا راقم صدر ہے، یہی مضمون ان کی تعریب کردہ کتاب "حجية الحديث النبوي' مولفہ مولانا محمد اسماعیل سلفی کے مقدمہ میں بطور تعارف موجود ہے۔

دیگر کتب ورسائل بطور خاص "رحمة للعالمين" اور حركة الانطلاق الفكري" کے عربی ایڈیشنوں کی دوبارہ طباعت کے سلسلے میں گفتگو ہوئی، طے پایا کہ متعلق ناشرین سے رابطہ کر کے حقوق کتب سے متعلق رکاوٹوں کو دور کرنے کے بعد اس کام کو انجام دیا جائے گا۔ لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

چند ماہ قبل ڈاکٹر صاحب سے دہلی میں بھی ملاقات ہوئی تھی عبداللہ اور میرے دیگر بڑے بچے تو ان سے متعارف ہی تھے ان کے تحفے کے سبب چھوٹوں نے بھی ان سے تعارف حاصل کرلیا تھا ایک مرتبہ چلتے چلاتے وہ منظر دیکھ کر میرے بھی دل میں آیا کہ ہاتھ پھیلا دوں، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے۔ دہلی میں ملاقات کے وقت پہلے کے مقابلہ میں گفتگو سے تو نہیں لیکن چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کمزوری کا حملہ ہے، لیکن اس کا بذات خود اظہار نہیں فرمایا، وہ ویسے بھی بیماری وغیرہ کے تذکرے اور شکایت کے زیادہ عادی بھی نہ تھے۔

مجھے بالکل یاد ہے کہ مولانا انور سلفی کے ساتھ موٹر میں جب ہم لوگ ''برج الکویت'' کی طرف جا رہے تھے تو شعر وشاعری کا مذاکرہ بھی ہوا، زندگی کی بے ثباتی اور تیز رفتاری سے سوئے منزل روانگی پر گفتگو کرتے ہوئے عربی کا یہ شعر پڑھا:

دقات قلب المرء قائلة له

إن الحياة دقائق و ثواني

آخری بار جب انھیں ہوٹل پہنچایا تو نہایت خوشی اور تاثر پذیری کے ملے جلے لہجے میں تقریباً فرمایا کہ ہم کو تم جیسوں پر فخر ہے اور دعائیں دیں، صحت وعافیت کی حالت میں ان سے آخری ملاقات تھی۔

اور موبائل کی گھنٹی بجی:

یوم شنبہ ۲۴ راکتوبر ۲۰۰۹ء تھا اپنی آفس سے نکل کر شیخ طارق العیسی حفظہ اللہ (صدر جمعیۃ إحیاء التراث الإسلامی کویت) سے ملاقات کے لئے ابھی (قرطبہ) کے راستے ہی میں تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجی، ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادہ ڈاکٹر فوزان احمد سلمہ (شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی) نے بھرائی ہوئی آواز میں علالت اور تیزی سے صحت کے روبہ زوال ہونے کی خبر دی، اور بتایا کہ آپ ان معدودے چند لوگوں میں سے ایک ہیں جنھیں والد صاحب نے بذات خود اپنی علالت کی اطلاع کے لئے حکم دیا ہے۔ اور اس وقت وہ (بترا ہاسپٹل۔۔ دہلی) میں زیر علاج ہیں۔

میں نے کہا: بات کروایئے۔ سلام کرلوں۔

ڈاکٹر فوزان نے کہا: بات کرنے میں کافی پریشانی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا آخری پیغام میرے نام:

بیماری کی یہ نزاکت سن کر ذہن ودماغ کو جھٹکا لگا،

اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ خلافِ توقع نہیں ہوتا لیکن میں نے ابھی عشرہ قبل مزاج پرسی کے لئے ٹیلیفون کیا تھا تو وہ مئو میں تھے، بیماری کا کوئی تذکرہ نہ کیا (اور وہ اس طرح شکوہ وشکایت کے عادی ہی کب تھے) فرمارہے تھے کہ چند دنوں میں ان شاء اللہ جامعہ سلفیہ پہنچ جاؤں گا۔

خیر، میں نے شفا کے لئے دعا کی اور ڈاکٹر فوزان سے سلام کے لئے عرض کیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی لہجہ کچھ جذباتی ہوگیا، اور یہ بھی کہا کہ ان شاء اللہ میں چند ایام میں آرہا ہوں۔ ڈاکٹر فوزان نے میرا سلام پہنچایا، تو ان سے استاذ گرامی نے یہ کہا کہ: ''کہہ دو، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیل کارواں سمجھا تھا میں

ڈاکٹر صاحب کے سعادتمند فرزندگان (سلمان وفوزان) اور پھر جامعہ سلفیہ کے دردمند ذمہ داران (مولانا شاہد جنید سلفی اور مولانا عبداللہ سعود سلفی) کی طرف سے علاج ومعالجہ میں کوئی کسر نہ رکھنے کا یقین ہوتے ہوئے بھی میں نے اپنے اطمینان کے لئے ڈاکٹر فوزان سے کہا کہ: علاج کے لئے انسانی وسعت میں جو آخری کوشش ہو وہ ضرور کرلی جائے تاکہ بعد میں افسوس نہ ہو۔

ڈاکٹر فوزان نے کہا کہ: ممبئی لے جانے کے لئے بھی مشورہ ہورہا ہے، اگر صحت نے اجازت دی تو وہاں بھی لے جایا جاسکتا ہے، اور مزید اطمینان کے لئے سکنڈ اڈوائز کے طور پر کسی دوسرے ہاسپٹل میں بھی لے جانے کی بات ہورہی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر فوزان سے گفتگو کرتے کرتے میں "جمعية إحياء التراث الإسلامي" کے ہیڈ آفس (قرطبہ) پہنچ گیا، اور صدر جمعیۃ شیخ طارق العیسی کو ڈاکٹر صاحب کی علالت کی خبر دی اور پھر وہاں سے "لجنة القارة الهندية" (روضہ) پہنچا اور اس کے لائق صدر شیخ فلاح خالد المطیری کو بھی بیماری کی نزاکت سے آگاہ کیا۔

ان دونوں قابل احترام ذمہ داروں نے ڈاکٹر صاحب کی صحت وعافیت کے لئے دعائیں اور ان نازک حالات میں علماء کی قدردانی وہمدردی کی جو آخری شکل ہوسکتی ہے اس کے لئے ازخود یقین دلایا۔ اور فلاح نے مجھ سے کہا کہ تم جارہے ہو تو ان کی صحت کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتے رہنا۔

میں ایک حقیقت کا یہاں اعتراف کرتا چلوں (اور پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں) کہ ڈاکٹر صاحب کے لائق فرزندگان نے اپنے والد گرامی کی خدمت کا ہر پہلو سے ایسا حق ادا کیا کہ ان کے کسی محب کے لئے کوئی گنجائش ہی نہ چھوڑی۔

کہ فطرت خود بخود کرتی رہی لالے کی حنابندی

اللہ تعالیٰ ان کے پسماندگان کو سلامت رکھے اور ہمدردان ومحبین کو جزائے خیر دے۔

استاذ گرامی کی عیادت اور اقرباء سے یکجا ملاقات:

حسب پروگرام میں منگل کی شام (۲۷/اکتوبر ۲۰۰۹ء) کو کویت سے روانہ ہوکر بدھ کی صبح (۲۸/اکتوبر ۲۰۰۹ء) کو دہلی پہنچ گیا۔ پہلی فرصت میں ڈاکٹر فوزان سلمہ سے رابطہ کیا لیکن پورے دن ان سے رابطہ نہ ہوسکا۔ جمعرات

۲۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء کی صبح کو رابطہ ہوا، تو بتایا کہ انھیں سکنڈ ایڈوائز کے لئے شاید ایک دن کسی دوسرے ہاسپٹل میں رکھ کر پھر (بترا ہاسپٹل) میں واپس لے آیا گیا ہے۔ ابھی پہلے سے واقفین کو بھی یہ خبر نہیں کہ ہم لوگ ''بترا'' میں ہیں۔

اپنے بڑے بیٹے عبداللہ سلمہ (جو ڈاکٹر فوزان کے شاگرد بھی ہیں) کو لے کر میں عیادت کے لئے ''بترا'' پہنچا تو بغل کی حنفی مسجد میں ڈیڑھ بجے ظہر کی اذان ہو رہی تھی۔

اندر پہنچا تو ڈاکٹر صاحب کے اقربائے درجہ اول کے علاوہ وہاں کوئی اور نہ تھا، سالوں بعد سب سے یکجا ملاقات ہوئی۔

- مسٹر سلمان احمد (ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے، جنرل اکاونٹنٹ کمپنی سعودی عربیہ)
- ڈاکٹر فوزان احمد (چھوٹے صاحبزادہ، پروفیسر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی)
- ڈاکٹر اظہر (ڈاکٹر صاحب کے بھائی، پروفیسر طبیہ کالج، مالیگاؤں)
- ڈاکٹر سراج انور (بھانجے اور داماد، زوج نکہت سلطانہ سلمہا)
- ڈاکٹر حماد احمد (داماد، زوج سمیحہ عفاف سلمہا)

ان غم سے نڈھال پانچ افراد میں ہم دونوں باپ بیٹے کا بھی اضافہ ہو گیا۔ نازک حال مریضوں کا وہ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں پر ماحول ہمیشہ سناٹے میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

اس شعبہ میں استاذ گرامی کے وجود نے دل میں امید وبیم کی عجیب کیفیت پیدا کر رکھا تھا، ہاسپٹل میں عیادت کے آداب کی پابندی کرتے ہوئے اکیلے روم میں داخل ہوا، تو دیکھا کہ شعلۂ حرکت وعمل بجھ کر خاموش ہونے کو ہے، اور اپنی زندگی کے آخری ایام نہیں، بلکہ آخری دن کی آخری ساعتیں اللہ کے رحم وکرم پر گزار رہا ہے:

ہوش و حواس تاب و تواں داغ جا چکا
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان جا چکا

دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کا عینی مشاہدہ ہوا، چہرہ پر طبی آلات کے گھیرے سے یہ محسوس ہوا کہ بے ہوشی کا عالم ہوگا لیکن میرا یہ گمان غلط ثابت ہوا، کیونکہ استاذ گرامی نے بعد میں خود مجھے پہچان لینے کی وضاحت کی، یہی نہیں بلکہ وفات سے کچھ پہلے راستے میں جب طبیعت کچھ سنبھلتی ہوئی لگ رہی تھی اور کچھ باتیں کیں تو ڈاکٹر فوزان سلمہ کے مطابق میرے بارے میں بھی پوچھا:

زندگی سے تھا کبھی معمور اب ویران ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

معالج ڈاکٹر سے مشورہ اور ہاسپٹل سے اخراج کی کارروائی:

عیادت کے بعد استاذ گرامی کی صحت سے متعلق امید و یاس کے ملے جلے احساس کے ساتھ وارڈ سے باہر نکلا، وہاں نازک حالات کی وجہ سے ہاسپٹل انتظامیہ بیمار پرسی کرنے والوں کو تو چھوڑیئے تیمارداروں کو بھی رکنے نہیں دیتی، فارسی مقولہ ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' لفظی طور پر وہاں منطبق ہو رہا تھا، نہ رکنے دے رہے ہیں اور بغیر رکے کوئی چارہ بھی نہیں۔ میں نے سلمان سلمہ سے کچھ باتیں کیں، ان سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی پھر نہ

چاہتے ہوئے بھی وہاں کے حالات کے پیش نظر اجازت چاہی، تو انھوں نے کہا کہ اظہر چچا بھی موجود ہیں، ڈاکٹر کے پاس مشورہ کے لئے گئے ہوئے ہیں ان سے بھی مل لیجئے تب جایئے، جامعہ سلفیہ کے زمانہ میں سلمان بڑے تھے، انھیں معلوم ہے مسٹر عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر اظہر وغیرہ سے کتنے برادرانہ تعلقات تھے۔

چند ہی منٹ کے بعد ڈاکٹر اظہر یہ خبر لے کر آئے کہ معالج ڈاکٹر کا یہ مشورہ ہے کہ مریض کو فوراً ڈسچارج کروا لیجئے، بہتر ہے کہ بقیہ اوقات وہ اپنے اہل وعیال میں گزاریں۔

مجھے استاذ گرامی کا وہ جملہ یاد آیا کہ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں'' ان شاء اللہ ملاقات ہوگی''

ڈاکٹر صاحب سے تعلق خاطر کہئے کہ اللہ تعالیٰ نے آخری لحظہ میں عیادت کا موقع بہم پہنچایا۔ لیکن وہ آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔

میں نے عرض کیا کہ آپ حضرات فوراً فیصلہ کریں کہ کیا کرنا ہے؟ ڈاکٹر صاحب کے بھائی ڈاکٹر اظہر اور دونوں داماد (سراج انور وحماد احمد) کوالیفائڈ ڈاکٹر ہیں، سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر کا مشورہ خیر خواہانہ ہے، اس کے بعد انھیں ہاسپٹل میں رکھنے سے ڈاکٹر کی نگرانی اور توجہ میں بھی کمی آجائے گی۔

پھر میں نے عرض کیا کہ انھیں منتقل کرنے کے لئے بائی ایر، بائی ٹرین، بائی ایمبولنس کون سا ذریعہ زیادہ مناسب ہوگا؟

مریض کی صحت کے پیش نظر اور راستے میں ناگفتہ بہ حالات کے وقوع کا لحاظ رکھتے ہوئے باقی ایمبولینس سفر کا پروگرام طے ہوا۔ پھر ایمبولینس بھی ایسا ہونا چاہئے جس میں آکسیجن وغیرہ کا انتظام لازمی طور پر ہو۔

اب انھیں ڈسچارج کروانے کی کارروائی شروع ہوگئی جو تقریباً چار گھنٹوں پر محیط لمبی کارروائی ہوتی ہے۔

اپنی ناتجربہ کاری اور احباب کا تعاون:

تمام موجودین میں یا تو نو وارد احباب تھے، اور ہم دہلی میں رہنے والوں کو ان جیسے حالات سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔

سلمان سلمہ شاید اپنی والدہ گرامی اور بچوں کو لے کر بائی ٹرین مئو کے لئے روانہ ہوگئے، ان کا ریزرویشن پہلے ہی سے موجود تھا اور ڈاکٹر فوزان کچھ دیر ادھر ادھر کی ترتیب میں لگے۔ دونوں داماد ڈسچارج کروانے کی کارروائی میں مصروف ہوئے۔ میں اور ڈاکٹر اظہر دیر تک استاذ گرامی کے سلسلے میں بات کرتے رہے۔

● میں نے عزیز گرامی ڈاکٹر خالد انور (ایڈیٹر روزنامہ ''ہمارا سماج'' اردو۔ دہلی) کو خبر دی انھوں نے بڑی سعادت مندی سے ہر طرح کا تعاون پیش کرنے کی آمادگی کا اظہار کیا، لیکن ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ مجھے خود ''غریبی انمولن سوسائٹی'' یاد آگئی، جسے میں نے ایمبولنس دلوائی تھی، ایسے ہی حالات میں سہولیات بہم پہنچانا اس سوسائٹی کے اغراض ومقاصد میں داخل ہے۔

اس کے جنرل سکریٹری کو ٹیلیفون کیا، وہ خود اپنے

نائب کو لے کر فوراً (بترا اسپتال) پہنچ گئے، ان کے پاس سوسائٹی کا کارڈ تھا، اس کے ذریعہ انھوں نے ڈسچارج کی کارروائی میں بھی ہاتھ بٹا کر جلدی کروائی جو بڑے ہاسپٹلوں میں ایک طویل عمل ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی ایمبولنس دہلی واطراف دہلی میں خدمت کے اعتبار سے سٹ ہے، اس لئے اپنے ان موجود ڈاکٹروں سے مشورہ کے بعد وہ ایمس (AIIMS) گئے اور ایمبولنس لے کر آئے سنا کہ وہ خرابی کے سبب راستے میں پریشانی کا باعث ہوئی، جس کا افسوس ہے۔

- ذریعۂ نقل کا سوسائٹی والوں کی وجہ سے بہ آسانی انتظام ہوگیا، جو ہم جیسے ناتجربہ کاروں کے لئے ایک اہم مسئلہ تھا، ادھر اخراج کی کارروائی جاری تھی کہ اسی دوران مولانا محمد مقیم فیضی (سابق نائب ناظم جمعیۃ اہل حدیث ہند) اور ان کے رفقاء اور مولانا محمد ایوب عمری (مدیر دارالدعوۃ۔دہلی) اوران کے رفقاء بھی تشریف لے آئے۔

اب تقریباً ہم سب لوگ ہی اکٹھا جمع ہو گئے، اسی اثنا میں مولانا عبداللہ سعود (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ) کا ٹیلیفون آیا، تو ڈاکٹر سراج انوران سے کہہ رہے تھے کہ یہاں ہم لوگوں کو کوئی واقفیت نہ تھی لیکن ایک صاحب آ گئے جن کی وجہ سے بڑی آسانی ہوگئی، ناظم صاحب نے ان سے پوچھا کہ وہ کون صاحب ہیں؟ پہلے دعا سلام کے علاوہ چونکہ ان سے کوئی مزید تعارف نہ ہوا تھا اس لئے انھوں نے مجھ ہی سے میرا نام پوچھا اور انھیں بتایا۔

پھر ناظم صاحب سے میری بھی بات ہوئی، انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر نے بنارس ہی میں اشارہ دے دیا تھا کہ اب گنے چنے ایام کی مہمانی ہے، پھر ڈاکٹر صاحب کی خدمات کو سراہا گیا، اور دعا پر گفتگو ختم ہوئی۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کے دونوں دامادوں سے بھی تعارف ہوا، کئی بار ٹیلیفون کے ذریعہ بات بھی ہوئی، بطور خاص دہلی سے مئو کے راستے میں اور پھر فوراً وفات کے بعد ٹیلیفون کا تبادلہ ہوا، اللہ تعالیٰ سب کو خوش وخرم رکھے۔

آخری دیدار کا منظر ابھی تک یاد ہے:

ادھر اخراج کی کارروائی مکمل ہوئی، ادھر ایمبولنس بھی آ کر لگ گئی، انھیں وارڈ سے نرسوں نے نیچے اتارا، اور ایمبولنس پر سوار کیا جانے لگا۔ اس منظر کے مشاہدہ سے میں بالکل مبہوت تھا، دعا کے علاوہ کسی بھی قسم کی مدداب درکار نہ تھی، اسی دوران مولانا محمد مقیم فیضی نے پہچان کروانے کی غرض سے کہا کہ ''یہ شیخ صلاح الدین ہیں'' تو اثبات میں جواب دیا اور یہ بھی کہا کہ نرسنگ ڈپارٹمنٹ کے جولوگ اتار کرلائے ہیں انھیں کچھ دے دیا جائے۔

اب روانگی کی تیاری مکمل ہوگئی، ڈاکٹر اظہر، ڈاکٹر فوزان ڈاکٹر سراج انور اور ڈاکٹر حماد احمد چاروں ایمبولنس پر ہی سوار ہوئے اور ایمبولنس سوئے منزل روانہ ہوگئی۔

رخصت اے بزم جہاں سوئے وطن جاتا ہوں میں
آہ ! اس آباد ویرانہ میں گھبراتا ہوں میں

اب ہم دیگر احباب دعا سلام کے بعد اپنی اپنی سواریوں کی طرف چل پڑے، مغرب کا وقت ہورہا تھا۔ میں اور عبداللہ دونوں جب ہاسپٹل کے گیٹ سے باہر نکلے تو

دیکھا کہ ایمبولنس وہاں کھڑی ہے اور ایمبولنس کا انتظام کرنے والے احباب ڈرائیور سے کچھ باتیں کررہے ہیں۔ پھر ہم اپنی گاڑی روک کر اترے۔ سلام کیا، دوبارہ الوداع کہا، اس طرح دلی میں ایمبولنس میں بیٹھے ہوئے احباب کو الوداع کہنے والا میں آخری شخص تھا۔

دہلی سے مئو کی طرف روانگی سے قبل کے پانچ گھنٹوں (ڈیڑھ سے ساڑھے چھ بجے تک) کے حالات کا میں عینی شاہد ہوں، وہ مناظر میرے لوحِ دل پر نقش ہیں، جو کبھی بھلائے نہیں جاسکتے۔

آخری دیدار کا منظر ابھی تک یاد ہے
سوچ کر دل اس کو محوِ نالہ و فریاد ہے

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے:

میں (بترا ہاسپٹل) سے ذاکر نگر جاتے ہوئے انھیں خیالات میں گم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے وہ قدردان یاد آئے جوان کی صحت کے بارے میں فکرمند تھے، بطور خاص میں نے شیخ فلاح خالد المطیری صاحب کو پوری کیفیت سے آگاہ کیا، پھر قدردان علم وعلماء شیخ عارف جاوید محمدی کو خبر کی، کویت میں ان کے شاگردان (مولانا کفایت اللہ مدنی اور مولانا محمد انور سلفی) وغیرہ بھی مطلع ہوئے، اپنے حلقے میں تیزی سے خبر پھیل گئی، ہمارے علما ودعاۃ نے درس ووعظ کی مجلسوں میں دعائیں کیں اور ڈاکٹر صاحب کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔

نماز عشاء کے بعد استاذ گرامی شیخ انیس الرحمٰن اعظمی (مدراس) کو مطلع کیا، مولانا عبدالحمید رحمانی کو کیفیت بتائی (جو خود خرابی صحت کا شکار ہیں اللہ تعالیٰ شفاء کامل و عاجل عطا فرمائے) انھیں ڈاکٹر صاحب کے دلی میں بغرض علاج موجودگی کی کوئی خبر ہی نہ تھی، شاید انھوں نے فوراً ڈاکٹر فوزان سے راستے ہی میں فون سے رابطہ قائم کرکے خود حالات سے آگاہی حاصل کی۔

میں چونکہ ایک ہی دن قبل کویت سے آیا تھا، احباب ومتعارفین کو خبر ہوگئی تھی، شام کو ملاقات کرنا چاہتے تھے لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی آئندہ روز کے لئے ٹال دیا، اپنے جو احباب بغیر پیشگی اطلاع کے تشریف لائے ان سے ملاقات ہوئی اور ڈاکٹر صاحب کی صحت وعافیت ہی موضوع گفتگو رہی۔

کافی رات تک ڈاکٹر فوزان وغیرہ سے رابطے میں رہا، سونے سے قبل ڈاکٹر سراج انور نے یہ خبر دی کہ ڈاکٹر صاحب کی حالت روبہ صحت ہے، اب ہم انھیں مئو نہ لے جاکر بنارس ہاسپٹل میں لے جائیں گے۔ ناظم صاحب (مولانا عبداللہ سعود) سے بات چیت ہوگئی ہے انھوں نے پورا انتظام کروادیا ہے۔

کیا خوشی سے مرنہ جاتے جو اعتبار ہوتا

ڈاکٹر فوزان سلمہ کے مطابق اس وقت ڈاکٹر صاحب نے باتیں بھی کیں، اور میرے بارے میں بھی پوچھا کہ ''صلاح الدین کب آئے تھے''؟

اس رابطے کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کی صحت کی خبر سے وقتی طور پر بے حد محظوظ ہوا، ناگوار متوقع خبر کے انتظار میں بیٹھے ہوئے شخص کو اگر اس کے بالکل برعکس خبر دی جائے تو اسے کتنی خوشی ہوسکتی ہے؟ اس کا اندازہ اس سے

لگائیں کہ میں نے فوراً شیخ انیس الرحمٰن اعظمی حفظہ اللہ کو رات کی ان ساعتوں میں دعا کی درخواست کرتے ہوئے خوش خبری سنائی اور سو گیا۔

لیکن صبح کی خبر سے یہ یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب کے روبہ صحت ہونے کی کیفیت اور اس دوران ان کی گفتگو موت سے قبل کی نشاط انگیزی اور ''صحوة الموت' (Wakefulness of Death) تھی۔

بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے
لمحہ بھر کے بعد وہ اک سازِ بے آواز تھا:

استاذ گرامی سے تعلق خاطر ہی کہئے کہ انھوں نے اپنی بیماری میں بھی اور پھر سوئے منزل روانگی سے چند ساعت قبل اس گفتگو میں خاکسار کو یاد فرمایا، جو ان کی زندگی کی آخری گفتگو تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس سے نوازے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایمبولنس میں موجود احباب نے شاید میرے جذبے کو میرے دل کے اندر جھانک لیا تھا، مئو کے راستے میں تو ان سے رابطے میں تھا ہی، خود ان قدر دانوں نے بھی مجھے حالات کی خبر رسانی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

میں لمبے سفر سے آیا ہوا تھکا تھکا انسان، پھر دوسرے دن کے ناخوشگوار حالات اور سونے سے قبل کی خوشخبری نے ملی جلی کیفیت کا ایسا سایہ ڈال دیا تھا کہ صبح موبائل کی گھنٹی بجی اور بجتی رہی، نیند کے غلبہ نے قوت فکر کو ماؤف رکھا، وضو کے بعد جب رابطہ کیا تو وہی متوقع خبر جسے سننے کے لئے دل آمادہ نہ تھا، لیکن قضائے الٰہی پر کس کو اعتراض ہوسکتا ہے؟ إنا لله وإنا اليه راجعون

لو كان في الدنيا بقاء لواحد
لما مات خير المرسلين محمد

ہے اسی قانونِ عالمگیر کا یہ سب اثر
بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

غم کے اس موقع سے زبان پر وہی حدیث جاری ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے اپنے لخت جگر ابراہیم علیہ السلام کی وفات پر اپنے حزن وملال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"إن العين تدمع، والقلب يحزن، ولا نقول إلا يا يرضى ربنا، وإنا بفراقك يا ابراهيم لمحزونون" (متفق علیہ)

(آنکھ اشکبار ہے اور دل غمگین، لیکن ہم زبان سے وہی کہیں گے جو ہمارے رب کو پسند ہے اور ہم اے ابراہیم! تیری جدائی پر یقیناً غمزدہ ہیں)

استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ) کی وفات کا حادثہ دہلی سے مئو کے راستے میں کانپور سے کچھ پہلے بہ وقت صبح (پانچ بج کر سولہ منٹ) بروز جمعہ (۱۰/ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ = ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء) کو پیش آیا۔ اور حرکت وعمل کا یہ شمع فروزاں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

اس خبر کے بعد ایمبولنس میں موجود احباب (ڈاکٹر فوزان، ڈاکٹر اظہر، ڈاکٹر سراج انور اور ڈاکٹر حماد

احمد) سے فرداً فرداً تعزیت کی، ابھی وفات سے چند ساعت قبل ان کے روبہ صحت ہونے کی خبر اور اس دوران گفتگو میں راقم کے بارے میں استفسار وغیرہ نے قلب وو جدان کو جذباتی کیفیت میں مبتلا کیا اور حفظہ اللہ) کا دعائیہ جملہ ان کے حق میں (رحمہ اللہ) میں تبدیل ہوگیا:

موت سے پہلے جو مصروف تکلم تھا ابھی
لمحہ بھر کے بعد وہ اک سازِ بے آواز تھا

امیر المومنین فی الحدیث امام محمد بن اسماعیل البخاری رحمہ اللہ (۱۹۴۔۲۵۶ھ) نے اپنے معاصر امام عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی ''صاحب السنن'' (۱۸۱۔۲۲۵ھ) کی وفات کی خبر پر فرمایا:

إن عشت تفجع بالأحبة كلهم
وفناء نفسك لا أبالك أفجع

(اگر عمر نے وفا کی تو تو تمام احباب کی موت کی خبر سے دوچار ہوتا رہے گا، اور تیری اپنی موت تو اے مخاطب! سب سے زیادہ پر ہول ہے)

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

جنازہ میں شرکت کی تمنا جو پوری نہ ہوئی:

ڈاکٹر صاحب کی وفات صبح کے وقت ہوئی، اس سے قبل جنازہ کی تیاری کیا رات میں ان کے روبہ صحت ہونے کی خبر کے سبب خود حادثۂ وفات میرے لئے خلاف توقع تھا۔ اسی دوران مولانا عبدالوہاب خلجی کا ٹیلیفون آیا، مجھے بھی کسی رفیق سفر کی تلاش تھی، لیکن وقت کی تنگی اور مسافت کی دوری نے قوت فیصلہ کو معطل کر رکھا تھا، دہلی سے بنارس کے لئے جس فلائٹ میں سیٹ ملنے کا امکان ہوسکتا تھا اس سے سفر بھی کرتے تو کسی حال میں بھی عشاء سے قبل مئو پہنچنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

ڈاکٹر فوزان سلمہ سے رابطہ قائم کیا وہ لوگ ابھی راستے میں تھے بتایا کہ ہم لوگوں کو ابھی کچھ خبر نہیں کہ کب تک پہنچ سکیں، جنازہ کی ترتیب وتنظیم کی ذمہ داری مولانا مظہر احسن ازہری حفظہ اللہ کے ذمہ ہے، فاضل گرامی مولانا ازہری سے رابطہ پر معلوم ہوا کہ اگر وقت پر سواریاں مل بھی جائیں تو آنے یں اتنی تاخیر ہوگی کہ لوگ جنازہ کے بعد رخصت ہو چکے ہوں گے پھر میں نے سپر ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت فرمائے۔

دور وقریب سے آئے ہوئے جم غفیر کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحب کے شاگرد رشید اس وقت نائب صدر جامعہ سلفیہ اور اب صدر جامعہ مولانا شاہد جنید سلفی بنارسی حفظہ اللہ نے پڑھائی اور آبائی قبرستان (مئو) میں ان کی تدفین ہوئی۔

یہ آفتاب عربیت افق مئو سے طلوع ہوا، جامعہ سلفیہ بنارس کی فضاؤں میں چمکا اور پھر اپنے مقام پر آکر غروب ہوگیا۔

ما كنت أحسب قبل دفنك في الثرى
أن الكواكب في التراب تغور

آپ کے دفن سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا
کہ ستارے بھی زمیں دوز ہوا کرتے ہیں

اس بطن گیتی کو قدرت نے اتنی وسعت دے رکھی

ہے کہ اس نے کتنے آسمانوں کو اپنے اندر سمولیا۔ ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

بلکہ جس نے بھی اسے روندا، اس کا آخری انجام یہی ہے،
اور کسی کو اس کے اس عمل پر اعتراض کا کوئی حق نہیں:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے (کریم!)
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

اپنے آباء واجداد، اساتذہ کرام اور دیگر پیش رو اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف روانہ ہو گئے، اب تسلی کا باعث صرف یہ ہے کہ ان سے ملاقات ہو: "انتم سبقتم ونحن بكم لاحقون"

كل نفس ذائقة الموت (الانبیاء: ۳۵) کے عام اور غیر استثنائی عالم گیر قانون کے تحت استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ رخصت ہو گئے اور ہم سب ترتیب میں لگے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ یاوری فرمائے:

موت کے قانون کا پابند قانون حیات
موت کی زد میں بہر لحظہ ہے پوری کائنات

اللهم اغفر له، وارحمه وعافه، واعف عنه، وأكرم نزله، ووسع مدخله وأدخله الفردوس الأعلىٰ:

احساسات وتاثرات:

اس چمنستان عالم میں لوگ سیر وسیاحت کے لئے آتے ہیں، اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس کی چمن بندی کر کے بلا تاخیر اپنے وقت پر رخصت ہو جاتے ہیں۔

کون کا شانہ مکینوں سے نہیں خالی ہوا
ہے چمن؟ جس کا نہیں رخصت کوئی مالی ہوا

اس کارگاہ حیات کا عجیب عالم ہے کہ ایک ماں باپ کی اولاد، ایک ادارہ کے فارغ التحصیل، ایک استاذ کے شاگرد، سب کو کام کے لئے یکساں مواقع فراہم، لیکن ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کی کیفیت وکمیت میں کافی اختلاف ہوتا ہے، پھر اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں بہت سے باصلاحیت حضرات کو کام کے مواقع میسر آتے ہیں لیکن اسی اصول کے تحت ہی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ ہوتا ہے۔

پھر کسی شخصیت کی کامیابی کا خیال دعایت اور پروپیگنڈہ سے نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتا ہے اس خیال کو اگر لفظی جامہ پہنایا جائے تو شاید کامیابی کے اعتراف میں لوگوں کو پس وپیش ہو، لیکن کامیابی کی کچھ نسانیاں ہیں، جو خود کامیابی تو نہیں لیکن ان کا وجود کسی شخص میں، اسے اپنے میدان کے کامیاب ترین لوگوں کے صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

کسی شخص کے اپنے میدان میں کامیابی سے یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ وہ معصوم عن الخطا ہوگا یا اس کی غلطی کی اصلاح کے لئے کوشش نہیں کی جا سکتی، یا اس سے معاملہ میں دلائل کی بنیاد پر اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ مقلدانہ روش کی ہمت افزائی ہے، بحث وتحقیق کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہمارے منہج ومسلک میں اس کی کوئی گنجائش ہے۔

یہاں انھیں حقائق وضوابط کے تناظر میں میرے احساسات وتاثرات کا مطالعہ فرمائیں:

- استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب زمین سے اٹھ کر

آسمان کی بلندیوں تک پہنچے، جامعہ ازہر تک رسائی ہوئی، ان کی عالی ہمتی ہی کہئے کہ میدان تعلیم وتربیت اور تصنیف وصحافت میں عملی طور پر داخل ہونے کے کئی سال بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے (ایم۔فل) اور (پی۔ایچ۔ڈی) کی ڈگری حاصل کی، جامعہ سلفیہ بنارس کے پلیٹ فارم سے کام کا موقع ملا اور اللہ کی عطا کردہ اپنی صلاحیت کو اس کے لئے وقف کردیا۔

ان کے رفقاء درس اور معاصرین میں بھی کچھ ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں ہیں جنھوں نے اپنے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں:

● ایک ہی ادارے میں (۱۹۶۸تا۲۰۰۹ء) تقریباً چالیس سے زائد مدت تک نرم وگرم حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کی پوری توانائی صرف کردینا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ نہ وہ ادارہ ہی کوئی عام ادارہ تھا، اور نہ ان کی شخصیت ہی کوئی عام شخصیت تھی۔

● ڈاکٹر صاحب اہم جماعتی، ملی، ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر نظر رکھتے تھے اور ان پر مجلہ ''صوت الامۃ'' میں اپنے اداریہ کے ذریعہ اسلامی نقطۂ نظر کے تناظر میں تبصرہ فرماتے تھے:

آں قدح شکست وآں ساقی نہ ماند

● جامعہ سلفیہ جیسے اہم ادارہ میں اتنی لمبی مدت گزارنے کے بعد ملک کے طول وعرض میں ان کے شاگردوں کا جال بچھا ہوا تھا، بلکہ عرب دنیا اور بطور خاص خلیجی ممالک میں بھی ان کی تعداد کچھ کم نہیں، جہاں بھی ان کا ورود ہوتا وہاں ''استاذ الاساتذہ'' کی حیثیت ہوتی۔ گونا گوں اوصاف کے سبب جماعتی کانفرنسوں، سیمیناروں اور جلسوں میں ان کی سیادت وصدر نشینی مسلم ہوگئی تھی۔

إذا لم يكن صدر المجالس سيدا
فلا خير فيمن صدرته المجالس

● جامعہ سلفیہ کے داخلی انتظام وانصرام سے بظاہر ان کا تعلق نہ تھا، لیکن اپنی کارکردگی کے سبب وہ اس میں بڑی حد تک دخیل تھے۔

اسی طرح جامعہ کے تعلیمی وترقیاتی منصوبوں کی تکمیل میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ وہ ابتدا ہی سے وکیل الجامعۃ (ریکٹر) اور بعد میں آخری عمر تک صدر جامعہ رہے۔

● انتظامیہ واساتذہ، اساتذہ واساتذہ، اساتذہ وطلبہ یا عام ذمہ داران اور ان کے ملازمین کے درمیان تعلقات میں نشیب وفراز سے کوئی ادارہ یا آفس خالی نہیں، پھر انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ سب کے تعلقات سب سے یکساں نہیں ہوتے، یہ عیب کی بات نہیں۔

عیب یہ ہے کہ اپنے ماتحتوں کو ظلم وزیادتی کا تختۂ مشق بنایا جائے اور ذمہ دار کی طرف سے ان کی حق تلفی ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ اپنے اوپر دوسروں کے حق میں زیادتی کے الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس موضوع کو میں نے اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردیا ہے، "وحصل ما فی الصدور" کا منظر وہیں سامنے آئے گا، اور ہر شخص کو اس کے قول وعمل کا صحیح بدلہ ملے گا، بے سوچے سمجھے جنھوں نے الزام تراشی کی ہے ان کی حقیقت بھی واضح ہوجائے گی۔

(پندرہ روزہ ''ترجمان'' جلد۳۲ شمارہ ۲ ص۳۲)

● جامعہ، جمعیت، منہج فکر، طریقۂ کار اور دیگر کئی اداروں اور شخصیات کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے نقطہائے نظر سے اختلاف کیا جاسکتا ہے بلکہ لوگوں نے زبانی اور تحریری طور پر کیا بھی ہے، میں خود بحث وتحقیق کے تناظر، یا تجربات کی روشنی میں اپنے نزدیک کسی چیز کے پایۂ ثبوت تک پہنچ جانے کے بعد دوسروں کی مداخلت کا قائل نہیں۔ لیکن کسی کی دلیل سے مطمئن ہونے کے بعد (أخذته العزة بالإثم) کے بے لاگ الٰہی تبصرے سے بچنے کو اپنی کامیابی اور غلط موقف پر اصرار کو جرم سمجھتا ہوں۔

قوت دلیل کے بعد اپنے موقف پر ثابت قدمی کا حق جس طرح میں اپنے لئے محفوظ رکھتا ہوں بالکل اسی طرح وہ حق دوسروں کو بھی دینے کا قائل ہوں۔

ہر دور میں علماء حق نے اپنے کمزور موقف سے رجوع کرکے اپنی حق پسندی کا حق ادا کیا ہے، میرے ذہن میں چند اہم مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے میں ترمیم بھی کی ہے، اور بعض کو بدلا بھی ہے، اور بقول ان کے ہی وہ ''ترجیح بلا مرجح کو بھی جھیلنے کے عادی تھے''، تو پھر ترجیح با مرجح کو تسلیم کرنے میں ان کے یہاں پریشانی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

● تعلیم وتربیت، تہذیب وثقافت، دعوت وتبلیغ، جماعت وجمعیۃ اور ملک وملت کے دیگر سلگتے ہوئے مسائل پر اصولی گفتگو کے ذریعہ اظہار خیال فرماتے جو جزئیات سے دور کلیات کے تناظر میں سب کے لئے قابل قبول ہوتا۔ شاید اسی وجہ سے انھیں اپنے ماحول میں ''مفکر جماعت'' کا خطاب دیا جاتا تھا۔

● مقصد سے والہانہ وابستگی، وقت کی قدر وقیمت کا خیال، نظم ونسق کی پابندی اور مستقل مزاجی کامیابی وکامرانی کے نمایاں اوصاف ہیں، جن سے بفضلہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو وافر حصہ عطا ہوا تھا۔ افراتفری سے دور انھوں نے بھرپور اور منظم زندگی گزاری، ان اوصاف کو وہ اپنی حیاتِ مستعار کے آخری ایام تک بروئے کار لاتے رہے۔

● برصغیر میں عربیت کے ادباء اور قلم کاروں کے درمیان ان کی ایک امتیازی شان تھی، اسلامی، ثقافتی اور ادبی موضوعات پر کثرت تحریر میں انھیں اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل تھی، تحریر وصحافت اور تالیف وترجمہ کے میدان میں انھیں طویل ترین تجربہ تھا، اب ان امور میں ان کا ہم پلہ اپنی جماعت میں کوئی نظر نہیں آتا۔

پھر کوئی قیس سا اٹھا نہ بنی عامر میں

● ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور شخصیت کا ایک ہلکا سا خاکہ میں نے عربی میں تیار کیا تھا جو ''حجية الحديث النبوي'' مولفہ مولانا محمد اسماعیل سلفی کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں شامل اشاعت ہے، پھر قدرے ترمیم کے ساتھ وہی خاکہ ڈاکٹر صاحب کے کویت آنے کے بعد، معروف مجلّہ ''المتی'' (اپریل ۲۰۰۹ء) میں بھی ٹائٹل پیج پر تصریح کے ساتھ شائع ہوا (راقم اس مجلّہ کے اڈوائزری بورڈ کا صدر ہے) اس شمارہ کی کاپیاں بذریعہ ڈاکٹر فوزان سلمہ استاذ گرامی کی خدمت میں روانہ کردی گئی تھیں۔

وہی خاکہ دیگر عربی مجلات میں بھی شائع ہوا۔

اب وہ میرے ویب سائٹ پر بھی موجود ہے۔

میری نظر میں بنارس سے باہر رہنے والے ڈاکٹر صاحب کے اوائل سربرآوردہ شاگردوں میں ڈاکٹر ابوحماد صغیر احمد (ریاض) ڈاکٹر عبدالرحمٰن الفریوائی (ریاض) مولانا احمد مجتبی (دارالدعوۃ، دہلی) مولانا عبدالمعید (علی گڈھ) مولانا عبدالواحد مدنی (سدھارتھ نگر) اور مولانا اصغر علی سلفی (دہلی) وغیرہ کے اپنے باہمی تعلقات جیسے بھی ہوں، لیکن ان کا سب سے تعلق خاطر تھا، اور کچھ بدمزگیوں کے باوجود بھی حسب مراتب سب کے علم وفضل کے معترف تھے۔

ہمارے یہاں اپنے اساتذہ وشیوخ کی سیرت نگاری کا جذبہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے دوسری جماعتوں نے اپنے شیوخ اور ان کے خادموں کے خادموں کی بھی تاریخ لکھ ڈالی ہے، لہٰذا تحریر وصحافت کے میدان میں کام کرنے والے ان کے شاگردوں کی ذمہ داری ہے کہ اس موضوع کا حق ادا کریں، ورنہ بقول نامور سوانح نگار مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ "بزرگوں سے متعلق واقعات وکارنامے حکیموں کے طبی نسخے کی طرح سینہ بہ سینہ چلتے چلتے ان کے واقف کاروں کا دور ہی ختم ہوجائے گا"۔

داستانیں لکھ کے رکھ لو چند عنوانوں کے ساتھ
پھر یہ باتیں ختم ہوجائیں گی دیوانوں کے ساتھ

اس طرح بعد میں اس دور کے مورخ کو تاریخ نویسی میں دقتوں کا سامنا ہوگا اور پھر کف افسوس ملنے کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا۔

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

قابل مبارکباد ہیں "مجلہ افکار" (مئو) کے حضرات ذمہ داران، جنھوں نے اپنے فضلاء کی قدردانی کا سلسلہ شروع کیا اللہ تعالیٰ ہمت وتوفیق سے نوازے۔

● استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب (رحمہ اللہ تعالیٰ) سے متعلق حافظہ کی تہوں میں دبے ہوئے دیرینہ حالات و واقعات، جذبہ شکر گزاری کے تحت اپنے اوپر ان کے احسانات، اور ان کے بارے میں اپنے احساسات وتاثرات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے، اب وہ ہم میں نہیں ہیں، لیکن ان کی یاد باقی ہے، بقول فیضی

اے ہم نفسان محفل ما
رفتید، ولے نہ از دل ما

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی خدمات کو شرف قبولیت بخشے، ان کی بشری کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔

اللهم اغفر له وارحمه!!
وصلى الله على نبينا وسلم تسليما كثيرا
وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين



ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی
استاذ حدیث جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض

استاذ الاساتذہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن بن یاسین ازہریؒ

حیات و خدمات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم و مکرم جناب عبداللطیف صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

استاذ مرحوم پر مقالہ بھیجا جارہا ہے، اگر پسند آئے تو پورا چھاپ دیجئے، تہذیب واختصار کی بھی اجازت ہے، لیکن اشاعت سے پہلے میرے پاس بھیج دیں تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے، ابھی بہت سارے گوشے اور بہت ساری باتیں، رہ گئی ہیں، جن کا تذکرہ ہوسکتا ہے کہ قارئین کے لیے مفید ہو، لیکن یہ جو کچھ تھا بڑی مشغولیت کے ایام میں ہو پایا، ہوا یہ کہ جب آپ کا مطالبہ شروع ہوا اور اصرار بڑھا، تو انہی ایام میں جامعہ کی ذمہ داریاں سامنے آگئیں، اور آپ کے کام کی طرف توجہ نہ ہو پائی جیسے، تیسے کر کے املاء کرا کے اور کمپیوٹر پر تصحیح کر کے یہ مقالہ بھیجا جارہا ہے، ہوسکتا ہے کہ کہیں تقدیم وتاخیر کی ضرورت محسوس ہو، اللہ تعالیٰ آپ جیسے زبردست حوصلے والوں کو اور پیدا کرے، جو بزور شمشیر سامنے والے سے جو چاہیں لکھا پڑھا لیں۔ حضرات اساتذۂ کرام اور ذمہ داران سے سلام عرض کریں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امیدوار عنایت:

عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی

الحمد لله رب العالمين الذي لايحمد على مكروه سواه، والصلاة على حبيبه المصطفى الذي أرشدنا أن نتذكر عند مواجهة مصيبة موته، أمابعد:

بروز جمعہ ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء بعد نماز فجر برصغیر پاک وہند بلکہ عالم اسلام کی ایک معروف علمی اور دعوتی شخصیت ہم سب کو داغ مفارقت دے گئی۔ میری مراد استاذ الاساتذہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن بن محمد یاسین الازہری سے ہے، جو ایک ہفتہ پہلے اچانک بیماری کی بنا پر بذریعہ ہوائی جہاز دہلی کے بترا اسپتال میں داخل کیے گئے۔ بنارس کے ڈاکٹروں کی تحقیق میں یہ شبہ قوی تھا کہ مرحوم کو کینسر کی بیماری کا سامنا ہے۔ یہ شبہ دہلی میں حقیقت بن گیا۔ چند دنوں کے مختلف ٹیسٹ کے دوران بیماری کے جسم پر موثر ہونے اور نقاہت اور زیادتی مرض اور بدن میں خون کی کمی اور کمزوری سے یہ تشویش کافی بڑھ گئی کہ اب مرض اپنے لاعلاج دور میں داخل ہو چکا ہے۔ انتظار تھا کہ جمعہ کو آخری رپورٹ آئے گی، لیکن جمعرات کی صبح عزیزم ڈاکٹر فوزان بن مقتدیٰ حسن نے اطلاع دی کہ ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ

اب چونکہ مرض لاعلاج ہے، اور مریض طبی اعتبار سے زندگی کے آخری مراحل میں ہے، اس لیے بہتر ہے کہ ان کو اپنے وطن لے جایا جائے۔ فوراً مئو لے جانے کی تیاری ہوئی اور ایمبولنس کے ذریعہ ڈاکٹر فوزان، اور مرحوم کے داماد ڈاکٹر سراج اور بھائی ڈاکٹر اظہر حسن کی معیت میں انہیں مئو کے لیے روانہ کیا گیا۔ رات میں ساڑھے بارہ بجے جب میں سونے کے لیے بستر پر گیا تو نیند اچٹ چکی تھی اور زبان پر ازہری صاحب کی صحت وعافیت کی دعا جاری تھی۔ اسی حالت میں آنکھ لگی تو خواب دیکھتا ہوں کہ میں فوزان کو ٹیلیفون کررہا ہوں اور وہ اٹھا نہیں رہے ہیں۔ اچانک فجر کے وقت ۳ بج کر ۱۴ منٹ پر موبائل کی گھنٹی پر جب فوزان کا نام دیکھا تو کئی گھنٹے کی بے چینی اور اضطراب کی تفسیر سننے کے لیے دل کو مضبوط کیا۔ ٹیلیفون پر دبی آواز میں فوزان نے کہا کہ ابا کانپور میں انتقال کر گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موت کی خبر سے ملک اور ملک سے باہر دینی اور تعلیمی حلقوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ لاعلاج بیماری کی خبر محدود افراد ہی تک تھی۔ میں نے موبائل کے ذریعے بہت سارے لوگوں کو اس اندوہ ناک حادثۂ فاجعہ کی خبر دے دی، تعزیتی پیغامات کے ٹیلیفون کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ انٹرنیٹ کھول کر دیکھا تو کئی جگہ موت کی خبر بھی شائع ملی۔ سنیچر اور اتوار کے روزنامہ اردو نیوز (جدہ) میں موت کی خبر جلی سرخیوں میں آگئی۔

اردو ریڈیو جدہ کے نیوز ریڈر محترم ڈاکٹر سعید عابدی اور ڈاکٹر لئیق اللہ خاں وغیرہ سے ڈاکٹر صاحب کے قدیم زمانے سے گہرے روابط تھے۔ لئیق اللہ خاں نے اردو نیوز کے لیے اور محترم احمد محمد شاکر (لاہور) نے الاعتصام اور پاکستان کے دوسرے جرائد کے لیے ڈاکٹر صاحب کے سلسلے کی معلومات مانگیں، نیز عرب شیوخ واحباب نے مطالبہ کیا کہ مرحوم کے احوال زندگی پر مضمون لکھوں۔ کئی روز کے بعد جمع خاطر کرکے ڈاکٹر صاحب کی زندگی پر مضمون قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ یقیناً ان کے بے شمار شاگرد اور محبین ان کے بارے میں لکھیں گے اور اس طرح سے آپ کی زندگی کے روشن پہلوؤں سے لوگ آگاہ ہوں گے۔

نشو ونما اور تعلیم:

اتنی ساری باتیں قارئین کرام نے ازہری صاحب کے بارے میں پڑھ لیں لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہاں میں آپ کی تعلیم وتربیت سے متعلق بنیادی معلومات دینا چاہتا ہوں۔

آپ کی پیدائش قصبہ مئوناتھ بھنجن کے محلہ ڈومن پورہ میں (۸/۸/۱۹۳۹ء) میں ہوئی۔ مئوناتھ بھنجن بحیثیت ایک اہل حدیث مرکز کے اور بحیثیت ایک بڑے دینی اور تعلیمی مرکز کے جماعت اہل حدیث کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اسی قصبہ میں ان کی پرورش ہوئی، ان کا گھرانہ دیندار گھرانوں میں سے تھا، ان کے نانا مولانا محمد نعمان، سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے شاگرد رشید تھے۔ جامعہ دار السلام عمر آباد میں اعظمی علماء آپ کے ماموں مولانا عبدالسبحان اعظمی یا ماموں زاد بھائی ہیں۔ ان کے ماموؤں میں سے مولانا فضل الرحمٰن جامعہ رحمانیہ، بنارس میں مدرس تھے، بعد میں مدرسہ عالیہ عربیہ، مئو میں پڑھاتے

رہے۔اسی طرح سے دوسرے ماموں مفتی مولانا عبدالعزیز مئوی دارالحدیث میں استاذ و مفتی تھے۔

آپ نے حفظ قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم سے لے کر عالمیت وفضیلت تک کی پورے تعلیم اپنے شہر مئو کے نامور اداروں جامعہ عالیہ عربیہ، جامعہ اسلامیہ فیض عام اور دارالحدیث میں وہاں کے اساطین علماء اور مشاہیر مدرسین سے حاصل کی۔ الہ آباد عربی فارسی بورڈ کے عالم وفاضل کے امتحانات بھی پاس کئے، فراغت کے بعد جامعہ الازہر (مصر) گئے۔ اور وہاں سے کلیۃ أصول الدین (قاہرہ) سے ایم اے کی ڈگری لی، اس لیے "ازہری" کی نسبت سے مشہور عوام وخواص ہوئے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

دارالعلوم مئو کی مرزاہادی پورہ شاخ میں ۱۹۵۳ء میں حفظ قرآن کی تکمیل کی، جامعہ عالیہ عربیہ میں ۱۹۵۹ء تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد فراغت دارالحدیث جامعہ اثریہ سے کی، فیض عام میں بھی تعلیم حاصل کی، ۱۹۵۹ء میں الہ آباد بورڈ سے مولوی کا امتحان دیا، ۱۹۶۰ء میں عالم کا، اور ۱۹۶۲ء میں فاضل دینیات کا، ۱۹۶۶ء میں کلیۃ اُصول الدین جامعہ ازہر سے ایم.اے کی ڈگری لی، اور ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ سے ایم فل کیا، اور ۱۹۷۵ء میں عربی ادب میں علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور علی گڑھ کی ڈگریوں کے لیے ہائی اسکول ۱۹۷۱ء اور انٹرمیڈیٹ ۱۹۷۳ء ونلی انگلش کے امتحانات علی گڑھ ہی سے دیے۔

جامعہ ازہر جانے سے پہلے دوسال تک فیض عام مئو میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

ازہری صاحب نے مذکورہ بالا مئو کے تین بڑے اہل حدیث ادارے میں تعلیم حاصل کی، بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں:

۱-مولانا شمس الحق بہاری رحمہ اللہ (جامعہ اسلامیہ فیض عام، بعد میں آپ نے ایک مدت تک جامعہ سلفیہ میں تدریسی فرائض انجام دیئے)۔

۲-مولانا عبدالمعید بنارسی رحمہ اللہ (جامعہ اسلامیہ فیض عام، بعد میں آپ نے ایک مدت تک جامعہ سلفیہ میں تدریسی فرائض انجام دیئے)۔

۳-مولانا عبدالرحمٰن نحوی رحمانی رحمہ اللہ (جامعہ اسلامیہ فیض عام، مئو)۔

۴-مفتی حبیب الرحمٰن اعظمیؒ (جامعہ اسلامیہ فیض عام، مئو)

۵-مولانا عبداللہ شائقؒ (جامعہ اثریہ دارالحدیث، مئو)۔

۶-مولانا عبدالرحمٰن بن عبیداللہ مبارکپوری حفظہ اللہ (آپ نے جامعہ اسلامیہ فیض عام میں چار سال تک تدریسی فرائض انجام دیئے (۱۹۶۲ء) میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے، آپ سے ازہری صاحب نے متن القدوری فی الفقہ الحنفی اور المجتنی لابن درید پڑھی)۔

ازہری علماء میں سے یہ حضرات ہیں: علی عبدالواحد الوافی، محقق مقدمہ ابن خلدون، شیخ محمد الغزالی، مشہور اخوانی داعی اور مصنف، شوقی ضیف، مولف تاریخ الادب العربی، انور الجندی، مشہور مولف۔

جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس میں آمد:

جماعت اہل حدیث کے مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ، بنارس کا قیام ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں تعلیم شروع

ہوئی، مختلف مدارس سے مشاہیر اساتذہ کو منتخب کر کے جامعہ سلفیہ کی مسند تدریس پر فائز کیا گیا۔ انہیں اساتذہ میں ازہری صاحب بھی تھے جو (۱۹۶۸ء) میں جامعہ سلفیہ آئے۔

ازہری صاحب سے میرا تعلق ان کے بنارس آتے ہی ہو گیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اپنے گاؤں کے مدرسے میں ۶۳ء میں پرائمری کی تعلیم مکمل کی اور ۶۴ء میں جامعہ رحمانیہ بنارس کے پرائمری شعبے کے سابق مدرس اور گاؤں کی محبوب شخصیت مولانا ابوالخیر فاروقی سے ابتدائی عربی اور فارسی کی ابتدا کی، ۶۵ء میں مدرسہ سعیدیہ (دارانگر، بنارس) میں چند ساتھیوں کے ساتھ تعلیم کی غرض سے بنارس آ گیا تو جامعہ رحمانیہ اور جامعہ سلفیہ کے ذمہ داروں، اساتذہ اور طلبہ سے تعارف اور روابط بڑھے۔ ۶۵ء میں آدھے سال تک ہی بنارس رہنا ہوا، ۶۶ء میں عید کے بعد شوال کے پہلے ہفتے میں دوبارہ ہم چار ساتھی تعلیم کی غرض سے بنارس آ گئے۔ تاکہ بنارس میں رحمانیہ میں داخلہ مل جائے، جس کی توقع بہت ہی کم تھی۔ مولانا ابوالخیر صاحب رحمانی رحمہ اللہ نے ازہری صاحب کے ماموں مولانا فضل الرحمٰن رحمہ اللہ جو سابق مدرس جامعہ رحمانیہ تھے کے نام خط لکھ دیا تھا کہ تم لوگ اگر بنارس کے کسی مدرسہ میں داخلے میں کامیاب نہ ہو پاؤ گے تو مئو چلے جانا وہاں کے مدارس میں داخلہ ہو جائے گا اور یہ خط ان شاء اللہ تیر بہدف ثابت ہوگا۔

الحمدللہ حالات کچھ اس طرح ہمارے حق میں استوار ہوئے کہ دوسرے دن یہ خوشخبری ملی کہ ہم لوگوں کا داخلہ رحمانیہ کی تیسری جماعت میں ہو گیا ہے۔ وہاں کے اساتذہ میں مولانا نذیر احمد املوی کا انتقال ۶۵ء ہی میں ہو گیا تھا۔ ۶۶ء میں وہاں مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی، مولانا محمد عابد حسن رحمانی، مولانا عبدالوحید رحمانی رحمہم اللہ، نیز دوسرے چند اساتذہ پڑھاتے تھے۔ حج کے بعد جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم کا افتتاح ہوا تو یہ تینوں جامعہ سلفیہ منتقل ہو گئے، عربی کی تیسری اور چوتھی جماعت ۶۶ء ۶۷ء میں پڑھنے کے بعد ۶۸ء میں ترجیحی طور پر ہم سب ساتھیوں کا داخلہ جامعہ سلفیہ کی عالمیت سال اوّل میں ہوا۔ ہم رحمانیہ سے وہاں منتقل ہوئے تو دیکھا کہ ایک نئے اور بہت بڑے مدرس ازہری صاحب آئے ہیں جن کا تعلق مئو کے مشہور علمی خاندان سے ہے اور ازہر سے ایم اے کیا ہے اور جامعہ سلفیہ میں پڑھائیں گے۔ اس زمانے میں جامعہ سلفیہ میں مدرس ہونا ہم لوگوں کی نظر میں بہت بڑا اعزاز تھا۔ پہلی بار میں نے ازہری صاحب کو جامعہ سلفیہ کے سامنے کی بلڈنگ کے گیٹ کے اوپر جہاں پرانی لائبریری تھی، کی چھت پر حافظ محمد عباس بنارسی صاحب کے ساتھ چہل قدمی کرتے اور بات چیت کرتے دیکھا اور چند دن کے بعد جب رحمانیہ سے آئے ہوئے اپنے اساتذۂ کرام کی خدمت میں گیا جو جامعہ سلفیہ کے تعلیمی نظام کے چلانے کے ذمہ دار تھے، تو وہاں ازہری صاحب کو دیکھا، مولانا عبدالوحید صاحب اور مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی نے میرے تعارف میں چند تعریفی جملے کہے، اس طرح سے پہلی مرتبہ ڈاکٹر ازہری صاحب کے حلقۂ تعارف میں میرا نام اس حوالہ سے آیا کہ یہ مشہور اہل حدیث بستی پریوا کا باشندہ ہے اور مولانا ابوالخیر صاحب فاروقی کے گاؤں کا ہے، اور یہ بچہ رحمانیہ سے ثانویہ

پاس کر کے آیا ہے، اور اس کا خط اچھا ہے، اس لیے ہم لوگ مضامین صاف کرنے اور نظام الاوقات وغیرہ لکھانے کے لیے اس سے مدد لیتے ہیں۔

چند دنوں کے بعد شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ دیکھو یہ حافظ مقتدیٰ حسن صاحب کا ایک مضمون ہے، اس کو صاف کر کے لے آؤ۔ بہت خوشی خوشی میں اسے لے گیا، اور جلدی سے صاف کر کے اسے ازہری صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن جب کہ میں مرحوم کی یاد میں یہ کلمات لکھ رہا ہوں۔ یہ تعلقات بڑھتے گئے، پہلے سال ہی آپ کے بچے مئو سے بنارس آگئے، مدن پورہ سے متصل ناظم صاحب کے ایک پرانے گھر میں رہائش کا انتظام ہوا۔ میں ان کے گھر بھی آنے جانے لگا۔ سلمان بڑے لڑکے چھوٹے سے تھے، فوزان پیدا ہی بنارس میں ہوئے، اور دو بھائی اظہر اور عبدالرحمٰن تعلیم کی غرض سے ساتھ میں رہنے لگے۔ میں دھیرے دھیرے ان کے خاندان کے ایک فرد کی طرح ہو گیا۔ اور ان کی موجودگی یا غیر موجودگی میں فیملی مسائل و معاملات میں ان کا ممد و معاون بنا۔

۶۸ء میں ازہری صاحب سے ہم لوگوں نے البلاغة الواضحة کا درس لیا اور بعد میں علامہ سیوطی کی علوم قرآن پر تالیف الاتقان بھی پڑھی۔

اساتذۂ کرام سے قربت و تعلق کی بناء پر ازہری صاحب سے بھی تعلق بڑھ گیا، اب ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ایک دن درس میں انہوں نے تمام طلباء سے فصاحت کی تعریف میں موجود عربی عبارت میں "ماجاء عفوا" کا معنی پوچھا۔ دائیں سے شروع کر کے بائیں تک پوچھتے گئے لیکن کسی نے جواب نہ دیا، یا جو کہا وہ ازہری صاحب کی نظر میں کافی وشافی جواب نہ تھا، سب سے آخر میں میں بیٹھا تھا، مجھ سے پوچھا تو میں نے برجستہ کہا ''جو زبان پر برجستہ آجائے'' جواب بالکل صحیح تھا، اب تو استاذ کی توجہ کا ایک اور عنوان ہاتھ آگیا۔ ہوا یہ کہ سابقہ کسی طالب علم نے اردو میں باریک خط سے یہ ترجمہ لکھ رکھا تھا، اور میں نے وہاں سے لے کر یہ جواب بتا دیا، ہم اتنے قابل نہیں تھے کہ سب سے اچھا ترجمہ کر کے جواب بتا دیتے، اس واقعہ سے بھی اُن کو میرے بارے میں حسن ظن ہوا، رات میں مغرب اور عشا کے درمیان چند طلباء آپ کے کمرے میں جا بیٹھتے اور عربی بولنے کی مشق کرتے، الفاظ و تراکیب ذہن میں تو رہتی تھیں لیکن سٹ جملے بولنے اور ادا کرنے کی صلاحیت نہ تھی اور نہ ہی یہ جرأت، دیر تک چپکے سے میز کی آڑ میں ''القاموس الجدید'' سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر جملے بناتے اور کبھی کوئی بات کہہ دیتے اور کسی بات کا جواب دے لیتے، ایک دن ازہری صاحب نے شاید مجھے ہی کو مخاطب کر کے کہا کہ عربی سیکھنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ڈکشنری کے الفاظ چن چن کر اور جوڑ جوڑ کر جملے بنائے جائیں۔ اس کے لیے زیادہ پڑھنا، اور استعداد بڑھانی ہوگی، ایک دن ایک سینئر طالب علم کو نصیحت کی کہ عربی زبان میں صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ عربی ادب و زبان کی چار اہم کتابوں کا مطالعہ کریں:

۱- البيان والتبيين للجاحظ

۲- أدب الكاتب لابن قتيبه

۳- الأ مالی لأبی القالی

۴- الکامل للمبرد

بعد میں مقدمہ ابن خلدون کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ان کتابوں کا ذکر عربی ادب کی اساطین کتب کے طور پر ابن خلدون نے کیا ہے۔ مرضِ وفات سے کچھ دنوں پہلے میں نے اپنے ایک بزرگ ساتھی سے پوچھا کہ ازہری صاحب نے آپ سے عربی زبان میں استعداد پیدا کرنے کے لیے چار کتابوں کے مطالعہ کا ذکر کیا تھا، کیا آپ کو یہ واقعہ یاد ہے تو انہوں نے کہا کہ نہ تو ہمیں یہ واقعہ یاد ہے اور نہ ان کتابوں کے بارے میں ذہن میں کچھ ہے۔ تو میں نے موصوف کو واقعہ سنایا اور کتابوں کے نام بتائے۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو میں نے یہ ساری کتابیں خریدیں اور بہت کچھ پڑھیں بھی۔ ۶۸ء میں ازہری صاحب کی سرکردگی میں ادارۃ البحوث وجود میں آیا، سلفیہ پریس لگا اور (۶۹ء) میں عربی مجلّہ کی اشاعت عمل میں آئی۔ ازہری صاحب کی قیادت میں یہ سارے کام شروع ہوئے اور پہلے ہی دن سے اور مجلّہ کے پہلے شمارے سے میرا تعلق ان تینوں اداروں سے ہو گیا۔ جوالحمد للہ کسی نہ کسی درجے میں اب تک باقی ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (شعبۂ عربی) سے ایم. فل اور پی. ایچ. ڈی:

ازہری صاحب نے جامعہ سلفیہ میں تدریس کے دوران ہی علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن کرا لیا، ڈاکٹر نورالحسن انصاری دلی یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر تھے، علی گڑھ کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر مختارالدین آرزو سے تعلقات کی بناء پر وہاں آسانی سے انہیں داخلہ بھی مل گیا، اور یو جی سی کا وظیفہ بھی۔ پہلے ایم فل کیا اور لطف یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی کے قواعد وضوابط کی تکمیل کے لیے ہائی اسکول کی انگلش کا علی گڑھ سے امتحان پاس کیا، پھر بعد میں انٹر کا، اور پی ایچ ڈی کے تھیسز سے پہلے ایم فل کے لیے ایک رسالہ کی تالیف کی جس کا نام "منصور الفقه حياته وشعره" یہ فل اسکیپ کے تقریباً ۱۵۰ صفحے پر مشتمل تھا۔ میں نے ازہری صاحب کی علی گڑھ موجودگی میں ۲۴، ۲۵ جنوری ۱۹۷۴ء میں ہائی اسکول انگلش کا امتحان دیا۔ جس میں مجھے ۷۵٪ فیصد نمبر ملے۔ اس کی مبارک باد دیتے ہوئے ازہری صاحب نے فرمایا تم کو مجھ سے ۱۵ نمبر زیادہ ملے ہیں۔

علی گڑھ میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کے دوران ان کا بنارس سے برابر تعلق قائم رہا، مجلّہ وغیرہ کے کام کی نگرانی بھی چلتی رہی۔ علی گڑھ کے اسلامیات، دینیات، تاریخ اسلامی اور عربی شعبوں کے اساتذہ سے گہرے تعلقات اور علی گڑھ میں اقامت سے جو تعلقات استوار ہوئے اس سے علی گڑھ والوں نے جامعہ سلفیہ سے اور جامعہ سلفیہ نے ان حضرات سے استفادہ کیا۔ یہ تعلق الحمد للہ اب تک قائم ہے۔

جب میں علی گڑھ آیا تو اپنے استاذ محترم ڈاکٹر عبدالرحمٰن محمد شفیع لیثی موصوف جو جامعہ رحمانیہ (بنارس) کے طالب علم تھے کے کمرہ میں ٹھہرا۔ ۱۹۶۶ء میں جامعہ سلفیہ میں افتتاح تعلیم کی مناسبت وتقریب سے متعلق کانفرنس میں جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ کے چانسلر شیخ ابن

باز کی نیابت کرتے ہوئے ہمارے استاذ شیخ عبدالقادر شیبۃ الحمد بنارس تشریف لائے، فضیلت کے طلبہ کو صحیح بخاری کا درس دیا، اور وہیں پر اعلان کردیا کہ جامعہ سلفیہ سے چار طلباء کو اس سال مدینہ یونیورسٹی میں داخلے کا وظیفہ دیا جائے گا، فوراً ہی پتا چلا کہ مولانا عبدالرحمٰن شفیع لیثی، مولانا عبدالسلام مدنی، مولانا عبدالحمید رحمانی (جو نئے نئے رحمانیہ بنارس سے فارغ ہو کر وہیں پر مدرس مقرر ہوئے تھے) اور دکتور وصی اللہ عباس کے نام کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔ اسی سال مولانا عبدالرحمٰن شفیع لیثی صاحب مدینہ چلے گئے، چار سال کے بعد بی اے کر کے واپس ہوئے تو تینوں مدنی فضلاء شیوخ کی پوسٹنگ جامعہ سلفیہ میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے ہوئی۔ (شیخ وصی اللہ عباس ابھی کلیہ ہی میں تھے بعد میں وہ مکہ یونیورسٹی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے رک گئے، اور اب تو وہیں کے ہو رہے)۔

ہم لوگوں کا یہ عالمیت سے فراغت کا سال تھا۔ اس سال مولانا عبدالرحمٰن شفیع صاحب سے ہم نے موطأ پڑھی، موصوف بنارس میں قلیل مشاہرے پر بال بچوں کے ساتھ رہنے لگے یا ابھی تنہا ہی تھے، چار سالہ مدنی زندگی کا آرام اور خاندان کی خوش حال زندگی کو دوام بخشنے کے پیش نظر ان کے سرپرستوں نے کہا کہ مولانا آپ تدریس کا کام کر کے خوشحال زندگی نہیں گزار سکتے۔ اس لیے یہ لائن چھوڑ کر طبیہ کالج سے ڈاکٹری کی ڈگری لے لیں، ادھر ہمارے دوست اور ساتھی ڈاکٹر عبدالحنان بن لعل محمد رسول پوری کے بھائی ماسٹر محمد فاروق صاحب نے اپنے بھائی عبدالحنان کو حکم دیا کہ تم عبدالرحمٰن فریوائی سے اچھا نمبر نہیں لا سکتے۔ اب تم فضیلت کی دستار باندھنے سے صرف نظر کر کے طب کی لائن اختیار کرو، چنانچہ ان دونوں نے تنگ ودو کر کے دینی لائن چھوڑ کر طب کے میدان میں اپنی قسمت آزمائی کی۔ اسی قسمت آزمائی کے زمانہ میں میں جنوری ۱۹۷۴ء میں ہائی اسکول کا امتحان دینے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آیا تو ان دونوں کے کمرے میں ٹھہرا۔ ڈاکٹر عبدالحنان سے میری خط و کتابت رہتی تھی۔ انہوں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا تو ازہری صاحب کے بارے میں لکھا کہ بنارس میں تو ان سے دوری رہا کرتی تھی۔ ان کے رعب ودبدبہ کی وجہ سے، بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن علی گڑھ میں تو معاملہ بڑی قربت اور مودت کا ہے۔ اس دوران ازہری صاحب کے کمرے میں بھی گیا، یونیورسٹی کے مطبخ کا کھانا بھی دیکھا، اور ازہری صاحب کو اس کو گرم کر کے کھاتے بھی دیکھا۔ علمی ترقی کے لیے آدمی کو ہر طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں وہاں پر ان کے شعبۂ عربی میں بھی جانا ہوا۔ ایک لطیفہ بھی سنتے جایئے: بی اے عربی کے ایک طالب علم کی ایک امتحانی کاپی رکھی ہوئی تھی، اس نے ''عربی'' کو ''اربی'' لکھ رکھا تھا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر مختارالدین آرزو تھے، جو عربی لکھنے اور بولنے پر قدرت نہ رکھتے تھے۔ لیکن عربی ادب وزبان میں مستشرقین کی طرح انگریزی کے ذریعہ ڈگریاں حاصل کی تھیں، ترقی کرتے کرتے صدر شعبہ ہی نہیں بلکہ باہر کی عربی اکیڈمی دمشق کے ممبر بھی بنے۔ ایک عربی سے نابلد ہندوستانی کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہ اعزاز کیسے حاصل ہوا، یہاں اس کا تذکرہ مقصود ہے۔

ڈاکٹر مختار الدین آرزو بڑے مردم شناس آدمی تھے۔ ازہری صاحب کی صلاحیت واستعداد کو انہوں نے فوراً ہی بھانپ لیا، ان سے بڑا اچھا برتاؤ کیا، ہر طرح کا تعاون دیا، وقتی طور پر لیکچر رشپ بھی دی۔ بعد میں مستقل لیکچرر کی پوسٹ پیش کی، لیکن اس میں دو چیزیں مانع ہوئیں: ناظم صاحب (عبدالوحید) کا عدم اتفاق اور خود ازہری صاحب کا اندر سے رہ کر علی گڑھ کے دینی، علمی اور ثقافتی ماحول اور وہاں وہ کتنا کام کر سکتے ہیں، اس کا صحیح اندازہ۔ بہرحال ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب نے ازہری صاحب کے ذریعہ مجلة المجمع العلمی الهندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اور اردو کے مقالات کو عربی میں منتقل کرنے نیز اسے چھپوانے کی ساری ذمہ داریاں ازہری صاحب نے اٹھائیں اور جامعہ سلفیہ کے پریس میں یہ کام ہوا، ان شماروں کی پروف ریڈنگ میں نے کی۔

علی گڑھ آکر جب میں واپس چلا گیا تو ازہری صاحب نے زبانی یا کسی خط میں بتایا کہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ تم علی گڑھ امتحان دینے آئے تھے تو وہ ملاقات کے خواہش مند تھے۔ اور مجلّہ کی اشاعت میں پروف ریڈنگ اور حسن اشاعت کے لیے تمہاری تعریف بھی کر رہے تھے۔ علی گڑھ وغیرہ کے اساتذہ کے جو مقالات عربی پرچے میں چھپتے تھے اس کی بھی ایک اہمیت ہوتی تھی اور اس کے ذریعے اپنے اپنے شعبے میں وہ ترقیاں بھی پاتے تھے۔ ازہری صاحب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے امام ابن عبدالبر کی کتاب بهجة المجالس نصف ثانی کو ایڈٹ کرنے کا کام علی گڑھ میں اور بنارس میں رہ کر کیا۔ بنارس میں اوپری منزل کے کمرہ نمبر ۱۹ میں مسند تدریس کے اردگرد جو مراجع تھے اس میں زرکلی کی الأعلام اور عمر رضا کحالہ کی معجم المولفین، اور المعجم المفهرس لألفاظ الحديث کے نام یاد ہیں، اور المنجد کا پرانا ایڈیشن بھی تھا جس کو وہ ازہر سے ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہاں اس کی الگ الگ دو جلدیں بنادی تھیں، دوسری اعلام سے متعلق تھی جو اصل اول کے ایک تہائی تھی۔

صاحب ترجمہ کے معاشی حالات:

جامعۃ الازہر سے واپسی کے بعد شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری رحمہ اللہ کے مشورہ سے آپ جامعہ سلفیہ میں استاذ بن کر آئے، سننے میں آیا کہ (۲۵۰) روپیہ مشاہرہ ہے لیکن پتہ چلا کہ (۲۲۵) روپیہ سے شروعات ہوئی، اس زمانے میں بھی یہ ایک خاندان کے اخراجات کے لیے ناکافی مشاہرہ تھا، اس لیے عام اساتذہ کی طرح آپ کے معاشی حالات بھی قابل اطمینان نہ تھے، انہی ابتدائی سالوں کی بات ہے جب جامعہ سلفیہ میں عربی کتابوں کی قلت تھی، معاشی ضرورت کے پیش نظر ازہری صاحب نے کئی کتابیں ناظم صاحب کے ذریعہ مکتبہ کو فروخت کردیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ازہری صاحب کی اکثر کتابیں مصر ہی میں چھوٹ گئی تھیں انہیں ان کا قلق تھا۔

زندگی کے حقائق سے آگاہی اور تجربات و مشاہدات سے آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ایک دن کہنے لگے

کہ ذاتی کتب خانے کی اہمیت سے قطع نظر اس کے مستقبل کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اگر ہم بڑے عالم بن بھی گئے تو مکتبہ کی وراثت کا مسئلہ ہے، مولانا سیف بنارسی کے مکتبہ کا حال دیکھو!۔

عہد عسرت کی بات ہے کہ جامعہ رحمانیہ پرائمری شعبہ کے صدر مدرس ماسٹر عبدالحمید صاحب جونپوری رحمہ اللہ جو ابتدائی عہد میں مدن پورہ میں جامعہ سلفیہ کے حاجی صدیق کی کوٹھی میں قائم آفس میں جامعہ کا حساب کتاب لکھتے تھے۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمایا کہ ناظم صاحب کی تاکید ہے کہ ازہری صاحب اور شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانی کی کوئی گھریلو ضرورت روکی نہ جائے، ان کا ہمیشہ خیال رکھا جائے۔

پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے بعد آپ کا رجحان یہ تھا کہ کہیں اندر یا باہر کسی یونیورسٹی میں ملازمت مل جائے۔ اس کے لیے ڈاکٹر عبدالعلی اعظمی ازہری کی ہدایت اور مشورے سے نائیجریا کی احمد و بیلو یونیورسٹی میں کاغذات بھجوائے جس کو میں نے پوسٹ کیا تھا۔

شیخ ہادی احمد الطالبی جو مدینہ سے بی اے کرنے کے بعد جامعہ سلفیہ میں مبعوث تھے ان کے توسط سے شیخ ابن باز نے ازہری صاحب کو جامعہ اسلامیہ میں تدریس کے لیے خط بھیجا، لیکن یہاں بھی ناظم صاحب نے ازہری صاحب کو جامعہ سلفیہ کی خدمت کے لیے روک لیا، اور آپ نے بطیب خاطر جامعہ سلفیہ کی خدمت کو دوسرے وظائف و مناصب پر ترجیح دی۔

نہرو یونیورسٹی میں لیکچررشپ کا ایک انٹرویو:

نہرو یونیورسٹی میں شعبۂ عربی میں لیکچررشپ کے لیے رمضان میں بنارس سے دلی کا سفر کیا۔ حالت صیام میں انٹرویو کے لیے نہرو یونیورسٹی گئے، وضع قطع اور لباس میں پورے مولانا، جو ساتھی انٹرویو میں شرکت کے لیے آئے تھے وہ بھی ازہری فاضل تھے۔ لیکن مکمل بابو، انٹرویو کے دوران چائے آئی، تو صدر شعبہ اور دوسرے ممتحنین بشمول انٹریو کے لیے آئے ہوئے صاحب نے چائے نوش فرمائی اور ازہری صاحب نے معذرت کی کہ میں صائم ہوں۔ اسی سے یونیورسٹی والوں کو ان کے دینی رجحان کا پتا چل گیا۔ بات تو پہلے سے طے تھی، من جملہ سوالات کے ایک سوال کسی عربی عبارت کے اعراب کا بھی تھا۔ ازہری صاحب کے صیام کی وجہ سے ہونٹ سوکھے تھے، سفر کی تکان بھی رہی ہوگی۔ اس سوال پر مزید طبیعت مکدر ہوئی اور وہاں سے یہ یقین کر کے باہر آئے کہ یہاں کوئی گنجایش نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے بھی بڑے عجیب اور پر حکمت ہوتے ہیں۔ ان کے بہت سارے ساتھیوں نے جامعہ ازہر اور دار العلوم قاہرہ، یا امریکن یونیورسٹی میں جا کر تعلیم حاصل کی اور ملازمت کے چکر میں مختلف مقامات اور مناصب پر پہنچے، مگر وظیفے کی مشغولیت کی بناء پر عملی طور پر یا ملی خدمات کے میدان میں اکثر لوگوں کی کارکردگی کوئی خاص قابل ذکر نہیں۔ بعض حضرات نے ایک مخصوص مدت تک پڑھنے لکھنے کا کام کیا اور ان کی تحریرات و تحقیقات سے لوگوں نے فائدہ بھی اٹھایا۔ بعض بزرگ دوست عہد پیری

میں مناسب اور مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔لیکن ازہری صاحب اپنے معاصرین اور ساتھیوں میں اس حیثیت سے ایک منفرد مقام پر ہیں کہ ان کو بچپن سے تا وفات ہمیشہ علمی اور دینی ماحول ملا، اور ہندستان واپس آ کر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جامعہ سلفیہ میں آ گئے۔اور اس طرح سے دین اور علم کی خدمت کا ہمہ جہتی میدان مل گیا۔

اپنے شعبۂ تخصص کے مطابق اگر کسی آدمی کو بالخصوص عالم دین کو کام کرنے کا موقع مل جائے تو یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہوتی ہے۔ازہری صاحب اس سعادت سے بہرہ ور ہوئے، اور ۶۸ء سے ۲۰۰۹ء تک پوری دل جمعی سے تدریس، تالیف اور دعوت کے میدانوں میں سرگرم رہے۔

ازہری صاحب کی جامعہ سلفیہ کے اسٹیج سے دینی دعوتی، تعلیمی اور تصنیفی خدمات

ازہری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے متعدد صلاحیتوں سے نوازا تھا، حفظ قرآن اور تجوید کے ساتھ مئو کے مدارس کی تعلیم سے عربی، اردو، فارسی اور علوم وفنون پر پوری طرح دسترس حاصل تھی۔جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے عربی زبان وبیان اور ترجمہ پر مزید قدرت ہوگئی۔اس طرح سے ہندوستان کے مروجہ عربی نصاب تعلیم میں سے ہر فن کی کتابوں کی پڑھانے کی استعداد بدرجۂ اتم موجود تھی، اور اردو، عربی میں تصنیف وتالیف اور مقالہ نگاری نیز تحقیق کتب کے ساتھ ساتھ انتظامی امور کی نگرانی کا بھی بڑا اچھا سلیقہ تھا۔اس لیے ابتداء ہی سے تدریس کے ساتھ مختلف انتظامی امور کی ذمہ داریاں بھی بحسن خوبی نبھاتے رہے۔

جامعہ سلفیہ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے درج ذیل میدانوں میں اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا:

۱- تدریس کے میدان میں عربی زبان وادب اور شرعی علوم کو ہمیشہ پڑھاتے رہے۔

۲- جامعہ میں ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مختلف اسلامی علوم وفنون اور عربی، اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں ۴۰۰ سے زیادہ کتابیں شائع کیں، جن میں سے اکثر یا ساری کتابوں کی تصحیح اور مراجعت کا کام بھی کیا۔بہت ساری کتابوں پر مقدمے بھی تحریر فرمائے اور بہت ساری کتابوں کی پروف ریڈنگ کی۔

ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے ذمہ دار کی حیثیت سے محض اس کا انتظام وانصرام خود ایک بہت بڑا کام اور کارنامہ ہے۔لیکن ساتھ ساتھ خود ادارہ کی خدمت اور تدریس کے فرائض کے ساتھ حسب توفیق تصنیف وتالیف اور ترجمہ وتعریب کا کام کرتے رہے، جن میں سے بعض کتابیں جامعہ سے شائع ہوئیں اور بعض باہر سے۔

۳- مرکزی مکتبہ جامعہ سلفیہ: جامعہ سلفیہ کی سنٹرل لائبریری سے بھی ازہری صاحب کو بڑا تعلق خاطر تھا اور اس کی فنی ترتیب اور کتابوں کی تجلید وغیرہ میں انہوں نے کافی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۴- ماہنامہ صوت الامۃ (عربی): جامعہ سلفیہ سے ۱۹۶۹ء سے آپ کی ادارت میں عربی مجلہ صوت الامۃ شائع ہونا شروع ہوا، جس کے اداریے وہ ابتداء سے

تاوفات لکھتے رہے اور مختلف موضوعات پر مقالات بھی۔

۵- ماہنامہ محدث: جامعہ میں اردو مجلّہ (صوت الجامعہ، ۱۹۷۳ء) میں شائع ہونا شروع ہوا، جس کے ایڈیٹر استاذ محترم مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی رحمہ اللہ تھے، جو بہت بڑے عالم دین، علوم کتاب وسنت کے ماہر، فنون کے استاذ، بالخصوص حدیث، فقہ، اور فرائض میں ماہر اور ایک اچھے شاعر تھے، جامعہ کی تاسیس ۶۳ء سے پہلے آپ جامعہ رحمانیہ میں استاذ تھے، جامعہ سلفیہ کے موسسین میں بلاشبہ آپ کا نام آئے گا۔ اس زمانے میں جامعہ سلفیہ سے جتنے اشتہارات اور پمفلٹ شائع ہوتے رہے سب استاذ محترم کے رشحات قلم کا شاہکار تھے۔ مجلّہ کا اداریہ خود لکھتے، مختلف مضامین بھی، بالخصوص اہل حدیث اور دیوبندیوں کے مابین اختلافی مسائل پر ہونے والی صحافتی بحثوں میں ان کا قلم خوب خوب چلتا تھا، مولانا عامر عثمانی رحمہ اللہ (ایڈیٹر ماہنامہ تجلی، دیوبند) سے مجلّہ میں مناظرے چلتے رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایک مشہور مضمون ''مدیر تجلی کا سہ آتشہ تفقہ'' کئی قسطوں میں لکھا۔ مولانا عامر عثمانی کے انتقال پر کہنے لگے کہ مرحوم کے انتقال کے بعد ان مسائل پر لکھنا بند ہوگیا ہے۔ ان کے حوالے سے اس طرح کے اختلافی مسائل پر لکھنے کا موقع ملتا تھا۔ آزاد صاحب میں بہت ساری خوبیاں تھیں اور جامعہ سلفیہ کی تاسیس سے پہلے ہی اس مہم کو سر کرنے والے گمنام مجاہدین کے سردار تھے۔ مولانا آزاد رحمہ اللہ کے بعد اردو مجلّہ کی خدمت بھی سب سے زیادہ ازہری صاحب نے کی، اردو میں بھی ازہری صاحب کا قلم خوب خوب چلتا تھا اور ہمیشہ ''محدث'' میں آپ کی مشارکت شروع ہی سے رہی، اب جامعہ کے پاس تدریس کے علاوہ کام کرنے کے لیے میدان تھے، عربی کے ساتھ اردو مجلّہ میں ازہری صاحب کی شرکت مجلّہ کے لیے نیک فال کی حیثیت رکھتا تھا۔

غالباً ۶۹ء میں استاذ محترم مولانا محمد رئیس ندوی رحمہ اللہ بھی جامعہ آگئے۔ اس طرح سے اب ادارہ میں تین مشہور لکھنے والے ہوگئے۔ کہنا یہ ہے کہ جامعہ میں موجودگی کی وجہ سے ازہری صاحب اردو مجلّہ میں بھی مقالات لکھتے رہے، ساتھ ہی باہر کے مجلّات میں بھی مقالات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا، جن میں ترجمان واہل حدیث کے علاوہ مجلّہ معارف اعظم گڑھ قابل ذکر ہیں۔

ایک اور پرلطف اور تعجب انگیز واقعہ:

یہ بات تو یاد نہیں رہی کہ مجلّہ اہل حدیث دہلی کا اس زمانے میں ایڈیٹر کون تھا۔ ہوا یہ کہ ازہری صاحب نے ''ابوالعباس القلقشندی'' پر ایک مقالہ تحریر فرمایا اور اسے اشاعت کے لیے مجلّہ اہل حدیث میں روانہ کیا، لیکن نامعلوم مصلحت اور سبب کی بنا پر مضمون شائع نہ ہوسکا۔ شاید ازہری صاحب کو اس کا سبب معلوم رہا ہو، لیکن انہوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ ہوا یہ کہ مقالہ کی ایک کاپی مجھے پوسٹ کرنے کے لیے دی اور کہا کہ تمہارے نام سے مجلّہ اہل حدیث میں یہ مضمون بھیج رہا ہوں۔ دیکھو وہ اسے شائع کرتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے وہ مضمون پوسٹ کر دیا۔ اور جلد ہی میرے نام سے وہ شائع ہوگیا۔

۶-وکالۃ الجامعہ

جامعہ سلفیہ کے شعبۂ انتظام کے حوالے سے :
ازہری صاحب نے کئی سال تک جامعہ کی مذکورہ بالا میدانوں میں خدمت کا تجربہ حاصل کیا، تو آگے چل کر مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ کی تحریک پر ناظم صاحب نے ان کو وکیل الجامعہ کے منصب پر فائز کیا۔ جب کہ اس منصب کے قبول کرنے سے پہلے جامعہ کی عربی دنیا سے خط وکتابت، کانفرنسوں اور سیمیناروں کی تنسیق وترتیب، عرب مہمانوں کے استقبال اور ملک کے اندر سے آنے والے مہمانوں کی دیکھ ریکھ کے فرائض انجام دیتے رہے، اور عملاً شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید بن ابوالقاسم رحمانی رحمہ اللہ کے کاموں میں ان کے مشیر، بلکہ بسا اوقات خود ان کے کاموں کو انجام دیتے تھے۔

وکیل الجامعہ کے منصب کے بعد ذمہ داریوں کا کام بڑھ گیا، اور آزاد صاحب پوری زندگی تدریس وافتاء اور اردو مجلے اور امتحانات کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔

ازہری صاحب کے آنے کے بعد ناظم صاحب نے آپ کو اردو میں خط وکتابت وغیرہ کی بعض ذمہ داریاں بھی دیں۔ اور آزاد صاحب کی وفات کے بعد ازہری صاحب عملی طور پر جامعہ سلفیہ کے اندرون اور بیرون ملک کے سارے کام کرنے لگے، عملاً شیخ الجامعہ کے ساتھ متعاون رہے، شیخ الجامعہ بھی ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں آپ سے رجوع ہوتے، اور اساتذہ اور طلبہ کے تدریسی مسائل سے لے کر ان کی رہائش، بورڈنگ، علاج، اور چھٹی، نیز امتحانات وغیرہ کے سارے مسائل سے آپ کا تعلق ہوگیا، نیز نصاب تعلیم سے متعلق مسائل، مرکزی، صوبائی اور ضلعی جمعیت اہل حدیث سے متعلق کام، اساتذۂ جامعہ کے ذریعے ہونے والی تبلیغی اور دعوتی خدمات کی تنسیق ونگرانی کے مسائل۔

جب ازہری صاحب کو وکالۃ الجامعہ کے منصب پر فائز کیا گیا تو حقیقت میں یہ ایک شکلی چیز تھی۔ کیونکہ شروع ہی سے جامعہ کے سارے کام وہی کرتے تھے، اب باقاعدہ اس عہدے کے تقاضے کی بناء پر مزید ذمہ داریاں بڑھ گئیں اور جامعہ کی فلاح وبہبود سے متعلق خط وکتابت اور اس کے لیے اندر اور باہر کے اسفار، سرکاری حکام سے ملاقات، باہر سے آنے والے ہر طرح کے مہمانوں کا استقبال اور ان کی ضیافت کی دیکھ بھال اور جامعہ میں ہونے والے اجتماعات اور سیمینار کا انتظام وانصرام، سپاس ناموں کی تحریر، اور جامعہ کی طرف سے ملک کے اندر اور ملک کے باہر کے اسفار ورحلات ساری ذمہ داریاں بحسن خوبی نبھاتے رہے۔

تصنیف، تالیف، ترجمہ اور تحقیق

لگتا ہے کہ عنفوانِ شباب ہی سے ازہری صاحب کو لکھنے پڑھنے اور ترجمہ کا ذوق وشوق تھا اور جامعہ ازہر جا کر عربی زبان وادب میں استعداد پیدا کرنے کے ساتھ ہی مصر ریڈیو کے شعبۂ اردو میں خبروں کو اردو میں ترجمہ کرکے ریڈیو پر پڑھنے کا کام کیا، جس سے ان صلاحیتوں کو مزید پختگی حاصل ہوئی۔ ۶۸ء میں جب مصر

سے واپس آتے ہی بنارس آ گئے، تو فوراً ہمہ جہتی میدان میں صلاحیت کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے بہت ساری کتابوں کی تالیف فرمائی نیز اردو سے عربی میں مفید کتابیں منتقل کیں، فارسی سے بھی کئی مفید کتابیں عربی میں منتقل کیں، جن میں:

اردو مولفات:

۱- تاریخ ادب عربی (۵ حصے) (ناشر: ادارۃ البحوث الاسلامیۃ، جامعہ سلفیہ، بنارس)

۲- خاتون اسلام (ناشر: ادارۃ البحوث الاسلامیۃ، جامعہ سلفیہ، بنارس)

۳- عصر حاضر میں مسلمانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کی ضرورت

۴- قرآن کریم پر غور وتدبر مذہبی فریضہ ہے

۵- رمضان اور عید الفطر تربیتی نقطہ نظر سے (ناشر: مکتبہ الفہیم، مئو)

۶- ہندوستان میں تحریک اہل حدیث اور جدید تقاضے: تاریخ وتعارف

عربی مولفات:

۱- منصور الفقیہ: حیاته وشعره (ایم فل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) یہ رسالہ مجلّہ المجمع الھندی، علی گڑھ میں ۱۹۷۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۲- نظرة الی مواقف المسلمین من احداث الخلیج (ناشر: ادارۃ البحوث الاسلامیۃ، جامعہ سلفیہ، بنارس)

۳- حقیقة الأدب ووظیفته (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۴- مشكلة المسجد البابری فی ضوء التاریخ والكتابات المعاصرة (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۵- الثقافة الاسلامیة والمسلمون

۶- مسئولیة الشباب المسلم فی العصر الحاضر

۷- قراءة فی كتاب الحالة الخلقیة فی العالم الاسلامی للأستاذ اسرار عالم (یہ کتاب بھی مجلّہ صوت الامة کے (۹۶ء) بارہ قسطوں میں شائع ہوئی۔

۸- أزمة الخلیج فی میزان الشرع والعقل (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۹- القادیانیة والاستعمار (یہ رسالہ مجلّہ جامعہ سلفیہ میں تین قسطوں میں شائع ہوا۔

۱۰- ماذا یقولون و کیف یفکرون (مجلّہ صوت الامة، ۱۹۹۶ء) تین حلقوں میں شائع ہوا۔

۱۱- اتجاهات الدیانات الی السعادة أو الشقاوة (مجلّہ صوت الامة، ۱۹۹۶ء) تین حلقوں میں شائع ہوا۔

۱۲- الدعوة الاسلامیه فی الهند: متطلبات و مقترحات (مجلّہ صوت الامة، ۱۹۹۵ء) تین حلقوں میں شائع ہوا۔

۱۳- فضل العلم فی الكتاب والسنة ومسئولیات العلماء فی هذا العصر (یہ چار قسطوں میں مجلّہ صوت الامہ میں ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔

۱۴- فتویٰ علماء المسلمین فی شبه القارة الهندیة بخروج القادیانی واتباعه من الاسلام (مجلّہ صوت الامة، ۱۹۹۹ء) کے دو شمارے میں اور ۲۰۰۰ء کے چار

شماروں میں اور چھٹی قسط دور شیخ الاسلام محمد حسین البتالوی فی مقاومة القادیانی ونحلته اور مؤسس حرکة ختم النبوة وقادتها ۲۰۰۰ء کے دوقسطوں میں شائع ہوا، اس طرح سے یہ رسالہ آٹھ قسطوں پر مشتمل ہے۔

۱۵-شیخ الاسلام ابوالوفاء ثناء اللہ الامرتسری وجهوده فی مقاومة القادیانیة (چارقسطوں میں مجلّہ صوت الامة ۲۰۰۰، ۲۰۰۱ء)۔

۱۶- جهود شیخ الاسلام ابی الوفاء الامرتسری فی العالم العربی (تین قسطوں میں مجلّہ صوت الامة ۲۰۰۱ء)

۱۷-تعریف بکتاب الجیب المحمدی (محمدیہ پاکٹ بک) (چارقسطوں میں مجلّہ صوت الامة ۲۰۰۱ء)

۱۸-الاسلام الذی ندعوالیه -(نظرة الی میزات الاسلام)، (چارقسطوں میں مجلّہ صوت الامة ۲۰۰۴ء)۔

۱۹-السیرة النبویة وأهمیتها فی الاسلام (دوقسطوں میں مجلّہ صوت الامة ۲۰۰۵ء)۔

۲۰-جهود مخلصة فی مقاومة القادیانیة (پانچ قسطوں میں مجلّہ صوت الامة ۱۹۸۹ء)۔

۲۱-صور من نشاطات المدارس الاسلامیه فی الهند (۲)حلقات، (مجلة الجامعة ۱۹۹۴، ۱۹۹۵ء)

۲۲-ماذا یقولون و کیف یفکرون (۳)حلقات (مجلة الجامعة ۱۹۹۶ء)۔

تحقیق و تعلیق اور تہذیب و اختصار

۱-کتاب بهجة المجالس لابن عبدالبر (تحقیق نصف آخر، مع فهارس کامله للکتاب من أوله الی آخره)

یہ پی ایچ ڈی کا مقالہ (تھیسس) ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی ادب میں پیش ہوا۔

۲-حصول المامول فی اختصار ارشاد الفحول للشوکانی اختصار نواب صدیق حسن خاں (اختصار و تعلیق) (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۳- فتح المنان فی اختصار الاتقان للسیوطی (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

عربی سے اردو میں ترجمہ

۱- انا: عباس محمود عقاد کی خودنوشت سوانح (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۲-مختصر زادالمعاد للشیخ محمد بن عبدالوہاب (ناشر: الدار السّلفیہ، بمبئی)

۳- اصلاح المساجد للشیخ جمال الدین القاسمی (ناشر: الدار السّلفیہ، بمبئی)

۴-رسالت کے سایہ میں (تالیف: ڈاکٹر عبدالحلیم عویس) (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۵- راہ حق کے تقاضے (مہذب: اقتضاء الصراط المستقیم لشیخ الاسلام ابن تیمیہ/تہذیب الفریوائی) (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۶-تیس حکومتوں کے زوال کے اسباب (تالیف: ڈاکٹر عبدالحلیم عویس) (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

۸-خادم حرمین شریفین کا حقیقت افروز بیان (ناشر: جامعہ

سلفیہ، بنارس)

۹- شاہ عبدالعزیز آل سعود ایک عہد ساز شخصیت (ناشر: فریوائی اکیڈمی، دہلی)

۱۰- اعضاء کی پیوندکاری: شرعی نقطۂ نظر سے (بحث ہیئۃ کبار العلماء، سعودی عرب) (ناشر: جامعہ سلفیہ، بنارس)

اردو سے عربی میں تراجم:

۱- رحمۃ للعالمین تالیف: علامہ سلیمان سلمان منصور پوری (مطبوع: الدار السّلفیہ، بمبئی، دو حصے، اور تیسرے حصہ کا ترجمہ اپنے شاگرد سے کرایا اور اس کی مراجعت کی)

۲- حركة الانطلاق الفكرى وجهود الشاه ولى الله الدهلوى فى التجديد (مقالات مولانا محمد اسماعیل سلفی)

۳- الاسلام تشكيل جديد للحضارة تالیف: مولانا محمد تقی الامینی (مطبوع: قاہرہ، مصر)

۴- عصر الالحاد: خلفيته التاريخية وبداية نهايته: تالیف: مولانا محمد تقی الامینی (مطبوع: قاہرہ، مصر)

۵- النظام الالهى للرقى والانحطاط: تالیف: مولانا محمد تقی الامینی (مطبوع: قاہرہ، مصر)

۶- بين الانسان الطبيعى والانسان الصناعى: تالیف: مولانا محمد تقی الامینی (مطبوع: قاہرہ، مصر)

۷- مسألة حياة النبى ﷺ فى ضوء الأدلة الشرعية: تالیف: مولانا محمد اسماعیل سلفی گجرانوالہ

۸- حجية الحديث الشريف: تالیف: مولانا محمد اسماعیل سلفی گجرانوالہ

۹- زيارة القبور وحكمها: تالیف: مولانا محمد اسماعیل سلفی گجرانوالہ

۱۰- النصرانية الحاضرة فى ضوء التاريخ والبحث العلمى: تالیف: مولانا مصلح الدین اعظمی

۱۱- الشيوعية والاسلام فى ميزان العقل: تالیف: مولانا مصلح الدین اعظمی

فارسی سے عربی میں:

۱- قرة العينين فى تفضيل الشيخين (تالیف: شاہ ولی اللہ دہلوی) (ناشر: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند)

۲- الاكسير فى أصول التفسير (تالیف: سید نواب صدیق حسن خان بھوپالی)

کچھ مزید علمی منصوبے:

۱- رحمۃ للعالمین کے عربی ایڈیشن کے بعد ازہری صاحب نے اس کے اردو نسخے پر بھی نظر ڈالی اور اس کی تحقیق کر کے مولانا احمد شاکر مالک مکتبہ سلفیہ، لاہور کو یہ نسخہ بھیجا وہ بھی اس کتاب کی علمی اشاعت کے خواہش مند تھے لیکن ابھی تک یہ محقق ایڈیشن منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔

۲- ازہری صاحب کی ایک بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک نیا ترجمہ قرآن مع حواشی شائع کیا جائے، اس کے لیے مولانا عبدالوہاب حجازی کو متعین کیا گیا اور ترجمہ کا کام پورا بھی ہوا، جس کی مراجعت اور تصحیح کا کام ازہری صاحب کی نگرانی میں پورا ہوا، تفسیری حواشی کے بارے میں میری معلومات نامکمل ہیں۔

۳- دار الدعوۃ دہلی کے پروگرام میں تفسیر سعدی کا اردو ترجمہ بھی تھا، میں نے اس کام کے لیے آپ سے عرض کیا

کہ آپ اس کا ترجمہ املا کرادیجئے، چنانچہ آپ نے یہ کام املاء کی شکل میں شروع کیا اور بعد میں کچھ لکھا بھی لیکن مشغولیت کی بنا پر اس کام کو مولانا ضیاء الحسن سے اپنی نگرانی میں کرایا جو تقریباً ایک تہائی تک پہنچا، اور بعد میں اس کی تکمیل دہلی کے دارالدعوۃ کے ارکان مجلس علمی نے کی۔

۴-ازہری صاحب کے علمی منصوبوں میں دو منصوبوں کا علم مجھے اور ہے جو نامکمل رہے، جامعہ ازہر میں ایم اے کرنے کے بعد آپ نے پروگرام بنایا کہ پی ایچ ڈی کا مقالہ نواب صدیق حسن قنوجی بھوپالی (ت: ۱۳۰۷ھ) کے موضوع پر لکھیں گے اور اس کی پوری منصوبہ بندی آپ کے پاس لکھی شکل میں میں نے دیکھی تھی، لیکن ہندوستان واپس آجانے کے بعد بات آگے نہ بڑھ پائی۔

۵-اسی طرح سے امام شافعی کی تفسیر کی ترتیب کا کام بھی آپ کے ذہن میں تھا اور اس کے لیے وہ امام شافعی اور ان کے شاگردوں کی کتابوں کی ورق گردانی بھی کرتے تھے، ریاض میں میں نے اس موضوع پر ایک جدید کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی، تو اس پر خوش ہوئے کہ چلو میں نے نہ سہی کسی نے اس نیک کام کو انجام دیا۔

۶-معارف ابن تیمیہ اور ابن القیم کے تراجم کے سلسلے میں بھی وہ ہمارے پروگرام سے پوری طرح ہم آہنگ تھے ،بلکہ عملی طور پر اس کے لیے منصوبہ بندی اور مترجمین کے لیے ہدایات بھی آپ نے تحریر فرمائی تھیں، اور آپ کا ذہن پوری طرح تیار تھا کہ اس پروگرام پر محنت ہونی چاہئے، مجھے آپ کے اوراق میں یہ بات ملی کہ مستقبل میں آپ فتاویٰ ابن تیمیہ کے اردو میں اختصار کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔

۷- ایسے ہی مولانا ثناء اللہ امرتسری کی نصرانیت کے رد وابطال کی خدمات پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں، اور رحمۃ للعالمین کا اردو میں ایک تحقیقی ایڈیشن تیار کررہے ہیں، جس کا تذکرہ اوپر ہوا، رہ گیا شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے فتاویٰ کے اختصار کا مسئلہ تو میرے خیال سے منصوبہ اور عناوین کی قلمبندی سے آگے یہ کام نہ ہوسکا، اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کی نصرانیت سے متعلق ردوابطال پر تالیف کا مجھے کوئی علم نہیں کہ وہ کام کہاں تک پہنچا، اور رحمۃ للعالمین کی اشاعت کا مسئلہ حافظ محمد احمد شاکر (لاہور) کے پاس ہے، اور میرے خیال میں وہ کتاب اچھے ڈھنگ سے ان شاء اللہ منظر عام پر آئے گی۔

ادارۃ البحوث کی طرف سے تحقیقی کتب کی اشاعت:

ازہری صاحب کو بڑا شوق تھا کہ جامعہ سلفیہ سے حدیث کی اچھی کتابیں تحقیق کے بعد شائع ہوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ میں پڑھنے والے ہم طلبہ سے کافی مشورے ہوئے۔ یہ بات طے پائی کہ الکامل لابن عدی کی تحقیق ہونی چاہئے اس سلسلے میں ڈاکٹر محمود میرہ، استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ کا تعاون بھی رہا، لیکن مخطوطات کے فوٹو کے علاوہ عملاً اس میں کوئی پیش رفت نہ پائی اور اس دوران اس کا ایک ایڈیشن بھی بازار میں آگیا پھر فتح المغیث فی شرح الفیۃ الحدیث للعراقی: تالیف: الحافظ السخاوی کے مخطوطات اکٹھے کئے گئے اور اساتذہ کی مدد سے اس کام کی ابتداء ہوئی لیکن اساتذہ اس سلسلے میں زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئے تو آپ نے اپنی

نگرانی میں جامعہ کے ایک فاضل اور وہیں کے مدرس مولانا حسین احمد سلفی سے یہ کام کرایا، اور الحمدللہ یہ کتاب پانچ جلدوں میں شائع بھی ہوئی۔

عربی اور اردو میں مقالہ نویسی:

ازہری صاحب نے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں بہت سارے مقالات لکھے، جن میں سے اکثر جامعہ سلفیہ کے عربی اور اردو مجلّات بیز طلبہ کی انجمن کے مجلّہ المنار میں شائع ہوئے ،اس کے علاوہ معارف اعظم گڑھ، ترجمان دہلی، اہل حدیث دہلی، افکار عالیہ، مئو، دعوت دہلی، برہان دہلی، اور قومی مورچہ بنارس، اور روزنامہ سہارا، اور دوسرے دینی اداروں سے شائع ہونے والے مجلّات میں شائع ہوئے ، ہمارے سامنے ایک فہرست ہے جس کو عزیزان گرامی ڈاکٹر فوزان بن مقتدیٰ حسن اور مولانا محفوظ الرحمٰن سلفی لائبریرین جامعہ سلفیہ نے تیار کی ہے ،جن میں ۱۹۶۹ سے ۲۰۰۶ء تک ۳۰۴ عربی مقالوں کا ذکر ہے، اور ۱۹۶۳ سے ۲۰۰۷ء تک شائع ہونے والے ۱۷۸ اردو مقالات کا ذکر ہے ،اسی فہرست کے مطابق ۴۸ عربی کتابوں پر مقدمہ لکھنے کا ذکر ہے ،اور ۹۷ اردو کتابوں پر لکھے ہوئے مقدموں کا تذکرہ ہے اور ۳ انگریزی کتابوں پر اور ۴ ہندی کتابوں پر اور جامعہ سلفیہ سے باہر چھپنے والی ۲۲ کتابوں پر انہوں نے مقدمے لکھے، ۲۱ کانفرنسوں کیلئے مقالات لکھے، جن میں سے ۵ کانفرنسوں میں مقالات بھیجے اور ان میں شرکت نہیں کی ،اور ۹ بڑی بڑی کانفرنسوں کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیا۔

واضح رہے کہ یہ فہرست مقالات جامعہ سلفیہ کے مجلّات وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے، بعض ذاتی معلومات سے، اس پر بھی اضافے کی گنجائش ہے، مثلاً دارالدعوۃ، دہلی اور جامعہ ابی ہریرہ الاسلامیہ (دارالدعوۃ، لال گوپال گنج، الٰہ آباد) میں پڑھے جانے والے کم از کم چار مقالات ایسے ہیں جن کا ذکر اس فہرست میں نہیں آیا ہے۔

مولانا عبدالوحید ناظم جامعہ سلفیہ، مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر منتخب ہو گئے تو جمعیت کے مسائل سے بھی ان کا گہرا تعلق ہوگیا۔

درمیانی عہد میں ۱۹۷۸ء سے پہلے ہی شیخ انیس الرحمٰن اعظمی شیخ الجامعہ کے دست راست بنے، ان کو بھی ازہری صاحب کی تائید حاصل تھی۔ آزاد صاحب کی وفات کے بعد مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے مجلّہ ''محدث'' کی ذمہ داری قبول کی۔ ۱۹۷۲ء میں فراغت کے بعد ۱۹۷۳ء میں میرا تقرر جامعہ سلفیہ میں ہوگیا ، میرے ذمہ پریس، مکتبہ، اور مجلّہ وغیرہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری تھی۔ اسی سال مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری تشریف لائے، اسی سال ناظم صاحب یعنی مولانا عبدالوحید عبدالحق رحمہ اللہ حج کے لیے تشریف لے گئے، مجھے جو ذمہ داری دی گئی وہ اوپر مذکور ہوئی، لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے ازہری صاحب نے ناظم صاحب کے مشورے سے مجھے حکم دیا کہ میں مجلّہ اہل حدیث اور دوسرے مجلّات کی فائلوں سے مولانا ثناءاللہ امرتسری کی قادیانیت کے رد وابطال کی کوششوں پر مواد فراہم کروں، چنانچہ میں نے بعض فائلیں اس مقصد کے لیے اپنے کمرے میں منگوالیں ،لیکن جب مولانا صفی الرحمٰن صاحب آگئے تو

اس منصوبہ پر ان کو کام کرنے کے لیے کہا گیا، چنانچہ حاصل مطالعہ کے طور پر مولانا صفی الرحمٰن نے اس موضوع پر دو کتابیں شائع کیں۔ایک ''قادنیت اپنے آئینے میں'' اور دوسری ''قادیانیت کے کے رد وابطال میں مولانا امرتسری کی جدوجہد''۔

آزاد صاحب کی رحلت کے بعد ''محدث'' کی ذمہ داری مولانا صفی الرحمٰن کے ہاتھ میں آئی۔اور ۱۴۰۸ء کے ابتدائی مہینوں تک آپ ''محدث'' کے ایڈیٹر رہے، ان کے مرکز السنۃ والسیرۃ مدینہ میں باحث کی حیثیت سے منتقل ہونے کے بعد مجلّہ ''محدث'' کے ایڈیٹر مولانا عبدالوہاب حجازی کو بنایا گیا۔

مولانا عبدالوہاب حجازی کے پورے عہد میں مجلّہ ''محدث'' سے ازہری صاحب کا تعلق ادارتی بورڈ کے سب سے معزز اور مقتدر ممبر بلکہ سرپرست کے رہا۔

صوبائی اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے پلیٹ فارم سے:

ضلعی اور مقامی جمعیت اہل حدیث سے میرے خیال میں ازہری صاحب کا تعلق صرف ان کے پروگراموں میں شرکت کرنے اور تقریر کرنے تک محدود رہا، لیکن صوبائی جمعیت اہل حدیث اتر پردیش کا دفتر شہر کے قلب دال منڈی میں تھا اور اس کے ناظم مولانا عبدالقادر انور بستوی تھے، جو اب تک اس کے ناظم ہیں، لیکن اب بنارس سے یہ آفس الحمدللہ لکھنو منتقل ہو چکا ہے۔

صوبائی جمعیت کے پروگراموں کی ترتیب وتنسیق میں ناظم صاحب سے قربت کی وجہ سے اور بنارس میں اس کے آفس کی وجہ سے کافی رہا، اور مولانا انور صاحب ہمیشہ ڈاکٹر صاحب سے مشورہ لیتے نظر آئے۔ باقی مجالس میں بھی ان کی فعال شرکت ہوتی تھی، جامعہ سلفیہ کے دارالحدیث ہال میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں مجھ کو شرکت کی دعوت ملی، اس جلسہ میں مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری کے مدینہ جانے کے بعد صوبائی امیر کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ اثنائے گفتگو میں نے کچھ گزارشات کیں تو ازہری صاحب نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھے چپ رہنے اور کارروائی کو آگے بڑھانے کی بات کہی اور اساتذہ مسکرا کر رہ گئے۔ میں نے ایک تجویز یہ پیش کی کہ صوبائی جمعیت کا آفس لکھنو، کانپور اور الٰہ آباد جیسے یوپی کے اہم شہروں میں ہونا چاہئے۔ جامعہ سلفیہ و جامعہ رحمانیہ اور ضلعی جماعت اہل حدیث کی بنارس میں موجودگی کی وجہ سے یہاں صوبائی جمعیت کے آفس کا کوئی فعال کردار نہ ہوگا۔ جب کہ مذکورہ شہروں میں سے کسی شہر میں اس کے آفس کے قیام سے وہاں جماعت متحرک ہوسکتی ہے، الحمدللہ ایک لمبی مدت کے بعد اس وقت مشرقی یوپی کا آفس لکھنو میں ہے، اور بنارس کے آفس سے زیادہ فعال، مفید اور موثر ہے۔

ازہری صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلی الأعظمی ناظم صاحب کی مدت امارت میں مجلس عاملہ کے ممبر بنائے گئے، ناظم صاحب کے امیر جمعیت بننے کے بعد عملاً لکھنے پڑھنے اور جماعت کی تنظیم کے مسائل کی ذمہ داری جامعہ سلفیہ کے اساتذہ نے نبھائی جن میں ازہری صاحب نیز مولانا صفی الرحمٰن قابل ذکر ہیں۔

جماعت کے مختلف چھوٹے بڑے اجتماعات میں محترم ناظم صاحب کے خطبۂ صدارت وامارت کی ترتیب وتسوید کا کام ڈاکٹر صاحب کرتے تھے اور ناظم صاحب سے پہلے اور بعد میں مشورہ کرتے۔ میرے اندازے کے مطابق ابتدائی چند سالوں کے علاوہ بعد میں ناظم صاحب کے نام سے چھپنے والی ساری تحریریں ازہری صاحب کے قلم سے نکلی ہیں۔

☆ کئی اجتماعات میں مجھے بھی دہلی جانا ہوا، جن میں سے ایک اجتماع جمعیت شبان اہل حدیث اور حرمت حرمین کانفرنس وغیرہ ہیں۔

دعوتی اور تعلیمی کانفرنسیں اور اجتماعات:

جماعت کے پلیٹ فارم سے معیاری بڑے جلسوں کے انعقاد کا کام جامعہ سلفیہ کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے، جس سے جامعہ کے مسلک اور تعارف کی اشاعت کا کام بہت خوب ہوا، اور اندر اور باہر کے ہر طرح کے اداروں اور افراد سے جامعہ اور جماعت اور افراد جماعت کے تعلقات استوار ہوئے، اور اس سے فی الجملہ تعلیم ودعوت اور مسلک کی اشاعت کا کام آگے بڑھا۔ ان سبھی اجتماعات کے انتظام میں اور اس کی مناسبت سے مختلف اشتہارات، پمفلٹ اور رسائل، اور بعض جماعتی تعارف کے وقیع کام خود ازہری صاحب نے کئے، اور کئی کام اساتذہ کے اشتراک سے ہوا۔ ترحیبی کلمات اور سپاس ناموں کو اگر اکٹھا کیا جائے تو یہ خود ایک اچھی کتاب بن جائے گی۔

ایسے ہی جامعہ کے تعارف، اور مکتبہ سے متعلق پمفلٹ وغیرہ کو اگر اکٹھا کیا جائے تو بہت ساری مفید معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں جس سے جماعت اور جامعہ کی تاریخ پر کام کرنے والے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

جامعہ سلفیہ کے لیے اندر اور باہر سفارت کاری:

جامعہ کی فلاح و بہبود کے لیے ازہری صاحب نے ناظم صاحب کے ساتھ ۱۹۷۸ء میں سعودی عرب کا پہلا سفر کیا، جس میں دار الافتاء کے زیر انتظام دونوں آدمیوں نے حج کیا۔ ساتھ میں مولانا مختار احمد ندوی بھی تھے، اس سال میں نے بھی حج کی سعادت حاصل کی تھی، اور نحر اور رمی جمرات میں ازہری صاحب کے ساتھ تھا۔

اس کے بعد کئی بار ازہری صاحب نے ناظم صاحب کے ساتھ اور کئی بار مولانا عبدالقدوس صاحب نائب ناظم جامعہ سلفیہ اور شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید کے ساتھ باہر کا سفر کیا۔

سفر کو حدیث میں جہنم کا ٹکڑا کہا گیا ہے:

اس آسانی اور سہولت کے زمانے میں بھی سفر میں آدمی کو طرح طرح کی پریشانیوں اور زحمتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن میں نے مشاہدہ کیا کہ ناگفتہ بہ حالات میں بھی یہ ذمہ داری نبھائی جاتی رہی، ان اسفار میں مدینہ یونیورسٹی، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ (ریاض)، جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ)، جامعۃ الملک سعود (ریاض)، شئون الحرمین (مکہ)، دار الافتاء (ریاض)، وزارۃ الأوقاف الاسلامیہ (ریاض) ندوۃ الشباب الاسلامی (ریاض)، رابطۃ العالم الاسلامی (مکہ) وغیرہ کے ذمہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں،

اور دوسرے مختلف شعبہ جات کے لوگوں سے رابطہ ہوتا۔

جامعہ سلفیہ بنارس سے آنے والے طلبہ اور دوسرے سلفی اخوان جو جامعہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھے جامعہ کے وفد آنے پر اپنے معزز مہمانوں سے ملتے، اجتماعی دعوتوں کا انتظام ہوتا، مختلف انداز کے مشورے ہوتے، جامعہ کی ترقی، مسلک کی اشاعت جمعیت کے کاز کو مضبوط کرنے، جامعہ کے زیر انتظام چھپنے والی کتابوں اور مجلات کی اشاعت اور اہل علم تک پہنچانے کے مسائل زیر غور آئے۔ سعودی عرب کی یونیورسٹیوں بالخصوص جامعہ اسلامیہ میں داخلے کے مسائل بھی زیر بحث آتے۔

مدینہ منورہ میں اقامت کے دوران جامعہ کے وفود میں آئے ہوئے مہمانوں کی خدمت ناچیز کے لیے ایک خوشگوار یاد کی حیثیت رکھتی ہے، تقریباً سبھی ذمہ داروں نے گھر آکر ہماری عزت افزائی کی، اور اکثر و بیشتر ضیافت کی سعادت سے بہرہ ور ہوا۔ ۱۴۰۸ھ میں میں جامعہ سلفیہ میں تدریس کے لیے گیا اور چار سال تک یہ خدمت انجام دی، ۱۴۰۸ھ میں ماہ ربیع الأول میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر کانفرنس ہوئی جس میں عزت مآب ڈاکٹر عبداللہ ترکی چانسلر جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض تشریف لے آئے، اس کے فوراً بعد ناظم صاحب اور ازہری صاحب کی معیت میں مجھے پھر سعودی عرب آنے کی سعادت ملی، اور وفد کے ان معزز بزرگوں کی خدمت کا موقع ملا۔ ان اسفار میں میں نے دیکھا کہ ازہری صاحب ہمیشہ کچھ نہ کچھ مطالعہ اور لکھنے اور ترجمے کا کام کرتے رہتے تھے۔

مختلف مجالس میں جامعہ کے تعارف کے لیے مجھے آگے بڑھاتے تھے، مجھے ان کی موجودگی میں کچھ کہتے ہوئے دقت محسوس ہوتی تھی، تو ہمت افزائی کرتے تھے، دوست اہل علم کی مجالس میں گفتگو کے وقت کھل کر باتیں ہوتیں، ازہری صاحب اپنے اخلاق، برتاؤ اور طرز تکلم سے سامعین کی نظروں میں اپنا وقار قائم کر لیتے، ناظم صاحب کی مجرد حاضری، سکوت اور مسکراہٹ، اور کبھی کبھی برموقت بعض باتیں ان کے وقار میں مزید اضافہ کر جاتیں۔

جامعہ اسلامیہ میں میرے تعلیم حاصل کرنے کی لمبی مدت اور ایم اے اور پی ایچ ڈی کے ایام میں میری تحقیق سے کئی کتابوں کی اشاعت سے ایک محدود پڑھے لکھے حلقے میں اپنے تعارف کی بناء پر سب سے بے حجابی اور شناخت اور الفت و محبت کے ماحول کو بنانے کا کام دیتی تھی، اور اس طرح سے مل ملا کر جامعہ اور جماعت کے تعارف کی سبیل نکل آتی تھی۔ جامعہ سلفیہ میں جامعہ اسلامیہ سے مبعوث اساتذہ کرام: شیخ ربیع ہادی المدخلی، شیخ احمد ہادی الطالبی، شیخ علی مشرف العمری، شیخ عبداللہ الغنیمان، اور شیخ عبداللہ الحسین وغیرہم کے علاوہ جامعہ اسلامیہ کے ذمہ داران اور اساتذہ کرام سے کافی گہرے روابط تھے جن میں شیخ عبدالمحسن العباد، شیخ عمر فلاتہ، شیخ حماد بن محمد الانصاری، ڈاکٹر محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی، شیخ عوض الشہری وغیرہ اساتذہ اور ذمہ داران قابل ذکر ہیں، جن کے یہاں آنا جانا اور ان کی زیارت ان اسفار میں ضروری رہا کرتی تھی، اور مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کے مشائخ کے علاوہ ان اسفار میں جن چند احباب سے گہرے روابط ہوئے اور وہ ازہری صاحب کو برابر یاد رکھتے تھے یہ ہیں:

عبداللہ الشویعر اور محمد احمد یہ دونوں صالح نوجوان ندوۃ الشباب الاسلامی (ریاض) کے اسٹیج سے سعودی عرب آنے والے علماء اور دعاۃ کی خدمت کا کام تطوع وفی سبیل اللہ کرتے، اور ان دونوں نے ہماری دعوت پر جامعہ سلفیہ کی زیارت بھی کی، اور سالہا سال جامعہ کی خدمت کے لیے ہمہ تن کوشاں رہے۔

ڈاکٹر عبدالحلیم العویس جامعۃ الامام میں کلیۃ العلوم الاجتماعیۃ کے استاذ، مشہور قلم کار، جامعہ سلفیہ میں استاذ زائر کی حیثیت سے تشریف لے گئے، اور انہی کے ذریعے سے ندوۃ الشباب ریاض سے روابط پیدا ہوئے، اور ندوۃ کے مہمان خانے میں ٹھہرنے کے انتظامات ہوتے رہے۔ ازہری صاحب سے ان کی گہری دوستی تھی، ازہری صاحب نے اس تعلق خاطر کی بنا پر موصوف کی بعض کتابوں کا خود اردو میں ترجمہ کیا، اور سیرت ابن حزم کا ترجمہ مولانا محمد رئیس ندوی سے کرایا۔ یہ ساری کتابیں جامعہ سے چھپیں۔ اسی سلسلے سے مولانا محمد تقی امینی ناظم دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بعض کتابیں بھی ڈاکٹر عبدالحلیم عویس صاحب نے شائع کیں، جن کو ڈاکٹر صاحب نے عربی میں منتقل کیا تھا۔

شیخ محمد ابراہیم بن قعود: موصوف دارالافتاء میں سعودی عرب سے باہر کام کرنے والے دعاۃ کے ادارہ کے مدیر تھے اور ازہری صاحب سے بڑا تعلق خاطر رکھتے تھے۔

عصر حاضر کے عظیم سیاح، مشہور مولف ادیب، داعی، منتظم، علامہ شیخ محمد ناصر العبودی سعودی عرب کی ادبی اور دینی میدان کی اہم شخصیت ہیں، وہ پہلے جامعہ اسلامیہ کے جنرل سکریٹری تھے، بعد میں دارالافتاء میں قائم مجلس الدعوۃ الاسلامیۃ کے جنرل سکریٹری بنے، اس وقت وہ رابطۃ العالم الاسلامی کے نائب جنرل سکریٹری ہیں، اور ایک سے زائد بار ہندوستان کا سفر کیا، ان سے ازہری صاحب کے تعلقات بڑے گہرے تھے۔ بنارس کے ایک اجلاس میں غالباً ۱۴۰۰ھ میں جو جامعہ سلفیہ میں جہیمان کے خروج مہدی کے فتنے سے واقع حادثہ حرم کے فوراً بعد ہوا تھا، عبودی صاحب بنارس تشریف لائے، ازہری صاحب نے مجھ سے کہا کہ چلو عبودی صاحب سے تمہارا تعارف کرادوں، چنانچہ میں آپ کی معیت میں ہوٹل گیا اور آپ نے عبودی صاحب کے سامنے میرے تعارف میں اچھے کلمات کہے جس کا اثر میں نے بعد میں عبودی صاحب سے ملاقاتوں میں محسوس کیا۔

ڈاکٹر عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی: ڈاکٹر عبداللہ ترکی دعوت وتعلیم کے میدان کی بہت مشہور شخصیت ہیں، اور ایک لمبی مدت سے اہم تعلیمی اور دعوتی مناصب پر رہ کر متنوع خدمت اب تک انجام دے رہے ہیں، موصوف ازہری صاحب سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے، (۱۴۱۲ھ) میں جب میں جامعہ الامام میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے آیا تو ہمیشہ ملاقات میں آپ نے الأخ مقتدی کہہ کر ان کی برابر خیریت پوچھتے رہے۔

سفر وحضر کے مشاہدات:

استاذ محترم رحمہ اللہ سے ۱۹۶۸ء سے تاوفات میرا گہرا ربط وتعلق رہا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانۂ طالب

علمی میں عالمیت اور فضیلت کے دوران چھ سال، اور فراغت کے بعد ایک سال جامعہ سلفیہ کے ادارۃ البحوث میں کام کرتے ہوئے یعنی سات سال تک مدینہ منورہ آنے سے پہلے پھر بارہ سال کے بعد چار سالہ تدریسی مدت یعنی گیارہ سال مجھے جامعہ سلفیہ میں رہنے کا موقع ملا، جس میں اور اساتذہ کی بہ نسبت ازہری صاحب کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا زیادہ موقع ملا، جس میں یہ بات ملاحظہ میں آئی کہ ازہری صاحب اپنے کاموں اور اوقات کی پلاننگ بڑے اچھے انداز سے کرتے تھے۔ اور ان کا وقت ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا، یا ادارۃ البحوث کی کتابوں، عربی مجلہ جامعہ سلفیہ سے متعلق کاموں میں گزارتے، تمام ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے ہمیشہ ہلکے پھلکے کام کرتے رہتے یعنی کسی کتاب یا مضمون کا عربی سے اردو یا اردو سے عربی میں ترجمہ اور بہت سارے لوگوں کے مطالبات کی تکمیل بھی زندگی کا ایک مشغلہ تھا، بازار بہت کم جاتے، بینک کا کام ملازمین کے ذریعہ کرواتے۔

جمعہ پابندی سے محلہ نمیا کی مسجد اہل حدیث میں پڑھاتے تھے۔ کبھی مسجد باگڑ بلی میں بھی پڑھاتے تھے اور نمیا کی مسجد کے تعلق سے وہاں کے چند احباب کے ساتھ دوستی بھی نبھاتے اور ان کے ساتھ ہفتہ عشرہ میں ان کے گھروں میں یا جامعہ میں بھی خورد ونوش کی مجالس جمتیں۔ کبھی مئو کے دوستوں میں سے کوئی آجاتا تو انگشتی بھی شوق سے پکاتے اور کھاتے کھلاتے۔ اس درمیان علی گڑھ کی مدت اقامت میں میرا ایک بار علی گڑھ بھی جانا ہوا، ان کی وہاں کی زندگی بھی بڑی مشغولیت اور جہاد کی تھی۔ اپنا ایم فل سے پی ایچ ڈی تک کے اعمال کی ترتیب وتنسیق وہ بھی ہوسٹل سے شعبہ عربی اور اس کی لائبریری اور یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری مولانا ابوالکلام آزاد کا چکر لگا کر، پھر ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو (صدر شعبہ عربی) جو ان کے مقالے کے سپروائزر بھی تھے، کے ساتھ علمی تعاون بھی ایک مصروفیت کا کام تھا نیز متعدد اساتذہ اور طلبہ کے مقالات ومولفات کی تصحیح وتنقیح یا تعریب، بالخصوص ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے پورے اردو کام کو عربی میں منتقل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

علی گڑھ کے اساتذہ کے بہت سارے مقالات اس زمانے میں بھی اور بعد میں بھی صوت الامۃ میں شائع ہوتے رہے۔ نیز ڈاکٹر مختار الدین کی نگرانی میں مجلۃ المجمع العلمی کے اصل روح رواں ازہری صاحب ہی تھے، اور اسی تعلق سے اس کی اشاعت جامعہ سلفیہ کے پریس میں ہوئی۔

میری جامعہ اسلامیہ، مدینہ منورہ میں طالب علمی کے زمانہ میں جب ازہری صاحب سعودی عرب آتے تو وہ جامعہ سلفیہ کے کام سے، یا توعیہ اسلامیہ یا کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے آتے۔ بعد میں ۱۴۰۸ھ-۱۴۱۱ھ تک میں بھی ان کے ساتھ سفر میں رہا۔

☆ سفر میں فرض منصبی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کے اپنے ذوق کی تکمیل کی فکر بھی برابر انہیں دامن گیر رہتی تھی، اور نئی کتابوں، مجلات اور اخبارات کا سرسری ہی سہی، مطالعہ کرتے، نوٹ لیتے، اور ساتھ میں موجود ترجمہ وتعریب یا مضمون نویسی کا کام بھی برابر کرتے

رہتے تھے۔

☆ سفر میں آنے والے یہ درج ذیل واقعات کا ذکر ازہری صاحب کی زندگی اور طبیعت ومزاج کے جاننے کے لیے مفید ہوں گے:

۱-۱۴۰۵ھ کی بات ہے جامعہ سلفیہ، بنارس کے شیخ الجامعہ استاذ محترم مولانا عبدالوحید رحمانی رحمہ اللہ ازہری صاحب کے رفیق سفر تھے، وہ شیخ احمد مجتبیٰ سلفی کو لے کر شیخ ابن باز رحمہ اللہ سے مولانا محمد رئیس ندوی رحمہ اللہ کے وظیفے کے سلسلے میں طائف تشریف لے گئے اور میں ان کے ساتھ جدہ آیا۔ جدہ میں مولانا ابوالاشبال صغیر شاغف بہاری کے گھر میں قیام ہوا، ان کے ذریعہ بعض احباب سے ملاقات ہوا کرتی تھی، گرمی کا موسم تھا، کمرہ میں بھی سخت گرمی تھی، اوپر مستزاد مچھروں کی یلغار، بہرحال صبر وشکر کے ساتھ یہ رات گزر گئی، اور پھر مولانا ابوالاشبال کے نکتوں اور لطیفوں سے رات کی تلخی ختم ہوگئی، اور زندگی کے ہنگامہ اور مسائل نے پرانی رات کو نسیاً منسیاً کردیا۔

۲-جامعہ سلفیہ کے وفود جب بھی خلیجی ممالک میں جاتے جامعہ کے تعارف سے متعلق پمفلٹ کے علاوہ جامعہ کی اردو، عربی اور انگریزی، ہندی سبھی زبانوں کی مطبوعات اور عربی اور اردو مجلات ساتھ ہوتے، اور ایرپورٹ پر مراقبۃ المطبوعات کے کارکنان ضابطے کی کارروائی میں جامعہ کی کتابیں رکھ لیتے، اوران کو واپس لانے میں کافی مشکلات کا سامنا ہوتا، کیونکہ یہ ادارہ دار الافتاء کے تابع تھا، اور بغیر تفتیش وتحقیق کے ان کا ملنا ایک مسئلہ ہوتا، ایک بار ایسا ہوا کہ ساری مطبوعات اور مہر سب دارالافتاء کے لجنۃ مراقبۃ المطبوعات چلی گئیں، لیکن کافی وقت گزرنے کے بعد بھی وہ واپس نہ ہوئیں، انہی میں مہر بھی تھی، یہ تجویز آئی کہ یہاں پر ایک مہر بنوالی جائے، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک مہر بنوانے کی قیمت (۴۶) سعودی ریال ہے، جب اس کا ہندوستانی روپے میں ترجمہ ہوا تو رقم بڑی نظر آئی، ازہری صاحب نے کہا کہ میں بغیر مہر ہی کے کام چلالوں گا، جامعہ جاکر اس کا حساب کیا دوں گا، بہرحال اس سال کتابیں واپس نہیں ہوئیں، اور غالباً اسی سفر میں شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی طرف محسنین کے نام خطوط ملنے میں بھی بڑی تاخیر ہوگئی جس کے بغیر کسی سے رابطہ بے نتیجہ تھا اور اس پر ایک ماہ گزر گئے، اور آپ اور شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ مدینہ آگئے، جب مجھے معلوم ہوا کہ دارالافتاء سے خطوط ملنے میں اتنی تاخیر ہوگئی تو میں نے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے پرائیویٹ سکریٹری شیخ ابراہیم بن عبدالرحمٰن الحصین رحمہ اللہ سے ان کے گھر میں جاکر ملاقات کی، اور بتایا کہ ہمارے اساتذہ جامعہ سلفیہ سے آئے ہوئے ہیں اور ایک مہینہ ہوگیا لیکن ابھی شیخ ابن باز رحمہ اللہ کے محسنین کے نام سفارشی خطوط نہیں ملے ہیں، تو آپ نے تعجب کا اظہار کیا، اس لیے کہ آپ شیخ ابن باز کے گھر کے آفس کے ذمہ دار تھے، اور دارالافتاء میں شیخ کے آفس سکریٹری دوسرے ہوا کرتے تھے پھر یہ کہ یہ خطوط ادارۃ الدعوۃ فی الخارج کی طرف سے لکھ کر شیخ کے پاس بھیجے جاتے تھے اور یہ ایک ضابطہ کی کارروائی ہوتی اور مجھے حکم دیا کہ تم ان مشائخ کو لے کر ریاض آؤ، چنانچہ میں وفد کے ساتھ ریاض گیا اور صبح صبح آفس کھلتے ہی شیخ ابراہیم الحصین کے پاس پہنچ گیا، آپ نے

انتہائی دلجمعی سے کئی گھنٹوں کی جد وجہد کے بعد صلاۃ ظہر تک ہمارے مطلوبہ محسنین کے نام شیخ ابن باز کے خطوط تیار کرواکران پر شیخ صاحب کے دستخط کرواکر ہمیں دے دیا، اس پر سب سے زیادہ تعجب خودادارۃ الدعوۃ فی الخارج کے ملازمین کو ہوا کہ اچانک یہ سب کیسے ہوگیا، ایک مہینہ کے بعد الحمد للہ اب وفد اس لائق ہوگیا کہ وہ اپنا کام شروع کرے، قارئین اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ازہری صاحب اور شیخ الجامعہ نے اس مدت انتظار کے لیے کتنا صبر کیا ہوگا۔

سفر میں کتابوں کے ساتھ ایرپورٹ پر اس طرح کے برتاؤ کو دیکھتے ہوئے ازہری صاحب نے یہ حل نکالا کہ اب اکثر سفر میں ظہران ایرپورٹ پر اترتے جہاں پر ان کے گہرے دوست مولانا محمد اویس ندوی رحمہ اللہ کے صاحب زادے شعیب بھائی ایرپورٹ پر کتابوں کی نگرانی کے کام پر متعین تھے، شعیب بھائی اور اُن کی اہلیہ ذکیہ بھابھی ازہری صاحب سے غایت درجہ محبت رکھتے تھے، اور اس تعلق خاطر سے ہم لوگوں کا رابطہ بھی شعیب بھائی سے بڑا گہرا رہا، اور دمام اور خبر میں اسی رابطہ سے مزید تعلقات استوار ہوئے، بار بار ہوائی جہاز کا سفر ایک مسئلہ ہے، لیکن جامعہ کے کام کے لیے یہ طریقہ بھی ازہری صاحب نے استعمال کیا (۱۴۰۸ھ) میں جب آپ ناظم صاحب کے ساتھ سعودی عرب آئے تو میں بھی ساتھ میں تھا، اور ظہران ایرپورٹ پر جہاز سے نکلتے ہی شعیب بھائی نے ہمارا استقبال کیا، اور ہمارا سامان جلد ہی گاڑی میں پہنچ گیا۔

۳- ایک بار کویت سے شیخ عبداللہ السبت حفظہ اللہ کا ٹیلیفون آیا کہ وہ بمبئی کے فلاں ہوٹل میں آرہے ہیں، ازہری صاحب وہاں جاکران سے ملاقات کریں، چنانچہ انہوں نے مجھے ساتھ لیا، ہم دونوں بنارس سے ٹرین پر سفر کر کے بمبئی پہنچے، رات گزارنے کے لیے صابوصدیق اور بھنڈی بازار وغیرہ کے علاقہ میں کئی جگہ کوشش کے باوجود مناسب رہائش کا انتظام نہ ہوسکا تو بدرجہ مجبوری ایک مسلم مسافر خانہ کی مسجد کے دروازے پر بمشکل ایک جگہ تھوڑی دیر لیٹنے کو ملی، اور اذان فجر کے بعد وہ جگہ بھی جاتی رہی۔ فجر کے بعد ہم وہاں سے بستر باندھ کر ایک ہوٹل میں گئے، سامان رکھ کر فوراً سمندر کے کنارے ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ جہاں شیخ عبداللہ السبت ناشتے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے، ہوٹل پہنچ کر شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی آپ سے بہت ساری باتیں ہوئیں جن میں ایک خاص موضوع نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلی جس سے سلفی منہج کی تعلیم کا مناسب انتظام ہوجائے۔ عرب کے سلفی دوستوں کی یہ خواہش بڑی برہنہ انداز کی ہوتی ہے، ہندوستان کے حقیقی اور واقعی مسائل کی انہیں خبر ہی نہیں ہوتی، آدمی کو جب کسی ملک کی نہ تاریخ کا علم ہو اور نہ جغرافیہ کا تو اس کو اپنی بات سمجھانا، اور اس کی باتوں اور مشوروں کو سننا اور اس پر صبر کرنا بڑا مشکل کام ہے، ازہری صاحب ایسے موقع پر پوری دلجمعی سے سامع کی گفتگو سننے اور صبر کرنے کے عادی تھے اور بندہ اٹھک پٹھک اور نعم ولا والا مولوی، اور قدیماً کہا گیا ہے کہ ملا آں باشد کہ چپ نہ شود۔ بالخصوص جب دلائل اپنی جانب قوی ہوں تو خاموش رہنے کا کیا مطلب؟۔ شیخ عبداللہ السبت حفظہ اللہ جب اپنی بات ختم

کر چکے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ کسی بھی نصاب تعلیم کے بدلنے کے لیے مناسب کورس کی کتابوں کی فراہمی پہلی شرط ہے۔لیکن بات یہیں نہیں ختم ہوجاتی ، ہندستان میں ایک عربی فارسی اور اردو کا نصاب تعلیم ہے، جو ہندستانی یونیورسٹیوں کے شعبوں میں پڑھایا جاتا ہے اوران کا انتظام حکومت کرتی ہے۔ دوسرا نصاب تعلیم جو درس نظامی کی نام سے معروف ومروج ہے ار، جس میں بعض اصلاحات بھی ہوئی ہیں وہ آج کل کے عربی مدارس میں نافذ ہے۔ ان مدارس کی اکثریت سرکاری تعلیمی بورڈوں سے ملحق ہے جن کے اساتذہ کو بورڈ سرکاری طور پر تنخواہیں دیتا ہے، اب تو پنشن کا نظام بھی آ گیا ہے۔طلبہ با قاعدہ سالانہ عربی وفارسی میں مولوی عالم، فاضل دینیات وفاضل ادب منشی ومنشی کامل وفاضل سب کا امتحان دیتے ہیں۔ یہ نظام یوپی اور بہار کے صوبوں میں نافذ ہے۔ ہندوستان کی علمی اور مذہبی فضاء میں یہاں کی اکثریت کے عقائد اور فقہی مزاج سے کٹ کر کسی بھی نصاب تعلیم کا نفاذ افادیت اور عدم افادیت سے قطع نظر مشکل کام ہے۔صورت حال یہ ہے کہ ہندستان میں موجود پرائیویٹ عربی مدارس کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کی تنخواہیں حکومت دیتی ہے، حکومت کا اپنا ایک نصاب ہے، جس کے مطابق امتحانات میں مدارس کے طلبہ کا بیٹھنا ضروری ہے،اوران ڈگریوں کی بنیاد پر فارغ التحصیل طلبہ کو انہیں عربی مدارس میں سرکاری ملازمتیں بھی ملتی ہیں، انہیں یونیورسٹیوں میں اور طب اور دوسرے شعبوں میں داخلے ملتے ہیں۔ اس پابندی سے صرف چند ادارے باہر ہیں، اب ایسے حالات میں سلفی مدارس میں اپنا من پسند نصاب کس طرح نافذ کرنا ممکن ہے۔

شیخ موصوف کے لیے ہندوستان میں نصاب تعلیم اور نظام تعلیم سے متعلق یہ معلومات ان کے اپنے بیان کے مطابق بالکل نئی تھیں، میں نے ان سے کہا: جناب والا! کیا آپ حضرات کی نگرانی میں چلنے والا کوئی ایسا ادارہ ہے جو اس طرح کے مسائل کی تنفیذ کے لیے کسی ادارہ کو خود کفیل بنا سکے، طبعاً ایسا نہ ہے، اور نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے، اور اگر اس طرح کے مسائل سے آپ پہلی بار مطلع ہو رہے ہیں تو ۲۵ سال سے برصغیر کا دورہ کر کے آپ یہاں کیا کام کر رہے تھے۔

ناظم اعلیٰ رحمہ اللہ جو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر تھے اور وہاں ایک کارکن کو مستعفی کرنے کے ردعمل پر ان کی طرف سے جمعیت کے خلاف قانونی کارروائی سے مسئلہ سنگین ہوگیا تھا، میں نے اس کی سنگینیت کے بارے میں پہلے دن ہی ازہری صاحب اور ناظم صاحب کو باخبر کر دیا تھا، لیکن افسوس کہ وہ لوگ اس مسئلہ پر کچھ نہ کر سکے، اور بات آگے بڑھ گئی، اب ناظم صاحب کی خواہش تھی کہ ازہری صاحب بمبئی سے دہلی ہوتے ہوئے بنارس واپس ہوں تاکہ متعلقہ شخص سے اس سلسلے میں تفاہم ہو جائے، بہرحال ہم بمبئی سے دہلی پہنچے اور بات چیت ہوئی لیکن بات کسی نتیجہ تک نہ پہنچی، یہ ہمارا بڑا لمبا سفر تھا۔ اس میں میں نے ازہری صاحب کو بڑا صابر وشاکر اور قناعت پسند آدمی دیکھا، جامعہ کی طرف سے اخراجات کے سلسلہ میں بہت محتاط رہتے تھے کہ اس سے لوگوں کو زبانیں کھولنے کا موقع ملتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب کتاب کا مسئلہ تو الگ ہے۔

حیدرآباد کے ایک علمی سفر میں میں ان کے ساتھ تھا، وہاں ایک سرکاری ادارے کی طرف سے ڈاکٹر عبدالودود اعظمی صاحب کی نگرانی میں عربی کی تعلیم پر ایک سیمینار تھا جس میں ہندوستانی یونیورسٹیوں اور بعض نمائندہ جامعات جیسے ندوہ، دیوبند، جامعہ سلفیہ وغیرہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے، یہ سفر بھی بڑا طول طویل تھا، اور مجھے تنہا ایک ادارہ کی زیارت کے لیے شولاپور جانا تھا، میں وہاں سے جاکر آیا۔ اس سفر میں بھی میں نے آپ کے صبر وضبط اور قوت برداشت کا مشاہدہ کیا۔

توعیہ اسلامیہ مکہ مکرمہ:

موسم حج میں حجاج ومعتمرین کی دینی رہنمائی اور مسائل حج میں ان کے فتاوے کے جوابات کے لیے حکومت کے ادارہ دار الافتاء کی طرف سے اور بعد میں وزارت الاوقاف کے تابع یہ ادارہ بڑی اہم دینی خدمت شروع سے آج تک کرتا آرہا ہے، برصغیر کے علماء ودعاۃ بھی اس میں شرکت کرتے تھے، جامعہ اسلامیہ کے طلباء بھی مشائخ کی تقریر اور فتاویٰ کے ترجمہ کے لیے ایام حج میں اس میں کام کرتے تھے، میں نے بھی ایک سے زائد بار شرکت کی ہے، ازہری صاحب اس ادارے میں کئی سال حاضر ہوئے، وہیں پر میری ملاقات مولانا سعید الرحمن اعظمی سے بڑی اچھی طرح ہوئی، ازہری صاحب شعبہ صحافت عربی میں بھی یہاں کے اساتذہ کے ساتھ کام کرتے تھے، ایک بار ایک شذرہ میری کتاب جهود مخلصة في خدمة السنة المطهرة پر شائع ہوا جو آپ کے توسط سے اس شعبہ کے ممبر کو ملا تو موصوف نے اس پر تبصرہ کیا، اس کا ایک نسخہ ازہری صاحب نے مجھے بھی دیا تھا، دار الافتاء ریاض میں آنے جانے اور توعیہ کے پروگراموں میں شرکت کے ذریعہ شیخ محمد عبداللہ بن قعود، ڈاکٹر محمد سعد الشویعر وغیرہ سے بڑے اچھے روابط قائم ہوئے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالب علمی سے اس کی انتظامیہ کی ممبری تک:

۱۹۶۸ء میں ازہری صاحب بنارس آئے، اور بعد میں علی گڑھ کے شعبہ عربی میں پی ایچ ڈی کے رسالہ لکھنے کے لیے داخلہ لیا، تو اس سلسلے میں کئی سال تک ان کی علی گڑھ میں اقامت رہی اور بعد میں ایک سال لیکچرر شپ میں علی گڑھ میں رہنا ہوا، اور چھٹیوں میں بنارس چلے آتے تھے۔

علی گڑھ کی اقامت کی وجہ سے جامعہ سلفیہ کے تعلقات اس یونیورسٹی کے اساتذہ کے ساتھ علی وجہ الخصوص اور دوسری یونیورسٹیوں اور اداروں کے ساتھ استوار ہوئے جس سے طرفین کو فائدہ ہوا، جس کا مظاہرہ سیمیناروں میں اور اجتماعات میں شرکت اور جامعہ کی سند دوسری حکومتی یونیورسٹیوں میں اعتراف کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

ازہری صاحب کا رابطہ علی گڑھ سے بنا رہا، آخر میں وہاں کی انتظامیہ بورڈ کی ممبری بھی ملی، جو بہر حال طرفین کے لیے اعزاز ہے، ٹھیٹھ دینی مدارس کے فارغ التحصیل متحرک اہل حدیث عالم کا ممبری کے لیے انتخاب یہ اچھی چیز بھی تھی اور نادر بھی، اس میں صلاحیت واستعداد کے ساتھ شخصیت کی وجاہت بھی رہے تو ممبر کے لیے اعزاز

ہے، اور محض تعلقات کی بناء پر ممبر شپ حاصل ہو تو جو تبصرہ چاہیے وہ کر لیجئے، میری نظر میں اس طرح کے اداروں کی ممبری یہ علی گڑھ کے لیے اعزاز ہے، کہ اتنے فاضل آدمی وہاں سے نسبت رکھتے ہیں، ورنہ ممبران تو اداروں میں آتے جاتے ہی رہتے ہیں، خود ازہری صاحب کو اس طرح کی ممبری سے بہت دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے اس کے اکثر اجتماعات میں شریک بھی نہیں ہوئے۔

ایک تجویز:

کسی بھی اہم شخصیت کی رحلت کے بعد لوگوں کو اس بات کا شوق ہوتا ہے کہ وہ اس شخصیت کے بارے میں پڑھیں۔ ازہری صاحب ان علمی اور دینی شخصیات میں سے ہیں، جن کا رابطہ علماء اور طلبہ سے پوری زندگی رہا ہے، اور انہوں نے جو کچھ لکھا پڑھا اکثر چیزیں کتابی شکل میں نیز مجلات میں مطبوع ہیں۔ الحمدللہ جامعہ سلفیہ کے مجلات میں شائع ہونے والے مقالات سب کے سب محفوظ ہیں، اس لیے میں نے ازہری صاحب سے کئی بار اس بات کا مطالبہ کیا کہ مختلف عناوین وموضوعات کے مقالات کو مرتب کر کے شائع کرنا چاہیے، تو وہ اس پر تیار تھے لیکن عملی طور پر مقالات کو الگ سے شائع کرنے کا کام نہ ہو سکا، اب عزیز ڈاکٹر فوزان ازہری سے گزارش ہے کہ وہ مقالات کی ترتیب کا کام کر کے اس کو اشاعت کے لائق بنائیں، میرے خیال میں اس کی ترتیب اس طرح سے ہو سکتی ہے۔

۱- مقالات الازہری (کتابوں پر مقدمے اور تقریظات (اردو)

۲- مقالات الازہری (کتابوں پر مقدمے اور تقریظات (عربی)

۳- البحوث المقدمة فی الندوات والمؤتمرات (خارج الہند)

۴- مقالات الازہری (سیمینار اور کانفرنس میں پڑھے جانے والے مقالات)

۵- مقالات الازہری (تعلیم وتربیت اور نصاب تعلیم سے متعلق مقالات)

۶- مقالات الازہری (تاریخ اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث سے متعلق مقالات)

۷- مقالات الازہری (اسلامی دعوت اور اسلامی کی نشر واشاعت سے متعلق مقالات)

۸- مقالات الازہری (ہندوستان میں عربی ادب اور زبان سے متعلق مقالات)

۹- مقالات الازہری (مسلمانوں کے سیاسی، اجتماعی اور تعلیمی مسائل سے متعلق مقالات)

۱۰- مقالات الازہری (سفرنامے)

۱۱- مقالات الازہری (شخصیات کا تعارف، تراجم اور وفیات)

۱۲- مقالات الازہری (حدیث اور حجیت حدیث اور عمل بالحدیث سے متعلق مقالات)

۱۳- مقالات الازہری (معاشرتی مسائل سے متعلق مقالات)

۱۴- مقالات الازہری (قرآن کریم کے فضائل ومناقب سے متعلق مقالات)

۱۵-مقالات الازہری (الادیان والفرق سے متعلق مقالات)

۱۶-مقالات الازہری (سعودی عرب اور عالم اسلام سے متعلق مقالات)

۱۷-مقالات الازہری (علمی اور تحقیقی مقالات)

۱۸-مقالات الازہری (مسلم پرسنل لاء بورڈ اور مسلم مسائل سے متعلق مقالات)

۱۹-مقالات الازہری (جامعہ سلفیہ اور دوسرے دینی اور تعلیمی اداروں سے متعلق مقالات)

اساتذہ، طلبہ اور مولفین ومترجمین کی ہمت افزائی:

۱- ازہری صاحب جامعہ سلفیہ کے اساتذۂ کرام اور دوسرے علماء وفضلاء کو ہمیشہ اس بات کی ہمت دلاتے کہ وہ تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا کام کچھ نہ کچھ کرتے رہیں۔ جس نے بھی کوئی مقالہ یا کوئی کتاب ان کو اشاعت کے لیے بھیجی تو آپ کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ چیز مجلات میں یا ادارۃ البحوث کی طرف سے چھپ جائے۔ اس سلسلے میں پہلی مثال مولانا رئیس الاحرار ندوی کی ہے، جن کی آپ نے بھرپور ہمت افزائی کی اور برابر تصنیف وتالیف میں ان کی مدد کرتے رہے۔ ان کی ساری کتابیں جامعہ سے شائع کرنے کا انتظام کیا۔ جب کہ بعض لوگ ندوی صاحب کی کتابوں کو جامعہ سے شائع کرنے کے سلسلے میں بہت سارے اعذار تلاش کرتے تھے، ان میں سے بعض برحق بھی تھے۔ لیکن ازہری صاحب نے مولانا کو جامعہ سے حق الخدمت دلانے اور ان کتابوں کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ نہ آنے دی۔

ایک فاضل نے ایک اہم دینی اور علمی شخصیت پر ایک مشہور عالم دین کی نگرانی میں ایک مقالہ تیار کیا، مقالے کے بعض حصوں کو جامعہ سلفیہ کے مجلّہ صوت الامہ میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ ۱۴۰۸ھ سے ۱۴۱۲ھ تک مقالات کی ترتیب دے کر میں استاذ محترم کے پاس پیش کر دیتا تھا اور جب وہ اس کی اجازت دے دیتے تو وہ پریس میں چلا جاتا۔ اس مقالہ کے سلسلے میں میں نے کہا کہ اس کی اصلاح کے بغیر اس کی اشاعت مناسب نہیں ہے، تو اس پر ناراض ہوگئے اور کسی اور سے کہا کہ اس کو دیکھ لیں اور وہاں سے بھی یہی جواب آیا تو خود اس کو پڑھا اور میری رائے کی تصویب فرمائی کہ یقیناً یہ مقالہ اس صورت میں شائع ہونے کے لائق نہیں ہے۔

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کا منصوبہ یہ تھا کہ کتب حدیث، اہل حدیث علماء کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کی جائیں تا کہ برصغیر کے اہل حدیث مدارس میں صحیح ڈھنگ سے حدیث کی تعلیم ہو، اور یہ کام خود انہوں نے التعليقات السلفية على سنن النسائي کو شائع کر کے کیا، اور آپ کی تجویز پر شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ نے مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح کی تالیف فرمائی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی صحیح بخاری پر حاشیے کی ہے۔ اس حاشیے کے لیے آپ نے مولانا عزیز زبیدی -رحمہ اللہ- کو منتخب کیا، اور انہوں نے یہ کام انجام بھی دیا، اور اشاعت کی غرض سے یہ حاشیہ جامعہ سلفیہ کے پاس پہنچا، (۱۴۰۸ھ) میں جب میں جامعہ گیا تو ازہری

صاحب نے یہ مسودہ مجھے دیا کہ میں اس پر اپنی رائے دوں، کئی دن کے مطالعہ کے بعد میں نے عرض کیا کہ جس مقصد کے لیے یہ حاشیہ تیار کرایا گیا ہے موجودہ صورت میں اس کی اشاعت سے وہ مطلوبہ مقصد نہیں حاصل ہوگا اس لیے کہ جن مروجہ حواشی کتب حدیث سے مستغنی ہونے کے لیے اس حاشیہ کی ضرورت ہے، اس کے مراجع بھی کم وبیش وہی ہیں، جو مطبوع اور مروج ہیں، مزید اطمینان کے لیے آپ نے ڈاکٹر رضاء اللہ -رحمہ اللہ- سے کہا کہ اس حاشیہ پر وہ اپنی رائے دیں تو انہوں نے بھی وہی بات کہی جو میں کہہ چکا تھا، بعد میں یہ مسودہ مولانا احمد شاکر کو واپس کر دیا گیا۔

ادارۃ البحوث سے اچھی کتابوں کی اشاعت اور مجلہ صوت الامۃ میں مقالات کے اشاعت کے لیے برابر خط وکتابت بھی کرتے تھے، اور بعض دفعہ اس انداز سے مطالبہ کرتے کہ اس پر مجھے اعتراض ہوتا لیکن دعوت کی مصلحت کے پیش نظر آپ کا یہ اسلوب ہوتا۔

ہندوستان میں عربی زبان وادب پر مولانا علی میاں ندوی -رحمہ اللہ- کی المختارات مشہور انتخاب ہے، ازہری صاحب ایک نئے انتخاب کی خواہش رکھتے تھے اور اس کے لیے آپ نے پروگرام بھی بنایا تھا لیکن یہ کام یا تو سعودی عرب اور مصر کی لائبریریوں میں ہوتا یا پھر علی گڑھ کی مولانا ابوالکلام آزاد لائبریری میں جہاں عربی ادب کے قدیم وجدید مراجع دینی مدارس کی لائبریریوں کی نسبت سے زیادہ موجود تھے، چنانچہ آپ کی خواہش تھی کہ میں (۱۹۷۳ء) میں کچھ دن کے لیے علی گڑھ آؤں اور ان منتخب مقالات کو کتابوں سے نوٹ کروں، لیکن ایسا نہ ہو سکا اور پھر میں (۱۹۷۴ء) میں مدینہ منورہ آ گیا، اور اس موضوع پر کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

آپ کی خواہش یہ تھی کہ امام بخاری پر ایک اچھا سا سیمینار جامعہ سلفیہ میں منعقد کیا جائے، ایسے ہی ایک خواہش یہ تھی کہ ایک بار البانی صاحب کو ہندوستان لایا جائے اور ان کے لیے جامعہ سلفیہ میں پروگرام رکھے جائیں، لیکن یہ دونوں خواہشیں پوری نہ ہو پائیں، اور امام بخاری سے متعلق ایک دو بار تجویز آئی لیکن بعد کے ملکی اور غیر ملکی ناموافق اور ناسازگار ماحول میں کسی بڑی کانفرنس کا انعقاد ایک مشکل مسئلہ تھا۔

ازہری صاحب کا دار الدعوۃ سے ربط وتعلق:

دار الدعوۃ (لال گوپال گنج الہ آباد) کا قیام (۱۹۷۵ء) میں عمل میں آیا تا کہ الہ آباد وپرتاب گڑھ اور ان دونوں ضلعوں کے قرب وجوار میں دعوت وتعلیم کے کام کو منظم کیا جائے، (۱۹۸۲ء) میں لال گوپال گنج میں ایک پرائمری مدرسہ "دعوۃ الاسلام" کے نام سے کھولا گیا اور دھیرے دھیرے دعوت وتبلیغ اور تعلیم کے میدان میں کام ہوتا رہا، بارہ سال پہلے عربی اور اسلامی تعلیم اور حفظ قرآن کریم کا نظم قائم ہوا، اور دہلی میں بھی "دار الدعوۃ" کے نام سے صحیح اسلام کے تعارف کے عنوان سے کتب حدیث وتفسیر اور اسلامی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا کام شروع کیا گیا، اور شروع ہی سے علماء اور فضلاء کا بھرپور تعاون حاصل رہا، مولانا عبدالوحید صاحب ناظم جامعہ سلفیہ کو بھی اس علاقہ میں دعوتی اور تعلیمی کام کو منظم کرنے کی فکر تھی، اور

وہ میری اس سلسلے میں ہمت افزائی بھی کرتے تھے، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے ایک بار مجھ سے عرض کیا کہ پریوا مشہور اہل حدیث بستی ہے، اور ان دونوں ضلعوں میں کئی گاؤں اہل حدیثوں کے ہیں اور جگہ جگہ مسلک سے جڑے لوگ موجود ہیں، لیکن دعوت وتعلیم کے میدان میں کوئی پیش رفت تعجب ہے کہ قدیم زمانے سے نہیں ہو پائی ، میں نے عرض کیا کہ علاقہ میں دعوتی کام کرنے والوں کی کمی اور علماء کی قلت اور اہل حدیث آبادی کی بھی قلت اس کے اسباب ہیں، اور اس علاقہ سے جن لوگوں نے بھی علم دین حاصل کیا، انہیں ملازمت کے لیے باہر ہی رہنا پڑا، چنانچہ قدیم زمانہ سے مولانا احمد اللہ پرتاب گڑھی اور ان کے بھانجے مولانا محمد یونس دہلی کے ہو رہے، بعد میں مولانا محمد یونس کراچی چلے گئے، دو تین آدمی کے علاوہ اس علاقہ میں کوئی عالم دین ہے ہی نہیں کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی پیش رفت کر سکے، اسی لیے جب لال گوپال گنج میں ایک قطعہ زمین مسجد اور مدرسہ کے لیے حاصل ہوگئی تو شیخ الحدیث، ناظم عبدالوحید صاحب، حافظ محمد عباس صاحب ، حاجی محمد الیاس صاحب، اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور ازہری صاحب سبھوں نے اپنی دلچسپی دکھائی کہ یہاں جلد از جلد مسجد کی تعمیر ہونی چاہئے، چنانچہ مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ سے کہہ کر ان بزرگوں نے اس اہم کام کو کرایا، اور اس کے بعد الحمد للہ کام آگے بڑھتا رہا، دارالدعوۃ لال گوپال گنج کی مجلس کے آپ ممبر بھی تھے، دار الدعوۃ نے تبلیغی دورے اور دعوتی کانفرنسوں اور حفظ قرآن کے انعامی مقابلوں کا اہتمام کیا، کئی سیمینار منعقد کئے، ازہری صاحب کی ان سارے پروگراموں میں شرکت گویا کہ واجبی چیز تھی بلکہ آپ کے مشورے اور ہدایات کے مطابق کارکنان کام کرتے رہے، آپ کی ان پروگراموں میں شرکت ان کی کامیابی کے ساتھ ساتھ شریک علماء وفضلاء جن کی اکثریت آپ کے شاگردوں اور متوسلین کی تھی ان سب کے لیے بھی آپ کے ساتھ بیٹھ کر دعوت وتعلیم کے مسائل پر غور وخوض اور مشورے کا ایک موقع ہاتھ آجاتا تھا، ازہری صاحب کی طبیعت ہمیشہ دینی اور تعلیمی کاموں میں تعاون کی رہی، اور دارالدعوۃ کے ساتھ کچھ زیادہ ہی یہ تعاون دیکھنے میں آیا، ایک بار ایسا ہوا کہ دوران تقریر دارالدعوۃ ہی کے ایک پروگرام میں آپ نے یہ بات کہی کہ شروع میں دارالدعوۃ کے قیام سے متعلق میرے دل میں انشراح نہیں تھا، لیکن من باب تعاون علی الخیر میں اس کے پروگراموں سے جڑا رہا، لیکن آج میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ سوچ صحیح نہیں تھی اور اس ادارے کا یہاں پر قیام بہت صحیح اور مناسب قدم تھا اور اس کے فوائد اب سب کے سامنے ہے، اس علی الاعلان اعتراف پر مجھے جہاں ایک طرف تعجب ہوا کہ اتنی قربت کے باوجود آپ نے کبھی نہ مجھ سے اور نہ ادارہ کے اور دوسرے افراد سے اس طرح کی کبھی کوئی بات کہی اور نہ کبھی اس عدم انشراح کی طرف اشارہ ہی کیا، اور خوشی اس بات کی تھی کہ اس علاقہ میں اس ادارہ کی افادیت نے آپ کو اس اعتراف پر مجبور کیا، فالحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔

ازہری صاحب رحمہ اللہ نے دار الدعوۃ الہ آباد،

اور اس کے تعلیمی ادارے ''جامعہ ابی ہریرہ الاسلامیہ'' اور ''دار الدعوۃ'' دہلی سے متعلق اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار اپنی مختلف تحریروں میں کیا ہے، جن میں سے سنن ابی داود، سنن ابن ماجہ پر آپ کے مقدمات اور شعبۂ تخصص سے متعلق کانفرنس کے موقع پر آپ کا صدارتی خطبہ ہے جو کہ مطبوع ہے، محترم ابوالقاسم شاد عباسی بنارسی بن حافظ محمد عباس نے ''دار الدعوۃ'' سے متعلق ایک نظم لکھی، بچپن میں وہ پڑھوا تے تھے، ان کی نظم بڑی معنی خیز اور کامیاب مقاصد کی عکاس ہے، ازہری صاحب ''دار الدعوۃ'' پروگراموں میں ایک سے زائد بار اس کو پڑھواتے، اپنے خطبہ صدارت میں بھی اس کے کئی اشعار نقل کئے ہیں۔

دار الدعوۃ الحمد للہ اپنے مقاصد میں کامیابی کی راہ پر رواں دواں ہے، اور اب یہ حقیقت ہے کہ جامعہ ابی ہریرہ الاسلامیہ کی موجودگی ایک زندہ حقیقت ہے، اگر اس کا کریڈٹ کسی کو جاتا ہے تو ان میں سرفہرست اساتذہ کرام بالخصوص ازہری صاحب اور ان کے تلامذہ ہیں، ایک بات کا تذکرہ یہاں پر مناسب ہے کہ ہم نے جتنے بھی دعوتی، تعلیمی یا تصنیفی منصوبے بنائے، ازہری صاحب نے سب پر موافقت فرمائی، اور اپنا تعاون دیا، ہندوستان میں بڑے دینی مدارس جن میں ایک جامعہ سلفیہ بھی ہے میں تخصص کے شعبے قائم ہیں، بعض عرب دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ جب اب تعلیم عام ہوگئی ہے اور کئی ملکوں کے پرائیوٹ تعلیمی ادارے تخصص کے شعبے قائم کئے ہوئے ہیں، اور وہ طلبہ کو فیس ادا کرنے کے بعد ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دیتے ہیں تو برصغیر کے دینی اور تعلیمی ادارے جو بھرپور طور پر درس نظامی کی تعلیم دیتے ہیں اور ان ہی اداروں کے علماء وفضلاء کی علمی کتابوں اور ان کی شخصیات پر اسلامی عربی یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں تو اب ہمارے دینی بھائیوں کو بھی یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ وہ اپنے یہاں تخصص کے شعبے کھولیں اور اس کا پہلا مقصد یہ ہو کہ اساتذہ کرام کو ان شعبوں سے ڈگریاں دی جائیں تاکہ تعلیمی اور تصنیفی تجربہ بڑھے، اور پرائیوٹ طور پر جدید اصطلاح کی ڈگریاں دینا کوئی معیوب اور قابل اعتراض بات نہیں ہے، ہمارے سامنے یمن، بیروت، اور سوڈان وغیرہ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے پرائیوٹ تعلیمی اداروں کی اس باب میں کارکردگی موجود ہے اگر برصغیر کے مدارس ایسا کریں تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، اس فکر کو آگے بڑھانے کے لیے ہمارے بعض دوستوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا، اور میں نے دو تین سال پہلے اس سلسلے میں ایک کانفرنس بھی کی، اور عملی طور پر انتساب کے ذریعے بعض طلبہ کا داخلہ بھی لیا اور ان کے امتحانات بھی ہوئے، اور چونکہ عرب دنیا میں اس کا رواج ہے اس لیے وہاں کے لیے یہ عام سی بات ہے لیکن برصغیر میں ابھی لوگ اس کے عادی نہیں ہیں اس لیے ابھی کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو پائی، ایک مقالہ امام شوکانی کے مسائل حج سے متعلق فقہی آراء پر تھا، اس کے لیے مقالہ کے سپروائزر، مقالہ نگار سعودی عرب سے آئے، اور میں نے اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے جامعہ میں اس مقالے کا مناقشہ کیا، اور سامعین اس سے محظوظ ہوئے، عرب دوستوں نے اعتراف کیا کہ ڈاکٹر ازہری بڑے فاضل استاذ ہیں اور اس باب میں بھی آپ کی ہنرمندی اور

صلاحیت واضح ہے۔

شروع میں ازہری صاحب نے کہا کہ فقہ میرا تخصص نہیں ہے، تو مجھ سے اس مقالہ کے مناقشہ سے طالب علم کو کیا فائدہ ہوگا، میں نے عرض کیا کہ مدینہ یونیورسٹی میں مولانا محمد گوندلوی اور مولانا عبدالغفار حسن رحمانی دینی مدارس کے فضلاء اور مدرسین ہی تھے جنہوں نے وہاں نسلوں کی تربیت کی آپ تو شروع سے آج تک دینی علوم وفنون کی تدریس کے ساتھ ساتھ اس سے متعلق تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا کام بھی کررہے ہیں، اور عملاً جدید تعلیم کے تجربے سے خود پورے پور پر گزر چکے ہیں، اور ازہر سے لے کر علی گڑھ کا تجربہ آپ کے پاس ہے، اسی طرح سے میں نے ازہری صاحب سے ''اقتضاء الصراط المستقیم'' کی تلخیص کے ترجمہ کے لیے کہا تو فوراً اس کا ترجمہ کردیا، نواب صدیق حسن کی فارسی کتاب الاکسیر فی اصول التفسیر کو عربی میں میرے کہنے ہی پر منتقل کیا۔

میں نے علماء اور مشائخ اور کارکنانِ دعوت و خدام مسلک کے کارناموں کے اعتراف کے لیے والد صاحب کے نام پر فریوائی اکیڈمی سے عبدالجبار فریوائی ایوارڈ کا گیارہ سال پہلے جب منصوبہ بنایا تو ازہری صاحب کے سامنے رکھا تو اس سے نہ صرف یہ کہ خوش ہوئے بلکہ ہمت افزائی کی اور تاحیات جن شخصیات کو یہ ایوارڈ دیئے گئے اس کے مشورہ میں بھی شریک تھے۔

دار الدعوۃ کی کتابوں کی اشاعت کی تاخیر کے بارے میں آپ کو تشویش رہتی تھی جب اس راہ کی مادی اور معنوی مشکلات کی تفصیل میں نے آپ کے سامنے رکھ دی تو اس پر اطمینان کا اظہار کیا، فی الجملہ علماء وفضلاء بالخصوص شاگردوں کے ساتھ لطف کا معاملہ فرماتے اور بہت سارے لوگ عربی اور اردو میں آپ ہی کی ہمت افزائی سے لکھنے اور چھپنے لگے جو معروف ومشہور بات ہے، فضیلت سال اول میں میں نے اردو میں ایک انعامی مقابلے میں ایک مضمون تیار کیا جس کا عنوان تھا برصغیر میں اہل حدیث کی تفسیری خدمات جو مجلہ صوت الجامعہ میں شائع ہوا، اور بعد میں نے اس کی تعریب کی، اور بی اے کے سالوں میں مدینہ میں ہندوستان میں خدمت حدیث کے نام سے معلومات عربی میں مرتب کی، اور اسی کو کلیۃ الشریعہ کے آخری سال میں مقالہ کی شکل میں پیش کیا، جس کے مشرف مولانا عبدالغفار حسن رحمانی رحمہ اللہ تھے، ازہری صاحب سے برابر خط و کتابت اور مجلّہ کے لیے علماء کے مضامین کے بھیجنے سے متعلق کاموں کی وجہ سے ادارۃ البحوث میں جو کچھ ہوتا تھا اس کے بارے میں پوری معلومات رہتی تھی، پہلے خدمات حدیث سے متعلق قسط وار پوری کتاب صوت الامہ میں شائع ہوئی، اور (۱۴۰۰ھ) کی جامعہ سلفیہ کی کانفرنس میں جب میں پہنچا تو پتہ چلا کہ میں دو کتابوں کا مولف بن گیا:

۱-جهود مخلصة فی خدمة السنة المطهرة۔

۲-جهود أهل الحديث فی خدمة التفسير۔

اسی طرح سے جامعہ اسلامیہ میں شعبۂ حدیث سے ایم اے کی ڈگری کے لیے جب میں نے کتاب الاباطیل والمناکیر والصحاح والمشاهیر للجورقانی کی تحقیق شروع کی تو کچھ دن کے بعد موضوع بدل کر مجھے کتاب الزهد للامام وکیع بن الجراح کی

تحقیق کا کام ملا، لیکن میں نے پہلی کتاب کی تحقیق وتخریج مکمل کرلی، تو اسے ازہری صاحب نے جامعہ سلفیہ سے دوجلدوں میں شائع کیا، بعد میں دوسری کتابیں اور رسائل سب بلا کسی تعویق کے جامعہ سے چھپتی رہیں، اور اکثر کتابیں ایک سے زائد مرتبہ چھپیں، سب پر آپ نے مقدمہ بھی تحریر فرمایا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے کے حوالے سے آپ کا معاملہ، بشہ ہمت افزائی کا تھا۔

دینی اور تعلیمی اداروں اور شخصیات سے تعلق اور تعامل

علمائے اہل حدیث کی سیرت میں یہ بات ملے گی کہ انہوں نے دین، علم، معاشرہ اور سیاست کے میدانوں میں ہمیشہ اجتماعیت کا مظاہرہ کیا، ملک کی آزادی میں سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہو یا ندوۃ تحریک اور جمعیت علماء ہند کے اسٹیج سے ملی جدو جہد میں شرکت یا آزادی کے بعد مسلم پرسنل لا وغیرہ اداروں کے ساتھ تعاون ہر جگہ آپ کو واضح تعاون کی مثالیں مل جائیں گی، جامعہ سلفیہ، جماعت اہل حدیث کا نمائندہ ادارہ تھا، اس کے اسٹیج سے اسلامی اور عربی تعلیم اور اسلامی صحافت کا کام ہوا، اور جامعہ کی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں دوسری جماعتوں کی برابر واضح نمائندگی رہی، یہ سب کام ازہری صاحب کی قیادت میں ہوا، اور اس کے اچھے نتائج بھی برآمد ہوئے، ابھی میں مدینہ منورہ میں تعلیم کے آخری مراحل میں تھا کہ محترم ڈاکٹر منظور عالم جو مجمع ملک فہد میں کام کرتے تھے اور ہندوستان میں ان کے پاس کام کرنے کا منصوبہ تھا، ازہری صاحب سے موصوف نے مدینہ منورہ میں ملاقات کی، اور جب انہوں نے دہلی میں مسلم او بجکٹب انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ڈالی تو ازہری صاحب نے بھی اس کی ممبری قبول کی، مجھے بھی اس کا ممبر بنایا گیا، اور ہم لوگوں نے ایک سے زائد بار اس کے اور اس کے ذیلی ادارہ اسلامی فقہی اکیڈمی کے پروگراموں میں شرکت کی، اور ازہری صاحب، مولانا شمس پیرزادہ، اور ناچیز کی رائے یہ تھی کہ عملاً اس سلطانی جمہور کے زمانے میں ان دونوں اداروں سے کسی دیرپا مفید پروگرام یا خدمت کی توقع بظاہر نظر نہیں آتی، لیکن اس ملی فورم کے ساتھ تعاون سے اس بات کی توقع ہے کہ شاید یہ ادارے ملک کے لیے مفید ثابت ہوں۔

سورج کنڈ میں منعقد ہونے والے ایک بڑے پروگرام میں ازہری صاحب نے مجھے اور مولانا عبدالوہاب حجازی کو بھیجا میں نے ازہری صاحب سے عرض کیا کہ لگتا ہے کہ یہ ادارہ آل انڈیا پیمانے کی کوئی سیاسی تنظیم بنانے کی سوچ رہا ہے، تو آپ نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ یہ قیاس آرائی قبل از وقت ہے، جب ہم دونوں اور مہمانوں کے ساتھ نظام الدین دہلی سے سورج کنڈ کے اجتماع گاہ میں پہنچے تو پتہ چلا کہ سارا اجتماع آل انڈیا ملی کونسل کی داغ بیل پر ہے، میں نے اس نئی سیاسی جماعت کے بنانے کی تاریخ ہند کی روشنی میں مخالفت کی، لیکن ملی کونسل کا اعلان ہوگیا اور اس سے ملت کی خیر خواہی کی آرزوئیں اور تمنائیں جڑ گئیں، اتنے سال کے بعد اس جماعت نے قوم اور ملک کو کیا فائدہ پہنچایا، یہ قارئین خود معلومات حاصل کر کے فیصلہ کرلیں۔

محترم ڈاکٹر محمد یونس نگرامی ندوی رحمہ اللہ نے لکھنؤ میں ایک ادارہ جمعیت المثقفین کے نام سے بنایا تھا، ازہری صاحب بھی اس کے ممبر تھے، کویت پر صدامی

حملے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے خلیجی بحران کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ایک پروگرام حرمت حرمین کے عنوان سے رکھا جس کے کنوینر مولانا عبدالنور عبدالعظیم ندوی تھے ازہری صاحب نے مجھے اور مولانا عبدالوہاب حجازی کو اس میں بھی بھیجا، اسی طرح سے سید حامد علی کی اصلاحی تحریک کے ایک اجتماع میں جو الفرقان کے دفتر لکھنؤ میں منعقد ہوا مجھے بھیجا، اور اسی طرح سے مختلف اجتماعات اور کانفرنسوں میں اگر خود شریک نہ ہو پاتے تو کسی نہ کسی مدرس کو نمائندگی کے لیے بھیجتے ، اس لیے کہ اس طرح کی مشارکت ملی تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے۔

خمینی شیعی انقلاب اور خلیجی بحران:

(۱۴۰۷ھ) کے ماہ ذی القعدہ میں میں تعلیم سے فراغت کے بعد ہندوستان واپس گیا تو جس دن میں اپنے گاؤں پہنچا پہلی خبر یہ ملی کہ ایرانیوں نے حرم مکی میں کچھ گڑبڑ مچائی ہے، جب میں بنارس گیا تو اس کی پوری تفصیل معلوم ہوئی، میں نے جامعہ سلفیہ کی لائبریری سے مولانا عبدالمجید الحریری کے ذاتی مکتبہ سے دو کتابیں نکالیں، اور ازہری صاحب کی خدمت میں پیش کیں کہ میں ان کی تحقیق کردیتا ہوں اور اس وقت ان دونوں کتابوں کا چھپنا صحیح صورت حال کی عکاسی کے لیے معاون ثابت ہوگا، ایک کتاب کا نام تھا، الوهابيون والحجاز اور دوسری کا نام السنة والشيعة أو الوهابيه والرافضة ، یہ دونوں کتابیں (۱۹۲۴ء = ۱۳۴۴ھ) کے بعد شائع ہوئیں ، دراصل یہ دونوں کتابیں علامہ رشید رضا کے بیسیوں مقالات کا مجموعہ تھیں، اور سعودی عرب سے شیعوں اور اہل بدعت کی دشمنی اور شریف مکہ اور اُن کے اعوان کی سعودی عرب کے خلاف پروپیگنڈہ مہم کا بروقت بڑا علمی محاسبہ تھا، ازہری صاحب نہ صرف خوش ہوئے بلکہ ہمت افزائی کی اور دونوں کتابیں میری تحقیق سے بنارس میں شائع ہوئیں، یہ اس کے علاوہ ہے جو آپ نے مقالات کی شکل میں ان موضوعات پر اردو اور عربی میں تحریر فرمایا، اسی طرح سے خلیجی بحران کے عنوان پر میں نے ازہری کے پاس کویت پر حملہ کے دن ڈاکٹر خورشید احمد (لاہور) کی ادارت میں نکلنے والے اردو میگزین میں شائع شدہ ایک مفصل مقالے کو پیش کیا، جس میں البعث پارٹی اور اس کے لیڈروں کے کفریہ افکار ونظریات کو مفصل طور پر بیان کیا گیا تھا، اور میں نے یہ تجویز رکھی کہ اس موقع پر جماعت اہل حدیث اور اس کے اداروں کو ایک آگہی مہم چلانی چاہئے جس میں تحریر وتقریر اور جلسوں کے ذریعہ لوگوں کو بتایا جائے کہ اس طرح کی شورش اور کارروائیوں سے عالم اسلام اور مسلمانوں کو کیا نقصانات پہنچیں گے اور یہ کہ اس طرح کے فتنوں میں ایک مسلمان کا کیا موقف ہونا چاہئے ،اور سعودی عرب اور خلیجی ممالک سے مسلم جماعتوں کے راوبط کی وجہ سے تائید اور مخالفت کے مواقف میں ہم اہل حدیثوں کا موقف یہ ہونا چاہئے کہ دراصل اس فتنہ میں سعودی عرب کے خلاف اٹھائے گئے وہابیت کا الزام ہی تائید اور دشمنی کا معیار ہے، ماضی میں جماعت اہل حدیث کے علماء اور عوام نے عقیدے کی بنیاد پر سعودی عرب کی بھرپور تائید کی تھی، اور اگر اس وقت یہ موقف اختیار کیا جائے تو یہ اسی ماضی کے موقف کا ایک تسلسل ہوگا، بالخصوص اس ماحول میں کہ مجاہدین اقلام بھاری بھرکم رپورٹوں کے ذریعے سے عربوں میں اپنے کو ہمدرد ثابت کریں گے، اور موقع پانے پر اہل حدیثوں کے خلاف پروپیگنڈہ سے بھی باز

نہ آئیں گے، چنانچہ ازہری صاحب کی قیادت میں ہم لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور آپ نے تقریر اور تحریر کے ذریعہ اس مسئلہ کی صحیح عکاسی کی اور میں نے سعودی عرب کے موقف کو صحیح طور پر چلنے کے لیے وہاں کے سربرآوردہ علماء و مشائخ کے ملنے والے مقالات کا اردو ترجمہ کرکے اسے مجلات میں چھپوایا، بعد میں ازہری صاحب نے ایک رسالہ (۱۴۱۱ھ) میں عربی مقالات پر جامعہ سے شائع کیا، اس کا نام تھا نظرة الى مواقف المسلمين من احداث الخليج، اس رسالہ میں آپ کے مقدمہ کے بعد چار مقالات ہیں، اور اس وقت کی منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور پروگراموں کی رپورٹ مجلات میں شائع کی، بعد میں ادارۃ البحوث کی طرف سے ایک دستاویزی کتاب ماہ صفر (۱۴۱۲ھ = ۱۹۹۱ء) بڑے سائز کے (۲۳۶) صفحات پر شائع کی، جس میں (۴۳) چھوٹے بڑے مضامین اور مقالات ہیں، اور تقدیم کتاب کے بعد (۴) مقالات آپ کے قلم سے ہیں، اور (۱۳) چھوٹے بڑے مضامین میرے ہیں، جن کی اکثریت سعودی عرب کے علماء کے مقالات کے ترجمے ہیں۔

حرف آخر:

ازہری صاحب کے سانحہ ارتحال کے بعد بعض لوگوں نے مضامین لکھے اور وہ شائع بھی ہوئے، لیکن میرے پاس اتفاق سے اس کی صرف خبر ہے، جامعہ سلفیہ اور جامعہ عالیہ عربیہ نے آپ کی خدمات سے متعلق خصوصی نمبرات کی اشاعت کا اعلان کیا، ابھی یہ نمبرات منظر عام پر نہ آسکے، لیکن ازہری صاحب کی خدمات سے متعلق اندر اور باہر کے تعلیمی اداروں میں کام کی شروعات ہوگئی ہے، جس میں سے جامعہ سلفیہ کے ایک فارغ التحصیل نوجوان عبدالسلام سلفی ہیں، جنہوں نے جامعة المدينة العالمية ملیشیا میں ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے لیے ازہری صاحب کی عربی زبان وادب سے متعلق خدمات کے عنوان کو پیش کیا ہے، جس کے سپروائزر ایک مصری استاذ ہیں، اس سلسلے میں موصوف نے میرے پاس آنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن ابھی تک وہ نہ آسکے کہ اس سلسلے کی مزید تفصیلات معلوم ہوتیں، ازہری صاحب کے بھانجے ڈاکٹر اطہر بھی ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں میرے پاس ان کی طرف سے ایک سوالنامہ بھی اس سلسلے میں آیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان کے سلفی مدارس میں شخصیات سے متعلق موضوعات پر طلبہ سے بحثیں تیار کرائی جائیں اور ازہری صاحب اور دوسرے علماء وفضلاء کی زندگی کے مختلف گوشوں کو موضوع بحث بنایا جائے، اس سے مختلف انداز کے فوائد حاصل ہوں گے ان شاء اللہ۔

اس موضوع پر لکھنے کی کافی گنجائش ہے، اگر اللہ نے توفیق دی تو آگے بھی ازہری صاحب اور دوسرے اساتذۂ کرام پر کچھ نہ کچھ لکھنے کا عزم ہے، اللہ رب العزت آپ کو اور ہمارے دوسرے سارے اساتذۂ کرام کو اپنے یہاں اچھا بدلہ دے، اور آخرت میں ان کے مراتب بلند فرمائے، آمین ثم آمین، وصلى الله على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين۔

☆☆☆

مولانا حافظ حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری
استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد

ڈاکٹر ازہریؒ کا خاندانی پس منظر

اور تعلیم و تعلم کی راہ میں ان کا سفر

علاج معالجہ کے ڈاکٹروں نے علم وتحقیق کے ڈاکٹر مولانا حافظ مقتدی حسن اعظمی ازہری کے مرض کے آگے اپنی بے بسی اور عجز کا اعتراف کرلیا۔ چارہ گروں کی لاچاری دیکھ کر اہلِ خانہ نے فیصلہ کرلیا کہ واپس گھر لے جانے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔ جمعرات ۲۹/اکتوبر کی ایک اداس شام تھی، دہلی سے ایمبولنس کے ذریعہ عازمِ مئو ہوئے کہ جہاں زندگی کا پہلا سانس لیا تھا وہیں سکھ آئے گا، یا آخری سانس کے لئے شاید اسی مقام کا انتظار ہوگا۔ انسان کی سوچ اور تقدیر کے فیصلے میں ہمیشہ مطابقت نہیں ہوا کرتی، قانونِ قدرت "وما تدری نفس بای ارض تموت" غالب آیا۔ چلتے چلتے کانپور کے قریب صبح کے سہانے وقت میں پانچ بجے کے لگ بھگ راضی برضائے الٰہی جان حزیں جان آفریں کے حوالے کردی۔ إنا لله و إنا إليه راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کے علمی مقام، عملی کام، درس وتدریس کے فرائض، دعوت وتبلیغ کے میدان، تالیف وتراجم کی فہرست، نظم ونسق، انتظامی صلاحیت، رفاہی خدمات، راہِ عمل میں ان کی بے مثال قربانیاں اور ایک نوخیز پودے کو تناور درخت بنا کر اس کی شاخوں کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچانے اور اس کے برگ وبار سے خاص وعام کو مستفید کرنے تک کے طویل سفر کی روداد آپ کے شرکائے کار اور تلامذہ قلم بند کرتے رہیں گے۔ میں تو ڈاکٹر صاحب کے خاندانی پس منظر اور اہل وعیال کی تعلیم وتربیت پر ان کی نظر کے عنوان سے بہت مختصر طور پر ''شاہد عدل'' بن کر عرض کرنا چاہوں گا۔ کوشش ہوگی کہ میری تحریر ہر قسم کے مبالغے اور بے جا تعریف وتوصیف سے محفوظ رہے، ورنہ ہر طرف سے انگلیاں اٹھیں گی اور میرے سر اقرباء نوازی کا الزام تھوپ دیا جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب میرے بھانجے ہیں اور ان کی اہلیہ عزیزہ نورالنساء میری بھتیجی ہیں۔ ہمارے والد نعمان اعظمی رحمہ اللہ، شیخ الکل میاں صاحب دہلوی رحمہ اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کے تلامذہ میں سے تھے، اپنی لڑکی بلقیس کے نکاح کے لئے محمد سعید صاحب کے فرزند محمد یاسین کا انتخاب کیا۔ یہ خاندان تعلیم وتعلم کے میدان میں کچھ نمایاں نہیں تھا مگر دیانت وامانت اور شجاعت وبسالت میں اس کی ایک حیثیت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا اپنے گیارہ بھائی بہنوں میں دوسرا نمبر ہے۔ پہلا نمبر بہن رشیدہ خاتون کا ہے جو مولانا محمد اعظمی حفظہ اللہ کی اہلیہ ہیں۔ ۴۹/۱۹۴۸ء میں ان کی شادی خانہ آبادی کی

تقریب میں ہم سب لوگ والد صاحب کی قیادت میں شریک ہوئے تھے۔ چار بھائیوں میں آپ سب سے بڑے ہیں۔ تاریخ ولادت ۸/ اگست ۱۹۳۹ء ہے۔

ماں بڑے عالم دین کی بیٹی تھیں۔ خاندان کے اکثر بچے حفظ قرآن سے اپنی تعلیم شروع کرتے تھے۔ مقتدیٰ حسن کو بھی اس راہ پر لگا دیا گیا۔ تکمیل حفظ کے بعد مئو کے تین بڑے مدارس جامعہ عالیہ عربیہ، جامعہ فیض عام اور جامعہ دارالحدیث اثریہ سے کسب فیض کیا۔ ۱۹۶۱ء میں آپ نے سند فضیلت حاصل کی۔ دوران درس ممتاز طالب علم تھے۔ جوں ہی فراغت حاصل کی جامعہ فیض عام نے تدریسی خدمات کے لئے آپ کا انتخاب کیا۔ مدھوبنی، بہار میں کچھ دن اور جامعہ فیض عام میں دو ایک سال مدرس رہے۔ چوں کہ آپ کے عزائم بلند تھے، پرواز اونچی تھی، علم کی پیاس دو چار گھونٹ سے بجھنے والی نہیں تھی، بلاد عربیہ کی جامعات کے چشمۂ صافی سے سیراب ہونے کی زبردست خواہش رکھتے تھے۔ جون ۱۹۶۱ء میں مئو گیا تھا، تو آپ کو اسی دھن میں مگن دیکھا۔ ان دنوں ایسی آرزوؤں کی تکمیل آج کی طرح آسان نہیں تھی مگر دل میں تڑپ ہو، طلب ہو، سچی تڑپ ہو، ارادے بلند ہوں تو راستوں کو ہموار ہونا ہی پڑتا ہے۔ ۱۹۶۲ء کے اواخر میں مصر کی قدیم ترین اور مشہور عالم ازہر یونیورسٹی میں آپ کا داخلہ منظور ہو گیا۔ جیسے ہی آپ کے قدم وہاں جمے، میرے نام مدینہ منورہ کے پتے پر پروفیسر عباس محمود العقاد کی شاہ کار کتاب ''یومیات'' بطور ہدیہ روانہ کی جو آج تک میرے پاس ایک امانت کی طرح محفوظ ہے۔ کتاب کے اندرونی صفحے میں عربی کی یہ عبارت تحریر ہے: هدية صغيرة الى الخال الكريم الحافظ حفيظ الرحمن الأعظمي العمري تقديرا لشعوره النبيل نحو العلوم والآداب وإجلالا لشخصيته المتطلعة إلى المعالي، لعلها تقع موقع قبولها الحسن وتبقى تذكار المودته الصافية ونحن المتشرفون.

م-ح-و-ع.ا

(''م، ح،'' تو مقتدیٰ حسن ہیں اور ''ع۔ا'' میرے دوسرے خواہر زادے ڈاکٹر عبدالعلی ازہری ہیں۔)

ہدیہ کی اس عبارت کو نقل کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو عربی سے ایک تعلق خاطر تھا، ورنہ ایک عجمی کو دوسرے عجمی کے نام عربی میں مخاطبت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ طالب علمی کے دور ہی سے طے کر لیا تھا کہ مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے اور عالم اسلام کے مسائل کے اظہار کے لئے عربی زبان ہی ذریعۂ افہام وتفہیم ہوگی۔ تجربے اور مشاہدے میں یہی بات آئی ہے کہ طالب علمی کی مدت میں جو اپنا میدان اور مقصدِ حیات متعین کر لیتے ہیں ان کو فراغت کے بعد بھٹکنا نہیں پڑتا۔ ان کا نصب العین ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا، کارزارِ حیات میں روز اول سے پورے انہماک واشتیاق کے ساتھ اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں اور ان کی نیت اور ہمت یہی ہوتی ہے کہ ڈیرے اب منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے۔

جامعہ ازہر میں طلب علم کے کے ساتھ علم وتحقیق ہی سے متعلق کچھ خارجی مصروفیات بھی آپ کے حصے میں آئیں، تصنیف وتالیف اور تراجم کا میدان ملا، قاہرہ ریڈیو کے اردو پروگرام سے بھی وابستگی ہوئی، ہر ایک کام میں اتنی

یافت بھی ہو جاتی تھی کہ یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ ایک لمبی مدت وہاں گزاری جاسکتی ہے، لیکن شروع سے آپ کا مزاج کچھ قلندرانہ اور کچھ زاہدانہ تھا۔ قاہرہ کی مغربی تہذیب، نسائیت کی ادافروشی اور مردوزن کے آزادانہ اختلاط سے آپ کو وحشت اور اختلاج ہونے لگا۔ جوں توں کر کے ایم۔ اے کیا اور ایک دن بھی ضائع کیے بغیر ۱۹۶۷ء میں وطن واپسی کی راہ اختیار کی۔ حالانکہ قاہرہ کا رنگین ماحول ہندوپاک کے خشک مدارس کے فارغین کے لئے تازہ ہواؤں سے مشام جان کو ایسا معطر و معنبر کرتا ہے کہ طلبہ مختلف بہانوں سے مدتِ تعلیم میں توسیع کرتے چلے جاتے ہیں۔

قاہرہ سے واپسی کے بعد بستر کھولا بھی نہیں تھا کہ جامعہ سلفیہ بنارس جو اس وقت مرکزی دارالعلوم کہلاتا تھا، اس کے افتتاح کو سال دو سال ہی مدت گزری تھی، اس کے لائق ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید عبدالحق سلفی کی جوہر شناس نگاہوں نے ازہری صاحب کو تاک کر گرفتار کرلیا۔ ۱۹۶۸ء میں جامعہ سلفیہ سے خلوص ووفا اور صدق وصفا کا جو عہد و پیمان استوار ہوا وہ ۲۰۰۹ء کے اواخر تک، یعنی آپ کے سفر آخرت پر جانے تک مکمل اکتالیس سال برقرار رہا۔ ع

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

جامعہ سلفیہ سے وابستہ ہوئے تو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ اپنے آپ کو اس میں ایسا داخل اور شامل کیا کہ اس کے خادم، ناظم، معلم، ترجمان، سفیر، وکیل...... غرض ہر ایک حیثیت سے اس کی ڈوب کر بھرپور خدمت انجام دی۔ سلفیہ کا ترجمان ''صوت الأمۃ'' آپ کے دم، قدم اور قلم سے جاری ہوا۔ اخیر دم تک اس کے روح رواں اور ترجمان رہے۔ زبان و بیان پر آپ کو دسترس تھی اور قلم پر ایسی گرفت کہ آپ کا اشہب قلم امت کے حساس مسئلے کو لے کر سرپٹ دوڑتا چلا جاتا۔ پوری امانت، باریک بینی اور تحقیق ودلائل کے ساتھ مسلمانوں سے متعلق مسائل و مشاکل، تذکرے اور تجزیے سے عرب دنیا کو روشناس کرایا۔ آپ کے مقالات، مولفات وتصنیفات اور تراجم کا تذکرہ میرا موضوع نہیں ہے۔ خاندانی پس منظر و تعلیم پر مجھے لکھنا ہے۔

خاندانی پس منظر کا مختصر تذکرہ ہو چکا ہے، آپ کے نانا مولانا محمد نعمان رحمہ اللہ سے آپ کو استفادے کا موقع میسر نہیں آیا، مگر چھوٹے نانا مولانا ابو القاسم قدسی (رحمہ اللہ) مئو ہی کے نہیں ملک کے مشاہیر اہل علم میں سے تھے، عربی نثر ہی نہیں نظم پر بھی آپ کو قدرت تھی۔ ۱۹۲۴ء میں آل سعود حجاز ونجد کے حکمراں بنے تو دنیا بھر سے مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا ہوا، حق وصداقت سے وابستہ جن افراد نے اس طوفان بلاخیزی کا زبان وقلم سے مقابلہ کیا ان میں ایک نام مولانا قدسی کا بھی تھا۔ عربی کا ایک مدلل علمی کتابچہ میری نظروں سے گزر چکا ہے، جس میں فصیح وبلیغ عربی شاعری کی زبان میں آپ کے کلام سے دو تین صفحات مزین تھے، آپ ہی کے لائق فرزند مفتی عبدالعزیز عمری اور حقیقی ماموں مولانا فضل الرحمٰن عمری (رحمہما اللہ) ہیں دونوں شخصیتوں کا نام اگرچہ آپ کے اساتذہ کی فہرست میں نہیں آتا ہے مگر میرے علم میں ازہری صاحب دونوں سے متاثر نہیں مرعوب تھے اور خوب استفادہ بھی کیا تھا۔ بڑے احترام سے ان کا نام لیتے تھے، ان کے آگے ان کی اجازت کے بغیر لب کشائی کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ مجھ سے ایک مرتبہ کہا کہ ''نئی نسل ذرا کچھ پڑھ لکھ لیتی ہے تو

سمجھنے لگتی ہے کہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں ہے اور ہمارا یہ حال ہے کہ ملک کے بڑے بڑے علمی مراکز اور بیرون ملک سے بھی کچھ خوشہ چینی کرنے کے باوجود ان بزرگوں کے آگے اپنے کو طفل مکتب ہی جان کر ان کے علم وفضل کی ہر مقام پر گواہی دیتے ہیں اور ان کے کسی تسامح او رتغافل پر کبھی ہماری نگاہ نہیں اٹھی۔''

مئو کے جامعات سے فراغت، الٰہ آباد بورڈ سے مولوی، عالم، فاضل کے امتحانات میں امتیاز سے کامیابی حاصل کرنے کے بعد جامعہ ازہر سے ایم۔اے کیا، جامعہ سلفیہ بنارس کی ملازمت کے دوران ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۵ء کے درمیان علی گڈھ سے یم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی تکمیل کی۔پی۔ایچ۔ڈی کا موضوع "تخريج أحاديث بهجة المجالس لابن عبدالبر" تھا۔اندلس کے نامور امام ابوعمر یوسف ابن عبدالبرؒ کی کتاب "بهجة المجالس" اسلامی آداب زندگی پر محیط ایک مبسوط کتاب ہے، جس میں آیات واحادیث کی بڑی تعداد کے ساتھ اشعار واقوال کا بھی ایک بڑا انبار ہے۔ اس کتاب کی دوسری جلد کی احادیث کی تخریج پر سات سوصفحات کا مقالہ تیار کیا، اہل علم سے خراج تحسین اور داد تحقیق کے مستحق قرار پائے۔ علامہ ابن خلدون کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ موصوف ازہر میں طالب علم کی حیثیت سے داخل ہوئے مگر عشق اور مشک کی طرح آپ کا علم اہل نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکا اور آپ مالکی مذہب کے قاضی متعین کردیے گئے۔ اسی طرح اپنے مقالے کی تکمیل کے دوران علی گڈھ میں عربی ادب کے طلبہ کی تعلیم وتدریس کی ذمہ داری ازہری صاحب پر عائد کردی گئی۔

ددھیال میں چوں کہ قابل ذکر کوئی عالم نہیں تھے، اس لئے آپ نے طے کرلیا کہ اپنے بھائی بند اور آل اولاد کو اس راہ پر لگا کر ایک نئی تاریخ کی شروعات اور علاحدہ روایت کی طرح ڈالیں گے۔ آپ کے چھوٹے تین بھائیوں میں دو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اہم مناصب پر فائز ہیں۔عبدالرحمٰن جو ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی کرکے جامعہ محمدیہ طبیہ کالج مالیگاؤں میں لائبریرین ہیں۔ دوسرے ڈاکٹر اظہر حسن ایم۔ڈی علیگ محمدیہ طبیہ کالج مالیگاؤں کے پرنسپل ہیں۔ باقی ایک بھائی شفیق الرحمٰن ہیں، جن کی کسی وجہ سے قابل ذکر تعلیم نہیں ہوسکی۔ ان کے بچوں نے ''پدر نتواند پسر تمام کند'' کے مصداق رہی سہی کسر پوری کردی۔ ثوبان پی۔ ایچ۔ ڈی کرچکے ہیں اور فیضان فارغ ہونے والے ہیں۔

بڑی بہن رشیدہ خاتون کے لڑکے شیخ اسعد اعظمی ابن مولانا محمد اعظمی سے علمی دنیا متعارف ہے۔ اب انہی کی ذات سے امیدیں وابستہ ہیں کہ ماموں کے خوابوں کی تعبیر اور ادھورے کاموں کی تکمیل کے لئے آگے بڑھ کر آئیں گے اور ان کے صحیح جانشین ہونے کا ثبوت فراہم کریں گے۔ دوسری ہمشیرہ ذکیہ خاتون کے لڑکے ڈاکٹر سراج انور علیگ جو خیر سے ازہری صاحب کے داماد بھی ہیں، اچھے طبیب کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ایک اور ہمشیرہ خالدہ خاتون کے لڑکے ڈاکٹر اطہر افضال پی۔ ایچ۔ ڈی وزیر اعظم ہند کی آفس میں فارن لنگویج کے شعبے میں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔

بہنوں میں امیہ خاتون پوسٹ گریجویٹ ہیں اور عرصے سے جامعہ فیض عام میں ایک کامیاب اور مثالی معلمہ کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ رہی اولاد کی بات تو اللہ تعالیٰ نے

آپ کو تین لڑکے اور تین لڑکیاں عطا کیں۔ایک لڑکا محمد اطہر صغرسنی میں انتقال کر گیا۔بڑی صاحب زادی بتول خاندان ہی میں بیاہی گئی تھیں۔ایک پیچیدہ مرض نے بہت پریشان کیا، بھری جوانی میں دنیا سے رخصت ہوئی اور عمر آباد کے قبرستان میں اپنے بزرگوں کے پہلو بہ پہلو مدفون ہے۔

اولاد کی تعلیم و تربیت کے تذکرے سے پہلے ایک حقیقت واضح کر دینا چاہوں گا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ملک وملت کے مشاغل میں مصروف لوگوں کو اپنے گھر کی خبر لینے کی فرصت کم ہی ملتی ہے۔عربی مثل ہے "بـــاب النـجـار مخلوع" (بڑھئی کے گھر کا دروازہ ٹوٹا ہی رہتا ہے) باہر کے کام سے آتا ہے تو تھکن سے چور رہتا ہے، اپنا کام کرے تو کب کرے اور کیسے کرے؟ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو دن رات اپنے آپ کو قومی، علمی اور اداری کاموں میں وقف کیے رہتے ہیں، لیکن یہاں بھی آپ کو ازہری صاحب کی اس خوبی کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ باہر کی شب وروز کی تھکا دینے والی مشغولیت کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں رہے۔آج تعلیم کو دوحصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک دینی کہلاتی ہے، دوسری دنیوی، نہیں تو عصری سمجھی جاتی ہے اور دونوں کے درمیان بعد المشرقین کا فاصلہ بتایا جاتا ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صحیح نہیں ہے۔ہر وہ علم جو انسان کو اللہ کی پہچان، مقصد حیات اور اخروی انجام سے باخبر رکھتا ہے وہ دین ہی کا علم ہے۔ازہری صاحب کی شاید سوچ بھی یہی تھی، علوم وفنون میں اتنی آفاقی وسعتیں آچکی ہیں کہ ایک طالب علم کو دونوں سے آگہی فراہم کرنا برداشت سے باہر بوجھ سمجھا جائے گا، اس لئے آپ نے بہت سوچ کر ایک لڑکے سلمان اختر کو حساب وکتاب اور معیشت واقتصاد کے میدان میں اونچی ڈگری C.A کی تعلیم دلائی۔اب وہ سعودیہ کے شہر الخبر میں صالح بن عبدالعزیز کی کمپنی میں باوقار عہدے پر فائز ہیں۔دوسرے فرزند ڈاکٹر فوازن احمد کو عربی علم وادب کی تعلیم سے آراستہ کر کے ان کے پی۔ایچ۔ڈی کے رسالے کے لئے ہندوستان کے جرجانی عبدالعزیز میمن کے علمی اور ادبی کارنامے کا موضوع انتخاب کیا۔نمایاں کامیابی کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبۂ عربی میں لکچرر متعین ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم سے بھی غافل نہیں رہے۔تینوں کو اسلامی آداب زندگی کے طور طریقے سکھائے، مفید تعلیم و تربیت کے زیوروں سے آراستہ کیا، منجھلی لڑکی نکہت مدرسہ عالیہ نسواں میں طالبات کی معلمہ ہیں۔

میں بہت دور سے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔اور بھی خاندان میں کئی ایک روشن چراغ ضرور ہوں گے، فاصلے کی وجہ سے میری معلومات ناقص ہیں، جن کا نام اور کام چھوٹ گیا، میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

ہم اسے ازہری صاحب کا کمال ہی کہیں گے کہ ان کے ددھیال میں اوپر ایک بھی قابل ذکر عالم نہیں مگر ان کے نیچے اور پیچھے علم وفضل سے آراستہ ملک وملت کی خدمت سے وابستہ نوجوانوں کی اتنی بڑی تعداد ہے، اللہ ان سب کو نظر بد سے محفوظ رکھے، ہم ان پر زمانے کی نظر دیکھ رہے ہیں۔اس پوری نسل کی تیاری میں آپ کی اہلیہ کا بھی پورا عمل دخل، ایثار، تعاون، قربانی اور جد جہد ضرور شامل ہے۔آپ کی اہلیہ آپ کے بڑے ماموں مولوی عبدالمنان (مرحوم) کی صاحب زادی ہیں، یعنی مولانا محمد نعمان (مرحوم) کی

پوتی، خاندانی روایات اور شرافت کا سلسلہ نسل درنسل اثر انداز تو رہے گا ہی۔عربی مثل ہے۔ن "هذه شنشنة أعرفها من اخرم.

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت بڑی کروفر، رعب داب اور گھن گرج کی تھی، آپ کی صلاحیتوں کے اہل علم معترف تھے، ساتھی اور طلبہ متاثر اور مرعوب تھے، آپ کے آگے لب کشائی کی ہمت کم ہوتی تھی۔ مدرسہ اور دارالاقامہ میں آپ کی آمد سے پہلے پہلے سکون، سکوت اور وقار کی پہنچ ہو جاتی تھی، مگر یہی شخصیت گھر پر ہوتی تو خیر کم خیر لاهله کا عملی نمونہ بن جاتی۔ لڑکے، لڑکیاں بے تکلف ہر موضوع پر بحث و مباحثہ کرتے، پوتے نواسے آپ کے بازوؤں میں جھولے جھولتے، کہانیوں کی فرمائش کرتے اور ماں اس بڑے القاب اور ادب واحترام والی ذات کو صرف ''بابو'' کہہ کر مخاطب کرتی تھیں اور میں سمجھتا ہوں کہ انھیں اس سے جو مسرت ہوتی ہوگی بڑے سے بڑا خطاب بھی اس کے آگے حقیر لگتا ہوگا۔

ہمارے درمیان شمال وجنوب کے طویل فاصلے کے باوجود کئی مناسبتوں اور تقریبوں میں ملاقات کے مواقع فراہم ہوتے رہے۔ ہماری آخری ملاقات فروری ۲۰۰۹ میں مدینۃ العلوم چمپارن بہار میں ہوئی، جامعہ امام ابن تیمیہ کے بانی ڈاکٹر محمد لقمان سلفی حفظہ اللہ نے ہم دونوں کو تین دنوں تک ساتھ رہنے کا غیر مترقبہ موقع فراہم کر دیا۔ معہد عالی کے تخصص کا افتتاح تھا، کئی اجلاس ہوئے، ہم ساتھ ساتھ بیٹھے اجلاس کی کاروائی کے ساتھ اپنی اپنی بھی کہہ سن لیتے تھے۔ مدارس کے نصاب تعلیم کے سلسلے میں حیدرآباد کی غیر ملکی زبانوں کے مرکز سیفل میں اور دہلی کی وزارت تعلیمات کے دفتر میں بھی ہم ساتھ رہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ نصاب میں سلفی مکتب فکر کی کتابوں کو شریک کرانے کے لئے بڑی مدلل اور مسکت باتوں سے تمام ارکان کو متاثر اور قائل کرانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ بے باک اور حق گو تو تھے ہی، مصلحت پرستی آپ کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی، ہاں میں ہاں ملانا آپ کو آتا بھی نہیں تھا، ہمیشہ غلط کو غلط کہا، مجمع چاہے جتنا بڑا ہو اور رکھنے والی شخصیت کتنی ہی قدآور کیوں نہ ہو آپ کے اعلان حق میں کوئی حکمت و مصلحت مانع نہیں رہی۔ دنیا کو بہت قریب سے دیکھا، مشاہیر کی صحبتیں اٹھائیں، سب کو پرکھا، آپ کے تبصرے حقائق پر مبنی ہوا کرتے تھے، تفصیل طویل ہے اور موضوع ذرا تلخ بھی ہے، آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے گی، اس لئے چپ رہنے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔

ایک اور خوبی جس سے میں بہت متاثر ہوا، آپ نے اپنے فرائض کو ہمیشہ ذاتی مسائل پر مقدم رکھا۔ دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کے مواقع نصیب ہوتے تو آگے بڑھ کر خندہ پیشانی سے انجام دیتے، خانگی امور کا دل پر کتنا ہی بھاری بوجھ ہو، وہ آپ کی عملی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکا۔ آپ کی بڑی صاحب زادی بتول جان لیوا مرض میں مبتلا تھی، مدراس، چنائی کے ہسپتال میں زیر علاج تھی، اس کی پریشانی اور بے چینی دیکھی نہیں جا سکتی ہے، ایسے موقع پر بھی مسجد مبارک میں خطبۂ جمعہ کی زحمت دی گئی تو کسی معذرت کے بغیر بخوشی آمادہ ہو گئے۔ دیگر مساجد و معاہد میں بھی جس کسی نے دعوتِ خطاب دی آپ نے اسے مایوس نہیں کیا۔ خود اپنی صحت کی فکر نہیں کی، جس مرض میں وفات پائی وہ ایک دو دن کا نہیں ہوتا، مہینوں سے رہا ہوگا مگر آپ کی

مصروفیات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ۲۱/ستمبر کو صحت اچھی نہیں رہی ہوگی مگر عید کا خطبہ جوش خطابت کا مظہر تھا۔ اس کے بعد والے جمعہ میں بھی منبر آپ کی صدا سے گونج رہا تھا۔ ۲۵/ستمر اور ۳۰/اکتوبر میں وقفہ ہی کتنا تھا! ع

اڑ گیا پنچھی ڈال ابھی تک جھول رہی ہے

بہر حال ڈاکٹر ازہری اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ان کی یادیں، باتیں، کتابیں، خدمات اور خلوص ووفا کی سوغات رہتی دنیا تک تابندہ رہیں گی۔ علم ووفا کی راہ میں ستر سال کی مسافت بغیر رکے، تھکے پوری ثابت قدمی اور استواری کے ساتھ طے کی، مصروف اور مشغول اور مفید خاص وعام زندگی بسر کی، آرام کم کیا، کام زیادہ کیا، کام بھی ذاتی یا اہل وعیال کا نہیں، چراغ جلتا رہا اور انجمن کے کام آتا رہا، دنیا نے انھیں جتنا دیا اس سے کئی گنا زیادہ اس کی جھولی میں ڈال کر یہاں سے خالی ہاتھ رخصت ہوئے۔ آپ کی وفات سے ایک خاندان اور ایک ادارے کا نقصان نہیں ہوا، یہ پورے ملک وملت اور عرب وعجم کی علمی دنیا کا خسارہ ہے۔ لائق وفائق شخصیتیں مفارقت کے داغ دے جاتی ہیں تو دیر تک دماغوں میں اندھیرا اور مایوسی کا بسیرا رہتا ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ جانے والوں کا نعم البدل عطا نہیں فرماتا نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اٹھتی رہیں گی۔

دلی دعا ہے کہ اللہ کی رحمت بشری لغزشوں کو عفو ومغفرت کے سائے میں جگہ دے کر آپ کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں انبیاء، شہداء اور صلحاء کی صحبت نصیب فرمائے۔ آمین

☆☆☆

ڈاکٹر صاحب کا ایک پیغام نوجوانوں کے نام

مادیت کے غلبے، دینی مزاج کی کمی اور ماحول کی ناہمواری کے باعث ہمارے نوجوانوں میں اسلام اور دعوت اسلام کے لئے وہ جذبہ اور تڑپ نہیں جس کی ضرورت ہے، جب کہ دنیا کے متعدد ملکوں میں مسلم نوجوان اس سلسلہ میں بیحد سرگرم ہیں، امت کی ترقی کے لئے نوجوانوں کا مثبت انداز میں متحرک ہونا ضروری ہے، ملت کے اس طبقہ میں جوش وجذبہ اور قوت عمل دونوں موجود ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے علماء اور بزرگ اس طبقہ کی سرپرستی فرمائیں، اور نوجوانوں کے لئے کام کا جامع منصوبہ تیار کریں، معاشرہ کی تعمیر میں اگر ملت کا نوجوان طبقہ سرگرم عمل نہ ہوگا تو اس سے ایسا خلا پیدا ہوگا جس کا پر کرنا مشکل ہوگا۔ موجودہ دور میں نوجوانوں کے متحرک ومصروف عمل ہونے کی بات آتی ہے تو کچھ لوگوں کے ذہن میں دہشت گردی وتخریب کاری کی وہ صورتیں گھوم جاتی ہیں جنھیں مختلف ذرائع ابلاغ نشر کرتے ہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام امن وآشتی کی تعلیم دیتا ہے، فتنہ وفساد پر اس نے عبرتناک سزائیں مقرر کی ہیں، ظلم وتعدی کی وہ ہمیشہ حوصلہ شکنی کرتا ہے، اس لئے ہم جب نوجوانوں کے متحرک ہونے کی بات کرتے ہیں تو اس کا مقصد معاشرہ کی تباہی نہیں بلکہ تعمیر ہوتی ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کا تجزیہ کرنا ہمارے ذمہ داروں کا فرض ہے۔

☆☆☆

شیخ محمد عزیر شمس
مکہ مکرمہ

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری مرحوم کی یاد میں

جامعہ سلفیہ کے سرپرست اور جماعت اہل حدیث کے روح رواں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا، فوری طور پر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم سب یتیم ہوگئے، یہ ایک شخص کی رحلت نہیں بلکہ ایک عہد کا خاتمہ ہے۔

فما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

اب ان جیسا ادیب و انشاء پرداز، مصنف و مترجم، صحافی ودانشور، مربی و معلم، مبصر ونقاد، داعی و مفکر، منتظم اور مدبر پوری جماعت میں شاید ہی کوئی نظر آئے۔ زندگی بھر اکیلے انھوں نے جتنے شعبوں میں کام کیا ہے وہ علماء وفضلاء کی ایک ٹیم مل کر بھی نہیں کرسکتی۔ پورے اخلاص وتوجہ اور حسن انتظام وتدبیر سے جامعہ سلفیہ کو انھوں نے سابق ناظم اعلیٰ مرحوم مولانا عبدالوحید سلفی کے ساتھ مل کر بامِ عروج پر پہنچایا، اس کے علمی و تعلیمی شعبوں کی نگرانی کی، شعبۂ نشر واشاعت کو ترقی دی، اس کے عربی ترجمان "صوت الجامعة" (پھر "مجلة الجامعة السلفية" اور اب "صوت الامة") کی ابتدائے اشاعت ۱۹۶۹ء سے آج تک چالیس سال ادارت کی، اس کی ساری کانفرنسوں، جلسوں اور پروگراموں کے روح رواں رہے، عرب ممالک میں جامعہ کا تعارف کرایا۔ اور خود اپنی تصانیف اور تحریروں کی بنا پر عالم اسلام میں معروف ومشہور ہوئے، متعدد ملکی وغیر ملکی تنظیموں کے رکن منتخب ہوئے اور مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔

مرحوم بے شمار صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ مئو کے مدارس سے فراغت پھر جامعہ ازہر (مصر) میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پوری زندگی جامعہ سلفیہ میں گزاری، کام کے اوقات میں ہمیشہ یا تو وہ آفس میں ہوتے یا کلاس روم میں۔ چند گھنٹیاں پڑھاتے اور باقی پڑھنے، لکھنے اور آفس کے دوسرے کام کرنے میں گزارتے۔ وہ خود بھی کام کرتے اور دوسروں کو بھی مختلف میدانوں میں کام کرنے کی ترغیب دیتے۔ جامعہ سلفیہ کے ساری علمی پروگرموں کا خاکہ وہی مرتب کرتے، شعبۂ نشر واشاعت ان ہی کے دم سے قائم تھا، نصاب تعلیم پر نظر ثانی اور اس کے مطابق مقررہ کتابوں کی تیاری ان ہی کے ذمہ تھی، عربی مجلّہ کی ادارت اور اس میں شائع ہونے والے سارے مضامین کی ایڈیٹنگ وہی کرتے۔ لائبریری کی ترتیب وتنظیم کا کام بھی ان ہی کی نگرانی میں شروع ہوا تھا۔ ملکی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں جامعہ سلفیہ کی طرف سے نمائندگی کا فیصلہ بھی وہی کرتے تھے۔ اساتذہ کے ساتھ باہمی مشاورت اور منتظمین جامعہ کے ساتھ تبادلۂ خیال کے بعد جامعہ کی ترقی کے لئے ہمیشہ

لائحہ عمل وضع کرتے۔ طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت، ان کے علمی نشو ونما، عربی زبان وادب میں مہارت اور لکھنے پڑھنے میں نمایاں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے رہنمائی کا کام بڑی حد تک وہ کرتے تھے۔

میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۶ء تک جامعہ میں چھ سال عالمیت اور فضیلت کے مراحل میں پڑھتا رہا۔ اس وقت وہاں ہر فن کے ماہر اساتذہ موجود تھے، نصابِ تعلیم میں معقولات، منقولات اور ادبیات کے علاوہ انگریزی اور معلوماتِ عامہ کے مضامین بھی شامل تھے۔ طلبہ میں مطالعہ کا شوق، تحصیلِ علم کا جذبہ، لکھنے پڑھنے میں مسابقت ومنافست، کتابوں کے باہمی مذاکرہ اور عربی بولنے اور لکھنے سے شغف تھا۔ جامعہ میں جتنے تحریری وتقریری پروگرام ہوتے ان میں شرکت کے علاوہ جامعہ سے باہر بنارس میں جو بھی تعلیمی، علمی، ادبی اور ثقافتی اور مذہبی ادارے مسلمانوں یا غیر مسلموں کے تھے ان کی زیارت اور وہاں کی محفلوں میں شرکت ہم طلبہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ مسجد، مندر، چرچ، گرودوارے، بنارس ہندو یونیورسٹی، کاشی ودیا پیٹھ، جے نرائن کالج، سعیدیہ لائبریری، اسلامیہ لائبریری، جامعہ اسلامیہ جامعہ فاروقیہ، جوادیہ کالج، رام نگر میں مولانا امام الدین رام نگری، للّٰہ پورہ میں حکیم یوسف صاحب اور دیگر علمی وادبی شخصیات کے چکر کاٹتے رہتے دور دور تک پیدل ہی نکل جاتے تھے۔ چائے خانوں اور پارکوں کو بھی ہم لوگوں نے علمی بحث ومناظرے کے اڈے بنا دیئے تھے۔ اس ماحول میں ہماری پرورش اور نشو ونما ہوئی، اساتذۂ کرام ہم پر بڑی شفقت کرتے، درس کے علاوہ بھی باقی اوقات میں ہم ان سے استفادہ کرتے اور اپنی علمی پیاس بجھاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ہماری جماعت نے کلاس روم میں تو کوئی کتاب نہیں پڑھی، وہ صرف ایک دو دن کے لئے عالمیت سال دوم میں بلاغت کے درس میں آئے تھے، مگر ان سے علمی استفادہ خوب کیا، انھوں نے مجھے اور میرے ساتھی (شیخ) صلاح الدین مقبول کو اپنی نگرانی میں جامعہ کی لائبریری کی ترتیب وتنظیم میں لگا دیا تھا، ہم ہر فن کی کتابیں علاحدہ کرتے، رجسٹر میں اندراج کرتے، نمبر لگاتے، اور پھر الماریوں میں اپنی جگہ رکھتے۔ ۱۹۷۶ میں فراغت کے بعد میں تو چلا گیا، میرے دوست وہاں ایک ڈیڑھ سال مزید لائبریری میں کام کرتے رہے۔ لائبریری میں ہم نے ہزاروں غیر درسی کتابیں دیکھیں۔ اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں، مصنفین کی پہچان ہوئی، ہر فن پر اہم کتابوں کا علم ہوا، اہل حدیث اور غیر اہل حدیث علماء کے درمیان جو مناظرانہ رسائل تحریر کئے گئے ان سے واقفیت ہوئی۔ جامعہ کی لائبریری میں مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی اور مولانا عبدالمجید حریری کے قیمتی ذخیرۂ کتب کے علاوہ گوالیار اور غازیپور کے کئی مکتبات ضم ہو گئے تھے، سعودی عرب، مصر اور بیروت کی بہت سی نئی مطبوعات ان پر مستزاد۔ ہم فہرست بنانے اور لائبریری کی ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ نادر اور اہم کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے رہے اور یہیں سے کچھ لکھنے کا داعیہ پیدا ہوا، چنانچہ میں نے صاحب ''عون المعبود'' مولانا شمس الحق عظیم آبادی (م ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء) پر ایک مفصل مقالہ لکھا، اور اسے ''معارف'' میں اشاعت کے لئے بھیجا، جو ۱۹۷۵ء کے دو شماروں میں چھپا۔ اردو کے ساتھ عربی میں بھی اسے تیار کیا، جس کی ایک قسط ''صوت الجامعة'' میں اسی سال

چھپی۔ پھر ڈاکٹر صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اسے مستقل کتابی شکل دو، تاکہ جامعہ سے اس کی اشاعت عمل میں آئے۔ میں فراغت (۱۹۷۶ء) تک پوری کتاب کے پروف پڑھ کر جامعہ میں دے آیا تھا، مگر اس کی اشاعت ۱۹۷۹ء تک عمل میں آئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ پوری کتاب کے چھپے ہوئے تمام فرمے پریس سے غائب ہوگئے چنانچہ اس کی دوبارہ کمپوزنگ، تصحیح اور طباعت ہوئی، اور ڈاکٹر صاحب کے مقدمہ کے ساتھ وہ "حیاة المحدث شمس الحق وأعماله" کے نام سے چھپی۔

مضمون نگاری اور تالیف کے میدان میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا، ۱۹۷۵ء ہی میں مرحوم نے مجھے مولانا عظیم آبادی کی کتاب "رفع الالتباس عن بعض الناس" کی تصحیح وتعلیق میں لگا دیا اور اس کے ضروری اصول وقواعد سمجھائے، مجھے دو نسخوں کا مقابلہ، آیات و احادیث کی تخریج، اور اقوال واقتباسات کے لئے مآخذ کا مراجعہ کرنا تھا، علاماتِ وقف کا اضافہ، پیراگرافنگ، ہمزہ کا صحیح جگہ استعمال، اور ضروری حواشی ان پر مستزاد۔ اس کام کے دوران مجھے تحقیق وتخریج کا عملی تجربہ ہوا، "المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم" اور مستشرقین کی تیار کردہ "المعجم المفهرس لألفاظ الحديث النبوي" کا علم ہوا۔ تاریخ، حدیث، فقہ اور لغت کے اہم مصادر ومراجع سے واقفیت ہوئی۔ اور ان سے استفادہ کی ٹیکنک سمجھ میں آئی۔ چند ماہ میں یہ کام مکمل ہوگیا، اور اس کی اشاعت بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کے مقدمہ کے ساتھ جنوری ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی۔

اس سنہ میں ہم فضیلت کے آخری سال میں تھے، سارا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا، اس زمانے میں اندرون وبیرون ہند کے ۱۰۰ سے زیادہ رسائل وجرائد (اردو، عربی، انگریزی اور ہندی کے) طلبہ کی انجمن (ندوة الطلبہ) کے لئے آتے تھے، انجمن کی ایک لائبریری الگ تھی جس میں ہر فن کی اردو کی اہم کتابیں تھیں۔ اس کا انتظام وانصرام طلبہ کے ہاتھ میں ہوتا تھا، میں نے مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے حالات زندگی سے متعلق مواد جمع کرنے کے ساتھ برصغیر کے تمام مرحوم علماء اہل حدیث کا تذکرہ مرتب کرنا شروع کردیا۔ اور اس کے لئے جامعہ اور انجمن کے علاوہ بنارس کی تمام مشہور لائبریریوں میں کتابوں اور مجلات ورسائل کی فائلوں کی ورق گردانی اور چھان بین میں لگ گیا۔ اور جہاں سے جو کچھ مواد ملا اسے اپنے ہاتھ سے نقل کرلیا (کیونکہ اس زمانے میں کتابوں کی فوٹو کاپی کا رواج نہ تھا) اس طرح سیکڑوں کتابوں اور پرچوں میں شائع شدہ ساری مطلوبہ معلومات بڑی حد تک میرے پاس جمع ہوگئیں۔

اس دوران ایک واقعہ ایسا پیش آیا جو فراغت کے بعد جامعہ میں میرے مزید قیام اور وہاں علمی خدمت انجام دینے کی راہ میں حائل ہوگیا۔ مولانا محمد داؤد راز دہلوی مرحوم نے اس زمانے میں اعلان کیا کہ وہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے حالات وخدمات پر ایک کتاب ''حیات ثنائی'' شائع کرنے والے ہیں، انھوں نے علماء اور اہل قلم سے گزارش کی کہ وہ اس مجموعہ کے لئے اپنے مضامین روانہ کریں تاکہ شامل اشاعت ہوسکیں۔ جامعہ میں تین ساتھیوں (میں، بدرالزماں نیپالی اور صلاح الدین مقبول) نے طے کیا کہ وہ اس کے لئے مضامین لکھیں گے، میں نے ''مولانا امرتسری کی تفسیری خدمات'' پر اور میرے دوست

بدرالزماں نیپالی نے ''مولانا امرتسری کے فتاویٰ'' پر مضامین بھیج دیئے جب اس کا علم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ہوا تو وہ سخت ناراض ہوئے انھوں نے کہا کہ جامعہ نے تاریخ اہل حدیث کی ترتیب واشاعت کا منصوبہ بنا رکھا ہے، مولانا امرتسریؒ پر خصوصیت سے کام پیش نظر ہے، تم لوگوں نے یہاں بتائے بغیر مولانا داؤدراز کو مضمون کیوں بھیج دیا؟ ہم دونوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس جامعہ کے کسی منصوبہ پر کوئی اثر پڑے گا، اور اپنے مضامین کی کسی دوسری جگہ اشاعت کے لئے ہمیں جامعہ سے اجازت لینی پڑے گی۔ چنانچہ ہم نے کہا کہ ہمیں تو پہلے سے ایسے کسی منصوبے کا علم نہ تھا، اور ان مضامین کی اشاعت سے جامعہ کے کسی منصوبہ کو کیا نقصان پہنچے گا؟ مرحوم نے فرمایا کہ آئندہ نتائج کے تم لوگ ذمہ دار ہو گے۔ ہم دونوں حیرت واضطراب کے عالم میں ان کے آفس سے نکلے، اور سمجھ گئے کہ اب فراغت کے بعد ہمارے لئے جامعہ میں کوئی جگہ نہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

میں فراغت کے بعد ڈیڑھ سال تک دلی، لکھنؤ، علی گڑھ، اعظم گڈھ، پٹنہ، کلکتہ اور دوسرے شہروں کی سیر کرتا رہا۔ ہر جگہ ایک عرصہ قیام کر کے تذکرۂ علمائے اہل حدیث سے متعلق مواد جمع کرتا رہا، سب سے زیادہ قیام دلی میں رہا، وہاں جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، غالب اکیڈمی اور دیگر تعلیمی، علمی اور ادبی اداروں اور مختلف دینی جماعتوں اور تنظیموں کے مراکز اور وہاں کی لائبریریوں، نشر واشاعت کے شعبوں اور تجارتی مکتبات میں گھومتا رہتا، علمی وادبی شخصیتوں اور مشہور علماء ومفکرین سے ملنے کی کوشش کرتا، پٹنہ میں خدابخش لائبریری کے اندر کئی ماہ تک عربی مخطوطات کی فہرست سازی کا کام کرتا رہا مولانا شمس الحق عظیم آبادی کا ذخیرۂ کتب چونکہ یہیں منتقل ہوگیا ہے، اس لئے اس کے اکثر مخطوطات اور مولانا کی تصانیف کے قلمی نسخے بھی وہیں دیکھتا رہا اور ان سے ضروری نوٹ لیتا رہا، بلکہ بعض چھوٹے چھوٹے قلمی رسائل پورے اپنے ہاتھ سے نقل کر لئے جن کی تحقیق واشاعت بعد میں عمل میں آئی۔ یہاں بعض نادر اور اہم قلمی کتابوں کا علم ہوا۔ ''تقویۃ الایمان'' کی اصل عربی "رد الاشـــراك" کا ایک نسخہ یہاں نظر آیا، جسے اپنے ہاتھ سے نقل کیا، مولانا عظیم آبادی کی "غاية المقصود شرح سنن ابی داؤد" کے غیر مطبوع اجزاء بھی ملے (جو بعد میں جامعہ سلفیہ کی توجہ سے نقل کئے گئے، پھر ان کی اشاعت عمل میں آئی)

لکھنؤ میں ندوۃ العلماء اور رائے بریلی میں مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی لائبریری سے مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے نادر مکتوبات، نواب صدیق حسن خاں اور شیخ حسین بن محسن یمانی کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ رسائل وتصانیف کا پتہ چلا۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں مولانا عبدالحی لکھنوی کا ذخیرۂ کتب دیکھنے کا موقع ملا۔ کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی، نیشنل لائبریری، مدرسہ عالیہ اور مولانا عبداللہ لائبریری کے چکر کاٹتا رہا۔ کلکتہ میں قیام کے دوران ہی پتہ چلا کہ مدینہ یونیورسٹی میں اس سال میرا اور میرے کئی ساتھیوں کا داخلہ ہوگیا ہے۔ میں پاسپورٹ بنوانے کی غرض سے ایک عرصے کے بعد بنارس گیا، میرے والد مرحوم جامعہ سلفیہ میں شیخ الحدیث تھے۔ وہاں ضروری کارروائی کی، ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ملا۔ اور مختلف شہروں میں علمی اکتشافات کی داستان

سنائی۔ اب وہ ناراض نہیں تھے انھوں نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے میری باتیں سنیں، میری زیر طبع کتاب "حیاۃ المحدث شمس الحق" میں نئی معلومات کی روشنی میں اضافہ وترمیم کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے مدینہ روانہ ہونے سے پہلے کتاب ضروری اضافے کے بعد ان کے حوالے کردی۔

فروری ۱۹۷۸ء میں مدینہ منورہ آنے کے بعد سے مکہ مکرمہ میں اب تک قیام کے دوران بارہا ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ اس دوران جب بھی سعودی عرب آتے ان کے ساتھ ہم طلبہ کی علمی نشست ہوتی، وہ ہمیں نصیحت کرتے، علمی کاموں کے بارے میں دریافت کرتے، مادرِ علمی جامعہ سلفیہ کے احوال سناتے، اور مجھے خاص طور پر تذکرہ علمائے اہل حدیث کی پہلی فرصت میں ترتیب واشاعت پر توجہ دلاتے۔ میں کہتا کہ اسے طباعت کے لئے تیار کرنا یہاں ممکن نہیں، ہندوستانی علما سے متعلق ضروری مآخذ ومصادر یہاں دستیاب نہیں۔ پورا مجموعہ نظرثانی اور اضافہ کا محتاج ہے۔ اور یہ کام ہندوستان میں چند ماہ بیٹھ کر ہی ممکن ہے، جس کا موقع مجھے آج تک نہیں ملا۔

چھٹیوں میں جب بھی میں ہندوستان جاتا تو جامعہ سلفیہ پہنچتا، وہاں دوایک دن گزارتا، اساتذہ وطلبہ سے ملتا، وہاں کی لائبریری سے استفادہ کرتا۔ موجودہ ناظم اعلیٰ (مولانا عبداللہ سعود صاحب) جو میرے ہم درس ہیں، ان سے اور نائب صدر مولانا شاہد جنید صاحب اور صدر ڈاکٹر صاحب مرحوم سے ملا کرتا۔ خاص طور پر جامعہ کے مختلف امور سے متعلق تبادلہ خیال کرتا، اور جامعہ کی مزید ترقی اور اصلاح سے متعلق اپنی تجاویز پیش کرتا۔ کئی بار تحریری طور پر بھی ذمہ داران کو آگاہ کیا، اصلاح اور ترقی کے بعض مظاہر دیکھنے کو ملے، لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ خصوصاً اب جب کہ جامعہ کے سارے پرانے ماہر اساتذہ یا تو اللہ کو پیارے ہوگئے، یا نکل کر دوسرے اداروں میں منتقل ہوگئے۔

میں اس زمانے کا تصور کرتا ہوں جب وہاں والد مرحوم بہ حیثیت شیخ الحدیث، مولانا عبدالوحید رحمانی، بہ حیثیت شیخ الجامعہ، مولانا عبدالمعید بنارسی، ڈاکٹر صاحب، مولانا آزاد رحمانی، مولانا رئیس ندوی، مولانا عابد حسین رحمانی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری، شیخ انیس الرحمٰن اعظمی اور دیگر عرب اساتذہ تھے جو مختلف علوم وفنون کے ماہر اور جامعہ کے لئے عزت اور شہرت کا باعث تھے۔ اور جن سے طلبہ درس کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی استفادہ کرتے تھے۔ اور علم کے علاوہ اخلاق وآداب بھی سیکھتے تھے اس وقت جامعہ کو مختلف فنون کے ماہر اساتذہ اور علم وتحقیق کے میدان میں معروف اور قابل افراد کی سخت ضرورت ہے۔ ابھی کل تک علوم حدیث ورجال میں برصغیر کے سب سے بڑے عالم (مولانا رئیس ندوی) جامعہ میں تھے، ڈاکٹر صاحب کے گزر جانے سے عربی ادب وصحافت کا بھی جنازہ نکل گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے، مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے، اور جامعہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔

جامعہ سے قلبی تعلق کی بنا پر میں اپنی مطبوعہ کتابیں وقفہ وقفہ سے وہاں بھیجتا رہتا، ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزرتیں تو ان کی تحسین کرتے، اور کبھی کبھی ان پر تبصرہ بھی شائع کرتے۔ ادھر تقریباً پندرہ سال سے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف سے متعلق کسی بھی

زبان میں اب تک جو کام ہوا ہے، خواہ کتاب ہو یا کوئی مضمون یا کتاب کا کوئی باب، اس کا جائزہ اور اس پر تبصرہ اس ببلوگرافی میں شامل ہوگا۔ اس دوران دنیا بھر کی لائبریریوں میں خاص طور پر مخطوطات کا جائزہ لینے سے پتہ چلا کہ ابھی امام صاحب کی بہت سی کتابیں اور رسائل غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ "مجموع الفتاویٰ" وغیرہ میں ان کی اشاعت نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں ان کی تحقیق وتصحیح میں مشغول ہوگیا۔ اور اب تک ان کی دس جلدیں (جامع المسائل ۱-٦ تنبیہ الرجل العاقل ۱-۲، جواب الاعتراضات المصریۃ اور قاعدۃ فی الاستحسان) مکہ مکرمہ سے شائع کیں۔ امام صاحب کی یہ سب کتابیں پہلی بار چھپی ہیں۔ ابھی میرے پاس دس بارہ جلدوں کا مواد اور بھی ہے جو قابل اشاعت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم میرے اس کام سے بہت خوش ہوئے اور اس کی جلد از جلد تکمیل پر توجہ دلائی۔ خدا کرے یہ کام بحسن وخوبی اختتام کو پہنچے۔

پانچ سال قبل جب نواب صدیق حسن خاں پر ایک سیمینار جامعہ سلفیہ میں ہوا تھا اس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا، میں نے ان کی کتاب "ابجد العلوم" کا جائزہ لیا تھا اور اس کی قدر وقیمت بیان کی تھی۔ اس کے افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر صاحب نے نواب صاحب کی تصانیف کی ہو بہو اشاعت پر توجہ دلائی، اور ان کی کسی طرح کی تسہیل یا تلخیص کی سختی سے مخالفت کی۔ میں نے اپنے ابتدائی کلمات میں اس نقطۂ نظر پر تنقید کی، اور بتایا کہ ساری کتابوں کی علمی طور پر اشاعت یقیناً ہو بہو ہونی چاہئے۔ لیکن پوری قوم کے فائدہ کے پیش نظر اس کی تسہیل وترتیب میں بھی کوئی حرج نہیں۔ دنیا کی ساری زبانوں کے کلاسیکی ادب میں یہ دونوں اسلوب رائج ہیں۔ متخصصین کے لئے اصل متن، اور عام لوگوں کے لئے اس کے Simplified نسخے۔ انگریزی میں اکثر شعر وادباء کے افکار و خیالات سے استفادہ کے لئے یہ دونوں طریقے رائج ہیں۔ عربی ادب میں بھی ابوالعلاء معری وغیرہ کی کتابیں دونوں طرح چھپی ہیں۔ مولانا عطاء اللہ بھوجیانی (جن کے پاس نواب صاحب کی تقریباً ساری کتابیں تھیں) نے نواب صاحب کی کئی کتابیں تسہیل کے بعد شائع کی تھیں جس کی وجہ سے عوام ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس تبصرے پر کچھ نہیں کہا۔ لیکن کچھ دوسرے لوگوں کو میرا بیان سن کر بڑی حیرت ہوئی، کیونکہ وہ ڈاکٹر صاحب کی کسی بات پر تنقید کے عادی نہیں تھے۔

مرحوم کا اصل میدان تحریر وتصنیف کا تھا۔ انھوں نے عربی اور اردو میں بے شمار مضامین و مقالات لکھے جو جامعہ سلفیہ کے مجلّات کے علاوہ ملک وبیرون ملک کے رسائل وجرائد میں شائع ہوئے، ان میں کچھ علمی وتحقیقی نوعیت کے ہیں اور اکثر فکری ودعوتی۔ "معارف" میں ان کے بعض تحقیقی مقالات شائع ہوئے، جامعہ کے عربی ترجمان "صوت الجامعۃ" کے تو پہلے دن سے ایڈیٹر تھے، ان کی اکثر عربی تحریریں اس میں شائع ہوئیں۔ ان میں مضامین بھی ہیں، اداریے اور تبصرے بھی، مختلف پروگراموں کے رپورٹ بھی ہیں اور سپاس نامے اور استقبالئے بھی۔ مرحوم کو عربی میں۔ ہر طرح کی تحریر لکھنے پر قدرت حاصل تھی۔ ان کا اسلوب فصیح وبلیغ اور رواں دواں

تھا۔ فکر کے اندر کوئی پیچیدگی نہ تھی، باتیں سلیقے سے اور مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ جذبات کے بجائے عقل کا سہارا لیتے، لفظوں اور محاوروں سے کھیلنے کے بجائے ان کے انتخاب اور برمحل استعمال پر توجہ دیتے، بات ٹو دی پوائنٹ کہتے اور بے وجہ طوالت اور تکرار سے اجتناب کرتے۔ لکھتے وقت شعر وشاعری کا سہارا نہیں لیتے تھے۔

جدید عربی ادب کے معمار (طٰہٰ حسین، احمد امین اور عقاد وغیرہ) جس طرح سادہ مگر پروقار، موثر اور فکر انگیز نثر لکھتے تھے مرحوم اسی اسلوب کے داعی اور ترجمان تھے اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کیا پورے برصغیر میں اس باب میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ دوسرے عربی لکھنے والے عموماً صحافتی اسلوب اختیار کرتے ہیں اور طول طویل عبارتیں لکھ کر انشاء پردازی کے جوہر دکھاتے ہیں، زبان وبیان کے لحاظ سے ان کے یہاں بے شمار خامیاں ہوتی ہیں، الفاظ کے دروبست، جملوں کی ترتیب اور محاوروں کے استعمال میں معیاری ادبی اسلوب کی رعایت نہیں ہوتی۔ فکر کے اندر غموض، عبارت میں تکلف، بیان میں عجلت اور تحریر میں کچھ لکھنے والوں کے بارے میں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ غم وغصہ سے پاگل ہوگئے ہیں۔ اور دیوانگی کے عالم میں کچھ بکے جارہے ہیں، مرحوم کی تحریریں ان سارے عیوب سے پاک تھیں بطور نمونہ ان کے اداریے، تبصرے اور کتابوں پر مقدمے ملاحظہ فرمائیں، وہ کس خوش اسلوبی سے مرکزی مضمون پر توجہ دیتے ہیں، اور کس طرح موضوع زیر بحث کا حق ادا کرتے ہیں، کتابوں پر مقدمے اور تبصرے میں موضوع کی اہمیت، تالیف کے پس منظر، مولف کی قدر ومنزلت، کتاب کی خصوصیات اور آج کے دور میں اس کی ضرورت کا ذکر اتنی جامعیت کے ساتھ کرتے ہیں کہ قاری کو کتاب سے متعلق پوری واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔

اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمہ کے میدان میں بھی ان جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔ چونکہ وہ دونوں زبان کے مزاج شناس تھے، اس لئے ترجمہ کے وقت انھیں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، ایک زبان میں ایک فقرہ پڑھ کر فوراً ہی دوسری زبان میں بلا جھجک لکھتے چلے جاتے۔ مجھے علم نہیں کہ کبھی انھوں نے اپنی تحریر یا ترجمہ کی دوبارہ تبییض کی ہو۔ جو کچھ قلم برداشتہ لکھ دیتے، وہی کاتب یا کمپوزیٹر کے حوالے کردیتے۔ عام تحریریں، اعلانات اور جامعہ کے خطوط بسا اوقات ٹائپ رائٹر پر بغیر کسی مسودے کے خود ٹائپ کرتے تھے۔ عربی ترجموں میں ان کی مشہور قابل ذکر کتابیں "حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولي الله" (محمد اسماعیل السلفی) "رحمة للعالمين" (قاضی سلیمان منصورپوری) "قرة العينين في تفضيل الشيخين" (شاہ عبدالعزیز) "حجية الحديث النبوي" (محمد اسماعیل السلفی) اور "قضايا كتابة التاريخ الاسلامي" (محمد یاسین مظہر الصدیقی) ہیں۔

عربی سے اردو ترجموں میں مشہور کتابیں یہ ہیں: میں (عباس محمود عقاد) اصلاح المساجد (جمال الدین قاسمی) صراط مستقیم کے تقاضے (ابن تیمیہ) مختصر زاد المعاد (محمد بن عبدالوہاب) ان کی کتاب "تاریخ ادب عربی" (پانچ حصے) بھی دراصل شوقی ضیف کی عربی کتاب کی تہذیب وتلخیص وترجمہ ہے، جسے انھوں نے کچھ حذف

واختصار کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔

جو طلبہ ترجمہ کا فن سیکھنا چاہتے ہیں ان کے لئے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ترجمے اور اصل کتابیں سامنے رکھیں، ترجمے کو بند کر کے پہلے اصل سے خود ایک دو صفحہ ترجمہ کریں، پھر مرحوم کا ترجمہ کھول کر اس سے موازنہ اور تصحیح کا کام کریں، میرے خیال میں اس طرح چند ماہ کی محنت سے ترجمہ کی اچھی صلاحیت ان شاء اللہ پیدا ہو جائے گی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ اکثر ترجمہ ہیں یا مضامین ومقالات کے مجموعے ان میں سے اکثر جامعہ سلفیہ سے شائع ہوئی ہیں۔ پی. ایچ. ڈی. کے لئے انھوں نے ابن عبدالبر (م۴۶۳) کی کتاب 'بھجۃ المجالس" کے ایک حصہ پر کام کیا تھا جو شعروادب اور اخلاق ومواعظ پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب عرب دنیا میں پہلے سے شائع شدہ ہے۔ اس لئے مرحوم نے اس کی دوبارہ اشاعت کی طرف توجہ نہ کی۔

جامعہ میں تدریس، عربی پرچے کے لئے مضامین ایڈٹ کرتے، شعبۂ نشر واشاعت کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں پر نظر ثانی، جامعہ کے انتظامی اور علمی امور دیکھنے اور خطوط لکھنے، مختلف پروگراموں، جلسوں اور کانفرنسوں کی تیاری اور ان میں شرکت وغیرہ میں ان کا سارا وقت صرف ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے عربی اور اردو میں پانچ سو کے قریب مضامین ومقالات تحریر کئے، اور جامعہ سلفیہ کی چار سو سے زیادہ مطبوعات پر "کلمۃ الناشر" یا پیش لفظ لکھے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے تو کم سے کم ۱۴-۱۵ جلدیں بنیں گی۔ جن کتابوں کے عربی یا اردو ترجمے کئے ہیں وہ ان پر مستزاد۔

مرحوم نے ستر سال کی عمر پائی، ان کی صحت عموماً اچھی رہی، کبھی کبھی کچھ عوارض لاحق ہوئے، اور جلد ہی شفایاب ہو گئے۔ کام کے وقت وہ ہمیشہ آفس میں حاضر ہوتے، سستی وکاہلی نام کو نہ تھی، جس کام کا ارادہ یا وعدہ کرلیا اسے مقررہ وقت میں پورا کردیا۔ جامعہ سلفیہ کے علاوہ انھوں نے الدار السلفیہ (ممبئی) اور دوسرے اداروں کے لئے ترجمہ وتالیف کا کام کیا۔ مختلف مدارس اور جامعات کے ذمہ داران انھیں اپنے یہاں لے جاتے اور ان سے ہر طرح کے مشورے کرتے اور وہ فراخ دلی کے ساتھ ان کا تعاون کرتے، عربی میں ان کے لئے تعارف نامے لکھتے اور عربی تحریروں کا مراجعہ کرتے۔ بعض لوگوں نے ان کا استغلال بھی کیا۔ ان کا نام استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کیا، انھیں تکلیف بھی پہنچائی۔ مگر انھوں نے کبھی کوئی شکایت نہ کی، اور کسی کے بارے میں برے الفاظ استعمال نہیں کئے۔ یہ ان کی عالی ظرفی تھی۔

مرحوم کی وفات کے بعد پوری جماعت سوگوار ہے، جامعہ سلفیہ اپنے سرپرست اور قائد سے محروم ہو گیا۔ ہم سب یتیم ہو گئے، ادب وصحافت کا مرد میدان نہ رہا، تالیف وترجمہ کا رمز شناس رخصت ہو گیا، ایک عظیم داعی و مفکر اور دین کا ایک بے لوث خادم ہم سے جدا ہو گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ ان کی مغفرت کرے، ان کی خدمات کو قبول فرمائے، اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین

☆☆☆

پروفیسر (ڈاکٹر) محمد سعود عالم قاسمی
ڈائرکٹر سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

۱۹۸۵ء کی بات ہے، اسٹریچی ہال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ربیع الاول کی مناسبت سے سیرت النبی کا جلسہ تھا۔ اس جلسہ میں دیگر علمائے کرام کے ساتھ مولانا ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ) بھی تشریف لائے تھے۔ جامعہ سلفیہ بنارس کے علمی ترجمان ''ماہنامہ محدث'' کے ذریعے آپ سے غائبانہ تعارف تھا کیوں کہ راقم بھی ''محدث'' میں مضامین لکھا کرتا تھا۔ بالمشافہہ ملاقات کا یہ پہلا موقع تھا جو سلام وکلام کی حد تک مختصر تھا مگر تاثر یہ تھا ؎

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

۱۹۸۷ء میں شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر (موجودہ اسسٹنٹ پروفیسر) کی سلیکشن کمیٹی تھی، راقم بھی اس میں امیدوار تھا۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب اور سلیمان اشرف صاحب (دہلی) بحیثیت ایکسپرٹ تشریف لائے تھے۔ میں اپنی امیدواری کے لیے کچے پکے مضامین جو مختلف دینی وعلمی رسائل میں شائع ہوئے تھے، ساتھ لے گیا تھا۔ فہرست مضامین میں ایک مضمون تھا: ''عالم اسلام کے خلاف عیسائی مشنریز کی سازشیں''۔ اس مضمون میں عیسائی مبلغ ضویمر کے حوالے سے ان منصوبوں کا تجزیہ کیا گیا تھا جو مسلم دنیا کی مذہبی تبدیلی سے تعلق رکھتے تھے۔ راقم نے قرآن کریم کی آیت: ﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّخِذُوْا الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارَی أَوْلِیَاءَ﴾ (المائدۃ: ۵۱) سے استناد کرتے ہوئے عیسائیوں اور مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی اور تاریخی اختلاف کو نمایاں کیا تھا۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے اس مضمون پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا: آپ نے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، اس کے برخلاف قرآن تو عیسائیوں کو مسلمانوں سے دوستی میں بہت قریب دیکھتا ہے۔ دونوں میں تطبیق کی کیا شکل ہوگی اور پھر انھوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ أَشْرَکُوْا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ آمَنُوْا الَّذِیْنَ قَالُوْا إِنَّا نَصَارَی ذٰلِکَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُهْبَاناً وَأَنَّهُمْ لاَ یَسْتَکْبِرُوْنَ﴾ (المائدۃ: ۸۲)

''مسلمانوں سے دشمنی کے معاملہ میں سب سے سخت تم یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے اور محبت میں مسلمانوں سے نزدیک تم نصاریٰ کو پاؤ گے۔ یہ اس لیے ہے کہ ان میں علما اور رہبان ہیں اور وہ لوگ استکبار نہیں کرتے۔''

میں نے جواب میں عرض کیا کہ دونوں باتیں اپنی

جگہ پر درست ہیں۔ پہلی آیت میں یہود ونصاریٰ کا اسلام کے مقابلے میں معاندانہ سخت رویہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ دین اسلام کو باطل اور پیغمبر عربی ﷺ کو خود ساختہ نبی سمجھ کر مخالفت کرتے ہیں، اس لیے ان سے دوری بنائے رکھنا بہتر ہے۔ دوسری آیت میں مخالفین اسلام کی شدت پسندی کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں یہود ومشرکین کو اسلام سے عداوت میں عیسائیوں کی بہ نسبت شدید ترین ثابت کیا گیا ہے اور عیسائیوں میں نرمی کی وجہ ان کے یہاں علما، فقہا اور رہبانوں کی موجودگی اور ان میں استکبار کا نہ ہونا بیان کیا گیا ہے۔ موقع ومحل کی مناسبت سے یہ دونوں آیات برحق ہیں بلکہ آج بھی مسلم دنیا ان دونوں رویوں کا سامنا کر رہی ہے۔

ڈاکٹر ازہری صاحب جواب سن کر مطمئن ہوگئے۔ جب سلیکشن کمیٹی کا نتیجہ آیا تو راقم کو صرف لکچر رہی نہیں بلکہ ناظم دینیات بھی منتخب کرلیا گیا تھا۔ بعد میں جب ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی اور اپنی دعاؤں سے نوازا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ڈاکٹر ازہری صاحب سے یہ تفصیلی تعارف مستقبل میں ملاقات اور مراسلات کا ذریعہ بن گیا۔ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ تشریف لاتے تو راقم ان سے ملنے حاضر ہوتا۔ میں جب بنارس جاتا تو جامعہ سلفیہ جا کر شرف ملاقات حاصل کرتا۔ جامعہ سلفیہ میں جب بھی کوئی علمی سیمینار ہوتا تو وہ راقم کو مدعو کرتے، امام ابن تیمیہؒ پر سیمینار ہوا تو دعوت دی، اصرار کیا اور تجدید ملاقات کی آرزو کا اظہار کیا، مگر راقم شدید ضرورتوں کی بنا پر علی گڑھ سے رخت سفر نہ باندھ سکا۔ بعد میں جب علامہ صدیق حسن بھوپالی پر جامعہ میں سیمینار ہوا تو راقم نے اس میں شرکت کی اور اپنے معروضات پیش کیے۔

راقم کے جو مضامین اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے، ڈاکٹر ازہریؒ ان کو دیکھتے، خوش ہوتے اور اظہار خیال فرماتے۔ راقم کے پاس ڈاکٹر صاحب کے بہت سے خطوط تھے جن میں سے چند ابھی تک محفوظ ہیں۔

۲۱ نومبر ۱۹۹۲ء کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"مئو کی ملاقات سے حاصل سرور وانبساط ابھی تازہ ہی تھا کہ دہلی سے واپسی کے بعد جامعہ (سلفیہ) کے وفد نے آپ سے ملاقات اور آپ کی توجہ کا تذکرہ کیا اور سلام بھی سنایا۔ میں نے آپ کے نام جامعہ کی بعض مطبوعات بھجوادی ہیں۔ آپ کے تاثرات کے لیے پر امید ہوں اور قلمی تعاون کے لیے بھی۔ اس خط کے ذریعہ ایک زندہ شخصیت کو مخاطب کر رہا ہوں، امید ہے کہ جواب میں میرے لیے زندگی کا پیغام ہوگا۔"

مقتدیٰ حسن ازہری

ڈاکٹر صاحب کا مفصل خط جس کا اقتباس درج کیا گیا ہے، راقم نے شوق کی نگاہوں سے دیکھا، عقیدت سے پڑھا اور زیر لب گنگنایا:

اگر تلاش کروں کوئی مل ہی جائے گا
مگر تمھاری طرح کون مجھ کو چاہے گا

ڈاکٹر صاحب نے مئو کی جس ملاقات کا ذکر فرمایا ہے وہ بڑی بابرکت تھی۔ ۱۹۹۲ء میں رابطہ کمیٹی کی طرف سے مئو میں تعلیمی اجلاس تھا، اس اجلاس میں تعلیمی بیداری

کے حوالے سے ہم دونوں مجتمع تھے۔ ازہری صاحب سے مئو میں دوسری ملاقات اپریل ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ جمعیۃ اہل حدیث کا اکیسواں سالانہ اجلاس تھا۔ راقم بھی ایک مہمان مقرر کی حقیقت سے مدعو تھا۔ اپنی تقریر میں راقم نے کہا:

ہر مسلمان قرآن و سنت پر ایمان رکھتا ہے جو قرآن وسنت کو نہ مانے وہ مسلمان نہیں، پھر بھی قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کی دعوت کو سنجیدگی سے نہیں لیتا بلکہ مسلکی تناظر میں دیکھتا ہے، ہمیں غور کرنا چاہئے کہ کہیں قرآن وسنت کو پیش کرنے کی حکمت میں ہم سے چوک ہو رہی ہو، کلیات کی جگہ جزئیات میں ہم الجھ گئے ہوں۔ مقصد اور طریق کار دونوں کو موثر ہونا چاہئے تاکہ صحیح نتیجہ برآمد ہو۔

اس تقریر کو ڈاکٹر صاحب اور نوجوان علماء نے بہت پسند کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی خیال تھا کہ امت کو متحد کرنے کے لیے توحید اور کلیات دین کو بنیاد بنانا چاہئے۔

دوسرا مکتوب ۲۱ رجنوری ۱۹۹۳ء کو راقم کے نام لکھا۔ اس وقت ملک کے حالات مسلمانوں کے تعلق سے بہت خراب تھے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد شہید کی جاچکی تھی۔ بابری مسجد کے علاوہ شرپسندوں نے یوپی، راجستھان، مہاراشٹر میں درجنوں مساجد کو مسمار کیا تھا۔ اور مسلمانوں کی جان و مال پر ہر جگہ حملے ہو رہے تھے۔ دستور معطل ہو چکا تھا۔ قانون مہر بہ لب تھا، حکام اور انتظامیہ جانب دار بن گئے تھے ان حالات میں مسلمان اپنے رنج وغم اور بے بسی کا مختلف طریقوں سے اظہار کر رہے تھے اور مستقبل کی طرف سے فکر مند تھے۔ اس موقع پر راقم نے ایک مضمون ''موجودہ حالات میں مسلمانوں کا لائحہ عمل'' کے عنوان سے لکھا تھا جس کو اخبارات ورسائل نے بڑے پیمانہ پر شائع کیا۔ یہاں تک کہ وی ٹی راج شیکھر کے انگریزی رسالہ ''دلت وائس'' میں بھی اس کا خلاصہ پیش کیا گیا۔ اس مضمون میں راقم نے مسلمانوں کو اسوۂ نبوی کو اختیار کرتے ہوئے ہمت وحوصلہ اور صبر وحکمت سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا اور ایک ایسی سیاسی حکمت عملی اپنانے کی دعوت دی تھی جس میں ملک کے سیکولر مزاج اور مظلوم غیر مسلموں کو شامل کر کے جارح طاقتوں کا مقابلہ کرنے کا اشارہ تھا۔ راقم کا معروضہ اصغر گونڈوی کے الفاظ میں یہ تھا:

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہاں صیاد ہوتا ہے

بنارس میں بھی یہ مضمون کسی اخبار نے نقل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پڑھا تو حسب ذیل مکتوب لکھا:

''حالات کی ناہمواری سے مراسلت میں انقطاع ہو گیا تھا۔ آئندہ ان شاء اللہ میری طرف سے کوتاہی نہیں ہوگی۔ بابری مسجد کے سانحہ کے بعد آپ کا ایک مضمون مقامی روزنامہ میں پڑھا تھا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ اب ملک میں مسلمان بے حد نازک مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کا اندازہ پہلے سے تھا۔ لیکن لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ابھی وقت ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا علمی مرکز ہے اور وہاں پر آپ کا منصب موثر وحساس ہے، میری گزارش ہے کہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کے لیے جماعتوں اور پارٹیوں کی سیاست سے بچتے ہوئے اگر وہاں سے اقدام ہو تو اچھا ہوگا۔ اندیشہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے کچھ

کرنے کا وقت ہے یا نکل چکا ہے۔"

مقتدیٰ حسن ازہری

ملکی حالات پر تشویش اور مسلمانوں کے لیے فکر مندی جو ڈاکٹر ازہری صاحب کے یہاں تھی، وہ ان کی گفتگو اور ملاقاتوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس خط میں بھی اس کی ایک جھلک موجود ہے۔ ڈاکٹر ازہری صاحب دو عالمی اداروں کے فیض یافتہ تھے۔ جامعہ ازہر مصر اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دونوں سے سند لیاقت حاصل کی تھی۔ ان جامعات کے عالمی کردار اور وسیع علمی ماحول نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی تشکیل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی ہوتے اپنی شخصیت کے متنوع ابعاد کا اثر چھوڑ جاتے۔ ڈاکٹر صاحب اہل حدیث عالم تھے، وسیع القلب، وسیع النظر اور خوش مزاج، قرآن وسنت کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اساس بنانے پر زور دیتے تھے، مسلمانوں کی مختلف دینی اور سماجی جماعتوں میں رشتۂ اتحاد قائم کرنے کی خواہش رکھتے تھے، اس کا اظہار انہوں نے اپنے مذکورہ خط میں بھی کیا ہے۔

عام طور پر اہل حدیث علماء کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ملت سے کٹ کر رہنا پسند کرتے ہیں اور ان میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تاثر مولانا مقتدیٰ حسن ازہری سے مل کر زائل ہو جاتا تھا۔ ان کی سوچ وفکر کی بنیاد سنت محمدی تھی اور ان کی سعی وجہد کی منزل امت محمدی تھی، وہ دونوں کے لیے مخلص تھے اور دونوں کے خدمت گار۔

ڈاکٹر ازہری صاحب جامعہ سلفیہ بنارس کے روح رواں تھے، وہ جامعہ کی پہچان تھے، ان سے جامعہ کا وقار تھا، وہ چاہتے تھے کہ جامعہ سلفیہ میں اہل حدیث علماء کے علاوہ ملک اور بیرون ملک کی جامعات کے دانشور اور مفکرین آئیں، وہاں کے اساتذہ اور طلباء سے خطاب کریں، بحث وتحقیق کے نئے موضوعات اور علمی دنیا کی ترجیحات سے روشناس کرائیں اور فکر ونظر کی تازہ ہوائیں لائیں، پھر قرآن وسنت کی روشنی میں ان موضوعات پر مباحثہ اور مناقشہ ہو۔ اگر دوسرے مرکزی تعلیمی اداروں میں اس مزاج اور اس سوچ کے سربراہ ہوتے تو ان مدارس کا علمی ودینی اور تحقیقی معیار بہت بلند ہوتا اور عصری درسگاہوں کے لیے ان میں درس عبرت اور نمونۂ عمل ہوتا۔

۱۹۹۴ء میں جامعہ سلفیہ بنارس میں اسلامی عصری موضوعات پر لکچر سیریز رکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب سے حسب ذیل اساتذہ کو نمائندہ بنا کر بھیجنے کی منظوری حاصل کر لی تھی:

(۱) ڈاکٹر مسعود الرحمان خاں ندوی شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز
(۲) ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی شعبہ اسلامک اسٹڈیز
(۳) ڈاکٹر کفیل احمد قاسمی شعبہ عربی
(۴) ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی شعبہ سنی دینیات

جامعہ کی دعوت پر یہ قافلہ بنارس پہونچا۔ جامعہ کے مہمان خانہ میں سہ روزہ قیام رہا۔ طلباء کے لیے متعدد محاضرات ہوئے، راقم نے فقہ اسلامی کے ارتقا پر خطبہ دیا۔ طلباء نے دلچسپ سوالات کیے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے جس مہمان نوازی، علم دوستی اور اپنائیت کا معاملہ کیا، اس کی لذت اب تک تازہ ہے۔ انھوں نے محسوس ہی نہیں

ہونے دیا کہ ہم اپنے گھر سے دور ہیں۔ مذکورہ تینوں دانشور توان کے ہم عمر اور دوست تھے، مگر راقم خورد اور نو آموز تھا، مگر ان کی محبت کا اسیر تھا۔ جامعہ سے واپسی پر میں ان کو شکریہ کا خط لکھنا چاہتا تھا کہ ڈاکیہ ایک خط دے گیا۔ مکتوب نگار کا نام ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری تھا اور خط کا مضمون اس طرح تھا:

۲۳/۱۱/۱۹۹۴ء

"امید ہے کہ بنارس سے علی گڑھ کا سفر بخیر و عافیت طے ہوا ہوگا، جامعہ سلفیہ میں محاضرات کے لیے آپ کی تشریف آوری اور قیام ہمارے لیے باعث عزت و مسرت تھا، آپ نے اس سلسلے میں جو زحمت برداشت کی اور محنت و محبت کے ساتھ طلبہ کو مستفید کیا، اس کے لیے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جامعہ پر آپ کی عنایت و توجہ ہمیشہ برقرار رہے گی اور آپ کے تعاون و حوصلہ افزائی سے ہم علم کی راہ میں آگے بڑھتے رہیں گے۔"

مقتدیٰ حسن ازہری

ریکٹر جامعہ سلفیہ

ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد بھی اس طرح کے پروگرام رکھے۔۔ ان کی خواہش تھی کہ محاضرات کو سالانہ تعلیمی میقات کا حصہ بنادیں مگر بوجوہ وہ ایسا نہیں کر سکے۔ مگر اس کی آرزو ان کے دل میں ہمیشہ رہی۔

اتر پردیش کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لانے کے لیے جناب سید حامد صاحب کی سربراہی میں یوپی رابطہ کمیٹی بنائی گئی۔ رابطہ کمیٹی نے متعدد تعلیمی، معاشی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے کارواں نکالے۔ رابطہ کمیٹی کی ایک فعال یونٹ بنارس میں تھی۔ ڈاکٹر اقبال احمد انصاری اور جناب طاہر علی انصاری ایڈوکیٹ اس کے فعال رہنما تھے۔ دونوں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ راقم جب بھی رابطہ کمیٹی کے تعلیمی پروگرام کے تحت بنارس جاتا تو ڈاکٹر ازہری صاحب کو مطلع کرتا، ان سے ملنے جامعہ سلفیہ جاتا اور کبھی وہ خود ملنے کے لیے تشریف لاتے، ملی اور سیاسی موضوعات پر اور ملکی حالات پر بصیرت اور دل سوزی سے گفتگو فرماتے۔ میری سماجی کوششوں کی حوصلہ افزائی فرماتے اور خانقاہوں سے نکل کر رسم شبیری ادا کرنے کی تلقین کرتے۔

۲۰۰۳ء میں راقم کو حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ راقم رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا مہمان تھا اور منیٰ میں مسجد خیف کے قریب رابطہ کی چار منزلہ عمارت میں اس کا قیام تھا، یوم الترویہ یعنی آٹھویں ذی الحجہ تک مسجد خیف میں نماز باجماعت ادا کرتا تھا، حاجیوں کا ہجوم ابھی امنڈا نہیں تھا۔ اس لیے مسجد خالی سی رہتی تھی۔ نماز کے بعد راقم تلاوت میں مشغول ہو جاتا تھا۔ تلاوت کرتے ہوئے جب راقم سورہ المائدۃ تک پہونچا تو اسے بے ساختہ وہ منظر یاد آگیا جب ۱۹۸۷ء میں علی گڑھ کی سلیکشن کمیٹی میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے مذکورہ آیت کی تفسیر و تطبیق کے بارے میں پوچھا تھا۔ راقم نے تلاوت مکمل کی اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب کے لیے دعا کی۔ حج بیت اللہ سے واپسی پر راقم نے ان کو خط لکھا اور مسجد خیف میں ان کے لیے دعا کا ذکر کیا۔ جواب میں انہوں نے ۱۹ مارچ ۲۰۰۳ء کو خط لکھا:

"نعمت غیر مترقبہ کے طور پر آپ کا گرامی نامہ

موصول ہوا، جس سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اس بات سے مزید طمانیت ہوئی کہ آپ نے حج کے مبارک سفر میں خاکسار کو اپنی دعاؤں میں یاد فرمایا۔ اللہ تعالی سے میری پر خلوص دعا ہے کہ آپ کا حج، جملہ عبادتیں اور اپنے لیے نیز تمام مسلمانوں کے لیے آپ کی دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

مکتوب میں محولہ آیت کا ایک مصداق اس وقت بھی سامنے ہے۔ عالم اسلام کے حکام اور عوام دونوں دورخ پر ہیں، پھر بھی اتحاد و اتفاق کی مضبوطی حاصل نہیں۔ ماضی کی بعض حکمت عملی ناکام ہوگئی اور بعض کے سلسلہ میں انتظار ہے، لیکن جبر و استبداد کا پنجہ بھی پھیلتا جا رہا ہے"۔

مخلص: مقتدیٰ حسن ازہری

۲۰۰۸ء میں مدرسہ عالیہ عربیہ مئو ناتھ بھنجن کے ارباب انتظام نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحب کو اپنے مدرسہ کی اسناد کی منظوری کے لیے درخواست دی۔ یونیورسٹی میں مدارس کے الحاق، معادلہ اور منظوری کی درخواستیں متعدد مراحل سے گزرتی ہیں۔ اس لیے منظوری میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ ۲۰۰۹ء میں راقم کو سدھارتھ نگر، اعظم گڑھ اور مئو کے بعض مدارس کا معائنہ کرنا تھا، مدرسہ عالیہ کے ذمہ داروں نے راقم سے رابطہ قائم کیا۔ رجسٹرار آفس سے مدارس کی جو فہرست معائنہ کے لیے بھیجی گئی تھی، اس میں مدرسہ عالیہ کا نام شامل نہ تھا۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب کا فون آیا کہ اگر مئو اور اعظم گڑھ کے مدارس کا معائنہ کرنے جا رہے ہو تو مدرسہ عالیہ کو بھی اس میں شامل کر لو، اس مدرسہ سے میرا تعلق ہے اور اس زحمت کے لیے ذاتی طور پر ممنون ہوں گا۔

ڈاکٹر ازہری صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے راقم نے اپنے طور پر مدرسہ کو اس فہرست میں شامل کیا اور معائنہ کے دوسرے رفیق سفر پروفیسر فرمان حسین صدر شعبۂ شیعہ دینیات کے ہمراہ مدرسہ کا معائنہ کیا۔ ارباب مدرسہ نے بڑی کرم فرمائی کی، ایک جلسہ کا انعقاد کیا اور ہمارے کچھ تعلیمی خیالات کی پذیرائی کی۔ ڈاکٹر ازہری صاحب نے ان حضرات کو پہلے سے کہہ دیا تھا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں ان کا خاص خیال رکھا جائے اور دوران معائنہ بھی فون سے رابطہ قائم رکھا۔ بہر صورت معائنہ رپورٹ داخل ہوتے ہی مسلم یونیورسٹی نے مدرسہ عالیہ کی سند کو منظوری عطا کی۔

ایک دن میں اپنے شعبہ میں مشغول مطالعہ تھا کہ ایک رفیق نے اطلاع دی: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکلا، آنکھیں نم ہوگئیں اور دل میں عقیدت و محبت کے ہزاروں چراغ جھلملا اٹھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد جامعہ سلفیہ جانے کا موقع نہیں ملا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کو کبھی نہیں بھولا۔ سوچتا ہوں کہ جامعہ سلفیہ جاؤں اور بے تاب نگاہوں سے جامعہ کی دیوار و در میں ڈاکٹر صاحب کی یادوں کے نقوش دیکھوں اور مکینوں سے سوال کروں:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر تو ویرانہ پہ کیا گزری

☆☆☆

ڈاکٹر شعیب نگرامی
الخبر ۔ سعودی عرب

حافظ جی......*

''موصوف سے میری ملاقات ۱۹۶۲ء میں قاہرہ میں ہوئی اور تعارف و دوستی کا جو تعلق اس وقت استوار ہوا بحمداللہ آج تک قائم ہے''۔

یہ اقتباس حافظ جی کے اس مقدمہ کا ہے، جو انھوں نے میری کتاب ''اسلام دشمن تحریکوں......'' کے لئے لکھا تھا، لیکن یہ تعلق ۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۹ کی صبح سعید صاحب (ڈاکٹر سعید عابدی سابق صدر شعبہ اردو جدہ ریڈیو حالیہ مقیم جدہ) کی ایک ٹیلی فون کال سے ختم ہوگیا۔ سعید صاحب نے کہا کہ شعیب بھائی آج صبح پیٹ کے کینسر نے حافظ جی پر فتح پالی۔ وہ خالق حقیقی سے جا ملے اور اب ان کو لے کر مئو جا رہے ہیں۔

حافظ صاحب کے انتقال کی خبر ہم سب پر بجلی بن کر گری، ہم سب کو ان پر بڑا ناز تھا، اس وقت بھی تعزیتی مضامین لکھے گئے اور آج بھی لکھے جا رہے ہیں لیکن جو کھویا سو کھویا، اہل علم ساتھیوں کی جدائی کا غم بہت شدید ہوتا ہے اور پھر ایسا دوست جو قاہرہ کی واپسی کے بعد بلندیوں کی چوٹیوں کی جانب رواں دواں تھا، لیکن کسے یقین تھا کہ موت کا دام سخت اس کے آشیاں سے اتنا قریب تھا کہ پرواز کے دوران ہی گرفتار کرلیا جائے گا۔

ایک ایسے فریق و دوست اور زندگی کی تمام سرگرمیوں میں سالوں آہنگ رہنے والے مخلص ساتھی کی اچانک جدائی کا غم کوئی ایسا معمولی واقعہ نہیں جو آسانی سے بھلایا جاسکتا ہو، جس کی محبت واخلاص کے نہ مٹنے والے نقوش ذرہ ذرہ میں، پتہ پتہ اور بوٹے بوٹے پر ہر جگہ نمایاں ہوں، جس کی پاکیزہ سیرت، اعلیٰ ترین کردار اور کوثر و تسنیم سے دھلی صاف وشفاف زندگی آنکھوں میں بسی ہو، اور دل میں جاں گزیں ہو، جس کی حوصلہ مندی، اعلیٰ ہمتی، سچی دینداری، اعلیٰ ظرفی، فہم سلیم، غیر معمولی ذہانت اور وسیع النظری کی شہادت ہر شخص کی زبان پر ہو اور جو وسعت فکر ونظر کے ساتھ اقلیم قلم پر حکمرانی کرتا رہا ہو، ایک ایسا جامع صفات شخص جو تاریخ کا جوہر شب تاب تھا۔ اہل تعلق کے دلوں پر کیا کچھ نہ گزری ہوگی اس کا صحیح اندازہ صرف وہی کرسکتا ہے جو جانے والے سے صحیح طور پر واقف ہو اور جس نے ان کو اچھی طرح دیکھا اور برتا ہو۔

* ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری مرحوم جو قاہرہ میں احباب کے درمیان ''حافظ جی'' کے نام سے جانے جاتے تھے۔

قاہرہ میں ہندوستانی طلباء کی آمد کا سلسلہ ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۵۸ میں شروع ہوا۔ چنانچہ ۵۸ میں قاہرہ آنے والے طلباء کا وفد ندویوں پر مشتمل تھا جس میں راقم السطور کے علاوہ مدراس کے ڈاکٹر اسماعیل مرحوم، بنگلور کے ڈاکٹر عبدالقیوم، بھوپال کے لقمان خان مرحوم، اعظم گڑھ کے ڈاکٹر سید لقمان مرحوم اور مئوناتھ بھنجن کے ڈاکٹر معین الدین تھے۔

سن ساٹھ کی ابتدائی دہائیوں میں مدارس کے طلباء کی جو جماعت آئی ان میں سے نمایاں نام مقتدیٰ حسنؒ، مظہر احسن اعظمی، عبدالعلی (ڈاکٹر عبدالعلی عبدالحمید، سعید صاحب، (ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی) اور طفیل احمد جونپوری مرحوم تھے۔

ہمارے یہ تمام احباب ہندوستان کے مختلف مدارس سے آئے تھے ان میں نہ کوئی سلفی تھا، نہ دیوبندی اور نہ ندوی، بلکہ سب کے سب مسلمان تھے۔ ایک دسترخوان پر فول، روٹی اور طیمہ کھانے اور شارع سلیمان پاشا واقع یونانی کافی ہاؤس میں فوطی کے ہاتھوں بنی کافی پیتے، گروہی اور مذہبی تعصب جو ہمارے مدارس کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے اسے دریائے نیل کے پانی نے دھو دیا تھا۔

ان احباب میں سعید صاحب، حافظ جی، عبدالعلی اور مظہر مجھ سے سب سے زیادہ قریب تھے، یہ سب جامع ازہر کے طالب علم تھے اور میں یونیورسٹی کے شعبہ عربی ادب کا طالب علم تھا لیکن ہم سب کی رہائش ایک ساتھ عباسیہ میں چار منزلہ بلڈنگوں میں تھی، جو مدینۃ البعوث الاسلامیہ کے نام سے مشہور تھا اور ذمہ داروں کے مطابق اس کا سالانہ بجٹ افغانستان کی حکومت کے سالانہ بجٹ کے برابر تھا۔

اس عظیم الشان ہوسٹل میں کبھی کبھار اختر رضا جو الازہر کا پالا چھونے چند ماہ کے لئے آئے تھے اور جن کا سلسلۂ نسب احسان الٰہی ظہیر مرحوم کی تحقیق کے مطابق امام کاظم سے ملتا ہے ان کی جھلک دکھائی پڑتی لیکن طفیل مرحوم کے ہاتھوں میں عصائے موسیٰ کے خوف سے کبھی نزدیک نہیں آتے تھے، حافظ جی کے ساتھ ہمارے تعلقات کچھ ایسے تھے کہ اس کی نوعیت متعین کرنا آسان نہیں مگر ان کے ساتھ بیٹھنے سے ایک طرح کی لطیف خنکی اور طمانیت قلب کا احساس ہوتا تھا، ان سے قرابت داری نہیں تھی مگر کسی قریب ترین عزیز کی طرح الفت اور یگانگت تھی، وہ متانت و وقار کا مجسمہ مگر چہرہ اور باتوں میں بھولا پن، طبیعت کے نرم مگر اصولوں کے پکے، لوگوں سے بے نیاز مگر ہر ایک کے بہی خواہ، ہمدرد، نفاست اور سلیقہ وسادگی ان کی طبیعت کے نمایاں اوصاف تھے، لباس سے لے کر رہن سہن اور گفتگو اور ہر کام میں اس اوصاف کی جھلک نمایاں تھی۔ مناظر فطرت اور خوشگوار موسم حافظ صاحب کی کمزوری تھی۔

پاکستان کی مشہور شاعرہ اور بی بی سی کی شعبۂ اردو کی سابقہ اناؤنسر سحاب قزلباش سے ریڈیو قاہرہ کے شعبہ

اردو کے لئے انٹرویو کر رہا تھا تو انھوں نے دریائے نیل کو دلہن کی مانگ سے تشبیہہ دی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ حسین قاہرہ کے حسن کو نیل ہی نے چار چاند لگادئے ہیں، قاہرہ کی حسین شاموں سے لطف اندوز ہونے کے لئے حافظ جی کے ساتھ میں نے انوبس منحری یعنی دریائی بس کے ساتھ نیل کی لہروں کے ساتھ سفر کیا اور پھر بوٹ ہاؤس میں برازیلی اور ترکی کافی کے مزے بھی لئے۔

یہ ایک فطری بات ہے کہ جو دلکش مناظر سے متاثر ہوگا تو وہ اچھی اور دلکش تعبیر سے ضرورت لطف لے گا جو بادِصبا کی لطیف لہروں کا قدرشناس ہوگا وہ اچھے اور خوبصورت شعر پر بھی جھومے گا، عبدالباری انجم الہ آبادی ثم کراچوی مرحوم جو ریڈیو قاہرہ کی اردو سروس کے بانی تھے وہ ہم لوگوں کے اکلوتے خوش الحان غزل کے شاعر تھے۔ ان کے اشعار زبان پر ان کی گرفت کے ساتھ ان کے اعلیٰ کردار کے بھی آئینہ دار ہوا کرتے تھے، عبدالباری مرحوم جب بھی قابو میں آجاتے تو حافظ جی ان کے اشعار پر جھوم اٹھتے اور دل کھول کر داد دیتے، حافظ جی نے جامعہ سلفیہ سے وابستگی کے بعد جب تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو ان کی تحریروں میں جو رعنائی وبرنائی آئی وہ اسی اعلیٰ ذوق کی دین ہے انھوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا اس میں تازگی اور چاشنی پیدا کردی۔

قاہرہ میں عبدالعلی (۱) کی علمی صلاحیت، خداداد ذہانت اور حیرت انگیز حافظہ کی دھوم کے ساتھ ہم طلبہ کا اپنی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ مصری علماء وادباء کی ہفتہ وار محفلوں میں شرکت ہم لوگوں کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ تھی، چنانچہ جامع ازہر میں نماز جمعہ کے بعد شیخ محمد الغزالی مرحوم، اسی دن شام کو سید سابق مرحوم، منگل کی شام عباس محمود العقاد مرحوم، بدھ کی شام ڈاکٹر یوسف حنیف مرحوم، جمعرات کی شام محمد ابوہو مرحوم اور جمعہ کی شام شیخ محمود شاکر مرحوم کی مجالس میں ہم سے اکثر وبیشتر احباب شرکت کیا کرتے تھے، دوسری جانب احباب معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے ریڈیو قاہرہ تک رسائی کی جدوجہد میں بھی لگے رہتے تھے، میں ریڈیو قاہرہ کی اردو سروس سے ۱۹۶۰ میں وابستہ ہوچکا تھا اور آخر کار احباب کی کوششیں جوڑتوڑ کے بعد کامیاب ہوئیں، حافظ جی، سعید صاحب، عبدالعلی اور میرے چھوٹے بھائی ہارون نگرامی مرحوم میرے رفیق کار ہوئے اور مظہر اعظمی طفیل مرحوم اور میرے ایک دوسرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر یوسف نگرامی نے شعبۂ ہندی کا مورچہ سنبھال لیا۔ میں ہر منگل کی شام ایک تمثیلی مشاعرہ یہیں کرتا تھا اور جس میں شرکت کرنے والے طلباء کو دودو پاؤنڈ ملا کرتے تھے اور یہ مشاعرہ میں نشر ہونے سے ایک گھنٹہ قبل ریکارڈ کیا کرتا تھا، ایک منگل کو یہ طلبہ ایک غلط فہمی کا

(۱) ڈاکٹر عبدالعلی عبدالحمید برطانوی شہری پروفیسر اسلامک کالج لندن

نگار ہوکر ریکارڈنگ کے لئے نہیں آئے تو مجبورا مشاعرہ براہ راست نشر کرنا پڑا اور عبدالباری صاحب مرحوم کے علاوہ اس تاریخی تمثیلی مشاعرے کے شرکاء مقتدیٰ حسن، عبدالعلی، سعید عابدی اور شعیب نگرامی ایسے بے سرے تھے کہ اگر تان سین زندہ ہوتے تو ہم لوگوں کو سن کر فن موسیقی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے، نتیجہ واضح تھا بیشمار سامعین نے ہمیں لکھا کہ اب اس مشاعرہ کے بعد ہم لوگوں نے منگل کے دن آپ کی ساری نشریات نہ سننے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہماری اردو سروس کی ایک پیشکش ''سب رنگ'' سامعین میں بہت مقبول تھا یہ پروگرام براہ راست نشر ہوتا تھا اور اس میں عبدالعلی اور میری اہلیہ ذکیہ پروین سامعین کے خطوط پڑھا کرتے اور میں ان کے جواب دیا کرتا۔

شادی کے بعد میری رہائش دریائے نیل کے کنارے واقع گارڈن سٹی میں ہوگئی۔ جہاں روز شام حافظ جی، عبدالعلی، مظہر، سعید صاحب، رئیس ندوی، نقی الدین فردوسی فدوی جمع ہوتے، اور یہاں علمی مشغلہ کے ساتھ کام ودہن کی لذت کا بھی انتظام ہوتا۔ مخلص ترین احباب کی ان یادگار محفلوں کا شیرازہ ساٹھ ویں دہائی کے آخر میں منتشر ہونا شروع ہوگیا، سب سے پہلے حافظ جی علی گڈھ سدھارے، پھر میں بن غازی ٹیلی ویژن پر بحیثیت نیوز ایڈیٹر کی تقرری کے بعد لیبیا کے لئے روانہ ہوگیا۔ میرے بعد عبدالعلی نائیجیریا کی لاگوس یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہوکر سیاہ براعظم کو سدھارے، مظہر عربوں کو عربی پڑھانے کے لئے سعودی عرب چلے گئے اور سعید صاحب نے ریڈیو قاہرہ چھوڑ کر جدہ ریڈیو کی نوکری کر لی۔

۱۹۸۱ء میں میں بن غازی چھوڑ کر سلسلۂ ملازمت سعودی عرب کے مشرقی صوبے کے شہر ''الخبر'' چلا آیا جہاں حافظ جی کا بڑا لڑکا عزیزی سلیمان اختر ایک پرائیوٹ کمپنی میں بحیثیت چیف اکاؤنٹنٹ کام کر رہے ہیں، حافظ جی جب بھی مملکت کے سرکاری دورے پر آتے تو الخبر ضرور آتے، ان کے ساتھ گھنٹوں ملاقاتیں رہتیں، میں ۱۹۸۴ء میں ایک تقریب کے سلسلہ میں بنارس گیا ہوا تھا اور میرا قیام کلارک اودھ نامی ہوٹل میں تھا تقریب کے اختتام کے بعد حافظ جی کے اصرار پر میں اپنی اہلیہ کے ساتھ جامعہ سلفیہ ان کا دو دن مہمان رہا، جامعہ سلفیہ کو دیکھ کر اللہ کے اس مخلص بندہ اور صاحب عظمت انسان کی اعلیٰ نظری، اولوا العزمی کے طفیل جامعہ سلفیہ کی شاندار عمارت کو دیکھ کر اسلم جیراج پوری کا یہ شعر زبان پر آ گیا۔

عزم راسخ ہے نشانِ قیس و شانِ کوہ کن
عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

جامعہ سلفیہ جو حافظ جی کی محنت وکاوش کی وجہ سے علم وہدایت کی وادی بن گئی ہے اس کی وسیع وشاندار عمارتوں اور وہاں رہنے والے طلباء واساتذہ کی وجہ سے جنگل میں منگل کا سماں نظر آیا۔

حافظ جی نے جامعہ سلفیہ میں اپنے طویل قیام کے دوران تیس سے زیادہ عربی واردو میں کتابیں لکھیں اور اتنی ہی عربی و فارسی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا، حافظ جی عربی اور اردو کے بہت اچھے انشاء پرداز تھے، عربی شہ پاروں کا انھوں نے ایسا رواں اور شستہ ترجمہ کیا جس کو پڑھ کر بے اختیار زبان سے عش عش نکلتا ہے۔

ماہنامہ ''محدث'' اور ماہنامہ ''صوت الامۃ'' میں حافظ جی نے زندگی کی روح پھونک دی اور دونوں پرچوں میں جدید صحافت کی رعنائی آ گئی، حافظ جی کے مذکورہ دونوں پرچوں میں اداریے مفید بھی تھے اور قابل قدر بھی، منزلِ راہ بھی تھے اور زادراہ بھی، عقل سلیم کے لئے درس و عبرت اور قلب حساس کے لئے پندونصیحت تھے۔

حافظ جی رابطہ ادب اسلامی کے ایک فعال اور سرگرم ممبر تھے، ان کی تحریریں اسلامی ادب کی خصوصیات کی حامل ہوتی تھیں، حاصل کلام یہ کہ حافظ جی کی تحریروں میں ہر چیز ملتی ہے، ان کا قلم آبشار تھا جو خیالوں سے ٹکراتا اور بڑے جوش و شور میں طغیانی کی طرح گزرتا اور افسردہ جذبات کو حیات نو بخشتا، قیادت کے لئے انقلاب انگیز مشعل دیتا، صاحب قلم کو نیا اسلوب و نگارش کا نمونہ پیش کرتا، اہل فکر وعقل کو روشنی اور تاب نا کی دیتا، دینی اور اسلامی شعور کا احیا کرتا، زمین چمن گل کھلاتی ہو یا نہ ہولیکن اس کے سینے میں جانے کتنے درِنایاب اور گہنا بے گرانمایہ، آسودہ خاک، علم وعمل کے سوتے، فکر ونظر کے ستارے بھی اس کی آغوش میں دفن ہیں اور انہی میں میرے حافظ جی بھی ہیں جن کے قلم حق کی نگاہ کا فیض بند ہوگیا جس سے احساس وشعور کے تاروں کو تحریک ہوتی تھی، مردہ دلوں میں تمنائے حیات کروٹیں لیتی تھی اور جو دین رحمت کے ان اصولوں کی نشاندہی کرتا تھا جس سے انسانیت کی صورت گری بدرجہ اتم ہوتی اور رعنائی ہستی کے خدوخال اجاگر ہوجاتے تھے، حافظ جی نے اپنی عمر سے زیادہ کام کیا، اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ کارآمد بنایا۔

حافظ جی اس طرح یک بارگی بزمِ ہستی سے اٹھ کر چلے گئے، جیسے اس دنیا سے ان کا سروکار ہی نہیں تھا، لیکن ان کے قدموں کے نشان باقی ہیں اور باقی رہیں گے، بھری محفل سے ان کے اٹھ جانے کی ادا یاد رہے گی، محفل ان کے بغیر سونی ہوگئی اور جانے کب تک سونی رہے گی، مرور ایام سے زخم مندمل تو ہو رہے ہیں لیکن زخم کا نشان کبھی نہیں مٹے گا، حافظ جی ایک بڑا خلا چھوڑ گئے، نگاہ جستجو ان کا بدل نظر نہیں آ رہا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆☆

مولانا محمد الاعظمی
سابق شیخ الجامعہ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کے بعض امتیازی اوصاف

عمومی طور پر کسی علمی قدآور شخصیت کی سیرت نگاری کے لئے مرکزی عنوان ''حیات وخدمات'' کے تحت اس کی زندگی کے احوال وکوائف، فضائل ومحاسن اور کثیر الجہات خدمات کے متنوع پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا جاتا ہے، ہم اس کشمکش میں رہے کہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کی حیات وخدمات کے کس پہلو پر قلم آزمائی کریں، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی مثالی شخصیت کچھ ایسی تھی کہ:

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

اس لئے کسی خاص پہلو کے انتخاب میں ہماری سرگردانی نے آسان راستہ اختیار کیا کہ آزادانہ طور پر ڈاکٹر صاحب کے ان اوصاف حسنہ کا تذکرہ کیا جائے جو ان کو عام شاہراہ چلنے والے اہل علم سے کسی طور پر ممتاز کرتے ہیں۔

خاندانی پس منظر

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جو کبھی ناخواندگی، کاغذ وقلم سے لاتعلقی اور شرف شائستگی سے دوری اس کی شناخت تھی، اس کی ایک شاخ حنفی المسلک ہے اور اس میں غلو کی حد تک تشدد وتعصب پایا جاتا ہے، اس میں ایک ایسا مولوی پیدا ہوا جس نے سلفیوں سے معرکہ آرائی کو اپنا مشن بنایا، اور جاہلیت اولیٰ کی یاد تازہ کردی۔

دوسری شاخ سلفی المسلک ہے، ڈاکٹر صاحب اس کے گل سرسبد تھے، لیکن ان سے پہلے اس میں بھی علم کی روشنی اس حد تک مفقود رہی کہ بالفاظ ڈاکٹر اطہر افضال ''نہ کوئی علمی پس منظر، نہ لوح وقلم سے کوئی رابطہ، ہاں سیف وسنان کی روایت تھی''۔ البتہ ڈاکٹر صاحب کے نانیہال خاندان کو علم وفضل اور دینی خدمات میں امتیازی فوقیت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے راقم کو اسی علمی خاندان کا ایک ذرۂ خاک ہونے کا شرف بخشا ہے، الحمد للہ۔ ڈاکٹر صاحب کے نانیہال کی علمی شہرت نے بعض لوگوں میں غلط فہمی پیدا کردی کہ وہ اسی علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی والدہ مرحومہ بزرگ سلفی عالم شیخ محمد نعمان تلمیذ شیخ نذیر حسین محدث دہلوی، رحمہم اللہ تعالیٰ، کی صاحبزادی اور زیور علم وہنر سے آراستہ تھیں، انھوں نے اپنی تمام اولاد (چار بیٹوں اور سات بیٹیوں) کو اپنی بے مائیگی کے باوجود حتی المقدور اتنی تعلیم دلائی جو اس زمانے کی درسگاہوں میں رائج تھی، ان کی پہلی اولاد اور ڈاکٹر صاحب

کی بڑی بہن جو میری اہلیہ ہیں وہ ہندی زبان سے بھی کسی قدر واقف ہیں، جس سے یہ احقر یکسر نا آشنا ہے، یہ برٹش گورنمنٹ کے دور کی بات ہے، مدارس ومکاتب میں ہندی تعلیم کا کوئی تصور نہیں تھا، اور عصری درسگاہوں میں اردو اور فارسی بھی شامل نصاب تھی، البتہ مدرسہ عالیہ نسواں مئو جو نصف صدی تک ہندوستان (برصغیر) میں تعلیم نسواں کا واحد ادارہ تھا، اس میں ایک معلّمہ ہندی داں تھیں، انھوں نے اپنی زیر تعلیم بچیوں کو ہندی زبان سے بھی آشنا کیا، جواب ہندی دور میں انھیں کام دے رہی ہے۔

علمی شوق

ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان کے وہ پہلے سپوت ہیں، جنھوں نے دادیہالی روایات کے خلاف نانیہال کی علمی ودینی میراث کے حصول اور اس میں ترقی وتقدم کو اولیت دی، اور زندگی کے آغاز سفر سے اسی میدان میں تگ وتاز کو ہم سفر بنایا، گھر کی معاشی حالت ان کے لئے حوصلہ شکن تھی، مگر والدین کی طرف سے ان کی ہمت وعزم اور شوق ولگن کو ہر ممکن سہارا ملتا رہا، تعلیم کے ایک درمیانی مرحلے میں ان کو ایک موذی مرض لاحق ہوگیا، مئو کے معالجین کے علاج سے ناکام ہوکر ایک عرصے تک بنارس میں زیر علاج رہے، اللہ تعالیٰ نے شفاء دی، پھر ممکنہ سرگرمیوں کے ساتھ تعلیمی سلسلہ جاری ہوگیا، البتہ معالجوں کی ہدایت پر رمضان المبارک میں امامت تراویح کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

علمی سطح ایسی تھی کہ جو خوش نصیب حافظ قرآن ہوجاتا، تو اس کے علم وفضل کے لئے یہی کافی سمجھا جاتا، اور اس کا مرتبہ ومقام عالم کے قریب شمار ہوتا، وہ خود بھی مزید تحصیل علم سے بے نیاز ہوجاتا، لیکن ڈاکٹر صاحب کا ذوق علم اور شوق طلب اس روایتی منزل تعلیم پر قناعت کرنے پر راضی نہیں ہوا، حفظ قرآن کے بعد جامعہ عالیہ عربیہ مئو میں دینی وعربی تعلیم متوسطات تک حاصل کرکے جامعہ فیض عام مئو کو مقر تعلیم بنایا، اس کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد احمد رحمہ اللہ، جو ایک بزرگ عالم وفاضل اور تجربہ کار جوہر شناس تھے، ڈاکٹر صاحب کی ذہانت، محنت اور علمی ذوق وشوق سے یہاں تک متاثر ہوئے کہ جامعہ ہی میں ان کی رہائش، قیام وطعام کا انتظام اور ماہانہ وظیفہ مقرر کرکے ہر فکر و پریشانی سے ان کو آزاد کردیا، تاکہ یکسوئی سے تعلیمی سفر جاری رکھیں، اور مثالی عالم کے محاسن سے آراستہ ہوکر عملی میدان میں اپنے کو کامیاب شہسوار ثابت کریں، افسوس تعلیم کے آخری سال میں معمولی سی بات تلخی کا باعث ہوگئی، اور ڈاکٹر صاحب نے جامعہ اثریہ مئو میں سنۃ الشہادۃ کی تعلیم حاصل کی۔

علوم درسیہ سے فراغت کے بعد جامعہ فیض عام مئو نے اس المیہ کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کو مسند تدریس تفویض فرمائی، یہ اعزاز عام فضلاء ومتخرجین کے علمی سفر کی آخری منزل ہوتا ہے، لیکن یہاں پر بھی عام روایت سے الگ مزید علوم وفنون کی طلب اور ان میں کمال وجمال کی خواہش "اطلبوا العلم من المهد الى اللحد" پر عمل کرنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی، قدرت نے ان کی اس خواہش کا احترام اس طرح کیا کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ جامعہ ازہر مصر سے استفادہ واستفاضہ کی راہ

ہموار کردی، سچ ہے "من جد وجد"۔

مصر سے واپسی کے بعد عملی زندگی کا آغاز جامعہ سلفیہ بنارس میں تدریسی خدمت سے ہوا، دو تین سال خدمت کرتے گذرے ہوں گے کہ علمی دنیا کی ضرورت کے پیش نظر اعلیٰ ڈگری کی کمی کا احساس ہوا، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی پہنچ گئے، وہاں پر روز و شب مشینی انداز میں پڑھنے لکھنے، پڑھانے اور امتحانات کی تیاریوں میں اس طرح گذرے کہ ایم فل کرنے اور پی. ایچ. ڈی. کی تھیسس کے ساتھ جونیر اور ہائی اسکول کے امتحانات بھی انجام پاتے رہے، ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ماہنامہ "صوت الامۃ" عربی کی ادارت اور ادارتی مقالہ نویسی کی ذمہ داریاں اس اہتمام کے ساتھ سنبھالے رہے کہ یہ عربی مجلہ اپنے معیار و وقار کے جلو میں وقت مقرر پر لباس اشاعت سے آراستہ ہوکر اپنے شائقین اور قدر دانوں کے ہاتھوں میں پہنچتا رہا، یہ ساری کاوشیں ڈاکٹر صاحب کے ایام طالب علمی کے عجائب وغرائب کا درجہ رکھتی ہیں، جو اس حقیقت پر شہادت ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فضل کبیر اور خیر کثیر انھیں خاص بندوں کو ودیعت ہوتا ہے جو جہد مسلسل سے علمی خدمت اور دینی دعوت کے تمام آلات واسلحہ جات سے آراستہ ہونے کے لئے اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں، اور زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیتے۔

اگر ان تعلیمی ادوار اور حصول علم کے لئے جدوجہد کے زمانوں کا احتساب کیا جائے تو ان کا مجموعہ ڈاکٹر صاحب کی نصف عمر کو پہنچتا ہے۔

عملی زندگی

طالب علمانہ زندگی وادیوں پر وادیاں طے کرتے ہوئے جب اس منزل پر پہنچی کہ ملک وقوم کو، مذہب وملت کو، جماعت وافراد کو اور علمی حلقوں کو اپنے علوم وفنون کے آبشاروں سے سیراب اور تشنگان علم ودانش کو اپنے چشمۂ فیض سے آسودہ کریں، تو اس کے لئے مرکزی دار العلوم بنارس ہی کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا مرکز ومستقر بنایا، اپنے وطن سے قریب رہتے ہوئے بھی اتنی دوری کہ سال میں ایک دو مرتبہ چند روز کے لئے مسافر کی طرح رہ کر واپس چلے جاتے، ان ایام میں بھی جامعہ کے امور ومسائل اور خود ان کے علمی مشاغل ہم سفر رہتے، انھوں نے ہند وبیرون ہند کی دانش گاہوں میں استفادہ کرنے کے ساتھ ان کے تعلیمی نظام اور اعلیٰ تعلیم کے لوازم واسالیب کا جو مشاہدہ کیا اور تجربات حاصل کئے، ان کی روشنی میں روایتی درسگاہوں سے بلند ہوکر جامعہ سلفیہ کی مرکزیت کے شایان شان تعلیمی وتعمیری ترقی وتوسیع کے لئے جہد مسلسل کو اپنا مقصود حیات بنایا، اور ساری توانائیاں اس کے لئے وقف کردی۔

محترم ناظم اول مولانا عبد الوحید عبد الحق رحمہ اللہ بہت ہی مخلص اور مردم شناس تھے، ڈاکٹر صاحب کو پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ یہ قابل اعتماد اور ان کے دست راست ہونے کی پوری صلاحیت کے مالک ہیں، اور جامعہ کی تعمیر وترقی اور آبیاری کے لئے اپنا عیش وآرام قربان کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں، جامعہ کے لئے ان دو عظیم فعال معماروں کی رفاقت ضرورت بن گئی، باہم دست و بازو بن گئے،

رفتار کار برق رفتار ہوتی گئی، ملک و بیرون ملک کے بڑے بڑے علمی اداروں اور رفاہی جمعیتوں سے روابط میں اضافہ ہوا، عرب وعجم کے دورے ہوئے، جامعہ اور اس کے مشروعات ونشاطات کا تعارف اور مادی و معنوی وسائل کا دائرہ ہمہ گیر سطح پر وسیع ہوتا گیا۔

جامعہ کے ارتقاء میں کردار

سابق ناظم اعلیٰ کے معتمد خاص ہونے کی بنا پر جامعہ کے ارتقاء اور دائرہ کار کے پھیلاؤ میں ڈاکٹر صاحب کا کلیدی کردار رہا کرتا تھا، ان کی تحریک اور سعی مشکور سے نوع بنوع مشروعات کی تنفیذ عمل میں آتی رہی، درسگاہوں، دفتروں، طلبہ و اساتذہ کے لئے اقامتی کمروں اور دوسری ضروریات کی منزلوں کی تعمیر کا کام ہنگامی پیمانے پر جاری ہوا، ادارۃ البحوث الاسلامیہ، دار الترجمہ والتالیف، شعبۂ صحافت ودعوت، شعبۂ کتابت، طباعت اور اشاعت کتب کا انتظام ہوا، مزید برآں گوناگوں علمی نشاطات ومذاکرات، اور عالمی کانفرنسوں کے انعقاد کا اہتمام ہوتا رہا، جامعہ کی کم عمری کی نسبت ان عظیم کارناموں نے اہل علم ونظر کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

مشاغل

ڈاکٹر صاحب کے مشاغل روز وشب اور طریقہائے کار عام روایات سے منفرد ہوا کرتے تھے، جامعہ کے تمام شعبوں کی نگرانی، اور تدریسی خدمت کے علاوہ ہمہ وقت پڑھنے لکھنے اور علمی کاموں میں مشغول رہا کرتے، حتی الامکان کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیتے، سفر میں بھی یہ مشغولیت ساتھ رہتی، مراسلات، تقریظات، توصیات، مقالات، اداراتی شنذرات نویسی، بحث وتحقیق اور ہنگامی تحریرات جیسی علمی مصروفیات میں ان کے لیل ونہار تمام ہوا کرتے، انھیں مشاغل کے ہجوم میں زائرین اور وفود کا استقبال، ان کی خدمت اور ان کے مسائل ومطلوبات کے لئے ہر ممکن تعاون سے گریز نہیں کرتے۔

اکثر ایسا ہوتا کہ رمضان، عیدین اور دوسری تعطیلات اپنے معمول کے مطابق جامعہ ہی میں گزارتے، اور علمی وقلمی سفر کسی اسٹیشن پر ٹھہرے بغیر جاری رہتا، اپنے وطن مئو کے مکان اور جائداد کی خبر گیری کے لئے بھی فرصت نہیں نکال پاتے، والدین اور دیگر اقرباء واحباء سے بالمشافہ ملاقات اور پرسش احوال کی آرزو بھی تشنۂ تکمیل رہ جاتی، اپنی اور خانگی ضروریات کے لئے خود جامعہ سے باہر نہیں نکلتے، بلکہ مطلوبہ اشیاء کی خریداری وفراہمی کا کام دوسروں کے سپرد رہا کرتا، مکان کی تعمیر اور جائداد کے تحفظ کے مسائل ومعاملات سے نمٹنے کے لئے کسی کو وکیل مقرر کرکے خود آزاد رہتے، وہ بھلا برا کچھ بھی کرتا کسی قسم کی گرفت سے دوچار نہیں ہوتا، اخراجات کی جو بل پیش کردیتا، بلاشک وتردد ادا کردیتے، بعض لوگ اس کے استحصال کی شکایت کرتے تو اپنی معذوری ظاہر کرکے خاموش ہو جاتے، اپنے بیگانے اور ہمسایوں سے زیادتی اور نقصان پہنچنے کی صورت پیش آتی تو دفاعی کوشش کے بجائے صبر وخاموشی کے ساتھ ان سے تعلقات کی خوشگواری میں فرق نہیں آنے دیتے۔

رجال سازی

ڈاکٹر صاحب کے من جملہ امتیازی اوصاف ایک یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر جامعہ کی خدمت کی طرح رجال سازی اور علماء گری کے لئے فکری وعملی کوشش اپنی نصابی سرگرمیوں میں شامل رکھتے تھے، اسٹاف کے اساتذہ وتلامذہ میں سے باذوق ونشیط افراد کو بحث وتحقیق، صحافت وخطابت، مقالہ نگاری، اور کتابوں کے ترجمہ وتالیف کی ترغیب وتربیت دیتے، اور اپنی نگرانی میں ان کو مشغول رکھتے، ان کے کئے ہوئے کاموں کا جائزہ لیتے رہتے، اصول، اسلوب، اور مشکلات میں ان کی رہنمائی فرماتے، ڈاکٹر صاحب کے اس مخلصانہ افاضہ وافادہ کا اثر ہے کہ جامعہ سلفیہ کو اس انتاج پر فخر حاصل ہے کہ اس کے فضلاء میں گراں قدر تعداد ایسی ہے جو اعلیٰ ڈگریوں کی حامل ہوکر دنیا کی نامور درسگاہوں واداروں میں پیشہ ورانہ علمی خدمت انجام دے رہی ہے۔

عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستاں کے ہیں

دوسرے مدارس وجامعات کے تعلیم یافتہ بعض فضلاء بھی قابل ذکر مقام رکھتے ہیں، لیکن جامعہ سلفیہ کے ابنائے متقدین ومتاخرین میں ایک ایسی جماعت ہے جس پر ڈاکٹر صاحب کے علم وفضل اور اعلیٰ تعلیم کی سنہری چھاپ ہے، ان کی تدریب وتربیت کا یہ فیض نمایاں ہے کہ یہ ممتاز فضلائے جامعہ ڈاکٹر صاحب کے منہج پر چل کر اپنی مساعی سے اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کرکے تعلیمی، تالیفی، دعوتی اور دوسرے علمی میدانوں میں شہسواری کررہے ہیں۔

عمومی فیوض

ڈاکٹر صاحب کے دعوتی عمل کا دائرہ وسیع اور عمومی تھا، ایک طرف ہندو بیرون ہند کی عظیم الشان علمی ودعوتی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مندوب خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوکر مقرر موضوع کے حساس پہلوؤں کی توضیح وتصویر اس طرح پیش کرتے کہ ان کی علمی بصیرت، معلوماتی کثرت اور فکری گہرائی کی ترجمان ہوتی، ان کی باتیں دلائل اور واقعاتی شہادات سے مرصع ہوتیں، اہل علم ودانش اس قدر متاثر ہوتے کہ ان سے استفادہ کے مواقع تلاش کرتے۔

دوسری طرف مساجد میں خطابت جمعہ، جلسوں، کانفرنسوں اور علمی اجتماعات کی صدارت سے لوگوں کو مایوس نہیں ہونا پڑتا، یہاں تک کہ طلبہ کی انجمنوں اور لائبریریوں کے پروگراموں کی صدارت کرنے میں بھی اپنی سبکی محسوس نہیں کرتے اور نہ ان کے قیمتی اوقات کی قربانی اس راہ میں حائل ہوتی، اگر کوئی طالب یا ضرورت مند ان سے توصیہ وتزکیہ کا خواستگار ہوتا، یا کوئی معمولی اور نو آموز کاتب وباحث بھی اپنی قلمی کاوش پر کلمات تقدیم لکھنے کی درخواست کرتا تو اس کو بھی مایوس نہیں کرتے، بلکہ تشجیع وتشویق سے نوازتے۔

وطن مئو میں عیدین اور جمعہ کی امامت:

شہر مئو کی سب سے بڑی عیدگاہ ڈومن پورہ کے مستقل امام عیدین ڈاکٹر صاحب تھے، امسال علالت کے باوجود عید الفطر کی امامت وخطابت کے فیضان سے لوگوں کو

محظوظ و مسعود فرمایا، اس خطبہ میں خصوصی طور پر حالات حاضرہ کے تناظر میں تین نکات موضوع خطاب رہے، تقریباً پون گھنٹے تک جامع اور بصیرت افروز بیان بغیر کسی تکان واکتاہٹ کے جاری رہا، موضوع کے جو پہلو تشنہ بیان رہ گئے تھے، ان کو اگلے، جمعہ، جامع مسجد حبہ مئو کے خطبہ میں لباس تکمیل پہنایا۔

مئو میں جب بھی تشریف لاتے اہم مساجد کے ارباب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور خطبہ جمعہ کی منظوری سے سرفراز ہوتے، اس طرح مئو کی جوامع کو ڈاکٹر صاحب کی امامت وخطابت کا شرف حاصل ہوتا۔

مزید یہ کہ مئو کی مختلف علمی و دینی اور دعوتی تنظیمیں ان سے استفاضہ کے لئے کوئی پروگرام ضرور منعقد کرتیں، ان کی صدارت وخطابت سے پروگرام کی افادیت واہمیت دوچند ہوجاتی، اور اہل علم ودانش کی خصوصی شرکت محفل کے لئے باعث فخر وکامیابی قرار پاتی۔

کلیہ فاطمۃ الزہراء مئو

مئو میں مسلم بچیوں کی خالص دینی وعربی تعلیم کے لئے مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ کے زیر اشراف مشاورتی میٹنگ میں فیصلہ ہوا کہ اس کے لئے ایک مستقل درسگاہ کا انتظام ضروری ہے، مولانا مظہر احسن ازہری نے اس کا نام ''کلیہ فاطمۃ الزہراء'' منتخب کیا، اور مولانا ندوی کی فرمائش پر اس کی منتظمہ کمیٹی کے ارکان صرف اہل علم منتخب ہوئے، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مولانا مظہر احسن ازہری اور ڈاکٹر عبدالعلی ازہری، اس کے اولین ستون تھے، اس زمانے میں یہ تینوں حضرات بیرون مئو علمی وتدریسی خدمت انجام دے رہے تھے، پھر بھی کلیہ کے مسائل کی خبرگیری اور اس کے فروغ کے لئے برابر اتصال رکھتے، جب کبھی تعطیلات میں وطن واپسی ہوتی، کلیہ کی کارگذاریوں کا جائزہ لیتے، اور طالبات ومعلمات سمیت خواتین کا اجلاس منعقد کرکے ان کو دینی تعلیم وتربیت کی اہمیت وافادیت سے آگاہ کرتے، اور طالبات کو تشجیعی انعامات سے نوازتے۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ چونکہ مئو سے قریب بنارس میں مصروف عمل رہتے تھے، کلیہ کو ان سے استفادہ کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے رہے، بالخصوص کلیہ کے تعلیمی نصاب ونظام کے اعداد، ترتیب وتنسیق میں ڈاکٹر صاحب کی توجیہات سے مشکلیں آسان ہوجاتی رہیں، اس ادارے سے ان کی دلچسپی وسرگرمی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ کلیہ میں تعلیمی مرحلہ جب علوم عالیہ تک پہنچا تو ان کی تدریس کے لئے ایسے عمر رسیدہ استاذ کی ضرورت تھی جو دراسات علیا بالخصوص صحیحین کی تدریس پر قدرت وتجربہ رکھتا ہو، اس کے حصول کی کوشش مئو کی حد تک ناکام رہی، ان ایام میں ڈاکٹر موصوف اور ڈاکٹر عبدالعلی ازہری بھی یہاں موجود تھے، اور تلاش وجستجو میں سرگرداں تھے، بالآخر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن نے اس مسئلے کے حل کے لئے تجویز پیش کی کہ ہم لوگ وفد کی شکل میں مولانا عبدالوحید صاحب ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس کی خدمت میں پہنچ کر درخواست کریں کہ مولانا عابد حسین رحمانی استاذ جامعہ سلفیہ کو کچھ عرصہ کے لئے کلیہ فاطمۃ الزہراء مئو میں تدریسی خدمت انجام دینے کی اجازت عطا فرمائیں اس تجویز پر عمل ہوا،

الحمدللہ درخواست مقبول ہوئی، اور ڈاکٹر رحمہ اللہ کی قیادت میں یہ وفد سالماً غانماً واپس ہوا۔

مجلس ندائے وقت مئو

مئو میں دعوتی عمل کی توسیع کے لئے ڈاکٹر صاحب نے ۲۰۰۰ء میں قدیم وجدید اہل علم ودانش اور فضلائے مدارس کو مولانا مظہر احسن ازہری ناظم جامعہ عالیہ عربیہ مئو کے مکان پر مدعو کیا، اس اجتماع میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مجلس دعوت وارشاد قائم کرنے کی ضرورت پیش کی جو عام روایتوں جلسوں اور جمعیتوں سے ہٹ کر معاشرے میں عملی اصلاح کی کوشش کرے، الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریک وترغیب بہت مقبول ہوئی، اور ایک دعوتی کارواں حرکت میں آ گیا، جو ڈاکٹر صاحب کی قیادت ورہنمائی میں "مجلس ندائے وقت" کے نام سے رواں دواں ہوگیا، الحمدللہ اس کے مثبت اثرات عملی شکل میں ظاہر ہوئے، افسوس صد افسوس، مجلس کا یہ مخلص بانی اور میر کارواں ہم سے جدا ہوگیا، اور مجلس اس کی بابرکت خدمات اور قیمتی مساعدات سے محروم ہوگئی، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات بہت عظیم خسارہ ہے، لیکن اس کے مداوا کے لئے حدیث رسول میں اجر عظیم کی خوش خبری دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ کسی نیک رسم کے بانی وعامل ہوتے ہیں ان کو اس کے اجراء کا اجر ملتا ہے، اور اس پر عمل کرنے والوں کے مثل بھی اجر پاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "من سن سنة حسنة فله اجرها وأجر من عمل بها" (الحدیث)

زبان رسول اللہ ﷺ سے دی گئی اس خوش خبری میں مجلس ندائے وقت کو متحرک اور سرگرم عمل رکھنے کی دعوت وہدایت کا پہلو بھی شامل ہے، تاکہ ڈاکٹر صاحب کے ذخیرۂ حسنات میں مزید درمزید اضافہ کا سلسلہ جاری رہے، اور اہل مجلس بھی اجر خیر حاصل کرتے رہیں۔

دیانت وامانت

ڈاکٹر صاحب ہر کام اور معاملے میں دیانت اور امانت کا غایت درجہ اہتمام کرتے تھے، یہاں تک کہ وہی ذمہ داری قبول کرتے جس کا حق ادا کرنے میں کوتاہی یا غفلت راستہ نہ پائے، علماء اور مدرسین کے اس طرز عمل سے ناخوش رہتے تھے کہ وہ اپنے فرائض کو پوری دلجمعی اور پورے وقت مقرر تک انجام دینے میں تساہلی وکوتاہی کرتے ہیں، ایک روز اس دیانتی وامانتی کوتاہی کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک بار وہ چند منٹ کی تاخیر سے کلاس روم جا رہے تھے، راستے میں ایک مدرس اپنے کلاس روم سے واپس آ رہے تھے، سبب پوچھا: کہنے لگے "درس دے کر آ رہا ہوں"۔

ایک مرتبہ جامعہ عالیہ عربیہ مئو میں تشریف لائے، درس وتدریس کے فرض کی ادائیگی میں مدرسین کی تقصیر اور وقت تعلیم کی کٹوتی پر رنج وافسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہاں تک برافروختہ تھے کہ کہنے لگے "لوگ کہتے ہیں کہ اگر قصابوں کی بخشش ہوجائے گی تو سب لوگ بخش دیئے جائیں گے" (اس مقولہ کی شہرت اس لئے ہے کہ مئو کے گوشت فروش قصاب گوشت کی تول میں ترازو کی ڈنڈی

مارنے کے بہت ماہر ہیں) میں کہتا ہوں کہ ''اگر مدرسین کی بخشش ہوجائے گی تو قصابوں کی بھی بخشش ہوجائے گی''، اللہ اللہ، ڈاکٹر صاحب میں اخلاص اور دیانت داری کے ساتھ عمل وخدمت کی کس قدر تڑپ تھی، اور خود امانت داری ودیانت داری کے کتنے بلند مقام پر فائز تھے، ڈاکٹر صاحب کا قول مذکور اس زمانے کا ہے، جب تدریس میں ڈنڈی مارنے کا مرض موجودہ دور کی عام اور ترقی پذیر وبا کی طرح نہیں تھا۔

یہ حقیقت روشن ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ سلفیہ میں پیشہ ورانہ تدریس سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا، دوسال کے بعد اس قیمتی پیشہ کو قربان کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے علی گڑھ چلے گئے، وہاں چار سال تک مسلسل محنت اور جاں فشانی کرتے رہے، مطالعہ اور بحث وتحقیق میں عرق ریز رہے، اس طرح وہ دن آیا کہ باضابطہ طور پر پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری لے کر واپس آئے، پھر جامعہ کی خدمت میں مشغول ہوگئے۔

اس کے برعکس بعض حضرات وقت اور ضرورت آنے پر کسی مدرسہ سے دکتورہ کی ڈگری لے کر اپنا مطلوب حاصل کرلیتے ہیں، جب کہ اس طرح کے مدارس میں عموماً فضیلت سے اونچی ڈگری کا کوئی تصور نہیں۔

اگر ڈاکٹر صاحب چاہتے تو کئی مدرسوں سے دکتورہ کی ڈگری بہت آسانی سے حاصل کرلیتے، اور مدارس اس کام پر فخر کرتے، لیکن ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے کردار کی سچائی اور مضبوطی نے ان کے ذہن میں ایسا وسوسہ بھی گزرنے نہیں دیا ہوگا۔

تواضع اور بزرگوں کا احترام

ڈاکٹر صاحب عظیم اعزازات اور اونچے مناصب کا حامل ہونے کے باوجود اپنے بزرگوں، اساتذہ اور اہل علم وفضل کا بے حد احترام کرتے تھے، اور ان کے سامنے بہت متواضع رہتے، اور خادمانہ حیثیت سے پیش آتے، کسی مجلس اور پروگرام کی صدارت کے وقت بالانشینی سے پرہیز کرتے، لوگوں میں اپنی امتیازی شان ناپسند کرتے۔

نہد شاخ پرمیوہ سر بزمین

ایک مرتبہ جامعہ عالیہ عربیہ میں تعلیمی کنونشن منعقد ہوا، اس کے صدر ڈاکٹر صاحب اور مہمانان خصوصی مولانا مظہر احسن ازہری اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری تھے، ان تینوں اعلام کے لئے کرسیاں بالترتیب رکھی گئی تھیں، لیکن ڈاکٹر صاحب حاضرین کے ساتھ فرشی نشست میں شامل ہوگئے، اس طرح مہمانان خصوصی نے ڈاکٹر صاحب کی ہم نشینی پسند کی، مجلس میں سے ایک دانش ور اٹھ کھڑے ہوئے، احتجاج کے انداز میں شکوہ کیا کہ کرسیوں کا صدارت وضیافت سے خلا اجلاس کے آداب اور شان کے خلاف ہے، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ پھر بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی، راقم اپنی کمتری کے باوجود یہ جرأت کرنے پر مجبور ہوا کہ ان تینوں اکابر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور حسب مرتبہ ان کو کرسی نشین کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اہلحدیث جامعات ومدارس کے تعلیمی نصاب ونظام میں اتحاد کے لئے تحریک چلائی تھی، ملک کی قابل ذکر درسگاہوں کے چیدہ اصحاب تعلیم کے کئی اجتماعات جامعہ سلفیہ میں ہوئے، پھر اس کو وسعت دینے

ہوئے دوسرے بڑے مدارس میں اس اجتماع کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا گیا، جامعہ فیض عام میں اس اجتماع کی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن فیضی نے جامعہ کے ہاسٹل کا سنگ بنیاد رکھنے کی خواہش کی، اور ڈاکٹر صاحب کو خشت اول رکھنے کی تکلیف دینا چاہی، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس عمل کے لئے مفتی صاحب ہی کو مقدم رکھا، پھر مولانا عبدالوحید شیخ الجامعہ السلفیہ اور راقم کے بعد سنگ بنیاد رکھنے کی رسم ادا کی، اس طرح کے کئی مواقع پر ڈاکٹر صاحب کی تواضع و بے نفسی کے واقعات مشاہدے میں آتے رہے''۔

ڈاکٹر صاحب کی وفات سے تین سال پہلے ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب ان کے سب سے بڑے بیٹے اور ولی تھے، سب کے محترم تھے، ان کی نماز جنازہ پڑھانے کا اولین حق ڈاکٹر صاحب ہی کو حاصل تھا، راقم کے برادر نسبتی تھے، تلمذ کا رشتہ بھی تھا، جو مجھ کمترین کے لئے باعث فخر تو ہے، لیکن ان جیسے عالی مقام و جامع صفات حسنہ کے لئے موجب پشیمانی ہے، پھر بھی انھوں نے اصرار کر کے اپنی والدہ کی نماز جنازہ پڑھانے کا حق مجھے سونپ دیا، ڈاکٹر صاحب کی اس غایت تواضع وانکساری سے راقم خود بھی بہت متحیر و پشیمان ہوا، ان سے بحث واحتجاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، ناچار سر تسلیم خم کرنا پڑا، اس وقت لوگوں کے سامنے ہماری حیثیت ایسی تھی جس کی تصویر چچا غالب نے اس طرح کھینچی ہے ۔

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ دہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

آخری دور

اکیسویں صدی کی اس پہلی اختتام پذیر دہائی کچھ اس طرح گزری کہ ڈاکٹر صاحب کے کردار و اطوار کی زبان افسردگی اور مایوسی کی کہانی سنا رہی تھی، جامعہ کی سرگرمیاں اور اس میں نشاطات کی بوقلمونیاں لحہ بلحہ تازگی و بالیدگی کی سمت سے سکڑ نے سمٹنے کی طرف رخ پھیرنے کا احساس دلا رہی تھیں، اس سلسلے میں ہم نے ان کو کئی مرتبہ کریدنا چاہا، لیکن کسی واضح جواب کے بجائے ان کی سنجیدگی اشارہ کر رہی تھی کہ ۔

تجری الریاح بما لاتشتهی السفن

لگتا ہے کہ حالات کے دباؤ اور تشجیعانہ تعاون سے محرومی نے ان کے ذہن ودماغ کی جولانی کو اس طرح متاثر کر دیا تھا کہ دہلی میں اقامت کو انجام کار کے لئے زیادہ مفید سمجھ رہے تھے، یہ حقیقت مسلم ہے کہ میر کارواں کے ارتقائی سفر کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی، لیکن جب وسائل وعوامل منہ موڑ لیتے ہیں، اور سنگ راہ پیش قدمی کو روکنے لگتے ہیں تو ذوق سفر ماند پڑ جاتا ہے، اور زندگی حسرت ویاس کی تصویر بن جاتی ہے، لیکن با ایں وآں ڈاکٹر صاحب کا قلمی سفر زندگی کے آخری لمحات تک بغیر توقف جاری رہا، اور جامعہ سلفیہ سے عملی تعلق قائم رہا۔

رحمه الله تعالىٰ وأدخله مدخلا كريما۔



ڈاکٹر سید سعید احسن عابدی
صدر شعبہ اردو جدہ ریڈیو۔ جدہ

کچھ یادیں کچھ باتیں

جب کسی شخصیت سے غیر معمولی تعلق ہو اور وہ شخصیت صاحبِ کردار بھی ہو اور علم وفضل کے اعلیٰ مقام پر بھی فائز ہو، تو اس یقین کے باوجود کہ موت لازمۂ بشریت ہے یہ خیال شاذ ونادر ہی آتا ہے کہ وہ کسی دن جدا بھی ہوجائے گی، پھر ہوا یوں کہ برادر مکرم ومحترم ڈاکٹر مقتدیٰ صاحب نے، جن کو ''رحمہ اللہ'' کہنے اور لکھنے پر دل کو آمادہ کرنے کے لئے خاص ریاضت کرنی پڑتی ہے اپنی آخری علالت سے کچھ ہی دنوں قبل راقم الحروف سے ٹیلیفونک رابطہ کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ اس سال ان شاء اللہ تعالیٰ اہلیہ اور عزیزی فوزان سلمہ بغرض حج سعودی عرب جائیں گے، دوران گفتگو ان کے لب ولہجہ سے ان کی ناسازیٔ طبع کا کوئی اشارہ بھی نہیں مل رہا تھا، انھوں نے میری کتاب پر اپنے تبصرے کا بھی ذکر کیا اور یہ بھی فرمایا کہ بعد از حج مدینہ منورہ میں کوئی کانفرنس ہونے والی ہے جس میں ان کی شرکت کی ان شاء اللہ تعالیٰ کافی توقع ہے۔ میں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ باذنہ تعالیٰ محترمہ بھابھی صاحبہ اور عزیزم فوزان سلمہ یہاں سعودی عرب میں خصوصاً مکہ مکرمہ میں اپنے قیام کے دوران آپ کی رفاقت کی کمی محسوس نہیں کریں گے اور میں ان کی خدمت کو اپنے لئے باعثِ شرف وسعادت سمجھوں گا۔ اس وجہ سے جب مجھے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو بغرض علاج دہلی منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ وہاں کے کسی اسپتال میں داخل بھی ہو گئے ہیں، تو اس اطلاع سے کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی۔

ابتداءً میں ڈاکٹر فوزان سلمہ سے رابطہ میں رہا، مگر بیماری کی نوعیت اور اس کی سنگینی سے متعلق ان سے تشفی بخش معلومات نہ ملنے پر میں نے برادر مکرم ومحترم جناب مولانا مظہر احسن صاحب حفظہ اللہ سے رابطہ کیا، آپ نے بھی اس سلسلے میں اگرچہ بعض تحفظات سے کام لیا، لیکن دبے لفظوں میں گویا یہ بھی بتا دیا کہ:

یوں تو وہ مالک ہے چاہے ڈال دے تنکے میں جان
ورنہ اب حالت تیرے بیمار کی اچھی نہیں

پھر جس تیزی سے حالات میں تبدیلی ہوئی اس نے دل میں خوف پیدا کر دیا اور بالآخر وہ گھڑی آ گئی جس نے ۴۵ برسوں پر ممتد اس دنیوی رفاقت کا خاتمہ کر دیا، میں مولانا مظہر احسن ازہری حفظہ اللہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے پل پل کی خبریں دیتے رہے، اور آخر میں جنازے کے کوائف سے بھی مطلع کیا۔

انتقال پر ملال کے بعد جامعہ سلفیہ بنارس کے ترجمان ''محدث'' کے گرامی قدر مدیر کا گرامی نامہ موصول ہوا تھا جس میں ڈاکٹر مقتدیٰ صاحب رحمہ اللہ پر خصوصی نمبر نکالنے کی اطلاع دیتے ہوئے یہ طلب کیا گیا تھا کہ میں اس کے لئے اپنے تاثرات پر مشتمل کوئی مضمون تحریر کر کے

بھیجوں، میرے اوپر ان کی رحلت کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ چاہتے ہوئے بھی میں کوئی مضمون نہ لکھ سکا، جس پر معذرت خواہ ہوں۔

ابھی چند دنوں قبل برادر مکرم ومحترم جناب مولانا مظہر احسن صاحب حفظہ اللہ سے ٹیلیفون پر طویل گفتگو ہوئی اس کے دوران مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جامعہ عالیہ عربیہ مئو کا بھی کوئی آرگن ہے اور وہ بھی خصوصی نمبر نکالنا چاہتا ہے، مظہر صاحب نے مجھے حکم بھی دیا کہ میں ڈاکٹر ازہریؒ کے بارے میں اپنے تاثرات لکھ کر بھیجوں۔

۱۹۶۴ء میں ہندوستان سے مصر کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل تک میں برادر محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ سے واقف نہیں تھا، ان کے علاوہ برادر مکرم ومحترم ڈاکٹر عبدالعلی صاحب حفظہ اللہ سے بھی واقف نہیں تھا، البتہ اتنا یاد پڑتا ہے کہ مصر کے سفر کی تیاریوں کے سلسلے میں دہلی جاتے ہوئے ٹرین میں یوں ہی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے سرسری سی ملاقات ہوگئی تھی۔ رہے محترم مولانا مظہر احسن ازہری صاحب تو ان سے ۱۹۵۹ء سے تعلق ہے اور وہ اس طرح کہ وہ اسی سال فیض آباد کے مشہور قصبہ ٹانڈہ کے ''کنز العلوم'' نامی مدرسہ میں بغرض تعلیم داخل ہوئے تھے، جہاں میں پہلے سے پڑھ رہا تھا، مظہر صاحب مجھ سے درجہ میں اونچے تھے عمر اور علم دونوں میں ان کی فوقیت میرے اور ان کے درمیان ایک دیوار نہیں رہی اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور زندہ دلی سے وہ مدرسہ کے اساتذہ اور طلباء دونوں میں ہر دل عزیز ہوگئے۔ جب وہ تعلیم مکمل کر کے مئو واپس چلے گئے تو ان سے کوئی تعلق باقی نہ رہا، لیکن دو تین سال بعد جب میں سرائے میر کے ''مدرسۃ الاصلاح'' سے جاتے ہوئے اعظم گڈھ سے گزرا تو ٹرین کے اسی ڈبہ میں مظہر صاحب سوار ہوئے جس میں میں موجود تھا، اس وقت میرے اوپر ''اکزیما'' کا شدید حملہ ہو چکا تھا اور سوجن اور دانوں سے میرا چہرہ کافی بھیانک ہو گیا تھا، مظہر صاحب نے مجھے پہچان لیا میرے ''اچھوت'' بن جانے کے باوجود مجھے گھر لے گئے اور اپنے حسن سلوک سے میرے اوپر جو اثر ڈالا وہ میرے لوح قلب پر اب تک نقش ہے۔

ڈاکٹر مقتدیٰ صاحب، مولانا مظہر صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مجھ سے پہلے قاہرہ پہونچ گئے تھے میرے پہنچنے کے بعد وہاں ایک ایسی جماعت بن گئی جس کے باہمی ربط وتعلق میں کوئی فتور پیدا ہونے کے بجائے مرور زمانہ سے مزید پختگی اور متانت پیدا ہوتی گئی اور الحمد للہ تادم تحریر یعنی ۴۵ سال سے یہ ربط وتعلق محبت وخلوص کے ساتھ قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی رحلت غیر صلبی بھائیوں کے اس گروپ سے ایک تجربہ کار اور مدبر عنصر کم ہوگیا۔

ہم چاروں بھائیوں، دوستوں اور اگر تعبیر صحیح ہو تو چار درویشوں میں ڈاکٹر صاحب علم وفضل اور معاملہ فہمی اور انسانی تجربات میں چونکہ بڑے تھے اس لئے ان کے ساتھ معاملات اور برتاؤ میں اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا جس کے وہ بجا طور پر مستحق بھی تھے، خصوصیت کے ساتھ میں اپنی گھریلو تربیت کے نتیجے میں ان کا اس طرح احترام کرتا تھا جس طرح بڑے بھائی کا احترام کیا جاتا ہے اور عام محفلوں میں جب بڑے چھوٹے کا معیار قائم نہیں رہتا، میں کوشش کرتا تھا کہ ان کی جو حیثیت پہلے دن قائم ہوگئی تھی وہ متاثر نہ ہو، حتی کہ یہاں جدہ میں بھی آخری ملاقات تک میں ان کے اور اپنے درمیان ادب واحترام کی ایک حد قائم رکھتا تھا ایسا

بھی ہوا کہ وہ "رابطة العالم الاسلامي" مکہ مکرمہ کی دعوت پر جدہ پہنچے اور وہ بھی رات میں، مگر ان کو لینے کے لئے ایرپورٹ پر کوئی نہیں، انھوں نے مجھے ٹیلیفون کیا تو میں فوراً ایرپورٹ گیا اور ان کو لے آیا اور اس کو اپنے لئے سعادت باور کیا۔

قاہرہ میں ڈاکٹر صاحب کا قیام زیادہ طویل نہ رہا۔لیکن انھوں نے اس قیام سے بھرپور استفادہ کیا، عربی زبان بولنے اور لکھنے میں کافی مہارت پیدا کرلی تھی جس میں مسلسل ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ ان کی عربی تحریروں سے عجمیت بالکل غائب ہوگئی جس کے شاہد ان کے وہ اداریے ہیں جو وہ ''صوت الامة'' میں لکھتے تھے۔

قاہرہ میں قیام کے دوران ان کے لئے پیسہ کمانے کے بہت سے مواقع آئے لیکن یہ ان کی فطرت کے خلاف تھی یا محض پیسہ کمانا ان کا مقصد نہیں تھا، اسی وجہ سے جہاں وہ ہر میدان میں کامیاب رہتے وہیں اس سے کچھ سیکھ کر نکلتے۔

ازہر میں ایم۔اے کر لینے کے بعد ڈاکٹر صاحبؒ نے وطن واپسی کا فیصلہ کرلیا جو بڑا بروقت اور درست فیصلہ تھا اور ۱۹۶۸ء میں بنارس کی نوزائیدہ درسگاہ الجامعة السلفية کے تدریسی شعبہ سے وابستہ ہوگئے، جامعہ کے جن ارباب حل وعقد نے موصوف کو اپنی درسگاہ میں لینے کا فیصلہ کیا ان کا یہ قدم بڑا صائب تھا، کیونکہ اس نوزائیدہ درسگاہ کو ڈاکٹر صاحب جیسے صاحب علم وفضل اور وسیع النظر استاذ کی سخت ضرورت تھی اور خود ان کو بھی ایک ایسے علمی مرکز کی ضرورت تھی جہاں وہ اپنی علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرسکیں اور بعد کے حالات نے یہ ثابت کردیا کہ دونوں فریقوں نے بالکل صحیح قدم اٹھایا۔اس طرح الجامعة السلفية ایک مدرسہ بننے کے بجائے ایک اسلامی یونیورسٹی بن گئی جس سے فارغ ہونے والے طلباء میں ایسے باصلاحیت افراد پیدا ہوئے جو بحث وتحقیق کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

قاہرہ سے ان کے واپس جانے کے بعد ۱۹۷۰ء تک ان سے کوئی رابطہ نہیں ہوا اور نہ ان کے حالات ہی معلوم ہوئے اور اگر مجھے صحیح یاد ہے تو ۱۹۷۰ء کی آمد سے پہلے ہی مولانا مظہر احسن صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلی صاحب قاہرہ سے جاچکے تھے۔اول الذکر سعودی عرب میں تدریس کے شعبہ سے منسلک ہوگئے تھے اور آخر الذکر کو نائیجیریا کی احمد وبیلو اسلامی یونیورسٹی میں پروفیسرشپ کی ملازمت مل گئی تھی۔

دوسرا دن جمعہ کا تھا ڈاکٹر صاحب صبح سویرے ہی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے والد ماجد اور بھائیوں کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے ان کی پریشانیاں بجا تھیں، اس طرح ڈاکٹر صاحب کے وجود نے ماحول کو بیحد خوشگوار بنادیا اور انھوں نے نیز دوسرے احباب نے ناشتہ اور دوپہر کے کھانے کا جس طرح پرتکلف انداز میں اہتمام کیا اس کی یاد اب تک باقی ہے۔

۱۹۷۴ء میں جب ریڈیو جدہ کے شعبہ اردو میں میری تقرری ہوئی اس وقت مظہر صاحب سعودی عرب ہی میں تھے، لیکن جدہ سے کافی فاصلے پر واقع حائل میں تھے اس لئے بروقت تو ملاقات ممکن نہ تھی، البتہ تعطیلات میں وطن جاتے ہوئے جدہ میں ملاقات ہوئی اور وطن سے واپسی پر بھی ملاقات ہوئی، بلکہ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، ادھر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب بھی نائیجیریا سے جدہ کی

کسی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے، ملاقات ہوئی اور پھر یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بات خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی جو صلاحیت بخشی تھی وہ قابل رشک تھی، میں بسا اوقات جدہ یا مکہ مکرمہ میں ان کے دوروں کے موقع پر ان کے ساتھ رہا ہوں اور متعلقہ افراد سے ان کی گفتگو سنی ہے وہ نہایت ادب سے اور شستہ اسلوب میں اپنی بات پیش کرتے تھے جس کا سننے والوں پر اچھا اور خوشگوار اثر پڑتا تھا انداز میں مومنانہ تواضع کے ساتھ خود اعتمادی کا عنصر بھی شامل ہوتا، عام مجلسوں میں بحث ومباحثہ کے موقع پر وہ جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے نہایت سنجیدگی اور ٹھہراؤ کے ساتھ اپنی بات یا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے تھے، میرے خیال میں ان کی کامیابی کا بہت بڑا راز اسی امر میں مضمر تھا کہ وہ تصادم اور اشتعال انگیزی کے بجائے تسامح اور رواداری کی صفت سے متصف تھے۔

بدقسمتی سے میں نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے چاہے یہ ترجمہ ہو یا تصنیف، انھوں نے کئی بار اپنی تصنیفات جامعہ سلفیہ کی بعض مطبوعات کے ساتھ بھیجیں تو ضرور مگر یا تو وہ ضائع ہوگئیں یا واپس چلی گئیں جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، جو کتابیں ضائع ہوگئیں وہ میرے خیال میں محکمۂ ڈاک میں کام کرنے والے ہموطن اور ہم زبان "رقیبوں" کو پسند آ گئیں۔ آخری چند سالوں میں "صوت الامۃ" کے شمارے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تھے جن میں ادب کی چاشنی اور فکر کی بلندی ہوتی تھی۔

ڈاکٹر مقتدیٰ رحمہ اللہ بحیثیت استاذ جامعہ سلفیہ سے وابستہ ہوئے تھے اور رئیس الجامعہ کی حیثیت سے وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ۴۱ سالوں پر پھیلی ہوئی ان کی یہ طویل خدمات یقیناً بہت سے ہنگاموں، طوفانوں اور اتار چڑھاؤ سے گزری ہوں گی، کتنے لوگوں نے ان سے اور ان کے طرز تعلیم سے اختلاف کیا ہوگا، کتنے لوگوں پر ان کی کامیابی بجلی بن کر گری ہوگی، کتنے لوگوں نے ان کی دانستہ یا نادانستہ غلطیوں کو اچھالا ہوگا اور کتنے لوگ ان کے درپۓ آزار رہے ہوں گے اور ان کو وہاں سے ہٹانے کے لئے سازشیں کی ہوں گی، مگر ان سب کے باوجود ان کا نہ صرف اپنے مرکز پر جمے رہنا، بلکہ نہایت خوبی کے ساتھ اپنے نصب العین پر عمل پیرا رہنا اور مسلسل ترقی کرتے رہنا اگر کسی چیز پر دلالت کرتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ مستقل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ حالات سے نبرد آزما ہونے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے اور ان کی منزل ان کے سامنے اس قدر واضح تھی کہ وہ ناسازگار حالات سے کبھی ٹکراتے ہوئے اور کبھی ان کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور اللہ کی توفیق اور فضل سے ان کی راہ میں حائل ہونے والے کنارے لگتے گئے، اس طرح جامعہ سلفیہ پر وہ اپنی ایسی گہری چھاپ لگا کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں کہ اس کو مٹانا کسی کے بس میں نہیں ہے،

اور جاتے جاتے میری کتاب پر مفصل تبصرہ کرکے مجھے جس طرح زیر بار کردیا ہے اس کا صلہ دینا تو درکنار، بذریعہ الفاظ ان کا شکریہ ادا کرنے سے بھی میں عاجز ہوں، البتہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے حسنات اور نیکیوں کو شرف قبولیت سے نوازے اور ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ آمین۔



پروفیسر اظہر حسن
پرنسپل، محمدیہ طبیہ کالج، منصورہ، مالیگاؤں

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بڑے بھیا۔۔۔۔۔۔مقتدیٰ حسن ازہری

مایہ ناز طبیب، مجتہد و عالم ابن رشد کے تعلق سے مورخین رقم طراز ہیں کہ وہ نہایت محنتی شخص تھا اور کبھی تھکتا بھی نہیں تھا، اس کی پوری زندگی میں صرف دو راتیں ایسی گزری تھیں جس میں اس نے مطالعہ نہیں کیا۔ ایک وہ رات جب اس کی شادی ہوئی تھی اور دوسری وہ جس میں اس کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ ٹھیک اسی چیز کو ہم لوگوں نے عملی شکل میں بھیا کے اندر دیکھا۔ عام گھریلو ماحول ہو، شادی کا جشن یا تہواروں کی خوشیاں ہوں، گاؤں اور محلہ کی فضا مکدر ہو، فساد اور کرفیو کا زمانہ ہو یا ماتمی حالات، لیکن بھیا کے قلم و قرطاس کے مشغلے کو کبھی ان چیزوں سے متاثر ہوتے نہیں دیکھا۔ شدید گرمی کے دنوں میں بس یہی کہتے تھے کہ لائٹ نہ رہنے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوتی مگر آرام کے وقت تو لائٹ رہنا ہی چاہئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں طالب علم ہونے کا خواب کس کا نہیں ہوتا لیکن جب بھیا جامعہ ازہر میں زیر تعلیم تھے تو گھر کے بچے بھی اپنے آپ کو وہیں کا طالب علم تصور کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ بھیا اپنے خطوط میں یونیورسٹی کے شب و روز کی عکاسی کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو محسوس ہوتا کہ ہم بھی ان کے ساتھ ہیں اور پھر یقیناً یہ خواہش ہوتے دیر نہیں لگتی تھی کہ ہمیں بھی وہیں پڑھنا ہے۔ ۲۳/مارچ ۱۹۶۳ء بھیا کی مئو سے قاہرہ کی روانگی طے پائی تھی جس کے پہلے کی کچھ باتیں اب بھی ذہن کے پردے پر موجود ہیں جنہیں میں الفاظ کی شکل میں قرطاس کے حوالے کرنا چاہوں گا۔ جب بھیا نے والد محترم مرحوم (حاجی محمد یاسین بن محمد سعید) سے کہا کہ ابا میں تعلیم کی غرض سے مصر جانا چاہتا ہوں تو والد صاحب نے جو یقیناً ایک بڑے مگر غریب خاندان کو چلانے کے ذمہ دار تھے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ کتنا خرچ آئے گا؟ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ اس وقت بھیا نے ۱۳۰۰ روپیہ بتایا تھا جس میں ۵۰۰ روپیہ بحری جہاز کا کرایہ بھی شامل تھا۔ اس پر والد محترم کا جواب تھا کہ یہ میری استطاعت سے باہر ہے۔ اس کے بعد بھیا نے یہ کہا کہ ٹھیک ہے آپ جتنے روپیوں کا انتظام کر سکتے ہیں اتنا ہی کر دیجئے، میں اس میں جتنی دور تک جا سکوں گا جاؤں گا اور وہاں کچھ کام کرنے کے بعد پھر مزید آگے بڑھوں گا۔ حصول تعلیم کا یہ جذبہ دیکھ کر والد محترم نے قرض لے کر پورے پیسے کا انتظام کر دیا تھا اور اس کار خیر میں جو لوگ شریک تھے ان میں ابوالکلام چچا، اور مشتاق احمد مشین والے مرحومین کے نام شامل ہیں اور بھیا ہمیشہ ان

لوگوں کا حد درجہ احترام کرتے رہے اور ان کے اس احسان کو زندگی بھر یاد بھی رکھا۔ والدہ مرحومہ (بلقیس نعمان بنت مولانا محمد نعمان) کے بیان کے مطابق آپ نے مئو کے تعلیمی دور میں "المنجد" عربی لغت خریدنے کے لئے صرف ۲۰ روپیہ لیا تھا اور باقی نصابی کتابیں یا تو اپنے ہم جماعت ساتھیوں سے لے کر پڑھ لیتے تھے یا پھر ان کی نقل اتار کر اسے محفوظ کرلیا کرتے تھے جو آج بھی ان کی کتابوں کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔

بھیا کو جب ازہری سے علیگ ہونے کا شرف حاصل ہوا تو اب ہم لوگ جامعہ ازہر کی خواہش چھوڑ کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھنے کا خواب سجانے لگے جس کی تکمیل بھیا کی رہنمائی اور ان کی حوصلہ افزائی کے طفیل ۱۹۷۸ء میں ہوئی۔ پہلی مرتبہ علی گڑھ روانگی کے لئے بھیا مجھے بنارس اسٹیشن چھوڑنے بھی آئے اور میری مکمل رہنمائی بھی فرمائی۔ علی گڑھ میں ایسے بے شمار لوگ ملے جو یہ کہہ کر مجھے گلے لگا لیتے تھے کہ میں ازہری صاحب کا بھائی ہوں۔ ایک شخصیت جن سے کافی عرصہ بعد ملاقات کا شرف حاصل ہوا حالانکہ ان کی علمی شہرت کے باعث میں غائبانہ طور پر ان سے متعارف تھا جو ہر جمعہ کو جامع مسجد سرسید ہال میں نہایت ہی موزوں و متوازن، پر اثر و پر معلومات اور طلباء کے ذہنوں میں جاگزیں ہونے والا خطبہ دیا کرتے تھے اور اس وقت پوری یونیورسٹی برادری ان کی تبحر علمی کی قائل اور قتیل تھی۔ سادگی ایسی کہ آج کل کے عربی مدارس کے فارغین میں بھی ناپید ہوا کرتی ہے، زبان ایسی کہ یونیورسٹی میں شاذ و نادر ہی سننے کو ملا کرتی تھی، بڑے بڑے پروفیسرس کو ان کے سامنے دوزانو بیٹھے دیکھا لیکن ایسی لائق مرتبت شخصیت کو بھی ازہری صاحب کی علمیت کا قائل اور گرویدہ پایا۔ چنانچہ اپنے پندرہ روزہ رسالہ "احتساب" میں بھیا کے تعارف میں وہ کچھ اس طرح سے رقم طراز ہیں کہ" یونیورسٹی میں بڑے بڑے پروفیسر کو وہ مرتبہ وعزت اور مقام حاصل نہیں ہے جو مقتدیٰ حسن ازہری کو ایک دینی مدرسہ میں حاصل ہے"۔ اور یہ شخصیت بلا شبہ مولانا تقی امینی صاحب کی تھی جن کا تعلق ازہری صاحب کے علی گڑھ چھوڑ دینے کے بعد بھی اتنا مضبوط رہا کہ آپ نے صرف بھیا سے ملاقات کی غرض سے بنارس اور مئو کا سفر کیا اور پھر یہ سلسلہ یوں تاریخی بنا کہ ازہری صاحب نے تقی امینی صاحب کی کتابوں کو عربی قالب عطا کیا اور اس طرح ایک ہندستانی مفکر اسلام کی فکر عرب ممالک تک جا پہنچی اور لوگ ان سے روشناس و فیض یاب بھی ہوئے۔ دوسری مشہور شخصیت ڈاکٹر مختار الدین آرزو صاحب کی تھی جو کہ اس وقت شعبہ عربی کے صدر تھے اور ازہری صاحب کے استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پی۔ ایچ۔ ڈی مقالہ کے نگراں بھی تھے اور یقیناً موصوف کا شمار اس وقت یونیورسٹی کی قد آور شخصیات میں ہوتا تھا۔ موصوف نے بھیا کو ایک خط بڑے افسوس اور درد کے ساتھ لکھا تھا کہ" مقتدیٰ تم لیکچرر کے انٹرویو میں میرے انتہائی اصرار کے بعد بھی نہیں آئے لہٰذا اس پوسٹ پر تمہارے بعد جس کا تقرر ہونا تھا ہو گیا"۔ مرکزی یونیورسٹی کی ایک اعلیٰ ملازمت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک مدرسے کے اندر تدریسی فریضہ کی ادائیگی کو ترجیح دینا شاید ازہری صاحب کی ایک ایسی قربانی تھی جس کی مثال

شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔

جامعہ سلفیہ کے چالیس سالہ تدریسی و انتظامی دور کے بارے میں تو مجھے زیادہ علم نہیں ہے اور نہ ہی میں اس تعلق سے کسی چیز پر روشنی ڈالنا مناسب سمجھتا ہوں البتہ ایک مثالی واقعہ کو ضبط تحریر میں لانا ضروری سمجھتا ہوں جو اقرباء پروری سے اوپر اٹھ کر آپ کی انصاف پسندی کا غماز ہے۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ ۱۹۸۲ء میں ازہری صاحب کچھ دنوں کے لئے بیرون ہند سفر پر تھے کہ اسی اثنا طلباء کے مختلف مطالبات جس میں کھانا پانی اور اسی قسم کے دوسرے مسائل جو عام طور پر اداروں میں وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں کو لے کر جامعہ کی فضا مکدر ہوگئی جس کے طفیل طلباء یونین کی تشکیل بھی عمل میں آئی اور ساتھ ہی ان کے مطالبات اور احتجاج نے تشدد کی شکل اختیار کر لی، حالانکہ موجودہ ذمہ داران اور منتظمین جامعہ نے جملہ مسائل کو حل کرنے کی حتی المقدور کوشش بھی کی لیکن ناکامی کی صورت میں بالآخر جامعہ کو پندرہ دنوں کے لئے بند کر کے ہاسٹل بھی خالی کرانا پڑا۔ اسی دوران ازہری صاحب کی وطن واپسی ہوئی اور آتے ہی انہوں نے موجودہ بحران سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک تاریخ ساز فیصلہ صادر فرمایا جو یقیناً ان کی انتظامی صلاحیتوں اور ان کے کام کرنے کے طریقوں پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے اور جو لوگ مستقل ان کے ساتھ رہے ہیں وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ موصوف اکثر و بیشتر اس قسم کے فیصلے صادر فرمایا کرتے تھے۔ ازہری صاحب نے ان تمام ہی طلباء کے اخراج کا حکم صادر فرمایا جو اس تحریک کے روح رواں تھے اور جنہوں نے علم بغاوت بلند کر کے اس دینی ادارہ کے تشخص کو داغدار کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے روحانی ماحول کو سبوتاژ کرنے کی مذموم کوششیں کی تھیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ اخراج کردہ طلباء کی فہرست میں ان کا اپنا سگا بھانجا بھی شامل ہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے اس وقت منتظمین جامعہ نے آپ سے اس فہرست پر نظر ثانی کی درخواست بھی کی تھی مگر آپ نے اپنے اس فیصلے میں رشتوں کی کمزوریوں کو آڑے نہیں آنے دیا اور جوں کا توں نافذ کر کے نہ صرف یہ کہ اس ادارہ کی عظمت رفتہ کو بحال کیا بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے سامان عبرت بھی فراہم کیا۔

یہ تمام باتیں دل و دماغ میں نقش تھیں اور جب ۱۵/اکتوبر کو یہ خبر ملی کہ بھیا کی طبیعت ناساز ہے تو یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ طبیعت کی ایسی خرابی ہو سکتی ہے جس سے جانبر ہونا ممکن نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایک چیز آگے بڑھتی گئی اور مختلف جدید تشخیصی آلات اور طبی جانچ سے یہ بات واضح ہوتی گئی کہ ازہری صاحب کا مرض جان لیوا ہے۔ بیماری کے ظہور سے کچھ مہینہ قبل آپ نے فون پر کچھ طبی مشوروں کے لئے مجھ سے بات کی تھی کہ رپورٹ میں یورک ایسڈ بڑھا ہوا ہے حالانکہ فی زمانہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ اس پر فکرمندی لاحق ہوتی اور پھر کچھ عرصہ بعد دوبارہ بات چیت سے اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ اب یورک ایسڈ نارمل ہو گیا ہے لیکن جب بنارس میں ڈاکٹروں نے کسی قسم کے سلعہ کا خدشہ ظاہر کر کے انہیں دہلی لے جانے کا مشورہ دیا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یقیناً ڈاکٹروں نے سلعہ خبیثہ تشخیص کیا ہوگا۔ ازہری صاحب جو

صحت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے اور اس کی مضرت و منفعت ہمیشہ ان کے پیش نظر ہوا کرتی تھی معمولی سے معمولی مرض میں بھی وہ مکمل پرہیز کے قائل تھے اور مضر اشیاء سے خود بھی بچتے تھے اور اہل خانہ و خاندان کو بھی ان سے بچنے کا مشورہ، ترغیب اور تاکید کیا کرتے تھے، کب اور کس موسم میں کیا کھانا چاہئے اور کن چیزوں سے پرہیز ضروری ہے اس سلسلہ میں وہ کسی طبیب سے کم معلومات نہیں رکھتے تھے۔ اور مزید یہ کہ ڈاکٹروں کی بتائی ہوئی ایک ایک چیز پر کاملاً عمل پیرا ہونا ان کے معمولات میں شامل تھا۔ چونکہ بھیا بذات خود بلند عزم و حوصلہ اور مضبوط قوت ارادی کے حامل انسان تھے اس لئے صحت کی معمولی خرابیوں کو وہ موسمی اثرات پر محمول کر دیا کرتے تھے اور ایسی چیزوں سے ان کے روزمرہ کے مشاغل کو کبھی متاثر ہوتے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی ناسازی طبع کے باعث کبھی بستر علالت پر بغرض استراحت دیکھا گیا۔ جب میں نے بغرض خیریت انہیں فون کیا تو اطمینان کے ساتھ ان کا یہ کہنا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے بس پسلی کے مقام پر ہلکا سا درد ہے ان شاء اللہ افاقہ ہو جائے گا۔ بہر کیف دل کی آواز پر مالیگاؤں سے دلی کا سفر ہوا اور بترا ہاسپٹل میں قیام کے ایک مختصر سے وقفہ میں ماضی کا ایک طویل پس منظر نظروں کے سامنے آ گیا اور شروعات یہاں سے ہوتی ہے کہ جب ہم لوگ ابھی شعور کی حدوں سے باہر تھے تو بھیا اس وقت مدرسہ عالیہ کے ایک طالب علم ہوا کرتے تھے۔ کسی امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں ان کا زیادہ تر وقت مدرسہ میں ہی گزرتا تھا اور دیر رات گئے گھر واپسی ہوا کرتی تھی۔ اس بات کا تذکرہ بھیا اکثر کیا کرتے تھے کہ میرے کچھ ساتھی مجھے مدرسہ سے گھر تک چھوڑنے محض یہ دیکھنے کے لئے آتے تھے کہ آپ کے والد محترم صرف پیروں کی آواز سے کیسے بیدار ہو جاتے ہیں؟ جس کا تجربہ بعد میں ہم سبھی لوگوں کو بھی ہوا کہ جب ہم سفر سے کبھی بھی اور کسی بھی وقت گھر پہنچتے تو اس بات سے بے نیاز و بے پرواہ ہوا کرتے تھے کہ دروازہ کون کھولے گا۔ اور کتنی دیر لگے گی؟ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ والد صاحب اپنے بچوں کے لئے رات گئے تک جاگتے رہتے تھے لیکن کبھی بھی انہوں نے یہ نہیں کہا کہ تم لوگ گھر جلدی آیا کرو اور شاید ازہری صاحب والدین کی انہی سب قربانیوں کا نتیجہ تھے۔

مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ اور بھیا کا آپسی تعلق تعلیم کے ابتدائی دور سے ہی رہا ہے جیسا کہ اکثر مولانا ذکر کیا کرتے تھے۔ جب ستمبر ۱۹۶۷ء میں بھیا قاہرہ سے ہندوستان واپس ہوئے تو مولانا نے آپ کو جامعہ سلفیہ بنارس کی خدمت کے لئے مختص کر لیا بعدہ جامعہ محمدیہ کے قیام اور پھر مئو میں مدرسہ البنات کلیہ فاطمۃ الزہراء اور عالیہ جنرل اسپتال کی شروعات نے دونوں کے ایک ساتھ کام کرنے کے عزم و حوصلہ کو مزید استحکام بخشا۔ اس سلسلہ میں مالیگاؤں جہاں قوم کی پسماندگی اور جہالت کو دیکھ کر مولانا کو کام کرنے کا ایک جذبہ سا پیدا ہو چکا تھا اور انہوں نے ازہری صاحب کو کئی مرتبہ مالیگاؤں آنے کی دعوت بھی دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مالیگاؤں ایک چھوٹا اور مسلم اکثریتی شہر تھا جہاں پر دینی تعلیم کی اشد ضرورت تھی تاکہ جہالت و لاعلمی کے خاتمہ کے ساتھ ساتھ قوم کو بیدار بھی کیا جا سکے، لہٰذا آپ دونوں حضرات کی جہد مسلسل اور مساعی جمیلہ کے

نتیجہ میں ۷۷۔۷۶ میں گولڈن نگر علاقہ میں جامعہ محمدیہ کا قیام اور افتتاح عمل میں آیا جو ۱۹۷۹ء میں منصورہ مالیگاؤں میں باقاعدہ طور پر منتقل ہوا۔اس موقع پر جب ازہری صاحب مالیگاؤں شہر کے اندر کہیں جا رہے تھے تو اس وقت فاطمہ بوا (دادا محمد سعید مرحوم صاحب کی پوتی اور ہارون فراز صاحب کی والدہ) جو شروع سے مالیگاؤں میں مقیم تھیں انہوں نے بھیا کو یہ کہہ کر آواز دیا کہ مقتدیٰ تم کہاں مالیگاؤں میں؟ بھیا کا بیان ہے کہ اس وقت میں اس بزرگ خاتون کو نہیں پہچان سکا لہٰذا انہوں نے نہایت ہی بے تکلف انداز میں خود ہی وضاحت کی کہ میں تمہاری پھوپھی ہوں۔۱۹۸۶ء میں بھیا کی مالیگاؤں دوبارہ آمد غالباً جمعیت اہل حدیث کی دعوت پر ہوئی تھی جب وہ جامعہ بھی تشریف لائے تھے اور اس وقت آپ دونوں حضرات کی کوششوں سے ماضی میں لگایا گیا یہ علمی درخت برگ وثمر سے مزین ہو چکا تھا۔مزید یہ کہ محمدیہ طبیہ کالج ۱۹۸۱ء میں قیام پذیر ہوکر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جانا دونوں معززین کے لئے فخر وانبساط کا باعث بنا۔میری موجودگی میں غالباً ۹۷۔۹۶ء میں بھیا کی مالیگاؤں آمد ایک اہم علمی کانفرنس کے تعلق سے ہوئی تھی جس میں مولانا نے آپ کو خصوصی طور پر مدعو کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ دینی مدارس کے تعلیمی نظام میں جدید نصاب کی شمولیت ہی اس کانفرنس کا موضوع تھا۔ازہری صاحب اگر چہ جدید نصاب کی شمولیت کے حامی تھے مگر اس وقت مولانا سے انہوں نے ایک سوال ضرور کیا تھا کہ ابھی مدارس اپنے بنیادی فرائض یعنی مذہبی تعلیم میں پختگی کو نہیں پہنچ سکے ہیں کیونکہ اگر ہم غور کریں تو آج بھی معاشرہ کے اندر ہمارے فارغین میں ایسے کتنے عالم ہیں جن پر ہم مختلف مسائل میں بھروسہ کر سکتے ہیں؟اور یقیناً یہ تعداد چند تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے لہٰذا اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس تعلق سے محنت اور فکر کی ضرورت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔اسی موضوع پر ۲۰ مئی ۲۰۰۷ء مؤ ناتھ بھنجن کے ایک پروگرام جس کا عنوان "فروغ تعلیم کے لئے ذہن سازی کا طریقہ" میں آپ نے جو مقالہ پیش کیا تھا اس کی چند سطور اس کی دلیل ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔۔۔۔۔

''ہماری گفتگو سے کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ ہم عصری تعلیم کے مخالف ہیں۔عصری علوم ہماری انسانی معاشرہ کی ضرورت ہیں اسی وجہ سے علماء اسلام نے اپنے عہد عروج میں صرف طبعی علوم کی آبیاری نہیں کی بلکہ ان میں قائدانہ کردار ادا کیا اور ضرورت کے مطابق علوم ایجاد کئے،عربی اور مغربی تہذیبوں کے باہمی تفاعل اور اخذ وعطا کے موضوع پر عرب دنیا میں جو کتابیں تصنیف کی گئیں ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سے معاملہ کی صحیح تصویر واضح ہوتی ہے۔سابقہ عہدوں میں ابن ندیم، حاجی خلیفہ اور طاش کبری زادہ نے اور جدید عہد میں بروکلمن اور فواد سزگین نے علوم سائنس میں مسلمانوں کی حصہ داری سے متعلق جن کتابوں کی نشاندہی کی ہے ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ماضی میں جس طرح مسلمانوں نے قرآن و حدیث سے متعلق علوم کی آبیاری کی اسی طرح طب و سائنس کے علوم میں بھی اپنی برتری ثابت کی،آج اسی ماضی سے سبق لے کر جدید علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کے میدان

میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے اور اس طرح آگے بڑھنے کی ضرورت ہے کہ مسلم قوم کی پسماندگی کا داغ پوری طرح دھل جائے۔ البتہ ذہن میں اس بات کو تازہ رکھنا ضروری ہے کہ دین اور علوم دین کی ترقی وتقویت کے بغیر ہماری ہر ترقی بے سود ہے۔ ہم دین و دنیا میں تفریق کے قائل نہیں لیکن دنیا کی ایسی ترقی جو ہمیں اپنے دینی ورثہ اور شناخت سے الگ کر دے ہمارے لئے گھاٹے کا سودا ہے۔ لہٰذا علوم شرعیہ اور عصریہ کی گفتگو میں دونوں نوعیت کے علوم کی ماہیت اور انسانی معاشرہ کے لئے ان کی ضرورت کے مسئلہ میں بصیرت اور کشادہ دلی سے بات کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے علمی میدان کی ہر رائے کا بیحد احترام ہے لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ اور رسولؐ نے جس چیز کے احترام کا پابند کیا ہے اسے مقدم رکھنا ضروری ہے'' (بحوالہ محدث، اگست ۲۰۰۷ء ص:۹)

یہ تو وہ اوقات ہوا کرتے تھے جب آپ مدبرین و اکابرین کے درمیان باتیں کیا کرتے تھے لیکن اس سے الگ جب آپ فرصت سے ہوتے تو شاگردوں کا ایک ہجوم آپ کے پاس ہوتا جو ازہری صاحب کی علمیت سے فیض یاب ہونے کی چاہت میں ہر وقت آپ کے ساتھ موجود ہوتا تھا۔ اسی موقع پر جامعہ کے ایک سینئر استاد سے جب ازہری صاحب نے یہ کہا کہ مولانا آپ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کیوں نہیں کرتے؟ تو حسب عادت استاد موصوف نے مختلف وجوہات بیان کر ڈالیں جس میں وسائل کی کمی، مدرسہ کا سیاسی ماحول، انتظامیہ کی عدم دلچسپی وغیرہ کا شکوہ تھا۔ اس پر ازہری صاحب کا جواب جو آج بھی مجھے یاد ہے یہ تھا کہ مولانا آخر آپ کے روزمرہ کے معمولات تو مکمل ہو ہی رہے ہوں گے جو کہ یقیناً اسی ماحول سے وابستہ ہیں تو پھر لکھنے پڑھنے جیسا نیک کام جس میں بلاشبہ اللہ کی مدد مسلم ہے کیوں نہیں ہو پاتا؟ بھیا کے اسی جملے نے نامساعد حالات میں مجھے کام کرنے کا ہنر و حوصلہ بخشا اور میں آج بھی اس پر عمل پیرا ہوں۔

سیمینار اور کانفرنسیز کا انعقاد میں ہمیشہ سے ازہری صاحب کی کوشش رہا کرتی تھی اور ریسرچ وتحقیق کو ان کے یہاں مرکزیت حاصل تھی۔ ان کے ذریعے ملی اسی سوچ نے مجھے محمدیہ طبیہ کالج منصورہ، مالیگاؤں میں گزشتہ سال ایک نیشنل کانفرنس کے انعقاد کا حوصلہ دیا جس کے بعد ہی مجھے یہ اندازہ ہوا کہ کانفرنس کے انعقاد کے لئے کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور کتنے لوگوں کی ناراضگی، تنقید اور مخالفت کے درمیان کام کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ دراصل یہی وہ مواقع بھی ہوا کرتے ہیں جب لوگوں کے خلوص و اخلاص نیز اپنے و پرائے پن میں با آسانی امتیاز وتفریق بھی کی جاسکتی ہے اور ایسے حالات میں کامیابی انہیں کے قدم چومتی ہے جو عملی زندگی کی آزمائشوں سے دل برداشتہ نہ ہوتے ہوئے ان تکالیف ومصائب کو محض اپنے ذوق جنوں کے لئے مہمیز کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور بلا شبہ ایسے لوگ ہی ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ مذکورہ کانفرنس کا اختصاریہ ازہری صاحب کے تاثرات سے مزین ہے جس میں انہوں نے کانفرنس کی کامیابی کے لئے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا ہے۔

''محمدیہ طبیہ کالج مالیگاؤں کی طرف سے یونانی ادویہ کے موضوع پر دو روزہ کانفرنس کی خبر سے بیحد خوشی ہوئی، اس کے لئے نیک خواہشات کے اظہار کو اور اس کی ہمہ جہت کامیابی کے لئے دعا کو میں اپنے لئے اعزاز کا باعث سمجھتا ہوں، اس کے عظیم و مخلص بانی محترم مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ کی فعال شخصیت اور ان کے قابل قدر کارنامے آنکھوں کے سامنے ہیں، مرحوم سے ۱۹۶۸ء سے میرا سابقہ تھا، انہوں نے بڑی لگن اور حوصلہ کے ساتھ محمدیہ طبیہ کالج قائم کیا اور اس کی تعمیر وترقی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا، ان کے دل میں اخلاص اور عزائم میں قوت تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے کالج کو بہت جلد نمایاں کامیابی عطا فرمائی، اس وقت کالج کی آبیاری کا فریضہ مرحوم کے خلف رشید مولانا ارشد مختار صاحب انجام دے رہے ہیں، موصوف ہی کی توجہ اور محنت نیز کارکن حضرات کے تعاون سے کالج میں مذکورہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جسے ہم علم طب کی اہم خدمت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں''۔

اس موقع پر مجھے شدت سے ازہری صاحب کی وہ تمام کوششیں اور جاں فشانیاں یاد آئیں جب کہ کانفرنس کی متعینہ تاریخ سے بہت پہلے ہی سے آپ کا گھر سے رشتہ مکمل طور پر منقطع ہو جایا کرتا تھا۔ رات یا دن میں ایک مختصر وقفہ کے لئے گھر تشریف لاتے تھے جب کہ والدہ مرحومہ متعدد بار یاد کیا کرتی تھیں کہ بابو ابھی تک نہیں آئے اور انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ دیر رات گئے تک جاگتے ہوئے ان کا انتظار کرنا اور پھر رات کے آخری پہر بھیا کی آمد پر اماں کی یہ آواز کہ بابو کھانا کھا لیجئے اور بھیا کا یہ جواب کہ نہیں اماں میں نے تھوڑا کھا لیا ہے اب نہیں کھاؤں گا۔ اور یہ سلسلہ مہینوں تک چلتا تھا تب کہیں جا کر کانفرنس منعقد ہوتی تھی جس کے بعد تنقیدوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا کیونکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوا کرتے تھے جو صرف منفی پہلوؤں کی خاطر ہی کانفرنس میں شرکت کرتے تھے۔

ازہری صاحب کا رعب و دبدبہ، عزت و وقار گھر کے افراد سے لے کر باہر مدرسہ، محفل اور یونیورسٹی ہر جگہ عیاں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عجیب شان و مرتبہ عطا کیا تھا اور خاص چیز یہ تھی کہ کبھی بھی آپ کو کسی کو ڈانٹتے یا لعن طعن کرتے نہیں سنا مگر سامنے والے پر اثر ایسا ہوتا تھا جو ایک لمبی چوڑی تقریر و تنبیہ کے بعد بھی نہیں ہوا کرتا۔ اس سلسلہ میں بنارس کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو کچھ اس طرح سے ہے کہ ڈاکٹر سہیل انصاری مئو سے بنارس آئے ہوئے تھے اور وہ بڑے بھائی عبدالرحمٰن انصاری اور راقم السطور دونوں سے کہیں جانے کا اصرار کر رہے تھے لیکن ہم لوگوں نے بھیا کے ممکنہ خوف کے باعث جانے سے انکار کر دیا اس پر ڈاکٹر موصوف کہنے لگے کہ آخر تم لوگ اپنے بھیا سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟ چلو میرے ساتھ۔۔۔۔ بہر کیف ہم لوگ ان کے ساتھ ہو لئے اور واپسی دوپہر بعد ہوئی۔ اس وقت بھیا جامعہ سے واپس آ گئے تھے اور ان دنوں آپ کا قیام جامعہ رحمانیہ باگڑبلی میں اوپری منزل پر ہوا کرتا تھا اور نیچے رحمانیہ میں مدرسہ چلتا تھا۔ گھر پہنچنے پر ہم لوگوں نے ڈاکٹر سہیل سے یہ کہا کہ آپ ہی دروازہ کھلوائیے لہٰذا انہوں نے دروازہ پر دستک دی۔ اوپر سے ایک تار کے ذریعے دروازہ

کی کنڈی کھولنے کا نظم تھا لہٰذا بھیا نے کھٹ سے دروازہ کھولا اور سامنے ڈاکٹر سہیل سے ان کی ایک نظر ملی اور آپ اندر چلے گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر موصوف کا یہ بیان کہ واقعی ازہری صاحب سے نظر ملنے کا بعد میرے اندر خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور اب یہ بات پوری طرح سے میری سمجھ میں آ گئی کہ تم لوگ کیوں ان سے اتنا ڈرتے ہو۔ یہ وہ اثر تھا جو سامنے والا ازہری صاحب کے تعلق سے محسوس کیا کرتا تھا۔

ازہری صاحب صبر وضبط اور شکر خداوندی کا ایک مکمل پیکر تھے جس کا اندازہ پہلے سے ہم لوگوں کو تھا لیکن بترا ہاسپٹل میں قیام کے دوران ان کے صبر و ضبط اور تحمل و تشکر کا مزید مشاہدہ ہوا۔ اسپتال ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں پر مریض کی یہ خواہش ہوا کرتی ہے کہ کوئی اس کی خیریت پوچھے اور اس کو تسلی وسہارا دے، وہیں تیماردار بھی اس بات کا متمنی ہوا کرتا ہے کہ اسے بھی کچھ خدمت کا موقع نصیب ہو لیکن ایسے وقت میں بھی ازہری صاحب جو کہ یقیناً بستر سے اٹھنے میں تکلیف محسوس کرتے تھے اور جیسے ہی ہم لوگ انہیں سہارا دینے کی کوشش کرتے تو وہ فوراً ہاتھ کے اشارہ سے ہم لوگوں کو روک دیا کرتے تھے اور اس پر نہ تو کوئی شکایت اور نہ ہی کسی قسم کی ناشکری کا اظہار۔ یہ حقیت ہے کہ شخصیات کے اثرات نادانستہ طور پر عیاں ہو جاتے ہیں نہیں تو آخر کیا وجہ تھی کہ بترا ہاسپتل کا بڑا ڈاکٹر نمناک آنکھوں سے انہیں الوداع کہتا ہے اور سلطانپور کے قریب برادران وطن کی اچھی خاصی تعداد رو پڑتی ہے حالانکہ ان سے ازہری صاحب کی نہ تو کوئی قربت تھی اور نہ ہی کوئی شناسائی۔ ازہری صاحب کا رہائشی مکان جہاں سے روڈ تک آنے میں ایک گلی پڑتی ہے اور گلی کے آخری حصے پر ایک برادر وطن کا مکان پڑتا ہے۔ ازہری صاحب کے متعلق وہ اپنے تاثرات کچھ یوں بیان کرتا ہے کہ وہ بہت ہی نیک اور اچھے انسان تھے۔ جب ان کا گھر تعمیر ہو رہا تھا تو وہ یہاں پر موجود نہیں تھے مگر گھر کی تعمیر کے بعد جب ان کا آنا ہوا تو مجھ سے انہوں نے کہا کہ میرے گھر کی تعمیر میری غیر موجودگی میں ہو رہی تھی اور تعمیراتی سامان آپ کے دروازہ سے ہو کر گزرتا رہا ہوگا لہٰذا آپ کو کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہوئی؟ یہ ہوتا ہے بڑے لوگوں کا وطیرہ جو کہ اوروں کے لئے سبق آموز ہوا کرتا ہے۔

ارشد مختار صاحب اپنے بچپن کا ایک واقعہ یوں پیش کرتے ہیں کہ جب ہم لوگ اپنے آبائی مکان مرزاہادی پورہ مئو میں رہائش پذیر تھے اور ازہری صاحب ابا سے ملنے آتے تھے تو کئی مرتبہ دروازہ مجھے ہی کھولنے کا اتفاق ہوا اور جب والدہ محترمہ مجھ سے یہ پوچھتی تھیں کہ بیٹا کون ہے تو میری زبان سے بیساختہ جو لفظ نکلتا تھا وہ یہ کہ اماں "فرشتے" آئے ہیں۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک فرشتے کی جو تصویر ثبت تھی آپ کو دیکھ کر لگتا تھا کہ آپ ہی جیسے ہوتے ہوں گے۔

بھیا کی تدفین کے بعد چند روز تک میرا مئو میں قیام رہا اور اس دوران تعزیت کا ایک لا متناہی سلسلہ بھی جاری رہا۔ ہند اور بیرون ملک ہر جگہ سے تعزیتی پیغامات سوگواروں کی جانب سے مسلسل موصول ہو رہے تھے جن میں سے کچھ تعزیتی کلمات تو یقیناً دل و جان کو جھنجھوڑنے

والے ہوتے تھے۔ جب مولانا مظہر احسن ازہری صاحب نے ہم لوگوں سے تعزیتاً یہ کہا کہ ازہری صاحب آپ لوگوں کے والد بھی تھے"۔ تو نہ جانے کیوں عہد طفولیت سے لے کر اس وقت کے تمام لمحات و واقعات ایک ایک کر کے نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے، بچپن جہاں ہوش وحواس کی باتیں نہیں تھیں تب بھی ایک مشفق بھائی اور ایک ذمہ دار سرپرست کے رول میں انہیں دیکھا اور پھر ہوش سنبھالنے کے بعد گھر سے لے کر مدرسہ، کالج اور یونیورسٹی یہاں تک کی ملازمت اور نہ جانے کتنے معاملات اور مسائل میں ازہری صاحب ہی حرف آخر ہوا کرتے تھے۔

مولانا ارشد مختار صاحب نے آپ کے گھر پہنچنے کے بعد جب یہ کہا کہ سمجھ میں نہیں آتا کس سے تعزیت کے الفاظ کہے جائیں، کسے تسلی دی جائے اور کس کو صبر کی تلقین کی جائے۔ خود سے تعزیت کروں، ان کی اولادوں ورشتہ داروں سے تعزیت کروں یا پھر اپنے آپ کو تسلی دوں حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم تمام لوگ ہی یتیم ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ جمعیت، مدارس اور قوم سب ہی ایک سچے اور بے لوث خادم دین وملت سے محروم ہو گئی ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

بجھ بھی گیا تو کیا، شب فردا کا ہوں چراغ
اک روشنی، طرف بہ طرف چھوڑ جاؤں گا
(فضا ابن فیضی)

اسلام کے دائمی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے

''بین الاقوامی سطح پر اس وقت انسانی معاشرہ جس ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار ہے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم صرف اپنے ملک کے حالات پر نظر ڈالیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہمارا ملک امن وشانتی، نظم وضبط، تہذیب وتمدن اور اعلیٰ اخلاق وکردار کے لئے مشہور تھا، لیکن آج یہی ملک قانون وانتظام اور انسانی اقدار کی پامالی میں سرفہرست ہے۔ نفرت وعداوت، ظلم وبربریت، عناد وعصبیت اور فحاشی وبداخلاقی کا کون سا کھیل ہے جسے یہاں نہیں کھیلا جارہا ہے۔ ہم نے سائنس وٹکنالوجی میں بلاشبہ ترقی کی ہے اور فضائے بسیط کو اپنی مہم جوئیوں کا میدان بنالیا ہے، لیکن نفس انسانی کی تطہیر وتزکیہ اور فحاشی وبداخلاقی کے انسداد کا کوئی پروگرام ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہمارا ظاہر یقیناً زرق برق ہے لیکن من کی دنیا اندھیاری ہے، اور خود غرضی ونفسانیت کی زنجیروں میں ہم اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ اپنے علاوہ کسی اور کی بھلائی کا کوئی تصور ہی نہیں کر پاتے۔ یہ صورت حال متقاضی ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی ہدایت ورہنمائی سے آگاہ کیا جائے، اور اسلام کی صورت میں اللہ کا جو دائمی پیغام ہمارے پاس موجود ہے اسے لوگوں تک پہنچایا جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فضل الرحمٰن مدنی
رئیس المجلس العلمی والافتاء
جامعہ محمدیہ، مالیگاؤں

استاذ الاساتذہ حضرت العلام ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

جامعہ سراج العلوم بونڈھیار میں جماعت خامسہ پڑھنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں ناچیز نے جامعہ سلفیہ بنارس میں داخلہ لیا، داخلہ عالمیت سال ثانی میں ہوا، اس وقت جامعہ سلفیہ میں حضرت العلام مولانا شمس الحق سلفی، عظیم محدث وفقیہ علامہ رئیس احمد ندوی، ماہر فلسفہ ومنطق مولانا عبدالمعید بنارسی، مفتی جامعہ مولانا آزاد صاحب رحمانی، اور ماہر ادب مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی، اور ہر فن مولا مولانا عابد حسن رحمانی رحمہم اللہ جیسے باصلاحیت و ماہرین علوم وفنون اساتذۂ کرام مسند تدریس پر جلوہ افروز تھے، اسی سال سے عرب اساتذۂ کرام کی جامعہ سلفیہ بنارس میں آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور شیخ صالح العراقی، شیخ ربیع المدخلی، شیخ ہادی، شیخ علی مشرف اور شیخ عبداللہ غلیمان وغیرہم تشریف لائے ،ان کی آمد سے جامعہ سلفیہ کے علمی رونق میں بڑا اضافہ ہوا، اور عربی لکھنے پڑھنے اور بولنے کا ایک بہترین ماحول تیار ہوا، نیز صحیح سلفی عقیدہ اور توحید خالص پر خصوصی توجہ دی گئی اور کتاب التوحید، العقیدۃ الواسطیۃ اور شرح العقیدۃ الطحاویۃ جیسی عقیدۂ سلف کی کتابیں داخل نصاب ہوئیں، اسی سال استاذ گرامی حضرت العلامہ جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ بھی جامعہ سلفیہ تشریف لائے، استاذ محترم جامعہ ازہر مصر سے ماجستیر (M.A.) کر کے چند ماہ پیشتر ہی ہندوستان تشریف لائے تھے۔ اور مصر اور جامعہ ازہر کے اساتذہ اور طلبہ میں دوستانہ اور بے تکلفی کے ماحول کی بنا پر وہ طلبہ سے اور طلبہ ان سے بہت جلد مانوس ہو گئے، مقررہ کتابوں کی کلاس میں تدریس کے علاوہ مغرب کے بعد ان کے کمرے میں بڑے طلبہ جمع ہوتے اور عربی میں ان کے ساتھ اور آپس میں بھی گفتگو کرتے، نیز اردو عربی کے مجلات وجرائد پڑھتے اور ان کا ترجمہ کرتے اور جہاں بھی طلبہ سے کوئی غلطی ہوتی یا عربی بولنے یا ترجمہ کرنے میں انہیں پریشانی ہوتی آپ فوراً ان کی رہنمائی کرتے، ڈاکٹر صاحب نے جامعہ ازھر سے ایم۔اے کرنے کے ساتھ قاہرہ ریڈیو کے شعبۂ اردو میں دو سال تک مترجم (Translater) اور اناؤنسر (Anounser) کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا اور انہیں ترجمہ اور عربی بول چال میں بڑی مہارت حاصل تھی، وہ عربی وانگلش کے جدید اصطلاحات سے بھی خوب واقف تھے اس واسطے ان مجلسوں سے طلبہ نے خوب استفادہ کیا۔

حضرت العلام ڈاکٹر مقتدی حسن ازہریؒ کی ولادت مشہور اور مردم خیز شہر مئو ناتھ بھنجن میں ۱۹۳۹ء میں ہوئی، آپ کا خاندان پہلے ہی سے دینداری میں معروف تھا ،مئو ناتھ بھنجن کی سرزمین عربی و دینی مدارس کی کثرت، اور ہر فن کے مایۂ ناز علماء وفضلاء اور اصحاب قلم وقرطاس کے اعتبار سے پورے ہندوستان میں معروف ومشہور ہے، ڈاکٹر

صاحب نے ابتدائی تعلیم سے لے کر فراغت تک کی تعلیم مئو کے مدارس و جامعات میں حاصل کی۔ نیز الٰہ آباد بورڈ سے مولوی، عالم اور فاضل کے امتحانات دے کر اعلیٰ درجات سے کامیابی حاصل کی، فراغت کے بعد دو سال تک جامعہ فیض عام میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس سے پہلے کچھ مہینے جامعہ اسلامیہ بھوارہ بہار میں بھی مدرس رہے۔

ڈاکٹر صاحب بچپن سے ہی انتہائی ذہین وفطین اور اعلیٰ تعلیم کے شوقین اور خواہشمند تھے۔ اسو اسطے جامعہ ازھر مصر میں داخلہ کیلئے کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کا موقع عنایت فرمایا، چنانچہ ۱۹۶۳ء میں جامعہ ازھر مصر کے تعلیمی وظیفہ پر قاہرہ تشریف لے گئے اور وہاں کلیہ اصول الدین میں داخلہ لے کر ماجستیر (M.A.) کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۶۸ء میں وطن عزیز واپس آئے اور جامعہ سلفیہ میں تدریس اور تصنیف وتالیف میں لگ گئے۔ مگر دل میں ابھی بھی مزید اعلیٰ تعلیم کی تڑپ موجزن تھی اس واسطے کچھ دنوں کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبۂ عربی میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۲ء میں ایم فل (M.Phil) اور ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹریت (P.h.D) کر کے ان کی اعلی اسانید حاصل کیں، پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ایک سال تک وہاں عربی ادب کے متبادل استاذ بھی رہے، اس کے بعد آپ پھر جامعہ سلفیہ بنارس تشریف لائے اور تدریسی خدمات کے ساتھ جامعہ کے عربی رسالہ "صوت الجامعة" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، آپ کی ادارات میں مجلّہ روز افزوں ترقی کرتا رہا اور محض ہندوستان میں ہی اس کی پذیرائی نہیں ہوئی بلکہ عالم عرب میں بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور اس کے ذریعہ جامعہ سلفیہ بنارس اور جماعت اہل حدیث ہند کی آواز دور دراز ممالک تک پہونچی اور جامعہ سلفیہ کا عالم عرب میں تعارف ہوا۔ اور لوگ اس کی کارکردگی اور تعلیمی، دعوتی اور تصنیفی وتالیفی میدان میں اس کی عظیم خدمات سے واقف ہوئے۔

۱۹۸۷ء میں ذمہ داران جامعہ سلفیہ نے ان کو ریکٹر کا عہدہ تفویض کیا پھر اس کی صدارت کے عظیم منصب پر فائز ہوئے، آپ نے جامعہ سلفیہ کی ہر جگہ بہترین نمائندگی کی، اور ہند اور بیرون ہند جامعہ سلفیہ کا بہترین تعارف کرایا، مختلف کانفرنسوں، سمیناروں، علمی مجلسوں اور جمعیتوں کے دعوتی وعلمی پروگراموں میں شرکت کی اور سعودی عرب، امریکہ اور کئی دوسرے ممالک میں اسلامیات کے متعلق منعقد ہونی والی کانفرنسوں میں جامعہ کے مندوب رہے، عربی زبان وادب میں ان کی اعلیٰ صلاحیت اور مثالی خدمت کی بنا پر آپ کو ۱۹۹۲ء میں صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ سے نوازا گیا، اور آپ کی پانچ جلدوں پر مشتمل کتاب "تاریخ ادب عربی" عربی زبان وادب کی تاریخ کے سلسلہ کی ایک شاہ کار تصنیف قرار دی گئی۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان وادب پر عبور کے ساتھ تصنیف وتالیف، مقالہ نگاری اور اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمہ کی بڑی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا تھا، چنانچہ آپ کے عربی مقالات صوت الجامعة، مجلة الجامعة السلفية جو بعد میں صوت الامة ہو گیا کے اداریوں کو اگر جمع کیا جائے تو ان کی کئی جلدیں تیار ہو جائیں گی۔

عربی کے علاوہ آپ اردو کے بھی ایک اچھے

ادیب ومصنف تھے چنانچہ آپ کے قلم گہر بار سے کئی قیمتی کتابیں اردو زبان میں منصۂ شہود پر آئیں اور بعض کتابوں کے چند سالوں میں ہی کئی کئی ایڈیشن نکل گئے، آپ کے بعض سوانح نگاروں نے آپ کی اردو اور عربی کتابوں کی تعداد بتیس (۳۲) لکھی ہے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: تاریخ ادب عربی پانچ جلدیں (اردو)، خاتون اسلام (اردو)، راہ حق کے تقاضے (اردو ترجمہ) مشکل المسجد البابری فی ضوء التاریخ والکتابات المعاصرة (عربی)، قرة العینین فی تفضیل الشیخین (عربی)، مسئلة حیلة النبی فی ضوء الادلة الشرعیة (عربی)، رحمة للعالمین (عربی)، حرکة الانطلاق الفکری وجهود الشاہ ولی الله فی التجدید (عربی)، نظرة الی موقف المسلمین من احداث الخلیج (عربی)

آپ کی خدمات ونشاطات اور علمی، ادبی، دعوتی اور جماعتی کارناموں پر نظر ڈالی جائے تو کئی میدانوں میں وہ واضح طور پر نظر آئیں گی، مثلاً:

(۱) تعلیمی وتربیتی خدمات: آپ نے تقریباً چالیس سال تک جامعہ سلفیہ بنارس میں تدریسی اور تربیتی خدمات انجام دی ہیں اور آپ سے استفادہ کرنے والے تلامذہ کی تعداد کئی سو ہوگی جن میں سے آج کئی اعلیٰ ڈگریوں کے حامل ہیں اور بحث وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں، جو ان شاء اللہ ان کے لئے صدقہ جاریہ ہوں گے۔

بہت سے تلامذہ ایسے بھی ہیں جو مدارس و جامعات کے مدیر، رئیس اور شیخ الجامعہ وغیرہ کی حیثیت سے نہایت کامیابی کے ساتھ ان مدارس وجامعات کو چلا رہے ہیں اور ہزاروں طلبہ وطالبات ان سے علمی اکتساب کر رہے ہیں۔

بہت سے تلامذہ اچھے ڈاکٹر اور حکیم ہیں، جو ملت اسلامیہ کی طبی اعتبار سے خدمت انجام دینے کے ساتھ دعوتی و اصلاحی کام بھی نہایت حکمت و کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

آپ کے ایسے تلامذہ بھی کثیر تعداد میں ہیں جو تدریس اور تعلیم وتربیت کا کام انتہائی کامیابی اور نہایت اخلاص ومحنت کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔

کتنے تلامذہ ایسے ہیں جنہوں نے صحافت اور مقالہ نگاری کے میدان میں اپنی شناخت بنائی ہے۔

کتنے ایسے ہیں جو بہترین مقرر اور کامیاب داعی ہیں اور دعوت و ارشاد کے میدان میں ان کی ناقابل فراموش خدمات ہیں۔

(۲) صحافتی خدمات: ڈاکٹر صاحب کا لگ بھگ چالیس سال تک عربی واردو صحافت سے بڑا گہرا تعلق رہا اور مجلّہ صوت الجامعة، الجامعة السلفیة اور صوت الامة کی انہوں نے ادارت کی، اگر ان کے عربی مقالات اور اداریوں کو جمع کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں، علاوہ ازیں انہوں نے اردو میں بھی بہت سارے قیمتی مقالات لکھے جو ماہ نامہ محدث بنارس، ترجمان دہلی، نوائے اسلام دہلی، نور توحید نیپال، روز نامہ آواز ملک بنارس، الھدی دربھنگہ، اور روز نامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ، افکار عالیہ مئو، اہل حدیث، البلاغ بمبئی، نور توحید، السراج، برہان، معارف، الاعتصام لاہور، علی گڈھ میگزین، الفرقان

ڈومریا گنج وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔

(۳) تصنیفی خدمات: اس میدان میں بھی ڈاکٹر صاحب کی بہت ہی عظیم الشان اور قابل قدر خدمات ہیں انہوں نے اردو اور عربی میں کئی بیش قیمت کتابیں تصنیف فرمائیں جن سے لوگ ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے، علاوہ ازیں جامعہ سلفیہ بنارس سے جتنی بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں تقریباً سب پر ان کے بیش قیمت تقریظ اور تقدیم ہیں، اس کے علاوہ آپ نے اپنے بہت سے تلامذہ اور دیگر علماء کرام کی کتابوں پر بھی بڑے علمی اور معلوماتی مقدمے لکھے ہیں۔(۱)

(٤) دعوتی خدمات: خطبات جمعہ، دروس ومواعظ اور مختلف دعوتی واصلاحی پروگراموں اور کانفرنسوں میں اپنی شرکت اور اپنے گراں قدر خطابات اور صدارتی خطبات کے ذریعہ اس میدان میں بھی آپ کی بڑی قابل قدر خدمات ہیں۔

(۵) جماعتی خدمات: ڈاکٹر صاحب کا جمعیت اہل حدیث ہند کے ساتھ ہمیشہ بڑا گہرا تعلق رہا ہے، آپ ہمیشہ ذمہ داران جمعیت کو اپنے گراں قدر آراء ومشوروں سے نوازتے رہے، اور کئی آل انڈیا اہل حدیث کانفرنسوں کی صدارت کی، اور اپنے قیمتی خطابات وخطبات صدارت سے ان کو وقار بخشا، نیز جامعہ سلفیہ کے طلبہ واساتذہ وغیرہ کے ذریعہ ان کے انتظام وانصرام میں بھرپور تعاون کیا اور اساتذۂ جامعہ کے ذریعہ ان کے مختلف پروگراموں کو ترتیب دینے اور چلانے میں مدد کی، غرضیکہ مختلف طریقوں سے انہوں نے جمعیت اہل حدیث ہند کے ساتھ تعاون کیا۔

ان کے علاوہ بھی آپ کی اور بہت سی علمی، ادبی اور اصلاحی خدمات ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس ان کے حیات وخدمات پر ماہنامہ ''محدث'' اور ''صوت الامۃ'' کے ضخیم نمبر نکالے اور پھر مختلف باحثین کے ذریعے ان کی مکمل سوانح حیات تیار کرائے، نیز عصری جامعات میں ان کی خدمات کے مختلف گوشوں پر پی ایچ ڈی کے رسالے تیار کرائے جائیں تاکہ علمی وادبی دنیا ان کے خدمات سے کما حقہ واقف ہو سکے اور ان کی خدمات کے مختلف گوشے واضح ہو سکیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ایک فرزند سے اس بارے میں گفتگو بھی ہوئی اور انہوں نے بتایا کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے علمی مقالات اور اداریوں کی جمع وترتیب کا کام شروع ہو گیا تھا اور کچھ کام ہوا بھی ہے، اللہ تعالیٰ اسے تکمیل تک پہونچائے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ جامعہ سلفیہ کی بڑے اخلاص کے ساتھ خدمت کی اور اس کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک پہونچانے کی کوشش کی، جامعہ سے ان کا ایسا گہرا تعلق تھا کہ ان کی حیات میں ان کے بغیر جامعہ اور جامعہ کے بغیر ان کا تصور عجیب لگتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے تلامذہ سے بڑی محبت کرتے تھے، ہمیشہ ان کی رہنمائی فرماتے اور اچھے مشوروں سے نوازتے تھے، جس سے ان کی ملاقات ہوتی یا ٹیلیفون پر رابطہ ہوتا اس کے حالات کے ساتھ علمی کاموں کے بارے میں ضرور پوچھتے اور جب علمی کاموں کا علم ہوتا تو بہت خوش ہوتے ہمت افزائی کرتے اور دعاؤں سے نوازتے اور کوئی

(۱) ان تمام کی تفصیل آپ کو اسی شمارے میں مل جائے گی۔

علمی کام نہ پاتے تو بار بار نصیحت کرتے اور محنت وکوشش کی ترغیب دیتے۔

ڈاکٹر صاحب کے جامعہ سلفیہ تشریف لانے سے قبل ہم لوگوں کو مقالات ومضامین کی تصحیح ومراجعہ کے سلسلے میں پریشانی ہوتی تھی اور کبھی کبھی ایک ایک ماہ انتظار کرنا پڑتا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کی تشریف آوری کے بعد جو کوئی مقالہ نظر ثانی فرمانے کیلئے ان کی خدمت میں پیش کرتے تو دو تین روز میں نظر ثانی کر کے واپس کر دیتے اور یہ مشورہ بھی دیتے کہ کس مجلّہ میں چھپنے کیلئے بھیجیں، ان کی اپنے تلامذہ کی ہمت افزائی کا یہ عالم تھا کہ جب ہم لوگ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں پڑھتے تھے تو سب سے سالانہ امتحان کے رزلٹ کے بارے میں پوچھتے اور تحریری شکل میں مانگتے پھر مجلّہ الجامعة السلفیہ میں اپنی تعلیق وتبریک کے ساتھ چھاپتے، ایک مرتبہ میرا رزلٹ چھپنے میں کسی طرح چھوٹ گیا تو دوسرے شمارہ میں معذرت کے ساتھ پورے ایک صفحہ میں نمایاں طور پر شائع کیا، فارغین جامعہ فراغت کے بعد جامعہ سلفیہ جاتے تو ان کے قیام وطعام وغیرہ کا بڑا خیال رکھتے، طلبہ سے خطاب کرنے کیلئے کہتے، دیر دیر تک علمی کاموں اور نشاطات کے بارے میں پوچھتے اور مشوروں سے نوازتے، غرضیکہ فراغت کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی سرپرستی ورہنمائی کرتے رہتے تھے۔

آپ وقت کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اور بہت منظم زندگی گزارتے تھے اور کوئی وقت ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، اور ہر کام کو اس کے وقت پر کرتے تھے، سفر وحضر ہر جگہ ان کے ساتھ کتابیں، کاغذ اور قلم ساتھ رکھتے تھے اور لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

اپنی صحت، صفائی وستھرائی اور لباس وغیرہ کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے، کیرلا کے سفر میں ایک مرتبہ ساتھ رہنے کا موقع ملا تو دیکھا کہ جب میٹنگوں وغیرہ میں شرکت کیلئے نکلتے تو کپڑوں وغیرہ کے ساتھ جوتے کی بھی صفائی کا خیال رکھتے، حسب ضرورت صدری یا شیروانی کا استعمال کرتے، جس پروگرام میں بھی شرکت کرتے پوری تیاری کے ساتھ جاتے اور توجہ سے تمام کاروائیوں میں شریک ہوتے۔ اہم اہم باتیں نوٹ کرتے، اور بھرپور حصہ لیتے۔ تدریس کے آداب کا لحاظ فرماتے، اور ہمیشہ کلاس میں تیاری کے ساتھ آتے اور پوری توجہ اور محنت وشوق کے ساتھ پڑھاتے۔

کھیل سے بھی آپ کو دلچسپی تھی، اور ہم لوگوں کے ساتھ عصر بعد والی بال کھیلا کرتے تھے، روزانہ اخبارات وجرائد کا مطالعہ کرتے اور انگریزی اخبارات بھی پڑھتے۔

غرضیکہ آپ کی شخصیت ہر اعتبار سے ایک نمایاں شخصیت تھی، آپ کا شمار ان باعظمت شخصیات میں ہوتا تھا جو عظیم دانشور، مفکر وممتاز مؤلف، مصنف، مترجم، عربی واردو کے کہنہ مشق ادیب، کامیاب معلم ومربی، علم وعمل کے پیکر اور باوقار منتظم مانی جاتی ہیں۔

اللهم اغفر له، وارحمه، وتقبل حسناته، وتجاوز عن سيئاته، وارزقه دارا خيرا من داره، واهلا خيرا من اهله،، آمين يا رب العالمين.

☆☆☆

ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری
رئیس قسم السنۃ جامعہ محمدیہ مالیگاؤں

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

مشرقی یوپی کے ضلع اعظم گڈھ کواللہ نے اہل علم کا منبع بنایا یہاں سے عظیم ہستیاں آب وتاب کے ساتھ ابھریں اور ایک عالم کو اپنی روشی سے منور کرگئیں، مدرسوں کا شہر مئوناتھ بھنجن اسی ضلع کا ایک اہم حصہ تھا جو فی الحال ضلع بن چکا ہے۔

یہاں ایک محلّہ ڈومن پورہ ہے جو تین حصوں میں تقسیم ہے ڈومن پورہ حبہ، ڈومن پورہ پچھم، ڈومن پورہ کساری یہیں ایک لٹھ مار خاندان آباد تھا جس کا علم وتہذیب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ (۱) اسی خاندان کے ایک فرد جناب محمد یٰسین صاحب تھے جو اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے۔ آپ اگر چہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن علم دوست اور علماء کے بڑے قدردان تھے۔ دینی مجلسوں سے سجانے میں پیش پیش رہتے تھے، اللہ نے بسطۃ فی الجسد'' سے بھی نوازا تھا۔

اس کی ایک مثال وہ نادر واقعہ ہے جس کو جناب مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ نے بیان کیا تھا کہ جب حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ مئو تشریف لائے تو ان کی بگھی کو دوافراد نے اپنے کندھے سے کھینچ کر اسٹیشن سے مہمان گاہ تک پہنچایا تھا حالانکہ اسٹیشن سے وہ کافی دور تھا، اہل مئو نے اپنی نگاہوں سے علماء کی قدردانی کا یہ منظر دیکھا، ممکن ہے کہ علماء کی اس قدردانی کی وجہ سے رب العالمین نے اس شہر کو شہر خوباں بنا دیا، اس نے جس قدر دینی تعلیم کی خدمت کی آبیاری کی ہے شاید ملک کے کسی خطہ نے نہیں کیا، عالیاوی، فیضی، اثری، محمدی علماء کا دستے یہیں سے تیار ہوتے ہیں۔

ان دو حضرات میں سے ایک ازہری رحمہ اللہ کے والد جناب محمد یٰسین رحمہ اللہ تھے اور دوسرے مولانا مختار احمد ندوی کے والد محترم جناب حاجی ضمیر احمد رحمہ اللہ تھے۔ آپ کے والد نے علماء اور دینی مجلسوں سے بہت کچھ سیکھا تھا، غالباً اسی جذبہ نے بچوں کی تعلیم پر کسی قسم کا سمجھوتا نہ ہونے دیا۔

استاذ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کی والدہ بلقیس بانو محمد نعمان عمری رحمہ اللہ کی دختر تھیں جو کسی مدرسہ کی سند یافتہ تو نہ تھیں لیکن شوق مطالعہ اور ذوق طلب نے ایک مشفق تعلیم یافتہ خاتون کے برابر کر دیا تھا اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا بھرپور خیال تھا کیونکہ آپ کا گھرانہ

(۱) ازہری صاحب رحمہ اللہ کی وفات پر میں نے عجلت میں ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو مجلّہ صوت الحق میں مطبوع ہے۔ اس میں میں نے مئو کے علمی ماحول اور آپ کے خاندان کے روشن ستاروں کو نوجوان تعلیم یافتہ افراد پر قیاس کرتے ہوئے یہ تحریر کیا تھا کہ آپ کا تعلق ایک علمی گھرانے سے ہے، لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ آپ ہی اپنے خاندان کے علمی معمار ہیں، اصلاً آپ کا خاندان صاحب سیف وسنان رہا ہے۔ (بسکوہری)

اہل علم اور علماء کا گھرانا تھا آپ کے گیارہ بھائیوں میں سے نو عالم دین تھے انھیں میں سے مولانا فضل الرحمٰن عمری رحمہ اللہ تھے جو جامعہ محمدیہ منصورہ کے ایک مدت تک شیخ الجامعہ رہے۔ جناب مولانا محمد نعمان رحمہ اللہ نے عمرآباد کو اپنا مسکن بنایا جہاں علماء اور فضلاء کی ایک جم غفیر نے ان سے استفادہ کیا اس علمی چمن سے بقول ڈاکٹر اظہر حسن حفظ اللہ پرنسپل محمدیہ طبیہ کالج آپ کی والدہ کو والہانہ محبت تھی۔ آپ کے ایک نواسے جناب اطہر افضال نے اپنے نانی کی اس محبت کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ عمرآباد بلقیس نعمان کی کمزوری تھی۔ مدراس کا یہ خطہ ان کا شہر آرزو اور دیار شوق تھا۔ آنجناب نے ان کی ثقافت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ آپ ایک قابل رشک خاتون تھیں۔ اللہ آپ کو غریق رحمت فرمائے۔ آپ ہی کے فرزند ارجمند استاذ گرامی جناب مقتدی حسن ازہری رحمہ اللہ تھے، جن کی ثقافت اور پیار و محبت کا گہرا اثر آپ پر پڑا۔ والدین نے آپ کو "بھیا" کا لقب دیا۔

آپ کا اسم گرامی ابوسلمان مقتدیٰ حسن ازہری بن محمد یاسین بن محمد سعید بن عبدالرشید مومن تھا، مئو ناتھ بھنجن کے محلّہ ڈومن پورہ حبہ میں آپ کی ولادت ۸/اگست ۱۹۳۹ء میں ہوئی۔

علم و علماء سے محبت رکھنے والوں کی دلی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی علماء کی صف اول کی طرح ہوں لہٰذا اقتصادی پریشانی کے باوجود بھی والدین کی دلی خواہش اور تڑپ یہ تھی کہ ان کے فرزند کی اچھی تعلیم و تربیت ہو لہٰذا ہوش سنبھالتے ہی مکتب و مسجد کا راستہ دکھلایا جو ایک مومن کے ایمان کی علامت ہوتی ہے۔

مدرسہ عالیہ جو اس وقت اہل حدیثوں کا منفرد ادارہ تھا "الف سے اللہ کو پہچان" یہیں سے شروع کیا۔ ابتدائی درجات کی تعلیم مکمل کی، حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی عالم حفظ قرآن کے بغیر یتیم ہوتا ہے، اہل حدیثوں میں اس وقت حفظ قرآن کے مدارس بہت کم تھے مئو میں احناف کا ایک مشہور ادارہ "دارالعلوم" ہے اس کی مختلف شاخیں تھیں اس کی ایک شاخ مرزاہادی پورہ میں تھی وہاں آپ نے حفظ قرآن کے لئے داخلہ لیا۔ جناب حافظ محمد اسماعیل صاحب رحمہ اللہ سے حفظ قرآن اور جناب قاری خلیل الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ سے قرأت و تجوید سیکھا۔ ۱۹۵۳ء کا زمانہ ہے کلام اللہ کو سینے میں بسا کر آگے قدم بڑھایا۔ مدرسہ عالیہ سے کسب فیض دوبارہ شروع کیا۔ منزلوں کو طے کرتے ہوئے ہندوستانی معیار کی تعلیم مکمل کی۔ جس کے لئے کسی رخت کی ضرورت بھی نہ پڑھی۔ خاک مئو نے یہیں تمام ضروریات مکمل کردی۔ مدرسہ عالیہ، فیض عام، دارالحدیث منبع رشد و ہدایت اور علم کا سرچشمہ موجود تھا، جس پنگھٹ پر جایئے علم کا جام چھلکتا نظر آئے گا۔ مولوی، عالم، فاضل، منشی، الہ آباد بورڈ کی ڈگریاں یہاں کا سوغات اور علمی نشانی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں جامعہ اثریہ دارالحدیث سے فراغت کے بعد دوسال جامعہ فیض عام میں علمی چشمہ کا ایک سوتا بن گئے۔

قدرت نے امت کے جس علمی خدمت کے لئے آپ کو منتخب کیا تھا اس کے لئے یہ علم ناکافی تھا۔ لہٰذا نامساعد حالات کے باوجود بھی از مئو تا قاہرہ کا رخت سفر باندھا، مئو میں تعلیم کے دوران والد کو حسب استطاعت

سہارا دیا، تعلیم کے ساتھ ساتھ معاش میں ہاتھ بٹایا، آبائی پیشہ ساڑی کی بنائی تھی جس میں بھی آپ فنکار تھے۔ مئو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ کر گھے کے گہرائی کو پاٹ کر علم کی رفعت کی جانب قدم بڑھایا۔ ۱۹۶۳ء کا زمانہ تھا کلیۃ الدعوۃ واصول الدین کا انتخاب کیا، قاہرہ ریڈیو کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں اپنی پہچان بنائی۔ ۱۹۶۷ء میں وطن واپس ہوئے۔ جامعہ سلفیہ کو علمی وطن بنایا رفتہ رفتہ ایک تن آور سایہ دار علمی درخت بنے جس کی شاخوں پر بے شمار بلبلان چمن نے اپنا آشیانہ بنایا۔ جن کی ایک طویل فہرست ہے .M.A کی ڈگری او نچے نیچے ہی حد فاصل ہے جہاں سے Ph:D کو لپک لینا کوئی مشکل نہیں بآسانی علی گڈھ یونیورسٹی سے ۱۹۷۵ء میں اس کو بھی سمیٹ لیا۔

اصل زندگی تو وہی ہے جو دوسروں کے لئے ہو خواہ وہ تدریس ہو، تصنیف ہو افتاء وارشاد ہو، بحوث ومقالات ہوں یا اور کچھ، جامعہ سلفیہ میں انھیں پیشوں کو اپنا مقصد حیات بنایا، زندگی کے مختلف اتار چڑھاؤ دیکھے، زیرو بم ملاحظہ کیا نامساعد حالات بھی آئے، تکلیف دہ عرق النساء کی مصیبت بھی جھیلی لیکن مقصد سے سمجھوتہ نہ کیا۔ آپ کی زندگی کی نمایاں خصوصیت قلم وقرطاس ہے سفر وحضر میں یکساں طور سے آپ اس کے قدرداں رہے۔ رب العالمین نے بھی عمل میں برکت عطا کیا۔ عربی اور اردو مقالات کا ڈھیر لگا دیا، تصنیف وتالیف کی لڑیاں پرودیں، علمی ترجمانی و اختصار کتب کا نمونہ بھی پیش کیا ابناء امت کے لئے ۴۲ کتابوں کا تحفہ پیش کیا نہ بدل کی تلاش نہ حقوق کی خواہش ۳۸۰ عربی مقالے ۲۳۶ اردو مقالے تقدیم وتعارف کتب ۱۶۸ ہیں۔ سیمیناروں اور عظیم جلسوں کو زینت بخشا۔ ان میں چالیس مقالے پیش کئے دیگر خطابات الگ ہیں۔ رائے ومشورہ میں کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ ایک بار آپ سے مالیگاؤں میں ملاقات ہوئی خاکسار اس وقت عمید شئون الطلاب اور کثرت مشاغل سے مالامال تھا، کون آیا کون گیا، کون مریض، کون تندرست، کون بھاگا کون جاگا، کس نے تار توڑا، کس نے بلب پھوڑ، کس نے گالی دی، کون مار کھایا، کس کی ٹی سی ہے، کون بلاصفحہ ہے، کون صالح، کون ظالم کون چور، کون سینہ زور، تجسس کی علت، پس پردہ معلومات کے چاہت کی لت وغیرہ وغیرہ کا جھمیلا تھا۔ مجھ سے جواب طلبی ہوئی آپ کا علمی مشغلہ؟ (یعنی تصنیف وتالیف) جواب کچھ نہیں۔ سوال: وجہ؟ جواب وقت نہیں ملتا سوال: کھاتے پیتے ہیں نا اس کے لئے وقت ہے نا؟ پھر؟؟؟ علمی کام کے لئے وقت نہیں؟ چبھتا ہوا سوال دل کا چور پکڑا گیا، اس پر خلوص مکالمہ نے مجھ کو جھنجھوڑ دیا، سوچنے کا کتنا اچھوتا انداز نصیحت کا کس قدر کارگر پیرایہ، جتنا عمل دکھایا تھا شاباشی کی امید تھی لیکن پورا منظر ہی بدل گیا، اس پس منظر نے مجھ کو بھی منظر کا راستہ دکھایا۔ اب جو کچھ ہے رب العالمین کا کرم ہے بعدہ اساتذہ کرام کی محبتوں، دعاؤں اور محنتوں کا ثمرہ ہے۔ جزاھم اللہ خیرا وبرا۔

ازہری صاحب کی نصیحت کا عجب انداز تھا، جامعہ سلفیہ میں پھٹکارنے کا انداز دیکھا سر نیچے کئے ہوئے پھٹکارنے کی دھمکی دیتے ہوئے، ایسا لگتا تھا کہ اب کوئی بھاری بھرکم آواز اٹھے گی، تھرتھراہٹ کی گھڑیاں آئیں گی، امید وبیم خوف وہراس کا ملا جلا تصور آتا جاتا، اتنے میں پتہ

چلاتا کہ پھٹکار مکمل ہوگئی، کیا حسن تنبیہ تھی نہ لاٹھی نہ ڈنڈا، نہ سخت کلامی نہ گوشمالی سر اٹھا کر بھرپور نگاہ دیکھ لیا، نصیحت کی انتہا ہوگئی۔ اس چہرے سے پڑھنے والوں نے سب کچھ پڑھ لیا ایک بہی خواہ استاذ اپنے شاگرد سے کیا چاہتا ہے بالکل واضح ہوجاتا تھا، اس وقت جامعہ سلفیہ کے طلبہ بھی کیا خوب تھے، اساتذہ کے قدرداں، ان کی خدمات کے خواہاں، سمع وطاعت کے جذبہ سے بھرپور، وعظ ونصیحت ان پر موثر اور کارگر، طلب علم کا ذوق وشوق جی ہاں عام حالت یہی تھی، شذوذ کا کیا اعتبار یقین نہ ہو تو اس دور کے طلبہ کو گن لیجئے عرب وعجم میں دیکھ لیجئے، کارکردگی ملاحظہ کر لیجئے، یقیناً اعتبار ہو جائے گا۔

درون خانہ بھی ازہری صاحب کی دست خود پر اعتماد کی عادت تھی، اپنے ملبوسات کی صفائی بدست خود کرتے رہے جو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، البتہ استعمال قلم میں "استعن بیمینك" پر عمل تھا۔

تینوں بھائیوں اور جملہ بہنوں سے روابط صلہ رحمی پر مبنی تھا۔ شفیق الرحمٰن مئو، عبدالرحمان مالیگاؤں، امین مکتبہ محمدیہ طبیہ کالج، ڈاکٹر اظہر حسن (M.D.) علیگ پرنسپل محمدیہ طبیہ کالج آپ کے حسب ترتیب برادران خورد ہیں موخر الذکر کی زبانی آپ کے گھریلو زندگی کی بہت ساری خوبیوں کا پتہ چلا۔

آپ کی اولاد میں اطہر حسین فرزند اول تھے چیچک کی وبائی بیماری میں وفات پائی۔ بتول دوسری نمبر پر، اعلیٰ تعلیم یافتہ دختر تھیں، مہلک بیماری رب العالمین کی قربت کا سبب بنی، جس کے دکھ نے پدرانہ شفقت کے اشک کو نچوڑ ہی لیا، عزیزی سلمان اختر اور ڈاکٹر فوزان احمد پروفیسر جامعہ ملیہ نکہت اور عفاف آپ کی موجودہ اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے اور والدین کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

ازہری صاحب رحمہ اللہ علیہ نے بیالیس سالہ علمی زندگی میں تصنیف وتالیف اور تدریس کے علاوہ دعوتی اور علمی پروگراموں میں شرکت کی، مختلف مجلسوں اور جمعیتوں سے بھی منسلک رہے، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے مجلس عاملہ کے فعال رکن، المجلس الاعلیٰ للمساجد رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے عضو، مسلم پرسنل لا بورڈ کے ممبر، جمعیۃ المثقفین اور رابطہ ادب اسلامی کے رکن، جامعہ محمدیہ ایجوکیشن سوسائٹی اور ادارہ اصلاح المساجد ممبئی کے ہمراہی رہے، دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کے رکن، مجلس ندائے وقت مئوناتھ بھنجن کے سرپرست بھی تھے۔ مجلّہ افکار عالیہ مئو کی مجلس مشاورت میں شامل۔ آخری ذمہ داری جامعہ سلفیہ کی صدارت تھی۔ آپ کی زندگی اہل علم کے لئے عبرت اور نمونہ ہے۔

بالآخر وقت موعود آپہنچا۔ ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء مطابق ۱۰/ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ بروز جمع صبح سواپانچ بجے تقریبا پندرہ دن کی علالت کے بعد مئو جاتے ہوئے کانپور میں وفات ہوئی آپ کی عمر تقریباً ستر سال کے تھی۔ آبائی وطن مئو میں مغرب کی نماز کے بعد سوگواروں کی جم غفیر نے سپرد خاک کیا۔

اللّٰهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه۔

☆☆☆

شیخ احمد مجتبیٰ سلفی سابق استاذ جامعہ سلفیہ بنارس
وحال استاذ جامعہ ابو ہریرہ الاسلامیہ، لال گوپال گنج

مفکر جماعت ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

کچھ یادیں۔ کچھ باتیں

الحمدللہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی أشرف المرسلین، وعلی آله وأصحابه اجمعین، وعلی من تبعهم بإحسان إلی یوم الدین۔و بعد:

استاذ الجیل، استاذ الاساتذہ، سیکڑوں علمائے راسخین کے استاذ، سیکڑوں دعاۃ و معلمین کے مربی، علمی و تعلیمی رہنما، دن ورات جماعت کے بارے میں دردمندی سے سوچنے والے، مسلکِ سلف کے لئے انتہائی دردمند وغیرت مند، کسی بھی سلفیت دشمن کی ہرزہ سرائی پر تڑپ جانے والے، ہم سب کے سرپرست علامہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری دنیا سے چلے گئے۔انـــا للہ وانـــا الیـــہ راجعون۔

جماعت کے لئے استاذ محترم کی دردمندی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ آپ پورے ہندوستان میں کسی بھی گوشے میں اور کسی بھی سطح پر جماعت کے لئے کسی بھی طرح کی خدمت انجام دینے والے زندہ یا مردہ سبھی حضرات کی حیات و خدمات کا ریکارڈ محفوظ ہوجانا چاہتے تھے، تاکہ ہماری زریں تاریخ مدون ہوتی رہے اور آئندہ جماعتی نسلوں کے لئے مہمیز اور درس ثابت ہو، اپنی اس دردمندی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جامعہ سلفیہ سے سند فراغت حاصل کرنے والے عالم اور فاضل کے طلبہ کے بحوث علمیہ میں اپنے اپنے علاقہ کے علماء ودعاۃ، مبلغین و معلمین ومناظرین یا قائدین کی حیات وخدمات پر بحث لکھنے پرزور دیتے تھے۔

بنا بریں خود آپ کی حیات وخدمات کا ریکارڈ ضبطِ تحریر میں لاکر جماعت وملت کے تعلیمی اداروں، علماء دعاۃ، معلمین ومبلغین یا کسی بھی میدان میں کام کرنے والے اشخاص کی رہنمائی کے لئے شائع کرنا ضروری تھا، ہم شکرگزار ہیں جامعہ عالیہ عربیہ اور مجلّہ افکار عالیہ مئو کے ذمہ داروں کا جنھوں نے یہ بیڑا اٹھایا ہے اور وہ مجلّہ افکار عالیہ کا ان کی حیات وخدمات پر مشتمل ایک خاص اور ضخیم شمارہ شائع کرنے جارہے ہیں۔

کسی بڑی شخصیت کی حیات وخدمات پر خاص شمارے کے بارے میں استاذ محترم کی یہ خاص رائے تھی کہ صرف جذباتی تاثرات ہی سے خاص شمارہ نہ بھردیا جائے بلکہ اس کے علمی کمالات وخصوصیات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جائے۔

بنابریں استاذ محترم کے اوپر کچھ خامہ فرسائی سے میں اس لئے گریز کرتا رہا کہ آپ کی تالیفات بروقت

میرے سامنے متوفر نہیں ہیں کہ تمام تالیفات کی روشنی میں آپ کے علمی کمالات یا خصوصیات کو اجاگر کروں، یا کسی ایک ہی تالیف کو لے کراس کی خصوصیات پر ایک دراسہ پیش کروں، بنابریں آپ کے نظریے کے علی الرغم ان پر ایک تاثراتی تحریر ہی پیش کر کے ان سے متعلق یادگار مجلّہ میں شریک ہونے کا شرف حاصل کررہا ہوں، ویسے بڑی شخصیات کی ذکریات بھی کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں، ان کی تو ہر ہر ادا اس لائق ہوتی ہے کہ اس کو ضبطِ تحریر میں لاکران کو جاوداں بنادیا جائے، بہرحال ان کے اپنے ساتھ گزرے چند یادگار اور ناقابل فراموش اور سبق آموز اسفار وواقعات وخیالات کو ضبط تحریر کررہا ہوں۔

موصوف سے فضیلت میں "الاتقان فی علوم القرآن" للسیوطی کے درس میں ایک سال اور ندوۃ الطلبہ کے ہفتہ واری جلسوں میں دوسال بھرپور استفادہ کا موقع ملا، کلاس اور انجمن میں علمی افادات ہی سے واسطہ پڑتا ہے مگر موصوف کے افادات متعلقہ موضوع سے بھی آگے اور ہمہ گیر ہوتے تھے، موصوف چونکہ عالم عرب اور مصری یونیورسٹیوں سے استفادہ کئے ہوئے تھے اس لئے آپ کے دروس ہندوستان کے روایتی انداز سے آگے بڑھ کر نوٹس کی صورت میں بھی ہوتے تھے، آپ نے ہم لوگوں کو حدیث "أنزل القرآن علی سبعة أحرف" کے معانی اور مطالب پر ایک مبسوط نوٹ بنا کردیا تھا، اسی نوٹ سے ہمیں پہلی بار معلوم ہوا کہ "مشہور حدیث" "قراءت سبعہ" کا اس حدیث رسول (ﷺ) کے مصداق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد افادہ اور استفادہ کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اور موصوف سے احقر کا دوبارہ واسطہ اس وقت پڑا جب جامعہ اسلامیہ مدینہ نبویہ سے ماجستر کے بعد آگے تعلیم کا موقع نہیں ملا۔ میرے ساتھ میرے دو ہم سبق ساتھیوں (ڈاکٹر عبدالقیوم محمد شفیع بستوی اور ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری) کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، ہم تینوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی (جو دکتورہ سے فارغ ہوچکے تھے) کو ناظم صاحب (مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ) کا خط گیا کہ آپ سبھی حضرات جامعہ سلفیہ آجائیں، جامعہ آپ سبھی کی خدمات کا منتظر ہے، اور ظاہر ہے کہ چونکہ اس وقت ناظم صاحب مرحوم کے خط و کتابت کا اکثر معاملہ، استاذ محترم کے ہاتھوں انجام پاتا تھا، مذکورہ خط بھی استاذ محترم ہی کی تحریر میں تھا جو شاید میرے ریکارڈ فائل میں محفوظ بھی ہوگا۔

مذکورہ چاروں حضرات میں سے صرف احقر اور ڈاکٹر فریوائی جامعہ سلفیہ آسکے، مدینے سے ہم دونوں کا سامان اور مکتبہ بھی سیدھا جامعہ سلفیہ ہی آیا، مگر باضابطہ تعیین میں میرے سلسلے میں جب تاخیر ہوئی تو درمیان میں خبر پاکر ایک مدنی ہم عصر صاحب نے احقر کو اپنے ادارے میں آنے کی پیش کش کردی، اس کی خبر پاتے ہی استاذ محترم نے ناظم صاحب سے تاکید کرکے یکدم رہائشی کمرے کی چابی میرے حوالہ کردی کہ آپ کو کہیں نہیں جانا ہے، اس طرح میں جامعہ سلفیہ میں تدریس، ترجمہ، تالیف و تحقیق کی خدمت انجام دینے لگا۔

یہاں آنے پر استاذ محترم نے سب سے پہلے شاہ

ولی اللہ دہلوی کی فارسی کتاب "قرۃ العینین فی فضیلۃ الشیخین" (ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما) کے اپنے عربی ترجمہ کی تخریج کا کام میرے حوالہ کیا۔

اس کے بعد "التعلیقات السلفیۃ علی سنن النسائی للعلامۃ المحدث عطاء اللہ حنیف الفوجیانی" کی جدید طباعت کے لئے تحقیق وتخریج کا عظیم کام میرے حوالہ کردیا،

(ان دونوں کاموں کے احقر کے حوالہ کرنے میں رفیق مکرم دکتور فریوائی کا مشورہ شامل تھا۔ فجزاھم اللہ فی الدارین خیر الجزاء)

اور جب جامعہ میں پہلی بار شعبۂ تخصص فی الحدیث کا دوسالہ کورس چالو ہوا تو "السنۃ عبر التاریخ" کا مادہ آپ نے میرے حوالہ کیا، اس شعبہ میں تدریس کا صرف خاکہ دیا گیا تھا، اسباق اور نوٹس کی تیاری کا کام متعلق مدرس کے حوالہ تھا، دو سال گزرنے پر استاذ محترم نے ہر مدرس سے اس کے مادۂ تدریس کے لئے ایک جامع کورس کا خاکہ مانگا، میں نے اپنے دوسالہ تدریسی تجربہ کی روشنی میں ایک خاکہ ان کے حوالہ کردیا، تو کلاس میں طلبہ سے فرمارہے تھے کہ "مجتبیٰ کے سوا کسی نے مرکز ومرتب طور پر کوئی خاکہ نہیں پیش کیا"، میں تو مدرس تھا، آپ تو طلبہ میں کسی کے علمی کام سے بہت خوش ہوتے تھے، اس بابت ان کے اندر انتہا درجے کی مردم شناسی بھی تھی، اور اس کے بعد طالب علم کو اور آگے بڑھانے کا جذبۂ صادق بھی تھا، ان کے تمام شاگرد اس کے شاہد ہیں۔

ایک بار مولانا ابومسعود قمر بنارسی رحمہ اللہ کے صاحبزادے جناب سعید احمد خان صاحب (سابق کونسلر جدہ من جانب حکومت ہند جو سفارتی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو کر امریکہ میں قیام پذیر تھے) نے دو مسئلے کی بابت استاذ محترم سے استفسار کیا، استاذ محترم نے ایک رجسٹر پر دونوں مسئلے لکھ کر اساتذۂ جامعہ سے ان کی رائیں مانگیں لیکن بقولِ استاذ محترم کسی صاحب نے جواب نہیں دیا، اور احقر نے جو جواب لکھا اس پر بہت خوش تھے، افادۂ عام کے لئے دونوں مسئلے اور ان کے جوابات درج تحریر کئے جارہے ہیں۔

سوال رقم (۱) کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان مسلم پرسنل لاء کے ہندوستان میں کورٹ میں نفاذ کی بات تو کرتے ہیں مگر مسلم کرمنل لاء (اسلامی تعزیرات وحدود یا فوجداری معاملات) کی ہندوستان میں نفاذ کی بات نہیں کرتے؟

سوال رقم (۲) ارشاد باری ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَالَّذِينَ هَادُواْ وَالصَّابِؤُونَ وَالنَّصَارَى مَنْ آمَنَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وعَمِلَ صَالِحاً فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ (المائدۃ:۶۹) سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ یہود ونصاریٰ اور صابی دھرم والے بھی اگر اپنے اپنے دھرموں پر صدق دلی سے عمل پیرا ہوں تو ان کی بھی آخرت میں نجات ہوجائے گی، تو پھر دینِ اسلام ہی کے ماننے والوں کی کیا خصوصیت رہ گئی۔

میں نے ان دونوں سوالوں کے حسب ذیل جواب لکھے:

(۱) پرسنل لا (عائلی قوانین جیسے نکاح، طلاق اور وراثت) میں چونکہ فریقین مسلمان ہوتے ہیں اس لئے ہر

دو فریق پر کورٹ کا فیصلہ لاگو ہوسکتا ہے، جبکہ فوجداری معاملات میں ضروری نہیں کہ دونوں فریق مسلمان ہی ہوں، تب غیر مسلم پر اسلامی تعزیرات کیسے نافذ کی جاسکتی ہیں؟ نیز بافادہ امام ماوردی (در احکام سلطانیہ) اسلامی تعزیرات پبلک پر مسلمان حکمران اعلیٰ (خلیفہ یا سلطان) یا اس کا نائب (قاضی) ہی نافذ کرسکتا ہے، اور ہندوستان میں مسلمان حکمران یا اس کا نائب موجود نہیں ہے۔

(۲) اس کے دو جواب ہیں (۱) یا تو یہ آیت دوسری آیت ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيناً﴾ (آل عمران:۸۵) سے منسوخ ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، اور یا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اپنی نبوتوں کے زمانہ میں جس نے اپنی شریعت پر صدق دلی سے عمل کیا ہے وہ آخرت میں نجات سے بہرہ ور ہوگا، لیکن اب سابقہ شریعتیں منسوخ ہوچکی ہیں اس لئے اب صرف دین محمدی پر عمل ہی سے نجات ملے گی جیسا کہ عام مفسرین کا خیال ہے۔ (نیز سورہ بقرہ کی آیت رقم ۶۲ پر صلاح الدین یوسف کا حاشیہ دیکھا جائے)

دعوتی اسفار میں کئی بار احقر کا ان کے ساتھ جانا ہوا، وہ خود ہی میرا انتخاب کرتے تھے، آپ نے مئو سے فضیلت سے فراغت کے بعد اور مصر جانے سے پہلے ٹوپاٹانڑ ضلع دمکا (جھارکھنڈ) میں لگ بھگ چالیس سال قبل رمضان المبارک میں تراویح پڑھائی تھی، چالیس سال کے بعد جب اس گاؤں کا میرے ساتھ دورہ کیا تو بہت سے لوگوں کو نام کے ساتھ اور کچھ لوگوں کو چہرے سے پہچان لیا کہ آپ شاید فلاں کے لڑکے یا فلاں کے بھائی ہو، یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

بعض جگہوں پر اجلاس عام کی صدارت کی ذمہ داری لئے ہوتے اور بروقت کسی مجبوری کی وجہ سے نہ جاسکنے پر احقر کو بھیج دیتے تھے، جامعہ محمدیہ ڈابھاکینڈ (جھارکھنڈ) کے ایک اجلاس عام کے موقع سے تو ایسا بھی ہوا کہ نظم استقبالیہ میں ''مقتدیٰ'' کی جگہ ''مجتبیٰ'' کرکے وہ نظم پڑھی گئی۔

آپ کے ہمراہ ایک یادگار سفر کا تذکرہ ضرور کروں گا، وہ اس لئے کہ اس سفر کی روداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہدوں سے آپ کتنا بھاگتے تھے، نومبر ۱۹۹۳ء یا ۹۴ء میں جامعۃ الامام البخاری کشن گنج میں ایک عظیم اجلاس ہوا جس میں بہار کے اس وقت کے گورنر اخلاق الرحمٰن قدوائی صاحب چیف گیسٹ تھے، کشن گنج سے بذریعہ اودھ آسام میل بستی آنا تھا، تاکہ جامعہ سراج العلوم بونڈیہار کے دس سالہ اجلاس عام میں شرکت کرسکیں، مگر بدقسمتی سے اس دن وہ گاڑی منسوخ ہوگئی۔ اب برادرم شیخ عبدالمتین (رحمہ اللہ) برادرم شیخ عبداللہ جھنڈانگری اور اس وقت کے مرکزی ناظم عمومی عبدالوہاب خلجی صاحبان نے بونڈیہار کے اجلاس میں شرکت کی راہ اس طرح نکالی کہ کشن گنج سے بذریعہ کار نیپال کے مقامی ایرپورٹ بیراٹ نگر چلے جائیں، اور وہاں سے کاٹھمنڈو بذریعہ فلائٹ، اور پھر وہاں سے بذریعہ فلائٹ بونڈیہار سے متصل نیپال کے ایرپورٹ بھیرہوا چلے جائیں، مگر کاٹھمنڈو سے بھیرہوا کی فلائٹ میں جگہ دستیاب نہ ہوسکی، تب بذریعہ کار سفر کیا گیا، کاٹھمنڈو سے جھنڈانگر نو گھنٹے کے طویل سفر میں دونوں حضرات (خلجی وجھنڈانگری

صاحبان) برابر استاذ محترم سے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت قبول کر لینے کی ترغیب دیتے رہ گئے مگر "ہاں" کر کے نہیں دیا، بڑے بڑے عہدوں کو تو آپ موجودہ زبان میں "لفٹ" ہی نہیں دیتے تھے۔

اور جب اکتوبر ۲۰۰۱ء میں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی امارت کے لئے نئے میقات کے واسطے امیر کے انتخاب کی بات آئی تو سعودیہ میں مقیم سلفی اخوان نے ریاض میں میٹنگ کر کے ڈاکٹر صاحب کے نام کی تجویز پیش کی، تب بھی آپ نے سختی سے انکار کر دیا۔

ٹھیک انتخاب کے دن استاذ محترم مجھے ساتھ لے کر بنارس میں ایک دعوت میں گئے تھے، واپسی میں رکشہ پر فرمایا: دیکھو شیخ! ریاض سے ہمارے سلفی اخوان نے نیز اندرون ملک سے میرے معروف شاگردوں نے مجھ سے بار بار تقاضہ کیا، مجھے یہ عہدہ لینا تو ہے نہیں، مگر ذرا دیکھو کہ اندرون ہند جماعت اور جمعیت کے جگادری حضرات میں سے کسی نے مجھ سے اس سلسلے میں رجوع نہیں کیا ان جگادری حضرات کے نیچر پر استاذ محترم کے اس تبصرے کے نشتر پر ذرا غور فرمایا جائے ایک بار استاذ محترم نے مرکزی جمعیت دہلی کی بابت تو یہاں تک فرما دیا تھا کہ دہلی میں یا تو ......رہتے ہیں، یا جو وہاں جاتا ہے وہ بھی......ہو جاتا ہے۔

جامعہ کے اپنے دفتر میں استاذ محترم موجود تھے بات چل رہی تھی جماعت کے ایک بہت ہی قد آور حضرت کے اپنے ادارہ کی مالیات میں سوء تصرف کی، استاذ محترم نے فرمایا: مجتبیٰ! شاید ہمیں لوگ "اس بزم" میں احمق ہیں۔

جماعت کے نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے سلسلے میں فی زمانہ یہ ظاہرہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ کوئی صاحب کسی ادارہ سے کسی حیثیت سے منسلک ہیں، پھر وہاں سے نکلتے ہیں اور ایک نیا ادارہ خود اپنی تولیت میں کھول لیتے ہیں، اس طرح متعدد ادارے وجود میں آئے ہیں، اس سے قطع نظر کہ ان اداروں سے جماعت ہی کے افراد کو (استاذ، طالب علم اور عام اسٹاف کی حیثیت سے) فائدہ پہنچ رہا ہے جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں، مگر اصل سوال ان اداروں کے قیام کے پس منظر یا نیت کا ہے۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ سابق ادارہ کے ذمہ داروں کا تلخ رویہ بھی اس کا محرک بنا ہے، ذمہ داروں کے تلخ رویہ کا اگر ہلکا سا جائزہ دیکھنا ہو تو شیخ فضل اللہ انصاری اور شیث تیمی کے مقالہ کا مطالعہ کیا جائے جو انھوں نے مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے ایک تعلیمی کانفرنس کے موقع سے اہل حدیث کمپلیکس میں پیش کیا تھا جس میں اس وقت کے وزیر داخلہ شیوراج پاٹل نے شرکت کی تھی۔ یا دکتور عبدالعلیم بستوی کا وہ مقالہ مطالعہ کیا جائے جو انھوں نے سابق "التوعیہ" میں شائع کرایا تھا، اور میری رائے بھی یہ بن گئی ہے کہ اداروں کے ذمہ داروں کے اپنے اسٹاف (خواہ وہ سعودیہ سے متخرج: لیسانس، ماجستیر، یا دکتوراہ کی ڈگریوں کے حامل ہوں) کے ساتھ استحصالی، استغلالی، یا آمرانہ وحاکمانہ رویہ کو دیکھتے ہوئے مذکورہ حضرات کا الگ ادارہ کھول لینا ہی صحیح تھا، بقول ایک سعودی متخرج اور ایک ادارے کے ذمہ دار کے کہ "اگر تم اپنا ادارہ نہ کھولو گے تو سعودیہ سے متخرج علامہ ہو کر بھی دوسروں کے غلام رہو گے"۔ (فھل من مدکر)

اس تمہید طولانی کا پس منظر یہ ہے کہ اگر استاذ محترم بھی دیگر لوگوں کی طرح جامعہ سلفیہ سے نکل کر کوئی عظیم تنظیم یا ادارہ قائم کر لیتے تو پلک جھپکتے میں اس کو اوجِ ثریا پر پہنچا دیتے، کیونکہ ساری دنیا میں لوگ آپ کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، آپ کی علمیت اور اخلاص کے معترف تھے، اور سیکڑوں آپ کے باصلاحیت شاگرد تھے جو تدریسی عملہ کے طور پر تیار ہوتے۔ نیز اندرو باہر آپ کا ہمہ جہتی تعاون فرماتے، لیکن اس طرح کے خیال کو بھی آپ نے سختی سے جھٹک دیا، اور جامعہ سلفیہ کی نسبت سے اپنی عقیدت ومحبت کو ایسے الفاظ سے تعبیر کیا جو سنہرے حرفوں سے درجِ تاریخ کرنے کے لائق ہیں۔ آپ نے فرمایا تھا ''میں جو کچھ ہوں جامعہ سلفیہ کے طفیل ہی بنا ہوں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ جامعہ نے بھی میرے طفیل بہت کچھ حاصل کیا ہے'' اور یہ حقیقت ہے کہ جامعہ کو ''عالمیت (عالمی حیثیت) تک آپ کے علمی جدوجہد ہی نے پہنچایا ہے، آپ کے انتقال پر جامعہ کے موجودہ ناظم اعلیٰ مولانا عبداللہ سعود حفظہ اللہ نے بجا لکھا تھا کہ ''جامعہ کا ایک باب ختم ہوگیا''۔

عہدوں اور مناصب سے آپ کے بھاگنے کے موقف پر اس واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے کہ ہم نے سنا ہے (واللہ اعلم) کہ ایک بار جامعہ سلفیہ کی صدارت کی پیش کش پر آپ نے مجلس میں فرمایا تھا کہ ''اگر آپ لوگ زیادہ ضد کریں گے تو میں مجلس سے اٹھ کر چلا جاؤں گا'' (سبق لیں وہ لوگ جو عہدوں کے بھوکے ہوتے ہیں)

اور آخر عمر میں جب آپ نے جامعہ سلفیہ کی صدارت کا عہدہ قبول فرمالیا تو میں نے سابقہ تناظر میں مزاحاً عرض کیا کہ ''آخر قبول کر ہی لیا نا؟؟؟ تو فرمایا: کہ میں مولانا شاہد جنید سلفی سے مجبور ہوگیا (اس سے پہلے بھی وہ میرے سامنے شیخ شاہد جنید صاحب کی کئی بار تعریف کر چکے تھے)

اپنی تعریف سے آپ کتنا بھاگتے تھے، یہ اس واقعہ سے ظاہر ہوگا کہ رابطہ عالم اسلامی مکہ میں جب مولانا علی میاں ندوی (رحمہ اللہ) کی وفات سے ہندوستان کی سیٹ خالی ہوئی تو سعودیہ میں مقیم سلفی اخوان نے اس وقت کے جامعہ سلفیہ کے ناظم جناب محمد سالم صاحب کو لکھا کہ آپ ایک خط شیخ ابن باز (رحمہ اللہ) کو لکھیں کہ ہندوستان سے اس عہدہ کے لائق ڈاکٹر علامہ مقتدیٰ حسن ازہری ہیں، کیونکہ موصوف کی یہ یہ خدمات اور خصوصیات ہیں، نیز یہی خط ہندوستان کے متعدد جماعتی اداروں سے بھی بھجوا دیں، ناظم صاحب نے اخوان کا یہ خط ڈاکٹر صاحب کے حوالہ کردیا، ظاہر بات تھی کہ یہ سب عربی میں کرنا تھا، ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلوایا اور فرمایا: مجتبیٰ! یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب جامعہ کے ناظم صاحب کی طرف سے ہوگا، مگر میں خود اپنے قلم سے اپنی خدمات وخصوصیات اور اپنی ترشیح کی احقیت کیسے لکھوں؟ میں نے کہا: اخوان کی تجویز بہت ہی مناسب ہے، لایئے یہ کام میں کردیتا ہوں، سو میں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں شیخ ابن باز کو لکھا، آپ نے اب تک جتنی علمی خدمات انجام دی تھیں سب کی فہرست بنائی، آپ کی خصوصیات اور اس عہدے کے لائق ہونے کی بات پر زور طریقے سے لکھی اور ناظم صاحب کی طرف سے شیخ کے نام بھجوا دیا، نیز کئی مدارس سے بھی ان کی طرف سے خط بنا کر بھجوا دیا، مگر جب آخری ترشیح میں مرکزی جمعیت اہل

Scanned by CamScanner

حدیث ہند کے کردار کا معاملہ آیا تو کئی ایک ممبرانِ عاملہ سے میرے رابطہ کے باوجود وہاں سے کسی دوسرے کی ترشیح بھیج دی گئی، تب "إذا تعارضا تساقطا" کی نوبت آ گئی (خیر پھر بھی رابطہ کی کسی مجلس میں خود رابطہ ہی کی طرف سے آپ کی نامزدگی عمل میں آ گئی)

زمانے کے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر آپ نے جامعہ سلفیہ کی اسناد کا ملک وبیرون ملک معادلہ کرانے میں کوشش کی، اور تقریباً ہر جگہ سے معادلہ حاصل کرا دیا۔ لیکن اندرون ملک عصری یونیورسٹیوں میں جامعہ کی سندوں کے معادلہ سے اس کے برے نتائج کی وجہ سے اس کو ذاتی طور سے ناپسند ہی فرماتے تھے، کہ اس طرح دینی مدارس کا بہترین نخبہ (بیسٹ بیچ) علوم اسلامیہ وعربیہ میں رسوخ حاصل کرنے کی بجائے عصری درسگاہوں، عصری سرکاری وغیر سرکاری نوکریوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، تو آئندہ ان مدارس میں اچھی تدریس، افتاء وتالیف کے میدانوں میں قحط الرجالی کا سامنا ہوگا، آپ کی یہ دردمندی بجا تھی، یہ تو جماعت اور ملت کے اربابِ حل وعقد اور قائدین کو سوچنا چاہئے کہ آئندہ دس بیس سالوں میں اس ملی وجماعتی (تعلیمی) ضرورت کا کیا بنے گا؟ مدارس میں چونکہ خاطر خواہ معاوضہ نہیں دیا جاتا، نیز ان اداروں میں ذمہ داروں کا استحصالی رویہ ہر جگہ ملتا ہے، اس لئے ذہین اور غیور طلبہ مدارس دینیہ کا رخ ہی نہیں کرنا چاہتے، دس بیس سالوں کے بعد کا ذرا تصور تو فرمائیں یہ ذمہ داران، وسرمایہ داران وقائدین جماعت وملت ومدارس!!!

اسی طرح دینی مدارس میں بار بار تعطیل کے لئے مدارس بتقاضائے زمانہ مجبور ہیں، لیکن تعلیم پر اس کے برے نتائج کا رونا تمام دردمند ذمہ داران روتے ہیں، ایک سفر میں میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھا، گرمیوں کی تعطیل کے سبب ریلوے اسٹیشنوں پر ایسی بھیڑ کہ الامان والحفیظ، آپ فرمانے لگے ان گرمیوں میں مدارس میں آرام سے بیٹھ کر پڑھنا پڑھانا بہتر ہے یا اس محشر نما گرمی میں سفر کی یہ صعوبتیں برداشت کرنی؟ مدارس کے ذمہ دار ذرا سا اور خرچ برداشت کر کے ان گرمیوں میں تعلیم وتعلم کا سلسلہ برقرار رکھتے تو وہ اس پریشانی سے بہتر ہوتا، آرام بھی رہتا اور تعلیم کے نقصان سے بچاؤ بھی ہوتا، مگر:

اسے بسا آرزو کہ خاک شدہ

استاذ محترم کے تعلیم وتعلم کے میدان میں اور بھی ذاتی آراء تھے جو نہایت ٹھوس اور مبنی بر حقیقت تھے، مگر صفحات کی تنگ دامانی سب کے ذکر سے مانع ہے، وفی ذلك الكفاية

غفر الله له وأدخله فسيح جناته وأخلف لنا خيرا منه، وليس ذلك عليه بعزيز

☆☆☆

مولانا عبدالواحد مدنی
صفا شریعت کالج ڈومریا گنج

استاذ ازہری رحمہ اللہ کی یاد میں

اللہ جزائے خیر دے مولانا عبداللطیف اثری ایڈیٹر ''افکار عالیہ'' کو جن کے مسلسل اصرار اور پیہم متابعت کی وجہ سے آج بحالت سفر دہلی میں بیٹھ کر استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ ونور اللہ مرقدہ کے سلسلہ میں کچھ تاثرات قلمبند کر رہا ہوں۔ (عبدالواحد)

جماعتی وعلمی حلقوں میں یہ بات معروف ہے کہ ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کے چند عزیز شاگردوں میں اس حقیر کا بھی نام تھا اور اسے میں اپنے لئے ہمیشہ باعث افتخار سمجھتا رہا ہوں۔

ازہری مرحوم سے میرے تعلقات کا آغاز مادر علمی جامعہ سلفیہ بنارس کے عہد طالب علمی میں ہوا، استاذ وشاگرد کے یہ تعلقات روز بروز خوشگوار سے خوشگوار اور مستحکم سے مستحکم تر ہوتے گئے۔ اور ان تعلقات کی نوعیت خالص علمی، فکری اور ملی رہی۔ تعلیم وتعلم، دعوت وارشاد اور ملک وملت کے گونا گوں مسائل پر تبادلۂ خیال اور افادہ واستفادہ کا یہ سلسلہ تقریباً تین دہائیوں تک چلتا رہا۔ ازہری صاحب مرحوم کی شفقتیں، عنایتیں اتنی رہیں کہ میں ان کا شمار نہیں کرسکا، اپنے اس کمترین شاگرد کے تعلق سے غیر معمولی حسن ظن رکھتے اور علمی امور میں رہنمائی بھی کرتے اور مختلف طریقے سے حوصلہ افزائی بھی۔ اپنے اس عزیز پر مرحوم کے فرط اعتماد کا نتیجہ تھا کہ قطر میں منعقد ہونے والی عالمی سیرت کانفرنس میں شرکت کا جب آپ کو دعوت نامہ ملا تو اپنا عربی مقالہ تیار کرنے میں مجھے معاون بنایا اور سیرت نبوی کے بنیادی مراجع سے مواد کی فراہمی کی ذمہ داری خاکسار کو دی۔ قطر سے واپسی پر سیرت پر ایک عربی کتاب استاذ مرحوم نے ازراہ شفقت ہدیہ دیا، جو میرے لئے بڑا بیش قیمت تحفہ تھا جامعہ سلفیہ اور ازہری صاحب مرحوم لازم وملزوم تھے، جامعہ سلفیہ کی ترقی واستحکام میں آپ کے اخلاص اور محنت کا غیر معمولی دخل رہا ہے، جامعہ سلفیہ کے مرحوم ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید عبدالحق سلفی آپ پر غیر معمولی اعتماد کرتے تھے اور سرپرستی بھی، اور اب دونوں اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ مرحومین کو اپنی جوار رحمت ومغفرت میں جگہ دے، ان دونوں کی حسنات کو قبول فرمائے اور لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

ایک بار جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے جنرل سکریٹری شیخ عمر فلاتہ رحمہ اللہ ایک باوقار وفد کے ساتھ ہندوستان آئے اور جامعہ سلفیہ میں ان کا پرتپاک استقبال

ہوا۔ اس موقع پر شیخ عمر فلاتہ نے قطر کے چیف جسٹس عبد اللہ بن زید آل محمود کی ایک تازہ تحریر پر اپنی تشویش ظاہر کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ جامعہ سلفیہ کی جانب سے اس تحریر کا علمی جواب آنا چاہیے ۔ ازہری صاحب مرحوم نے اپنے غیر معمولی حسن ظن اور فرط اعتماد کی بنیاد پر اپنے اس گناہ گار شاگرد کو آفس میں طلب کیا اور قطر کے چیف جسٹس کے اس مقالہ کی زیراکس دی اور کہا تم اس کا جواب جلد از جلد لکھو، یقین جانیے کہ میں اندر سے گھبرا گیا کہ قطر کے چیف جسٹس، عالمی سطح کے معروف عالم وفقیہ اوران کی تحریر کا جواب یہ طالب علم لکھے، لیکن میں استاذ محترم کی عقیدت اور فرط احترام کے نتیجہ میں معذرت کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اور استاذ کے حکم کی تعمیل میں اپنا طالب علمانہ فریضہ سمجھ کر اس چیلنج کو قبول کیا۔ تقریباً دو ہفتہ کی شب و روز کی محنت سے جواب تیار کیا جو غالباً تین قسطوں میں صوت الأمة (عربی) میں حجر ثمود لیس حجرا محجورا کے عنوان سے شائع ہوا۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے امین عام شیخ عمر فلاتہ تک جب اس کی خبر پہنچی اور میرا تردیدی مضمون دیکھا تو بقول ڈاکٹر ازہری مرحوم بے حد خوش ہوئے اور جامعہ سلفیہ کے حق میں دعائیں دی کہ جامعہ سلفیہ کے فرزندوں میں ایسی غیر معمولی صلاحیت والے طلبہ بھی ہیں جو ہنوز طالب علم ہوتے ہوئے اس طرح کا علمی جواب لکھ سکتے ہیں۔ اس سے جامعہ سلفیہ کی قدر ومنزلت موصوف کے یہاں مزید دوبالا ہوگئی۔

جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر کے مرحوم ناظم اعلیٰ مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگری رحمہ اللہ بسا اوقات جامعہ سلفیہ جاتے تھے اور ازہری صاحب مرحوم سے عربی میں خطوط وغیرہ تحریر کرواتے، اس سلسلے میں کبھی کبھی ہفتہ عشرہ آپ کا جامعہ میں قیام رہتا، خطیب الاسلامؒ کو پہلی بار ضرورت محسوس ہوئی کہ جامعہ کا تعارفی کتابچہ عربی میں تیار کرایا جائے، اس مقصد سے موصوف جامعہ سلفیہ گئے اور اپنا مدعا ازہری صاحب کے سامنے رکھا، ازہری صاحب مرحوم نے مجھے آفس طلب کیا اور مولانا جھنڈانگری کے سامنے یہ ذمہ داری مجھے سونپی۔ چونکہ خطیب الاسلام مرحوم اور میرے والد مرحوم مولانا عبد القدوس صاحب انتہائی قریبی دوست اور ساتھی تھے، اس تعلق کے حوالہ سے بھی سراج العلوم کا عربی تعارفی کتابچہ تیار کرنا میں نے اپنے لئے سعادت مندی تصور کیا، پہلی بار میں نے ہی جامعہ سراج العلوم کے نام کے ساتھ السلفية کا اضافہ کیا اور اس کا نام جامعہ سراج العلوم السلفية ہوا۔ خطیب الاسلامؒ کتابچہ پڑھ کر بڑا مگن ہوئے اور مجھے کچھ ہدیہ دینے کی پیش کش کی اور میں نے اپنی کتاب دوستی کے ناطے خطیب الاسلام سے مولانا غلام رسول مہرؒ کی کتاب ''جماعت مجاہدین'' کا مطالبہ کیا جو خطیب الاسلام اگلے سفر میں بنارس اپنے ساتھ لائے اور ازراہ شفقت مذکورہ کتاب بطور مخلصانہ ہدیۃً مرحمت فرمائی ۔ غالباً انہیں دنوں میرے مطالعہ میں شکیب ارسلان کی مشہور کتاب حاضر العالم الاسلامی تھی جس میں نیپال

کے باشندوں کے بارے میں لکھا تھا کہ (کلھم ھندوس) یعنی نیپال میں سب ہندو ہی ہندو ہیں، مسلمان وہاں سرے سے ہیں ہی نہیں ۔ میں نے اس کتابچہ میں علامہ شکیب ارسلان صاحب کا وہ جملہ بھی کوڈ کیا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ نیپال میں مسلمانوں کی تعداد انتہائی کم اور حالت انتہائی خستہ اور مجہول ہے۔

ازہری صاحب جامعہ سلفیہ اور مسلک ومنہج کے فروغ واستحکام کے لئے ہمیشہ فکرمند رہے، اپنے شاگردوں بالخصوص علم دوست تلامذہ کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے، صلاح الدین مقبول احمد، عبدالمعید، رفیع احمد (مقیم آسٹریلیا) ان میں سے کون ہے جو اپنے اس خیر خواہ استاذ کی عنایتوں اور محبتوں اور شفقتوں سے بے نیاز ہو ۔ ہمارے دوست مولانا عبدالمعید ان کے گھر جا کر کافی دنوں تک عربی ادب کی ایک عظیم کتاب کا درس لیتے رہے، مولانا صلاح الدین مقبول سے برابر ''صوت الامۃ'' میں مضامین لکھواتے رہے۔

۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کی مسماری کے بعد میں حالات سے بہت دل برداشتہ تھا، دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا لگ رہا تھا، میں حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال بہتر ہوتی تو شاید مظلومی ومجبوری کے یہ منحوس دن نہ دیکھنے کو ملتے۔ میں نے اپنے دل کا غبار ایک طویل خط کی شکل میں استاذ محترم کو لکھا۔ جو میری زندگی کا طویل ترین خط تھا، میں نے اس خط میں تعلیم ، نصاب تعلیم ، نظام تعلیم میں اپنی معروضات پیش کی تھیں کہ شاید استاذ محترم اپنے جماعتی وملی اثر ورسوخ کو کام میں لاکر ان معروضات کو عملی جامہ پہنانے کی سوچیں۔ ظاہر ہے یہ خط ایک شاگرد کا اپنے ایک خاص استاذ کے نام تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اگلے چند ہفتوں میں میں نے وہ خط ایک مضمون کی شکل میں ماہنامہ محدث کے صفحات پر دیکھا جس پر ازہری صاحب نے ایک مختصر ادارتی نوٹ سے بھی مزین کیا تھا، اس خط کے شائع ہونے کے بعد مختلف حلقوں سے میرے پاس تحسین اور حوصلہ افزائی کے خطوط موصول ہوئے جس کے نتیجہ میں میں نے صفا نام کا تعلیمی ادارہ شروع کیا جسے شروع میں بعض کرم فرماؤں نے نہ جانے کیا کیا عنوان نہیں دیے۔ اللہ تعالیٰ سب کو معاف فرمائے اور ہم سب کی نیتوں میں اصلاح اور اعمال کو اتباع کا ہم رکاب بنائے کہ کوئی بھی عمل ہو اخلاص واتباع کے بغیر بے سود اور رائگاں ہوتا ہے۔

ازہری صاحب مرحوم سے جو تعلق جامعہ سلفیہ کے عہد طالب علمی میں قائم ہوا تھا وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ جانے کے بعد اور پھر ہندوستان لوٹنے پر ہمیشہ نہ صرف قائم رہا بلکہ اس میں روز بروز استحکام پیدا ہوا، یہی وجہ ہے کہ ''صفا'' نے جب بھی آپ کو یاد کیا آپ اپنے سارے پروگرام ملتوی کر کے تشریف لاتے اور میر مجلس کے طور پر صفا کے پروگراموں، سیمیناروں کی کامیابی کے لئے کوشاں رہتے ۔ الحمد للہ دو بین الاقوامی سیمینار ازہری مرحوم کی

صدارت میں منعقد ہوئے جس میں ایک کا موضوع تھا ''دینی مدارس میں قرآن کی تدریس کے مسائل'' اور دوسرے کا موضوع تھا ''معاشی مسائل کا قرآنی حل'' ان دونوں سیمیناروں کی تمام نشستوں میں آپ برابر شریک رہے اور اپنے گراں قدر خیالات سے حاضرین کو محظوظ کرتے رہے۔

آپ کے زمانہ میں جامعہ سلفیہ میں جس قدر سیمینار، سمپوزیم ہوئے سب پر آپ بتاکید حاضر ہونے کا حکم دیتے اور خاکسار اپنی شرکت کو اپنے حق میں سعادت مندی تصور کرتا کہ استاذ محترم اور دیگر اساتذہ وذمہ داران جامعہ سلفیہ، اور خود مادر علمی جامعہ سلفیہ کے در ودیوار کو دیکھنے کا زریں موقع ہاتھ آئے گا۔

مجھے یاد ہے سیرت نبوی پر عالمی سیمینار کا انعقاد جامعہ سلفیہ میں ہوا تھا، جس میں سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی بھی تشریف لائے، دوسرے دن کے اجلاس میں جس سیشن میں سید حامد صاحب کو خطاب کرنا تھا اس سیشن کی نظامت کے لئے ازہری صاحب مرحوم نے مجھے مکلف کیا۔ اس سیشن میں شہر بنارس کے عمائدین کی بڑی تعداد شریک تھی۔ علاوہ ازیں اے ایم یو کے متعلقہ قابل ذکر اساتذہ بھی۔ ازہری صاحب مرحوم کے حکم اور خواہش کے مطابق الحمدللہ اللہ کی توفیق سے بڑی خوش اسلوبی سے اس سیشن کی نظامت کا فریضہ انجام دیا جس کا چرچا بنارس اور علی گڈھ کے وابستگان میں کافی دنوں تک تھا۔

ازہری صاحب مرحوم کو جمعیت وجماعت کے غم دوراں میں کچھ لوگوں نے مبتلا کرنے کی کوشش کی اور مختلف آل انڈیا کانفرنسوں میں صدارت وغیرہ کا منصب بھی دیا گیا جو بہر حال ازہری صاحب کے لئے کم بلکہ کانفرنس کے وقار میں اضافہ کا موجب بنا، آخری دور میں جناب ازہری صاحب کو احساس ہوگیا تھا کہ جمعیت وجماعت کی گاڑی کھینچنا کسی ذی علم اور شریف انسان کے بس کی بات نہیں، اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے حالات سے انتہائی دل برداشتہ ہوگئے تھے جس کا اظہار خود مجھ سے بارہا فون پر کیا۔ اور فرماتے تھے کہ علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانویؒ کا وہ تبصرہ آج بھی برمحل ہے جس میں انہوں نے جمعیت وجماعت کو غم دوراں قرار دے کر اس سے فاصلہ بنائے رکھا تاکہ مسلک ومنہج کی علمی خدمت سکون سے کرسکیں۔

ازہری صاحب کی علالت ووفات کے درمیان کی مدت بڑی مختصر رہی۔ اللہ رب العالمین آپ کی مغفرت فرمائے مجھے خوشی اور سکون ہے کہ مجھے استاذ محترم کی نعش مبارک کو سنت کے مطابق غسل دلانے اور تکفین وتجہیز کا موقع ملا۔ مجھے قوی امید کہ آپ کی اللہ رب العالمین ضرور مغفرت فرمائے گا کہ آپ پیٹ کے مرض میں مبتلا تھے اور حدیث میں ہے کہ ''المبطون شهيد'' علاوہ ازیں جمعہ کی رات میں آپ کا انتقال ہوا اور حدیث رسول کے بموجب جس کا انتقال ليلة الجمعه کو ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبر کے فتنہ سے محفوظ رکھتا ہے۔

ازہری صاحب اور امریکہ کا سفر

ازہری صاحب مرحوم کی زندگی کا ایک اہم باب آپ کا سفر امریکہ ہے جس پر بہت سے حضرات نے انتہائی دل آزاری کے لب ولہجہ میں نہ جانے کیا کیا لکھا اور کیا کچھ نہ کہا ہوگا، استاذ محترم کی طرح اس خاکسار کی بھی زندگی کا ایک باب ''سفر امریکہ'' رہا ہے جس پر نہ مجھے اس وقت کوئی پشیمانی اور تردد تھا اور نہ ہی آج ہے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں عموماً اور سلفیان ہند کے ایک مخصوص حلقہ میں خصوصاً ہمارے سفر امریکہ پر بڑے سوالیہ نشانات کھڑے کئے۔ اور بین السطور نہ جانے کیسی کیسی حاشیہ آرائی نہ کی گئی، بالخصوص بعض سلفیان ہند کی مطلق العنانی اور بے لگام دریدہ دہنی یہاں تک پہنچ گئی کہ ہم لوگوں نے اپنے دین وایمان کا امریکہ اور وہاں کی حکومت کے ہاتھوں سودا کرلیا ہے فإنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔ بلکہ بعض لوگوں کو یہاں تک تبصرہ کرتے ہوئے ان کانوں نے سنا کہ ازہری صاحب مرحوم نے امریکہ سے لوٹ کر امریکی ڈالر سے اوکھلا ئی دہلی میں ایک بڑا پلاٹ خریدا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر مقلدیت میں جوغلو پیدا ہوجاتا ہے تو احترام وعقیدت اور حسن ظن جس کا حکم خود حدیث نبوی میں دیا گیا ہے وہ ساری کی ساری چیزیں ختم ہوجاتی ہیں۔ بیہودگی کا ایک طوفان تھا جو سفر امریکہ کے حوالے سے بعض حاقدین وحاسدین نے بپا کر رکھا تھا اور بسا اوقات مجہول نام سے جریدہ ترجمان، دعوت، راشٹریہ سہارا وغیرہ میں مضمون شائع کیا جاتا تھا۔ بالآخر ازہری صاحب مرحوم نے مجھے فون کیا اور کہا کب تک خاموشی رہے گی، میں نے عرض کیا کہ جہالت وسفاہت کا جواب خاموشی ہے، لیکن پھر میں نے استاذ محترم کے ایماء پر ایک مضمون بعنوان ''بدظنی سے احتراز کیجئے'' لکھا اور صفا شریعت کالج کے ایک طالب علم کے نام سے شائع کروایا، جس کے بعد تنقیص کا یہ طوفان بڑی حد تک تھم گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکابرین علماء ودانشوران ملت کی ٹیم کا یہ سفر کسی بدنیتی پر ہرگز مبنی نہ تھا ابتدا ہی میں ہم لوگوں نے امریکی سفارت کاروں کے سامنے عالم اسلام اور مسلمانوں کے تئیں امریکی حکومت کی جارحانہ پالیسیوں بالخصوص عراق وافغانستان میں کئے جانے والے مظالم پر اپنا کھلا احتجاج درج کروادیا تھا اور ببانگ دہل امریکی حکومت کے ذمہ داران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ باور کرادیا تھا کہ اگر حکومت امریکہ کا مقصد یہ سفر کرانے سے یہ ہے کہ امریکی پالیسیوں کے تعلق سے ہمارا رویہ یا نظریہ تبدیل ہوجائے گا یا امریکی پالیسیوں کے تعلق سے ہمارے موقف میں کوئی نرم گوشہ (Soft corner) پیدا ہوجائے گا تو یہ امریکی ذمہ داران کی بھول ہے۔ ان ساری وضاحتوں کے باوجود امریکی حکومت کے ذمہ داروں نے بصراحت کہا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آپ حضرات امریکہ جائیں وہاں کی زندگی کا قریب سے مطالعہ ومشاہدہ کریں، مختلف شعبہائے حیات کے لوگوں سے مل کر ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوں، اس کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ اس لئے ہم

نے پوری دینی بصیرت اور شرعی تفقہ کی روشنی میں امریکی کا سفر کیا اور اور اکیس روزہ سفر امریکہ کا شاید کوئی چھوٹا بڑا پروگرام یا میٹنگ ایسی نہ رہی جس میں ہم لوگوں نے اعلانیہ اسلام اور قرآن وسیرت نبوی کا پیغام نہ رکھا ہو، اور عالم اسلام کے تئیں امریکی حکومت کی جارحیت پر کھلی تنقید نہ کی ہو، بلکہ امریکی وزارت خارجہ میں ہونے والی میٹنگ میں میں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ امریکہ کی ہر بستی اور ہر گلی میں خیراتی اور رفاہی ادارے ہیں جو پبلک ویلفیر کا کام کرتے ہیں۔ لیکن خلیج عربی میں کئے جانے والے خیراتی ورفاہی کاموں میں امریکہ دہشت گردی کا جھوٹا الزام عائد کر کے روز بروز رخنے ڈالتا ہے۔ آخر یہ دوہرا معیار کیوں ہے؟ اور بہت ہی واضح طور پر ہم لوگوں نے کہا کہ جب تک امریکہ کی خارجہ پالیسی عدل وانصاف پر مبنی نہ ہوگی تب تک مسلمان امریکہ اور اس کی حکومت سے نفرت کرتے رہیں گے۔ اور ہم مسلمانوں کی نفرت امریکیوں سے نہیں امریکی حکومت اور اس کی ظالمانہ وسفا کانہ سیاست سے ہے، جس کے نتیجہ میں فلسطین، عراق، افغانستان میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔

ہمیں سفر پر جانے سے پہلے بھی اطمینان تھا اور دوران سفر اور واپس آنے کے بعد بھی کہ یہ سفر ہم نے اسلامی شریعت کے حدود میں کیا ہے۔ اور ہماری جو داعیانہ ذمہ داری تھی اسے ہم نے پورے طور پر ادا کیا ہے، بلکہ واپس آنے کے بعد ڈومریا گنج میں میں نے دوران خطبۂ جمعہ اور صفا کے امام ابن تیمیہ کانفرنس ہال کے استقبالیہ پروگرام میں کہا تھا کہ فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہنچ کر جو فریضہ انجام دیا تھا انہیں کے نقش قدم پر چلنے کا ایک سنہری موقعہ ہمیں بھی ملا اور اصل میں جب کوئی قوم یا ملت کمزور اور بیمار ہوجاتی ہے تو اس کی ذہنیت اور سوچنے کا انداز بھی مریضانہ ہوجاتا ہے۔ کچھ یہی حال ہمارے ان کرم فرماؤں کا رہا جنھوں نے سفر امریکہ کو بہانہ بنا کر مطعون وملعون کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر ازہریؒ ایمان واخلاق، شرافت ونجابت کا وہ آفتاب وماہتاب ہے جس پر تھوکنے والا خود اپنا چہرہ داغ دار کرتا ہے۔ کھلے دماغ اور کشادہ دلی سے کام لیا جاتا اور اخبارات وجرائد اور عوامی جلسوں کے اسٹیج سے گالیوں کی بوچھار کرنے سے پہلے کاش لوگ مختلف دینی اداروں وجماعتوں کے ذمہ داروں سے رجوع کرتے اور بیٹھ کر تبادلہ خیالات کرتے جس کا سبق خود قرآن وسیرت پاک سے ملتا ہے، تو شاید فضا میں یہ تعفن نہ پھیلتا۔ جب کہ جماعت اہل حدیث، جماعت اسلامی، جمعیۃ العلماء، جماعت تبلیغی، جامعہ سلفیہ، ندوہ، جامعۃ الفلاح غرضیکہ ملت کا کوئی قابل ذکر بلکہ قابل فخر ایسا ادارہ نہ تھا جس کی نمائندگی سفر امریکہ میں نہ رہی ہو۔ پھر اگر ملت کو ان اداروں وجماعتوں پر اعتماد نہیں اور ان کا دین وایمان خریدا وبیچا جاسکتا ہے تو پھر اس ملت کے دین وایمان پر بھروسہ کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

رفیق احمد رئیس سلفی
ادارہ علوم الحدیث، علی گڑھ

استاذ مکرم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

(یادیں اور تاثرات)

استاذ ذی مرتبت ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کی شخصیت، ان کے خاندانی پس منظر، ان کے تعلیمی مراحل، ان کی علمی، تدریسی، تصنیفی، صحافتی اور انتظامی سرگرمیوں کو وہ اصحاب فضل وکمال شرح وبسط سے زیر قلم لا سکتے ہیں جو ان کے ساتھ رہے ہیں، ان کے ساتھ کام کیا ہے یا ان کے اعزہ واقارب میں ان کا شمار ہے۔ ان کی حیات کے یہ پہلو نمایاں ہوں تو شخصیت کو پہچاننے میں مدد ملے گی اور دور کے لوگ بھی ان سے واقف ہوسکیں گے۔ اب تک جو مقالات یا مضامین ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر شائع ہوئے ہیں اور جن کو پڑھنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے، ان میں خاصا مواد موجود ہے۔ اس کو مزید تفصیل سے لکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک سوال ان کی علمی اور تصنیفی خدمات کا ہے، اس کی قدر وقیمت بھی متعین کرنا ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی تمام تصانیف اور علمی کاموں کا بھی تجزیہ ہوگا اور ہم ان سے مستفید ہوسکیں گے۔ ان کی متنوع خدمات کو آشکارا کرنا، ان سے مستفید ہونا اور ان کو عام کرنا ایک جماعتی اور ملی فریضہ ہے۔

میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں، سوچتا ہوں کہ ان کی عظیم شخصیت کے کس پہلو کو نمایاں کروں اور کسے زیر قلم لاؤں۔ جامعہ سلفیہ بنارس میں ان سے تعلق کا تو سوال ہی نہیں تھا، ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا جائے اور وہ بھی ہمارے دور طالب علمی میں بہت کم طلبہ سے راست تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت ان کی مصروفیات تدریسی نہیں تھیں۔ یہ میری اور میرے ہم درس ساتھیوں کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے کچھ دنوں تک عربی ادب کی کتاب ''مختارات'' کے چند اسباق پڑھائے تھے اور اس طرح پڑھایا تھا کہ آج بھی ان کی یاد تازہ ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے فن پر کتنا عبور رکھتے تھے اور تدریس کے میدان میں ان کو کتنا ملکہ حاصل تھا۔ جامعہ کی زندگی میں یہ ان سے استفادہ اور تعلق کی نوعیت ہے۔ میرے ان سے تعلق کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب میں علی گڑھ آیا اور ماہنامہ ''دعوت سلفیہ'' کی ادارت سنبھالی۔ یہ رسالہ حاجی نذیر احمد سلفی رحمہ اللہ اور بھائی عبدالسمیع صاحب ادارہ دارالحدیث سے نکالتے تھے اور اس کے ابھی دو چار شمارے ہی نکلے تھے کہ پروفیسر محمد معین فاروقی حفظہ اللہ اور محترم مولانا محمد عبدالمنان اثری حفظہ اللہ کے حکم سے اس کی ادارت کی ذمہ داری میں نے قبول کی۔ جوش فراواں کے زیر اثر تیز وتند اداریے لکھنا اور ملی اور جماعتی مسائل پر بے باکی

سے اظہار خیال کرنا اس کی خاص پہچان تھی۔ جلد ہی رسالہ ارباب جماعت کی نظر میں آ گیا اور اس کے بعض مضامین موضوع بحث بننے لگے۔ اسی رسالہ سے انھوں نے مجھے پہچانا اور پھر ملاقاتوں اور علمی روابط کا سلسلہ قائم ہوا جو ان کی حیات کے آخری سالوں تک جاری رہا۔ ان کی بعض باتیں مشورے اور علمی مسائل پر تجاویز دل ودماغ میں محفوظ ہیں۔ زیر نظر تحریر میں انھی کو گرفت میں لانے کی کوشش ہوگی اور اسی سے ان شاء اللہ ان کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو سامنے آئیں گے جو میرے خیال میں ان کا امتیاز تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں جب ان کی وفات پر تعزیتی نشست منعقد ہوئی تو راقم بھی اس میں شریک تھا اور پروفیسر کفیل احمد قاسمی صاحب نے اس میں پہلی تقریر کرنے کی دعوت مجھے اس اعلان کے ساتھ دی کہ رفیق صاحب ان کے شاگرد ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان کی شخصیت پر وہی پہلے اظہار خیال کریں۔ میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا لیکن حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وفات کی خبر سے ویسے ہی دل بیٹھا جا رہا تھا، بڑی مشکلوں سے ان کی شخصیت اور فکر سے متعلق چند باتیں عرض کیں۔ اس نشست میں جماعت اہل حدیث کی نمائندگی کے حوالہ سے میں نے یہ بات نمایاں کی اور بعد میں بھی لوگوں نے اسے دہرایا کہ وہ اپنے فکر اور مسلک کی ترجمانی بڑی متانت اور پختگی سے کرتے تھے۔ دوسرے مکاتب فکر کے اہل علم کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات پورے اعتماد سے علمی انداز میں پیش کرتے تھے۔ استاذ جلیل کے استاذ گرامی پروفیسر مختار الدین آرزو صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ جب مجھے ان کی وفات کی خبر ملی تو میں بے چین ہو گیا۔ رات میں دیر تک نیند نہیں آئی۔ آخر ان کے خطوط کا لفافہ طلب کیا اور دیر رات تک ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط پڑھتا رہا جن کی تعداد ایک سو بارہ (غالباً یہی تعداد پروفیسر صاحب نے ذکر کی تھی) تھی۔ ان خطوط سے ان کی ساری یادیں تازہ ہو گئیں۔ پروفیسر کفیل احمد قاسمی صاحب نے شعبہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان کا ہمارے شعبہ سے گہرا اور والہانہ تعلق تھا، ہم کوشش کریں گے کہ ان کے اہم علمی اور ادبی مقالات کا کوئی مجموعہ شعبہ کی طرف سے شائع کریں۔ خدا کرے کہ شعبہ عربی اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو سکے۔

ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کی علمی زندگی کا یہ پہلو انتہائی تابناک رہا ہے کہ انھوں نے جامعہ سلفیہ کی طرف سے تفویض کردہ ذمہ داریوں کو بڑی خوش اسلوبی، خلوص اور امانت داری سے ادا کیا ہے۔ ماہنامہ ''صوت الامۃ'' نہ صرف جامعہ کا ترجمان تھا بلکہ سلفیان ہند کی بھی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس میں شائع ہونے والے تمام مضامین اور مقالات کو دیکھنا، زبان وبیان کے نوک پلک سدھارنا اور عرب اور علمی دنیا میں اسے مقبول بنانا آسان کام نہیں تھا۔ اداریہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہر پہلو پر نظر رکھنا ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ بعض لوگ جن کی علمی دنیا میں کوئی اچھی شناخت نہیں ہے، یہ شکایت کرتے رہے ہیں کہ ان کے یہاں انتاج نہیں ہے، فکر وخیال میں کوئی خاص ندرت اور جدت نہیں ہے، ان کے یہاں مداہنت ہے اور منہج سلف کے خلاف لکھنے بولنے والوں کی پذیرائی ہے۔ یہ شکایت بے

جا ہے اور اپنے زمانہ سے بے خبری کی دلیل ہے۔ڈاکٹر ازہری کے اداریوں پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ منہج سلف اور دعوت کتاب وسنت کے کسی نہ کسی پہلو کو معروضی انداز میں پیش کر کے قارئین کو غور وفکر کی دعوت دے رہے ہیں اور اپنی بات دوسروں کی تحریر سے مدلل کر کے مخالف نقطۂ نظر کے حاملین کو سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔قرآنی حکم حکمت، موعظت اور جدال احسن کی یہی عملی صورت ہے اور یہ صحافت کا ایک خاص اسلوب ہے جس میں انھیں خاص امتیاز حاصل تھا۔آج کتنے لوگ ہیں جو منہج سلف کی دہائی دیتے ہوئے اور غیرت وحمیت کا نعرہ لگاتے ہوئے ثقاہت سے فروتر زبان لکھتے ہیں اور مخالف نقطۂ نظر کے تعلق سے اتنی پھوہڑ اور ناشائستہ تحریر لکھتے ہیں کہ پڑھ کر ابکائی آجائے۔یہ نادان اور سادہ لوح سمجھتے ہیں کہ وہ منہج سلف کی خدمت کر رہے ہیں اور جیسے منہج سلف ان کی خواہشات کی کنیز ہے کہ وہ جو بھی ہفوات تحریر فرمائیں گے وہ منہج سلف قرار پائے گا۔اللہ کی جس کتاب نے معبودان باطلہ کو برا کہنے سے روک دیا ہو کہ کہیں جواب میں وہ تمھارے معبود حقیقی کو گالی نہ دے دیں اور جس نبی رحمت نے یہ فرمایا ہو کہ دوسروں کے ماں باپ کو گالی دینا اپنے ماں باپ کو گالی دینا ہے، اس کا دم بھرنے والے بعض غیر ذمہ دار حضرات دوسرے مکاتب فکر کے علماء کی پگڑیاں اچھالتے ہیں اور ان کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ تم بھی ہمارے علماء پر کیچڑ ڈالو۔علم وفکر سے تہی مایہ یہ لوگ قرآن کی اس آیت کو نہیں دیکھتے کہ وہ عیسائیوں کی گمراہیوں کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان میں جو لوگ خشیت الٰہی سے سرفراز ہیں ان کی تعریف بھی کرتا ہے۔آج یہ کون سا منہج سلف سامنے آیا ہے کہ اس میں کسی کی خوبیوں کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف کمیاں اور کوتاہیاں ہی موضوع بحث بنتی ہیں۔منہج سلف کی تعبیر وتشریح دور حاضر کا ایک اہم موضوع ہے اور یہ ہماری جماعت کی ایک بڑی علمی ضرورت ہے۔دیکھئے کب اس پر کہیں کوئی سیمینار ہوتا ہے اور ہمارا ذہن صاف ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بڑی خوبی تھی کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس طرح کی کمزوری کو در آنے کا کبھی موقع نہیں دیا۔منہج سلف کی ترجمانی ہمیشہ کتاب وسنت اور سلف کی روشن تعلیمات کے ذریعہ فرماتے رہے۔نبی اکرم ﷺ کے کئی ایک ارشادات ''مابال اقوام....'' سے شروع ہوتے ہیں۔کیا نبی رحمت کو متعلقہ شخصیات کے اسمائے گرامی معلوم نہیں تھے۔معلوم تھے، اچھی طرح معلوم تھے لیکن آپ ان کی عزت ملحوظ رکھتے تھے۔خطبہ دیا، باتیں ارشاد فرمائیں، تنبیہ کی اور اپنا اسوۂ مبارک بتادیا۔متعلقہ لوگ متنبہ ہوگئے اور دوسروں کو بھی نصیحت مل گئی۔کیا سلفی منہج یہ نہیں ہے کہ صرف افکار ونظریات زیر بحث لائے جائیں، ان کی علمی تردید دلیل وبرہان سے کی جائے، کتاب وسنت سے دلائل دیے جائیں اور فریضۂ دعوت کا حق ادا کردیا جائے۔لہک لہک کر ناموں کا اعلان کرنا، دلوں میں جھانکنا، شبہات ظاہر کرنا، سوئے ظن میں گرفتار ہونا، الزام تراشی کرنا اور غیر مہذب زبان تحریر کرنا کون سا سلفی منہج ہے۔جماعت حقہ کے یہ نام نہاد خیر خواہ اور نادان دوست دعوت کتاب وسنت کی پوری جدوجہد کو سبوتاژ کر رہے ہیں اور غیروں کی نظر میں اس کے علمی وقار کو

مجروح کررہے ہیں۔ واللہ المستعان۔

"صوت الأمة" عربی زبان میں جماعت کا واحد رسالہ ہے جوایک تسلسل کے ساتھ شائع ہورہا ہے اور عالم عرب میں اسے وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کا اسے پابندی سے نکالتے رہنا کسی معجزہ سے کم نہیں ہے۔ ان کے اداریوں کو بے جان اور پھسپھسا کہنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کوئی کام پابندی سے کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ کئی ایک عربی رسالے جماعت کے اداروں نے جاری کیے لیکن انجام سب ہی کو معلوم ہے۔ مزاج یکساں نہیں ہوتا، طبیعت برابر نہیں رہتی، گھر اور باہر کے دسیوں مسائل گھیرے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی ذمہ داری نبھاتے رہنا اور اس میں کسی طرح کا فرق نہ آنے دینا ایک عظیم کارنامہ ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جماعت کے بعض اداروں کے ترجمان میں ایک خاص قسم کے اداریے شائع ہوئے جس میں یہ تحریر کیا گیا کہ جمعیۃ کے قائدین نے قحط الرجال کا شوشہ فقط زیب داستان کے لیے بڑھا دیا ہے ورنہ ہماری جمعیۃ میں رجال کار کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ماہنامہ "دعوت سلفیہ" علی گڑھ میں راقم نے بھی اسی مضمون کا ایک پر جوش اداریہ بعض علمی شخصیات کے حوالہ سے تحریر کردیا جن کو ہمارے بعض ثقہ اداروں نے اپنے یہاں سے رخصت کردیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر سے جب یہ تحریریں گزریں تو انھوں نے ان کا راست نوٹس لینے کی بجائے چند قدیم علمائے اہل حدیث کی بعض تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل ایک مختصر مضمون ماہنامہ محدث میں تحریر فرمایا جن میں قحط الرجال کی شکایات موجود تھیں۔ کسی کا نام لینے یا کسی کا جواب دینے کی بجائے انھوں نے بالکل معروضی انداز اپنایا اور جماعت کے اصحاب فکر کو بتادیا کہ قحط الرجال کا شوشہ موجودہ قیادت نے زیب داستان کے لیے نہیں بڑھایا ہے بلکہ ہمارے اسلاف کو اس کا احساس بہت پہلے سے رہا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دور حاضر میں سلفی فکر و منہج کو جس علمی انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے، اس کے لیے افراد کہاں ہیں اور اگر ہیں تو نشان دہی کی جائے کہ وہ کون کون ہیں۔

دینی اداروں میں جس طرح کے مسائل ہوتے ہیں اور انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ کے درمیان جس طرح کے روابط ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا انتظام سنبھالنے والے اچھی طرح واقف ہیں۔ آزاد ہندوستان میں حکومت سے تعاون لیے بغیر ان اداروں کو چلانا اور ان سے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنا بہت زیادہ آسان نہیں ہے۔ ساحل پر کھڑے ہوکر تماشہ دیکھنے والے ان کی داخلی اور بیرونی پیچیدگیوں کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ طالب علمی کے دور میں ناپختہ ذہن کے ساتھ ہم طلبہ بھی بہت اچھل کود مچایا کرتے تھے۔ اس اچھل کود کو توانائی بعض نوعمر اساتذہ بھی بسا اوقات فراہم کردیا کرتے تھے اور اس طرح ہمیں اپنی شرارتوں پر کلی اعتماد ہوجاتا تھا۔ اسی طرح کے حالات میں بعض دینی اداروں میں ہڑتال ہوتی ہے اور طلبہ ہنگامہ کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ جامعہ سلفیہ بنارس کے ساتھ بھی یہ حادثہ پیش آیا اور اس کے نتیجہ میں بہت سے طلبہ کا اخراج عمل میں آیا۔ ڈاکٹر ازہری صاحب ان ایام میں بیرون ہند کے دورے پر تھے۔ واپس آئے تو ظاہر ہے کہ ان کو اس کا بڑا صدمہ تھا لیکن

جو فیصلہ لیا جا چکا تھا اس میں وہ بہت زیادہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ہم میں سے بعض طلبہ کو اس کا بڑا غصہ تھا اور اس کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں ہو جایا کرتا تھا۔ڈاکٹر صاحب کو اس صورت حال کا مکمل علم رہتا تھا اور وہ طلبہ کے ذہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔اسی سلسلے میں ایک بار دہلی میں ملاقات ہوئی تو شفقت سے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: آپ سے کچھ اکیلے میں بات کرنی ہے۔چنانچہ سہا سہا ان کے ساتھ مرکزی جمعیۃ کے ایک کمرے میں گیا۔انھوں نے سامنے کرسی پر بٹھایا اور فرمایا کہ آپ حضرات کی ساری تحریریں میری نظر سے گزرتی ہیں اور میں ان کو توجہ کے ساتھ پڑھتا ہوں۔یہ بات بالکل درست ہے کہ جامعہ سلفیہ کے فیصلہ سے بعض معصوم اور بے گناہ طلبہ متاثر ہوئے ہیں۔ہم سب کو اس بات کا احساس ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مادر علمی سے نفرت کی جائے اور جماعت کے سب سے بڑے ادارے کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ کیا جائے۔اپنی صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کرو۔مجھ سے کوئی مدد چاہتے ہو تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔انھوں نے اپنی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ میں بھی جامعہ فیض عام کا نکالا ہوا ہوں۔لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کروں۔تم لوگ اپنے رویہ کو بدلو۔جامعہ سلفیہ نے جو فیض پہنچایا ہے اسے بروئے کار لاؤ اور مثبت انداز میں کام کرو۔ان کی یہ نصیحت دل میں بیٹھ گئی اور پھر اس پہلو پر سوچنا اور لکھنا بند ہو گیا۔آج جب ڈاکٹر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں ان کی یہ باتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں اور سوچتا ہوں کہ اگر ان کی یہ نصیحت نہ ملی ہوتی تو قلم کہاں کہاں بھٹکتا اور اس کی آوارگی کہاں لے جاتی، اس کا تصور بھی سوہان روح ہے۔یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ہے ورنہ وہ علم اور منصب کے اعتبار سے جتنے بڑے تھے، اس کے سامنے ہم خوردوں کی کیا اوقات تھی۔آج کتنے لوگ ہیں جو برگشتہ طلبہ کو سدھارنے کا یہ ہنر اپناتے ہیں اور پوری فکر مندی سے ان کو راہ راست دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کی ایک خصوصیت ان کی علم دوستی اور علم نوازی بھی تھی۔علمی کاموں کی توقیر کرنا اور اسے سراہنا ان کا نمایاں وصف تھا۔میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں کہ کسی کام کا تعارف کر رہے ہیں تو کلیجہ بھنچ بھنچ جاتا ہے اور الفاظ بڑی مشکلوں سے نکلتے ہیں۔ایک بڑی شخصیت کے بعض علمی نوادرات کی ترتیب دینے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ایک صاحب نے اس کا تعارف کرایا لیکن پورے تعارف میں بڑی مشکل سے ایک جملہ آیا کہ فلاں صاحب نے یہ کام کر کے ایک علمی خدمت انجام دی ہے حالانکہ اسے پڑھنے، سمجھنے اور ترتیب دینے میں تقریباً چھ ماہ کا عرصہ صرف ہوا۔اس میں درج فقہی مسائل کو تفصیل سے مرتب کیا۔اس کے شائع ہونے پر ایک دوسرے بزرگ نے اپنے پاس موجود اسی شخصیت کے نوادرات کے منتشر اوراق ارسال کر دیے اور فرمایا کہ کئی لوگوں کے حوالہ اسے کیا لیکن کوئی اسے نہ پڑھ سکا اور نہ اسے میری مرضی کے مطابق مرتب کر سکا۔شخصیت سے محبت اور عقیدت نے آمادہ کیا کہ اسے بھی مرتب کروں اور بحمد اللہ یہ مجموعہ بھی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا۔اتنی محنتوں کے بعد جو علمی خدمت

انجام پائی جس پر کسی مادی فائدہ کی امید نہیں تھی، ایک عزیز نے جب ان دونوں نوادرات کے فقہی حصہ کو اپنے ایک بڑے مجموعہ میں شامل کیا تو کتابیات کی فہرست میں جہاں ان دونوں مجموعوں کا ذکر کیا، معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر مرتب کا نام نہیں درج کیا۔اس طرح کی سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں، لیکن استاذ جلیل کی علم دوستی اور قدر دانی دیکھئے کہ جب علی گڑھ میں شیخ صلاح الدین مقبول احمد حفظہ اللہ کے تعاون سے ''علوم حدیث: مطالعہ وتعارف'' کے موضوع پر سیمینار کیا اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کے لیے بنارس حاضری ہوئی تو پہلے انھوں نے موضوع کی نزاکت کا احساس دلایا اور کہا کہ یہ بڑا کام ہے، تم اتنے کم وسائل کے ساتھ اسے کیسے انجام دے سکو گے۔سیمینار کی تاریخوں کا اعلان ہوا اور اہل علم کی آمد کی منظوری مل گئی تو یہ ازہری صاحب کی ذات گرامی تھی کہ جامعہ کے تین اساتذۂ کرام کو جامعہ کے خرچ پر سیمینار میں بھیجا اور ہمارے اوپر اس کا بار نہیں آنے دیا۔سیمینار کی کامیابی کی جب رپورٹ انھیں ملی تو بہت خوش ہوئے اور فون کرکے مبارک باد دی اور دیر تک اس کی تفصیلات سنتے رہے۔کچھ ہی دنوں بعد اپنا مقالہ بھی مرتب کرکے بھیج دیا۔پھر جب برادر محترم مولانا عبدالمنان سلفی حفظہ اللہ کی کوششوں سے مجموعۂ مقالات کی اشاعت کا انتظام ہوا اور میں نے پورے ایک سال تک محنت کرکے اسے شائع کیا تو بے پناہ خوشی کا اظہار فرمایا اور یہ بات کئی لوگوں کے سامنے کہی کہ مجھے حیرت ہے کہ اتنا بڑا، بیش قیمت اور مہتم بالشان مجموعہ تم نے اکیلے ترتیب دے کر کیسے شائع کردیا۔ہم نے کئی سیمینار کیے لیکن ان کے مقالات کی ترتیب آج تک نہیں ہو پائی ہے۔میرے مطالبہ کے بغیر اس مجموعۂ مقالات پر ماہنامہ ''صوت الامۃ'' کا اداریہ لکھا اور دل کھول کر اس کی تعریف کی۔حدیث نبوی پر مقالات کا یہ مجموعہ آج بحمد اللہ مرجع کی حیثیت سے استعمال ہورہا ہے۔پاکستان سے بھی اس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔اللہ تعالیٰ ان تمام دوستوں کو دنیا اور آخرت میں سرخروئی عطا فرمائے جنھوں نے اس میں کسی طرح کی بھی مدد فرمائی ہے۔جماعت کے مستند مورخ اور عظیم مصنف مولانا محمد اسحاق بھٹی حفظہ اللہ نے مجموعۂ مقالات کی وصولیابی پر مفصل خط تحریر فرمایا تھا جس میں انھوں نے اسے غیر مسبوق ایک اہم علمی خدمت قرار دیا تھا، یہاں گنجائش نہیں ہے کہ ان کی تحریر درج کروں، ان شاء اللہ کسی اور موقع سے قارئین ذی اکرام کی خدمت میں اسے پیش کیا جائے گا۔ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کے دل میں اس کام کی بڑی وقعت تھی اور وہ برملا اس کا اظہار فرماتے تھے۔

اسی طرح جب برادر محترم مولانا عبدالواحد مدنی حفظہ اللہ کی علم دوستی سے متاثر ہوکر میں نے ''صفا شریعت کالج'' کے آرگن ''ماہنامہ نداء الصفا'' کی ادارت سنبھالی اور پھر اسی تعلق سے ''صفا شریعت کالج'' میں کئی ایک سیمینار کا خاکہ مرتب کرنے کی سعادت حاصل ہوئی تو ان سے مزید قربت پیدا ہوئی۔مولانا عبدالواحد مدنی کا شمار ان کے قریبی تلامذہ میں ہوتا ہے اور وہ ہر طرح کے علمی کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کی ذرہ نوازی اور علم دوستی کو اس کے ایک سیمینار کے حوالہ سے بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔مولانا عبدالواحد مدنی حفظہ اللہ کو

اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ مدارس دینیہ میں قرآن کی تعلیم وتدریس کے جو اثرات ظاہر ہونے چاہئیں، وہ نہیں ہورہے ہیں۔خاص طور پر سلفی مدارس نے جتنے اہتمام سے حدیث کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری کیا ہے،اس طرح کا اہتمام کسی وجہ سے قرآن پاک کے بارے میں نہیں ہو پایا ہے۔انھوں نے فون پر تفصیل سے اپنے خیالات ظاہر فرمائے اور حکم دیا کہ ''مدارس کے نصاب تعلیم میں قرآن کا مقام اوراس کا منہج تدریس'' کے مرکزی عنوان پر ایک سیمینار کا خاکہ مرتب کر کے ارسال کرو۔علی گڑھ میں اپنے حلقۂ احباب سے مشورہ کر کے ایک مفصل خاکہ مرتب کیا اور انھیں بھیجا۔انھوں نے اس خاکہ کو ڈاکٹر ازہری صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔انھیں بھی یہ پسند آیا اور پھر جماعت کی تاریخ میں اس نوعیت کا پہلا سیمینار ''صفا شریعت کالج'' نے منعقد کیا۔مختلف مکاتب فکر کے اہل علم کتاب الٰہی کے تعلق سے کشاں کشاں سیمینار میں تشریف لائے اور بہت کامیاب سیمینار منعقد ہوا۔ڈاکٹر ازہری صاحب اس سیمینار کے صدر نشیں تھے اور اس کی تمام نشستوں میں اسٹیج پر موجود رہے،اپنا گراں قدر مقالہ بھی پڑھا اور قراردادیں بھی مرتب کرائیں۔مولانا مدنی کے حکم کے مطابق جب اس سیمینار کے مقالات کا مجموعہ مرتب کیا اور قرآن اکیڈمی،ڈومریا گنج نے اسے شائع کیا تو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور جامعہ سلفیہ کے عربی ترجمان میں اس پر بھی مفصل اداریہ تحریر فرمایا جس میں خاکسار کے مقدمہ کے بعض اقتباسات کا ترجمہ بھی اپنے تبصرہ میں شامل کیا۔آج سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ازہری صاحب کو ہم سے کیا لالچ تھی،کیوں انھوں نے اس خدمت کو جماعت کی تاریخ کا ایک حصہ بنادیا۔سمجھ میں آتا ہے کہ ان کی علم دوستی نے انھیں اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ان کا یہ بھی جذبہ تھا کہ یہ ہمارے شاگرد مستقبل کے معمار ہیں،ان کی حوصلہ افزائی ضروری ہے تاکہ یہ مزید محنت سے جماعت کی علمی ضروریات پوری کریں۔آج کتنے مدعیان زہد اتقا ہیں جو دوسروں کے علمی کاموں کو نہ صرف نظر انداز کرتے ہیں بلکہ اگر کہیں اس کا ذکر آجائے تو ان کے منہ کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے صحیح ہے کہ حسد سب سے بڑی برائی ہے اور انسان کی ساری نیکیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔قرآن کے مجموعۂ مقالات کے تعلق سے یہ حقیقت بھی حیرت ناک ہے کہ ہماری جماعت کے کسی دوسرے رسالہ کو اس مجموعۂ مقالات کا تعارف کرانے کی توفیق نہیں ملی،البتہ پاکستان میں ڈاکٹر سفیر اختر صاحب کو میرے مخلص دوست مولانا سراج الدین مکی نے اس کی دو کاپیاں ارسال کردی تھیں،انھوں نے ''سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد'' میں اس پر مفصل تبصرہ کیا اور دل کھول کر اس کی تعریف کی اور ادارہ سے درخواست کی کہ اسے یہاں بھی شائع کرنے کی اجازت دی جائے۔

صفا شریعت کالج کے ایک سیمینار سے فارغ ہوکر ڈاکٹر ازہری صاحب کی معیت میں جامعہ اسلامیہ دریاباد حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔بہت دنوں سے خواہش تھی کہ اس عظیم اور اپنی نوعیت کے منفرد ادارہ کو دیکھا جائے۔اللہ نے یہ خواہش پوری فرمائی اور وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی معیت میں۔قافلہ میں شیخ اسعد اعظمی اور دیگر حضرات بھی تھے۔جامعہ کے ذمہ داران نے پر تپاک خیر

مقدم کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا بھی یہ پہلا سفر تھا، انھوں نے جامعہ کو دیکھ کر بڑی خوشی ظاہر فرمائی اور ذمہ داروں کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔ وہاں ایک مشکل مرحلہ یہ بھی تھا کہ طلبہ اور اساتذہ کو خطاب کرنا ہے۔ ہم سب مسجد میں حاضر ہوئے اور تمام لوگوں نے تحیۃ المسجد کی ادا کی اور پھر پروگرام کا آغاز ہوا۔ قافلہ کے تمام ہی شرکاء کو خطاب کرنا تھا۔ مجھے بھی خطاب کی دعوت دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں خطاب کرنا اور وہ بھی کوئی کام کی بات کہنا ایک بڑی آزمائش تھی۔ زیادہ بولنے کی بیماری تو پہلے سے تھی، کھڑا ہوا تو وقت کا پتہ نہیں چلا اور بہت کچھ کہہ گیا۔ طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے ایک بات یہ بھی عرض کی کہ دارالاقامہ میں رہتے ہوئے بسااوقات گھر جیسی پریشانی آسکتی ہے۔ ہم اپنے گھر میں رہتے ہوئے جس طرح اس پریشانی کو انگیز کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں یہاں بھی ان کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ اداروں میں اس طرح کی باتوں کو لے کر الجھن کھڑی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور یہ آپ کی تعلیمی زندگی کے لیے بہت مضر ہے۔ دوسری بات جامعہ کے امتیازات کا ذکر کرتے ہوئے یہ عرض کی کہ ہماری جماعت میں بحمد اللہ احادیث نبوی کی تحقیق وتخریج میں کافی پیش رفت ہوئی ہے اور محدث عصر علامہ البانی رحمہ اللہ نے تو اس سلسلہ کو بلندیوں تک پہنچا دیا ہے۔ آج ضرورت ہے کہ فقہ الحدیث پر بھی کام کا آغاز کیا جائے اور محدثین کرام نے سنن وجوامع مرتب کرکے احادیث رسول کو جس طرح زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے سہل الوصول بنایا تھا، ہم اس سلسلے کو آگے بڑھائیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اگر ایک حدیث کو دس ابواب میں ذکر کرکے دس مسائل مستنبط کیے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان سے زمانہ کی ضروریات کے مطابق گیارہواں اور بارہواں مسئلہ مستنبط نہ کریں۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے جب خطاب فرمایا تو میری بعض باتوں کی تائید وتصویب فرمائی اور اس کی مزید وضاحت فرمائی۔ یہ بھی فرمایا کہ فقہ الحدیث پر کام کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے اور اس کے لیے انھوں نے حافظ محمد عمران لاہوری حفظہ اللہ کی تحریر فرمودہ کتاب ''فقہ الحدیث'' کا حوالہ دیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب کی ذرہ نوازی دیکھیے کہ انھوں نے تمام مثبت باتوں کی تائید فرمائی اور جہاں جہاں انھیں نظر آیا کہ اس پر حاشیہ لگانے کی ضرورت ہے، وہاں اپنے بیش قیمت خیالات سے ہمارے علم میں اضافہ فرمایا۔ بعض حضرات کے پندار علم کا عالم یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی بات کہنی ہے کسی کا ذکر کیوں کیا جائے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی منفرد تھی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی اور جہاں فکر ونظر میں کمی یا کوتاہی محسوس کی، اس پر خوبصورتی سے متنبہ بھی کیا۔ دریاباد کا یہ سفر بڑا دلچسپ تھا، طرح طرح کی علمی باتیں ہوتی رہیں اور ڈاکٹر صاحب اس میں ایک دوست کی طرح شریک رہے۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا، اس کا تعلق بھی ڈاکٹر صاحب کے ایک خاص زاویہ نگاہ سے ہے۔ دوران سفر علمی باتیں ہورہی تھیں کہ بعض بڑی شخصیات کے بعض تفردات کا ذکر آگیا۔ ان دنوں میں ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی حفظہ اللہ کی کتاب ''ابو ھریرۃ فی ضوء مرویاتہ'' سے کچھ احادیث کا ترجمہ

''ماہنامہ نداء الصفا'' میں شائع کر رہا تھا۔ میری نظر اس میں ایک جگہ یہ دیکھ کر رک گئی کہ ڈاکٹر اعظمی صاحب نے طلاق بائن کے بعد حلالہ کے مسئلہ میں احناف کے نقطۂ نظر سے ملتی جلتی بات لکھی ہے۔ میں نے جب ڈاکٹر ازہری صاحب سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا: کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ان کی تعلیم جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ہوئی ہے۔ یہی کہہ کر انھوں نے اپنی بات مکمل کر دی اور شرکائے سفر کی سمجھ میں بات آ گئی۔

جامعہ میں ایک ایسا نازک وقت بھی ان پر آیا جب ان کا طرز عمل بعض محترم ذمہ داروں کو گراں گزرنے لگا اور ان کی ذات گرامی کے تعلق سے شکایات پیدا ہونے لگیں۔ اس مسئلہ میں کس کا موقف درست تھا اور کس کا غلط تھا۔ یہ فیصلہ کرنا نہ میرا کام ہے اور نہ مجھے حق ہے کہ اس پر اظہار خیال کروں۔ انھی دنوں ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لائے۔ یہ باتیں میں بھی سن چکا تھا۔ یونیورسٹی کے مہمان خانہ میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو اس تعلق سے اپنی تشویش ظاہر کی۔ انھوں نے فرمایا کہ تم نے جو کچھ سنا ہے وہ صحیح ہے لیکن جس جامعہ میں اپنی ساری صلاحیتیں لگا دی ہیں اور جس جامعہ سے قلبی تعلق اور گہرا لگاؤ ہے، اسے کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ بات انھوں نے اس پس منظر میں کہی تھی کہ ان کے بعض تلامذہ کا مشورہ تھا کہ جامعہ چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر صاحب کے لیے دنیا پڑی تھی، وہ اپنے لیے کہیں بھی جگہ بنا سکتے تھے لیکن جامعہ کی خدمت کو انھوں نے ترجیح دی اور آخر کار بدلے ہوئے حالات میں اپنے لیے جگہ بنائی اور زندگی کی آخری سانس تک اس سے وابستہ رہے۔ آج سوچتا ہوں تو دل بھر آتا ہے کہ میری طالب علمی کے زمانے میں جس استاذ جلیل کے رعب اور دبدبے کا عالم یہ تھا کہ ان کے حکم اور مشورہ کے بغیر کوئی پتہ نہیں ہلتا تھا، اسی جامعہ میں انھوں نے اپنے شاگردوں اور خوردوں سے تال میل بنا کر جامعہ کی خدمت کی۔ اپنے مقام اور مرتبہ سے تنازل کیا، لیکن ایک روحانی تعلق تھا جامعہ سے، اس کی خاطر انھوں نے سب کچھ گوارا کیا۔ ان کے کتنے شاگردوں نے ذرا سی بات پر اختلاف ہوتے ہی ان مدارس سے استعفا دے دیا جہاں ان کو مامور کیا گیا تھا اور اپنا ذاتی ادارہ کھول کر بیٹھ گئے اور آج وہ شاداں وفرحاں ہیں، پھل پھول رہے ہیں اور طالبان علوم نبوت کی تعلیم وتربیت کا اپنا مستقل نظام چلا رہے ہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب چاہتے تو الگ سے ایک جامعہ کھول دیتے اور اس کے موسس بن کر آزادی سے دن گزار لیتے لیکن انھوں نے ایسا نہ کبھی سوچا اور اور نہ اس کی منصوبہ بندی کی۔ آج خیال آتا ہے کہ ان کی وفات کے بعد جامعہ نے ان کے لیے کیا کیا اور وہ ان کے لیے کر بھی کیا سکتی ہے۔ منصب، فرائض اور ذمہ داریوں کے تعلق سے آج کچھ لوگ اس مرد درویش کو ہدف ملامت بنا رہے ہیں جس نے اندھیروں میں بھی سلفیت کا چراغ روشن رکھا اور جہاں جہاں گیا، سلفیت کی عزت وآبرو کو چار چاند لگا کر واپس آیا۔ خون جگر جلاتا رہا اور کسی ستائش اور صلہ کی تمنا کیے بغیر سلفیان ہند کے مرکزی ادارہ کی شہ رگ بنا رہا اور زندگی کی آخری سانس تک صرف اس کی تعمیر وترقی کے بارے میں فکر مند رہا۔ اللہ ان کی خدمات کا اجر عظیم انھیں

عطا فرمائے اور اپنے محبوب بندوں میں ان کو شامل فرمائے۔آمین۔

ایک مرتبہ بنارس حاضری کے موقع پر عرض کیا کہ اب کمپیوٹر آ گیا ہے،علمی کاموں کے لیے اس کا استعمال کریں تو فرمایا:میاں ٹائپ رائٹر سیکھ لیا تھا تو مصر سے آنے کے بعد جامعہ میں ساری مراسلت ٹائپ رائٹر سے مجھے ہی کرنی پڑتی تھی یہاں تک کہ ہاتھ سے لکھنے کی نوبت کم آتی تھی۔اب کمپیوٹر سیکھ کر اس عمر میں اپنے لیے کوئی نئی پریشانی بڑھانے کا ارادہ نہیں ہے۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جامعہ کی کس قدر خدمت کی ہے اور اپنی بھرپور زندگی میں اسے کہاں سے کہاں پہنچایا ہے۔

ایک قابل صد احترام استاذ نے جو شعر وادب اور تحریر وانشا سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں، اپنا مجموعۂ کلام شائع کیا ہے۔مجموعہ کلام کا نام انھوں نے کافی غور وفکر کے بعد تجویز کیا ہے۔ان کا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ وہ جہاں جہاں گئے اور جن جن لوگوں سے واسطہ پڑا،انھوں نے انھیں خون کے آنسو رلائے ہیں۔چاہے وہ مدینہ طیبہ کی پاک سرزمین ہو،بنارس میں جامعہ سلفیہ کا پروقار کیمپس ہو،فیجی کی دعوت وتربیت کی پیاسی زمین ہو یا علی گڑھ کا علم وہنر کا شہر ہو،ہر جگہ آنسو دینے والے لوگ ملے اور انھوں نے ظلم وستم کی انتہا کردی۔مقدمہ کتاب میں جو کچھ صیغۂ غائب سے تحریر کیا ہے ،اس کے بارے میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کسی نے ظلم وزیادتی کی ہو اور بدخواہی کرکے اپنی عاقبت خراب کرنے کا سامان کیا ہو لیکن شاید دنیا میں اس کا کوئی حتمی اور آخری فیصلہ نہ ہو سکے۔اب یہ فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا کہ کس نے کس پر ظلم کیا اور کس نے کس کو آنسو دیے ہیں۔علیم وخبیر ہستی سے نہ کوئی راز مخفی ہے اور نہ اس کے دربار عالی میں لفظوں سے کھیلنے کا کسی کو کوئی موقع ملے گا اور نہ اس کی کوئی قیمت ہوگی۔راقم سطور اچھی طرح جانتا ہے کہ منہج سلف یہ ہے کہ استاذ کا احترام کیا جائے،ان کی توقیر کی جائے،ان کا نام عزت سے لیا جائے اور اللہ سے ہمیشہ یہ دعا کی جائے کہ وہ جہاں کہیں رہیں اپنے اہل وعیال کے ساتھ شاداں وفرحاں رہیں،ذہنی سکون کے ساتھ زندگی گزاریں اور ہر ابتلا اور آزمائش سے محفوظ رہیں۔کہنے کو آدمی بہت کچھ کہہ سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اور حاصل کیا نکلے گا۔اللہ ہی سے فریاد کی جاسکتی ہے کہ صرف وہی ظالموں سے انتقام لینے والا ہے۔یہ مجموعہ کلام ابھی تازہ تازہ آیا تھا کہ میرا دہلی جانا ہوا۔دارالدعوۃ میں مجلہ ''الحکمۃ'' کی فائلیں دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر ازہری صاحب بغل میں فائل دبائے تشریف لائے،ان دنوں وہ اپنے صاحب زادے ڈاکٹر فوزان لکچرر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پاس مقیم تھے۔ملاقات ہوئی دعا سلام کے بعد علی گڑھ کے حالات معلوم کیے اور دیر تک کئی علمی مسائل پر گفتگو فرماتے رہے۔دوران گفتگو جب میں نے اس شعری مجموعہ کے مقدمہ کا ذکر کیا تو فرمایا:تمھاری طرح کئی دوسرے شاگردوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا مقدمہ نہ اب تک پڑھا ہے اور نہ پڑھنے کا ارادہ ہے۔بعض حضرات نے اس کے مندرجات سے واقف کرایا ہے۔اس کے بعد فرمایا کہ اب جب کہ تم نے ذکر چھیڑ ہی دیا ہے تو ان کے جامعہ سلفیہ میں تشریف لانے اور پھر جامعہ سے بیرون

ملک جانے کی پوری تفصیل بھی سن لوتا کہ تم لوگوں کو بھی معلوم ہوجائے کہ میں نے ان کے ساتھ کیا کیا ہے اور انھوں نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے۔ پوری تفصیل بتاتے ہوئے نہ انھوں نے کوئی ناشائستہ لفظ استعمال کیا اور نہ ان کی شان میں کوئی نازیبا کلمہ کہا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ استاذ ذی اکرام کس قدر وسیع الظرف تھے اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں کے بارے میں کتنی احتیاط سے لفظوں کا استعمال کرتے تھے۔ ہر فرد کا اپنا زاویہ نظر ہوتا ہے، اس کو بھی سنجیدگی اور توجہ سے سننا چاہئے۔ اپنے عزیز ترین شاگرد کی اس تحریر کو انھوں نے برداشت کیا اور اس پر تاحیات صبر بھی کرتے رہے، مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے اپنی کسی تحریر میں اس کی ادنی شکایت بھی کی ہو۔

بنارس کے ایک سفر میں ان کے آفس میں حاضری دی۔ کئی ایک مسائل پر گفتگو ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ جماعت میں اس وقت بعض ایسے موضوعات پر کام کرنے کی ضرورت ہے، جن سے مسائل بھی واضح ہوجائیں اور کتاب وسنت اور منہج سلف کی نمائندگی بھی ہوجائے۔ فرمانے لگے: کون اس کے لیے اپنے کو فارغ کررہا ہے، کس کو فرصت ہے کہ ان موضوعات پر علمی تصانیف تیار کرے۔ تم آج یہ بات کہہ رہے ہو میں نے تقریباً دوسو موضوعات کی فہرست تیار کی ہے جن پر علمی اور تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ملازم سے اپنی الماری سے ایک رجسٹر نکلوایا اور میرے سامنے رکھ دیا۔(۱) میں نے اسے مکمل دیکھا تو اندازہ ہوا کہ استاذ ذی اکرام کو ان تمام علمی تقاضوں کا احساس ہے لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے والے رجال کار کہاں ہیں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ رجسٹر کس کے پاس ہے۔ اگر جامعہ سلفیہ میں ہے تو وہاں کے محترم اساتذہ کو اس سے استفادہ کرنا چاہئے اور اگر اہل خانہ کے پاس ہے تو ڈاکٹر فوزان صاحب سے درخواست کروں گا کہ اسے کسی مقالہ کی صورت میں مرتب کرکے جماعت کے کسی رسالہ میں شائع کردیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک علمی امانت ہے جو ڈاکٹر ازہری کی طویل علمی زندگی کا حصہ ہے۔ کیا معلوم اللہ کسی بندے کو ان موضوعات میں سے کسی پر کام کرنے کی توفیق دے دے اور اس طرح ڈاکٹر صاحب کی حسنات میں ایک اور اضافہ ہوجائے۔

اسی سفر میں اپنے اس کرب کا بھی اظہار کیا کہ جماعت کے بعض افراد میں دوسرے اہل بدعت کی طرح سختی آتی جارہی ہے اور وہ بھی نماز کی اقتدا کے معاملہ میں افراط وتفریط کا شکار ہورہے ہیں۔ ہمارے قدیم علمائے اہل حدیث مثلاً مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری، مولانا محمد اسماعیل گجرانوالہ، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور مولانا عبید اللہ رحمانی رحمہم اللہ کا یہ نقطہ نظر کبھی نہیں تھا۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق کیا اور کئی مقامات کے بعض واقعات سنائے جہاں یہ ناگفتہ بہ صورت حال پیدا ہوچکی ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ اس موضوع پر جماعت

(۱) افسوس کہ یہ رجسٹر پوری کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکا۔ متعلقہ ذمہ داروں نے اس سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ورنہ ان موضوعات کی پوری تفصیل اس شمارے میں ضرور ملتی۔ (ادارہ)

کے سرکردہ علماء کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی سرپرستی میں بیٹھنا چاہیے اور اس کا کوئی حل تلاش کرنا چاہیے۔

گزشتہ کئی سالوں سے افراد جماعت ملک کے مختلف حصوں میں بعض جوشیلے مقررین کا پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ یہ ہمارے شعلہ بیان مقررین چونکہ بہت مصروف رہتے ہیں، ان کی مانگ بھی بہت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ حضرات اپنا حق خدمت بھرپور انداز میں وصول کرتے ہیں۔ اس طرح کے مقررین نے ہمارے عوام کے مزاج کو بھی بہت متاثر کیا ہے۔ اب انھیں بھی اپنی اصلاح سے زیادہ دوسروں پر میزائل برسانے میں لطف آتا ہے۔ یہ مقررین عوام کی اس نفسیات کو بھلی بھانت جانتے ہیں اور اس کا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جاہل اور بے شعور عوام اپنی ان حرکتوں سے اپنے مقامی علماء کو اذیت پہنچاتے ہیں اور انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔ میں نے کٹیہار کا وہ علاقہ بھی دیکھا ہے جہاں کے عوام سیلاب سے پریشان ہیں، غربت ہے، جہالت ہے، لیکن مسلک کا درد اور اس کی حمیت بہت ہے۔ اس طرح کے بعض مقررین وہاں منصوبہ بندی کرکے تشریف لے جاتے ہیں اور ماہ دو ماہ قیام کرکے ہزاروں روپے غریب عوام سے سمیٹ لاتے ہیں۔ دین سیکھنے کے لیے کیا اس کی ضرورت ہے اور کیا اس طریقہ سے دین سکھایا جاسکتا ہے۔ بنارس کے ایک سفر میں جامعہ کے مہمان خانہ میں یہی مسئلہ زیر گفتگو تھا۔ انہی دنوں ڈاکٹر صاحب کے اپنے وطن مئو میں اس طرح کا ایک واقعہ رونما ہوا تھا، جس سے شہر میں فساد کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی تفصیل بتائی اور بڑے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ میرے اپنے محلّہ میں یہ جلسہ تھا۔ میں اسٹیج پر تقریر کررہا تھا کہ شعلہ بیان مقرر تشریف لے آئے۔ اتنے میں مجمع سے آوازیں آنے لگیں کہ ازہری صاحب اپنی تقریر بند کیجیے۔ میں کیا کرتا۔ تقریر ختم کی اور اسٹیج کے نیچے اتر گیا۔ یہ ہیں اہل حدیث عوام۔ ہم نے ان کی کیا تربیت کی ہے اور ہم انھیں کس دین کی تبلیغ کررہے ہیں۔ ابھی تک انھیں یہی نہیں معلوم کہ علم کسے کہتے ہیں اور عالم دین کون ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک بار علی گڑھ تشریف لائے۔ میں پورے دن ان کے ساتھ رہا۔ اس موقع پر کئی ایک کام انھیں انجام دینے تھے۔ پہلا کام یہ تھا کہ فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبد الباری فتح اللہ حفظہ اللہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات اور شعبہ عربی اور ادارہ علوم الحدیث، جامعہ اردو روڈ علی گڑھ کے لیے علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کی منتخب کتابیں ارسال فرمائیں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب سے غالباً انھوں نے کہا تھا کہ آپ یہ کتابیں ان دونوں شعبوں کے ذمہ داروں کے حوالہ کردیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کتابیں کہاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا علم تو ہمیں ہے لیکن ابھی تک کتابیں یہاں نہیں پہنچی ہیں۔ یہ سن کر وہ سخت پریشان ہوئے۔ شاید وہ اپنے علی گڑھ کے دوستوں سے اس کا ذکر کرچکے تھے۔ مجھ سے کہا کہ دہلی میں مولانا عبدالستار سلفی سے رابطہ کرو اور معلوم کرو کہ کتابیں کہاں ہیں۔ میں نے فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ اپنی کسی مصروفیت کی وجہ سے کتابیں نہیں بھیج سکے ہیں۔ میں نے جب اس کی اطلاع دی تو بار بار افسوس کرتے رہے۔ اپنی ذمہ داری کے احساس کی وجہ

سے انھیں پریشانی لاحق ہوئی اور یہ افسوس رہا کہ وعدہ کے مطابق میں یہ کتابیں ان شعبوں کے حوالہ نہ کرسکا۔ان کے جانے کے بعد یہ کتابیں علی گڑھ آئیں اور دونوں شعبوں کی لائبریری میں داخل ہوئیں۔تھوڑے دنوں بعد ادارہ علوم الحدیث، جامعہ اردو روڈ علی گڑھ میں بھی یہ گراں قدر ہدیہ آگیا۔آج بحمد اللہ اہل علم ان سے استفادہ کرر ہے ہیں۔اللہ تعالیٰ فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر عبدالباری حفظہ اللہ کے حق میں ان کتابوں کو صدقہ جاریہ بنائے۔

ڈاکٹر ازہری صاحب اپنے اس سفر میں اپنے محترم استاذ پروفیسر مختارالدین آرزو صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔میں بھی ساتھ گیا۔علی گڑھ میں پروفیسر آرزو صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ڈاکٹر صاحب ایک شاگرد کی حیثیت سے ملے اور ان کے سامنے ایک سعادت مند شاگرد کی طرح بیٹھ گئے۔دیر تک مختلف علمی مسائل پر گفتگو جاری رہی۔اسی درمیان علی گڑھ کی روایت کی مطابق پرتکلف چائے پی گئی۔ڈاکٹر صاحب اپنے دور طالب علمی میں پروفیسر آرزو صاحب کے بہت قریب تھے۔وہ ان کی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور اپنے بعض مسودات نظر ثانی کے لیے ڈاکٹر ازہری صاحب کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔اس موقع پر بھی کوئی مسودہ انھوں نے اس تاکید کے ساتھ حوالہ کیا کہ اسے جلد واپس کردیجیے گا۔یہاں ڈاکٹر صاحب کا وہ انداز میرے سامنے آیا کہ ایک شاگرد اپنے استاذ کی کتنی عزت کرتا ہے۔نگاہیں نیچی کیے استاذ کی ہر بات پر ہاں کہتے رہے اور جب بھی مخاطب کیا، ''سر'' کہہ کر مخاطب کیا۔ڈاکٹر صاحب اندرون خانہ بھی تشریف لے گئے اور ان کی اہلیہ سے دعا سلام کرکے واپس آئے۔جب ہم وہاں سے لوٹے تو پروفیسر آرزو صاحب گھر کے باہر تک رخصت کرنے آئے اور اپنی دعاؤں کے ساتھ ہمیں روانہ کیا۔

یہ ہیں میری چند یادیں جن کا تعلق استاذ مکرم ڈاکٹر ازہری صاحب سے تھا۔ان میں عبرت اور نصیحت کا سامان بھی ہے اور ان کی شخصیت کا اظہار بھی۔اللہ تعالیٰ ان کی جملہ خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ان کے اہل خانہ کو شاد و آباد رکھے۔ہم کو توفیق دے کہ انھیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ان کے درجات کی بلندی کے لیے دعا کرتے رہیں۔وہ اپنے پیچھے جو مشن چھوڑ گئے ہیں، اسے آگے بڑھانا ہی ان کے لیے صحیح خراج عقیدت ہے۔موت سے کسی کو مفر نہیں۔ہر کسی کو احکم الحاکمین کے پاس جانا ہے۔جانے والوں کے لیے دعائے مغفرت اور ان کی حسنات کا تذکرہ کرتے رہنا ہی سلفی منہج ہے۔وفات پا جانے والی شخصیات کے سہو و نسیان، خطاؤں، کمیوں اور کوتاہیوں کا ذکر وہی کرتے ہیں جو اس منہج سے ناآشنا ہیں۔منہج سلف کی مخلصانہ پیروی اور وہ بھی زندگی کے تمام شعبوں میں کئی طرح کی قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔اس کی توفیق اللہ کے وہی بندے پاتے ہیں جن پر اس کا خصوصی فضل و کرم ہوتا ہے۔

☆☆☆

مولانا عبداللطیف اثری

جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

تھی ابھی محفل ہستی کو ضرورت تیری

مولانا حافظ مقتدیٰ حسن ازہری کی شخصیت علمی کروفر، رعب وجلال، ذمہ داران مدارس کی نظر میں احترام و اکرام میں ایک زمانہ سے دیکھتا اور سنتا تھا۔ جامعہ سلفیہ بنارس جانے پر یا مئو تشریف لانے پر بار بار دعا وسلام کا بھی شرف حاصل کر چکا تھا۔ لیکن دعا وسلام اور احوال پرسی وخیریت سے معاملہ آگے نہیں بڑھتا تھا۔

لیکن جب میں نے ''محمدیات'' پر حواشی و تعلیقات کا کام کیا اور اس کے قدیم حوالوں کو جدید طبع شدہ کتابوں سے مرتب کیا اور وہ کتابیں مکتبۃ الفہیم سے شائع ہوئیں اور آپ تک پہونچیں تو آپ نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، چونکہ بعض مصلحتوں کے پیش نظر اس پر اصلی نام کے بجائے قلمی نام حافظ ابوسہیل درج تھا اس لئے ابتداءً وہ یہ نہ جان سکے کہ اس کے محشی دراصل کون ہیں، ایک بار جامعہ عالیہ عربیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد و دستار بندی کے موقع پر جب جامعہ تشریف لائے اور آپ سے ملاقات کی غرض سے جہاں آپ تشریف فرما تھے حاضر ہوا تو دروازے ہی پر جیسے ہی آپ نے مجھے دیکھا بے اختیار بول پڑے آیئے حافظ ابوسہیل صاحب آیئے حافظ ابوسہیل صاحب بڑی ریسرچ ومحنت کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ہی حافظ ابوسہیل ہیں۔ ٹھیک ہے آپ نے جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اچھا کام ہے میں نے اس کام کو جامعہ سلفیہ کے علمی واشاعتی منصوبوں میں شامل کر رکھا تھا لیکن آپ نے اسے کر کے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ اور پھر بڑے گرمجوشی سے ملے۔ مولانا محمد الاعظمی سابق شیخ الجامعہ بھی اس وقت موجود تھے آپ نے کہا کہ مجھے بھی مشکل ہی سے معلوم ہوا ہے کہ حافظ ابوسہیل یہی ہیں۔

اور پھر اس کے بعد یہ علمی تعلق مضبوط ہی ہوتا گیا۔ آپ بنارس سے جب گھر تشریف لاتے تو جامعہ ضرور آتے اور کبھی کبھار مجھے گھر بلاتے اور مختلف موضوعات پر دیر تک تبادلۂ خیالات کرتے اور استفادہ کا موقع دیتے۔ اس دوران میں جس قدر سوالات کر سکتا تھا کرتا رہتا تھا اور آپ بڑی خوش دلی سے جواب دیتے تھے۔ ایک بار دوران گفتگو اٹھ کر آپ نے از خود چائے بنایا اور کہا کہ اب چائے پیتے پیتے بات ہوگی۔

ایک دن آئے تو کہا کہ میں آج صرف آپ سے ملنے آیا ہوں پھر ایک مضمون دیا اور کہا کہ اس کو کمپوز کر کے راشٹریہ سہارا میں بھیجنا ہے۔ جب راشٹریہ سہارا میں وہ مضمون شائع نہ ہو سکا تو افکار عالیہ میں شائع کرنے کا حکم دیا یہ مضمون مکہ مکرمہ اور مسجد حرام کی تاریخ پر ایک معتبر تصنیف کے نام سے جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔

جب جامعہ عالیہ عربیہ سے مجلہ افکار عالیہ کا اجراء ہوا اور آپ اس کی مجلس مشاورت میں شریک ہوئے تو یہ تعلق اور بھی مستحکم ہو گیا۔ اس سلسلے میں جو بھی اشکال ہوتا بذریعہ ٹیلیفون حل کر لیتا یا پھر جب مئو تشریف لاتے تو آپ کے سامنے رکھتا اور مناسب حل وتجویز آپ کی طرف سے ملتا۔ آپ نے ''افکار عالیہ'' کو اپنے کئی گراں قدر مقالے سے نوازا۔ حقیقۃً اس کی سرپرستی فرمائی اور اسے اپنا ہی مجلّہ سمجھا۔ ایک بار آپ نے ''محدث'' میں اشاعت کے لئے ایک مضمون کا انتخاب کیا تھا اور اس پر اپنی جانب سے نوٹ بھی لکھا تھا۔ جس میں اس مضمون کی علمی حیثیت اور بروقت اس کی اشاعت کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالی تھا لیکن پتہ نہیں کس بنا پر کمپوز ہو جانے کے بعد بھی شائع نہ ہو سکا۔ آپ نے اس مضمون کو میرے پاس بھیجا اور مجھے لکھا کہ محدث میں اگرچہ نہیں چھپ سکا لیکن ہمارا ''افکار عالیہ'' موجود ہے اس میں شائع ہوگا اور وہ شائع بھی ہوا اور اس مضمون سے بعض حلقوں میں زلزلہ بھی آیا، اس کا جواب بھی پرانے انداز واسلوب میں دیا گیا اور کتابی شکل میں شائع کرکے بڑے پیمانے پر پھیلایا گیا۔ مجلہ افکار عالیہ میں اس کا جواب بلا کسی تبصرہ کے ٹھوس علمی انداز میں شائع ہوا اور پھر وہی ہوا جو اس سے پہلے ہوتا آیا ہے۔

مولانا ازہریؒ قرآن وسنت کے شیدائی تھے آپ اس بات کے قائل تھے کہ قرآن وسنت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ دونوں میں بغیر تفریق غور کرنا ضروری ہے۔ اجتہاد کا مرتبہ بلاشبہ قرآن وسنت کے بعد ہے لیکن قرآن وسنت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ایسے حضرات کو سخت ناپسند کرتے تھے جو قرآن کو سنت کے بغیر ہی کافی سمجھتے ہیں۔ اور حدیث کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس کے مقابلے میں رائے یا لغت کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں جابجا اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

ایک بار ''افکار عالیہ'' میں ایک مضمون شائع ہوا مضمون فکری اعتبار سے بہت عمدہ تھا لیکن مضمون نگار انہیں لوگوں میں سے تھے جو سنت کو اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ اس بات کا مجھے علم نہیں تھا بس نفس مضمون مجھے پسند آیا اور اس میں قابل اصلاح جو چیزیں تھیں ان کی اصلاح کر دی۔ مضمون میں جہاں کہیں حدیث کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کو مشعل ہدایت قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی میں نے وہاں سنت کو بھی شامل کر دیا اور مضمون کا جو حصہ حدیث رسول کے خلاف تھا اسے حذف کر دیا اور نفس مضمون کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اسے شائع کر دیا۔ انہی دنوں یہی مضمون بلا کسی اصلاح وتبصرہ یا ادارتی نوٹ کے من وعن ایک مشہور رسالہ میں بھی شائع ہو گیا اور اس میں وہ تمام چیزیں موجود رہ گئیں جو قابل اصلاح تھیں حتی کہ صریح حدیث کے خلاف جو بات تھی وہ بھی شائع ہو گئی۔ مولانا ازہریؒ نے غالباً اس دوسرے رسالہ کو دیکھا اور جب انہیں معلوم ہوا کہ یہی مضمون ''افکار عالیہ'' میں بھی شائع ہوا ہے تو مضطرب ہو گئے۔ اور سخت غصہ کا اظہار کیا۔ اشاعت کے تھوڑے دنوں کے بعد جب مئو آئے دفتر ''افکار عالیہ'' میں بھی تشریف لائے اور آتے ہی کہا کہ ''افکار عالیہ'' کی مجلس مشاورت سے میرا نام نکال دیا جائے میں آپ کے تیور سے خوفزدہ تو ہوا لیکن ہمت کر کے پوچھا کہ آخر کیا چوک

ہوئی ہے، کہا کہ جن کو آپ نے بنارس بھیجا تھا کیا انھوں نے آپ سے واپس آ کر بتایا نہیں ہے میں نے کہا کہ نہ تو کسی کو میں نے بنارس بھیجا ہے اور نہ ہی کسی نے مجھ سے کچھ کہا ہے۔ آپ نے کہا کہ فلاں کا مضمون کیوں شائع ہوا۔ میں نے کہا کہ کیا آپ نے ''افکار عالیہ'' میں شائع شدہ اس مضمون کو پڑھ لیا ہے۔ آپ نے کہا کہ میں نے دوسرے رسالہ میں پڑھا ہے وہی مضمون تو ہے۔ اور جب یہ بتایا کہ اس مضمون میں جہاں جہاں کوئی قابل اصلاح چیز تھی اسے درست کیا گیا ہے اور خلاف حقیقت وخلاف سنت کوئی چیز نہیں ہے تو آپ کا اضطراب مسرت میں تبدیل ہو گیا۔ اور کہا اب مجھے قلبی سکون ملا ہے ورنہ میں کافی مضطرب تھا۔ مضمون نگار کے بارے میں البتہ بتایا کہ اگر چہ اسلوب اور انداز فکر اچھا ہے لیکن مستشرقین کا پورا جذبہ ان حضرات میں کام کر رہا ہے لہٰذا ان کی کوئی تحریر رسالہ میں شائع نہ ہو اور پھر اس پر اب تک عمل جاری ہے۔ مضمون نگار نے بعد میں پوری کوشش کی کہ ان کے مضامین کی اشاعت ہوتی رہے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ جن حضرات کے سامنے ازہری صاحب نے خفگی بلکہ غصہ کا اظہار کیا تھا اور ان کے ذریعہ پیغام بھجوایا تھا انھوں نے وہ پیغام کیوں نہیں پہونچایا اس کا راز صرف اللہ کو معلوم ہے۔

ازہری صاحب کو علم وادب سے بڑی دلچسپی تھی اور علمی کام کرنے والوں کی تشجیع ورہنمائی ان کی خاص صفت تھی۔ مشہور صحافی ابن احمد نقوی حفظہ اللہ کی مرتب کردہ کتاب ''فکر اقبال'' جو علامہ اقبال کی فارسی کلام پر ایک جامع ودلکش تبصرہ ہے کی طباعت کا جب پروگرام بنا اور مولانا مجاز اعظمی کے مشورہ سے جب اس کتاب پر تاثرات لکھنے کے لئے ایک کمپوز شدہ مسودہ دکھایا تو دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور کہا یہ کام تم نے بہت اچھا کیا ہے میں اس پر ضرور لکھوں گا۔ مسودہ لے کر چلے گئے اسی دن کسی کام سے جب میں آپ کے گھر گیا تو مسودہ ہاتھ میں لے کر نکلے اور کہا کہ میں اسی کے پڑھنے میں مصروف ہوں پھر دوسرے دن مسودہ لے کر از خود تشریف لائے اور کہا کہ اس کی اصل کہاں ہے لگتا ہے کہ دو صفحات کی پروف ریڈنگ چھوٹ گئی ہے۔ میں نے اصل نکالا تو واقعۃً اس کی پروف ریڈنگ نہیں ہو سکی تھی۔ آپ نے اس کتاب پر ۱۸، ۲۰ صفحات (فل اسکیپ سائز) پر اپنا تاثر لکھا اور باقاعدہ کمپوز کرا کے میرے حوالے کیا۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ یہ کچھ زیادہ طویل ہو گیا ہے تو بخوشی تلخیص واختصار پر راضی ہو گئے اور بنارس لے جا کر دوبارہ اسے تیار کر کے حوالے کیا جو کتاب کی زینت ہے۔ آپ ہی کے مشورے سے اس پر تاثرات لکھنے کے لئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر عبدالحق دہلوی سے رابطہ کیا گیا اور پھر ان حضرات کے تاثرات کے ساتھ کتاب شائع ہوئی۔

اس طرح حامی کتاب وسنت مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ کی معرکۃ الآراء کتاب ''تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی'' جس کا آپ نے حرکۃ الانطلاق الفکری وجهود الشاہ ولی اللہ فی التجدید کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا ہے کی جدید طباعت کے لئے حواشی کا کام جب مکمل ہو گیا تو اس پر بھی چند کلمات لکھنے کی گزارش کی گئی۔ آپ نے اس کام پر بھی

پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک طویل تقدیم لکھ دیا۔ آپ کی شدید خواہش تھی کہ کتاب جلد از جلد منظر عام پر آ جائے لیکن افسوس کہ بعض طباعتی پیچیدگیوں کی وجہ سے کتاب آپ کی زندگی میں نہ آ سکی۔ فیاللاسف

آپ نے اس کتاب کو حرفاً حرفاً پڑھا ہے بعض اغلاط کی تصحیح بھی کی ہے۔ اور آپ کے مشورے وہدایت سے بعض حاشیہ کا انداز بدلا گیا ہے۔

اس کتاب کی تصحیح، تعلیق، تحشیہ کے دوران ایک عبارت ایسی ملی جس کے بارے میں مجھے شبہ ہے کہ مولف سے نقل کرنے میں چوک ہوگئی ہے۔ اس بارے میں کئی اہل علم سے مشورہ بھی کیا۔ مولانا ازہریؒ کی عربی کتاب بھی دیکھی۔ لیکن کوئی تسلی بخش صورت حال سامنے نہ آئی۔ جب آپ سے میں نے اس صورت حال کا ذکر کیا تو کہا کہ مولف کی عبارت کو من وعن رکھیں اور حاشیہ میں یہ وضاحت کردیں کہ فقہ حنفی کی کتاب میں ایک عبارت ہمیں اس طرح بھی ملی ہے۔ مولانا نے کہا ہوسکتا ہے کہ مولانا سلفی کی نظر سے اسی طرح کی بھی عبارت گزری ہو اس لئے اس کو کاٹنا درست نہیں ہے اس طرح سے اطمینان ہوگیا۔ اور حاشیہ میں یہی نوٹ لکھ دیا گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی علی گڈھ

ہمارے کرم فرما، بزرگ اور محسن ہیں، افکار عالیہ کے قدر داں اور ابتدا ہی سے اس کے معاون رہے ہیں۔ آپ کی کتاب ''وحی حدیث'' جب مجھے ملی تو میں نے ازہری صاحب سے اس کا تعارف لکھنے کی گزارش کی۔ آپ نے کہا کہ میں اس کا تعارف عربی میں لکھنے اور ''صوت الامۃ'' میں اشاعت کا ارادہ رکھتا ہوں میں نے کہا کہ نہیں بہتر ہے کہ تعارف اردو میں ہو اور ''افکار عالیہ'' میں شائع ہو ازہری صاحب نے میری اس درخواست کو شرف قبولیت سے نوازا اور یہ تعارف ''افکار عالیہ'' میں شائع ہوا آپ نے میری اس درخواست کا اس میں ذکر بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وحی حدیث کا ذکر میں پہلے سن چکا تھا لیکن دیکھنے اور پڑھنے کا موقع اب ملا۔ میں اس پر اپنے تاثرات کا اظہار عربی میں کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے صورت الامۃ میں شائع کرسکوں لیکن ''افکار عالیہ'' کے مدیر محترم کا اصرار تھا کہ اس کا تعارف ان کے مجلّہ میں شائع ہونا چاہئے اس لئے اردو زبان میں ہی کچھ عرض کروں گا۔

مولانا ازہری نہ صرف یہ کہ علماء سے عقیدت رکھتے تھے بلکہ کون کہاں ہے اور کیا کام کررہا ہے اس سے حتی الامکان واقفیت رکھتے تھے۔ ایک بار میں آپ کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا فرمایا کہ آپ کے مدرسہ کے ایک فارغ کا خط برائے حصول تزکیہ آیا ہے لیکن میں نے اس کے لئے یہ شرط لگا رکھی ہے کہ صدر مدرس کی تصدیق کے ساتھ اسناد و دیگر کاغذات کی فوٹو کاپی آئے تب ہی تزکیہ لکھنا ممکن ہے۔ لیکن اگر آپ ہی تصدیق لکھ دیں تو میں تزکیہ دے دوں گا میں نے تصدیق لکھ دیا اور تزکیہ مل گیا۔ متعلقہ آدمی کا داخلہ بھی ہوگیا۔ اسی طرح بہت سے حضرات کے لئے آپ نے تزکیہ لکھا ہے اور آج وہ مختلف میدان میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فللّٰہ الحمد ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس وقت یہ بھی بتایا تھا کہ تزکیہ کے لئے مجھے متعلقہ اداروں سے کیا ہدایت ملی ہے اور میں اس پر اپنی کوشش بھر عمل کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ازہری صاحب کو اگر چہ جامعہ عالیہ عربیہ میں تدریس کا موقع نہ ملا لیکن یہ ادارہ آپ کی نظر میں انتہائی محبوب تھا۔ اگر آپ ہندوستان میں موجود رہتے تو اس کے سالانہ پروگراموں میں شرکت کرتے طلبہ کو نصیحت سے نوازتے اور ذمہ داران کو مفید مشورہ دیتے۔ ایک بار نصاب تعلیم سے متعلق ایک میٹنگ میں حاضری ہوئی نصاب تعلیم میں جزوی ترمیم کی اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ جامعہ عالیہ عربیہ کی اسناد کو عصری درسگاہوں میں منظور کرانے میں بھی آپ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جامعہ عالیہ عربیہ جب اپنی نئی بلڈنگ میں منتقل ہوا تو تشریف لائے۔ خوشی محسوس کی طلبہ کو خطاب بھی کیا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جامعہ سلفیہ کے ایک وفد کو جو مولانا عبداللہ سعود سلفی ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ و مولانا شاہد جنید سلفی موجودہ صدر جامعہ سلفیہ، شیخ اسعد اعظمی ودیگر حضرات پر مشتمل تھا جامعہ کی نئی بلڈنگ دکھانے اور جامعہ کی تعلیمی وتعمیری پیش رفت سے واقف کرانے کے لئے لائے۔

جامعہ عالیہ عربیہ نے بھی آپ کو ہر موڑ پر یاد رکھا ہے اور ہر اہم کام میں آپ سے مشورہ ضرور کیا جاتا تھا جب آپ کو عربی زبان وادب کی خدمت کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا تو آپ کے اعزاز میں جامعہ کی لائبریری ہال میں ایک اعزازیہ پروگرام ترتیب دیا گیا اور پرزور استقبالیہ پیش کر کے آپ کے علمی کمالات کا اعتراف کیا گیا۔ جامعہ میں منعقد ہونے والا مشہور علمی سیمینار بھی آپ ہی کے زیر اشراف ہوا ہے۔

مولانا ازہریؒ نے مولانا مجاز اعظمیؒ کی تحریروں کو جمع کرنے اور ان کے حالات مرتب کرنے کا بھی ان کی حیات ہی میں پروگرام بنایا تھا۔ اور مجھے مجاز صاحب کے ساتھ اس کا ذمہ دار بنایا تھا۔ لیکن افسوس کہ خود مجاز صاحب کی عدم توجہی وعدم موافقت کی بنا پر یہ کام شروع ہی نہ ہو سکا اگر یہ کام ہو گیا ہوتا تو ایک علمی کام میں اچھا اضافہ ہوتا۔ اسی طرح آپ کے پیش نظر علماء مئو کے علمی کارناموں کو ترتیب دینا تھا۔ اس کے لئے آپ نے ایک نشست بھی کی تھی لیکن آپ کی نہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور نہ ہی منصوبہ کامیاب ہو سکا اس میں عدم دلچسپی انہیں کی رہی جن کو اس کام کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ جب مجلہ افکار عالیہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو ذمہ داران جامعہ نے سوچا کہ اس کا رسم اجراء پاکوڑ کانفرنس میں ہو۔ اس کے اجراء کو پروگرام میں شامل کرنے کے لئے مرکزی جمعیۃ کو ایک درخواست بھیج دی گئی لیکن افسوس کہ یہ پروگرام میں شامل نہ ہو سکا حالانکہ یہ جمعیۃ کے صحافتی خدمات میں ایک اضافہ تھا پاکوڑ میں جب ذمہ داران سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے اس قسم کی درخواست کے موصول ہونے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ جب ڈاکٹر صاحب سے یہ صورت حال بتائی گئی تو کہا کہ آج ایک اجلاس میری صدارت میں ہونے والا ہے میں اس کا اجراء اس اجلاس میں کر سکتا ہوں اور پھر آپ نے اس کا اجراء کیا اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

الغرض ازہری صاحب کی سوچ عمیق اور فکر وسیع تھی اب آپ کی ساری باتیں رہ رہ کر یاد آ رہی ہیں۔

☆☆☆

شیخ اسعد اعظمی
جامعہ سلفیہ، بنارس

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کا خاندانی پس منظر

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ بن محمد یاسین بن محمد سعید بن منیب رشید بن عبد الوہاب، علم وادب کی دنیا میں جس بلند مقام پر فائز تھے وہ خال خال لوگوں ہی کا مقدر ہوتا ہے۔ ایسی قد آور شخصیتوں کی زندگی اور اس سے متعلق مختلف گوشے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں، ان ہی گوشوں میں سے ایک خاندانی پس منظر کا بھی ہے۔ عموماً ایسا سمجھا جاتا ہے کہ علم وفضل میں کمال حاصل کرنے والی ہستیاں عالی النسب اور علمی خاندان کے سلسلے کی کڑی ہوتی ہیں۔ ایسا ضروری نہیں، ہر طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ ان پڑھ، غیر مہذب، غیر تعلیم یافتہ خاندان سے علم کی شمع جلانے والے کا ظہور، اور نامی گرامی علمی گھرانے میں پیدا ہونے والوں کی علم وادب سے تہی دامنی کی مثالیں بھی نایاب بلکہ کم یاب نہیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے آبائی سلسلے میں شہرہ رکھنے والی کوئی قابل ذکر شخصیت تو نظر نہیں آتی، البتہ آپ کے والد گرامی جناب حاجی محمد یاسین صاحب گرچہ کسی خاص درسگاہ کے فیض یافتہ نہ تھے مگر علم اور علماء کے قدرداں تھے۔ درمیانہ قد، چہرے پر سفید گھنی داڑھی، مناسب لباس کے ساتھ کندھے پر رومال جس کا پنجوقتہ نمازوں میں استعمال، یہ سب آپ کی شناخت میں داخل تھا۔ ۴ رلڑکوں اور ۷ رلڑکیوں میں سے اکثر کو ضروری اور بعض کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔ آپ کی علم دوستی اور علماء کی تعظیم وتکریم کی مثالوں میں وہ واقعہ قابل ذکر ہے جسے مولانا مختار احمد صاحب ندوی رحمہ اللہ اپنے والد گرامی کے تعلق سے بیان کیا کرتے تھے۔ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ ایک مرتبہ کسی پروگرام میں شرکت کے لیے مئو تشریف لانے والے تھے۔ مئو ریلوے اسٹیشن پر لوگ ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ مولانا ندوی صاحب کے والد حاجی محمد ضمیر صاحب اور ازہری صاحب کے والد حاجی محمد یاسین صاحب ایک تانگہ یا گھوڑا گاڑی لیے پہنچے جو گھوڑے سے خالی تھا، لوگ یہ دیکھ تعجب میں پڑے تھے کہ مولانا امرتسری ٹرین سے اترے، انھیں اسی تانگے میں بٹھایا گیا اور پھر ان دونوں حضرات نے اس عالم جلیل کی خدمت وتکریم کا یہ انداز اپنایا کہ گاڑی کے گھوڑے کی جگہ خود اسے کھینچ کر مولانا

کو قیام گاہ تک پہنچایا۔ رحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

والد ازہری کی علم دوستی اور علماء شناسی ازہری صاحب کی درج ذیل تحریر سے بھی مترشح ہوتی ہے:

"......جب میں جامعہ سلفیہ آیا تو ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید سلفی نے مجھے "تحریک آزادئ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی" نامی کتاب (اشاعت اول) عنایت کی۔ یہ کتاب میں نے اب تک نہ دیکھی تھی، نہ اس کے مصنف شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ سے زیادہ واقفیت تھی۔ البتہ والد بزرگوار (الحاج محمد یاسین بن سعید رحمہ اللہ سے سنا تھا کہ شیخ الحدیث علامہ محمد اسماعیل رحمہ اللہ مئو تشریف لائے تھے تو ان کی تقریر سے عوام کی دینی حمیت اور جوش میں بے حد اضافہ محسوس کیا گیا تھا۔ ان کی سادہ اور علمی نکات پر مشتمل گفتگو ایک خاص کشش رکھتی تھی۔ یہ سرسری انداز کا تذکرہ تھا جو علماء کے تعلق سے گھر اور محلہ میں ہوا کرتا تھا۔"

(تحریک آزادئ فکر.....ص:۹-۱۰، تقدیم، طبع ۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے خاندانی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے اس امر کا تذکرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ آپ کا آبائی گھر مئو کے مغربی علاقے میں واقع محلہ ڈومن پورہ حبہ میں تھا، اس محلہ (حِبّــہ) کی لگ بھگ پوری آبادی اہل حدیث افراد پر مشتمل ہے، اس محلے کی ایک بے حد اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ بڑے بڑے نامور ونابغۂ روزگار علماء وفضلاء کا مولد ومستقر رہا ہے۔ مولانا فیض اللہ مئوی (متوفی ۱۳۰۶ھ) جنہوں نے اپنی جد وجہد سے سرزمین مئو میں توحید وسنت کا بیج بویا اسی محلہ کے فرزند تھے، آپ کے صاحبزادے مولانا ابوالمکارم محمد علی (متوفی ۱۳۵۲ھ=۱۹۳۳ء) موجد روغن احمر وبلند پایہ مصنف، مولانا ابوالمکارم کے علاوہ اسی نام (محمد علی) کے اور تین مشہور علماء مختلف کنیتیں رکھنے والے اسی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے: (۱) مولانا ابوالمحاسن محمد علی بن رحم اللہ (متوفی ۱۳۴۹ھ=۱۹۳۰ء) (۲) مولانا ابوالمعالی محمد علی بن حسام الدین (متوفی ۱۳۵۳ھ=۱۹۳۵ء) مولانا ابوالقاسم محمد علی قدسی بن عبدالرحمٰن (متوفی ۱۳۷۳ھ=۱۹۵۴ء)

مولانا ابو القاسم محمد علی قدسی رحمہ اللہ کے صاحبزادے معروف عالم دین مولانا مفتی عبدالعزیز اعظمی عمری (متوفی ۱۴۲۶ھ=۲۰۰۵ء) جو اسی محلے میں سکونت پذیر تھے ان علماء کے تذکرے بڑی دلچسپی سے کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ان علماء کی ایک فہرست تیار کی تھی جو اس محلّہ اور اس کی مسجد سے متعلق تھے، جس میں کل (۱۷) اکابر علمائے کرام کے اسمائے گرامی کے ساتھ ان کی ولدیت، تاریخ وفات، مدفن اور نماز جنازہ پڑھانے والے کا نام مذکور تھا۔ یہ فہرست شیشہ کے فریم میں مسجد میں محفوظ

کردی گئی ہے۔آپ نے ایک فہرست مئو کے ان علماء کی بھی تیار کی تھی جنہیں شیخ الکل علامہ سید نذیر حسین محدث دہلوی علیہ الرحمۃ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔اس کے علاوہ مئو کے اہل حدیث علماء پر آپ کی کتاب "القول المستحسن في علماء مئو ناتھ بھنجن" بھی ہے جس کا تذکرہ اہل مئو اور متعلقہ لوگوں میں زبان زد تو ہے مگر افسوس اس کا آج تک سراغ نہ لگ سکا۔

ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندانی عز وشرف آپ کے نانیہالی رشتے سے بلندیوں کو چھوتا ہے۔ ماہنامہ ''محدث'' بنارس کے ''شیخ الحدیث نمبر'' میں ''مرعاۃ المفاتیح'' پر تحریر کردہ اپنے مضمون کے شروع میں ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''میرا ننہال علم وفضل سے وابستگی کے لیے مشہور ہے، اس میں متعدد باکمال علمی شخصیتیں گزری ہیں، شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے گھر سے تعلق کا شرف بھی اسے حاصل ہے۔والدہ محترمہ بلقیس خاتون حفظہا اللہ بہت سے حالات وواقعات اس عہد کے سناتی تھیں جب شیخ صاحب کے والد محترم اپنے کنبہ کے ساتھ ہمارے محلّہ میں مقیم تھے اور شیخ صاحب ننہال کے بچوں کے ساتھ اپنا بچپن گزار رہے تھے.....'' (ص:۱۴۶)

آپ کی والدہ ماجدہ محلّہ ڈومن پورہ حبہ ہی کے مکین مولانا ابوالعرفان محمد نعمان بن حاجی عبد الرحمٰن کی صاحبزادی تھیں۔مولانا محمد نعمان کے علمی مقام ومرتبہ کا اندازہ لگانے کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ آپ کو محدث عظیم علامہ سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔میاں صاحب کے علاوہ محدث جلیل استاذ الاساتذہ حافظ عبد اللہ غازی پوری رحمہ اللہ سے بھی آپ نے کسب فیض کیا تھا۔شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد سے بھی آپ کو شاگردی حاصل تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے نانا مولانا محمد نعمان صاحب جس علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ مئو ناتھ بھنجن کی سرزمین میں علم وفضل کا ایسا تناور درخت تھا جس کے برگ وبار دور دور تک سایہ فگن تھے اور ہیں۔مولانا کے جد اکبر حکیم شیخ جمال الدین کو اللہ رب العزت نے پانچ فرزند عطا کئے تھے: (۱) حاجی عبد الرحمٰن، جنہیں حاجی عبد الرحمٰن شہید کے نام سے جانا جاتا ہے۔آپ ایک بار سفر سے واپس لوٹ رہے تھے، کچھ غیر مسلم اپنے کسی دشمن کی گھات میں تھے، رات کے اندھیرے میں غلط فہمی کی وجہ سے آپ ہی کو اپنا دشمن سمجھ کر آپ کا کام تمام کر دیا۔(۲) حاجی عبد الحفیظ۔ان کے ایک صاحب زادے حکیم عبد المجید تھے، جو ایک حاذق اور ماہر حکیم اور عالم دین تھے۔مولانا مظہر احسن ازہری، ناظم اعلیٰ جامعہ عالیہ عربیہ مئو، اسی خانوادے سے تعلق رکھتے

ہیں۔ (۳) شیخ علیم اللہ، ان کے دو فرزند تھے، شیخ عبداللہ اور محمد سلیمان۔ شیخ عبداللہ کی اولاد میں راقم سطور کے دادا مولانا عبدالعلی اور حافظ سلطان احمد صاحب گزرے ہیں۔ (۴) حاجی نور محمد۔ ان کے قابل قدر فرزند حکیم مولانا ثناء اللہ صاحب تھے جو تجربہ کار، نباض حکیم اور عالم باعمل تھے۔ ان کے تین صاحبزادگان: حکیم مولانا ابوبکر، مولانا محمد عمر نورانی، مولانا محمد مصطفیٰ ہندسی سی، علم اور دولت کی نعمت سے مالا مال تھے۔ (۵) حاجی محمد عارف۔ آپ کی اولاد واحفاد میں بھی تقوی اور دین داری پائی جاتی ہے، البتہ کسی قابل ذکر علمی شخصیت کے بارے میں معلوم نہیں ہوسکا۔

شیخ جمال الدین کے اول فرزند حاجی عبدالرحمٰن کے چار صاحب زادگان تھے، چاروں کو اللہ نے علم کی نعمت بے بہا سے سرفراز کیا تھا:

۱- مولانا محمد حامد صاحب (متوفی ۱۳۳۱ھ=۱۹۱۳ء) آپ محدث دوراں سید نذیر حسین کے شاگرد تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلی بن عبدالحمید ازہری، پروفیسر مسلم کالج لندن، ومؤلف و محقق) کے جدامجد تھے۔

۲- مولانا محمد نعمان صاحب (متوفی ۱۳۷۱ھ=۱۹۵۱ء) میاں صاحب دہلوی، حافظ عبداللہ غازی پوری، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے شاگرد تھے، صاحب تذکرہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کے نانا تھے۔

۳- مولانا محمد ابراہیم صاحب: (متوفی ۱۳۳۷ھ=۱۹۱۸ء)

۴- مولانا ابوالقاسم محمد علی قدسی (متوفی ۱۳۷۳ھ=۱۹۵۴ء) مولانا مفتی عبدالعزیز عمری کے والد گرامی تھے۔

ان چاروں حضرات اور ان کی اولاد واحفاد کی اور اسی طرح حاجی عبدالرحمٰن کے دوسرے بھائیوں کے اخلاف کی علم اور دین کی خدمت کی جو روشن تاریخ ہے اس کے تذکرے کے لیے پورا دفتر درکار ہے۔ اختصاراً میں اسی خاندان کے ایک رکن رکین مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی عمری ابن مولانا محمد نعمان اعظمی کے تاثرات نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ موصوف لکھتے ہیں:

''......اس علمی خانوادے کی علمی ودینی خدمات ناقابل فراموش ہیں اور ملک وملت پر اس کے احسانات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ علم ودانش کے ہر شعبہ میں اس خاندان کے افراد کے نام سرفہرست ملیں گے۔ ملک کے گوشے گوشے اور دنیا کے کئی ممالک میں اس کے لائق فرزند اپنے علم وفضل کی وجہ سے ایک امتیازی مقام پیدا کرچکے ہیں۔ انگلینڈ، نائیجیریا، ملیشیا اور خلیج کی کئی ریاستوں میں ان کی روشن خدمات کے آثار دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس خانوادے نے جہاں بہت سے متبحر علماء وفضلاء، بہترین حفاظ وقراء اور شعلہ نوا مقررین وخطباء کو جنم دیا ہے وہیں شاندار محقق، کامیاب مصنف، لائق مترجم،

مستند ادیب، پرگو شاعر اور صاحب طرز انشاپرداز بھی پیدا کیے ہیں۔ آج اس خانوادے کے بیسیوں افراد مختلف علمی ودینی اداروں میں امتیازی اور کلیدی مناصب پر فائز ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان کی ٹھوس خدمات کو ہر جگہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔"ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"۔ (بات ایک مسیحا نفس کی،ص:۲۲-۲۳)

صاحب تذکرہ علیہ الرحمہ کے نانا مولانا نعمان صاحب تحصیل علم کے بعد کچھ دن مدرسہ عالیہ مئو میں اور کچھ دن مدرسہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں درس وتدریس کا عمل انجام دینے کے بعد جامعہ دارالسلام عمرآباد کی طلب پر ۱۹۲۸ء کے اواخر میں وہاں تشریف لے گئے اور تادم واپسیں وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ آپ کی پہلی شادی مئوناتھ بھنجن ہی میں ہوئی تھی، مئو والی اہلیہ سے آپ کے یہاں پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں: عبدالمنان، عبدالحنان، عبدالسبحان، محمد عرفان اور فضل الرحمٰن، یہ تمام فرزندگان وفات پاچکے ہیں۔ اسی طرح پانچوں بیٹیاں بھی دار بقا کو سدھار چکی ہیں۔ ان ہی میں صاحب تذکرہ کی والدہ محترمہ بلقیس نعمان رحمہا اللہ بھی تھیں جو تمام بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ مولانا نعمان کی اہلیہ عمرآباد جانے سے قبل انتقال کرچکی تھیں، اس لیے آپ نے عمرآباد پہنچ کر دوسری شادی کی۔ اس دوسری اہلیہ سے چار لڑکے حبیب الرحمٰن، عزیز الرحمٰن، حفیظ الرحمٰن، عتیق الرحمٰن اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ اس طرح مولانا کو اللہ نے کل ۹ بیٹوں اور ۷ بیٹیوں سے نوازا تھا۔ ان تمام کے یہاں اور پھر ان کی اولاد واحفاد کے یہاں بھی علم وعمل کی جو روشنی جگمگائی اور اب تک جگمگا رہی ہے اس کا وصف مشکل ہے۔ اور "ایں خانہ ہمہ آفتاب" کا مصداق ہے۔ وللہ الفضل والمنة۔

چنانچہ عبدالسبحان، فضل الرحمٰن، حبیب الرحمٰن، عزیز الرحمٰن اور حفیظ الرحمٰن سب نے جامعہ دارالسلام عمرآباد سے تعلیم حاصل کی اور آسمان علم وفضل پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے۔"فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر" مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا حافظ حفیظ الرحمٰن صاحبان حفظہم اللہ عمرآباد بلکہ پورے جنوبی ہند میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ آپ حضرات کی مساعی حمیدہ کی روشنی سے شمالی ہند بھی وقتاً فوقتاً منور ہوتا رہتا ہے۔ مولانا عبدالسبحان علیہ الرحمۃ کی اولاد واحفاد بھی علم وعمل اور دعوت وارشاد کے میدان میں نمایاں خدمت انجام دینے میں لگی ہوئی ہے۔ تقبل الله جهودهم۔

ازہری صاحب رحمہ اللہ کی والدہ اور ان کی دیگر بہنوں میں بھی دین اور علم سے محبت، صوم وصلاۃ کی پابندی، اسلامی آداب واحکام کا خاطر خواہ پاس ولحاظ، اولاد کی صحیح نہج پر تربیت، ان کی تعلیم کا بندوبست وغیرہ وغیرہ ان کی دینی

استقامت اور خاندانی نجابت کا منہ بولتا ثبوت تھا، اور تقریباً سب ہی کی اولاد واحفاد میں تعلیم، دین داری اور علم دوستی کا غلغلہ برابر بلند ہے۔

ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ کے بقیہ تین بھائی شفیق الرحمٰن، عبدالرحمٰن اور اظہر حسن اور سات بہنیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور ایک بہن کے علاوہ بقیہ بھائی بہن بحمد اللہ بھرے پرے خاندان کے ساتھ قافلۂ زندگی رواں دواں رکھے ہوئے ہیں۔ والدین نے عسرت کے باوجود کم وبیش ہر ایک کو حسب استطاعت علم سے آراستہ کیا۔ ڈاکٹر ازہری علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب عربی'' کے حصہ اول کا انتساب اپنے والدین کے نام ان الفاظ میں کیا ہے:

''والد محترم محمد یاسین سعید اور والدۂ محترمہ بلقیس نعمان کے نام، جن کی بے پناہ محبت، عظیم قربانیوں اور پر خلوص دعاؤں کے طفیل اللہ تعالیٰ نے مجھے علم سے محبت اور علماء سے عقیدت کی توفیق عطا فرمائی۔ رب ارحمھما كما ربياني صغيرا۔''

اور اپنی والدہ کا خاص طور سے تذکرہ کرتے ہوئے اپنے دیرینہ رفیق ڈاکٹر سعید احسن عابدی کی کتاب ''موضوع اور منکر روایات'' پر لکھے گئے اپنے ایک مضمون میں کتاب کے قصص الانبیاء سے متعلق باب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قصص الانبیاء کے عنوان سے ایک بات یاد آرہی ہے جس کا ذکر مناسب سمجھ رہا ہوں کیوں کہ وہ براہ راست ہماری دینی زندگی سے متعلق ہے۔

ہمارا ثقافتی معیار آج بھی محتاج توجہ ہے۔ اردو زبان میں قصص الانبیاء نامی ایک کتاب بڑے سائز پر اچھی طباعت میں بچپن میں لوگوں کے ہاتھ میں نظر آتی تھی، یہ کسی عربی کتاب (عرائس المجالس وغیرہ) کا ترجمہ تھا اور ناخواندہ طبقہ اسے لوگوں کو سنایا کرتا تھا۔ اس کے بعض واقعات میں نے بھی والدہ محترمہ رحمہا اللہ سے سنے تھے، جن میں عوج بن عنق (یا عوق) اور اس کی لمبائی سے متعلق داستان کے بعض حصے ذہن میں محفوظ ہیں، ہمارے محلہ میں علماء کی کمی نہ تھی، بہ یک وقت ''محمد علی'' نام کے تین چار عالم تھے جو اپنی اپنی کنیتوں سے ممتاز ہوا کرتے تھے۔ والدہ محترمہ اس کا اکثر ذکر کرتی تھیں، وہ خود مولانا محمد نعمان رحمہ اللہ کی لڑکی تھیں جو شیخ الکل سید نذیر حسین رحمہ اللہ کے شاگرد تھے.....'' (محدث بنارس: اکتوبر ۲۰۰۹ء، ص:۷)

والدہ خاص طور سے اپنی اولاد کی تعلیم کے تئیں زیادہ دلچسپی رکھتی تھیں اور تعلیم کے دوران انھیں قلت مالی الید کے باوجود ہر طرح کی سہولت فراہم کرنے کے لیے متفکر نظر آتیں۔ اللہ کے فضل سے اور پھر ان کی کوششوں اور دعاؤں سے ان کی اولاد میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن جیسی نابغہ

الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت، ڈاکٹر اظہر حسن (بی.یو.ایم.ایس.ایم.ڈی،علیگ) جیسے ماہر طبیب ومعلم ومنتظم، اوران حضرات کے علاوہ ان کے بھائی جناب عبد الرحمٰن صاحب (ایم.اے.بی لب) اور بیٹیوں اور پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں میں اوراب تیسری نسل میں متعدد حفاظ، علماء، ڈاکٹر، انجینئر، بی اے، ایم اے، پی ایچ ڈی اور مختلف علوم وفنون کے حاملین ہیں اور مختلف مدارس، جامعات، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۶ رشوال المکرم ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۹/اکتوبر ۲۰۰۶ء کو (۹۵) سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ انتقال کے کچھ دنوں بعد راقم کے شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کے بیٹے، بیٹیوں، پوتے، پوتیوں، نواسے، نواسیوں اوران کی اولاد کی تعداد (۲۰۰) کے لگ بھگ ہے۔ اس وقت (فروری ۲۰۱۲ء) پانچ سال کے عرصے میں اس فہرست میں تقریباً تین درجن نفوس کا اضافہ ہو چکا ہے۔

اسلامی کتابوں اور رسائل وجرائد ہمیشہ آپ کے زیر مطالعہ رہتے۔ اوراد واذکار کی کتابوں بالخصوص ''اسلامی وظائف'' مؤلفہ مولانا عبدالسلام بستوی ہمیشہ آپ کے پاس رہتی۔ اپنی بہو بیٹیوں اور متعلقہ خواتین کو اس کتاب کے مطالعہ کی تاکید بھی کرتی رہتی تھیں اور بسا اوقات انھیں خرید کر یہ کتاب ہدیہ بھی کیا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو ہمیشہ ''بابو'' کہہ کر یاد کرتیں۔ اپنے والد محترم مولانا نعمان صاحب کا تذکرہ اکثر کرتی رہتی تھیں۔ ان کے مدراس کے سفر وغیرہ کے واقعات بھی بیان کیا کرتیں۔

محترمہ کے احوال وکوائف اور محاسن وخصائص پر برادرم ڈاکٹر اطہر افضال نے ترجمان دہلی ماہ اکتوبر ۲۰۱۰ء کے ایک شمارے میں مفصل گفتگو کی ہے۔ راقم نے بھی آپ کی وفات کے معاً بعد محدث بنارس کے نومبر ۲۰۰۶ء کے شمارے میں ایک مختصر تحریر سپرد قلم کی تھی۔ اس لیے آپ کے سلسلے میں مذکورہ باتوں پر اکتفا کرتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ موصوفہ کی نیک طبیعت، اسلامی تربیت اور مومنانہ فراست کا محترم ازہری رحمہ اللہ کی شخصیت کو نکھارنے میں کتنا اہم کردار رہا ہوگا۔ میاں صاحب رحمہ اللہ کے تلمیذ رشید کی اس دختر نیک اختر اور پاکباز خاتون نے اپنے والد گرامی اوران کے مشہور زمانہ استاذ کی علمی ومذہبی وراثت کو آنے والی نسلوں میں پوری امانت داری سے منتقل کیا، جس پر ان شاء اللہ، اللہ رب العزت انھیں خوب سے خوب تر اجر سے نوازے گا۔

اللہ تعالیٰ ان تمام پاکباز نفوس کو ان کی خدمات جلیلہ پر اجر عظیم سے نوازے اور پسماندگان کو ان کے علمی ودینی ورثے کا محافظ وامین بنائے۔ آمین۔



مولانا ابوالعاص وحیدی
پرنسپل جامعہ عربیہ قاسم العلوم گلرہا۔ بلرامپور

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کا نظریۂ تعلیم

طرز تحریر اور زبان واسلوب کا نمونہ

برادر گرامی جناب مولانا عبداللطیف اثری/ حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

پنچایتی الیکشن کی وجہ سے جسمانی وذہنی تکان کے ساتھ کسی طرح مقالہ مکمل ہوگیا ہے، آج ہی رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج رہا ہوں، اس مقالہ میں ڈاکٹر ازہریؒ وغیرہ کی تحریروں کے اقتباسات زیادہ ہیں تاکہ لوگ صاحب افکار کے الفاظ ہی کے ذریعہ افکار سے واقفیت حاصل کریں۔ اور اس کے طرز تحریر اور زبان واسلوب سے بھی لطف اندوز ہوں، امید کہ مقالہ پسند آئے گا۔ ان شاء اللہ

جماعتی رجال وشخصیات کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ خصوصی اشاعتوں کے علاوہ ان پر حسب مراتب سوانحی کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے، ہر شخصیت کے ساتھ ملک وملت اور دین وجماعت کی نصف صدی کی تاریخ وابستہ رہتی ہے، اس لئے مستقل سوانحی کتابیں زیادہ مفید ہوتی ہیں۔ ٹھیک ہے جماعت اہل حدیث شخصیت پرست نہیں مگر شخصیت فراموش نہیں ہونا چاہئے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے یہاں ایک ایک بالشت کی شخصیات پر ضخیم کتابیں لکھ دی جاتی ہیں اور ہمارے یہاں محدث کبیر عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ، محدث عظیم عبیداللہ رحمانیؒ وغیرہ کے بارے میں اب تک جماعت کی طرف سے کوئی کتاب نہیں آسکی ہے۔ جناب ڈاکٹر ازہریؒ کے بارے میں آپ لوگوں کا اقدام قابل مبارکباد ہے، مگر ان پر ایک مفصل سوانحی کی کتاب کی ضرورت ہے۔

والسلام علیکم ورحمہ اللہ

ابوالعاص وحیدی

انسانی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت فکر ونظر اور عقل وذہن کو حاصل ہے، بلکہ یہی انسان کا نشان امتیاز ہے، اسی وجہ سے انسان کو ''حیوان ناطق'' کہا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ انسان ایسا جاندار ہے جو فکر ونظر کی صلاحیت رکھتا ہے، اسی لئے وہ کائنات میں غور وفکر کرکے مفید نتائج حاصل کرتا ہے اور مختلف ایجادات کرتا ہے۔

اس کائنات میں انسان دو طرح کے ہیں، مومن اور کافر، مومن انسان کے لئے وہ فکر ونظر مطلوب ہے جس میں دینی روح اور مذہبی جذبہ شامل ہو، اس لحاظ سے مسلمان علماء کے دو گروپ نظر آتے ہیں، ایک گروپ وہ ہے جس کی علمی سرگرمیوں میں پورے طور پر دینی روح اور مذہبی جذبہ نظر آتا ہے اور دوسرا گروپ وہ ہے جس میں فکری آوارگی پائی جاتی ہے اور مسلمان ہونے کے باوجود فکری اباحیت کا شکار رہتا ہے۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ پہلے گروپ کے وہ ممتاز عالم اور دانشور ہیں جن کے اعمال وافکار اور تصورات ونظریات میں مکمل طور پر دینی روح اور مذہبی جذبہ کی خوشبو محسوس ہوتی ہے، حالانکہ انھوں نے اپنی زندگی میں دینی وعصری دونوں طرح کی درسگاہوں سے استفادہ کیا ہے مگر مزاجی وطبعی اور خاندانی وسماجی اسباب وعوامل کی بنا پر ان کی

پوری زندگی میں دینی جذبہ کی بالادستی نظر آتی ہے۔

اس مقالہ میں بڑے اختصار کے ساتھ ڈاکٹر ازہریؒ کے نظریۂ تعلیم پر روشنی ڈالی جارہی ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ تعلیم وتربیت کے معاملہ میں کسی طرح کی فکری اباحیت اور افراط وتفریط کے قائل نہیں تھے، مقالہ میں سب سے پہلے تمہیدی طور پر مذہب اسلام کے نظریۂ تعلیم پر روشنی ڈالی جائے گی، اس کے بعد ڈاکٹر ازہریؒ کے خاندانی وتعلیمی پس منظر کا ذکر کیا جائے گا اور آخر میں ازہریؒ صاحب کی بعض تحریروں کی روشنی میں ان کے نظریۂ تعلیم پر بحث کی جائے گی، ان شاء اللہ

اسلام کا نظریۂ تعلیم

دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام تعلیم وتعلم کا بڑا حمایتی وخوگر ہے، لیکن مطلق تعلیم نہیں بلکہ وہ تعلیم جس سے خدا شناسی اور خود شناسی پیدا ہو، جب انسان کے اندر خدا شناسی کا جوہر ہوگا تو وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، الوہیت اور اسماء وصفات کا یقین کرے گا اور اس کے نظام ہدایت ورسالت کو مانے گا اور جب انسانوں کے اندر خود شناسی پیدا ہو جائے گی تو وہ اپنی حقیقت کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کفر وشرک کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات جن کا نزول سب سے پہلے ہوا ہے، ان آیات سے واضح طور پر اسلام کا نظریۂ تعلیم سامنے آتا ہے، وہ آیات یہ ہیں:

﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ (العلق:۱-۵)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے، جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا ہے، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔

ان آیات سے درج ذیل باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں، جن سے اسلام کے نظریۂ تعلیم پر بہت کھلے انداز میں روشنی پڑتی ہے۔

اول: پڑھائی لکھائی اور تعلیم وتعلم اس طرح ہونا چاہئے جس میں اللہ کی معرفت شامل ہو اس لئے کہ وہ خالق کائنات ہے۔

دوم: انسان کو اپنی حقیقت پر دھیان دینا چاہئے کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے جمے ہوئے خون سے کی جو تخلیق انسانی کا دوسرا مرحلہ ہے۔

سوم: اللہ تعالیٰ بڑا کریم ہے، اس نے قلم کے ذریعہ علم کا راستہ ہموار کیا ہے اور مختلف ادوار میں انسانوں کے لئے علوم وفنون کے راستے پیدا کئے۔

ڈاکٹر ازہریؒ کی پوری علمی وعملی زندگی اور ان کے تعلیمی نظریات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پورے طور پر اسلام کے مذکورہ نظریۂ تعلیم پر ایمان رکھتے تھے اور زندگی بھر اس کے داعی ومبلغ بھی تھے، جس کے مختلف اسباب وعوامل ہیں، ان میں سب سے اہم ان کا خاندانی وتعلیمی پس منظر ہے۔

ڈاکٹر ازہریؒ کا خاندانی وتعلیمی پس منظر

انسان کی تہذیبی وثقافتی نشو ونما میں اس کے خاندانی ماحول، خصوصاً والدین کا بڑا دخل ہوتا ہے، ڈاکٹر

ازہریؒ کی یہ بڑی خوش نصیبی رہی کہ انھیں علم وعمل کی دولت سے مالا مال خاندان ملا، اور ایسا ماحول ملا جس میں خالص اسلام کی ترجیحات اور کتاب وسنت کی تعلیمات جلوہ افروز تھیں، ازہریؒ صاحب کے بھانجے جناب ڈاکٹر اطہر افضال مقیم نئی دہلی نے اپنی نانی بلقیس نعمان (والدہ ڈاکٹر ازہریؒ صاحب) کے تذکرہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس خاندانی ماحول کا ذکر کیا ہے جس میں ڈاکٹر ازہریؒ کی تربیت ہوئی، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ان کا تعلق ایک علمی خاندان سے تھا، علمی اس معنی میں نہیں کہ گھر کے ایک آدھ فرد "قدوری" اور "شرح وقایہ" تک پہونچ کر کوتاہ علمی چھپانے کے لئے تعویذ اور تسبیح کا سہارا لیں، ذرا ان کے علمی پس منظر کی ایک جھلک اور جھانکی دیکھیں والد مولانا محمد نعمان جید عالم اور فائق مدرس، حدیث کی تعلیم سید نذیر حسین محدث دہلویؒ اور ادب کی تعلیم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی سے حاصل کی، مئو سے بہت دور عمر آباد (مدراس) اپنا علمی آشیانہ بنایا اور خلق کثیر نے ان سے دین کے رموز اور دعوت کے اصول سیکھے، بڑے ابا محمد حامدؒ بھی میاں صاحب کے شاگرد، چچا ابوالقاسم قدسیؒ عالم اور خطیب، دعوت دین کی راہ میں کوچین (کیرلا) تک پہونچے، بھائیوں میں دو افضل العلماء کی ڈگری سے سرفراز، تقویٰ وطہارت کے پیکر، علم و ہنر میں یکتا، انتظامی امور میں شفاف، کیا جمعہ، کیا جنازہ، کیا دوگانہ ہر جگہ پیش پیش، مئو سے مالیگاؤں اور بنارس سے رائیدرگ تک علمی منظر نامہ روشن کرنے کی سعادت، علاقی بھائیوں میں کوئی افضل العلماء، کوئی طبیب کامل، کوئی کیمیا کا ماہر، تبلیغی خدمات سے ملیشیا اور نائجیریا کے کچھ خطے روشن، کچھ بہنیں بھی دینی مزاج اور علمی ذوق سے آراستہ، ایک تو باقاعدہ معلمہ اور مئو میں تعلیم نسواں کی قدیم درسگاہ میں تدریس کا شرف، صفیہ خاتون والدہ ڈاکٹر عبدالعلی ازہری حفظہ اللہ"

(مقالہ "بلقیس نعمان- علمی وراثت کی توسیع کا استعارہ" جریدہ ترجمان اکتوبر ۲۰۱۰ء)

اس علمی ودینی خاندان وماحول کی وجہ سے ڈاکٹر ازہریؒ کی والدہ بلقیس نعمانؒ خالص دینی مزاج رکھتی تھیں، جادۂ کتاب وسنت پر گامزن تھیں اور غلط عقائد وافکار سے حد درجہ متنفر تھیں، ڈاکٹر اطہر افضال لکھتے ہیں:

"بلقیس نعمان کے مزاج میں سختی نہیں تھی، لیکن عقیدے میں سخت تھیں، اور صحت عقیدہ کا خاص التزام تھا، سماج میں رائج بدعقیدگی اور خوش اعتقادی قطعاً گوارہ نہیں تھی، کہیں بھی ٹوک دیتی تھیں، گھر کے ماحول میں کتاب وسنت کی خوشبو رچی بسی تھی۔ مئو تو جلسے جلوس کا شہر ہے، سو دینی اجتماعات واجلاس میں خوب شرکت ہوئی، ۱۹۲۷ء کی آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس، ۱۹۳۸ء میں انجمن تہذیب البیان (مدرسہ عالیہ عربیہ) کا جلسہ اور ۱۹۶۸ء میں مدرسہ عالیہ عربیہ کی صد سالہ تقریب کی روداد ان کی زبانی خوب سنی، علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا محمد جوناگڈھیؒ اور مولانا ابوالقاسم سیف بنارسیؒ کی تقریروں سے ان کی دینی معلومات میں وسعت پیدا ہوئی، فکر روشن ہوئی، کتاب وسنت پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا،

دین کے نام پر پھیلی ہوئی اور پھیلائی جارہی بکواس سے واقفیت ہوئی اور اس کی وجہ سے اولاد کو جس اسلام کی نعمت ملی وہ آلودہ نہیں بالکل نتھرا ہوا تھا'' (مقالہ ''بلقیس نعمان- علمی وراثت کی توسیع کا استعارہ'' جریدہ ترجمان اکتوبر ۲۰۱۰ء)

یہ ہے وہ خاندانی ماحول جس میں ڈاکٹر ازہریؒ پیدا ہوئے اور پھر تدریجی طور پر دینی وعصری تعلیم کے مراحل سے گزرے، ان کی فکری اور عملی زندگی پر تادم حیات خاندانی ماحول اور والدین کی تربیت کے خوشگوار اثرات غالب رہے، میں نے ایک مقالہ میں ڈاکٹر ازہریؒ کے تعلیمی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ مختلف تعلیمی وثقافتی سرچشموں سے سیراب ہوئے، ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن کی تکمیل حنفی ادارہ دارالعلوم مئو میں کی، عالمیت وفضیلت کی تکمیل بالترتیب مئو کے مشہور سلفی مدارس جامعہ عالیہ عربیہ، جامعہ فیض عام اور جامعہ اثریہ دارالحدیث میں کی، پھر دو سال کے تدریسی عمل کے بعد جامع ازہر مصر میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کچھ دنوں تدریسی مصروفیت رہی، پھر دو یا تین سال مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں رہ کر ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے بعد تادم حیات سرد وگرم برداشت کرتے ہوئے جامعہ سلفیہ بنارس میں بالترتیب وکیل الجامعہ اور صدر جامعہ کی حیثیت سے تعلیم وتربیت اور عربی واردو صحافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ اس طرح دینی وعصری درسگاہوں سے استفادہ کرتے ہیں اور اس طرح تعلیمی ڈگریاں ان کے پاس ہوتی ہیں وہ فکری وعملی طور پر آزادی کے شکار ہوجاتے ہیں، ان کے اندر تجدد پسندی آجاتی ہے، وہ شکل وصورت اور وضع قطع میں ماڈرن بن جاتے ہیں اور علمائے دین کو روایت پرست اور دقیانوس کے القاب سے نوازتے رہتے ہیں، مگر ہمارے ممدوح ڈاکٹر ازہریؒ اپنی زندگی میں فکری وعملی اباحیت میں مبتلا نہیں ہوئے، انھوں نے پورے طور پر خالص اسلامیت اور صحیح سلفیت کی حفاظت کی اور فکری وعملی طور پر تجدد پسندی سے محفوظ رہے''۔ (مقالہ اشاعت خاص مجلہ السراج جھنڈا نگر اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء)

جس شخص کا خاندانی وتعلیمی پس منظر اس طرح ہو جس کا ذکر ہوا، اس کے نظریۂ تعلیم وتربیت میں خالص اسلامیت کا ہونا ضروری ہے، جس سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔

ڈاکٹر ازہریؒ کا نظریہ تعلیم

تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں ڈاکٹر ازہریؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تعلیم ایک مقدس فریضہ ہے جس کا بنیادی مقصد سیرت وکردار کی تعمیر، تہذیب وتمدن سے آشنائی اور خداشناسی وخودشناسی ہے، یہ مقصد مشرقی علوم سے حاصل ہوتا ہے، اس سلسلہ میں مغربی علوم ناکام ہیں، اسی لئے ازہریؒ صاحب مشرقی علوم کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں اور دور حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر عصری علوم سے استفادہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

’’تعلیم ایک مقدس و با مقصد فریضہ ہے، اس سے سیرت وکردار کی تعمیر ہوتی ہے، انسان تہذیب وتمدن سے آشنا ہوتا ہے، دین ودنیا کی ترقی اس پر موقوف ہے، اسی سے خداشناسی وخود شناسی کا جوہر پیدا ہوتا ہے، نیز فرد و جماعت کے بہتر مستقبل کی ضمانت حاصل ہوتی ہے، ظاہر ہے ایسے عظیم عمل اور مقدس فریضہ کے خدوخال متعین کرنے اور اس کی تفصیلات طے کرنے میں انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اقدام کی ضرورت ہوگی، چند انقلابی آراء اور انفرادی ترجیحات سے اگر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کبھی کامیابی حاصل نہ ہوگی، بلکہ امت میں مزید انتشار اور بیچینی پیدا ہوگی، جدید دور میں سائنس وٹکنالوجی کے علوم مغرب میں پروان چڑھے اور پوری دنیا کو متاثر کیا، مادی ترقی کے میدان میں ان علوم کی اہمیت وبالادستی مسلم ہے، لیکن ان کا روحانی پہلو بے حد تشنہ ہے، اس کے بالمقابل مشرق کے قدیم اور روایتی علوم ہیں جن کا موجودہ مادی ترقی میں موثر کردار نہیں، البتہ مسلمانوں کے پاس اسلامی علوم کا جو سرمایہ ہے اسے ذہنی وتمدنی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے، اور اس نے انسانیت کی رہنمائی وبہبود کے میدان میں عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، موجودہ دور میں علم وتہذیب کی ترقی اور قوموں کے مابین اخذ وعطا کے عمل میں سہولت وتیزی کا تقاضا ہے کہ انسانی علوم کے اس مشرقی ومغربی سرمایہ کو نظر میں رکھا جائے اور اہمیت وافادیت کے لحاظ سے علوم کے درجات متعین کئے جائیں، پھر ان سے استفادہ کی صحیح راہ متعین کی جائے۔

(مقالہ تعلیمی کنونشن نمبر مجلّہ الفرقان ڈومریاگنج جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء)

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ جناب ازہریؒ صاحب کے نظریۂ تعلیم میں نہ افراط ہے کہ مغربی علوم کو اولیت دی جائے اور نہ تفریط ہے کہ مغربی علوم کو شجرۂ ممنوعہ قرار دے دیا جائے، وہ اسلامی ومشرقی علوم کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں اور مغربی علوم سے استفادہ کے بھی قائل ہیں، ان کا واضح نقطۂ نظر یہ ہے کہ دینی مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد عمل کے بعد اسلام کی اشاعت ہے جس کی اہمیت پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے، مگر انہیں اس کا بھی دردمندانہ احساس ہے کہ دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں موجود تقاضوں کی رعایت بھی ضروری ہے، اس کے بغیر عصر حاضر میں اسلامی دعوت کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

’’دینی مدارس ایک واضح ومتعین مقصد کے لئے قائم کئے گئے ہیں اور ملت کے لئے آج بھی اس مقصد کا حصول ضروری ہے، اس دور میں لوگوں کا علمی وثقافتی معیار بلند ہوا ہے مختلف احوال میں تبدیلی آئی ہے اور بہت سے سابقہ افکار وخیالات بے وزن ہوگئے ہیں، اس لئے نصاب میں اس کی رعایت ضروری ہے، کیوں کہ عمل کے بعد دینی تعلیم کا مقصد شریعت کی تبلیغ ہے، یہ تبلیغ اسی وقت موثر ہوگی جب داعی ومدعو کے علمی وثقافتی معیار میں ہم آہنگی ہو، آج کے معاشرہ میں جس طرح ہمیں سائنس وٹکنالوجی کی ترقی کے نتیجہ میں متنوع ایجادات وانکشافات کا سابقہ ہے، اسی طرح متعدد ایسے غیر سائنسی علوم بھی

متعارف ہو گئے ہیں جن سے انسان کو برابر واسطہ پڑتا ہے"۔
(مقالہ تعلیمی کونشن نمبر مجلہ الفرقان ڈومریا گنج جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء)

اس وقت علم اور تعلیم کے بارے میں ایک عجیب قسم کا غلو وافراط پایا جاتا ہے وہ یہ کہ علوم کی تقسیم درست نہیں ہے، انھیں دینی ودنیوی خانوں میں بانٹنا درست نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارے علوم مرتبہ ودرجہ میں برابر ہیں؛ حالانکہ یہ نظریہ خلاف واقعہ ہے اور مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر ازہریؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ بہرحال علوم کے درجات ہیں۔ اوران کی دینی ودنیوی تقسیم درست ہے۔ وہ دینی ہیں جن کا اسلامی شریعت سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق ہے اور وہ علوم دنیاوی ہیں جن پر فہم شریعت کا دارومدار نہیں ہے، اگر چہ وہ بھی دعوتی نقطۂ نظر سے ضروری ہیں، اس سلسلہ میں ڈاکٹر ازہریؒ کی ایک تحریر ملاحظہ ہو:

"دینی مدارس اور مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا ذکر جب آتا ہے تو فوراً علوم کی تقسیم کی بحث آجاتی ہے، میرے محدود و ناقص خیال میں اس تقسیم پر جن تاثرات کا اظہار کیا جاتا ہے ان میں مزید واقعیت پسندی کی ضرورت ہے، علوم کی دینی ودنیوی تقسیم سے صرف نظر کے باوجود ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ علوم کی متعدد قسمیں اور شاخیں ہیں، جن میں سے بعض کا اسلامی شریعت سے براہ راست تعلق ہے اور بعض کا بالواسطہ شریعت فہمی کے لئے، علوم کی یہ دونوں قسمیں جس قدر ضروری ہیں ویسی ضرورت دوسرے علوم کی نہیں ہے، دینی مدارس کا قیام شریعت فہمی کے بنیادی مقصد کے لئے ہوا تھا اس لئے ان مدارس کے ذمہ داران کی نظر میں دونوں قسموں کی اہمیت تھی، اور انھیں کی تدریس و اشاعت کے لئے وہ کوشاں تھے، دیگر علوم کی تحصیل کے جواز کی جو بحث اس سلسلہ میں وجود میں آئی وہ بلاشبہ غلط اور بے موقع تھی، لیکن مدارس کو چونکہ انتہائی ناہموار حالات کا سامنا رہا اس لئے اس مسئلہ میں شدت اور جانبداری راہ پا گئی اور عام علوم کے سلسلہ میں دوطرح کے ذہن بن گئے، دینی مدارس میں علوم شرعیہ کی تحصیل پر ان مدارس کے ذمہ داران کا اصرار بیجا نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ ہندوستان پر سامراجی تسلط کے جس دور میں یہ مدارس قائم ہوئے تھے، اس میں عربی زبان اور اسلامی ثقافت وتمدن کو زبردست خطرہ لاحق تھا، مسلمانوں نے اپنے بے مائیگی کے باوجود مدارس کے قیام کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ اس کے بغیر شرعی علوم کے تحفظ کی کوئی صورت نہ تھی، لیکن اس موقع پر مدارس کے ذمہ داران اور مذہبی قائدین کے لئے توجہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ تہذیب وثقافت کے میدان میں مسلم قوم کا ایک ماضی تھا جس سے رابطہ استوار رکھنے کی ضرورت تھی، اس قوم نے جس طرح دنیا والوں کو اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے دین ہدایت سے آشنا کیا تھا اسی طرح انھیں علم وفن کے میدان میں ترقی کی راہ دکھائی تھی، بعد کے دور میں مسلم رہنماؤں کا فرض تھا کہ وہ اپنے علمی ماضی سے رشتہ استوار رکھتے اور علوم شریعت پر توجہ کے ساتھ ساتھ دیگر علوم کی تدریس واشاعت کی

جانب بھی رہنمائی کرتے تا کہ ان پر علم کی تقسیم وحد بندی کا الزام عائد نہ ہوتا"

(مقالہ تعلیمی کنونشن نمبر مجلّہ الفرقان ڈومریا گنج جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر ازہریؒ کی مذکورہ تحریر سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ علوم شریعت کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ دینی مدارس کو یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ دیگر علوم یعنی سائنس وٹکنالوجی وغیرہ پر بھی انھیں توجہ دینا چاہئے تا کہ روشن علمی ماضی سے امت مسلمہ کا رشتہ استوار ہو سکے اور اسلام کے فروغ واشاعت میں ان سے مدد لی جاسکے۔

لیکن دینی مدارس میں سائنس وغیرہ کی تعلیم کس طرح دی جائے، اس سلسلہ میں کئی دشواریاں ہیں جن کو حل کرنا ضروری ہے۔ جیسے سائنس کے مضامین کو کس حد تک دینی مدارس کے نصاب میں شامل کیا جائے، دینی مدارس کا جو نصاب ہے اور ان کی جو مدت تعلیم ہے کیا اس کے پیش نظر دوسرے مضامین کے اضافہ کی گنجائش ہے، اور اگر سائنس کے مضامین اسلامی مدارس کے نصاب میں شامل کئے جائیں تو اس کی تعلیم کے لئے اساتذہ کی فراہمی ایک اہم مسئلہ ہے، اگر کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی خدمات لی جائیں تو مدارس کا تربیتی ماحول متاثر ہو سکتا ہے اور معیار تنخواہ کی بھی دشواری سامنے آسکتی ہے۔ ان تمام باتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ازہریؒ لکھتے ہیں:

"اسلامی مدارس کے سامنے یہ مطالبہ برابر دہرایا جارہا ہے کہ دینی مضامین کے ساتھ ساتھ ان مدارس میں سائنس کے مضامین کی بھی تعلیم دی جائے یہ مطالبہ خاصے لوگوں کی طرف سے بھی پیش کیا جاتا ہے، لیکن بعض توضیح طلب امور کی وہ وضاحت نہیں کرتے، مثلاً سائنس کے کن مضامین کی تعلیم دی جائے اور کس معیار کی؟ اسی طرح اس مقصد کی تعیین بھی ضروری ہے کہ جس کے حصول کے لئے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے۔

خاکسار کا کئی طرح کے نظام تعلیم سے سابقہ رہا ہے اور امکان و وسعت کے مطابق میں ہر نظام کے فوائد ونقصانات پر غور بھی کرتا رہتا ہوں، نیز تعلیمی امور میں کسی محدود یا تنگ نقطۂ نظر کا حامل نہیں ہوں، ان تمام امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ محدود پیمانہ پر کسی متعین مقصد کے حصول کے لئے مذکورہ مطالبہ پر غور کیا جاسکتا ہے یا اسے تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے پہلے یہ واضح ہونا چاہئے کہ سائنس کی تعلیم کے لئے اساتذہ کی دشواری کو کس طرح حل کیا جائے گا، مدارس کے تدریسی عملہ کے لئے ممکن نہیں کہ سائنس کے مضامین کی تعلیم دے سکے، اور اگر اس کے لئے کالج ویونیورسٹی کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی جائیں تو اس سلسلہ میں مدارس کا تربیتی ماحول متاثر ہوتا ہے، یہاں تنخواہ کے تفاوت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے، میرا مشاہدہ ہے کہ مدارس کی انتظامیہ سائنس کے اساتذہ کو وہ اسکیل نہیں دے سکتی جو کالج اور یونیورسٹی کی طرف سے انھیں دیا جاتا ہے۔

دینی مدارس کے نصاب میں کسی مضمون کے اضافہ سے قبل یہ غور کرنا ضروری ہے کہ کیا موجودہ مدت تعلیم کے اندر نصاب میں کسی مضمون کے

اضافہ کی گنجائش ہے؟ ایسی صورت میں مدت تعلیم میں اضافہ کئے بغیر کسی مضمون کے اضافہ کی سفارش قابل قبول معلوم نہیں ہوتی، ہماری اس گزارش کا یہ مدعا نہیں کہ ہم مدارس سے دقیانوسی، رجعت پسند اور دین و دنیا سے بے خبر انسان پیدا کرنا چاہتے ہیں، ہرگز نہیں، ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ مدارس میں تعلیم حاصل کرنیوالے حضرات کا اپنا تشخص برقرار رہے، اس کے بعد وہ جو کچھ بنا چاہیں بن سکتے ہیں''

(مقالہ تعلیمی کنونشن نمبر مجلّہ الفرقان ڈومریا گنج جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر ازہریؒ سائنسی اور عصری مضامین کی تعلیم کے منکر نہیں ہیں۔ البتہ دینی مدارس کے نصاب میں انھیں شامل کرنے کی راہ میں جو دشواریاں ہیں انھیں اس کا شدید احساس ہے، جس کا ذکر انھوں نے مقالہ میں کیا ہے، اسی مقالہ میں انھوں نے دینی مدارس کے طلبہ کو سائنس وٹکنالوجی کی تعلیم کے لئے ایک تجویز پیش کی ہے، جس میں بحث ونظر کی پوری گنجائش ہے، لیکن بہرحال وہ ایک اچھی رائے ہے، ملاحظہ کیجئے:

''اس مقام پر یہ توضیح بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت سے طلبہ سائنس وٹکنالوجی کا ذہن رکھتے ہیں، بہت سے طلبہ ''مولویانہ'' زندگی میں نہیں آنا چاہتے، لیکن حالات نے انھیں مدرسہ میں پہونچا دیا ہے، ایسے طلبہ کے سلسلہ میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ متوسطہ یا ثانویہ ہی کے مرحلہ میں ان کی صلاحیت ورجحان کا اندازہ لگا کر انھیں ان کی سند کے مضمون سے جوڑ دینا چاہئے تاکہ وہ اپنی پسند کے مطابق تعلیم حاصل کرکے ترقی کریں، آپ اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ مدارس میں تعلیم کے لئے جو طلبہ آتے ہیں ہم انھیں اپنا طالب علم بنا لیتے ہیں، اور اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ان کی ترجیح اور افتادِ طبع کو سمجھیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسہ کے ماحول میں رہ کر بھی کچھ طلبہ مدرسہ کے ماحول ومقصد سے ہم آہنگ نہیں ہو پاتے اور کبھی کبھی وہ اس نظام سے کھلی بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، تعلیمی عمل یقیناً منصوبہ بندی کا متقاضی ہے اور منصوبہ بندی کے لئے طبعی رجحان کا مطالعہ ضروری ہے، لہٰذا ہمیں ابتدائیہ یا متوسطہ ہی کے کسی مرحلہ میں یہ اندازہ لگانا ضروری ہے کہ کس طالب علم کی صلاحیت اور رجحان کیا ہے تاکہ اسی تعلیم سے جوڑا جا سکے، اگر طالب علم کسی نوعیت کی تعلیم سے ہم آہنگ ہے تو پھر میں یہ بھی سفارش کرتا ہوں کہ پورا تعلیمی خرچ برداشت کرکے اسے ایسے مضمون کی اعلیٰ تعلیم دی جائے تاکہ وہ ملت وجماعت کی خدمت انجام دے سکے''۔ (مقالہ تعلیمی کنونشن نمبر مجلّہ الفرقان ڈومریا گنج جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء)

''یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مدارس اسلامیہ میں عصری علوم کی تعلیم کے نظریہ کے ہم قائل نہیں، بلکہ اس طرح کے اقدامات کو علم اور دین دونوں کے لئے مضر سمجھتے ہیں، البتہ دونوں نوعیت کی تعلیم کے مابین ایسا حسن امتزاج گوارا کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ دونوں طرح کے نظام

تعلیم اپنے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرتے رہیں، دینی حلقہ کو جس نوعیت کے بالغ نظر اور ماہرین علوم شریعت علماء کی ضرورت ہے، وہ ان اسلامی مدارس میں پیدا کئے جائیں، اور اسی طرح علوم عصریہ کے ماہر علماء ان علوم سے متعلق پرائیوٹ اور سرکاری اداروں میں پیدا کئے جائیں، لیکن تجدد کے شوق اور اقتصادی مسئلہ کے حل کے زعم میں مدارس اسلامیہ کو عصری علوم کی تعلیم کا مرکز بنا دینا میری نظر میں ملت کے ساتھ خیانت اور مسئلہ تعلیم کی ہمہ گیر حیثیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ خاکسار عصری علوم کا مخالف نہیں، بلکہ ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ اسے یونیورسٹی سے استفادہ وافادہ کا موقع ملا ہے، اور اس موضوع پر مختلف اوقات میں اس نے خامہ فرسائی بھی کی ہے، پھر بھی اسے اس بات پر اصرار ہے کہ عصری علوم کو مدارس اسلامیہ میں داخل کرنے کے تجدیدی عمل سے ہمارے ذمہ داروں کو باز رہنا چاہئے، اس سے جو نقصانات ظاہر ہوں گے ان کا خواہ اس وقت ادراک نہ ہو، لیکن آئندہ بیحد افسوس ہوگا''۔

(مجلہ افکار عالیہ، مئو جولائی ۲۰۰۸ء)

حرف آخر

یہ ہے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کا نظریۂ تعلیم جس کی تفصیلی وضاحت کے لئے ان کی بعض تحریروں کے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، ہم اپنے الفاظ میں بھی ان کے تعلیمی افکار ونظریات ذکر کر سکتے تھے مگر انھیں کے الفاظ نقل کر دئے گئے تا کہ لوگ براہ راست ان کے تعلیمی افکار وتصورات سے مستفید ہوں اور ان کے طرز تحریر اور زبان واسلوب سے بھی لطف اندوز ہوں، اب بطور حرف آخر میں اپنے الفاظ میں ان کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ درج کر رہا ہوں۔

- تعلیم ایک مقدس فریضہ ہے جس کا مقصد خدا شناسی وخود شناسی ہے اور یہ مقصد مشرقی علوم سے حاصل ہوتا ہے، مغربی علوم اس بارے میں ناکام ہیں۔
- مدارس کے قیام کا مقصد دین پر عمل اور اس کی اشاعت ہے، مگر نصاب میں عصری تقاضوں کی رعایت ضروری ہے تاکہ داعی ومدعو میں ہم آہنگی پیدا ہو۔
- علوم کی تقسیم کا انکار واقعیت پسندی کے خلاف ہے، علوم کی بہرحال متعدد قسمیں اور شاخیں ہیں، علوم کے جس حصہ کا بلاواسطہ یا بالواسطہ شریعت سے تعلق ہے، وہ علوم شریعت کہے جاتے ہیں جن پر دین فہمی کا دارومدار ہے۔
- امت مسلمہ کا جو روشن علمی ماضی رہا ہے، اس سے رشتہ استوار رکھنے کے لئے علوم شریعت کے ساتھ دیگر علوم کی تدریس پر بھی توجہ دینا چاہئے۔
- دینی مدارس کے نصاب میں سائنسی علوم شامل کرنے کی راہ میں بڑی دشواریاں ہیں، اس سلسلہ میں بہتر ہوگا کہ مدارس میں جو طلبہ آتے ہیں، ان میں جو سائنس وٹکنالوجی کا ذہن رکھتے ہیں، انھیں متوسطہ یا ثانویہ کے بعد عصری علوم کے لئے موقع دینا چاہئے؟

اللہ تعالیٰ تمام ذمہ داران مدارس کو نصاب تعلیم سے متعلق افراط وتفریط سے بچائے اور جادۂ اعتدال پر قائم رکھے۔

☆☆☆

عبداللہ سعود بن عبدالوحید
ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ۔ بنارس

ہمارے استاذ

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ

جامعہ سلفیہ بنارس کی تاسیس کو آج چھیالیس سال گزر چکے ہیں، تاسیس کے وقت میں جامعہ رحمانیہ کا طالب علم تھا، کبھی کبھی ہم مرکزی دارالعلوم کے احاطہ میں اپنے والد کے ساتھ چلے جاتے تھے، وہاں کا میدان اور مزدوروں کے کام اب تک ذہن میں نقش ہیں، رحمانیہ سے مولوی کے چار سال پورا کرنے کے بعد عالم اول میں جامعہ پہنچا، اس وقت جامعہ میں صرف چھ کلاس روم تھے، ایک سے چار عالیت اور پانچ و چھ نمبر فضیلت کا کلاس تھا، طلبہ کی تعداد محدود تھی، اساتذہ مستعدی سے پڑھاتے تھے، جو بھی جامعہ سے تعلیم حاصل کر کے نکلا سب کے اندر اچھی استعداد و ملکہ پایا جاتا ہے، جب ہم کچھ اوپر کلاس میں گئے اس وقت ہم کو جن اساتذہ کرام نے پڑھایا ان میں محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب بھی تھے، ڈاکٹر صاحب جب آئے تھے ان کا استقبال ہوا تھا، ایک قابل و باصلاحیت استاذ کی حیثیت سے ہر کوئی ان کو جانتا تھا، بہت جلد آپ کو عربی ماہنامہ کا ذمہ دار بنایا گیا اور جامعہ کی معنوی ترقی میں آپ میرے والد محترم، اس وقت کے ناظم اعلیٰ کے دست و بازو بن گئے، ۱۹۷۸ء میں آپ کو وکیل الجامعہ بنایا گیا، جس کے لئے ڈاکٹر صاحب بہت ہی مناسب شخصیت ثابت ہوئے، عرب دنیا سے ربط مضبوط کرنے میں ڈاکٹر صاحب نے اہم رول ادا کیا ہے، عربی میں خط و کتابت کے لئے ڈاکٹر صاحب خود اپنے ہاتھ سے خط ٹائپ کرتے تھے، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا، جب میں نے جامعہ میں ۱۹۹۴ء میں کمپیوٹر لگایا، اس کے بعد سے ڈاکٹر صاحب کو آسانی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں نے کئی سفر کئے ہیں، دو تین بار سعودیہ کا سفر کیا ہے، اور امریکہ کے سفر میں بھی ہم دونوں ایک ساتھ تھے، ہمارے دوسرے ساتھی الگ الگ کمرہ میں رہتے تھے، مگر میں کوشش کرتا کہ ہم دونوں ایک ہی کمرہ میں رہیں میں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور آپ کی قدر میرے دل میں سب سے زیادہ تھی، آپ میرے والد محترم کے بہت قریبی تھے یہ نسبت بھی میرے دل میں ہمیشہ رہی۔

ہمارے استاد اور جامعہ سلفیہ کے صدر محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ اپنی صحت کے بارے میں بہت محتاط تھے، گزشتہ رمضان میں وہ مئو میں تھے، اس سال جامعہ ۷/شوال سے کھلا، ڈاکٹر صاحب کچھ اپنی نجی ضرورت کے پیش نظر دیر سے جامعہ پہنچے، جامعہ آنے کے بعد تین چار روز وہ اپنی رہائش گاہ سے نیچے نہیں اترے، معلوم کرنے

پر پتہ لگا کہ طبیعت ناساز ہے، میں ۱۴ر تاریخ کو ان کی رہائش گاہ پر خیریت معلوم کرنے گیا، بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے، بائیں طرف پسلی و پیٹھ میں درد ہے اور کچھ تنفس کی شکایت ہے، پوچھا علاج کیا کر رہے ہیں، کہا کہ ڈاکٹر آر این باجپائی کا علاج چل رہا ہے، نمونیہ بتا رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی طبیعت دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ نمونیہ نہیں ہے میں نے آپ سے کہا کہ ٹھیک ہے علاج کیجئے مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا جائے، بہر حال میں اسی روز آپ کو ایک دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا، ڈاکٹر نے دیکھ کر کچھ جانچ کرانے کو لکھا اور تین دن کی دوا لکھی، جب ازہری صاحب باہر چلے گئے تو میں نے ڈاکٹر سے نمونیہ کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ نمونیہ ہرگز نہیں ہے، مجھے کینسر کا خطرہ لگ رہا ہے، آپ کے پیٹ میں اپنڈکس کے قریب اندر گانٹھ بن چکی تھی، بنارس میں خون و الٹرا ساؤنڈ کرانے کے بعد مزید چیک اپ اور علاج کے لئے ہم لوگوں نے آپ کو ۱۸ر کتوبر کو بذریعہ ہوائی جہاز دہلی بھیجا اور بترا اسپتال میں بھرتی کرایا، اتوار کا دن تھا مگر ہسپتال کے مالک کی ہدایت پر اسی روز ڈاکٹر نے دیکھا، جانچ شروع ہوئی، اس دوران آپ کو کئی بوتل خون بھی چڑھانا پڑا، جب میں آپ سے ۲۵ و ۲۶ر اکتوبر کو بترا اسپتال میں ملا تو آپ کو تکلیف تھی اور کمزوری ظاہر ہو رہی تھی، جامعہ کے مسائل پر آپ سے گفتگو بھی ہوئی، یہ وہم و گمان میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر جلد ڈاکٹر صاحب ہم کو داغ مفارقت دے جائیں گے، ہم اللہ کے فیصلہ پر راضی ہیں، ڈاکٹر صاحب چلے گئے، جامعہ کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت عالمی شہرت یافتہ شخصیت تھی، آپ عالم بھی تھے، ادیب بھی تھے، مورخ بھی تھے اور خطیب بھی، ساتھ ہی ساتھ منتظم بھی تھے، ایک بار آپ نے مجھے ایک سند دکھائی جو سعودیہ کی طرف سے صوت الامۃ کی بہترین ایڈیٹری پر آپ کو دی گئی تھی، یہ آپ کے اچھے صحافی ہونے کا اعتراف تھا۔ ۱۱ر مئی ۱۹۹۳ء کو جب آپ کو راشٹر پتی بھون میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ذریعہ اشوکا ہال میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تو اس وقت میں بھی آپ کے ساتھ موجود تھا، کتنا اچھا لگ رہا تھا، آپ کے ساتھ دو آدمیوں کو پاس دیا گیا تھا، ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے، ڈاکٹر صاحب کی بیش بہا علمی تصنیفات، ترجمے اور کتابوں پر تبصرے، آپ کی باوقار علمی شخصیت کے غماز ہیں، یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض اساتذہ کو ان کی تصنیف پر جامعہ سے ملنے والی تنخواہ کے علاوہ الگ سے معاوضہ بھی دیا جاتا تھا مگر ہمارے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ ۲۰۰۳ء میں جب امریکہ کا سفر ہوا اور جامعہ سے مجھے منتخب کیا گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ساتھ چلنے کو کہا، ہر ادارہ سے صرف ایک ہی شخص کو لیا گیا تھا، مگر ہم لوگوں کے اصرار پر دو آدمی ساتھ گئے، اس سفر کی نسبت سے بھی ہمارے بھائیوں نے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں اور لکھا ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے، یہ وقت اس کے تذکرہ کا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت سی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی، جامعہ کے اندر جتنے اہم اور

بڑے پروگرام ہوئے سب میں ڈاکٹر صاحب کا عظیم حصہ ہے، جماعت کی آخری دونوں آل انڈیا اہلحدیث کانفرنسوں میں آپ ہی صدر مجلس استقبالیہ رہے، ہمارے یہاں جلسوں اور مدرسہ کے سالانہ پروگراموں میں ہماری خواہش رہتی کہ ڈاکٹر صاحب ہی صدارت فرمائیں، اس سال اتحاد ابناء السلفیہ کا سالانہ دوروزہ اجلاس ہونا تھا، اتحاد والے علماء کی لسٹ لے کر میرے پاس آئے اور صدارت کے لئے ڈاکٹر صاحب کا نام لیا میں نے کہا بہتر ہے، جب ڈاکٹر صاحب کے مرض کی اطلاع ان کو پہنچی تو میرے پاس آئے اور کہا کیا کیا جائے، نام بدل دیا جائے، میں نے کہا نہیں جیسے چھپ رہا ہے اسی طرح چھاپئے، حالانکہ مجھے خطرہ کا پورا احساس ہو چکا تھا، میری اہلیہ بھی اسی مرض میں اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں اور بھی میں نے کئی مریضوں کو دیکھا ہے، یہ مرض جب معلوم ہوتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے، یہ جلسہ اس روز ہونا تھا جس وقت ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کی قبر پر اپنے دونوں ہاتھ سے مٹی ڈال رہے تھے، انسان کتنا عاجز ولاچار ہے، دنیا کی تمام ایجادات اور سائنس کی ترقی اس مقام پر بے وقعت معلوم ہوتی ہے، ہم کسی کو ایک لمحہ کے لئے روک نہیں سکتے، کاش انسان اپنی حقیقت کو سمجھتا، اگر اس کو سمجھنے لگے تو جماعت ومدارس میں رونما ہونے والے اختلافات کافور ہو جائیں۔ آج اقتدار کی لڑائی نے ہم کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے، داؤ پیچ میں کسی کو بدنام کریں کسی کی عزت سے کھیلیں۔

اقتدار والے اپنے اقتدار میں گم ہیں، ان کو کسی کے مشورہ کا پاس نہیں، ہمیں جو کرنا ہے کریں گے، اب تو اقتدار اور کرسی کو باقی رکھنے کا گر بھی آ گیا ہے، جس کو مخالف پاؤ اس کو باہر کرو، اپنی تعریف لکھواؤ اور اس کو چھاپو، آج دنیا میں ترقی اور نیک نامی اسی کا نام ہے۔

ہمارے ڈاکٹر صاحب اس سے مختلف تھے، ہم لوگ چارٹرم سے آپ کو صدارت قبول کرنے کے لئے کہہ رہے تھے، یہ منصب صاحب منصب کے لئے ہے، آپ کی یہی سوچ تھی، آج وہ ہم میں نہیں رہے، یہ منصب پھر خالی ہو گیا، آپ کی تدفین کے بعد سنیچر کو میں نے جامعہ کے تمام اساتذہ کرام کو اکٹھا کیا، سب کے سامنے حالات کو پیش کیا، سب سے ہماری درخواست ہے کہ جامعہ کے لئے باصلاحیت افراد کو ڈھونڈیں، اللہ تعالیٰ کوئی سبیل پیدا کرے گا، ان شاء اللہ۔

یہ جامعہ سلفیہ جس جذبہ سے قائم کیا گیا ہے، آج پھر تجدید کی ضرورت ہے، اب ہم ایک دوسرے دور میں داخل ہو چکے ہیں، السابقون الاولون کے آخری کڑی تھے ڈاکٹر صاحب۔ اب اس وقت جامعہ میں سب سے بزرگ شخصیت جس کی ہے اس نے جامعہ کے افتتاحی پروگرام میں جامعہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ اب جامعہ اپنے پودوں کی خود آبیاری کر رہا ہے۔ باغباں سب چلے گئے ایک دور ختم گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر اطہر افضال
نئی دہلی

ازہری صاحب کی ترجمہ نگاری
'انا' کے حوالے سے

''عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے''۔
البرٹ گیرارڈ

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (۱۹۳۹۔۲۰۰۹) نے تقریباً نصف صدی تک تعلیم و تدریس، تصنیف و ترجمہ اور صحافت کی وادی کو اپنے افکار کی تابانی سے منور کیا۔ ان کے کام اور کارنامے کے تنوع کو دیکھتے ہوئے انھیں ایک جلوۂ صد رنگ شخصیت کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا، ان کے علمی انتاجات، ژرف نگاہی اور دانشورانہ بصیرت کے اعتراف و مقبولیت کا دائرہ مسلکی اور ملکی حدود سے پرے تھا۔ انھوں نے مقام و معیار کے لحاظ سے متنوع علمی سرچشموں سے استفادہ کیا تھا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں روایت و جدت کچھ اس انداز سے رچ بس گئے تھے کہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ بن گئے۔ ان کی شخصیت کی تشکیل میں مئو، قاہرہ اور علی گڑھ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ مئو کے مدارس اور مذہبی ماحول نے ان کو تقوی، توکل اور طہارت کا سبق پڑھایا تھا، قاہرہ کی آزاد علمی اور ادبی فضا میں ان کی ثقافت میں وسعت اور فکر میں آفاقیت پیدا ہوئی تھی اور علی گڑھ سے سرسید کے سوز دروں اور دردمندی کی دولت ملی تھی۔ قاہرہ سے واپسی کے بعد جامعہ سلفیہ بنارس سے وابستہ ہوگئے اور بقول خود'' اس کے در و بام سے ایسی انسیت ہوئی کہ تادم تحریر (۲۰۰۸) اسی جگہ شب و روز گزر رہے ہیں۔''(۱) یہیں سے ان کی شناخت بنی پھر خود جامعہ کا شناخت نامہ بن گئے۔ ادب، انشاء، تفسیر اور تاریخ کا درس دیا اور طلبہ کو دین و دانش کی نئی نئی راہوں سے آشنا کرایا۔ دعوت، تعلیم، اسلامی علوم، صحافت اور سیرت وغیرہ کے موضوعات پر سیمینار منعقد کرا کے عالمانہ اور دانشورانہ بحث کا آغاز کیا، ان کی مستقل تصانیف کم، ترجمے زیادہ اور مقالات کی تعداد تو بہت زیادہ ہے۔ وہ ترجمہ کے میدان میں ایک اتھارٹی تھے، اردو اور عربی کے ساتھ فارسی سے عربی میں بھی ان کی ترجمہ نگاری کے معیاری نمونے موجود ہیں۔ ان کی شخصیت کی بوقلمونی اور فکر کی آفاقیت کی طرح ترجمے کے موضوعات بھی متنوع ہیں، ان کو ایک مضمون میں سمیٹنا ذرا مشکل ہے، نامور مصری ادیب عباس محمود العقاد کی آپ بیتی ''انا'' کے ترجمے سے ان کے اس سفر کا آغاز ہوتا ہے یہاں پر اسی کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔

عباس محمود العقاد (۱۸۸۹۔۱۹۶۴) کا شمار جدید عربی ادب کے عظیم معماروں میں ہوتا ہے، وہ کسی کالج کے

(۱) علامہ اسماعیل سلفی گجرانوالہ تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی، (مقدمہ ڈاکٹر ازہری) مکتبۃ الفہیم مئو ۲۰۰۹، ص ۹

تعلیم یافتہ یا یونیورسٹی کے فارغ نہیں تھے لیکن ان کے علمی و ادبی انتاجات کے تنوع اور تعداد کو دیکھ کر ایک خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔صرف ذاتی محنت ،لگن اور مطالعے کی حیرت انگیز عادت نے ان کو اپنے وقت کا ایک عظیم ادیب اور صاحب نثر انشاء پرداز بنا دیا تھا۔العقاد نے مختلف موضوعات پر لکھا اور خوب لکھا،شعر اور نثر دونوں اصناف میں ان کی تخلیقات سے ان کی علمی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔انھوں نے شاعری کی، فکشن اور تنقید کے ساتھ اخبارات کے لئے کالم بھی لکھا، اسلامیات کے موضوع پر بھی ان کا اشہب قلم رواں تھا،''عبقریات'' کے مطالعے سے ان کے تاریخی شعور، بے پناہ قوت انشاء پردازی، استنباطی ذہن اور اخاذ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔تخلیقات میں یہ تنوع بجائے خود خاصے کی چیز ہے۔کتابوں سے ان کی دوستی کا اندازہ ان کے اس قول سے ہوتا ہے۔''میرے دوست توفیق الحکیم نے اپنی کسی کتاب میں میرے متعلق اپنا یہ تخیل پیش کیا ہے کہ میں جنت میں داخل ہونے کے بعد کتب خانہ کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا، بہت دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد جب کوئی کتب خانہ نہیں ملا تو تنگ آ کر یہ کہہ اٹھا کہ یہ کیا۔بغیر کتاب جنت کیسی؟''(۱)

'انا' العقاد کی ذاتی ونفسیاتی زندگی کے تذکرے پر مشتمل ہے۔اس آپ بیتی میں العقاد نے اپنے والدین، شہر، بچپن، تعلیم، اساتذہ اور ملازمت سے متعلق احوال کا ذکر کیا ہے، اس میں مضمون نگار سے ایک صاحب طرز ادیب اور عظیم انشاء پرداز بننے کے سفر کی دلچسپ داستان ہے، زندگی کے تلخ و شیریں تجربات ہیں، دوستوں کے ساتھ دشمنوں کا بھی ذکر ہے،فلسفۂ زندگی کے متعلق ان کے خیالات ہیں، موسم، مزاج اور ماحول کے حوالے سے ذاتی پسند و ناپسند کا ذکر ہے،عمر کے مختلف مراحل میں ان کے کیا مشغلے رہے،اس کتاب میں یہ تمام چیزیں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں ۔مختلف سیاسی اور ادبی شخصیات پر متوازن تبصرے ہیں، سیاست کی باتیں اور صحافت کے قصے ہیں، عشق ومحبت کی کہانیاں ہیں۔ اس خود نوشت سوانح کے مطالعے سے اس زمانے کے مصر کی ادبی ، سیاسی اور سماجی زندگی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مصنف نے چھوٹے چھوٹے واقعات، ذاتی تجربات وخیالات سے اس کتاب کو دلچسپ اور معلوماتی بنا دیا ہے۔بقول طاہر الطناحی:

''عقاد کی تحریر اور ان کی سوانح اکثر مفکرین، ادباء اور علماء سماجیات کے سوانح سے مختلف ہے ان میں سے بعض علماء، ادباء اور سیاسی لوگوں نے اپنی سوانح تاریخی انداز میں لکھی، بعض نے ڈائری اور یادداشت کا انداز اختیار کیا اور بعض لوگوں نے اپنی زندگی کی تصویر اعترافات کے انداز میں پیش کی اور زندگی کے صرف انتہائی اہم واقعات ہی کا تذکرہ کیا۔لیکن اپنے متعلق عقاد کی کی تحریر سوانح نگاری کے باب میں ایک نئے رنگ کی حامل ہے،اس میں صرف شخصیت یا گزرے ہوئے واقعات وحوادث کا بیان نہیں ہے بلکہ یہ ایک جستجو پسند عالم اور باکمال فن کار کی تحریر ہے جسے علمی، فکری اور فنی مسائل میں غور وفکر کی عادت ہے اور جس کی جولانگاہ فلسفہ، علم النفس، ادب، تربیت اور عمرانیات

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس ۱۹۸۷، ص ۱۱۴

کے مسائل رہے ہیں، جسے زندگی کا تجربہ اور تلخ و شیریں سے واسطہ رہا ہے اور اسی سے عالم کا تجربہ، مفکر کی عبرت اندوزی اور فلسفی کی حکمت حاصل ہوئی ہے۔' انھوں نے اپنے بارے میں لکھتے ہوئے مختلف قسم کے علوم اور گونا گوں فکری مسائل کو ہاتھ لگایا ہے، ہر واقعہ یا امر پر علمی انداز میں تبصرہ یا اس کی نفسیاتی یا فلسفیانہ توجیہ کی ہے''۔(۱)

العقاد نے ذاتی اور علمی سوانح کو الگ الگ قلم بند کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور اپنی زندگی کے لئے انھوں نے ''حیاۃ قلمی'' کا عنوان بھی منتخب کر لیا تھا۔ کر دیا جس کی چند قسطیں مصر کے مشہور اخبار ''الہلال'' میں شائع ہوئیں اور ''المصور''، ''الاثنین''، ''کل شی'' اور ''القافلہ'' میں بھی کئی مضامین چھپے۔ العقاد کے قدر داں اور صحافی و ناشر طاہر الطناحی نے ذاتی حالات سے متعلق تمام مضامین کو جمع کیا اور اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا، کتاب ابھی منظر عام پہ نہیں آپائی تھی کہ العقاد کا انتقال ہو گیا۔ الطناحی نے ہی اس کتاب کا نام ''انا'' تجویز کیا۔ انھوں نے 'انا' کے مقدمے میں تفصیل کے ساتھ اس کتاب کی شان نزول کے بارے میں لکھا ہے جو اس اردو ترجمے میں بھی موجود ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مقدمہ نگار نے صاحب کتاب کی ذاتی اور علمی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس کتاب کے بارے میں ان کی رائے کچھ یوں ہے۔

''عقاد کی زندگی ایک بھرپور زندگی ہے، اسے ایک کتاب میں جمع نہیں کیا جا سکتا، اگر میں اس کتاب ''انا'' کے ذریعہ عقاد کی ذاتی و نفسیاتی زندگی یا ''عقاد انسان'' کو پیش کر رہا ہوں تو ابھی مصنفین اور باحثین کے سامنے ''العقاد الکاتب یا العقاد الشاعر، العقاد السیاسی، العقاد اللغوی، العقاد الصحفی، العقاد الفنان، العقاد المؤرخ، العقاد المؤلف، العقاد العالم اور العقاد الفیلسوف وغیرہ عنوانات محتاج تشریح باقی رہ جاتے ہیں کیونکہ موصوف معلومات اور تخلیق کا سمندر اور صلاحیت و استعداد کے باب میں منفرد شخصیت کے مالک تھے۔''(۲)

'انا' کا اردو ترجمہ ازہری صاحب کے قیام علی گڑھ (۱۹۷۲تا۱۹۷۵) کی یادگار ہے، مسلم یونیورسٹی میں ازہری صاحب اور ان کے چند باذوق احباب نے ایک دارالترجمہ قائم کر کے جدید عربی ادب کی اہم کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا خالص علمی منصوبہ بنایا اور اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے جدید عربی آپ بیتیوں میں طٰہٰ حسین کی 'الایام'، احمد امین کی 'حیاتی'، سلامہ موسی کی 'تربیۃ سلامہ' اور عباس محمود العقاد کی 'انا' کا اردو ترجمہ کرنے کا کام شروع کر دیا مگر اس منصوبے کے تحت صرف 'انا' ہی کا ترجمہ مکمل ہو سکا، جس کی تفصیل اسی حلقے کے ایک اہم اسکالر فرید احمد برکاتی صاحب کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

''ایک روز طے پایا کہ کیوں نہ ایک ''دارالترجمہ'' قائم کر دیا جائے۔ دراویش نے اپنے لئے ایک ایک کتاب کا انتخاب کر کے گویا اس منصوبے کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ جن کتابوں کا انتخاب ہوا ان میں سے ایک ''انا'' بھی تھی۔ اپنے تعلیمی مشاغل کے ساتھ ساتھ ترجمے کے اس کام کو پورا

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس ۱۹۸۷،ص ۷ (۲) ایضاً ص ۹-۱۰

کرنا بشرطِ استواری ہی ممکن تھا چنانچہ صرف یہی ایک کتاب تھی جس کا ترجمہ تکمیل کی منزل کے قریب تھا کہ صحبت دراو پیش آخر ہوگئی۔ مقتدیٰ حسن صاحب نے اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کے بعد دارالعلوم جوائن کرلیا جہاں تدریس کے علاوہ ان کے ذمہ اہتمام سے بھی متعلق کئی امور تھے، دارالعلوم کے تبلیغی اور اشاعتی پروگرام کے تحت رسالہ ''دارالعلوم'' کی ادارت، کتابوں کی اشاعت وتراجم کے کام میں وہ ایسے مشغول ہوئے کہ انھیں ''انا'' کا خیال بھی نہیں آیا۔ ناچیز اور دوسرے دراویش وقتاً فوقتاً یاد دہانی کراتے رہے''۔(۱)

احباب کا اصرار اور یاد دہانی رنگ لائی اور 'انا' کا ترجمہ ''مشہور مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی'' کے نام سے ۱۹۸۷ میں جامعہ سلفیہ بنارس سے شائع ہو گیا۔ پوری کتاب ۳۰۴ صفحات اور آٹھ فصلوں پر مشتمل ہے جس میں فرید احمد برکاتی کی تقریب، طاہر الطناحی کے مقدمے کے ساتھ ازہری صاحب کا ایک مضمون '' جدید عربی ادب کا ایک عظیم معمار۔ عباس محمود العقادؔ' بھی شامل ہے۔ چوالیس (۴۴) صفحات پر مشتمل یہ علمی مضمون العقاد کی ہمہ جہت زندگی اور خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ 'انا' کا ترجمہ ۱۹۷۵ کے آس پاس مکمل ہوا تھا اور تقریباً بارہ سال بعد شائع ہوا، تحریر وتخلیق کی دنیا میں یہ وقفہ مختصر نہیں ہے ،جس وقت ازہری صاحب نے یہ ترجمہ شروع کیا تھا اس وقت ان کی حیثیت ایک نو آموز مترجم کی تھی اور جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو وہ علمی دنیا کا ایک معتبر نام بن چکے تھے اور ان کی شہرت کا دائرہ برصغیر سے خلیجی ممالک تک پھیل چکا تھا اور آج ان کی ترجمہ نگاری کے حوالے سے جب یہ چند سطریں لکھی جا رہی ہیں تو علمی دنیا اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں برصغیر میں عربی۔ اردو ترجمہ نگاروں کی مختصر سے مختصر ترین فہرست بھی ان کے نام کے بغیر ناقص رہے گی۔

ترجمہ ایک مشکل فن ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں، یہ انسانی سماج کی اہم ضرورت ہے ،اس سے ادبی اور ثقافتی تبادلے کی راہ ہموار ہوتی ہے، دیگر زبان اور سماج کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے، ترجمہ ہم کو ایک وسیع دنیا کا نظارہ کرنے کے لئے کھڑکی فراہم کرتا ہے جس سے ہمارے ذوق کی تسکین ہوتی ہے اور ثقافت وسیع ۔ ترجمے سے زبان کا دامن بھی وسیع بھی ہوتا ہے۔ ترجمہ بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے، اسی لئے بعض اہل علم نے ترجمہ کو تخلیق سے مشکل عمل کہا ہے کیوں کہ اس میں مترجم کو تخلیق کار کے خیالات کی ترسیل کا کام انجام دینا ہوتا ہے، تکنیکی ،معلوماتی اور سائنسی موضوعات کے مقابلے میں تخلیقی ادب کا ترجمہ زیادہ دشوار ہوتا ہے اور یہ عمل اس وقت دشوار تر ہو جاتا ہے جب تخلیقی فن پارہ کو کسی ایسی زبان میں منتقل کیا جائے جو تہذیبی سطح پر اصل زبان سے مختلف ہو۔ اسی لئے جرمن ادبی ناقد Heinrich Heine نے'' مترجم کی کوشش کو تنکوں میں سے گزرتی ہوئی سورج کی کرنیں ترتیب دینے کا عمل کہا تھا'' اور ظ۔ انصاری نے اس عمل کو ''طوطا کے ادوان پر چلنے'' سے تعبیر کیا تھا۔ ترجمہ پڑھتے

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس ۱۹۸۷،ص ۳

وقت تو کم لیکن ترجمہ کرتے وقت اس مشکل کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔مترجم کے لئے Source Language اور Target Language دونوں میں مہارت کے ساتھ ان کے مزاج کا یکساں شعور، تہذیبی روایات، سماجی رشتوں اور ان کے محاوروں سے اچھی واقفیت ضروری ہے، صرف زبان میں مہارت ترجمہ کے لئے ناکافی ہے۔ازہری صاحب کی مادری زبان اردو تھی، عربی زبان انھوں نے مئو، قاہرہ اور علی گڑھ میں سیکھی تھی خاص طور پر العقاد کے ملک میں قیام اور عرب اساتذہ کی تعلیم نے ان کے عربی زبان وادب کے علم اور ذوق کو کافی نکھار دیا تھا اور اس زبان میں ماہرانہ دسترس پیدا کر دی تھی۔

''ترجمہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔الفاظ و محاورات کے علاوہ جب تک کسی زبان کی تعبیر اور طرز ادا پر دسترس حاصل نہ ہو اس کے ترجمے اور ترجمانی کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے وسیع مطالعے اور اہل زبان کی صحبت بھی درکار ہوتی ہے۔'انا' کے مترجم ان دونوں صفات کے حامل ہیں کیونکہ ان کا قیام کئی سال مصر میں رہ چکا ہے۔''(۱)

ازہری صاحب کو ترجمہ نگاری سے دلچسپی تھی، قاہرہ میں قیام کے دوران عربی ادب اسلامیات سے متعلق اہم کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں اور ان کی خواہش تھی کہ ان کو اردو کا قالب عطا کر کے اس زبان کے قارئین کو بھی ان سے استفادہ کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ سے مطبوعہ 'دستاویز' میں اس کا اظہار بھی کیا ہے ''عربی ادب اور اسلام سے متعلق عرب علماء کی جدید تصنیفات کو اردو کا جامہ پہنانے کی شدید خواہش ہے''۔(۲)

اسی منصوبے کے تحت ازہری صاحب نے اسلامیات، سیرت، سوانح، تاریخ وتفسیر کے موضوعات پر کئی کتابوں کے ترجمے کئے جو برصغیر اور عرب ممالک کے علمی حلقوں میں مقبول بھی ہوئے۔یہاں بغیر کسی ترتیب کے ان کتابوں کا ذکر کیا جارہا ہے۔جمال الدین القاسمی کی کتاب اصلاح المساجد، محمد بن عبدالوہاب کی کتاب 'مختصر زاد المعاد، علامہ ابن تیمیہ کی 'اقتضاء الصراط المستقیم' کا 'راہ حق کے تقاضے'، ڈاکٹر عبدالحلیم عویس کی کتاب سقوط ثلاثین دولة کا 'عظمت رفتہ' اور 'فی ظلال الرسول' کا 'رسالت کے سائے میں' کے نام سے اردو ترجمہ کیا۔اردو سے عربی ترجمے کم وکیف دونوں لحاظ سے اہم ہیں۔علامہ اسماعیل سلفی گوجرانوالہ کی مشہور کتاب 'تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی' کا ترجمہ 'حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولي الله في التجديد' اور حجیت حدیث کو حجية الحديث کے نام سے عربی میں منتقل کیا، علامہ سلفی کے دو اور رسالوں کو مسئلة حياة النبي في

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس ۱۹۸۷، ص ۴
(۲) مصنفین کے اپنے قلم سے، دستاویز، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳، ص ۲۰

ضوء الادلة الشرعية اور 'زيارة القبور وحكمها ' کے نام سے عربی میں منتقل کیا۔ علامہ قاضی سلیمان منصور پوری کی کتاب رحمة للعلمين ، کا عربی میں ترجمہ کیا۔ پروفیسر تقی امینی کی کئی اردو کتابوں کو 'الاسلام تشكيل جديدللحضارة'، 'بين الانسان الطبيعي و الانسان الصناعي ' ،عصر الالحاد:خلفيته التاريخيية و بداية نهاية'، اور 'النظام الالهي للرقي و الانحطاط ' کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا، مولانا مصلح الدین کے دورسالوں کوالنصرانية الحاضرة في ضوء التاريخ و البحث العلمي اور الشيوعيةو الاسلام في ميزان العقل اور پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی کے ایک رسالے 'قضايا في كتابة التاريخ الاسلامي ' کے نام سے عربی میں منتقل کیا، شاہ ولی اللہ کی فارسی تصنیف 'قرة العينين في تفضيل الشيخين 'اورنواب صدیق حسن خان کی فارسی کتاب 'الاكسير في اصول التفسير ' کوعربی قالب عطا کیا۔ اس کے علاوہ کئی ایک مضامین وخطبات کا بھی ترجمہ کیا۔ ان تمام ترجموں میں صرف انا' کا ترجمہ ہی ادبی ہے اور یہ ان کا پہلا اور آخری ادبی ترجمہ ہے، بعد میں ان کا ترجمہ سے نہ صرف شغف جاری رہا بلکہ اس میں ترقی بھی ہوئی لیکن اس وقت ترجیحات بدل گئی تھیں اور انھوں نے ادبی ترجمہ کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہ ازہری صاحب کا پہلا ترجمہ ہے (سن اشاعت کے لحاظ سے نہیں) نقش اول کے باوجود ترجمے میں جو سلاست اور روانی ہے، مفہوم کی ادائیگی پر جوقدرت ہے، اس سے مترجم کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، یہ تو میرا خیال ہے آپ بھی ترجمے کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں۔

''میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور یہ ایمان وراثت کے ساتھ ساتھ شعور وفکر طویل کا نتیجہ ہے، موروثی اس لئے ہے کہ میرے والدین سخت متدین اوردینی فرائض کے پابند تھے، عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولنے کے بعد میں نے والدکو دیکھا کہ وہ فجر سے پہلے نماز کے لئے بیدار ہو جاتے تھے، نماز کے بعد دعاء و استغفار کرتے رہتے اور آفتاب طلوع ہونے کے بعد تک مصلی ہی پر رہتے اور اپنے اورادو وظائف سے فارغ ہوئے بغیر ناشتہ نہیں کرتے تھے''۔ (۱)ص ۱۳۸

العقاد نے 'انا' میں علم، ادب اور سیاست کے میدان کی اہم اور ممتاز شخصیات پر تبصرے بھی کئے ہیں ان کے تبصرے میں گہرائی ہے، توازن ہے اور حقیقت پسندی بھی، ترجمے میں بھی یہ خوبی برقرار ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ شیخ محمد عبدہ پچھلے پانچ سوسال میں مصر اور اس کے گرد و پیش کے سب سے بڑے آدمی ہیں۔ میرے اوپر ان کا بہت گہرا اثر پڑا۔ مجھے شیخ سے محبت اور لگاؤ اسی وقت پیدا ہو گیا تھا جب میں نے شیخ جداوی کی مجلسوں میں ان کا ذکر سنا، حاسدوں اور جہلاء کی نکتہ چینیوں

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس ۱۹۸۷، ص ۱۳۸

کے باوجود اسوان میں شیخ کو عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔"(۱)۵۹۔۶۰

العقاد ایک وسیع المطالعہ ادیب تھے، انھوں نے لکھا ہے کہ نپولین کے بارے میں تیس سے زیادہ قلم کاروں کی تحریریں میں نے پڑھی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ہر مصنف کے یہاں نپولین کی شخصیت دوسرے کے یہاں سے مختلف ہے۔ وہ قسم قسم کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے اور ہر ایک قسم کی کتاب کے مطالعے کے فوائد ان کے پیش نظر رہتے تھے۔

"فلسفیانہ، علمی اور ادبی تینوں نوعیت کی کتابوں کی تاثیر کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ علمی کتابوں سے ہمیں انضباط و دقت پسندی کا علم حاصل ہوتا ہے اور ایسی معین معلومات فراہم ہوتی ہیں جن میں سب لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ادبی کتابوں سے جذبات و شعور کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور زندگی و جمال سے پردے اٹھتے ہیں اور فلسفیانہ کتابیں بصیرت و استقرائی ملکہ کو جلا دیتی ہیں اور قاری کو معلوم سے نا معلوم اور فروع سے اصول تک پہنچاتی ہیں۔'(۲)

ایک اقتباس اور دیکھیں اس میں "خدا گواہ" کی ترکیب سے جملے کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

"مجھے ہزیمت و شکست سے نفرت ہے لیکن خدا گواہ ہے کہ اپنے آگے شکست خوردہ شخص کی ذلت دیکھ کر فتح و غلبہ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مد مقابل کی ہزیمت سے اپنی ہزیمت اگر زیادہ بری نہ ہوتی تو میں اس غلبہ ہی کو ناپسند کرنے لگتا جو لامحالہ ہزیمت و سپر اندازی کا سبب بن جاتا ہے۔"(۳)

بغیر کسی تکلف کے مختلف صفحات سے ان اقتباس کو پیش کیا گیا ہے، اس میں زبان و بیان کا جو حسن، سادگی اور سلاست ہے وہ قابل تعریف ہے، عبارت میں کوئی پیچیدگی یا بوجھل پن نہیں ہے۔ انھوں نے ترجمہ کے اسلوب کو متن کے اسلوب سے قریب تر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بقول برکاتی صاحب "مولانا ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ علمی کارناموں کا بار اس سہولت اور خندہ پیشانی سے اٹھا لیتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا وہ کتنا صبر آزما اور دقت طلب کام کر رہے ہیں، یہی خصوصیت ان کی تحریروں میں جلوہ گر ہے، وہی بے تکلف، سلیس اور پر مغز اردو تحریر جو ہمارے علماء کا خاصہ رہی ہے، آپ کو انا کے ترجمے میں نظر آئے گی"۔(۴)

ازہری صاحب نے ایک جگہ ترجمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ "کسی کتاب کی تلخیص یا ترجمہ میں جو بات سب سے اہم ہوتی ہے وہ یہ کہ اصل کتاب کا بنیادی مقصد کسی طرح متاثر نہ ہو، مصنف کے نقطۂ نظر میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہو اور اس کی نظر میں جو نقاط اہم ہیں ان کی اہمیت میں کمی نہ ہو۔ (۵) انا کا متن اور ترجمہ ایک ساتھ پڑھتے وقت قارئین کو نداز ہ ہوگا کہ مترجم نے متن کی معنویت کے ساتھ جمالیاتی فضا اور لسانی سطح کو بھی محتاط طریقے سے منتقل

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس ۱۹۸۷، ص ۵۹۔۶۰
(۲) ایضاً ص ۸۱۔۸۲ (۳) ایضاً ص ۱۰۱ (۴) ایضاً ص ۴
(۵) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ) راہ حق کے تقاضے، جامعہ سلفیہ بنارس ۱۹۹۸، ص ۲۰

کرنے کی کوشش کی ہے، بعض جگہ انھوں نے ایک ہی سطر میں کئی سطور کا ترجمہ سمیٹ دیا ہے، پڑھنے والا جب اصل اور ترجمہ دونوں کی عبارت میں الفاظ کی سطح پر کمیاتی تفاوت دیکھے گا تو چونک پڑے گا لیکن جب مفہوم پر غور کرے گا تو دادِ بغیر آگے نہ بڑھے گا۔ لیکن کہیں کہیں مترجم کی مختصر نویسی بعض لوگوں پر گراں بھی گزر سکتی ہے۔

عقاد نے اپنی والدہ کی کم گوئی کا ذکر کرتے ہوئے 'انا' میں لکھا ہے۔ "ولم ار فی حیاتی امرأة أصبر علی الصمت و الاعتکاف من والدتی ۔فربما مضت ساعة و ھی تستمع من جاراتھا و صدیقاتھا وتجیبھن بالتأمین اور بالتعقیب الیسیر" (۱) ص۴۰ ذرا اس عبارت کا ترجمہ بھی پڑھیں: "میں نے اتنی خاموش اور یکسو عورت نہیں دیکھی، پڑوس کی عورتیں گھنٹوں ان سے اپنی داستان کہتیں لیکن ان کی طرف سے ہوں، ہاں کے علاوہ کچھ اور سنائی نہیں دیتا" (۲) ص۳۹ "ہوں، ہاں" کی ترکیب اس پورے واقعے کو احسن طریقے سے ادا کرتی ہے، بلکہ متن میں عبارت قدرے ثقیل ہوگئی ہے لیکن مترجم کی صلاحیت نے اس کی ثقالت کو پانی پانی کر دیا ہے، حالاں کہ ترجمے میں ایک آدھ لفظ غائب ہے لیکن مفہوم بالکل متاثر نہیں ہو رہا ہے۔

ترجمہ کرتے وقت کبھی کبھی زبان و بیان کے حسن اور شگفتگی کو کچھ زیادہ نکھارنے کے چکر میں متن کا مفہوم متاثر اور مؤلف کا نقطۂ نظر اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ مترجم نے مصنف کی بات کو سلیقے سے منتقل کرنے کی کوشش کی ہے، ہاں کہیں کہیں عبارت میں ابہام در آیا ہے اور اکا دکا عربی کے ایسے ادق الفاظ آ گئے ہیں جو اردو کے متوسط درجے کے قارئین کے لیے نا قابل فہم ہیں۔ "میرے اندر ایک صفت ہے جسے بدخواہ عناد و تشبث کہتے ہیں اور دوست اسے عزیمت و ارادہ کی سچائی کا نام دیتے ہیں۔" (۳) مذکورہ عبارت میں اگر "تشبث" کا لفظ کچھ زیادہ ہی مشکل معلوم ہوتا ہے، اردو میں اس کے لئے "ضد یا ہٹ دھرمی" کا استعمال کیا جاتا ہے جو اس عبارت میں بالکل فٹ بیٹھتا بلکہ پھبتا ہے۔

اس کتاب میں پروف ریڈنگ کی غلطیوں کی بھرمار ہے جن کا سبب کچھ بھی رہا ہو، لیکن بدنام وہی ہوتا ہے جس کا نام ہوتا ہے۔ نقش اول کے باوجود 'انا' کے ترجمے میں ایک اچھے ترجمے کی تمام خوبیاں موجود ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اگر مترجم نے اپنی مصروفیتوں میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اس پر نظر ثانی کرکے ذرا اور اہتمام سے اشاعت کے لئے دیا ہوتا تو ترجمہ مزید معیاری ہو جاتا، صرف اس ترجمے کی روشنی میں ازہری صاحب کی ترجمہ نگاری کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے گی وہ ناقص رہے گی، اس کے باوجود ہم نے اس کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ ان کی ابتدائی ترجمہ نگاری کا نمونہ سامنے آ جائے اور ترجمہ کے میدان میں ان کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملے۔



(۱) عباس محمود العقاد، انا، موسسة دار الهلال، مصر، ص۴۰

(۲) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (ترجمہ)، مصری ادیب العقاد کی آپ بیتی، جامعہ سلفیہ، بنارس، ۱۹۸۷، ص۳۹ (۳) ایضاً ص۱۹۲

مولانا ضیاء الحسن محمد سلفی
استاذ جامعہ عالیہ عربیہ۔ مئو

ایک روشن چراغ اور بجھا

۲۰۰۹ء

ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کا مرکزی سلفی علمی ادارہ جامعہ سلفیہ بنارس ہے جس نے اپنے بلند تعلیمی معیار کو برقرار رکھنے کے لئے شروع سے ہی ماہرین فن علماء کرام کو منتخب کیا تھا جن کی شبانہ روز مساعی جمیلہ سے جامعہ کو ہندو بیرون ہند میں نمایاں مقام حاصل ہوا اور سلف صالحین کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، لیکن رفتہ رفتہ علم وادب کے شمس وقمر اور درخشاں کواکب غروب ہوتے گئے اور اس خلا کی تلافی نہ ہوسکی، میرے اساتذہ میں اپنے وقت کے جن اساطین علم وفن نے اس جامعہ میں اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو جامعہ کی ہمہ جہت خدمات کے لئے وقف کردیا تھا ان میں قابل ذکر مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی مبارکپوری، مولانا عبدالوحید ابوالقاسم رحمانی شیخ الجامعہ السلفیہ بنارس، شیخ الحدیث مولانا شمس الحق سلفی، ماہر فلکیات مولانا ابوعبیدہ عبدالمعید بنارسی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب الرحیق المختوم، ماہر فن درایت وروایت مولانا رئیس احمد ندوی مولف تالیفات کثیرہ اور مولانا عابد حسن رحمانی رحمہم اللہ ہیں جن کے علمی فیوض سے بہرہ ور ہونے کا زریں موقعہ ہمیں ملا، یہ سب اپنی علمی ودینی خدمات انجام دے کر راہی عدم ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ ان سب کے چلے جانے کے بعد بھی جامعہ سلفیہ کا مضبوط ستون اپنی پوری توانائی کے ساتھ کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور دینی وتعلیمی وتصنیفی خدمات میں ہمہ تن مصروف رہا جس پر صرف جامعہ ہی کو نہیں بلکہ پورے اہل حدیثان ہند کو ناز تھا میری مراد مایۂ ناز عالم دین، نازش جماعت وجمعیت اہل حدیث، کہنہ مشق صحافی وانشاء پرداز، نامور مولف، بلیغ خطیب، مفکر ملت، استاذ الاساتذہ، مثالی منتظم، صدر جامعہ سلفیہ بنارس جناب مولانا حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ ہیں جن کا شمار اکابر علماء دین ومفکرین ملت میں ہوتا تھا، جن کی صالح قیادت میں کاروان سلف رواں دواں تھا، آپ عبقری شخصیت کے حامل تھے لیکن افسوس وہ بھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ آپ کی وفات حسرت آیات سے ایک زریں عہد کا خاتمہ ہوگیا اور جامعہ سلفیہ بلکہ جملہ سلفیان ہند کو ناقابل تلافی سے دوچار ہونا پڑا، یہ زیاں کسی خاص علاقہ وادارہ کا نہیں ہے بلکہ یہ پوری ملت اور علمی دنیا کا ایسا خلا ہے جس کی تلافی کی کوئی دور تک سبیل نظر نہیں آتی، خاص طور پر ضلع مئو کا علمی حلقہ اس طرح کی ہمہ جہت شخصیت سے خالی نظر آتا ہے جن کو مرجع خلائق کی حیثیت حاصل تھی۔

مجھے بھی آپ سے دوران تعلیم اور اس کے بعد بھی برابر علمی فیض یابی کا موقعہ ملتا رہا اور جماعت وجمعیت کے

مسائل پر مشورہ طلب کرنے پر بڑی راسخ و مستحکم رائے دے کر رہنمائی کرتے تھے اور ادنیٰ علمی کام پر بھی پوری فراخدلی اور وسیع ظرفی کے ساتھ تشجیع فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی جملہ دینی و علمی ودعوتی اور تصنیفی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے۔ آپ کے علمی فیوض سے بہرہ ور ہونے کے ناطے میرے اوپر فرض بھی ہے اور قرض بھی کہ آپ کی حیات طیبہ کے درخشاں پہلو پر خامہ فرسائی کروں، ذیل میں آپ کی زندگی کے تابندہ نقوش ہدیۂ قارئین ہیں۔

نام ونسب

آپ کا نام حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری ہے اسی نام سے مشہور تھے سلسلۂ نسب یہ ہے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بن حاجی محمد یاسین بن محمد سعید۔

ڈاکٹر بننے سے پہلے آپ اپنے کو اعظمی لکھا کرتے تھے، آپ کے والد محترم جناب حاجی محمد یٰسین رحمہ اللہ عالم نہ تھے مگر علم دوست اور علماء نواز تھے۔ کتاب وسنت کے متبع اور مسلک سلف پر سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ وہ جفاکش تھے اور اولاد کو دینی تعلیم دلانے کا شوق جنون کی حد تک رکھتے تھے البتہ آپ کی والدہ محترمہ کا تعلق ایک علمی خانوادہ سے تھا آپ کے نانا مولانا محمد نعمان بن حاجی محمد سعید اعظمی (م ۱۲۹۷ھ-۱۳۷۱ھ) علامہ سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ سکے تلامذہ میں سے تھے انھوں نے پوری زندگی عمر آباد کے مشہور ادارہ جامعہ دارالسلام میں تدریس وتعلیم میں گذاردی، اور یہ علمی جذبہ وشوق آپ کی والدہ کی جانب سے ڈاکٹر موصوف کو بچپن سے ہی ملا۔

مولد ومنشأ

ڈاکٹر صاحب کی ولادت شہر مئو کے مردم خیز محلہ ڈومن پورہ حبہ میں ۸/اگست ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۵۸ھ کو خالص دینی وعلمی فضا میں ہوئی اور ایک دینی آغوش میں پرورش وپرداخت پائی اور سلفی ماحول اور مجمع فحول علماء میں پروان پائے، بچپن سے ہی آپ کی والدہ کی تعلیم وتربیت کا آپ پر گہرا اثر رہا۔

تعلیمی مراحل

علامہ ازہری رحمہ اللہ نے اپنی ابتدائی تعلیم مشرقی یوپی کے قدیم ترین سلفی ادارہ جامعہ عالیہ عربیہ مئو سے حاصل کی قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے بعد حفظ قرآن یہیں شروع کیا تھا لیکن اس کی تکمیل مدرسہ دار العلوم کی شاخ مرزاہادی پورہ میں کیا اور ۱۹۵۳ء میں وہاں سے حفظ قرآن کی سند لی پھر فارسی کا مقررہ نصاب اور عربی کے چار درجات کی تعلیم جامعہ عالیہ عربیہ میں حاصل کی اور ۱۹۵۷ء میں جامعہ عالیہ سے مولوی کی سند حاصل کی۔ آپ اس قدیم دینی دانشگاہ سے اپنی قلبی وعلمی نسبت کے اظہار کے لئے ہمیشہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے اور جامعہ عالیہ کے مادر علمی ہونے پر بجاطور پر فخر کرتے تھے۔

بلاد بها نيطت علىّ تمائمي
وأول أرض مسّ جلدي ترابها

پھر مئو کی مشہور درسگاہ جامعہ اسلامیہ فیض عام میں داخل ہوکر ۱۹۵۸ء، ۱۹۵۹ء دو سال تک عربی زبان وادب اور علوم شرعیہ میں تحصیل کمال کیا اور ۱۹۶۱ء میں جامعہ اثریہ

دارالحدیث مئو سے فراغت حاصل کی اور سند فضیلت سے نوازے گئے، اپنے تعلیمی مراحل کے درمیانی عرصہ میں عربی وفارسی بورڈ سے ۱۹۵۹ء میں مولوی، ۱۹۶۰ء میں عالم اور ۱۹۶۲ء میں فاضل کے امتحانات دیئے اور ان میں اچھی پوزیشن سے کامیابی حاصل کی۔

آپ بچپن سے ذہین وفطین تھے اور ابتداء ہی سے آپ کو منزل مقصود پانے کی فکر دامن گیر تھی اور طائر شوق پر پرواز تول رہا تھا، فراغت لے بعد دو سال ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۲ء تک جامعہ اسلامیہ فیض عام مئو میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا لیکن مزید علم ومعرفت کی طلب نے آپ کو بیٹھنے نہ دیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک زریں موقعہ عنایت فرمایا چنانچہ آپ ماہ اپریل ۱۹۶۳ء میں جامعہ ازہر کے تعلیمی وظیفہ پر قاہرہ روانہ ہوگئے۔ قاہرہ جانے والے آپ کے ہمعصروں میں ڈاکٹر عبدالعلی ازہری، مولانا مظہر احسن ازہری (ناظم اعلیٰ جامعہ عالیہ عربیہ) اور ڈاکٹر سعید عابدی تھے اور یہ سب اپنے وقت کے انتہائی ذہین طلبہ میں شمار ہوتے تھے اور ان کے اساتذہ کی آرزو تھی کہ یہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے ملک وملت کا نام روشن کریں۔ آپ نے جامعہ ازہر قاہرہ میں کلیۃ اصول الدین میں داخلہ لے کر M.A کی ڈگری حاصل کی، اس دوران آپ نے ریڈیو قاہرہ کے شعبۂ اردو میں بحیثیت مترجم واناؤنسر بھی کام کیا، پھر جامعہ ازہر میں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا لیکن حالات نے اس کی تکمیل کا موقعہ نہ دیا اور ۱۹۶۷ء میں آپ اپنے وطن واپس آگئے اور جامعہ سلفیہ میں سلسلۂ تدریس شروع کردیا۔ اس اثناء میں آپ کے دل میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا جذبہ موجزن تھا چنانچہ ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی اور اس کے تین سال کے بعد ۱۹۷۵ء میں اسی یونیورسٹی سے ادب عربی میں تحقیقی مقالہ پیش کرکے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرکے ڈاکٹر بن گئے۔ آپ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ابن عبدالبر اندلسی کی تالیف بھجة المجالس جزء ثانی کی تخریج وتحقیق پر مشتمل تھا اور یہ مقالہ ۷۰۰ صفحات کا تھا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ہی ڈاکٹر صاحب نے انگریزی میں ۱۹۷۱ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۷۳ء میں انٹر کی سند حاصل کی۔ اس طرح ازہری رحمہ اللہ نے مشرق کے علمی سرچشموں سے بھرپور سیرابی حاصل کی۔ مئو کے مدارس کے علاوہ جامعہ ازہر قاہرہ اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ آپ کی تعلیمی جولانگاہ تھی، تعلیمی اداروں کے معیاری تنوع، فکری توازن اور انداز میں تواضع کا یہ کمال تھا کہ آپ ہر طبقہ میں محبوب تھے، اس طرح آپ کو مدارس سے تقویٰ وطہارت، جامعہ ازہر قاہرہ سے وسعت ذہنی وبلندی فکر اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے سرسید کے سوز دروں اور ملت کے لئے دردمندی کی دولت ملی۔

اس انداز پر آپ کا تعلیمی سفر اختتام کو پہونچا اور دینی وعصری علوم وفنون سے آراستہ ہوکر آپ نے میدان عمل میں قدم رکھا۔

مشاہیر اساتذہ

اپنے تعلیمی مراحل میں ڈاکٹر صاحب نے جن نابغۂ روزگار علماء ومشائخ سے کسب فیض کیا ان میں سے

قابل ذکر مشاہیر اساتذہ یہ ہیں۔ مولانا عبدالعلی صاحب صدر مدرس جامعہ عالیہ عربیہ (م۱۹۶۶ء)، مولانا ابوالقاسم محمد علی قدسی (م۱۹۵۴ء)، مفتی مولانا عبدالعزیز عمری (م۲۰۰۵ء)، ماہر فلکیات مولانا ابوعبیدہ عبدالمعید بنارسی (م۱۹۸۰ء)، مولانا عبدالرحمٰن نحوی (م۱۹۶۴ء)، مولانا محمد احمد ناظم جامعہ فیض عام مئو (م۱۹۸۲ء)، مولانا عظیم اللہ مئوی (م۱۹۹۴ء)، مولانا عبداللہ شائق (م۱۳۹۴ھ)، مفتی مولانا حبیب الرحمٰن فیضی (م۱۹۹۶ء)، حکیم مولانا محمد سلیمان رحمانی، مولانا شمس الحق سلفی شیخ الحدیث جامعہ سلفیہ بنارس، مولانا محمد سلیمان منطقی بہاری، مولانا عبدالرحمٰن بن عبیداللہ رحمانی مبارکپوری، مولانا محمد اعظمی سابق شیخ الجامعہ جامعہ عالیہ عربیہ مئو وغیرہم، اور جامعہ ازہر قاہرہ کے مشہور اساتذہ یہ ہیں: شیخ محمد غزالی، مشہور خطیب و ماہر ادیان و ملل شیخ فتح اللہ بدران، استاذ علوم کتاب وسنت شیخ احمدین، ماہر فلسفہ وادیان ڈاکٹر محمد غلاب، ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی، ڈاکٹر شوقی ضیف، ڈاکٹر غنیمی ہلال، ڈاکٹر رزق وغیرہم۔

تدریسی خدمات

جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو سے ۱۹۶۱ء میں فراغت کے بعد آپ کے سلسلۂ تدریس کا آغاز ہوا۔ دو سال جامعہ اسلامیہ فیض عام میں تدریسی فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد مزید حصول علم کے لئے جامعہ ازہر قاہرہ تشریف لے گئے۔ ۱۹۶۷ء میں جب آپ قاہرہ سے اپنے وطن مالوف واپس ہوئے تو ہندوستان میں مرکزی تعلیمی ادارہ جامعہ سلفیہ بنارس وجود میں آچکا تھا اور وہاں ۱۹۶۶ء سے باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہو چکا تھا گویا کہ آپ کی تعلیمی وتدریسی جولانگاہ پہلے سے ہی قدرت نے تیار کر رکھا تھا، اس مرکزی ادارہ کے مردم شناس ناظم اعلیٰ جناب حضرت مولانا عبدالوحید عبدالحق سلفی رحمہ اللہ کی عقابی نگاہ ازہری صاحب پر پڑی، آپ کی نبوغ وفراست اور عربی ادب میں آپ کی اعلیٰ صلاحیت کو پرکھ لیا اور اس گوہر نایاب کو جامعہ سلفیہ میں تعلیم وتدریس کے لئے منتخب کرلیا اور جامعہ کے جملہ داخلی وخارجی امور ان کے سپرد کردیا تاکہ وہ اپنی دوراندیشی، معاملہ فہمی، حسن تدبر وتدبیر کے ذریعہ جامعہ کو ترقی کی بلند منزل اور بام عروج پر پہونچا دیں۔ چنانچہ ازہری صاحب نے جامعہ سلفیہ بنارس میں بروز سنیچر ۱۱رشوال ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۲رجنوری ۱۹۶۸ء سے تدریسی خدمات انجام دینی شروع کیں اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری مرحلہ تک مسلسل جاری رہا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں بھی آپ نے ایک سال عارضی طور پر ادب عربی کی تدریس کا فریضہ انجام دیا۔

ازہری صاحب نے چار دہائی سے زیادہ مدت تک ادب، انشاء، تفسیر اور تاریخ کا درس رہا، آپ نے جامعہ سلفیہ میں درجات عالیہ کی اہم ترین کتابوں کا درس دیا جن میں تاريخ الادب العربی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی شاہکار تصنیف حجة الله البالغه، علامہ ابن رشد کی کتاب بداية المجتهد وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر موصوف رحمہ اللہ ہمیشہ طلبہ کی فکری سطح بلند کرنے کے ساتھ ہی ان کی تربیت پر بہت زور دیا کرتے تھے، ان کے اندر صلاحیت کے ساتھ صالحیت بھی پیدا کرنا

چاہتے تھے، جامعہ میں تعلیمی سال کا پہلا اور آخری جمعہ کا خطبہ خود ہی دیا کرتے تھے جس میں اس بات پر زور دیتے تھے کہ جامعہ، اس کی فکر اور اس کے مقاصد کیا ہیں، جس سلفی جماعت کا یہ علمی ادارہ ہے ملک میں اس کی تاریخ کیا ہے اور طلبہ سے جامعہ کے تقاضے اور ذمہ داران جامعہ کی توقعات کیا ہیں۔ طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے کہ آپ جامعہ کے نمائندے ہیں عوام آپ کے کردار واخلاق کی روشنی میں جامعہ کی کارکردگی کو دیکھیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے کسی غیر متوازن عمل سے آپ کی شخصیت داغدار اور جامعہ کی کارکردگی متاثر ہو۔ درسگاہ اور مسجد ہر جگہ پر اپنی نظر رکھتے آداب مسجد اور نماز سے متعلق ادنیٰ کوتاہی برداشت نہیں کرتے تھے۔ طلبہ کی علمی ترقی کے لئے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے اور بدلتے حالات کے باعث مدارس اور طلبہ کے سامنے پیش آمدہ چیلنجوں سے بخوبی واقف تھے، اسی روشنی میں طلبہ کو رہنماہدایت کرتے تھے اور ان چیلنجوں سے نبردآزما ہونے کے اسلامی طریقے بتلاتے تھے۔

تقریباً چالیس سالہ زمانۂ تدریس میں آپ کے سامنے ہزاروں طلبہ نے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ہر ایک نے اپنے اپنے ظرف وصلاحیت کے مطابق کسب فیض کیا، آپ کے ان تلامذہ میں سے بعض نے آپ سے درسیات کے علاوہ ترجمہ وتالیف، عربی صحافت، مضمون نگاری کی تربیت حاصل کرکے ایک باکمال انشاء پرداز، نامور محقق، کامیاب مترجم کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کیا۔

ڈاکٹر موصوف کے ہم عصر مشہور ادیب جناب ابن احمد نقوی حفظہ اللہ نے ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کے بارے میں اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے جامعہ سلفیہ کو اپنی علمی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنایا اور اس طرح جامعہ سے وابستہ ہوئے کہ یہ رشتہ عمر کے ساتھ ہی منقطع ہوا، وہ اور جامعہ سلفیہ ایک طرح سے لازم وملزوم بن گئے تھے۔ وہ جامعہ کے استاذ، ریکٹر بھی تھے اور اس کی علمی سرگرمیوں کے سرپرست بھی۔ بیرونی دنیا میں اس کے وکیل بھی غرضکہ جامعہ کے ہر شعبہ میں ان کا عمل دخل تھا۔ جامعہ ان کی شناخت تھی اور وہ جامعہ کے روح رواں۔ انھوں نے اس عظیم علمی درسگاہ کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا اور بحران کا مقابلہ کیا اور ہر دور اور ہر حال میں ثابت قدم رہے اور جامعہ کے مفاد کو بہرحال مقدم رکھا، جامعہ سلفیہ کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نہ شروع ہوسکتی ہے اور نہ اس کے بغیر ختم ہوسکتی ہے۔ جامعہ کے در وبام پر ان کی ذات وصفات اور خدمات کے لازوال نقوش مرتسم ہیں۔

حلیہ مبارکہ

متوسط قد، مناسب بدن، گندمی رنگ، نگاہیں تیز، روشن بارعب چہرہ، طبیعت میں پاکیزگی ونفاست، گفتگو میں نرمی ومتانت، لب ولہجہ محبت آمیز، چلنے میں نگاہیں نیچی، پُروقار کشادہ پیشانی، کبھی کبھی زیرلب تبسم، گھنی داڑھی، ظرف ونظر میں وسعت، کبھی سر پر گول ٹوپی، کبھی بنارسی اور کبھی مخملی ٹوپی، یوپی کا مشرقی لباس کرتا وپائجامہ اور شیروانی زیب تن، علمی رکھ رکھاؤ۔ یہ تھا آپ کا حلیہ مبارکہ جس کا تعلق قریبی مشاہدہ سے ہے۔

اخلاق وکردار

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ گفتار کے ساتھ

کردار کے غازی تھے، ایک باحمیت اور غیرت مند سلفی عالم تھے۔ مزاج میں مسلکی تشدد نہ تھا، لیکن مسلک سلف کے دفاع میں ہر وقت سرگرم عمل رہا کرتے تھے، زبان وقلم کے ذریعہ شرک وبدعات کی بیخ کنی اور کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت میں کوشاں تھے، ہر علمی مجلس میں قائدانہ کردار ادا کرتے تھے قیادت کا جوہر آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھا، آپ ایک وسیع القلب انسان تھے۔ خصوصاً اپنے تلامذہ کی حوصلہ افزائی میں بڑے فراخدل واقع تھے، اپنے تلامذہ کی کتابوں پر تقدیم وتقریظ تحریر فرماتے اور وسیع ظرفی کے ساتھ ان کے علمی محاسن کا اعتراف کرتے، لطیف انداز میں اصلاح کا مشورہ دیتے اور تصنیف وتالیف اور ترجمہ وغیرہ جیسے علمی کاموں پر حوصلہ افزائی کے ساتھ اس کی ترغیب دیتے تھے۔

بقول علامہ ابن احمد نقوی حفظہ اللہ ازہری صاحب شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسری کے بعد پہلے سلفی عالم تھے جو اس آب وتاب کے ساتھ مطلع علمی پر طلوع ہوئے اور ایک شہاب ثاقب کی طرح اپنے پیچھے شعاعِ نور چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب علم وفضل کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود نہایت منکسر المزاج، تکلفات وظاہری شان وشوکت سے بے نیاز تھے، مجاملت ومداہنت سے بہت دور رہتے تھے اور اپنے قیمتی اوقات کی پوری قدر کرتے ہوئے ملت وجماعت کے لئے صحیح طور پر استعمال کرتے تھے۔

تقویٰ، پرہیزگاری، تہجد گزاری، تواضع، کتاب وسنت کی سختی کے ساتھ پابندی، ملت وجماعت کے لئے فدائیت کا جذبۂ صادق، حق گوئی اور دین وملت کے لئے جرأت مندانہ اقدام آپ کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔

صحافتی خدمات

جناب ازہری رحمہ اللہ کو انشاء پردازی وصحافت خاص طور پر عربی صحافت سے بڑا لگاؤ تھا۔ جامعہ ازہر قاہرہ میں تعلیم اور وہاں کی علمی وادبی فضا کا آپ پر گہرا اثر رہا، آپ نے عربی زبان وادب میں تبحر وکمال حاصل کیا اور عربی زبان میں مضمون نگاری میں مہارت حاصل کی، آپ زبان وقلم کے شہ سوار تھے۔ جامعہ سلفیہ بنارس میں ماہ شعبان ۱۳۸۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۹ء میں عربی مجلہ ''صوت الجامعہ'' کا اجراء ہوا تو اسی وقت سے آپ اس کے ایڈیٹر منتخب ہوئے اور پوری زندگی عربی وادبی صحافت میں پرورش لوح وقلم کرتے رہے، اردو زبان میں صحافت کا معاملہ ہو یا عربی زبان کا آپ نے دونوں زبانوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کو بھرپور فائدہ پہونچایا اور تقریباً ۴۰ سال تک اردو وعربی صحافت کے میدان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے رہے، ادب کے شہ پارے بکھیرتے رہے اور فکر ونظر اور علم وفن کا دریا موجزن کرتے رہے۔ اگر ملت اسلامیہ پر کوئی افتاد آتی یا ملت کسی بحران سے دوچار ہوتی تو قلم وقرطاس کے ذریعہ ملت کی صحیح ومثبت رہنمائی کرتے اور ملت کے زخموں پر مرہم رکھتے۔

صوت الامۃ عربی کے اداریوں نے عالم عرب کو ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، دینی، تعلیمی اور ثقافتی مسائل سے روشناس کرایا۔ بابری مسجد کے انہدام کے مسئلہ پر ان کے برمحل اداریوں نے اہل عرب کو مسئلہ کی حقیقت

سے واقف کرایا، دین، دعوت، توحید اور تعلیم کے علاوہ عالم عرب، برصغیر، ایشیا وسطی کے سیاسی مسائل پر آپ کے فکر انگیز تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ہی آپ نام نہاد شہرت پسند صحافیوں کی خبر بھی لیتے تھے اور ان تک دعوت حق کا پیغام پہونچاتے۔ لیکن نازک موقعہ پر بھی کبھی وقار و متانت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے ایک با مقصد صحافت کو طرۂ امتیاز بخشا، زرد صحافت کو ہمیشہ ہدف تنقید بنایا اور عالمی صحافت کی کج روی اور متعصبانہ روش پر سخت نکیر کرتے تھے اور اس کو صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔ آپ کے مقالات و مضامین میں تنوع و گہرائی ہوتی تھی، ٹھوس علمی مواد، ادبی حلاوت، انشاء پردازی کے جوہر دیکھنے میں آتے تھے، آپ کی تحریر میں حق گوئی، جرأت رندانہ، جذبہ ایمان اور اعتدال و توازن کی جلوہ گری نظر آتی تھی آپ کا ہر تجزیہ بصیرت افروز، ہر تحریر وقار و متانت کا شاہکار اور ادب و انشاء پردازی کا نمونہ تھی۔ چونکہ آپ کی نظر میں وسعت، فکر میں بلندی اور مطالعہ میں گہرائی و گیرائی ہوتی تھی اسی وجہ سے آپ جب کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے تو اس کے ہر پہلو پر نظر رکھتے اور بحث کے ہر گوشہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ایک عظیم مفکر و دانشور اور بالغ نظر صحافی تھے آپ کی صحافت ۴۰ سالہ طویل عرصہ پر محیط ہے، زندگی بھر کثرت سے مقالات و مضامین لکھتے رہے۔ چنانچہ جامعہ سلفیہ کا ماہنامہ عربی مجلہ صوت الامۃ اردو ماہنامہ محدث جریدہ ترجمان دہلی، نور توحید نیپال، افکار عالیہ جامعہ عالیہ مئو، آواز ملک بنارس اور راشٹریہ سہارا اردو لکھنؤ وغیرہ جیسے ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں آپ کے مضامین و گرانقدر مقالات شائع ہوتے تھے۔ آپ کے مقالات و مضامین کی تعداد ۸۰۰ سے متجاوز ہے۔ علاوہ ازیں کتابوں پر تقدیم و تقریظ کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ عربی زبان و ادب میں آپ کی مہارت قابل رشک تھی۔ اسی وجہ سے عرب دنیا کے علاوہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اسلامیات اور عربی زبان و ادب کے شعبے میں کافی مقبول تھے۔

دعوتی وملی خدمات

ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کا جماعت و جمعیت سے ہمیشہ گہرا ربط رہا، آپ کی تحریریں اور تقریریں جماعت اہلحدیث کی علمی تاریخ، ایثار و قربانی، اور جہد و جہاد کے ایمان افروز واقعات سے پر نظر آتی ہیں۔ آپ نہایت مثالی داعی اور اسلام کے سرگرم مبلغ تھے، ہندوستان میں اسلامی خدمت کی انجام دہی کے ساتھ کئی مرتبہ بیرون ملک بھی اپنے ملک کے نمائندے بن کر مختلف اسلامی کانفرنسوں میں شرکت کی۔ آپ ہمیشہ دعوتی و ملی خدمات میں پیش پیش رہے ملک میں منعقد مختلف کانفرنسوں، سیمینار، سمپوزیم اور دعوتی و تعلیمی اجلاس میں مدعو کئے جاتے، ان علمی مجالس میں پہونچ کر آپ اپنے بیش بہا مقالات پیش کر کے ملت کو صحیح راہ فکر و عمل دکھانے کی کوشش کرتے، اسی طرح مختلف عصری جامعات اور یونیورسٹیوں میں آپ کو لکچر دینے کے لئے بلایا جاتا، آپ نے جماعت اہل حدیث کی تنظیم مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے رکن مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ کی

حیثیت سے ایک عرصہ تک عظیم الشان ملی خدمات انجام دی ہیں اور اس مرکزی جمعیۃ کی تین آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر ہونے کا امتیازی شرف آپ کو حاصل رہا۔ ان کانفرنسوں میں آپ کے خطبہائے استقبالیہ انتہائی قابل قدر معلومات پر مشتمل ہیں جن سے تحریک اہلحدیث، اس کے صحیح خدوخال کو سمجھنے، اس تحریک کے مدوجزر، اس کے اغراض ومقاصد، اس کے کارہائے نمایاں کی تفصیل جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔

تصنیفی خدمات

ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کا شمار جماعت اہل حدیث کے ان نامور علماء مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے بیش قیمت کتابیں عربی واردو دونوں زبان میں تصنیف کی ہیں۔ آپ نے تصنیف وتالیف میں جوادبی معیار قائم کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ آپ نے اردو وعربی زبان میں تصنیف کے ساتھ ہی بعض عربی کتابوں پر تحقیق وتعلیق اور تہذیب کا کام انجام دیا ہے۔ اردو کتابوں کو عربی قالب میں اور عربی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرنے کی خدمت انجام دی ہے۔ آپ کے علمی کارناموں کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

الف: تحقیق وتعلیق

۱۔ بهجة المجالس تالیف حافظ ابن عبدالبر اندلسی جزء ثانی، اس پر تحقیق وتخریج کا کام آپ نے انجام دیا۔ یہی آپ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے۔

۲۔ حصول المأمول من علم الأصول تالیف نواب صدیق حسن خان قنوجی تعلیق وتقدیم وتلخیص۔

۳۔ فتح المنان بتسهيل كتاب الإتقان۔ اس میں مناہل العرفان وغیرہ سے بعض مفید مباحث کا اضافہ اور ضمیمہ میں کتب تفسیر کا تعارف شامل ہے۔

۴۔ رحمۃ للعالمین اردو تالیف علامہ محمد سید سلیمان منصور پوری۔ تعلیق وتحشیہ۔

ب: تعریب

۱۔ حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولي الله في التجديد یہ کتاب مولانا محمد اسماعیل گجرانوالہ کی کتاب تحریک آزادیٔ فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی کا عربی ترجمہ ہے۔

۲۔ مسئلة حياة النبي ﷺ في ضوء الأدلة الشرعية یہ بھی مولانا محمد اسماعیل گجرانوالہ کی کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔

۳۔ زيارة القبور وحكمها تالیف مولانا محمد اسماعیل گجرانوالہ۔

۴۔ حجية الحديث النبوي یہ بھی مولانا محمد اسماعیل سلفی کی تصنیف کا عربی ترجمہ ہے۔

۵۔ رحمة للعالمين تالیف علامہ محمد سلیمان سلمان منصور پوری

۶۔ الاكسير في اصول التفسير یہ کتاب نواب صدیق حسن خان قنوجی کی فارسی تصنیف کا عربی ترجمہ ہے۔

۷۔ قرة العينين في تفضيل الشيخين یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی فارسی تصنیف ہے۔

۸۔ قضايا كتابة التاريخ الاسلامي وحلولها۔ تالیف ڈاکٹر پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی

۹۔ الاسلام تشكيل جديد للحضارة تالیف مولانا محمد تقی امینی رحمہ اللہ

۱۰۔ بين الانسان الطبيعي والانسان الصناعي تالیف مولانا محمد تقی امینی رحمہ اللہ

۱۱۔ عصر الالحاد خلقيته التاريخية وبداية نهايته تالیف مولانا محمد تقی امینی رحمہ اللہ

۱۲۔ النظام الالهى للرقى والانحطاط تالیف مولانا محمد تقی امینی رحمہ اللہ

۱۳۔ النصرانية الحاضرة فى ضوء التاريخ والبحث العلمى تالیف ڈاکٹر مصلح الدین اعظمی

۱۴۔ الشيوعية والإسلام فى ميزان العقل تالیف ڈاکٹر مصلح الدین اعظمی رحمہ اللہ

۱۵۔ تاريخ المجاهدين یہ کتاب مولانا غلام رسول مہر کی کتاب سرگزشت مجاہدین کا عربی ترجمہ ہے۔

ج: اردو ترجمہ

۱۔ راہ حق کے تقاضے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی کتاب اقتضاء الصراط المستقیم کی تلخیص ڈاکٹر عبدالرحمٰن پریوائی نے کی ہے اسی تلخیص کا یہ سلیس ترجمہ ہے۔

۲۔ مختصر زاد المعاد فى هدى خير العباد تالیف شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی

۳۔ اصلاح المساجد من البدع والعوائد

شام کے مشہور سلفی عالم علامہ شیخ محمد جمال الدین قاسمی کی معرکۃ الآراء تصنیف کا ترجمہ ہے۔

۴۔ آپ بیتی

عباس محمود عقاد کی خودنوشت سوانح عمری ''أنا'' کا ترجمہ

۵۔ عظمت رفتہ

ڈاکٹر عبدالحلیم عویس مصری کی کتاب سقوط ثلاثين دولة کا ترجمہ ہے۔

۶۔ رسالت کے سائے میں

یہ کتاب بھی ڈاکٹر عبدالحلیم عویس مصری کی فی ظلال الرسول ﷺ کا ترجمہ ہے۔

۷۔ خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز اور ان کے ولی عہد کے حقیقت افروز بیانات

۸۔ اعضاء کی پیوندکاری اسلامی شریعت میں:

تالیف جماعۃ من العلماء

۹۔ امیت کا شرعی ولغوی مفہوم

یہ کتاب شیخ ابوعبدالرحمٰن عقیل الظاہری کی کتاب اللغة العربية بين القاعدة والمثال کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ ہے یہ مجلّہ افکار عالیہ میں چار قسطوں میں شائع ہوا ہے۔

د۔ اردو میں تالیف

۱۔ تاریخ ادب عربی

یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس میں عربی ادب کے مشاہیر ادبی ارتقاء اور فنی وتہذیبی کارناموں پر سیر حاصل بحث ہے۔

۲۔ خاتون اسلام

اس کتاب میں اسلام اور دیگر ادیان ومذاہب میں عورتوں کے مقام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ان کے دینی وسیاسی حقوق

وفرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ مسلمان اور اسلامی ثقافت

۴۔ دور حاضر میں مسلم نوجوانوں کی ذمہ داری

۵۔ عصر حاضر میں مسلمانوں کو سائنس وٹیکنالوجی کی ضرورت

۶۔ تحریک اہل حدیث مفہوم اور تقاضے (۱)

۷۔ روزہ اور عید الفطر تربیتی نقطۂ نظر سے

۸۔ قرآن مجید میں تدبر ایک دینی فریضہ

۹۔ معاصر تحریروں اور تاریخ کی روشنی میں بابری مسجد کا سانحہ

۱۰۔ ہم کیا پڑھیں؟

۱۱۔ شاہ عبدالعزیز آل سعود اور حکومت توحید

۱۲۔ اسلامی تعلیمات سے متعلق انصاف پسند غیر مسلموں کے تاثرات

۱۳۔ اسلام اور انسانی سماج (ہندی)

۵۔عربی میں تالیف

۱۔ نظرة الى مواقف المسلمين من احداث الخليج

۲۔ منصور الفقيه حياته وشعره

۳۔ مشكلة المسجد البابرى فى ضوء التاريخ والكتابات المعاصرة

٤۔ حقيقة الأدب ووظيفته

٥۔ قراءة فى كتاب الحالة الخلقية للعالم الإسلامى من تاليف الأستاذ أسرار عالم

٦۔ القاديانية

مناصب

ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ بہت سی علمی مجلسوں اور متعدد ادبی وثقافتی اہم اداروں کے رکن رکین رہے۔

۱۔ مسلم یونیورسیٹی علی گڈھ کی مجلس منتظمہ ومشاورتی کمیٹی

۲۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ ہند

۳۔ رابطہ ادب اسلامی ہند

۴۔ دینی تعلیمی کونسل

۵۔ جمعية المثقفين للتوعية الاسلامية

۶۔ تعلیمی بورڈ جامعہ محمدیہ مالیگاؤں

۷۔ رابطہ عالم اسلامی میں مساجد کے لئے اسلامی عالمی کمیٹی

۸۔ ادارہ اصلاح المساجد ممبئی

۹۔ مجلس شوریٰ ومجلس عاملہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند

۱۰۔ ادارۃ البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ بنارس کے ڈائریکٹر

۱۱۔ جامعہ سلفیہ بنارس کے وکیل الجامعہ

۱۲۔ مجلہ صوت الامۃ عربی کے چیف ایڈیٹر

۱۴۔ جامعہ سلفیہ بنارس کی مجلس منتظمہ کے صدر

۱۵۔ سہ ماہی مجلہ افکار عالیہ مئو کی مجلس مشاورت

اعزاز

ڈاکٹر موصوف کو عربی زبان وادب پر کامل عبور تھا اس پر آپ کی تصانیف شاہد ہیں چنانچہ تاریخ ادب عربی ۵ جلدوں کو عربی زبان وادب پر ایک شاہکار تصنیف قرار دیا گیا اور ۱۹۹۲ء میں آپ کی عربی ادب میں گرانقدر خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ہاتھوں عطا کیا گیا۔ اسی طرح

(۱) یہ دراصل مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک کنونشن میں پیش کردہ مقالہ ہے جسے کتابی صورت دے دی گئی ہے۔

۲۰۰۲ء میں دین اسلام اور اسلامی علوم کی خدمات کے صلہ میں فریوائی ایوارڈ ڈاکٹر عبدالرحمٰن پریوائی کے ہاتھوں ملا۔

مرض ووفات

حسب معمول رمضان ۲۰۰۹ء مطابق ۱۴۳۰ھ کی تعطیل میں آپ اپنے وطن مئو تشریف لائے، اس وقت آپ کے داہنے انگوٹھے میں تکلیف تھی جس کا علاج جاری تھا، پھر شکم میں درد ہوا لیکن اس کے باوجود اپنی قلمی سرگرمیوں میں مصروف تھے، یہاں تک کہ عیدالفطر کی نماز آپ نے عیدگاہ ڈومن پورہ پچھم میں پڑھائی اور عید کے بعد دو خطبۂ جمعہ بھی دیا پھر ۷ار شوال ۱۴۳۰ھ مطابق ۷ار اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز بدھ نئے تعلیمی سال میں اپنے علمی کام انجام دینے کے لئے جامعہ سلفیہ بنارس پہونچے۔ اسی دوران جسم کے بائیں جانب اوپر کے حصہ میں تکلیف محسوس کی ڈاکٹر نے جانچ کے بعد دوا تجویز کی پھر چند روز کے بعد مولانا عبداللہ سعود سلفی ناظم جامعہ سلفیہ بنارس نے دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا جس نے کچھ جانچ کرانے کا مشورہ دیا لیکن تکلیف بڑھتی گئی یہاں تک کہ چلنے پھرنے اور سونے میں دشواری ہونے لگی مولانا عبداللہ سعود اور مولانا شاہد جنید کے باہمی مشورہ کے بعد طے پایا کہ علاج کے لئے آپ کو دہلی لے جایا جائے، چنانچہ ۱۸ار اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز اتوار بذریعہ جہاز بغرض علاج دہلی روانہ ہوئے اور دہلی کے بترا اسپتال میں داخل کیا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے علاج میں اپنی پوری کوشش کی، مختلف قسم کی جانچ ہوتی رہی۔ اور یہ سلسلہ پانچ روز تک جاری رہا بالآخر ۲۹ر اکتوبر ۲۰۰۹ء کی صبح میں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا اور آپ کو گھر لے جانے کا مشورہ دیا، راستے میں ۲ر بجے رات میں تنگی تنفس محسوس ہوئی آکسیجن لگانے پر قدرے راحت ملی یہاں تک کہ ۵ بجے صبح کے بعد آپ نے اٹھ کر بیٹھنے کے لئے کہا آپ کو بٹھایا گیا اور قے ہوئی اور اس کے ساتھ ہی آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ جانکاہ حادثہ صبح سوا پانچ بجے کانپور پہونچنے پر پیش آیا اس طرح ۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز جمعہ سوا پانچ بجے علم وادب کا شہاب ثاقب غروب ہوگیا اور یہ خبر چند منٹ میں پوری دنیا میں پہونچ گئی اور علمی وادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔

مغرب سے آدھا گھنٹہ پہلے آپ کی نعش گھر لائی گئی اطراف واکناف سے جنازہ میں شرکت کرنے والوں کا عظیم اجتماع تھا آپ کی وفات پر ہر دل رنجیدہ اور ہر آنکھ اشک بار تھی نماز مغرب کے بعد آپ کی نماز جنازہ ڈومن پورہ پچھم کی وسیع عیدگاہ میں مولانا شاہد جنید بناری صاحب حفظہ اللہ نے پڑھائی اور آپ کی تدفین آبائی قبرستان مدن پورہ میں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ استاذ گرامی ڈاکٹر مقتدیٰ حسن رحمہ اللہ کو جوار رحمت میں جگہ دے، آپ کی جملہ دینی ودعوتی وملی اور علمی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور انھیں ان کا بہترین اجر وثواب عطا فرمائے اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اللھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه خطایای وأسكنه فسيح جنته وبوأه منازل الابرار مع النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا



مولانا نیاز احمد عبدالحمید طیب پوری
جامعہ محمدیہ منصورہ، مالیگاؤں

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

ایک عظیم مفکر اور صحافی

ڈومن پورہ میں ۱۹۳۹ء میں پیدا ہونے والے مشہور مفکر، صحافی، صاحب طرز انشاء پرداز، ماہر مترجم، نابغہ روزگار اور درجنوں کتابوں کے مولف جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کا ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء بروز جمعہ بوقت صبح پانچ بجے بمقام کانپور انتقال ہوگیا۔ آپ ستر سال کے تھے۔ وفات سے تقریباً دو ہفتہ قبل آپ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ آپ کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوگئے تھے۔ اس ظالم بیماری نے آپ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اور بہت ہی قلیل مدت میں آپ کی زندگی کی بساط سمٹ گئی۔ ڈاکٹر صاحب ایک مومن کی طرح اس بے حد موذی بیماری سے جنگ لڑتے رہے۔ اور صبر وشکیب کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بیماری ڈاکٹر صاحب کو فتح کر چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا اور گھر واپس لے جانے کا مشورہ دیا۔ آپ کے فرزندان اور اخوان نے ایسا ہی کیا۔ بذریعہ ایمبولنس واپس ہوتے وقت کانپور میں آپ نے آخری سانس لی۔ آپ کی نعش مئو دیر سے پہونچی اور فوراً غسل دے کر اسی شام بعد نماز مغرب ہزاروں سوگواروں کی دعاؤں کے ساتھ آپ کو سپرد خاک کردیا گیا اللھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه۔

جب دین رحمت کانفرنس میں ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری کا اچانک انتقال ہوا تھا ان کے جنازہ اور مٹی میں میں بھی شریک تھا۔ جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب جب مٹی دے کر واپس ہورہے تھے تو ان کا چہرہ رنج والم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ وہ ایسے چل رہے تھے جیسے ہارا ہوا کمانڈر۔ کیونکہ ان کا بازو ٹوٹ گیا تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ جب ڈاکٹر ازہریؒ کو لوگوں نے قبر کے حوالے کیا ہوگا تو کتنے کلیجے کٹے ہوں گے اور کس قدر آنکھیں اشکبار ہوئی ہوں گی۔ اور کتنے دل غمگین ہوئے ہوں گے۔

میں نے ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۵ء تک جامعہ سلفیہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اس وقت جامعہ سلفیہ کی طوطی بولتی تھی۔ ہر طرف اس کا شہرہ تھا۔ طلبہ اس میں تعلیم حاصل کرنے کی تمنائیں کرتے تھے۔ اس وقت بڑی نامی گرامی ہستیاں تدریسی فریضہ انجام دے رہی تھیں۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری شیخ الحدیث رئیس احمد ندوی اور مولانا عابد حسن رحمانی کے دروس، تحقیقات، تخریجات اور فتووں کی خوشبو سے پورا ہندوستان مہک رہا تھا۔ چند سالوں میں سب اللہ کے پیارے ہوگئے۔ ہمارے ممدوح جناب ڈاکٹر

ازہری صاحب اپنی علمی صلاحیت عربی اور اردو مضامین اور تالیفات کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہم کو کچھ دنوں تک فتح القدیر پڑھایا ہے۔ آپ کبھی اردو میں پڑھاتے تھے اور کبھی عربی میں۔ الفاظ کی صحت پر آپ بڑی ترکیز کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب طلبہ کی انجمن میں بھی شریک ہوتے تھے مقررہ وقت پر آتے تھے اور آخر میں غلطیوں کی تصویب کے ساتھ کچھ نصیحت کرتے تھے۔ کئی بار میں نے بھی مدعو کیا تھا۔ اور آپ تشریف لائے تھے۔ عربی اناؤنسنگ میں میں نے ایک صلہ کی غلطی کی تھی۔ تو اس کو بہت اچھے ڈھنگ سے سمجھایا تھا۔

طالب علمی کے دور میں آپ کا ادبی ذوق کیا تھا۔ میں نہیں جانتا۔ توقع ہے کہ مئو کی ضمیر میں جو عام طور سے ادبی ذوق پایا جاتا ہے وہ آپ کے یہاں بھی رہا ہوگا۔ غالبًا صحافی سرگرمی کا آغاز جامعہ سلفیہ سے کیا۔ جب یہاں بحیثیت معلم اور باحث مقرر ہوئے۔ تقرر سے پہلے آپ دو علمی مقالے تحریر کر چکے تھے ۱۹۶۹ء میں صوت الجامعہ کے ایڈیٹر بنے۔ اس طرح آپ کو عربی انشاء پردازی کا جوہر دکھانے اور اپنی صلاحیت کو نکھارنے کا زریں موقع ملا۔

ڈاکٹر صاحب عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اچھا لکھتے تھے۔ ایک بار مولانا ابوالعاص وحیدی حفظہ اللہ نے مجھ سے کہا تھا ”یار ازہری صاحب کتنی اچھی اردو لکھتے ہیں پہلے ان کی اردو ایسی نہ تھی“۔

ایڈیٹر بننا کھیل نہیں ہے۔ ہاتھی کا پیٹ بھرنا آسان ہے پر کسی مجلّہ کا پیٹ بھرنا بڑا مشکل ہے۔ ازہری صاحب علمی مضامین کے ذریعہ صوت الامۃ کا پیٹ بھرتے رہے۔ صوت الامہ کے اوراق اگر اکٹھا کئے جائیں کوئی جلد کی کتاب تیار ہو جائے گی۔

آپ کا اسلوب آسان، تعبیرات عمدہ، زبان ادب آمیز، شستہ، شگفتہ و حسین آپ خوبصورت تعبیرات کا استعمال کرتے تھے۔ آپ کے یہاں عمومًا کسی بھی زبان کی کتاب میں جھول اور ثقل نہیں پایا جاتا ہے۔ زبان و بیان کی باتیں آپ بڑا اہتمام کرتے تھے۔

اس وقت میرے پاس ڈاکٹر صاحب کی ایک کتاب ہے جسے الدار السلفیہ نے ممبئی سے شائع کیا ہے۔ اس کا نام اصلاح المساجد ہے۔ ازہری صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے اس نمونہ کا انتخاب نہیں کیا ہے بلکہ کتاب کھول دی ہے اور جو صفحہ سامنے آیا اسی کو تحریر کر رہا ہوں:

”عقول کو جلا دینے اور اخلاق کو مہذب بنانے میں تعلیم کی بڑی اہمیت ہے اسی بنا پر ضروری ہے کہ اس ذمہ داری کو ادا کرنے والا دانشمندی، وسعت معلومات فروعی مسائل سے واقفیت اور شریعت بھی ملحوظ آسانی سے متصف ہو“۔ (اصلاح المساجد:۱۹)

عربی اداریہ کا نمونہ:

ان من خداع أمريكا وتمويهها أنها

عرضت على الرأى العالمى خطتها لا حلال السلام فى الشرق الاوسط، ان اقرار السلام فى منطقة ما ليس أمرا نظريا، وتعرف أمريكا هذا جيدا، ولذا لا تكتفى فى قمع الشعب الأفغانى ولا العراقى ولا الفلسطينى بالخطوات النظرية، بل تلتجئ الى التحرك والعمل، وتحرك أسطولها، وترسل وعيدها، أما اذا كان العدوان من اسرائيل، وكانت الضحايا شعب فلسطين أو شعبا مسلما ودولة مسلمة فالأمر يحول الى التاصيل والتنظير والاقتراح، وهذه المراوغة هى التى تواجهنا من الأمم المتحدة – المنظمة الدولية التى يضرب بها المثل فى الاستكانة والضعف والخداع وموت الضمير وابادة الأبرياء– ومن الاتحاد الأوربى ومن الأقلام المستأجرة والاعلام المنخداع المخادع، ان الوضع العالمى متأزم جدا، والغطرسة الأمريكية لو استمرت لأدت الى كارثة اكبر، لا سمح الله، ان مكافحة الارهاب واجب على الجميع، وليس على امريكا وحدها، ولكنه لا يتم ولاينجح الا اذا كان بصدق وتشاور وواقعية، أما الازدواجية فى التعامل، والحكم بالمقياسين، والجرى وراء المصالح، والتهرب من التبعات، فلا تعد من خصائل الأحرار العادلين. (صوت الامة)

عربی میں ترجمہ کا نمونہ:

وهذه الرسالة لم تولف افتراء على شخصية المسيح عليه السلام وتعاليمه المقدسة بل لايضاح تعاليمه الصادقة وتنقيتها فى صنو القرآن الكريم. ومن اهدافها العظيمة ان يزاح الستار عن الاقوال التى نسبت اليه كذبا وبهتانا، لان التبشير المسيحى ينشر فى الهند كتابا تضاد تعاليم المسيح الصادقة وتناقض العقل السليم والفهم المستقيم.

(مجلة الجامعة السلفية نيابر ۱۹۸۱م)

فارسی سے اردو ترجمہ کا نمونہ:

”وانچہ امروز از علم حدیث بدست مردمانی است، ساختہ و پرداختہ شیخین است، بآں سبب کہ جملہ صالحہ از حدیث شیخین خود روایت کردہ اند، نہ پنداری کہ شیخین ہمیں قدر روایت کردہ اند کہ در کتب مسانید بایشان نسبت کردہ می شود، بلکہ بسیاری از احادیث مرفوعہ کہ در مسانید بکثیرین از صحابہ مذکور است، بتحقیقت روایت شیخین است کہ عبداللہ بن عمر، وعبداللہ بن عباس، وابو ہریرہ آنرا ارسال نمودہ اند، و بآنحضرت ﷺ رفع کردہ واہل مسانید ظاہر آنرا اعتبار کردہ در مانید ایشانان درج نمودہ اند، چنانکہ بر شخصے کہ متتبع جزئیات وکلیات علم حدیث باشد، مخفی نخواہد بود، وبریں قدر اکتفاء نہ نمودہ اند، وصحابہ را در آفاق فرستادہ اند، وایشان را طریق روایت آموختہ اند، وبروایت حدیث تحریض نمودہ

اند، وقوم را ابراخذ از ایشان حمل کردہ انداللخ‘‘۔

ڈاکٹر ازہری صاحب سے میرے تعلقات:

جامعہ سلفیہ میں دوران طالب علمی ہم ڈاکٹر صاحب کی آفس میں ایک یا دو بار گئے تھے۔ مجھے کتابوں سے بڑا لگاؤ تھا اور پڑھنے کا بھی۔ ایک بار توصیہ لینے کی خاطر ڈاکٹر صاحب کی آفس میں گئے۔ دس پانچ منٹ کی اقامت میں میں نے کئی کتابوں کا نام پڑھا۔ تہذیب التہذیب کی ۱۲ جلدیں سجی ہوئی تھیں۔ میں نے کتاب اور مولف کو غور سے دیکھا۔ واپس آکر ساتھیوں کو بتایا کہ ابن حجر نے ایک کتاب لکھی ہے جو بارہ جلد کی ہے۔ اس کا نام تہذیب التہذیب ہے۔ اس زمانہ میں جامعہ کی سینٹرل لائبریری سے استفادہ ناممکن تھا۔ ممکنہ حد تک بچوں کو بڑی لائبریری سے پرہیز کروایا جاتا تھا۔ ایک خوانخوار قسم کے لائبریرین اس میں ہوتے تھے جو طلبہ کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اب ماشاء اللہ لائبریری سے استفادہ بہت آسان ہوگیا ہے۔ طلبہ اور جامعات کی یہ بدنصیبی ہے کہ لائبریریوں سے استفادہ مشکل ہوتا ہے۔ بہت سے شروط وضع کئے جاتے ہیں۔ بعض لائبریرین اخلاق کا اکھڑ ہوتے ہیں۔ اس کو کیا پتہ کہ یہ کتابیں طلبہ کے حق میں کتنی مفید ہوتی ہیں۔ میں نے طالب علمی کے زمانہ میں بھی دیکھا تھا کہ ایک بڑے جامعہ میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے مجلات آتے تھے اور ان کا غلاف نہیں کھلتا تھا۔ اور نہ ہی طلبہ کے حوالے کیا جاتا تھا۔ دوران تدریس بھی میں نے دیکھا ہے کہ درجن کے درجن مجلات غلاف کے اندر گھٹتے رہتے ہیں اور ان کی نقاب کشائی نہیں ہوتی۔

طلبہ اور اساتذہ کے درمیان بہت زیادہ قربت نہیں تھی۔ جب میں مدینہ منورہ سے فارغ ہوا تو جامعہ سراج العلوم سے تدریس کا آغاز کیا۔ اللہ کا کرم ہے کہ میں نے پہلا درس صحیح مسلم جلد اول کا دیا ہے۔ ایک بڑے مولانا جو اکثر دورے پر رہتے تھے۔ ان کا پورا کورس پڑھایا ہوا نہ تھا۔ الحمدللہ میں نے سب کو مکمل کر دیا تھا۔ مولانا ابوالعاص وحیدی صاحب کی تحریروں کا بھی اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ یہ مجھے صحافت کی پرخار وادی میں گھسیٹ لائے۔ مسلسل تربیت کرتے رہے۔ زبان وبیان کے نشیب وفراز سے واقف کراتے رہے۔ ادب، تنقید اور تبصرہ پر اپنی ذاتی کتابیں بھی پڑھواڈالیں۔

وقت کے دھارے میں پانی بہتا رہا۔ میں نے مضمون نگاری سے آگے قدم بڑھایا اور کئی کتابوں پر کام کیا اور عوام میں مقبول بھی ہوئیں۔ کتابوں کی طباعت کے بعد میں ازہری صاحب کی خدمت میں ایک نسخہ ارسال کرتا رہا پر کبھی وصولیابی کی اطلاع نہیں ملی۔

جامعہ سلفیہ میں ابنائے قدیم کی کوئی تنظیم ہے۔ اس میں ایک بار مجھ کو بھی مدعو کرلیا گیا تھا۔ اس مناسبت سے مادر علمی کی زیارت کا حسین موقعہ ملا۔ ازہری صاحب سے بھی باتیں ہوئیں۔ میں نے بخاری کے ہندی ترجے کی بات بتائی تو استاذ گرامی جناب رئیس احمد ندوی اور ازہری

صاحب نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ مشورے دیے اور دعائیں بھی۔

ازہری صاحب کی شدید خواہش تھی کہ بخاری کسی بھی طرح چھپ کر آ جائے۔ اس کے لئے انھوں نے ایک بڑے ادارے کے ذمہ دار کے نام درخواست بھی دلوائی تھی لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک سیمینار میں ایک ناخوشگوار واقعہ:

۱۹۹۶ء میں جامعہ سراج العلوم بونڈیہار میں ''محدثین'' پر سیمینار تھا۔ اس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے امام شافعی پر بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مقالہ تیار کیا تھا۔ اس کے لئے میں نے چار پانچ مہینہ تک خون جگر جلایا تھا۔ عام روایت کے مطابق یہ سیمینار بدنظمی کا شکار رہا۔ سیمینار تقریباً ۳ گھنٹہ دیر سے شروع ہوا۔ ازہری صاحب کی صدارت تھی۔ اناؤنسر ایک مدنی صاحب ہوا کرتے تھے۔ جنھوں نے تین سیمیناروں میں میری مٹی پلید کی تھی۔ وقت ختم ہو گیا میرا نام نہیں آیا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ باقی مقالہ نگار مقالہ جمع کر دیں وہ شائع ہو جائیں گے۔ یہ سن کر ازہری صاحب کھڑے ہوئے اور شیر کی طرح گرجے اور کہا کہ مقالہ نگار مہینوں محنت کر کے مقالہ تیار کرتا ہے اس کی اسے پڑھنے کی تمنا ہوتی ہے۔ آپ نے اتنی بے دردی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ مقالہ جمع کر دیں۔ سارے مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پڑھے تھے۔ باقی حضرات کو پانچ منٹ وقت دیا گیا۔ پر مجھ غریب کو صرف دو منٹ دیا گیا۔ اس میں میں کیا پڑھتا۔ گیا چند ایک عناوین پڑھے اور چلا آیا۔ میری داڑھی نزاع کا سبب بن گئی۔ ازہری صاحب دوبارہ کھڑے ہوئے اور سختی کے ساتھ لوگوں کو ڈانٹا بھی اور سمجھایا بھی۔

اس موقع پر حضرت مولانا مختار احمد ندوی رحمہ اللہ بھی آئے ہوئے تھے ازیں قبل آپ سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے مجھے بلایا اور کہا۔ بیٹے تم آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکو گے۔ اس جملہ نے میرا دل بہت بڑا کر دیا۔ یہ بات میں تیرہ سال کی مدت گزر جانے کے بعد پہلی بار تحریر کر رہا ہوں۔

مولانا میں پیشہ ور مقرر نہیں ہوں:

عزت مآب جناب ڈاکٹر ازہری صاحب عام جلسوں میں شرکت کے لئے بعض خطباء کے مکتسبانہ اور مرتزقانہ رویہ سے دل برداشتہ تھے۔ چند خطیبوں نے جس طرح بھیک منگائی کی ہے۔ اور علماء کے مقام و مرتبہ کو جس طرح داغدار کیا ہے اس سے وہ ناخوش تھے۔ ایک بار میں نے شعبہ دعوت کا انچارج ہونے کے ناطے ایک پروگرام میں شرکت کرنے کے لئے فون کیا۔ آپ سے ٹکٹ کے لئے کہا کہ اس طرح AC کا ٹکٹ آنے جانے کا لے لیں گے اور......ازہری صاحب نے کہا مولانا میں پیشہ ور مقرر نہیں ہوں۔

مضمون لکھو بادشاہ بن جاؤ گے:

مضمون نگاری کے لئے آپ ہونہار طلبہ کو حوصلہ

دیتے رہتے تھے۔ لیکن ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ اس وقت صحافت میں نہ کوئی مادہ پڑھایا جاتا تھا۔ نہ اس پر توسیعی لیکچرس ہوتے تھے۔ اور نہ ہی کلاس میں کچھ بتائے جاتے تھے۔ جامعہ کے ایک طالب علم مولانا حمید اللہ سلفی ہوا کرتے تھے یہ بڑے زرخیز اور شاداب ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے ہم کو بتایا کہ ازہری صاحب نے ہم سے کہا تھا ''مضمون نگاری کرو بادشاہ بن جاؤ گے''۔

ازہری صاحب نے وقت کا استغلال کیا:

کہا جاتا ہے کہ الوقت کالسیف ان لم تقطعه يقطعك وقت تلوار کے مانند ہے۔ اگر تم اس کو حسین یا مفید مشغلہ میں نہ کاٹو گے تو وہ تم کو کاٹ دے گا اور گزر جائے گا۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ وقت سے استفادہ کیا اور اسے ضائع ہونے نہ دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے مضامین، مقالات اور کتابوں سے لائبریری بھر دی۔ علم وفن کا جو سرمایہ آپ نے چھوڑا ہے وہ جادو کی چھڑی گھمانے سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کے لئے آپ نے آرام وآسائش کو قربان کیا ہے۔ خون جگر جلا کر ان کو تیار کیا ہے۔ اور نرگس کو اس کے لئے بہت آنسو بہانا پڑا ہے۔ سستی، تساہل، تکاسل اور تغافل کے زمانہ میں محنت کرنے والا راتوں کو جاگنے والا، کسی جامعہ کے بارے میں پہلو میں درد مند دل رکھنے والا، اپنے جامعہ کو آگے بڑھانے والا، بحث وتحقیق کے لئے لائبریریوں کی خاک چھاننے والا بہت کم ملے گا۔

ازہری صاحب کی آفس دوپہر کے بعد بھی کھلی رہتی تھی اور آپ برابر لکھتے رہتے تھے۔ مدارس اور جامعات میں عام طور سے قیلولہ کا رواج ہے جو اتنا طول پکڑتا ہے کہ لیلولہ میں بدل جاتا ہے۔ گستاخی معاف ہم علماء کرام نہ اپنے علم کی قدر کرتے ہیں اور نہ ہی وقت سے استفادہ کرتے ہیں۔ استاذ گرامی جب تک ادارۃ البحوث کے مشرف رہے تب تک جامعہ سے شائع ہونے والی کتابوں پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اور عام طور پر عربی اردو میں شائع ہونے والی ساری کتابوں پر کلمہ ناشر یا تقدیم لکھا ہے۔

محققین اور باحثین اور جملہ اساتذہ کو ازہری صاحب کی زندگی سے عبرت پکڑنی چاہئے۔ جس بیماری میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا اس میں ڈاکٹر بترا نے کہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب میں ۱۶ گھنٹے کام کرتا تھا۔ میں نے عقاد، انور الھدی اور خیر الدین، زرکلی کے بعد ازہری صاحب کو بہت زیادہ محنت کرنے والا پایا ہے۔

موصوف کے اندر بڑی خوبیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

☆☆☆

ڈاکٹر بدرالزماں محمد شفیع نیپالی
جمعیۃ التوحید الخیریۃ۔ نیپال

قطرے جو تھے ترے عرق انفعال کے

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کو پہلی بار دیکھنے اور سننے کا اتفاق اس وقت ہوا جب میں ۱۹۷۰ء میں جامعہ رحمانیہ بنارس میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے گیا۔ ڈاکٹر صاحب ابھی کچھ ہی پہلے جامعہ ازہر سے تشریف لائے تھے۔ اکثر طلبہ آپ کے مقام ومرتبہ اور علمی حیثیت سے مرعوب رہتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری ناسمجھی سمجھ کی راہ پر آنی شروع ہوئی تھی۔ کچھ دنوں بعد ہم مرکزی دار العلوم یعنی جامعہ سلفیہ میں داخل ہوئے عالمیت کے دوسرے سال جب ڈاکٹر عبدالرحمٰن لیثی علی گڈھ طبیہ کالج میں داخل ہوگئے اور البلاغة الواضحة کا درس رک گیا تو صرف ایک روز ڈاکٹر مقتدیٰ ازہری نے ہمارا کلاس لیا اور ایک سبق پر تقریر کی۔

ازہری صاحب بڑے پروقار اور بارعب تھے۔ آپ کی پرمغز فکری تحریریں اور تقریریں علم وادراک والوں کے لئے کافی وقیع ہوتی تھیں جب کہ سطحی طبیعتوں کے لئے اوبنے کے سوا کچھ نہ ملتا۔

میرا تاثر ہے کہ آپ کی ابتدائی اور انتہائی تقریروں اور تحریروں کے درمیان لمبی مسافت ہے۔ برابر ممارست کی وجہ سے آپ کے آئینہ میں کافی نکھار آ گیا تھا۔ زبان وقلم میں برجستگی، گہرائی، وزن اور سلاست تھی، لکھنے اور بولنے میں میں نے اپنی بساط بھر نظر بھی رکھی مگر میں نے آپ کو کبھی اوچھا نہیں پایا۔ اپنی معلومات کی حد تک میں نے آپ کے یہاں آمد پایا۔ آورد کا گمان نہیں گزرا۔ ترجمتین یعنی تعریب اور تارید میں آپ کو اونچا مقام حاصل تھا جس میں سرعت بھی بلا کی تھی۔ تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی تجدیدی مساعی (تالیف مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ) کی تعریب "حركة الانطلاق الفكرى وجهود الشاه ولى الله الدهلوى" اور قاضی سلیمان سلمان منصور پوری کی مشہور کتاب "رحمة للعالمين" کی تعریب آپ کے اہم ترین کارناموں میں سے ہے۔ میں نے بعض ہندوستانی قدآور اور باوزن شخصیات کو آپ کی تعریب وتحریر کی ڈھکے چھپے اسلوب میں تعریف کرتے سنا ہے۔

جوانی کی ترش مزاجی وقت گزرنے کے ساتھ خوش مزاجی میں آمیز ہوگئی تھی جس کے لئے شہادت کی

ضرورت نہیں، لیکن ابتدائی دور میں بھی یہ چیز موجود تھی۔اس کے لئے ایک طالب علم کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ مذکور طالب علم کو کسی جہت سے نہ پشت پناہی حاصل تھی نہ ڈاکٹر ازہری صاحب کی بلندی تک رسائی کے لئے اس کے پاس کوئی زینہ تھا، ان کا اس خاک نشین کی سطح پر اتر کر ملنا اور زبان حال کی گفتگو سے اس کا درد وکرب محسوس کرنا اور پھر تاثر کا سماں بندھ جانا ایک معجزاتی تسخیر سے کم نہیں جس طالب علم کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا اس کا خیال ہے کہ اس کی حق تلفی ہوئی تھی جس کا استدراک تو نہ کیا گیا البتہ اس کے گم شدہ اوراق کی دوبارہ فراہمی کے لئے فراخدلی کا مظاہرہ بلا طلب ہوا۔ ممکن ہے اس معاملہ کا سرا کسی جذباتیت سے جڑ گیا رہا ہو جس کی حدت وشدت وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہوگئی ہو۔ اور ضمیر نے پس منظر سے حجاب اٹھادیا ہو جس پر انفعال ہوا ہو۔ لگتا ہے اقبال نے اسی جیسے موقعہ کے لئے کہا تھا۔ (ذراسی ترمیم کے ساتھ)

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے (ترے) عرق انفعال کے

چنانچہ انھیں حاصل شدہ اوراق کی بنیاد پر اس کی ترقی کے دروازے کھلے۔

ازہری صاحب سے میری جب بھی کہیں ملاقات ہوتی تھی علمی زندگی سے متعلق ضرور دریافت کرتے تھے۔ آپ سے آخری ملاقات آپ کے گھر شاہین باغ دہلی میں ہوئی۔ دیر تک علمی گفتگو ہوتی رہی۔ آپ نے اپنے بعض اشغال کا ذکر کیا۔ ان میں مولانا ذوالفقار شاگرد نواب صدیق حسن خان قنوجی کی مذکر ومونث پر ضخیم کتاب کی تلخیص کا ذکر آیا۔ میں نے عرض کیا کہ تذکر وتانیث پر اس میں مناسب مواد ہے مگر اس میں علامہ سبکی کا طبقات الشافعية الكبرى اور علامہ دمیری کا حياة الحيوان الكبرىٰ والا اسلوب دائرۃ المعارف اختیار کیا گیا ہے۔ آپ اس کا خلاصہ تیار کرتے ہیں تو مذکر ومونث پر کئی اہم کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان کا ملخص تیار کر کے موسوعة التذكير والتانيث کی شکل دی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں ابن الانباری کی کتاب کافی اہم ہے جب کہ فراء، ابن فارس اور مبرد کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ رائے آپ کو پسند آئی۔ تلخیص کا یہ کام غالباً چل رہا تھا کہ اجل آگیا۔

اللهم اغفر له وارحمه وأكرم نزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد۔

☆☆☆

محمد جابر زماں
جے این یو۔ نئی دہلی

عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن

ڈاکٹر ازہری: ایک شخصیت، ایک تحریک

اے خدائے واحد ولم یزل
ترے ایک حرف کے صید ہیں
یہ زماں مکاں، ترے فیصلوں کے حضور میں
نہ مجال ہے کسی حرف کی، نہ کسی کو تابِ سوال ہے
یہ جو زندگی کی متاع ہے
تری دین ہے، ترا مال ہے
مجھے ہے تو اتنا ملال ہے
...کہ جب اس کی ساعتِ آخری سرِ راہ تھی
میں وہاں نہ تھا!

(امجد اسلام امجد)

وہ رات کتنی سفاک تھی، میں بستر پر پڑا کروٹ بدل رہا تھا۔ نیند کوسوں دور تھی صبح ہونے میں ابھی چندے وقت باقی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، باہر نکلنے پر معلوم ہوا کہ بڑے ماموں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ذہن اس خبر کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ اس قحطِ علم کے دور میں ابھی ہم ازہری صاحب کو کھونے پر راضی نہیں تھے۔ تھی ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری/........ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے افراد و اشخاص کے لیے یہ ایک بڑا حادثہ تھا۔ مولانا مختار احمد ندوی اور فضاؔ ابن فیضی کی وفات سے ابھی ہم اُبر نہیں سکے تھے کہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ لیکن 'مرضیِ مولیٰ ہمہ از اولیٰ' کے بہ موجب سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ جب گھر جانا ہوا تو کئی لوگوں نے دریافت کیا کہ کچھ ازہری صاحب کے حوالے سے لکھا کہ نہیں۔ اس سوال کے بعد بھی خود کو کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں پاسکا۔ لیکن جب ان کے گھر پر جانا ہوا تب ان کی جدائی کا احساس ہوا۔ اس وقت دل کی جو کیفیت تھی وہ بیان سے باہر تھی۔ دراصل کچھ زخم اور حادثات ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو اس حد تک متاثر کر دیتے ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر پاتا۔ ایسی ہی کچھ صورت حال اپنی بھی تھی۔ وہاں سے یہ ارادہ کر کے اٹھا کہ کچھ الٹا سیدھا ہی سہی، ضرور لکھوں گا۔ اب اسی ارادے کی تکمیل کر رہا ہوں۔ لطف تو جب تھا کہ اس نابغۂ علم و فن کی داستانِ حیات خود انھیں کی زبانی سنتے، مگر افسوس کہ مرجانے والے کہانیاں نہیں سناتے، وہ خود کہانی بن جاتے ہیں جسے سننے اور سنانے کی سعادت پسماندگان کے حصے میں آتی ہے۔ ازہری صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے اور کچھ سیکھنے کا موقع تو مجھے بھی نصیب نہ ہوا، جس کا قلق بھی ہے؛ لیکن جو چند ملاقاتیں ہوئیں اور گھر میں رہنے سہنے کے آداب و اطوار کو مدِ نظر رکھ کر جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے اسی کو حوالۂ قرطاس کر رہا ہوں۔

دیار مشرق اپنے علمی حوالے سے ہر عہد میں موضوع بحث رہا ہے۔ چنانچہ مغل حکمراں شاہجہاں نے اس خطے سے متعلق کہا تھا، 'پورب شیرازِ ما ست' اسی خطے نے مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری، مولانا عبد السلام مبارکپوری، مولانا عبید اللہ رحمانی، مولانا حمید الدین فراہی، اور قاضی اطہر مبارکپوری جیسے اساطین علم وفن پیدا کیے۔ 'مئو ناتھ بھنجن' بھی اسی دیار پورب کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جو بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہندوستان کی علمی اور دینی تاریخ کے حوالے سے اہمیت کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں خاندان ولی اللٰہی کے جانشین میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کے اکیس شاگرد تھے۔ جن میں سے ایک مولانا محمد نعمان صاحب کی ذات گرامی بھی تھی جو میاں صاحب کے متاخرین تلامذہ میں تھے۔ وہ ازہری صاحب کے نانا تھے۔ انھوں نے ڈپٹی نذیر احمد سے بھی عربی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی اور وطن سے دور بہت دور عمر آباد، مدراس میں اپنی مجلس درس سجائی اور مستقل طور پر وہیں آباد ہو گئے۔ اس کے علاوہ مولانا ابوالمکارم محمد علی، مولانا محمد احمد (بڑے مولوی صاحب) مولانا حکیم عبد اللطیف زمیندار، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا عبد اللہ شائق، مولانا محمد احمد ناظم صاحب، مولانا عبد الرحمٰن نحوی رحمانی وغیرہ بھی اسی بستی سے متعلق تھے، جو اپنے اپنے میدان میں علم وحکمت کی آبیاری کرتے رہے۔ موجودہ زمانے میں ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی (شاہ فیصل ایوارڈ یافتہ)، ڈاکٹر عبد العلی ازہری (پروفیسر مسلم کالج، لندن) اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (مدیر: البعث الاسلامی) مولانا مظہر احسن ازہری ناظم جامعہ عالیہ عربیہ وغیرہ بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی دیار میں ازہری صاحب 8/ اگست 1939ء کو ایک متوسط پارچہ باف گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ویسے گھریلو کاغذات میں ان کے والد کے قلم سے ان کی تاریخ پیدائش 26-اگست 1936ء درج ہے۔

ازہری صاحب کے والدین ان چند لوگوں میں سے ہیں جو منہ کا نوالا روک کر بچوں کو تعلیم دلانے کے قائل تھے کیونکہ اس کی اہمیت کا انھیں احساس تھا۔ غربت کے باوجود ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی کیوں کہ وہ اولاد ذکور میں بڑے تھے۔ خصوصاً ان کی والدہ جن کے گھر میں اس وقت علم وعمل کا چرچا تھا۔ ان کا خاندان اپنی علمی وراثت اور اس کی توسیع وتوزیع کے حوالے سے قابل ذکر ہے۔ ایسا نہیں کہ ازہری صاحب کے گھرانے میں عورتوں کی تعلیم کی جانب توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان کی بڑی بہن نے بھی اپنے دور میں پرائمری کی مکمل تعلیم پائی تھی جو اس معاشرے میں رائج تعلیم نسواں میں کسی قدر زیادہ ہی تھی۔ ازہری صاحب کی تعلیم کا سلسلہ حفظ قرآن سے شروع ہوا۔ اس کے بعد بہ تدریج وہ تعلیمی مراحل طے کرتے گئے۔ اور ایک وقت آیا کہ ایک غیر علمی خاندان کا سپوت تحصیل علم کے بعد واپس ہوا تو اپنے وقت کا عربی ادیب کہلایا اور علوم دینیہ میں وہ مہارت حاصل کی کہ جامعہ سلفیہ جیسے مرکزی ادارے نے اسے اپنے یہاں جگہ دی۔ ان کی نبوغ وفراست کا صحیح اندازہ مولانا عبد الوحید عبد الحق سلفی کو تھا۔ دراصل ہیرے کی شناخت جوہری ہی کر سکتا ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مناسب قد، متوسط بدن، گندمی رنگ، پروقار کشادہ پیشانی، بارعب اور پرشوکت کتابی چہرہ، جس سے عزم واستقلال آشکارا ہوتا، دور بیں نگاہ، ستواں ناک، موزوں دہانہ، گھنی داڑھی —— یہ تھے ازہری صاحب ......سر پر عام حالتوں میں سفید گول، یا کپڑے کی لمبی ٹوپی اور مخصوص حالات میں مخملی ٹوپی، پتلے پائینچوں کا آڑا پاجامہ اور شیروانی؛ جاڑے کے دنوں میں گھر میں اوورکوٹ زیب تن فرماتے۔ چلتے تو 'مشیِ عباد اللہ' کا نمونہ پیش کرتے۔ خاموشی میں پہاڑ کا سکوت اور تفکرانہ انداز، اس دوران داڑھی پر ہاتھ پھیرنا بھی ان کی مخصوص عادت تھی۔ سنجیدگی، بردباری اور عزم کے چنور ان کے چہرے پر براجمان رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کے ناک نقشے میں جو چیز سب سے پہلے ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کراتی تھی وہ ان کی چوڑی پیشانی تھی جیسے کسی عالیشان عمارت پر سنگ مرمر کی تختی پر کھدا ہوا نام یا کوئی عبارت.......ساتھ ہی ان کی آنکھیں جو درازیِ عمر کی وجہ سے اندر کو کچھ دھنسی ہوئی تھیں، عام طور پر نیچے ہوا کرتیں جن سے ان کی ذہانت وفطانت کو پڑھا جا سکتا تھا۔ خوش مذاقی کی بات پر خندۂ دنداں نما پر ہی اکتفا کرتے۔ بڑے بڑوں سے ان کے لائق، اور بچوں میں بچوں سی باتیں کرتے.......اخلاقیات مذہب کا جزو عین ہے یا اضافی؟ طول طویل مبحث ہے۔ لیکن ازہری صاحب کو دیکھ کر اس کا یقین ہوتا تھا۔ ہر عالم شخص بااخلاق ہو ضروری نہیں و بالعکس.......ڈاکٹر صاحب انتہائی خاکسار اور سراپا عجز تھے لیکن اپنی علمی منزلت سے نہ صرف واقف، بلکہ قدر شناس بھی تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ دوسروں کو کم خاطر میں لاتے تھے۔ اچھے اچھوں کو ان کے سامنے لب کشائی کا یارا نہ ہوتا:

ہوں مدعی سخن کا مگر کی جب اس سے بات
جملے غلط سے ہوگئے، مفہوم الٹ گیا
(فضا)

ازہری صاحب کا تعلیمی سلسلہ حفظ سے شروع ہوا، اور اس کے بعد عربی اور اسلامیات کی تعلیم مدرسہ عالیہ، جامعہ فیض عام اور جامعہ اثریہ دارالحدیث میں حاصل کی۔ اس دوران جن اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا ان میں مولانا عبداللہ شائق، مولانا عبدالرحمٰن نحوی رحمانی، مولانا شمس الحق سلفی، مفتی حبیب الرحمٰن فیضی اور مولانا عبدالمعید بنارسی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں حصول علم کا ایک پڑاؤ ختم ہوگیا لیکن علمی تشنگی باقی تھی جس کے لیے انھوں نے جامع ازہر، قاہرہ کا سفر کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ 1968ء ہی میں جامعہ سلفیہ سے منسلک ہوگئے تھے۔ پھر بھی مزید تعلیم کا شوق دامن گیر رہا جس کی تکمیل کے لیے انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رخ کیا اور پی ایچ.ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد میدان عمل میں آ گئے۔

ازہری صاحب بنیادی طور پر علمی آدمی تھے اور تصنیف وتالیف سے دلچسپی کچھ زیادہ ہی رکھتے تھے جس پر ان کی تصانیف وتالیفات اور تراجم دال ہیں۔ سیمینار اور علمی مجالس میں شرکت بھی ضروری سمجھتے تھے جس کا دائرہ بیرون ہند تک وسیع تھا، ان مجالس میں عمومی طور پر خطبات و مقالات قلمبند کر کے لے جانا ان کا طریقہ تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے لکھ نہ سکے تو معذرت کر لیتے اور اپنی معروضات مختصر طور پر وہیں قلم بند کر کے پیش کرتے۔ جہاں مجالس کے صدر ہوتے؛ اور ایسا اکثر ہوتا تھا، تو واقعی صدارت کا حق ادا

کرتے، کرسیِ صدارت پر متمکن ہوکر مقالات کو پوری دلچسپی کے ساتھ سننا اور حسب ضرورت اپنی رائے دینا ان کی عادت تھی۔ مقالہ نگار کی حوصلہ افزائی کو اپنا فرض سمجھتے۔محنت اور سلیقہ کی داد جس قدر خوش ہوکر اور دل کھول کر ازہری صاحب دیتے تھے کوئی اور کم دے گا، کیونکہ اس طرح کی آزمائش اور لطف سے وہ گزر چکے تھے۔یوں تو ڈاکٹر صاحب کی نظر تمام علوم پر رہتی تھی لیکن قرآن اور علوم قرآن سے ان کو خاص شغف تھا۔ ادھر کچھ سالوں سے قرآن کے متعلق ان کے متعدد تفصیلی مقالات دیکھنے کو ملے اس کے علاوہ 'فتح المنان' اور دیگر رسائل اس بات پر دال ہیں۔ڈاکٹر صاحب ان معنوں میں تو مقرر نہیں تھے جن معنوں میں امام مسلم نے مقدمہ میں استعمال کیا ہے۔ ہاں تقریر کیا کرتے تھے۔ان کی تقاریر کی مخصوص صفت عجلت اور بے چینی تھی جو مثبت تھی، معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی چیز کے لیے بے قرار ہوں۔علم کے وفور کے پیش نظر اشارات ہی کو سب کے لیے کافی سمجھتے تھے ان کی آواز میں ایک طرح کی حدت اور تڑپ تھی۔ان کی تقریر استدلالی اور تفکیری ہوا کرتی تھی، جس میں اشارات وکنایات کا مناسب استعمال بھی ہوتا اور تحریک جذبات کے لیے اشعار سے برمحل استدلال بھی، جس میں آخر عمر تک شباب کی سی تازگی قائم رہی۔اقبال کی شاعری سے کافی متاثر تھے، تحریر وتقریر میں ان کے اشعار کا خوب استعمال کرتے۔ فضا صاحب کی شاعری کے بھی قائل تھے اور کبھی کبھی ان کے اشعار بھی استعمال کرلیا کرتے تھے۔

جامعہ سلفیہ کے مرکزی دروازے سے اندر کی جانب داخل ہوتے ہی دو رُویہ کمروں کا ایک سلسلہ ہے اسی میں سے دوسرا یا تیسرا کمرہ ازہری صاحب کی آفس تھا۔ازہری صاحب اور جامعہ سلفیہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم تھے۔معلوم نہیں آپ نے جامعہ سلفیہ کا درشن کیا ہے یا نہیں؟ یہ بھی تو نہیں معلوم کہ ازہری صاحب سے واقف ہیں یا نہیں؟ ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی آپ کو نیاز حاصل رہا ہے تو سمجھ لیجیے کہ دوسرے کو بھی دیکھ لیا۔ازہری صاحب ساکن جامعہ سلفیہ، اور جامعہ سلفیہ متحرک ازہری صاحب!

ازہری صاحب نے جب اس ادارے میں کام کاج سنبھالا تو اس ادارے کی کل عمر 5-6 سال تھی۔ ہندوستان سے اکثر نابغات علم وفن یہاں جمع ہو چکے تھے۔ ایسی حالت میں اپنے انفرادی نقوش ثبت کرنا مشکل امر تھا اس کے باوجود ازہری صاحب نے اپنی صلاحیت؛ ذہانت کی بہ دولت اپنی جگہ محفوظ کرالی اور جامعہ وجماعت کے مقصد کی تکمیل میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ اور جب انھوں نے یہاں کام کاج چھوڑا، نہیں نہیں بلکہ اس دارِفانی کو خدا حافظ کہا، تو جامعہ کی شہرت دور دراز علاقوں اور غیر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل کا مورخ ذاتی تعلقات اور انفرادی جذبات سے قطع نظر جمعیت؛ جامعہ کی حالت پر کبھی معروضی تجزیہ کرے گا تو بڑے دلچسپ انکشافات ہوں گے، ہوسکتا ہے اس کی وجہ سے بعض افراد؛ اشخاص کی شہرت پر منفی اثر پڑے لیکن مجھے یقین ہے کہ ازہری صاحب کی ذات تاریخ کی کسوٹی پر پوری اترے گی۔ کسی شخص کے لیے مجال انکار نہیں کہ انھوں نے جس جوش، لگن اور خلوص کے ساتھ اس ادارے کی خدمت کی اور کچھ ہی سالوں میں اس کی کشتی کو گرداب سے نکال کر ساحل

عائیت پر پہنچادیا، وہ انھیں کا حصہ ہے۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ازہری صاحب کو ایک سا ہی دیکھا۔ انھیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ وقت کی رفتار تھم گئی ہے، زمانے کی گردش رک گئی ہے۔ ہاں ابھی ایک دوسالوں میں کافی فرق آگیا تھا ورنہ خود ان میں اور ان کے مشاغل میں سرِ مو تفاوت نہ آتا تھا۔ وہ آدمی نہیں تھے، ارادہ تھے، جذبہ تھے، تفکر و تعمق کا نام مقتدیٰ حسن تھا جو حقیقی معنوں میں اقتدیٰ اور پیشوائی کے قابل تھے۔ حقیقت میں ان کے یہاں زندگی کا مفہوم کچھ یوں تھا:

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی

اللہ تعالیٰ نے عجیب شخصیت بنائی تھی۔ مذہبی، ادبی، تاریخی، تعلیمی اور سیاسی ہر موضوع پر یکساں تیار رہتے تھے۔ دراصل ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور حافظہ قوی تھا۔ جس کی بنا پر وہ مدرسہ فیض عام سے لے کر ازہر یونیورسٹی تک اور مدرسہ عالیہ سے علی گڑھ یونیورسٹی تک قابل توجہ سمجھے گئے۔ اس کے علاوہ بہترین عربی ادیب اور ایڈیٹر ہونے کے ساتھ اردو کے اچھے مذہبی مصنف بھی تھے۔ سنا ہے کسی زمانے میں شاعری سے بھی شغف تھا لیکن بہت جلد ہی اس کوچے سے نکل آئے۔ فرصت کے لمحات مطالعہ میں گزارتے، کتابیں ہی ان کے لیے بہترین رفیق تھیں۔ مدارس میں ایسے کم لوگ ہوں گے جو موصوف کی مانند کثیرِ مشاغل اور عدیمِ فرصت ہونے کے باوجود اتنی متنوع دلچسپی رکھتے ہوں جتنی ازہری صاحب رکھتے تھے۔ ان کے ذہن کی ہمہ گیریت اور ذوق کی پختگی کی بنا پر 'دریا بوجودِ خویش موج دارد' کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

ازہری صاحب نے اپنے علمی پس منظر کی بنا پر اپنے نظریات یا یوں کہیے کہ اسلامی نظریات کی تشہیر کے لیے جماعت اہل حدیث کو منتخب کیا اور پھر اسی کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ جماعت و جمعیت کی قیادت نے کئی مرتبہ چاہا کہ وہ جماعت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں لیکن انھوں نے معذرت کر لی۔ یہ ان کی مظہریت تھی جس نے انھیں یہ عہدہ لینے سے دور رکھا۔ کیونکہ عہدے تو نام کے لیے ہوتے ہیں اور کام تو نام اور عہدے کے بغیر بھی کیے جا سکتے ہیں۔ در اصل انھیں اپنے 'ڈاکٹر صاحب اور ازہری صاحب' ہی ہونے پر اصرار تھا۔ حقیقی بڑائی یہی ہے جس کے لیے کسی اضافی یا خارجی شے اور ذریعے کی احتیاج نہ رہے۔

ازہری صاحب جمعیت اہل حدیث سے جذباتی سطح پر وابستہ تھے جس کی مثال ان کی ان تحریروں میں ملتی ہے جہاں انھوں نے معقولات و منقولات کے بجائے جذبات و احساسات کا سہارا لیا ہے بالخصوص ان کے خطبات استقبالیہ جو یکے بعد دیگرے انھوں نے ستائیسویں، اٹھائیسویں اور انتیسویں کانفرنس میں پیش کیا۔ پاکوڑ کانفرنس جہاں مقیم رہ کر انھوں نے انتظامات کا جائزہ لیا اور مشوروں سے نوازتے رہے، یہ جذبات ہی تو تھے، اس کا عکس ان کے خطبہ استقبالیہ میں نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں جو وفور اور آمد ہے وہ دیگر تحریروں سے اس کو الگ کرتی ہے۔ اس پورے مقالے کی قرات کے دوران بار بار ارسطو کا وہ قول یاد آ رہا تھا جس میں اس نے خطابت کی شعریات پر بحث کرتے ہوئے جذبات کو خصوصاً نشان زد کیا ہے۔ اس کے باوجود علما کا ایک طبقہ جس نے کانفرنس انتظامیہ پر تنقید کے بہانے اس

پورے پروگرام پر سوالیہ نشان لگانے کی کوشش کی اور اس کی آڑ لیتے ہوئے کانفرنس کی قیادت پر سوال قائم کیا۔ اس کے جواب میں ازہری صاحب نے جس اسلوب میں حافظ یحییٰ کے نام اپنے خط میں ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے وہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ اس کے کچھ جملے سخت ہیں۔ اس لیے نہیں کہ لوگ یہ جملے دوسروں کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ ازہری صاحب سے کبھی اس طرح جواب سننے کی عادت نہ تھی وہ ہمیشہ ان باتوں کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے لیکن یہاں جذبات و احساسات کی قدر نہ ہونے کی بنا پر وفور جذبات کا تفاعل نظر آتا ہے جو بجا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں اکثر مشکلات آئیں مگر برے سے برے وقت میں بھی وہ شکر گزار رہے۔ ان کے خالق نے انھیں جس کام کے لیے دنیا میں بھیجا تھا وہ ہمیشہ خلوص کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ سکون و اطمینان کے ساتھ عمل پیہم ان کی خاص صفت تھی۔ وہ جہاں بھی رہے خود بھی متحرک رہے اور افراد و اشخاص کو بھی متحرک رکھنے کی فکر میں رہے:

حیات، شعلہ مزاج و غیور و شورانگیز
سرشت اس کی ہے، مشکل کشی جفاطلبی
(اقبالؔ)

یہ اطمینان موت کے وقت بھی ان کے چہرے بشرے سے عیاں تھا۔ ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ کر یہ شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے:

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید، تبسم بر لب اوست

مرض الموت میں شدید تکلیف اٹھائی مگر پیشانی پر شکن نہ آئی۔ بڑے صابر و ضابطہ آدمی تھے۔ انتقال سے کچھ دیر پہلے بیٹے نے مزاج دریافت کیا تو بولے:

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ نا خدا کہیے!

لوگ شہرت و عزت کے پیچھے بھاگتے ہیں اور شہرت ان سے روبہ گرداں رہتی ہے۔ اس کے برعکس ازہری صاحب شہرت سے دور رہے لیکن شہرت ہمیشہ ان کے پیچھے بھاگتی رہی۔ اس پر کچھ لوگ چیں بہ جبیں بھی ہوئے۔ ان کی زندگی میں ہی انھیں اتنی شہرت و عزت مل چکی تھی کہ مزید کے خواہش مند نہیں تھے۔

ازہری صاحب کی فکریات کا دائرہ بہت وسیع اور متوازن تھا ان کی نظر مدرسہ کی چہار دیواری سے باہر بھی دیکھنے کی عادی تھی۔ مطالعہ اور عملی معاملات نے ان کو زندگی کے وسیع تر تجربے سے آشنا کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ افراد کے مقابلے میں اجتماعیت پر زور دیتے تھے۔ امت میں بے جا افتراق کے قائل نہیں تھے۔ وہ علمی مسائل کو علما تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔ علمی مسائل میں توازن ان کی خاص صفت تھی۔ شدت پسندی کا ان کے یہاں شائبہ بھی نہیں تھا۔ ایسا بھی نہیں کہ انھوں نے ہر کسی سے سمجھوتہ کرنا ضروری سمجھا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں انھیں جماعت کے نظریات کی تائید اور دوسرے مکاتب فکر کی بحثوں اور تقریروں میں حصہ لینے کا موقع فراہم ہوا وہاں انھوں نے تائید کی۔ اور بڑے نرم لہجے میں ان افراد کو مخاطب کرتے ہوئے اسلامی فکر کو پیش کیا۔ مناظرانہ طرز فکر سے وہ بالکل عاری تھے۔ امت مسلمہ کو داخلی خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے، مسلکی اختلافات کو اسی لیے

نظر انداز کر جاتے۔ دراصل انھیں ملت اسلامیہ کی فلاح وبہبود پیاری تھی۔

ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان میں پہلی علمی شخصیت ہیں جنھوں نے خداداد صلاحیتوں کی بنا پر اپنی جگہ بنائی تھی۔ ان کے بعد کی نسل پر خود ڈاکٹر صاحب نے اثرات مرتب کیے اور یہ نسل تعلیم کی جانب مائل ہوئی........ نئی نسل جو تعلیم کے معاملے میں باشعور اور باحوصلہ ہے، مزید حوصلہ افزائی اور ان کی رہنمائی کو اپنا فرض جانتے تھے۔ دیگر کم ظرفوں کی طرح طنز کا نشانہ بنانا ان کا شیوہ نہیں تھا۔ بلکہ بعض اوقات قابل مواخذہ مواقع پر بھی صرف مسکرا کر اپنی بات کہہ جانا ان کا مخصوص انداز تھا۔ ان کے اس برتاؤ سے مخاطب کو خود اپنی غلطی کا احساس ہوجاتا۔ اور یہی وہ خوبی ہے جو آدمی کو اعلیٰ انسان بناتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں جنھیں اہل علم اپنی گفتگو کا موضوع بنائیں گے لیکن تمام میں ان اقدار وروایات کی جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے جو مشترک ہیں۔ اس حوالے سے جو مضامین و مقالات نظر سے گزرے ہیں ان میں چند ایک کو چھوڑ کر سبھی میں الفاظ ومعنی کی کشمکش صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہم دوسروں کی باتیں نقل کرکے ازہری صاحب کی شخصیت کو روشن کردیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ازہری صاحب کی خدمات کے پس منظر میں غور کریں۔ تخیلاتی تصویر بنا کر اپنے تاثرات قلم بند کرکے ہم خود ان کی شخصیت پر چادر ڈالنے کا سبب بن رہے ہیں۔ اب تو یہ بات عام ہوگئی ہے کہ 'یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا' ہم بہت سے لوگوں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے جو کچھ کہہ جاتے ہیں دراصل ویسے ہوتے نہیں، لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ اقدار کی شکست وریخت نے یوں تو ہر سطح پر اپنے نقوش مرتب کیے ہیں۔ لیکن اس کا مذہبی طبقہ میں بطور حاوی عنصر حلول کرجانا زیادہ مضرت رساں ثابت ہورہا ہے۔ مذہبی مادیت نے تو معاشرے کے مجد وشرف کا معیار ہی بدل ڈالا ہے۔ بت گری کسی بھی معاشرے کے لیے باعث خیر نہیں، لیکن بت شکنی کے زعم میں کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم خود شکنی اور ضمیر فروشی کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ ازہری صاحب کی زندگی بڑی واضح اور کھلی کتاب کی مانند تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں انھیں امور کو منتخب کیا جن کی صداقت کے متعلق ان کا ایقان تھا، بہ قول شاعر:

اس نے جیون میں جو کچھ کیا
صحیح سمجھ کر کیا
کسی کو جان بوجھ کر
چوٹ پہنچانے کے لیے نہیں
سہج کر سمجھ کر کیا
اس کا استوسار تھک ہے
اس کا جیون سپھل ہے۔

(اٹل بہاری باجپئی)

ازہری صاحب میں قائدانہ صلاحیتیں بہ درجۂ اتم موجود تھیں اور اس کا انھوں نے استعمال بھی کیا۔ ہر موقع پر وہ آگے نظر آتے تھے۔ اور تو اور انھوں نے جب اس دھرتی کو خیر باد کہا تب بھی آگے وہی تھے اور پیچھے ایک بھرا پرا سوگوار قافلہ.........

☆☆☆

مولانا عبدالوہاب حجازی

ایڈیٹر محدث بنارس

ایک ممتاز علمی وعملی شخصیت

عربی زبان کے مستند ادیب وصاحب قلم، ماہر استاذ، ادارۃ البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ کے نگراں ژرف نگاہ وجفاکش، مجلہ صوت الامۃ کے مدیر حضرت الاستاذ حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بڑی شخصیت تھے، علم کے ساتھ عمل کے دھنی تھے، دین اور جماعت سے محبت آپ کے قلب وضمیر کی گہرائیوں میں جاگزیں تھی، آپ کے خاندان میں علم، عمل اور جماعتی جذبہ نسلاً بعد نسل خیمہ زن تھا، آپ کا مولد شہر مئو دینی وعلمی وجاہت رکھنے والا شہر رہا ہے، صرف یہاں انیس تلامذہ سید نذیر حسین محدث دہلوی کے گزرے ہیں، پڑوسی شہر مبارکپور نے بڑے بڑے محدثین پیدا کئے، علم وثروت نے صدیوں سے اس ممتاز خطۂ ارضی کو اسلامی وسلفی تہذیب وتمدن اور معاشرت کا گہوارہ بنا دیا، موجودہ وقت میں ڈاکٹر صاحب اس مردم خیز علاقہ کی ایک نمائندہ شخصیت تھے اور جامعہ سلفیہ بنارس کو مقر عمل بنانے کے بعد آپ کے علمی وعملی فیوض کی اشاعت دور دور تک جاپہونچی۔

ڈاکٹر صاحب حافظ قرآن تھے، مدرسہ کے فاضل تھے، ازہر یونیورسٹی مصر اور مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے فیض یافتہ تھے، اس سے آپ کے علم وثقافت میں بڑی وسعت اور توازن تھا، مذکورہ بالا اداروں، ان کے اساتذہ وغیرہ سے آپ کی محبت اور تعلقات دم واپسیں تک تھے، اس کے ساتھ ہی دین اور جماعت سے محبت آپ کے خمیر میں تھی، آپ نے علمی فیض رسانی کے لئے اولاً فیض عام مئو کو منتخب کیا اور مصر سے واپسی کے بعد جامعہ سلفیہ آ گئے، علی گڈھ سے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد بھی آپ نے اسی جامعہ کو ترجیح دئے رکھا، ہمیں استاذ محترم کی یہ ترجیح دل سے پسند تھی، ظاہر ہے کہ اس میں دین، جماعت اور نئی نسلوں کی دینی و علمی تربیت کا پہلو بڑا اہم ہے۔

ڈاکٹر صاحب جامعہ سلفیہ میں آئے تو ہم لوگ یہاں پہلے سے زیر درس تھے، مضبوط پہلوانوں کی طرح گٹھا ہوا جوانی کا بدن، عصر کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ والی بال کھیلنے کے لئے کھیل کے لباس میں اترتے جو ڈھیلا ڈھالا سفید بشرٹ اور پتلون تھا، اس سے ہمیں جسمانی ورزش اور حفاظت صحت کی کھلی ہوئی تربیت ملتی تھی، طلباء کو بہت زیادہ باندھ کے رکھنا آپ کو پسند نہ تھا، اسے ان کی شخصیت وصلاحیت کے مختلف پہلوؤں کے نمو اور ارتقاء میں حارج سمجھتے تھے، لیکن اس کے معنی کھلی آزادی کے نہ تھے جس سے ان کی شخصیت کا خاصہ دینی پہلو فنا ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب ''نصاب تعلیم'' کی اصلاح پر بے حد توجہ دیتے تھے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جد وجہد کرتے تھے، ملک کے ماہر تعلیم علماء سے بھی مشورہ لیتے تھے، متعدد جامع ومفید کتابوں کی تلخیص کر کے انہیں شامل نصاب کرتے ، ائمہ متقدمین وغیرہ کی کتابوں کے ساتھ جدید دور کی لائق درس اہم کتابیں خاصۃً عقیدہ، نحو وصرف پر مصری یا سعودی علماء کی کتابیں شامل نصاب کرتے، یہ سب کچھ نئی نسلوں کے علمی، ثقافتی اور تربیتی معیار کو بلند اور وسیع کرنے کے لئے کرتے تھے۔

اس غرض سے کہ جامعہ سلفیہ، اس کے طلباء نیز دیگر مدارس اور نئی نسلیں جدید علمی وتعلیمی ودعوتی نشاطات و تحریکات سے آشنا و مستفید ہوں، ڈاکٹر صاحب جامعہ کی انتظامیہ کو اعتماد میں لے کر اپنی نگرانی میں سال بہ سال بارہا متعدد موتمرات وسیمینار منعقد کراتے رہے، جن میں سعودیہ عربیہ اور دیگر عرب ممالک کی علمی وتعلیمی ودعوتی شخصیات کے علاوہ ہندوستانی سرکاری یونیورسٹیوں کے پروفیسران اور ریسرچ اسکالر اور بڑے بڑے مدارس کے فاضل اساتذہ بڑی تعداد میں ذوق وشوق سے شرکت کرتے رہے، نئی نسلوں کے ذہنی، علمی وثقافتی آفاق کو وسعتوں سے ہم کنار کرنے میں یہ موتمرات وسیمینار بے حد مفید و موثر ثابت ہوتے تھے اور خود جامعہ سلفیہ علمی دنیا میں وسعت فکر وعمل کی حامل ایک نمائندہ تعلیم گاہ کی شکل میں نمایاں ہوتی تھی کہ اس میں وقت کے ساتھ چلنے اور زندہ کردار ادا کرنے کی تڑپ موجود ہے۔

استاذ گرامی ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا ایک امتیازی کارنامہ جس نے جامعہ سلفیہ کو دیگر مدارس اسلامیہ سے ممتاز کر دیا اور جوان کی ممتاز علمی وعملی شخصیت کا آئینہ دار ہے وہ جامعہ سلفیہ میں ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء کی علمی وعملی سرپرستی ہے ادارۃ البحوث نے آپ کی نگرانی میں بڑی ترقی کی، یہاں سے تین سو سے زائد کتابیں تصنیف وتالیف اور ترجمہ وطبع کے مراحل سے گزر کر علمی دنیا میں پہونچیں جو عربی، انگریزی اردو ہندی متعدد زندہ زبانوں پر مشتمل ہیں جس کی وجہ سے یہاں مکتبہ سلفیہ تجاریہ قائم ہوا اور جامعہ کے لئے ایک بابرکت مستقل ذریعہ آمدنی بن گیا، ڈاکٹر صاحب خود اپنی تصنیفات و مقالات کا بڑے پیمانہ پر شغل دوام رکھنے کے ساتھ بڑے اہتمام سے متعدد کتابوں کا مراجعہ کرتے اور یہاں سے طبع ہونے والی بیش تر کتابوں پر عرض ناشر تحریر فرماتے اور کتاب کی اہمیت کا تعارف اپنے قلم سے پیش کرتے۔ اس سلسلہ میں آپ کی عملی جزرسی کا یہ حال تھا کہ کسی کتاب کا مراجعہ ، پروف ریڈنگ، کاغذ، ٹائٹل، رنگ، تزئین، حروف کا سائز، نام اور دیگر امور آپ ہی کے ذریعہ سے طے پاتے تھے۔ ادارۃ البحوث سے دو مجلّے ''صوت الامۃ'' اور ''محدث'' برابر تا حال شائع ہوتے رہے اور دونوں میں ڈاکٹر صاحب نہایت پابندی سے اپنی قیمتی تحریریں اشاعت کے لئے دیتے تھے، صوت الامۃ تو برابر آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے۔

جامعہ سلفیہ کی خدمت کے لئے جب میرا معاہدہ

ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی آفس میں اپنی کرسی کے بغل میں میری کرسی میز لگوائی، اور میں ترجمہ وتصنیف کے عمل میں لگ گیا، بعد میں تدریس میں بھی لگا اور مقدمہ ابن خلدون اور جامع ترمذی پہلے سال میرے حصہ میں آئی، بعض دوستوں نے غالباً خوش ہوکر کہا کہ: آپ کو جامعہ میں پہونچتے ہی کرسی بھی مل گئی اور بڑی بڑی کتابیں تدریس کے لئے بھی مل گئیں، میں نے عرض کیا: ذلک فضل اللہ...... اس وقت سے لے کر اب تک میری متعدد نگارشات ادارۃ البحوث سے شائع ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ بیٹھ کر پوری کتاب کا مراجعہ کیا کرتے تھے میں ان کی اس شفقت اور قوت عمل پر ان کی عظمت کا اعتراف دل میں رکھتا تھا، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری صاحب جب سعودیہ عربیہ ملازمت کے لئے چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب کی ترجیح اور انتخاب سے مجھے محدث کی ادارت ملی، جامعہ سلفیہ کے ناظم اول مولانا عبدالوحید صاحب سلفی سے میرے قلمی ذوق وشوق کا بہتر تعارف کرایا۔ اپنے تعلق سے میں اسے استاذ گرامی کے حسنات میں شمار کررہا ہوں کہ اس سے اللہ نے مجھے بذریعہ قلم نئی نسلوں کی تربیت کا طویل عرصہ تک موقع عطا کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، استاذ گرامی کو اس کے اجر میں شریک فرمائے اور ذمہ داران جامعہ کو بھی۔

اللہ تعالیٰ آپ کی نیکیاں قبول فرمائے، لغزشوں سے درگزر فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

تعلیم اور تربیت

تربیت کو تعلیم کا مدخل اور بنیاد مانا گیا ہے، تربیت کے بغیر تعلیمی ڈھانچہ قائم نہیں ہوسکتا، تربیت کا اصل کام یہ ہوتا ہے کہ وہ افراد کو نفسیاتی، اخلاقی، عملی اور اعتقادی طور پر اس بات کے لئے تیار کرے کہ وہ عملی مادہ کو قبول کرسکے۔ تعلیمی مرحلہ میں انسان کو جو علم سکھایا جاتا ہے اسے بعد کے مرحلہ میں بارآور عملی شکل دینا مقصود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تعلیم وتربیت کے مابین ایک گہرا ربط ہے، اور یہ دونوں ایک عظیم مقصد کے لئے وسیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کے معاشرہ میں جو انتشار وانارکی پھیلی ہوئی ہے اس کا سبب یہی ہے کہ تعلیم وتربیت کے مابین فصل پیدا کردیا گیا ہے، تعلیم کو ترقی دی جارہی ہے، اور تربیت کے پہلو کو نظر انداز کیا جارہا ہے، مزید یہ کہ تعلیم اور تربیت دونوں کا جو مقصد ہے وہ نظروں سے بالکل اوجھل ہوگیا ہے۔

اگر کوئی انسان علم کے میدان میں شہرت و ناموری حاصل کرلے لیکن جھوٹ، خیانت اور بدکاری سے اپنے آپ کو دور نہ رکھ سکے تو ایسے انسان کی کیا قیمت ہوسکتی ہے؟ علم وتربیت کے مابین فصل کی وجہ سے یہ افسوسناک ومضحکہ خیز منظر سامنے آتا ہے کہ اخلاقیات ونفسیات کا مدرس کبھی کبھی ان تمام رذائل میں ملوث نظر آتا ہے جن کے خلاف وہ اپنے طلبہ کو درس دیتا ہے۔ آج علم کے مختلف شعبوں میں ہمارے پاس ماہرین کی قطعاً کمی نہیں، معاشیات، سماجیات اور نفسیات کے میدان میں بڑے بڑے ماہرین اور صاحب نظریہ افراد موجود ہیں، لیکن عملی میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس میں برابر اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے، اور یہی صورت حال یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ تربیت سے تعلیم کو علیحدہ کرنے کے بعد معیاری انسان کی تعمیر کا مسئلہ ناممکن بن جاتا ہے۔

مولانا مظہر علی مدنی
جامعہ فیض عام، مئو

استاذ محترم: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ

کچھ یادیں کچھ باتیں

سفر آخرت سے تقریباً پانچ ماہ پیشتر جون ۲۰۰۹ء کی ۶،۷ تاریخوں میں برادر محترم مولانا عبدالسلام صاحب سلفی امیر جمعیت اہل حدیث ممبئی نے اپنے آبائی وطن نوگڈھ (سدھارتھ نگر) کے علاقے، موہانہ چوراہا مہدیا وغیرہ میں دوروزہ دعوتی وتربیتی پروگراموں کا اہتمام کیا تھا جس میں شرکت وصدارت کے لئے استاذ محترم ازہری صاحب کو مدعو کیا تھا اور راقم کو بھی دعوتِ شرکت کے ساتھ ہدایت کی تھی کہ مئو سے ازہری صاحب کے ساتھ سفر کا پروگرام طے کرلیں، گویا اس سفر میں شرف معیت اور سعادت خدمت کا موقعہ فراہم کیا تھا۔ جزاہ اللہ خیرا۔ جسے بسروچشم قبول کرلیا، اور آپ کے اس علمی ودعوتی سفر میں جو غالباً آخری تھا، آپ کے ساتھ رہا۔ دورانِ سفر ہی آپ نے شکم میں کچھ تکلیف اور نظام ہضم میں کچھ خلل وپریشانی کا اظہار کیا، اور انتہائی احتیاط کے ساتھ خورد ونوش کی چیزیں لیں، تاہم پروگرام میں شراکت وحصہ داری حسب ترتیب رہی۔ کسی قسم کی معذرت اور تکلیف کا اظہار نہیں، بلکہ پوری آب وتاب اور قوت وتوانائی کے ساتھ حسب سابق علماء وعوام کو خطاب کیا، اور پروگرام کے مطابق بخیریت مئو واپسی ہوئی۔ کچھ دنوں بعد آپ بنارس چلے گئے تو دوایک بار مذکورہ سفر سے متعلق کچھ بات اور صحت کا حال معلوم کرنے کی بذریعہ موبائیل ہمت کیا، تو مرض شکم میں افاقہ کے ساتھ پیر (ایڑی) میں تکلیف بیان کیا، خلاف معمول لہجے سے صحت کے متعلق تشویش اور فکر مندی ظاہر ہورہی تھی، اتنی نرم اور پردرد گفتگو کبھی نہیں ہوئی تھی، مستقبل کا علم سوائے ذات باری تعالیٰ کے اور کس کو، بعد از مرگ اندازہ ہوا کہ جانکاہ مرض کی غالباً یہ ابتداء تھی، مگر آپ کی قوت ارادی، صبر وتحمل اور مسائل ومشکلات کو جھیلنے کی عادت، جس کے خوگر آپ زندگی کے ابتدائی مشکل دور اور ایام طالب علمی ہی سے ہوگئے تھے، اس نے اس مہلک مرض کو لوگوں کے سامنے اجاگر نہ ہونے دیا اور خود مرض کی اپنی طبیعت بھی ایسی ہی تھی، اس لئے اس حالت میں بھی تقریباً چار ماہ تک علم وفن کا یہ جبل اور حرکت وعمل کا یہ پیکر حسب معمول متحرک اور رواں دواں رہا، اور بظاہر چند ایام کی علالت کے بعد علم وفکر کا یہ آفتاب اچانک ۲۹/ اکتوبر کو غروب ہوگیا، (غفر اللہ لہ وجعل الجنۃ مثواہ) اور اپنے پیچھے ہزاروں، شاگردوں وعقیدتمندوں کو سسکتا بلکتا، جمعیت وجماعت

کو یتیم اور قوم وملت کو نڈھال چھوڑ گیا۔

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

موت کی آغوش میں سمانا تو ہر ایک ذی روح کا مقدر ہے اور یہ دار فانی محض رہ گزر ہے تاہم اس راہ سے گزرنے والے کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے انمٹ نقوش اور یادداشت پر لمبی لکیر چھوڑ جاتے ہیں اور ان کے گزرگاہ کی مہک تادیر باقی رہتی ہے، استاذ محترم کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی تھی، افسوس آج آپ ہمارے درمیان نہیں رہے، علم وفکر کی محفلیں سونی لگ رہی ہیں، مجالس علمیہ، سیمینار و کانفرنس کی صدارت بے وزن نظر آرہی، آپ کا جامعہ سلفیہ ویران وسنسان محسوس ہورہا ہے رب العالمین آپ کی وفات سے پیدا ہونے والے عظیم خلا کو پر کرنے کی کوئی سبیل پیدا فرمائے، (آمین)

مگر آپ کی یادیں تازہ ہیں، اعلی اخلاق وکردار کی بوفضا میں باقی ہے، علمی وفکری نقوش وکارنامے زندہ وتابندہ ہیں، آپ کے تلامذہ اور افاضل جامعہ جن کی تعداد ہزاری ہے، ان کا فرض ہے کہ آپ کی زندگی کے نمایاں ودرخشاں پہلوؤں کو حیطۂ تحریر میں لائیں تاکہ وہ دیگروں کے لئے مشعل راہ بن سکیں، قابل مبارکباد ہیں برادر محترم مولانا عبدالمنان صاحب سلفی، مدیر ماہنامہ ''السراج جھنڈا نگر'' کہ انھوں نے استاذ محترم کی یاد میں خصوصی شمارہ شائع کرنے میں سبقت کیا، علم دوستی اور احسان شناشی کا حق ادا کردیا، فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

دیگر تلامذہ ومعتقدین بھی، شرف تلمذ، احسانات وعنایات اور فیوض وافادات سے زیر بار، اپنے احساسات وخیالات کو حیطۂ تحریر میں لاکر اظہار عقیدت کے خواہاں وآرزومند ہوں گے، مگر کچھ تو خائف ہوں گے کہ قلم مشاق وسیال نہیں، زبان قندزدہ نہیں، شعور، پختگی تام نہیں، اس لئے جرح وتنقید کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے، بے شعوری وغلط بیانی کی نشاندہی ہو کوئی حرج نہیں، لیکن اجارہ داری کا زعم کسی کو نہیں ہونا چاہئے، بہر حال مشق تحریر وسخن کی کمزوری اور کچھ عدیم الفرصتی وبے بضاعتی کے سبب ہمت نہیں ہورہی تھی کہ کچھ صفحات سیاہ کئے جائیں مگر اللہ بھلا کرے مولانا عبداللطیف اثری مدیر افکار عالیہ کا کہ ان کے اصرار نے یہ چند سطور لکھنے پر مجبور ہی کردیا۔

استاذ محترم سے پہلی مرتبہ ملاقات ودیدار کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب موتمر الدعوۃ والتعلیم کے سال ۸۰-۱۹۷۹ء میں بغرض تعلیم جامعہ سلفیہ میں داخل ہوا، اس سے قبل ایام شعور میں دوران طالب علمی آپ کا ہم وطن ہونے کے باوجود اس کا اتفاق نہ ہوسکا، سبب آپ کا اکثر وطن سے دور اور میرا مشرقی علاقہ کا باشندہ ہونا، بہر کیف جامعہ میں چھ سالہ مدتِ تعلیم کے دوران قریب ودور سے دیکھنے وسننے اور کچھ کسب فیض کا موقعہ نصیب ہوا، مگر اس دوران آپ کی پروقار وجلالی اور بارعب شخصیت، نیز تعلیم وتربیت کے تعلق سے اصول پسندی اور اس کے سخت التزام کے سبب ابتدائی سالوں میں عام طلبۂ جامعہ کی طرح بہت

قریب ومانوس نہ ہوسکا، یہاں سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ وغیرہ میں تعلیم کے دوران اور واپسی کے بعد آپ کا سلوک ومعاملہ بالکل مختلف رہا، شفقت وعنایت، ذرہ نوازی وخورد نوازی کا تجربہ ہوا، جامعہ وطلبۂ جامعہ کے ساتھ آپ کے اخلاص ووفا اور دردمندی وفکر مندی کی بے نظیر صورتیں سامنے آئیں، اسی سے متعلق کچھ واقعات وتجربات کا ذکر اگر چہ خودستائی کے زمرے میں آسکتا ہے، مگر بر سبیل مثال وتذکرہ آپ کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کوئی قباحت نہیں، اس سے قبل آپ کے سوانحی خاکہ سے متعلق استدراکاً چند باتیں عرض کرنا مناسب وضروری معلوم ہوتا ہے۔

''السراج'' جھنڈانگر کے خصوصی شمارہ میں اس کے مدیر مسئول کے قلم سے درج ذیل باتیں ثبت ہیں۔

''جامعہ عالیہ عربیہ کے بعد مئو کے معروف دینی ادارہ جامعہ فیض عام میں داخل ہوئے، جہاں اگر چہ عالمیت تک کی تعلیم ہوتی ہے، لیکن یہاں ان کی تعلیم ثانویہ کے بعد منقطع ہوگئی'' مزید لکھتے ہیں:

''جامعہ اثریہ دارالحدیث میں تعلیم کے دوران ہی انھوں نے یوپی بورڈ سے، مولوی، عالم اور فاضل کی اسناد حاصل کیں''

معلوم نہیں مدیر مسئول کی پیش کردہ معلومات کا ماخذ کیا ہے، یہ کوئی تأثرات واظہار جذبات کے قبیل کی چیز نہیں کہ اسے فرد کی ذاتی رائے وخیال اور انفعال پر محمول کر کے صرف نظر کیا جائے، بلکہ ان باتوں کا تعلق حقائق ووقائع سے ہے جو بغیر استناد واستشہاد یا مشاہدہ کے ناقابل قبول ہے، اور اگر خلاف واقعہ وحقیقت سے متضاد بالخصوص جب کسی مسئول کے قلم سے ہو تو اس کی نشاندہی مناسب وضروری معلوم ہوتی ہے: کیونکہ ایسی باتیں اگر دستاویزی شکل اختیار کرلیں تو آئندہ قاری وناظر اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے مشکل کھڑی ہو جائے گی، اور وہ ان گتھیوں کو سلجھانے میں حیران وسرگرداں ہوگا، اور کچھ عجب نہیں کہ جمع وتطبیق کی صورت پیدا کرنے میں اسے سیکڑوں صفحات سیاہ کرنے پڑیں اور کسی یونیورسٹی سے اسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کردی جائے۔

بہر حال مدیر موصوف کے قلم سے درج مذکورہ تینوں باتیں خلاف واقعہ وحقیقت ہیں، مدارس اہل حدیث ہند کی تاریخ پر نظر رکھنے والے سے یہ مخفی نہیں کہ رحمانیہ دہلی کے بعد اور قیام جامعہ سلفیہ سے قبل جامعہ فیض عام ہی کو مرکزی حیثیت حاصل تھی، اور ازہری صاحب مرحوم کے دور میں وہ ماہرین اساتذہ کا مرکز اور طالبان علوم دینیہ کا ملجا وماویٰ تھا، اور تعلیم عالمیت تک نہیں بلکہ فضیلت ودورۂ حدیث تک ہوتی تھی، جو آج بھی بہ تسلسل جاری ہے، متوسطہ وثانویہ وعالمیت وغیرہ کے نام سے مراحل تعلیم کی تقسیم دور متاخر کی ایجاد ہے۔

دوسری بات یہ کہ جامعہ فیض عام میں علامہ مرحوم کی تعلیم ثانویہ تک منقطع نہیں ہوئی بلکہ فضیلت کے آخری

سال (آٹھویں جماعت/ دورۂ حدیث) تک جاری رہی، ہاں اسی سال آپ کسی وجہ سے دارالحدیث چلے گئے اور چند ماہ رہ کر فراغت کی رسم پوری کی، اور پھر لوٹ کر فیض عام آئے اور جامعہ ازہر، مصر جانے سے قبل کچھ عرصہ تدریسی خدمات انجام دیا۔

تیسری بات یہ کہ یوپی بورڈ کے امتحانات: مولوی، عالم، فاضل، جامعہ اثریہ سے نہیں بلکہ سارے امتحانات جامعہ فیض عام کے ریگولر طالب علم کی حیثیت سے آپ نے دوران تعلیم دیئے اور اسناد حاصل کیا، جس کی تفصیل آج بھی جامعہ فیض عام کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، جو درج ذیل ہے۔

مقتدیٰ حسن پسر محمد یاسین،

تاریخ پیدائش: ۸/ اگست ۱۹۳۹ء

امتحان	تاریخ امتحان	رول نمبر	نتیجہ
۱۔ مولوی (معقولات)	۱۹۵۹ء	۱۳۷	فرسٹ
۲۔ عالم	۱۹۶۰ء	۱۱۱	فرسٹ
۳۔ فاضل (دینیات)	۱۹۶۲ء	۱۸	سکنڈ

مذکورہ ان تینوں باتوں کی تصدیق وتصحیح محترم مدیر مسئول ہی کے ادارہ میں موجود مفتی وشیخ الحدیث مولانا عبد الحنان فیضی صاحب/ حفظہ اللہ کی طرف مراجعت سے ہوسکتی ہے جو ہمارے ممدوح مرحوم کے جامعہ فیض عام میں معاصر وچشم دید گواہ رہے ہیں۔

اپنے وطن مئو میں تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ تدریس وتعلیم کے لئے مدرسہ اسلامیہ، بھوارہ مدھوبنی بھی تشریف لے گئے، مگر کچھ ہی دنوں بعد مئو واپس لوٹ آئے اور جامعہ فیض عام میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، یہاں تک کہ جامعہ ازہر، مصر جانے کی راہ نکل آئی۔

جامعہ ازہر سے واپسی کے کچھ دنوں بعد جماعت اہل حدیث کی مرکزی درسگاہ جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس کے دور اندیش وحلیم الطبع ناظم مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور جامعہ کو اپنا مستقر عمل بنایا تو پیمان وفا اس سے ایسا باندھا کہ اخیر دم تک اسی کے ہو کر رہ گئے، سرد وگرم، موافق ونا موافق حالات بھی پیدا ہونے لگے مگر پیمان وفا ٹوٹنے نہ پایا، نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ، نہ استغلال واستحصال کی فکر، حیلہ سازی، خلوص وللّٰہیت اور بے لوثی کے ساتھ خدمات انجام دیتے رہے، اور اپنی ساری علمی استعداد وصلاحیت اور قوت وتوانائی جامعہ کے لئے وقف کر دی، پوری جانفشانی وقربانی کے ساتھ جامعہ کی تعمیر وترقی میں لگ گئے، چنانچہ جامعہ نے قلیل مدت میں تعمیر وترقی کے جو مراحل طے کئے، معیار ومقام حاصل کیا، اندرون وبیرون ملک جو پہچان بنائی اس میں مخلص ناظم جامعہ مولانا عبد الوحید مرحوم کے ناخن تدبیر کے ساتھ، ازہری صاحب مرحوم کا خون جگر شامل ہے، جس کا کوئی انصاف پسند انکار نہیں کرسکتا۔

جامعہ سلفیہ جس کا وجود وقیام ہی سلفیان ہند کے مرکز کے طور پر ہوا تھا، اس کے اندر ایک ماہر وکامیاب

مدرس ومربی کے علاوہ آپ کا منصب خواہ کچھ بھی رہا ہو، وکیل الجامعہ، موسس ومدیر ادارۃ البحوث الاسلامیہ یا رئیس الجامعہ، آپ کا کردار امور جامعہ میں ہمیشہ مرکزی وکلیدی رہا، نصاب ونظام تعلیم کا مسئلہ، طلبہ جامعہ کی فکری وعملی تربیت، عرب جامعات میں فضلاء جامعہ کا داخلہ، سلفیان عالم سے رابطہ وتعاون، اندرون وبیرون ملک جماعت و جامعہ کی نمائندگی، سلفی فکر ودعوت کی اشاعت اور باطل افکار ومذاہب کے ردودفاع عن مسلک سلف کا معاملہ ہو، تصنیف وتالیف اور ترجمہ وتحقیق کی ضرورت، جامعہ جماعت کے اکلوتے (اپنے وقت میں) عربی مجلہ صوت الامۃ کی ادارت واشاعت، غرض تعمیر وترقی کا جو بھی میدان ہو، آپ کا رول قائدانہ ورائدانہ ہی رہا۔ اور اسی ہمہ جہت علمی استعداد و صلاحیت اور کارکردگی کی بدولت ہی جامعہ کی پہچان اور نشان بن گئے تھے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا مشکل ہے۔

اہداف جامعہ کا حصول ہی آپ کی زندگی کا اہم ہدف اور نصب العین بن گیا تھا، ان کی بس یہی آرزو اور تمنا تھی کہ سلفیان ہند کا یہ مرکز اپنا مرکزی کردار ادا کرے، اور اسی کے معیار سے طلبۂ جامعہ کی تعلیم وتربیت ہو، تاکہ وہ مرکزی سلفی درسگاہ کی پہچان اور کتاب وسنت کے علمی وعملی اعتبار سے حقیقی وصحیح ترجمان بنیں۔ اس کے لئے وہ جو بھی جتن کرسکتے تھے کیا اور جو تدبیر وترکیب ممکن ہوسکتی تھی اسے اختیار کیا۔

درسگاہ کے اندر یا باہر ہر جگہ طلبہ پر نظر رکھتے اور انھیں اپنے اعلیٰ معیار وانداز پر نہ پاکر نصیحت وفضیحت کرتے، پھٹکار بھی لگاتے اور ارشاد ورہنمائی بھی، اور اچھے عمل کی حوصلہ افزائی بھی کرتے، علمی افادہ وافاضہ میں کبھی بخل وہچکچاہٹ نہیں ظاہر کرتے، بلکہ باذوق وہنرمند طلبہ کو فیضیاب کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے، جامعہ میں موجود رہتے تو طلبہ کی انجمن ندوۃ الطلبہ کے ہفتہ وار اجلاس خطابت میں شرکت وصدارت سے گریز نہ کرتے اور اس موقعہ سے اپنے صدارتی کلمات میں طلبہ کی لفظی اور فنی غلطیوں کی نشاندہی کے ساتھ عام ہدایات فرماتے، لگتا ایسا کہ انھیں طلبہ سے روبرو ہونے کا انتظار تھا، آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ طلبہ درسگاہ سے باہر اور ندوۃ الطلبہ کے پروگرام کے علاوہ بھی بغیر کسی قید وپابندی کے آزادانہ طور پر عربی بول چال اور ترجمہ وتعبیر کی مشق کریں، آپ سے اور دیگر اساتذۂ جامعہ سے استفادہ کریں، چنانچہ جب کبھی باذوق طلبہ اس کے لئے اختیاری مجلس النادی الثقافی کے نام سے منعقد کرتے تو اس میں بالعموم تشریف لاتے، عذر و موانع کی صورت میں کسی دیگر استاذ کو نیابۃً مکلف کرتے، فضیلت سال آخر میں النادی الثقافی کی ذمہ داری راقم کے سر تھی، اس کا تجربہ خود مجھے ہے، معلوم نہیں فراغت کے بعد کب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

جامعہ سے محبت اور اس کی تعمیر وترقی میں لگن، طلبۂ جامعہ کی تعلیم وتربیت پر توجہ آپ کی انھیں خوبیوں میں سے ایک ہے جو آپ کو دیگر اساتذہ واہالیان جامعہ سے ممتاز

کرتی ہے، خدمات جامعہ میں خلوص وللہیت اور بے لوثی کے ساتھ آپ کے دعوتی کاموں کے اندر بھی یہی چیز آپ کا نمایاں وصف ہے اس سے متعلق کچھ واقعات وتجربات بطور مثال ہدیۂ قارئین ہے۔

جامعہ کی ترقی وبرتری کے لئے ہمیشہ کوشاں وفکر مند رہنا عام سی بات تھی، طلبۂ جامعہ کا کسی بھی علمی میدان و مسابقہ میں بیک فٹ پر رہنا انھیں قطعی گوارا وقبول نہ تھا، جامعہ سے راقم کی فراغت کے بعد غالباً ۲۰۰۶ء میں مدینہ یونیورسٹی نے اپنے اساتذہ ومشائخ کو جامعہ سلفیہ بھیج کر وہاں عربی زبان واسلامی ثقافت کی تعلیم کے لئے ایک ماہ کا ٹریننگ کورس (دورۂ تدریبیہ) قائم کیا تھا، جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کورس تھا، جو بعد کے سالوں میں بھی جاری رہا، اس میں بلا تفریق مسلک جملہ مدارس کے محدود و منتخب فارغین ومراہقین کو شرکت کی اجازت تھی، اس کورس میں شریک ایک دوسرے مدرسہ کے طالب علم نے نماز بعد عربی زبان میں دس بارہ منٹ کی تقریر کرنے میں پہل کی، اور عرب مشائخ کو اچھا تأثر دیا، طلبۂ جامعہ سلفیہ کے سبقت نہ کرنے پر استاذ محترم بے چین وپریشان نظر آئے، چنانچہ دورۂ تدریبیہ میں شریک چند متفوق طلبۂ جامعہ کو آفس میں طلب کیا، اور انتہائی درد بھرے انداز میں خطاب کرتے ہوئے جامعہ کے مقام ومرتبہ کی دہائی دی، ہماری غفلت وسستی پر مشفقانہ سرزنش کی، اور دوسرے مدرسہ کے طالب کی سبقت پر ہماری غیرت کو جوش دلایا، چنانچہ استاذ محترم کی اس مشفقانہ ومخلصانہ نصیحت وفضیحت کا یہ اثر ہوا کہ لائن حاضر ان طلبہ نے مستعدی اور باہمی تعاون سے اس کے بعد میدان کسی اور کے ہاتھ جانے نہیں دیا، پھر غلبہ وسبقت کا پلرا ہمیشہ جامعہ ہی کے نام رہا، جس سے آپ بہت خوش اور مطمئن ہوئے، تحسین وتبریک سے نوازا حتی کی دورہ کے اختتامی پروگرام میں کلمة الطالب والجامعة السلفية، عربی زبان میں تیار کرکے اپنی نگرانی میں پیش کرنے کی ذمہ داری راقم کے سر ڈال دیا، اور اختتام دورہ پر آپ کے منشاء کے مطابق بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبۂ جامعہ کو اپنی طرف سے خصوصی نقد انعام سے بھی نوازا۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء وجعل الجنة مثواہ۔ (آمین)

طلبۂ جامعہ کی تربیت ورہنمائی اور حوصلہ افزائی و قدر افزائی حدود جامعہ کے اندر ہی محدود نہ تھی بلکہ اس سے باہر بھی جب موقع مناسب دیکھتے تو جیہ وارشاد کا کام کر جاتے، مدینہ یونیورسٹی میں فضلائے جامعہ کی ایک معتد بہ تعداد تھی آپ سعودی عرب کے سفر پر ہوتے تو مصروفیت کے باوجود بھی فضلائے جامعہ کے ساتھ بالخصوص اور سلفیان برصغیر کے ساتھ بالعموم علمی نشست وگفتگو کے لئے ان کی درخواست قبول کر لیتے اور اپنے خطاب وافادات سے نوازتے۔

آپ کو اپنے چمنستان علم سے ویسے ہی قلبی لگاؤ اور تعلق تھا جیسے ایک مالی وباغباں کو اپنے باغ وچمن سے، جس طرح چمن میں کھلتی کلی کو دیکھ کر اور باغ میں درخت بارآور دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں، ویسے ہی آپ اپنے کسی شاگرد وفاضل جامعہ کی ادنی سے ادنی علمی کاوش کو

دیکھ کر شاداں وفرحاں ہوتے اور بلا تکلف اس کی اس طرح حوصلہ افزائی وقدر افزائی کرتے کہ جامعہ میں دوران طالب علمی ان کی پروقار وجلال اور بارعب شخصیت افق ذہن پر طلوع ہوکر حسرت واستعجاب میں ڈال دیتی۔

ایک مرتبہ ''سقط'' کے موضوع پر عربی زبان میں ایک مقالہ لکھ کر بنارس آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ''صوت الأمۃ'' میں شائع ہوجائے اور جدید موقف کے تعلق سے اہل علم وتحقیق کا نقطۂ نظر سامنے آجائے، آپ آفس میں حسب معمول تحریر ومطالعہ میں مصروف تھے، بہرحال سلام ودعا کے بعد مقالے پر سرسری نظر فوراً ڈالا اطمینان وخوشی کا اظہار کیا اور پھر آپ نے تصنیف وتالیف، ترجمہ وتحقیق وغیرہ کے لئے جو خاکہ اور اشاریہ درج رجسٹر کر رکھا تھا، الماری سے نکال کر سامنے رکھ دیا اور کہا دیکھو یہ سب کام کا میدان ہے، بعجلت تمام ان پر نظر ڈالا اور ورق گردانی کیا، جس سے اندازہ ہوا کہ آپ کے پاس کتاب وسنت کی نشر واشاعت، دفاع عن الاسلام اور منہج سلف کی تعمیم کے لئے ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے تحت کتنا وسیع وعظیم علمی منصوبہ وخاکہ تھا، اللہ تعالیٰ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوئی سبیل پیدا فرمائے۔ (آمین)

بات منہج سلف کی آئی تو جامعہ سلفیہ میں وقت گزرنے کے ساتھ آپ کی زندگی وتحریر میں سلفی منہج اور سلفیت پر ارتکاز پچھلے ادوار کی بہ نسبت بڑھتا گیا، اور سلفیت اپنی پوری وسعت واعتدال کے ساتھ آپ کا نمایاں وصف بنتی گئی، مرکزی سلفی درسگاہ کی رئاست اور جمعیت وجماعت کی بالواسطہ وبلا واسطہ قیادت کا تقاضا بھی یہی تھا، چنانچہ آپ نے ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے پروگرام میں سلفی فکر ومنہج کی اشاعت کو اولین ترجیح دی، اسی لئے محض تالیف وتصنیف کے بجائے عربی، اردو، وفارسی سے ترجمے بھی کثرت سے نظر آتے ہیں، کیوں کہ مقصد مؤلف تالیفات کثیرہ بننا نہ تھا، بلکہ سلف کے علمی میراث سے افادۂ عام نیز برصغیر کے سلفی علماء کی خدمات علمیہ سے عرب دنیا کو متعارف کرانا بھی مقصود تھا۔

سلفی فکر ومذہب کی اشاعت، باطل افکار مذاہب اور بدعات کی تردید وتکذیب کو مستلزم ہے اس لئے آپ باطل تحریر وتحریک کے تعلق سے بھی انتہائی حساس تھے، اور کل جدید لذیذ کے پیش نظر بالخصوص طلبہ کو اس سے آگاہ کیا کرتے تھے، اور آپ کی تحریر اور اداریے میں خود اس پر نوٹس ہوتے۔

چند سال پیشتر سیتاپور کے ایک دانشور ڈاکٹر غافل انصاری صاحب نے دادا کے ترکہ سے محجوب پوتوں کی وراثت کے مسئلہ میں سلف کے متفق علیہ مذہب سے بغاوت اور منکرین حدیث کی ہمنوائی کرتے ہوئے اپنے مضامین متعدد جرائد ومجلات میں شائع کرا کر چیلنج کیا تو اس کے رد میں اور سلف کے دفاع میں کچھ لکھنے کی توفیق ہوئی، جواب درجواب تحریریں آئیں بالآخر مکتبۃ الفہیم کے مالکان کی خواہش پر کتابی شکل دے دی گئی، توثیق وتائید کے لئے مرحوم ازہری صاحب سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی گئی، تو آپ نے قدر واحترام اور امید افزا وحوصلہ افزا کلمات پر

مشتمل طویل ووقیع مقدمہ لکھا، جس کے کچھ اقتباسات نقل کئے جائیں تو خودستائی واپنی مدح سرائی ہوگی، لیکن اتنا عرض ضرور ہے کہ آپ نے صرف ورق گردانی کر کے یا نظر عنایت فرما کر تبرکاً یا تکریماً کچھ نہیں لکھ دیا، بلکہ علم وتحریر جو ایک امانت ہے، اس کے تقاضہ کے مطابق بالاستیعاب حرفاً حرفاً پڑھ کر اظہار خیال کیا، یہی حال دیگر مؤلفین ومترجمین کی کتابوں پر آپ کے مقدمات وتقریظات کا ہے کہ آپ دیگر معاصر اکابرین کے طرز پر صرف لمس ونظر کی برکت نہیں عطا کرتے ہیں، بلکہ گہری نظر ڈال کر ہی تقدیم کرتے ہیں، اسی لئے آپ کے بہت سے مقدمات ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جامعہ سلفیہ کی تعمیر وترقی، طلبۂ جامعہ کی تعلیم و تربیت اور تحریر وصحافت میں جان سپاری وجانفشانی کے ساتھ اخلاص وبے لوثی کی جھلک اور دنیاوی ومادی اغراض ومقاصد سے دوری نظر آتی ہے، وہی خلوص وبے لوثی آپ کی تقریر وخطابت ودعوتی اسفار میں بھی نظر آتی ہے، جو آپ کو بہت سے دیگر علماء معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، آج کل کسی دعوتی اجلاس وعلمی پروگرام میں شرکت کے لئے نذرانہ ونخرانہ اور طویل اخراجات کی شرط ومطالبہ ایک عام اور معروف بات ہوگئی ہے، لیکن استاذ محترم ان امور سے کوسوں دور تھے، تقریر و خطابت اور دعوتی اجلاس کے استحصال سے آپ گریز کرتے، یہ سب چیزیں آپ کی طبیعت ومزاج کے خلاف تھیں، خطبۂ جمعہ وعیدین بالعموم آپ کے معمولات میں سے تھے، علمی ودعوتی پروگراموں میں شرکت وصدارت کے لئے حسب فرصت واہمیت وضرورت سفر بھی کیا کرتے تھے، مگر آپ کا معاملہ یہی تھا کہ **قل مااسألكم عليه اجرا ان اجرى الا على الله رب العٰلمين.**

مئو میں قیام کے دوران آپ اکثر خطبۂ جمعہ اپنے گھر سے قریب مغربی علاقہ کی مسجدوں میں دیا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے مشرقی علاقہ میں صدر چوک پر واقع جامع فیض عام میں خطبۂ جمعہ کے لئے درخواست کیا تو قبول کرلیا، آپ کی سہولت اور خدمت استاذ کے پیش نظر میں نے آٹو رکشہ سے آمدورفت اور دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا کہ آج مجھے یہ سعادت حاصل ہوگی، مگر اے بسا آرزو کہ......رکشہ سے تنہا آئے اور نماز جمعہ کے بعد فوراً تنہا ہی واپس چلے گئے، نہ مصاحبت نہ ضیافت، ان امور سے سختی سے انکار ومعذرت کیا اور فرمایا کہ خطبۂ جمعہ کے لئے یہ سب لوازم نہیں، کسی اور موقعہ سے۔

اسی قسم کا تجربہ نوگڈھ کے اس سفر میں بھی ہوا جو سفر آخرت سے تقریباً پانچ ماہ قبل آپ کی معیت میں ہوا تھا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایسے پیکر علم وعمل واخلاص ووفا قائد ورہنما کی جدائی یقیناً جماعت وملت کے لئے ایک عظیم خسارہ ہے، پروردگار آپ کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور آپ کی مغفرت ورفع درجات کا ذریعہ بنائے، (آمین)

☆☆☆

مولانا عبدالرزاق عبدالغفار سلفی
دبئی، متحدہ عرب امارات

بجھ گیا، علم کا، حکمت کا، دانش کا چراغ

۱۹۳۹ء - ۲۰۰۹ء

جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس، عالم اسلام کی معروف عظیم دینی درسگاہ جس کے متعلق ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر فضا ابن فیضی رحمہ اللہ نے سچ کہا تھا:

بلاغت ومعانی وبیان کا گل کدہ ہے یہ
عرب کے طرز فکر سے عجم کا رابطہ ہے یہ

آج اسی کے صدر، برصغیر ہندو پاک میں عربی زبان وادب کے صف اول کے ادیب، انشاء پرداز، صحافی، مولف و مصنف اور مترجم عربی زبان کی خدمات کے صلہ میں صدر جمہوریہ ہند کے ایوارڈ یافتہ اور جامعہ سلفیہ بنارس سے تقریباً چالیس سال سے شائع ہونے والا عربی ماہنامہ "صوت الامۃ" کے رئیس التحریر استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ ہم سب سے جدا ہوگئے جن کے جانے سے علم وادب کا ایک ستون گر گیا۔ فکر وفن اور تہذیب تمدن کا چمن اجڑ گیا۔ ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

یہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک زبردست علمی اور قلمی خسارہ ہے جس کی تلافی بظاہر ناممکن نظر آتی ہے دل ودماغ ششدر اور حیران بن کر رہ گئے ہیں، اس لئے نہیں کہ موت نے انھیں اپنی آغوش میں لے لیا، موت تو ہر ایک کو آنی ہے، البتہ جس تیزی سے بیماری نے ان پر حملہ کیا اور پھر آناً فاناً چل بسے، اس پر چشم حیران اور دل حزیں ہے۔

چشم حیران، دل حزیں، افسردہ چہرہ گنگ لب
دیکھ لے دنیا ہمارے ضبط کا پیمانہ آج

اور صرف اتنا ہی نہیں کہ ہم لوگ ہی ماتم کناں ہیں، بلکہ جامعہ سلفیہ بنارس کے درودیوار اداس ہیں اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں:

جس کو اس کے عزم نے سینچا تھا اپنے خون سے
ہوگئی وہ بزم علم آہ! پھر ویرانہ آج

طلبہ اداس ہیں، اساتذہ اداس ہیں، کارکنان اداس ہیں ارکان جامعہ اداس ہیں اور۔

آپ کی بزم میں سب کچھ ہے مگر داغ نہیں

متوسط قد، مناسب بدن، گندمی رنگ، نگاہیں تیز، دانائی ودوراندیشی، معاملہ فہمی، حسن تدبیر، حسن تدبر، مزاج میں شائستگی، استقلال اور ٹھہراؤ، طبیعت میں پاکیزگی ونفاست، اصول اور قوانین اور وقت کی پابندی، گفتگو میں نرمی ومتانت، لب ولہجہ محبت آمیز، دفاع حق میں جسور وغیور، چلنے میں نگاہیں نیچی اور پروقار، کشادہ پیشانی، بارعب چہرہ، کبھی کبھی زیرلب مسکراہٹ، گھنی داڑھی، ظرف ونظر میں وسعت، کبھی سر پر گول ٹوپی کبھی مخملی، یوپی کا مشرقی

لباس کرتا پائجامہ اور شیروانی زیب تن، علمی رکھ رکھاؤ اور وضع داری، اسم با مسمیٰ یہ تھے ہمارے استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے ناظم اول مولانا عبدالوحید عبدالحق سلفی رحمہ اللہ کی دور بینی اور مردم شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی نظر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جیسے دانا وبینا اور دور اندیش ومعاملہ فہم شخص پر پڑی اور پھر منتخب کرلیا اور جامعہ سلفیہ بنارس کے تمام خارجہ امور کو ان کے ہی سپرد کردیا، تاکہ وہ اپنے حسن کے تمام خارجہ امور کو ان کے ہی سپرد کردیا، تاکہ وہ اپنے حسن تدبر وتدبیر سے جامعہ کے خاکوں میں مناسب رنگ بھر سکیں اور اس کے مستقبل کو روشن بنا سکیں۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
(اقبال)

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ میں بڑائی تھی دانائی تھی، یہی وجہ ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس کو مرکزی مقام دلانے میں، خواہ اندرون ملک کا معاملہ ہو یا بیرون ملک کا، اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا مرکزی کردار رہا ہے، بڑی لگن اور خلوص سے جامعہ کے کاز کو آگے بڑھانا، لوگوں سے رابطے پیدا کرنا اور پھر ان سے خط وکتابت کرنا، ہر ماہ "صوت الامۃ" میں نئے نئے مضامین شائع کرکے عالم اسلام میں پھیلانا اور جامعہ سلفیہ کے نام کو روشن کرنا، اس کے مورال کو بلند کرنا اور اردو صحافت کے ساتھ ساتھ عربی صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کرنا، یہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی انتھک اور بے لوث کوششوں کے نتیجہ میں ہی ہوسکا۔

ڈاکٹر عبدالعلیم ازہری بستوی حفظہ اللہ کے الفاظ میں:

ہمارے بزرگ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری حفظہ اللہ (رحمہ اللہ) کی ذاتی کوششوں اور دلچسپی سے مرکزی دارالعلوم نے تصنیف وتالیف کے میدان میں کسی حد تک اور نشر واشاعت کے میدان میں قابل ذکر حد تک ترقی کی ہے، لگ بھگ پچیس سال (چالیس سال) سے صوت الامۃ کی تحریر وادارت اور متعدد علمی سیمیناروں اور کانفرنسوں کے انعقاد کا سہرا بھی انہیں کے سر جاتا ہے۔ (التوعیہ نئی دہلی ستمبر ۱۹۹۴ء ص ۸)

اردو صحافت کا معاملہ رہا ہو یا عربی صحافت کا آپ نے دونوں زبانوں سے ملت اسلامیہ کو بھرپور فائدہ پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ تقریباً چالیس سال تک تصنیف وتالیف، ترجمہ وانشاء اور عربی واردو صحافت کے میدان میں اپنے قلم کی جولانیاں دکھاتے رہے، ادب کے شہ پارے بکھیرتے رہے، علم کے موتیوں کو لٹاتے رہے، فکر ونظر اور علم وفن کا دریا بہاتے رہے اور کبھی اکتاہٹ اور تھکاوٹ محسوس نہ کی، ہر ماہ "صوت الامۃ" عربی اور ماہنامہ "محدث" اردو کے اکثر شماروں میں اپنی علمی نگارشات پیش کرتے رہے، ملت اسلامیہ پر اگر کوئی افتاد آئی یا ملت اسلامیہ کسی مشکل سے دوچار ہوئی تو ان کے دل پر جو گزرتی رہی اسے رقم کرتے رہے۔

ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
(فیض)

قلم وقرطاس کے ساتھ ساتھ تدریسی فرائض بھی انجام دیتے رہے، ہندو بیرون ہند میں اصحاب علم وفضل سے خط وکتابت کا سلسلہ بھی چلتا رہااور کبھی کبھار دورے بھی کرتے رہے، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں کرسی صدارت کی زینت بھی بنے اور خطبۂ صدارت بھی پیش کرتے رہے، جمعیت وجماعت اور طلبہ ومدرسین کواہم تجاویز وقیمتی مشورے دیتے رہے اور جمعیت و جماعت کی حدی خوانی بھی کرتے رہے، ملت اسلامیہ کے چاک سینوں کے زخموں پر مرہم بھی رکھتے رہے، خلیجی بحران پر تبصرے کرتے رہے اور عالمی سیاست کے گیسو بھی سنوارتے رہے، نام نہاد اور شرپسند مصنفین کی خبر بھی لیتے رہے اوران تک دعوت حق کا پیغام بھی پہنچاتے رہے، لیکن کسی موڑ اور کسی بھی اسٹیج پر وقار ومتانت اور سنجیدگی کا دامن نہیں چھوڑا۔

زباں سخن کو سخن بانکپن کو ترسے گا
سخن کدہ مری طرز سخن کو ترسے گا
(ناصر کاظمی)

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا ہر تجزیہ بصیرت افروز و جامع، ہر تحریر پروقار ومتوازن، ہر تقریر پر مغز ومعتدل اور ہر مشورہ پر کیف ودل کشا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مفکر جماعت وملت بن گئے تھے۔ان کی سوچ اور غور فکر کا پیمانہ بہت وسیع تھا اور ملت اسلامیہ کے تمام مسائل پر محیط تھا، اگر وہ کچھ سوچتے تھے تو ملت اسلامیہ کی بہبود وفلاح اور اس کی مشکلات کے حل کے بارے میں سوچتے تھے، اس بات کی شہادت ان کے وہ مقالات اور مضامین دیں گے جو مختلف صحف ومجلات اور اردو عربی کے رسائل وجرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ ایک عظیم دانشور اور ایک عظیم بالغ نظر صحافی تھے، ان کی صحافت چالیس سال کے طویل عرصہ پر محیط ہے، میرے اپنے اندازے کے مطابق تقریباً پانچ ہزار صفحات پر ان کے مقالات بکھرے پڑے ہیں اور یہ مقالات ان تقدیم وتقریظ، اداریوں، تصنیف وتالیف، عرض ناشر، ترجمہ وانشاء اور خطبۂ صدارت کے علاوہ ہیں، جو آپ سیمیناروں اور کانفرنسوں میں پڑھا کرتے تھے۔

چنانچہ "صـــوت الامة" سے لے کر ہندوستان کے مختلف رسائل وجرائد میں آپ کے قیمتی مقالات ہر ماہ چھپتے رہتے تھے، مثال کے طور پر ماہنامہ "محدث" بنارس جریدہ "ترجمان دہلی، افکار عالیہ مئو، آواز ملک بنارس اور راشٹریہ سہارا لکھنؤ وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ میدان صحافت میں خوب خوب اپنے جوہر اور قلم کی جولانیاں دکھلاتے رہے اور ایک بامقصد صحافت کو گلے لگائے رکھا اور صحافت برائے شہرت کی ہمیشہ تردید کی، ان کی صحافت بامقصد تھی اور اس کے لئے پوری زندگی وقف کررکھی تھی، عالمی صحافت کے انحراف اور بے راہ روی پر کڑی تنقید کرتے تھے اوران کو درست وصحیح راہ کی طرف راہنمائی بھی کرتے تھے، آپ کے مقالات ومضامین میں تنوع اور گہرائی ہوا کرتی تھی، ٹھوس علمی مواد، ادبی چاشنی اور انشاء پردازی کے جوہر بھی دیکھنے میں آتے

تھے، ان تمام مقالات کو یکجا کرنا امر دشوار ہے اور دقت طلب بھی، (۱) بس چند مقالات کے عناوین کے ذکر پر اکتفا کروں گا جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے علم وفکر میں کتنی گہرائی تھی اور ان کی نگاہیں کہاں تک دیکھ لیا کرتی تھیں۔

مقالات کے چند عناوین کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ عصر حاضر میں اسلام کا تعارف، تقاضے اور امکانات۔
۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب۔
۳۔ اسلامی ضابطۂ اخلاق اور ہمارا سماج
۴۔ مدارس اسلامیہ کا نصاب اور معیار تعلیم
۵۔ ملی ترقی کے تقاضے
۶۔ انسانیت کی بے کسی، اسلحہ کی عالمی تجارت کے تناظر میں
۷۔ انسانیت کی بہی خواہی ہمارا فرض ہے
۸۔ اسلحہ بندی کا یہ عمل کہاں لے جائے گا
۹۔ فکری انتشار سے بچنے کی ضرورت ہے
۱۰۔ امریکہ کے حادثہ پر عرب صحافت کا ردعمل
۱۱۔ ملک کی تعمیر وترقی اور جمہوری اقدار کا تحفظ
۱۲۔ تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
۱۳۔ حقوق انسانی کا تحفظ اور بڑی طاقتوں کی آویزش
۱۴۔ انسانی بنیاد پر باہمی تعلقات کی استواری
۱۵۔ افغانستان پر امریکی حملہ اور اہل نظر کے اندیشے

استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کے مقالات کے یہ چند عنوانات ہیں:

نرم ہے برگ سمن، گرم ہے میرا سخن
میری غزل کے لئے ظرف نیا چاہئے
(ناصر کاظمی)

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی عبارتوں کو نقل کرنا اور پھر ان پر تبصرہ کرنا طوالت کا باعث ہوگا اس لئے چند مقالات کی چند عبارتیں پیش کرکے رخصت ہو جاؤں گا۔ ان شاء اللہ۔

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی تحریر حق گوئی، جرأت، جذبہ ایمانی اور توازن سے بھرپور ہوتی تھی، تملق، چاپلوسی اور مداہنت سے کوسوں دور رہتے تھے، چنانچہ اپنے ایک مضمون ''انسانیت کی بہی خواہی ہمارا فرض ہے'' میں یوں لکھتے ہیں:

''اہل باطل جب باطل پرستی کے سہارے اور باطل کی سربلندی کے لئے اپنا کام کرنے کی جرأت رکھتے ہیں تو اہل حق کو حق کی حمایت اور انسانیت کے احترام وتحفظ کے لئے اس سے زیادہ جرأت پیدا کرنے کی ضرورت ہے؛ ہم باطل پر نہیں ہیں نہ ظلم کے شیدا ہیں، نہ ملک میں تخریب چاہتے ہیں نہ مکروفریب اور غداری و وعدہ خلافی کے جرم میں ملوث ہیں اس لئے ہمیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، نہ کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار ہونے کی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جس وقت ملک میں اس کی محبت اور تعمیر کے دعویداروں نے مکروفریب اور ظلم وستم کا بازار گرم کررکھا ہے تو دوسری طرف ممبئی کے ہرشد مہتہ کی خیانتوں سے پردے اٹھ رہے ہیں اور محکمۂ سراغ رسانی وعدالت کے افسران

(۱) آپ کے عربی وارد و مقالات کی مکمل فہرست اس شمارے میں شامل ہے۔

اس خیانت کی تفتیش میں لگے ہوئے ہیں، دوسروں کو خائن اور غدار کہنے والے اس بات پر غور کریں کہ کیا خیانت میں کوئی مسلمان بھی ملوث نظر آتا ہے، ملک میں مسلمانوں کا کردار تمام تر کمزوریوں کے بعد بھی دوسروں کے بالمقابل بے داغ ہے۔

اخباروں میں جو معاملات زیر بحث رہتے ہیں ان میں مسلمان ہوتے ہیں یا دوسرے لوگ'' (محدث: جنوری ۲۰۰۸ء۔ص:۱۳)

میں نے شروع میں لکھا ہے کہ آپ کا ہر تجزیہ بصیرت افروز، ہر تحریر پروقار اور ہر مشورہ پرکیف ہوتا تھا اور ادب وانشاء کا نمونہ بھی، میری اس بات پر شہادت آپ کی ذیل کی تحریر دے گی۔ ملاحظہ فرمائیں آپ ''فکری انتشار سے بچنے کی ضرورت ہے'' کے تحت لکھتے ہیں:

''انفرادی واجتماعی انانیت، خودغرضی، ظلم وستم، عناد ورعونت، بے راہ روی، مادہ پرستی، حرص وطمع اور وحشت وبربریت کے دور میں قرآن کریم کا امت مسلمہ کے لئے یہ اعلان کہ اس کی تخلیق میں لوگوں کی خیر وفلاح مضمر ہے، بے حد اہم اور معنیٰ خیز ہے۔

ایسی عظیم اور با مقصد امت کی رہنمائی و بیداری کے لئے جو تحریر پیش کی جائے اسے بے حد معتدل اور جامع ہونا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ ''شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا'' والا مقولہ صادق آئے۔

امت کے لئے جو تجویز پیش کی جائے اس میں اس کے مقام ومسئولیت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ فکر وعمل کی جس راہ کی گفتگو کی جارہی ہے وہ امت کے منصب وذمہ داری سے میل نہ کھارہی ہو، آزاد ہندوستان میں کچھ اس طرح کا الجھاؤ پیدا ہوا ہے (یا پیدا کردیا گیا ہے) کہ اچھے اچھے لوگ ذہنی انتشار، مایوسی وجھلاہٹ کا شکار ہوگئے ہیں، محدود پیمانوں سے معاملات کو دیکھنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی بے حد معمولی چیز پر نگاہ ٹک جاتی ہے اور بڑے بڑے مسائل الگ رہ جاتے ہیں۔

امت مسلمہ کی اصلاح کے پروگرام کو معمہ سمجھا جارہا ہے۔ لیکن یہ معمہ نہیں تنازع للبقاء کے اس دور میں ہمیں پہلے اپنے دین سے رہنمائی حاصل کرنا چاہئے، طاقت کے توازن کی کوشش اور ظالم کا ہاتھ پکڑنا ضروری ہے، لیکن صحیح فکر اور صحیح عمل کے بغیر کارگہہ حیات میں سبقت کا تصور خام خیالی ہے، اسی زمین وآسمان کے درمیان دوسرے کام کرتے ہیں اور اسی میں کام کرنے کا ہم سے بھی مطالبہ ہے، اس مطالبہ کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی ہے کہ ہم احتجاجی سیاست کے ساتھ ہی عمل کے میدان میں اتریں اور شکایت نہیں بلکہ محنت کے ذریعہ اپنا مقام پیدا کریں۔

مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں؟
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک

(محدث: جولائی ۲۰۰۰ء ص:۵،۷)

بیسویں صدی کے اختتام اور اکیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی کچھ نئے نظریات اور خیالات ابھر کر سامنے آنے لگے اور ان پر خوب گرما گرم بحث ہونے لگی۔

صدی بدلی ہے باقی کچھ نہیں بدلا زمانے میں
وہی مقتل، وہی گردن، وہی شمشیر ہے ساقی

انہی نظریات میں سے ایک نظریہ یہ سامنے آیا اور پورے زور وشور سے سامنے آیا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تبدیلی لائی جائے، ان کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جائے اور انہیں عصری تعلیم سے ہم آہنگ بنایا جائے، یہ آواز دراصل بہت دور کی کوڑی سمجھ کر بلند کی گئی، تاکہ مدارس اسلامیہ پر ایک ضرب کاری لگائی جاسکے، اس کے طرۂ امتیاز کو ختم کیا جاسکے اور اسلامی بود وباش رکھنے والوں کو ایک کٹہرے میں کھڑا کیا جاسکے اور پھر اس طرح رہی سہی اسلامی تشخص ورمق کو صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا جائے، اس کا خوب خوب پروپیگنڈہ کیا گیا، سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور نام نہاد دانشوروں اور ماہرین تعلیم کو اس مسئلہ کے حل کے لئے مدعو کیا گیا تاکہ وہ اپنی مسموم تجاویز اور مشورے دے سکیں اور پھر اسلامی تعلیم وتربیت پر ضرب لگا سکیں، سو عصری تعلیم سے ہم آہنگ ہونے کی بات جوں کی توں رہی اور پھر۔ع

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنیٰ نہ ہوا

چنانچہ ۲۰ رمئی ۲۰۰۷ء مئو ناتھ بھنجن کے ایک اجتماع بعنوان ''فروغ تعلیم کے لئے ذہن سازی کا طریقہ'' میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے بھی شرکت کی اور اس کے تعلق سے اپنا مقالہ پیش کیا، تمام پہلوؤں پر نہایت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی اور چند لفظوں میں اس سازشی ذہن کا پردہ فاش کیا، نیز دل آویز اور بصیرت افروز مشورہ دیتے ہوئے اس مقالے کا نچوڑ یوں پیش کیا:

''ہماری گفتگو سے کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئے کہ ہم عصری تعلیم کے مخالف ہیں عصری علوم ہمارے انسانی معاشرہ کی ضرورت ہیں، اس وجہ سے علماء اسلام نے اپنے عہد عروج میں صرف طبیعی علوم کی آبیاری نہیں کی بلکہ ان میں قائدانہ کردار ادا کیا اور ضرورت کے مطابق علوم ایجاد کئے، عربی اور مغربی تہذیبوں کے باہمی تفاعل اور اخذ وعطا کے موضوع پر عرب دنیا میں جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں (ان کی تعداد بہت زیادہ ہے) ان سے معاملہ کی صحیح تصویر واضح ہوتی ہے، سابقہ عہدوں میں ابن ندیم، حاجی خلیفہ اور طاش کبری زادہ نے اور جدید عہد میں بروکلمن اور فواد سزگین نے علوم سائنس میں مسلمانوں کی حصہ داری سے متعلق جن کتابوں کی نشاندہی کی ہے ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ماضی میں جس طرح مسلمانوں نے قرآن وحدیث سے متعلق علوم کی آبیاری کی، اسی طرح طب وسائنس کے علوم میں بھی اپنی برتری ثابت کی، آج اسی ماضی سے سبق لے کر جدید علوم اور سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے اور اس طرح آگے بڑھنے کی ضرورت ہے کہ مسلم قوم کی پسماندگی کا داغ پوری طرح دھل جائے، البتہ ذہن میں اس بات کو تازہ رکھنا ضروری ہے کہ دین اور علوم دین کی ترقی وتقویت کے بغیر ہماری ہر ترقی بے سود ہے، ہم دین ودنیا میں تفریق کے قائل نہیں، لیکن دنیا کی ایسی ترقی جو ہمیں اپنے دینی ورثہ اور شناخت سے الگ کردے، ہمارے لئے گھاٹے کا سودا ہے، لہٰذا علوم شرعیہ اور عصریہ کی گفتگو میں دونوں نوعیت کے علوم کی ماہیت اور انسانی معاشرہ کے لئے ان کی ضرورت کے مسئلہ میں بصیرت اور کشادہ دلی سے بات کرنے کی ضرورت ہے، مجھے علمی میدان کی ہر رائے کا بے حد احترام

ہے لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کے احترام کا پابند کیا ہے اسے مقدم رکھنا ضروری ہے۔

(محدث: اگست ۲۰۰۷ء۔ص:۹)

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے مقالات سے یہ چند اقتباسات ہیں ان کو پڑھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک عالم دین دانشور کی تحریر میں کتنی بلاغت اور وسعت ہے صداقت اور واقعیت ہے، وضاحت، صراحت اور قطعیت ہے، زبان رواں اور شستہ ہے انداز بیان بے حد متین اور پر وقار ہے، لہب ولہجہ میں اعتماد اور یقین کی جھلک ہے، ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی ہر تحریر اسی طرح پر وقار، واضح، بین اور دوٹوک ہوا کرتی تھی، چونکہ آپ کی نظر میں وسعت اور مطالعے میں عمق تھا اس لئے جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تھے تو اس کے ہر پہلو کو اچھی طرح ٹٹولتے تھے اور بحث کے ہر گوشے کو تکمیل تک پہونچاتے تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ مسئلہ کو بھی تشنہ نہ چھوڑتے تھے۔ ع

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی زندگی میں میرے لئے جو دوسری چیز پرکشش تھی وہ ان کی قوت تصنیف وتالیف اور ترجمہ وانشاء کا عمل ہے، یہاں میری گفتگو صرف ان کے تراجم پر ہی مرکوز ہوگی اور وہ بھی صرف ایک پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش ناتمام کروں گا۔ چنانچہ جو لوگ بھی میدان تصنیف وتالیف اور ترجمہ وانشاء کے مراحل سے گزر چکے ہیں ان کو معلوم ہے کہ تصنیف سے کہیں زیادہ ترجمہ ایک مشکل ترین عمل ہے، ترجمہ کے لئے ضروری ہے کہ مترجم دونوں زبانوں کا ماہر ہو، دونوں زبانوں کے اسرار ورموز تشبیہات و استعارات اور مصطلحات سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔ تاکہ دوران ترجمہ اس کو کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، دوسرے ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان رواں، شستہ، سادہ اور سلیس ہو، تاکہ طبع زاد تصنیف کا گمان ہونے لگے۔

ترجمہ کے تعلق سے کئی باتیں کہی جاتی ہیں مگر ان میں دو باتیں بے حد اہم ہیں:

ا۔ ترجمہ میں اصل تصنیف کی جھلک ہونی چاہئے۔

۲۔ ترجمہ کو مترجم کے منفرد اسلوب کا نمائندہ ہونا چاہئے ہندی کے شاعر ڈاکٹر بچن کہتے ہیں کہ اگر مترجم اعلیٰ درجہ کی تخلیقی صلاحیت کا مالک ہو اور ترجمہ دیانتداری سے کرے تو اس کا ترجمہ اصل تخلیق سے زیادہ وقیع فن پارہ بن سکتا ہے اس لئے کہ ترجمہ کے عمل میں دو تخلیقی جوہر بروئے کار ہوتے ہیں، ایک مصنف کا اور دوسرا مترجم کا۔

پروفیسر محسن عثمانی کے الفاظ میں:

''ترجمہ کا فن تخلیق کے فن سے کم نازک اور دشوار نہیں، تخلیق کے لئے ایک زبان کے دریا کا شناور ہونا پڑتا ہے، مگر ترجمہ کے لئے مجمع البحرین اور جامع النورین بننا پڑتا ہے ترجمہ کا کرب بھی تخلیق کے کرب سے کم نہیں ہوتا ہے مترجم کی گرفت اگر دونوں زبانوں پر نہ ہو تو وہ ترجمہ کا فرض منصبی ادا نہیں کرسکتا ہے۔ اصل متن کے مطابق موزوں الفاظ ڈھونڈھنا اور جملہ کے در وبست پر توجہ دینا مشکل کام ہے فنکار اگر ادب کا ایک باغ تیار کرتا ہے تو مترجم اپنے صریر خامہ سے باغ کی بہار اور اس کی نسیم جاں فزا اور شمیم گل ہائے نازک کو دور دور تک پہونچاتا ہے، ترجمہ کا کام اتنا اہم ہے کہ بعض ملکوں میں اس کام پر پی.ایچ.ڈی. کی ڈگری

تفویض کی جاتی ہے۔ (جدید عربی ادب ص ۱۵)

ترجمہ کے بغیر آج کوئی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی اور ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس پر قدرت حاصل کرنے کے لئے شوق وصلاحیت ہی نہیں مشق ومزاولت اور اصولی واقفیت بھی درکار ہے، اصلاح سازی کے اصول اور طریقے، ترجمہ کے مختلف نظریے، ترجمہ میں زبان واسلوب کے مسائل، ترجمہ کی اقسام ان تمام پہلوؤں سے واقفیت ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی اپنی زبان میں ترجمہ کی روایت، اس کے رجحانات اور مختلف اداروں اور افراد کے ذریعہ اس کی نشوونما کا علم بھی ضروری ہے۔

(ترجمہ فن اور روایت)

ترجمہ کے لئے جتنے اصول وقواعد بیان کئے جاتے ہیں ہمارے استاذ محترم رحمہ اللہ کو ترجمہ کی تاریخ سے لے کر اس کے تمام اصول ومبادی سے بھرپور واقفیت حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو اردو سے عربی اور عربی سے اردو ترجمہ کرنے میں اس قدر مہارت حاصل تھی کہ پڑھنے سے اندازہ ہی نہیں ہوپاتا تھا کہ یہ ترجمہ ہے یا اصل تصنیف وتالیف، ترجمہ کی زبان اعلیٰ ومعیاری ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت سادہ اور سلیس ہوتی تھی، آپ کے ہر ترجمہ میں ندرت تھی، بجے تلے الفاظ اور جملوں کی بندش، عبارت میں ادبی ذوق اور چاشنی پائی جاتی تھی، جس سے پڑھنے میں لطف آتا اور زبان چٹخارے لیتی۔

چنانچہ عربی ادب وانشاء اور بیان وترجمہ میں مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، علامہ عبدالعزیز میمنی راجکوٹی، مولانا محمد یوسف سورتی، مولانا عبدالمجید حریری بناری، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور استاذ الاساتذہ مولانا عبدالغفور بسکوہری کے بعد برصغیر ہند میں کم از کم جماعت اہل حدیث کی سطح پر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کا کوئی ثانی نہ تھا اور ہمارے استاذ محترم نے ترجمہ کرنے میں بھی کسی سطحی فکر ونظر کا ثبوت نہ دیا بلکہ ایسی کتابوں کا انتخاب فرمایا جن سے زبان وادب کے ساتھ ساتھ فکر میں بالیدگی، خیالات میں بلندی اور عقیدے میں پختگی کے لئے راہیں ہموار ہوسکیں، اردو کی جتنی کتابوں کو آپ نے عربی جامہ پہنایا وہ یہ ہیں:
(۱) رحمۃ للعالمین (۲) تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی (۳) حجیت حدیث (۴) زیارت قبور (۵) مسئلہ حیات النبی ﷺ (۶) سرگزشت مجاہدین (۷) عروج وزوال کا الٰہی نظام۔ وغیرہ

اردو کی یہ وہ کتابیں ہیں جن کے پڑھنے سے سیرت نبوی ﷺ میں درک، حب نبی ﷺ میں اضافہ، حدیث کی حجیت پر یقین کامل، ایمان میں تازگی، جذبۂ جہاد میں ولولہ انگیزی، عقیدے میں نکھار اور قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کا سراغ ملتا ہے، اسی طرح آپ نے جن عربی کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا ان کے پڑھنے سے ذہن وقلب میں پاکیزگی، سیرت وکردار میں سدھار اور یقین وعمل میں تحریک پیدا ہوتی ہے، ان باتوں کے ذکر سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ترجمہ میں آپ کی ذہنی جہت کا تعین ہوتا ہے اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت آپ کا مقصود کیا تھا۔

میں یہاں عربی سے اردو ترجمہ کے چند نمونے پیش کروں گا جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ استاذ محترم کو

ترجمہ کرنے پر کتنی قدرت حاصل تھی اور دونوں زبانوں میں کتنی مہارت اور ان کے اسرار ورموز تک کس قدر رسائی حاصل تھی۔

عصر حاضر کے معروف مفکر محمد قطب کتاب و سنت کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یعنی ان ہی دونوں سرچشموں میں تاریخ کے ہر دور کے لئے مسلم فرد، مسلم جماعت، مسلم امت اور مسلم حکومت کی تعمیر کے تمام ضروری مواد اور عناصر موجود ہیں، شرط یہ ہے کہ مسلمان یہ تعمیر چاہیں اور اس کے لئے ضروری کوشش کا عزم رکھیں۔

مسجد نبوی کے اندر کی وہ جگہ جو حضرت عائشہؓ کے حجرے اور نبی ﷺ کے منبر کے مابین واقع ہے اور جہاں پر حضور صحابہ کو تعلیم وتربیت دیتے تھے اس کے بارے میں علامہ محب الدین الخطیب لکھتے ہیں:

یعنی اس مقام پر معلم انسانیت نبی ﷺ ان اولین مردان کار کو تیار فرماتے تھے جنھوں نے روئے زمین میں سب سے بڑا، سب سے پائیدار، سب سے نفع بخش اور سب سے برتر انقلاب برپا کیا۔

صلیبی جنگوں کے آخری دور میں مسلمانوں کی دینی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے استاذ محمد قطب لکھتے ہیں:

لا الٰہ الا اللہ (جو پورے اسلام کی بنیاد اور اس کا سب سے بڑا رکن ہے) کا مفہوم صرف زبان سے ادائیگی میں بدل گیا تھا۔ امر واقع سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، مسلمانوں کی زندگی میں اس کا تقاضا صرف اتنا تھا کہ دن بھر میں اسے چند بار کہہ لیا جائے، عقیدے کی خرابیاں اس کے علاوہ تھیں، یعنی خرافات کا ارتکاب ہوتا تھا اللہ تعالیٰ کی بغیر واسطہ، صاف اور خالص عبادت کی جگہ قبروں، اولیاء اور مشائخ کی پوجا ہوتی تھی۔

اہل بدر کے تذکرہ میں علامہ محب الدین الخطیب کا یہ فکر انگیز بیان ملاحظہ فرمائیے:

یعنی اسلام کے اس پیغام کو جس کے لئے بدر کے بہادروں نے جان دی تھی۔

اس سے علماء اندازہ لگا سکتے ہیں کہ استاذ محترم کو دونوں زبانوں پر کس قدر عبور حاصل تھا اور آپ کے تراجم میں کتنی کشش ہے، پڑھنے سے اندازہ ہی نہیں ہوسکتا ہے کہ یہ ترجمہ ہے یا طبع زاد تصنیف۔

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ عربی واردو زبان کی نزاکت اور بیان کی لطافت سے خوب واقف تھے۔ صرف یہی نہیں کہ ڈاکٹر رحمہ اللہ کا مطالعہ بڑا وسیع اور حافظہ قوی تھا بلکہ عربی واردو کی قدیم وجدید تاریخی اور فکری وادبی کتابوں پر بھی درک وبصیرت رکھتے تھے نیز شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتابوں کا بھی انھوں نے عمیق مطالعہ کیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اسلامی تحریکات اور اسلام دشمن تحریکات ونظریات کے پس منظر اور تہہ منظر سے خوب واقف تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی اور عالمی سیاسیات پر بھی ان کی اچھی نظر تھی یہی وجہ تھی کہ جب وہ کسی تحریک یا نظریہ پر کوئی تبصرہ فرماتے تھے تو نہایت جچے تلے الفاظ میں کرتے تھے گنجلک اور ابہام سے کوسوں

دور، تحریر میں روانی اور خلوص پایا جاتا تھا۔ عبارت سوز و دردمندی اور تاثیر سے پر ہوتی ہے۔

چنانچہ میری کتاب ''گلوبلائزیشن اور عالم اسلام'' کے مقدمہ میں عالمی مساوات اور امن وامان پر گفتگو کرتے ہوئے، پاسداران امن ومساوات کی قلعی کھولتے ہوئے ان کے لطف بیان اور زور قلم کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

''آج کی دنیا عجیب ہے اسلام کے ماننے والے اگر اپنے دین کی بنیاد پر نظام حکومت استوار کرنا چاہیں تو سب کا مزاج بگڑ جاتا ہے لیکن مذہب کے نام پر نیپال یا اسرائیل میں حکومتیں قائم ہوں اور ان کے زیر سایہ ہر طرح کی آمریت اور ظلم وستم کو روا رکھا جائے نیز قتل وغارت گری کی افسوس ناک روایتیں زندہ کی جائیں تو اس سے پاسداران امن ومساوات کو کوئی حیرت نہیں ہوتی ہے''۔

(گلوبلائزیشن اور عالم اسلام ص ۲۱)

مضمون کی ندرت اور زبان پر قدرت، ان کی تحریر کا خاصہ ہے استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کی علمی عظمت اور شہرت کسی تعارف اور تبصرہ کی محتاج نہیں۔

اسلامیات، اسلامی ادبیات، تاریخ وادب اور مذہب و اخلاق سب پر ان کی نظر تھی ان کی علمی کاوشوں، فکر وفن اور تحقیقی کاموں پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے اور یہ کام ان کے مستقل سوانح نگاروں کا ہے۔ کیونکہ ان کی دل آویز شخصیت میں اس قدر سحر انگیزی، اور دل کش جاذبیت کا امتزاج وسنگم ہے کہ یہ چند سطور ڈاکٹر رحمہ اللہ کی عظیم شخصیت کو اجاگر کرنے سے قاصر ہیں:

ہمارے استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ متین او سنجیدہ شخصیت کے مالک تھے، نئی نسل کے محسن اور مربی تھے،، ایک عظیم دانشور اور بالغ نظر انشاء پرداز، مفکر، مدبر، مورخ، مدرس، منتظم، مصلح، داعی اور واعظ بھی تھے، یہ ساری چیزیں آپ کی تحریروں میں عیاں اور بیاں ہیں، آپ کی تحریروں، کتابوں اور ترجموں کا ایک خاص مقام ہے، ضرورت ہے کہ آپ کی تحریروں کو جمع کیا جائے اور ان پر ریسرچ کی جائے۔(۱)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے حسنات، نیکیوں اور اعمال خیر کو قبول کر کے ان کو اجر جزیل سے نوازے، آپ کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرما کر آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، اہل وعیال اور ہم سارے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

☆☆☆

(۱) الحمد للہ ڈاکٹر صاحب کے کئی تلامذہ نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات پر کام کرنا شروع کر دیا ہے بعض لوگ مستقل کتابیں لکھ رہے ہیں بعض کتابیں شائع بھی ہوگئی ہیں ملک وبیرون ملک میں ڈاکٹر صاحب پر ایم فل اور پی. ایچ. ڈی. کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ سیمینار کی تیاری ہو رہی ہے۔ اداریے اور دیگر علمی تحریروں کو جمع کیا جا رہا ہے۔

مولانا حافظ محمد طیب سلفی

موسسۃ جمعۃ الماجد، دبئی

ازہری صاحب اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے

حتمی تاریخ یاد نہیں ہے، اتنا ضرور یقین ہے کہ ماہ نومبر ۱۹۷۵ء کے کسی جمعرات کے دن ''ندوۃ الطلبہ'' کے اجلاس (انجمن) میں باری کے اعتبار سے مجھے عربی میں تقریر کرنی تھی۔ طلبہ کے سامنے اور کسی استاذ کی صدارت میں خطاب کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جامعہ سلفیہ میں التحاق سے قبل ''مدرسہ ضیاء العلوم'' مومن پورہ، بمبئی میں میں نے ابتدائی تعلیمی مراحل مکمل کیا تھا جہاں طلبہ کی تدریب کی خاطر ہفتہ واری اجلاس یا انجمنوں کے انعقاد کا کوئی نظم ونسق نہیں تھا۔

جس انجمن میں، میں نے تقریر کی اس کی صدارت استاذ محترم ازہری صاحب -رحمہ اللہ- فرما رہے تھے، اس وقت میری عمر تقریباً ۱۳ ارسال تھی، استاذ محترم نے بہت غور سے تقریر سنی، حفظ وتجوید میں کچھ شعور وآگہی کی بناء پر تلفظ اور ادائیگی کلمات سے بہت متاثر ہوئے، تقریر ختم ہوئی تو میں اپنی نشست کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن استاذ محترم نے روک دیا اور بڑے مشفقانہ انداز سے پوچھا، "من أين أتيت" (تم کہاں سے آئے ہو؟) وفي أية مدرسة كنت تدرس؟ (اس سے قبل کس مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے) میں نے جواب میں جب ''مدرسہ ضیاء العلوم'' بمبئی کا ذکر کیا تو مزید کچھ سوالات کئے جو یادوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔

دراصل ''مدرسہ ضیاء العلوم'' کے ذکر سے استاذ عظیم اور مشفق کریم مولانا مختار احمد ندوی -رحمہ اللہ- کا ذکر آنا لازم تھا، کیونکہ اس وقت مولانا محترم ''مدرسہ ضیاء العلوم'' کے صدارت کے منصب پر فائز تھے، جامع مسجد اہل حدیث مومن پورہ، مولانا آزاد ہائی اسکول جیسا عظیم ادارہ اور مدرسہ ضیاء العلوم جیسی عربی ودینی درسگاہ، آپ کی سعی پیہم، مخلصانہ کوششوں اور قومی وملی ہمدردی نیز جمعیت وجماعت سے وابستگی کی غماز ہیں، آپ نے جماعت وجمعیت کو بمبئی بلکہ مہاراشٹر میں خصوصاً اور پورے ہندوستان میں عموماً ایک نئی پہچان دی۔

آپ ہی کی وہ ذات گرامی تھی جس نے استاذ محترم ازہری صاحب کا جامعہ سلفیہ کے لئے انتخاب فرمایا تھا، جس وقت ازہری صاحب اپنا تعلیمی سفر مکمل کر کے قاہرہ (مصر) سے بمبئی تشریف لائے اور مولانا کے پاس قیام فرما ہوئے اسی وقت مولانا نے جامعہ سلفیہ کے (سابق) ناظم اعلیٰ جناب مولانا عبدالوحید صاحب -رحمہ اللہ- سے رابطہ قائم کیا اور فرمایا کہ جامعہ سلفیہ کی خدمت کے لئے ازہری صاحب بہت ہی لائق اور مناسب ثابت ہوں گے۔ مولانا مختار صاحب کی نظر انتخاب، ناظم اعلیٰ کی بُعد نظر اور محترم ازہری صاحب کے لگن اور جذبہ نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ

صرف جامعہ کے لئے مناسب تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ جامعہ کی تعمیر وترقی کے لئے دنیا میں بھیجے گئے تھے، "كل ميسر لما خلق له" رحمة الله عليهم اجمعين۔

''ندوۃ الطلبہ'' کی انجمن میں استاذ محترم سے بالمشافہہ بات چیت کا یہ پہلا موقعہ تھا، آپ نے جس مشفقانہ انداز سے سوالات کئے اور جوابات سننے کی زحمت برداشت کی اس سے میرے دل کو بڑی تقویت اور ذہن و دماغ کو کافی روشنی ملی، اور دل و دماغ میں ان کا جو خوف یا رعب ودبدبہ سمایا ہوا تھا (بلکہ سینئر طلبہ کے ذریعہ سے سمادیا گیا تھا) وہ بہت حد تک دوران انجمن سلسلۂ سوال وجواب نے کم کردیا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ جامعہ سلفیہ کے ابتدائی ایام ہی سے آپ سے قربات بڑھی، اور شروع ہی سے آپ سے استفادہ کے مواقع میسر آئے، اور آپ کی جانب سے ترغیب وتشجیع نے استاذ وشاگرد کے اس رشتہ کو مزید استوار کیا، یہ بات قابل ذکر ہے کہ طلبہ سے آپ کا تعلق خالص علمی ہوتا تھا، آپ ایسے طلبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے جنھیں لکھنے پڑھنے میں دلچسپی اور رغبت ہو۔

کم وبیش ۷ سال کے عرصہ تک آپ سے قریب رہنے کے علاوہ وقتاً فوقتاً بالمشافہہ ملاقات، کبھی کبھار مراسلہ نگاری اور گاہے بگاہے بذریعہ ٹیلیفون احوال وکوائف سے باخبر ہوتے رہے، رحلت سے کچھ ماہ قبل آپ نے ہمارے دیار میں ایک اجلاس میں شرکت فرمائی تھی، آپ سے ٹیلیفون پر جب رابطہ ہوا تو برجستہ فرمایا: ''یہ سلام آپ ہی کے دیار سے جارہا ہے'' جب بھی آپ سے گفتگو ہوتی ذہن تازگی سے معمور اور آپ کے حسن اخلاق سے دل مسرور ہوجاتا تھا، غرضیکہ ڈاکٹر ازہریؒ ہم سب کے بہت ہی مشفق استاذ تھے، دور طالب علمی میں آپ نے مجھ پر خصوصی طور پر جو شفقت فرمائی اس کی تعبیر بہت مشکل ہے۔ آج جب استاذ محترم اپنی تحریر یا آپ کے سلسلہ میں اوروں کی تحریر یا کسی اور ذریعہ سے یاد آتے ہیں تو ذہن کے پردے پر وہی ندوۃ الطلبہ کی انجمن، وہی دارالحدیث ہال وہی آپ کا باوقار و پرتمکنت چہرہ، اور سوال وجواب کا پس منظر عود کر آتے ہیں، آپ کا مشفقانہ اسلوب آپ کی تحریروں میں بھی عیاں ہوتا، متخرجین طلبہ میں سے جو بھی آپ کو خط ارسال کرتا آپ جواب سے ضرور نوازتے، آپ کے تمام خطوط تو محفوظ نہیں رہے، البتہ دو خطوط آج بھی آپ کی شفقت وعنایت کی سرٹیفکٹ کے طور پر فائل خاص میں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب بحیثیت استاذ:

عالمیت ثانی میں پہلی مرتبہ استاذ محترم ازہری صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف راقم کو حاصل ہوا۔ آج یہ لکھتے ہوئے کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں محسوس ہورہی ہے اور نہ ہی کوئی انجانا خوف ہے۔ لیکن یقین کریں جب دروس کا جدول نوٹس بورڈ پر آویزاں ہوا تو ہم جماعت رفقاء کی اکثریت، اساتذہ کی فہرست میں ازہری صاحب کا نام دیکھ کر گھبرا گئی۔ لیکن مجھے ایک گونہ خوشی تھی کہ استاذ محترم سے بالمشافہہ استفادہ کا موقعہ میسر آئے گا۔

چونکہ عربی ادب آپ کا مرغوب اور پسندیدہ موضوع تھا اس لئے آپ نے تدریس کے لئے "البلاغة الواضحة" کا انتخاب فرمایا۔

استاذ محترم کا طریقۂ درس دیگر اساتذہ سے بالکل

مختلف تھا، درس کے دوران آپ پوری توجہ موضوع پر مرکوز رکھتے، لایعنی باتوں اور فضولیات سے بالکل اجتناب فرماتے، کلاس روم میں آپ کا دخول یا وہاں سے خروج بہت ہی باوقار طریقہ پر ہوتا تھا، اور آپ کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ طلبہ خود بخود عبارت سمجھیں اور مصنف کا مقصود جانیں، عبارت فہمی کو آپ طلبہ کے لئے سب سے زیادہ اہم قرار دیتے، آپ اسباق کو ترجمہ کی شکل میں ڈھال کر طلبہ کے ذہن نشین کرانے کے قائل نہیں تھے، اس لئے باری باری ہر طالب علم سے سبق کی عبارت پڑھواتے اور اس کی تشریح یا ترجمہ بھی خود طالب علم سے کراتے، جہاں مشکل عبارت آن پڑتی وہاں یقیناً خود تشریح فرماتے۔ جو رفقاء درس کسی طرح کے خوف وہراس میں مبتلا تھے، روز اول کے درس ہی سے ان کی طبیعتوں میں اطمینان اور چہروں پر سکون جھلکنے لگا تھا۔

آپ عربی زبان میں درس دینا پسند فرماتے تھے طلبہ کی اچھی تعلیم وتربیت کے لئے آپ ہمیشہ کوشاں رہتے، درس کے دوران اکثر جد وجہد کی تلقین کرتے، جو طلبہ عربی زبان میں تحدث وتکلم کی ممارست کرتے ان کو آپ بہت عزیز رکھتے تھے، انہیں مفید مشوروں سے نوازتے اور ان کی ہمت افزائی فرماتے، یہی وجہ ہے کہ آپ سے بالمشافہہ استفادہ کرنے والے طلبہ بلاشبہہ دوسرے طلبہ کے مقابلہ میں زبان عربی میں کافی ماہر ہوتے تھے۔

آپ کی تربیت کا اسلوب اوروں سے قدرے مختلف تھا، غیظ وغضب کی حالت میں بھی طلبہ کو جاہل سے زیادہ کچھ نہیں کہتے تھے، اس ''لفظ'' میں شفقت وتربیت کا پہلو مضمر ہوتا تھا، یہ بھی آپ کی امتیازی شان تھی ورنہ بہت سے اساتذہ کے ''آپ'' اور ''بزرگ'' جیسے الفاظ بھی روح میں ناسور بنا دیتے تھے، ایک بار کا ذکر ہے، میں آپ کی آفس میں آپ کا مضمون ٹائپ کررہا تھے، ٹائپ رائٹر میں '' ~ '' (مد) کی بٹن بسیار استعمال کے باعث واضح نہیں تھا، میں نے استاذ محترم سے پوچھا کہ اس ٹائپ رائٹر میں (مد) کا بٹن نہیں ہے؟ آپ نے اپنے انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''مولانا! اگر جہالت نہ ہوتو اس میں سب کچھ ہے''۔

ڈاکٹر صاحب بحیثیت مدیر

مجھے معلوم نہیں ہے کہ ''ادارۃ البحوث الاسلامیۃ'' کس سنہ میں قائم ہوا(۱) اور آپ نے صوت الامۃ کا اجراء کب کیا، لیکن جامعہ سلفیہ میں جب میرا التحاق ہوا جو سنہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے اس وقت ادارۃ البحوث الاسلامیہ اپنی آن وبان کے ساتھ کام کررہا تھا اور ''صوت الامۃ'' بھی پابندی وقت کے ساتھ جاری وساری تھا۔ استاذ محترم کی کرم فرمائی، عربی زبان سے دلچسپی اور پروف ریڈنگ جیسے نئے نئے ہنر سیکھنے کا جذبہ رکھنے کی وجہ سے دوران تعلیم اور فراغت کے بعد ایک سال اور کچھ ماہ ''ادارۃ البحوث'' سے منسلک رہا، اور ''صوت الامۃ'' و''ادارۃ البحوث'' کی تعمیر وترقی کے لئے استاذ محترم کی مساعی اور رغبت وشوق کو بہت قریب سے دیکھا۔ سن شعور سے لے کر آج تک جسے بھی دیکھا، جہاں بھی دیکھا، جس پر بھی نظر پڑی اور جس کے بھی قریب

(۱) ادارۃ البحوث الاسلامیہ کا قیام ۱۹۶۸ء میں ہوا اور ۱۹۶۹ء میں عربی مجلہ کا اجرا ہوا۔ پہلے اس کا نام صوت الجامعہ تھا پھر مجلۃ الجامعۃ السلفیہ ہوا اور اب صوت الامۃ کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔

رہا چاہے وہ اساتذہ ہوں، دوست واحباب ہوں، آفسوں میں کام کے ساتھی ہوں یا پھر اعزاء واقرباء ہوں، آپ جیسا پابند وقت اور مرتب زندگی گزارنے والا کسی کو نہیں پایا۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پابندی وقت اور ترتیب امور کا ہی ثمرہ تھا کہ آپ بیک وقت جامعہ سلفیہ کے ادارتی امور پر بحیثیت وکیل الجامعہ نظر رکھتے تھے، درس وتدریس کے فرائض بھی بخوبی انجام دیتے تھے، صوت الامۃ میں نشر ہونے والے ہر مضمون کا بدقت مطالعہ فرماتے تھے، مضمون نگار کی تحریر میں کومہ، فل اسٹاپ، نقطتین وغیرہ اگر ضرورت کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تو انہیں بھی تحریر فرماتے، مجلّہ کے لئے بلاناغہ اداریہ اور مضامین بھی تحریر فرماتے، ملک اور بیرون ملک تعلیم وتربیت پر منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور سیمیناروں کو بھی خطاب فرماتے تھے۔

صوت الامۃ اورادارۃ البحوث الاسلامیۃ کے لئے آپ خود بھی برابر مواد فراہم کرتے رہے، جہاں آپ کی اپنی تحریریں عربی اور اردو زبان میں تصنیف وترجمہ کی شکل میں برابر چھپتی رہیں، وہیں پر آپ جامعہ سلفیہ کے متخرجین کو لکھنے پڑھنے کی برابر تلقین کرتے، ان کی ہمت افزائی فرماتے، ان کی کتابوں پر مقدمات لکھتے، ان کے محاسن کا فراخدلی سے اعتراف کرتے، بقدر ضرورت اصلاح فرماتے اور کسی طالب علم کے کام کو کمتر نہیں سمجھتے، اپنے قیمتی اوقات میں سے کچھ فرصت کے لمحات نکال کر طالب علم کے کام کی اصلاح فرما کر اسے قابل اشاعت بناتے آپ کے اشراف میں ادارۃ البحوث سے سیکڑوں کتابیں آپ کے مقدمات اور پیش لفظ سے مزین ہو کر طبع ہوئی ہیں۔

جامعہ سلفیہ کی علمی ترقی میں ڈاکٹر صاحب کا کردار

جامعہ سلفیہ کی علمی ترقی اور اس کی عالمگیر شہرت میں آپ نے جس طرح کا رول ادا کیا، مخلصانہ اور مدبرانہ کوششیں کیں، اور اس سلسلہ میں چند معاندین کے طنز وتعریض کو برداشت کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ آپ نے اپنے شب وروز کے بیشتر اوقات کو جامعہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ آپ کی زندگی میں، جامعہ سلفیہ میں جو موجود رہا ہوگا چاہے وہ استاذ ہو، طالب علم ہو یا کسی اور منصب وعہدہ پر ہو اس نے اکثر وبیشتر استاذ محترم کو اپنے دفتر میں جلوہ افروز پایا ہوگا، کچھ کر جانے کی رغبت اور زندگی کے ہر ہر پل سے حتی الامکان استفادہ کی خواہش اس قدر آپ کے دل میں بسی تھی کہ صبح سے دوپہر تک ڈیوٹی کرنے کے علاوہ عصر کے بعد، مغرب کے بعد اور بسا اوقات عشاء کی نماز کے بعد آپ تصنیف وتالیف یا جامعہ کے ادارتی امور میں مشغول نظر آتے۔

جامعہ سلفیہ کی ترقی آپ کا نصب العین تھا، اس سے آپ بے پناہ محبت کرتے تھے، اور یہ عظیم ادارہ آپ کے دل کے بہت قریب تھا، چند تبصرے اور بے جا اعتراضات نے آپ کے دل کو دکھ بھی پہونچائے لیکن جامعہ کی فلاح وبہبود ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہی، انہیں اسباب کی بناء پر امکانات کے باوجود آپ نے کسی دوسرے جامعہ کی تاسیس کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ ہی ملک کے کسی اور جامعہ سے وابستہ ہونے کا خیال دل میں آیا، جامعہ محمدیہ مالیگاؤں سے بارہا آپ کو پیش کش کی گئی لیکن آپ نے جامعہ سلفیہ میں اپنی بقا کو ترجیح دی۔

یہ حقیقت ہے کہ جامعہ سلفیہ سے کام کرنے کے لئے آپ کو مناسب پلیٹ فارم ملا، لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ جامعہ کا یہ پلیٹ فارم آپ کی شخصیت سے پہچانا گیا، اس پلیٹ فارم کو تقویت آپ کی جد و جہد سے ملی، اسے شہرت کی بلندی پر آپ کی مخلصانہ کاوشوں نے پہونچایا، اسے یہ فضیلت اور مرتبت آپ کی حکیمانہ قیادت سے حاصل ہوئی اور اسے یہ عروج آپ کی ذو بصیرت صدارت سے ملا، جریدہ ترجمان (جلد ۲۹ شمارہ ۲۲) میں محترم المقام جناب ابن احمد نقوی صاحب نے کیا خوب تحریر فرمایا ہے:

''ڈاکٹر ازہری نے اپنا علمی سفر مئو، قاہرہ (مصر) اور علی گڑھ میں طے کیا، اور ایک جید عالم بن کر مطلع علم پر طلوع ہوئے، انھوں نے جامعہ سلفیہ بنارس کو اپنی علمی سرگرمیوں کی آماجگاہ بنایا اور اس طرح جامعہ سے وابستہ ہوئے کہ یہ رشتہ عمر کے ساتھ ہی منقطع ہوا، وہ اور جامعہ سلفیہ ایک طرح سے لازم و ملزوم بن گئے تھے، وہ جامعہ کے استاذ بھی تھے، ریکٹر بھی، اس کے جریدہ کے ایڈیٹر بھی، اس کی علمی سرگرمیوں کے سرپرست بھی، بیرونی دنیا میں اس کے وکیل بھی، غرض جامعہ کے ہر شعبہ میں ان کا عمل دخل تھا، جامعہ ان کی شناخت تھی اور وہ جامعہ کے روح رواں، انہوں نے اس عظیم علمی درسگاہ میں سرد و گرم اور نشیب و فراز بھی دیکھے، کرائسس کا مقابلہ بھی کیا، ہر دور اور ہر حال میں ثابت قدم رہے، اور جامعہ کے مفاد کو بہر حال مقدم رکھا، جامعہ سلفیہ کی تاریخ آپ کے ذکر کے بغیر نہ شروع ہو سکتی ہے اور نہ اس کے بغیر اختتام کو پہونچ سکتی ہے جامعہ کے وجود پر ان کی ذات و صفات اور خدمات کے لازوال نقوش مرتسم ہیں''۔

جماعت اہلحدیث کے تعارف میں ازہری صاحب کی تحریروں کا رول

آپ کی زندگی کا یہ بہت ہی اہم پہلو ہے۔ جس پر لوگوں نے کم روشنی ڈالی ہے، آپ کی علمی خدمات اور کاوشوں کا تو اکثر اہل علم ذکر کرتے ہیں، اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور ان شاء اللہ لکھتے رہیں گے، لیکن یہ بات قابل ذکر و ملاحظہ ہے کہ بیرون ہند میں عموماً اور عرب ممالک میں خصوصاً آپ کی تحریروں نے جماعت اہلحدیث کا جو تعارف کرایا اور وہاں کے ذی علم افراد، امراء اور رؤساء کو اس جماعت سے مکمل طور پر روشناس کرایا اس کی نظیر ماضی اور حال میں نہیں ملتی ہے۔ ماضی قریب و بعید میں جماعت اہل حدیث میں آپ سا کوئی قلم کار نہیں جس کی نگارشات عربی زبان میں، تصنیف و تالیف، ترجمہ و تحقیق یا مجلّات و جرائد میں مضامین کی شکل میں پوری عرب دنیا میں پھیلے ہوئے ہوں، آپ نے اپنی تحریروں، تقریروں اور زیارتوں کے ذریعہ ہمیشہ جامعہ و جماعت کی نمائندگی کی ہے، زمانہ حال میں بھی عرب ممالک کی زیارتیں ہوتی ہیں، لیکن ان زیارتوں میں جماعت و جمعیۃ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، یہ زیارتیں خالص اپنے جامعات، مدارس اور بسا اوقات موہوم مکاتب کے لئے ہوتی ہیں اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ان کے پاس اس کام کے لئے جمعیۃ اہل حدیث کا توصیہ بھی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ازہری صاحب جامعہ و جماعت کی ترقی کے لئے ہمیشہ غور و فکر کرتے رہتے، آپ نے نہ صرف اپنی تحریروں سے بلکہ تقریروں اور مواعظ و دروس سے جماعت کی تازندگی خدمت کی ہے، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث سے آپ

ایک فعال رکن بلکہ قائد کی حیثیت سے تا زندگی وابستہ رہے۔

استاذ محترم ڈاکٹر ازہری صاحب کی شخصیت کو ہر کسی نے ہمہ گیر قرار دیا ہے، صرف میں ہی نہیں بلکہ ہر کوئی جس نے آپ کو دیکھا، آپ سے ملاقات کی یا آپ کی تحریروں کو پڑھا وہ آپ کی علمی وعملی زندگی، اخلاقی وضعداری، دیانتداری اور ملنساری سے بہت متاثر ہوا۔

علم کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمل کی بھی توفیق عطا کی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہر موسم میں چاہے سردی ہو، گرمی ہو یا برسات کا موسم ہو، آپ سے تکبیر تحریمہ شاذ ونادر ہی فوت ہوتی تھی، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور ادارتی امور جیسے اشغال میں مصروف ہونے کے باوجود جمعہ کے خطبے اور ملک کے مختلف گوشوں میں منعقد ہونے والے اجلاسوں میں شرکت کے لئے وقت نکال لیا کرتے تھے۔

آپ کی علمی اور عملی زندگی ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھی، علم سے خاطر خواہ استفادہ کے لئے آپ نے عمل شاق کو گلے لگایا، زندگی کے ہر ہر پل کو غنیمت جانا اور انہیں تعمیری امور میں صرف کیا، ملک کی آزادی کے بعد جماعت اہل حدیث میں ایسی عبقری شخصیات بہت کم نظر آتی ہیں جو ان صلاحیتوں اور خوبیوں سے معمور ہوں، آپ کامیاب مدرس، مشفق مربی، ذی علم مصنف، فائق مترجم، ماہر قلم کار، مایہ ناز خطیب، مصلح ناقد، مدبر منزل، دانشور صحافی، بصیرت افروز داعی اور قوم وملت کے لئے دردمند جیسے صفات حمیدہ سے متصف تھے، ان خوبیوں سے مالا مال ہونے کے باوجود تواضع وخاکساری کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، بتقاضائے بشریت غصہ بھی آیا تو آواز اگرچہ بلند ہوئی لیکن زبان سے ادا کئے الفاظ پر اس کا اثر نہیں ہوا، کمال تو صرف اللہ کی ذات کو حاصل ہے، عصمت انبیاء کی صفت ہے، بشری لغزشوں اور انسانی کمزوریوں سے کون مبرا ہے۔

استاذ محترم ڈاکٹر ازہری صاحب پر جامعہ سلفیہ نے جس قدر کام کی ذمہ داری ڈالی تھی اور اس کے لئے علمی ومادی وسائل فراہم کئے تھے، اس کا آپ نے اپنے حوصلوں اور جذبوں سے پوری امانت داری اور اخلاص سے مکمل طور پر حق ادا کیا، اور کم وبیش ۴۰ سال کے علمی سفر کے دوران آپ نے درجنوں کتابیں تالیف وترجمہ کی شکل میں تحریر فرمائیں، کتابوں پر مقدمے تحریر فرمائے، اور مقالات ومضامین بھی لکھے۔

اہل علم ودانش اور فکر وفن کے ماہرین نے آپ کی علمی خدمات کو کافی حد تک خراج تحسین پیش کیا ہے اور قوی امید ہے کہ مستقبل میں بھی آپ کی شخصیت کے ہر پہلو پر عموماً اور تصنیف وتالیف کی خدمات پر خصوصاً بہت کچھ لکھا جائے گا۔ بحیثیت تلمیذ خاص اتنا ضرور لکھنے کی اجازت چاہوں گا کہ "من جد وجد" کو ذہن میں رکھ کر آپ نے اپنی ساری عمر جد وجہد میں گزاری، ہر ہر لمحہ کا صحیح استعمال کیا، درسگاہ، دفتر، سفر، منزل خاص یا جلسہ گاہ جہاں بھی آپ ہوتے لایعنی باتوں سے پرہیز کرتے، اور ان لمحات کو مفید اور نفع بخش امور میں صرف کرتے، ہر وقت غور وفکر میں محو رہتے، کارآمد باتیں جو بھی دماغ میں آتیں انہیں فوراً صفحہ قرطاس پر رقم فرماتے، اسی لگن وجذبہ اور سعی پیہم کی بناء پر ڈاکٹر ازہری صاحب رحمہ اللہ نے اپنے پیچھے ایک عظیم علمی ترکہ چھوڑا ہے اور قوم وملت کو قابل قدر علمی سرمایہ سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور علمی خدمات کو صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

معاصر علماء کے درمیان ازہری صاحب کا امتیاز:

اگر عدل وانصاف سے دیکھا جائے تو استاذ محترم کی شخصیت اپنے ہم عصروں میں سب سے متمیز تھی، چاہے وہ علمی کارنامہ ہو یا عملی میدان ہو، اپنی محنتوں، کاوشوں، دوراندیشیوں، پابندی اوقات، بلند حوصلوں اور نیک جذبوں کی بدولت آپ اپنے ہم عصروں سے کافی آگے نکل گئے تھے۔ یایوں کہنا چاہئے کہ آپ کے ہم عصر کسی نہ کسی شعبہ میں کچھ کمی یا تساہلی کے سبب آپ سے مسبوق رہ گئے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب استاذ محترم کے تفوق علمی یا عملی کا ذکر ہوتا ہے تو کسی کی تنقیص یا کسی پر تنقید مقصود نہیں ہوتی۔ مطمح نظر صرف اور صرف آپ کی چالیس سالہ علمی زندگی کے کارناموں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے حیات مستعار میں جو تدریسی، تصنیفی، تحریری، تحقیقی، صحافتی اور تبلیغی خدمات پیش کی ہیں وہ قابل ستائش اور لائق تقلید ہیں، آپ جامعہ سلفیہ کے استاذ، اس کے ریکٹر، صوت الامۃ کے مدیر ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے ڈائرکٹر اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے فعال رکن جیسے کلیدی اور اہم مناصب کو بدرجۂ اتم سنبھالتے ہوئے، تصنیف وتالیف، ترجمہ وتحقیق اور دعوت وتبلیغ میں بھی اپنا جوہر دکھاتے رہے، کیا یہ تمام اوصاف حمیدہ آپ کو اپنے عصروں سے ممتاز کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں؟

دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ جو آپ میں پنہاں تھا وہ آپ کے کسی معاصر میں نہیں دیکھا گیا۔ ہمیشہ طلبہ اور اعزاء واقرباء کی ترقی کے خواہاں رہتے اور اسی سلسلہ میں بنفس نفیس پیش رفت فرماتے، چند واقعات کا میں نے بذات خود مشاہدہ کیا ہے جو یہ واضح کرتے ہیں کہ آپ کس قدر متعاون، کرم فرما اور ہمدرد انسان تھے۔

معروف صحافی جناب ابن احمد نقوی صاحب کا مندرجہ ذیل جریدہ ترجمان (۲۹/۲۲) کے اداریہ کا اقتباس قابل مطالعہ اور ازہری صاحب کے سلسلہ میں حقیقت سے روشناس کرانے کے لئے کافی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ (ازہری صاحب) اپنے مقام ومرتبہ سے آگے تھے، اس لئے غرور وتمرد سے دامن کشاں رہ کر بھی اپنے معیار اور مقام کے لحاظ سے کام کرتے تھے، بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہوکر اسے انانیت سے تعبیر کرنے لگتے تھے، لیکن درحقیقت یہ وہ خودشناسی تھی جو علم وعرفان کی بلندیوں پر پہونچ کر حاصل ہوتی ہے۔

آپ مزید لکھتے ہیں:

"شیخ الاسلام علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ کے بعد وہ پہلے سلفی عالم تھے جو اس آب وتاب کے ساتھ مطلع علم پر طلوع ہوئے اور شہاب ثاقب کی طرح اپنے پیچھے شعاع نور چھوڑ گئے"۔ (جریدہ ترجمان: ۲۹/۲۲)

آپ ثقہ بالنفس کا، گفتگو کے دوران، اکثر ذکر کرتے اور کہا کرتے تھے کہ آدمی اسی وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب اسے اللہ کی ذات پر بھروسہ کے بعد اپنے نفس پر اعتماد ہو، بلاشبہ آپ میں وہ خوداعتمادی بدرجۂ اتم موجود تھی جس نے آپ کو بڑی کامیابی سے ہمکنار کیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کے علمی کاموں کو شرف قبولیت بخشے اور آپ کو جنۃ الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

ڈاکٹر عبد المنان محمد شفیق السلفی
متعاون مدرس و ریسرچ اسکالر
ام القری یونیورسٹی، مکہ مکرمہ

آہ استاذ محترم

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

کچھ یادیں۔ کچھ باتیں

جمعہ کا مبارک دن تھا، ذوالقعدہ ۱۴۳۰ھ کی گیارہ اور اکتوبر ۲۰۰۹ء کی تیس تاریخ تھی، صبح کا وقت تھا، تقریباً سات بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے، میں اپنے ریڈنگ روم میں بیٹھا ہوا مصروف عمل تھا، اسی بیچ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے استاذ محترم مولانا شبیر احمد مدنی حفظہ اللہ بانی ندوۃ السنہ کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن طالب جامعہ اسلامیہ کی آواز آئی اور انہوں نے یہ غمناک، و وحشتناک خبر گوش گزار کی کہ آج رات استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کا انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موت تو ایک اٹل حقیقت ہے اور اس سے کسی کو بھی رستگاری نہیں ہے جو اس دنیا میں آیا ہے اس کو ایک دن یہاں سے ضرور جانا ہے، بقا صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، لہٰذا آپ بھی قدرت کے اس نظام کے تحت یہاں سے تشریف لے گئے۔ آپ کی موت کوئی انوکھی چیز نہیں ہے کیوں کہ ہزاروں لاکھوں لوگ روزانہ مرتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کی وفات دنیا والوں کے لئے بہت نقصان دہ ہوتی ہے ہزاروں لوگ ان کی رہنمائی اور بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں، بہت سارے لوگوں کی زندگیاں تاریک ہو جاتی ہیں، ان سے استفادہ کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور ان کی موت سے جو خلاء پیدا ہوتا ہے وہ مشکل سے پر ہوتا ہے۔ اور ایک دنیا غم و حزن میں ڈوب جاتی ہے اور بلاشبہ استاذ محترم کی وفات اسی قبیل سے ہے۔

قارئین کرام: میری اس تحریر کا مقصد آپ کی سوانح حیات تحریر کرنا نہیں ہے اور نہ ہی میں اپنے اندر اس کی قابلیت پاتا ہوں، اور مجھے آپ کی مکمل حالات زندگی کا علم بھی نہیں ہے، آپ کے سیکڑوں شاگرد ہیں جن کو آپ کے حالات زندگی کا مکمل علم ہوگا وہ اس فریضہ کو ان شاء اللہ انجام دیں گے میں تو بس چند باتیں اور یادیں تحریر کرنے بیٹھا ہوں جن کا تعلق جامعہ رحمانیہ میں زمانہ طالب علمی سے لے کر آپ کی موت تک ہے۔

استاذ محترم کے نام سے پہلی مرتبہ میں اس وقت واقف ہوا جب ہمارے والد ماجد حفظہ اللہ مجھ کو اپنے ساتھ ۱۳۹۹ھ۔۱۹۷۹ء میں جامعہ سلفیہ میں داخلہ کے لئے بنارس لے گئے اور اللہ کے فضل و کرم سے جامعہ رحمانیہ کی پہلی جماعت میں میرا داخلہ ہوا۔ اس وقت میری عمر مشکل سے گیارہ بارہ سال کی تھی اور میں نچلی جماعت میں زیر تعلیم تھا اور ہم لوگوں کی رہائش بھی جامعہ سلفیہ سے باہر دور" دار

الاقامہ'' میں تھی لہٰذا پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہم لوگ اپنی رہائش گاہ واپس چلے جاتے تھے، جامعہ رحمانیہ و جامعہ سلفیہ کے اساتذہ بھی الگ الگ تھے اس لئے اس مدت کے بارے میں کوئی خاص معلومات میرے پاس نہیں ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ایک بار آپ کا رہائشی سامان جامعہ سلفیہ کے دارالضیافہ میں منتقل ہو رہا تھا تو استاذ محترم مولانا محمد یحییٰ صاحب نے درسگاہ کی کھڑکی کھولی دیکھا کہ کسی کا سامان منتقل ہو رہا ہے تو پوچھا کہ یہ کس کا سامان ہے پھر خود ہی جواب دیا کہ یہ ازہری صاحب کا سامان منتقل ہو رہا ہے۔ یہ پہلے سال کی بات ہے۔ اس کے بعد ۱۴۰۴ھ میں جب عالمیت سال اول میں پہونچا اور جامعہ رحمانیہ سے نکل کر جامعہ سلفیہ میں داخل ہوا اور ہم لوگوں کی رہائش بھی دار الاقامہ سے پہلے ہی جامعہ سلفیہ میں منتقل ہو چکی تھی تو پھر آپ کے بارے میں زیادہ سننے لگا اور معلومات میں کچھ اضافہ ہوا۔ اور پھر آئندہ سال عالمیت سال ثانی میں آپ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا کیوں کہ آپ عالمیت کی دوسری جماعت کو بلاناغہ پڑھاتے تھے، اس طرح آپ سے پہلی مرتبہ ڈائرکٹ اور روبرو استفادہ کا موقع ملا، اور آپ کی شخصیت سے مزید واقفیت ہوئی، آپ ٹائم کے بہت پابند تھے آپ کا معمول وقت سے آنے اور وقت سے جانے کا تھا۔ آپ تدریس میں کافی محنت کرتے تھے اور آپ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ہر لڑکا سبق اچھی طرح سمجھ جائے، اسی لئے سالانہ و ششماہی امتحان کے علاوہ آپ خود بھی زبانی امتحان اپنی آفس میں بلا کر لیتے تھے اور بچوں سے عبارت پڑھواتے اور اس کا مطلب دریافت کرتے تھے، غیر حاضری کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اگر کوئی لڑکا زیادہ مدت کے لئے غائب ہو جائے تو اسے زجر و توبیخ بھی کرتے تھے۔

آئندہ سال عالم سال سوم میں آپ سے معلقات سبع اور انشاء پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ اشعار کی شرح بہت اچھی طرح کرتے تھے، ہر مشکل الفاظ کی وضاحت بھی کرتے تھے اور مادہ انشاء کے لئے آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ طلباء سے دریافت کرنے کے بعد دو طلباء کے ذمہ یہ ذمہ داری ڈالی کہ ایک عربی سے اردو میں اور دوسرا اردو سے عربی میں ترجمہ کر کے لائے گا اور مجھ کو دے گا۔ عربی سے اردو کی ذمہ داری میں نے اٹھائی، لہٰذا ہر ہفتہ میں ترجمہ کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا تھا آپ کاپی اپنے ساتھ لے جاتے اور پھر چیک کر کے واپس لاتے تھے، اور شاید آپ نے یہ طریقہ اس بناء پر اختیار کیا تھا کہ ٹائم کی کمی اور لڑکوں کی زیادہ تعداد کی وجہ سے ہر ایک کی کاپی کو فرداً فرداً چیک کرنا ممکن نہیں تھا۔

بعد ازاں جامعہ سلفیہ بنارس میں مزید دو سال طالب علم کی حیثیت سے گزارا، لیکن بدقسمتی کہ آپ سے اور کوئی دوسرا مادہ پڑھنا نصیب نہیں ہوا، البتہ جب میرا آخری سال تھا اور یہ تعلیمی سال ۱۹۸۷۔۱۹۸۸ء کی بات ہے تو ایک اہم واقعہ جامعہ میں یہ ہوا کہ اسی سال منہج (Syllabus) میں تبدیلی کی وجہ سے فضیلت سال اول و دوم کو ایک ساتھ ملا دیا گیا تھا اور فضیلت صرف ایک سال کا کر دیا گیا تھا، اور میری زندگی کا اہم واقعہ یہ ہوا کہ مجھے اسی سال جامعہ سلفیہ کے طلباء کی انجمن ندوۃ الطلبہ کا ناظم منتخب کیا گیا، اور یہ انتخاب بھی قرعہ اندازی کے ذریعہ عمل میں آیا۔ در اصل میرے اور ایک دوسرے طالب علم ظفر عدیل کے درمیان نظامت کے لئے سخت منافست تھی اور جب ووٹنگ

ہوئی تو دونوں کے ووٹ برابر نکلے، لہٰذا اساتذۂ کرام کی رائے پر قرعہ اندازی ہوئی اور مربی انجمن مولانا عبدالوحید رحمانی رحمہ اللہ نے قرعہ نکالا جس میں اللہ کے فضل وکرم سے میرا نام نکلا اور مجھے ندوۃ الطلبہ کی نظامت ملی۔ اور یہ اسی نظامت کی دین تھی کہ اب استاذ محترم ازہری صاحب سے زیادہ ملاقات ہونے لگی اور پہلے سے زیادہ استفادہ کا بھی موقع ملا اور اسی سال بہت سارے واقعات پیش آئے، ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ اسی سال جامعہ سلفیہ میں مچھروں کی کافی کثرت ہوگئی تھی اور بچوں کے رہائشی کمروں میں پنکھے تو ویسے بھی نہیں تھے جس سے طلباء باہر سونے پر مجبور تھے، مزید یہ کہ نئی مصیبت مچھروں کی تھی جو کافی تنگ کرتے تھے، گرمی کا زمانہ تھا رات میں گرمی کی وجہ سے نیند ویسے بھی نہیں آتی تھی اور پھر اوپر سے مچھر۔ کریلا نیم چڑھا کا معاملہ تھا، تنگ آمد بجنگ آمد۔ لہٰذا ہم کچھ طلباء نے شیخ الجامعہ اور ازہری صاحب سے ملاقات کر کے اپنی پریشانیوں کو ان کے سامنے رکھا اور اتنی جرأت کر ڈالی کہ پنکھا لگانے کا مطالبہ بھی کر دیا ۔ یہ سن کر استاذ محترم نے کہا کہ پنکھا کے بارے میں سوچنا بھی نہیں، یہ ناممکن ہے، البتہ مچھروں کو ختم کرنے کے لئے دوا چھڑکوانے کا انتظام کر دیتے ہیں، استاذ محترم کا یہ ٹکا سا جواب سن کر ہم لوگ ناکام ونامراد واپس چلے آئے، بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر اس بیسویں صدی میں بھی ایک اعلیٰ وارفع تعلیمی ادارہ میں بچوں کو پنکھا کی نعمت سے کیوں محروم رکھا جا رہا ہے۔ بہت پہلے سنا تھا اور شاید حقیقت بھی ہو کہ کسی دور میں بچوں نے یہ جرأت کر ڈالی تھی کہ وہ پنکھوں سے کپڑا سکھاتے تھے یا پنکھا آن کر کے چلے جاتے تھے وغیرہ۔ لہٰذا اس بیماری کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ بچوں کو پنکھا ہی سے محروم کر دیا جائے، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ اور روزانہ کے دردسر سے نجات مل جائے گی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن لوگوں نے غلطی کی ان کو سزا مل گئی بعد کے لوگوں کو اس سے محروم کیوں رکھا گیا؟ تو میری نظر میں شاید طالبان علوم نبوت کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ دوران تعلیم بھی مشقت ومصیبت اٹھائیں اور فارغ ہونے کے بعد بھی مشقت ومصیبت جھیلتے رہیں جیسا کہ اکثریت کی حالت ہے، بہت کم لوگ ہی عیش وآرام کی زندگی تو چھوڑیے اچھی زندگی گزار پاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بہت سارے طالبان علوم نبوت اپنا راستہ بدل دیتے ہیں۔

اسی پر بس نہیں بلکہ جامعہ سلفیہ میں ٹھنڈے پانی تک کا کوئی انتظام نہیں تھا اور جب بھی کسی ذمہ دار سے کچھ کہا جاتا تو وہ گھڑے خرید کے پانی ٹھنڈا کرنے کی تجویز دیتا تھا، لہٰذا بسا اوقات طالب علم ٹھنڈے پانی کے لئے ترس جاتا تھا اور اسے باہر جا کر اپنی پیاس بجھانی پڑتی تھی، اور اسی سال ہندوستان میں پہلی بار جامعہ سلفیہ کے اندر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی طرف سے ایک مہینہ کے لئے ماہ جولائی ۱۹۸۷ء ذوالقعدہ ۱۴۰۷ھ میں دورۂ تدریبیہ کا انعقاد ہوا۔ ناظم ندوہ کی حیثیت سے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مہمانان معظم واساتذۂ جامعہ اسلامیہ کی خدمت میں ایک پروگرام پیش کرنے کا ارادہ ہوا جس کا مقصد انجمن کا تعارف اور اس کی سرگرمیوں سے مہمانوں کو آگاہ کرنا تھا، ازہری صاحب نے اس کی منظوری بھی دے دی، لہٰذا ایک پرگرام تیار کیا گیا، ناظم چونکہ میں ہی تھا اس لئے تعارف وغیرہ لکھ کے استاذ محترم کی خدمت میں پیش کیا، جس کی آپ نے اصلاح فرمائی اور یہ نوٹ لکھا کہ تمہاری عربی

کمزور ہے اور تمہیں محنت کی ضرورت ہے۔

اور جب معظم مہمانوں کی خدمت میں پروگرام پیش کیا گیا تو قرآن مجید کی تلاوت کے بعد سب سے پہلے میں نے ندوۃ الطلبہ کا تعارف پیش کیا اور مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور یہ میرا پہلا موقع تھا جب میں کسی اس طرح کی علمی محفل میں کوئی تعارف پیش کر رہا تھا خیر اس کے بعد جب میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو آپ نے مجھ کو بلایا اور آہستہ سے سمجھا کے کہا کہ تم بہت تیز پڑھتے ہو ہمیشہ اور خصوصاً جلسوں و میٹنگوں و پروگراموں میں اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کے پڑھا کرو، اس طرح موقع کی مناسبت سے آپ نے بہترین مشورہ دیا اور نصیحت کی۔

اور اس آخری سال میں بحیثیت ناظم میں نے ایک خاص بات یہ محسوس کی کہ اس وقت آپ کا جامعہ میں کلی طور پر غلبہ تھا اور آپ کا طوطی بولتا تھا، اور بنا آپ کی موافقت ومنظوری کے ایک معمولی کام بھی انجام نہیں پاتا تھا، اس کا اندازہ مجھے اس سے ہوا کہ جب بھی میں مربی انجمن کی حیثیت سے شیخ الجامعہ مولانا عبد الوحید رحمانی کے پاس سالانہ انجمن کے لئے دن کا انتخاب، اختیار موضوعات اور تاریخ کا تعین وغیرہ کے لئے جاتا تو وہ مجھے فوراً ازہری صاحب کے پاس بھیجتے تھے اور خود وہ کچھ بھی نہیں کرتے تھے اور میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ ناظم اعلیٰ مولانا عبد الوحید صاحب جب بھی جامعہ تشریف لاتے تو ہمیشہ آپ ہی کی آفس میں بیٹھتے تھے اور اکثر وہیں سے لوٹ بھی جاتے تھے۔ داخلہ وغیرہ بھی آپ کی منظوری کے بغیر نہیں ہوتے تھے اور آخری مہر آپ ہی لگاتے تھے، گویا کہ جامعہ سلفیہ کے سولہ آنہ مالک آپ ہی تھے اور آپ کی پکڑ کافی مضبوط تھی، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو آپ وکیل الجامعہ تھے اور یہ منصب شیخ الجامعہ کے بعد ہوتا ہے، وکیل الجامعہ شیخ الجامعہ کے تابع ہوتا ہے جیسا کہ یہاں سعودی عرب میں ساری یونیورسٹیز کا نظام ہے۔

آخری سال کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ بوقت ضرورت مسجد میں طلباء کو جمع کرنے کے لئے مجھ سے کہتے تھے یا کسی طالب علم سے کہتے کہ ناظم سے کہہ دو کہ طلباء کو فلاں وقت جمع کرنا ہے، اور جب بھی مجھے حکم ہوتا میں اس کی تعمیل کرتا، ایک بار ایسا ہوا کہ کسی طالب علم سے آپ نے طلباء کو جمع کرنے کے لئے کہلوا بھیجا لیکن وہ طالب علم بھول گیا اور مجھے اطلاع نہیں دی، لہٰذا میں نے بھی بچوں کو نہیں روکا اور جب بچے نماز بعد مسجد سے نکلنے لگے تو وہ بہت غصہ ہوئے اور مجھے بلا بھیجا، میں آیا تو کافی غصہ تھے اور پوچھا کہ تم نے طلباء کو کیوں نہیں جمع کیا تو میں نے معذرت کر دی اور کہا کہ مجھے کسی نے اطلاع نہیں دی، آپ غصہ تو تھے ہی لہٰذا بولتے رہے اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔

جامعہ سلفیہ کے آخری سالوں میں مجھ احقر کو یہ شرف بھی حاصل رہا کہ آپ نے کئی بار مجھے اپنی آفس میں بلا کر خدمت کا موقع دیا اور اپنے مسودات کو مجھ سے صاف کرایا، حالانکہ میری تحریر کوئی خاص اچھی نہیں تھی، یہ تو آپ کی کرم فرمائی تھی لیکن آپ دیگر اساتذہ کی طرح مفت میں کوئی کام نہیں لیتے تھے بلکہ باقاعدہ محنتانہ بھی دیتے تھے۔ اور میرے علاوہ جن دیگر طلباء سے بھی آپ یہ خدمت لیتے تھے ان کو بھی معاوضہ ضرور دیتے تھے، معلوم ہوا کہ آپ دوسروں کے وقت کی بھی قدر کرتے تھے اور آپ یہ قطعاً مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ ذاتی کام بچوں سے مفت میں کرایا جائے۔

آپ جامعہ کی ہر چیز پر حتی الامکان نظر رکھتے تھے اور کوئی بھی چیز آپ کی نظر سے اوجھل نہیں رہتی تھی، یہاں تک کہ طلباء کی دیواری میگزین پر بھی آپ نظر ڈال لیتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے مجھے بلا کر کہا کہ طلباء نماز کے دوران جمائی لیتے ہیں جبکہ حتی الامکان اسے روکنا چاہئے اس طرح ناک ادھر ادھر صاف کرتے ہیں ادھر ادھر تھوکتے ہیں یہ سب گندی عادتیں ہیں لہٰذا اعلان لگا دو کہ ان سب سے پرہیز کریں۔ میں نے ایڈیٹر ظفر عدیل سے کہہ دیا تو انہوں نے ازہری صاحب کے نام سے اعلان لگا دیا، آپ کی نگاہ جب اس پر پڑی تو انہوں نے پھر مجھ کو بلایا اور کہا کہ میرا نام کیوں لکھا ہے یہاں پر ادارۂ جامعہ لکھو۔

علاوہ ازیں آپ طلباء جامعہ سلفیہ کی انجمن ندوۃ الطلبہ کی ساری سرگرمیوں میں شریک ہوتے تھے اور اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے تھے۔ ہفتہ واری تقریری پروگرام، سالانہ انجمن اور کسی مناسبت سے خاص پروگرام وغیرہ سب کو اپنی تشریف آوری سے رونق بخشتے۔ مجلّہ ''صوت الامۃ'' میں بھی طلباء کے لئے ''رکن الطلبۃ'' کے نام سے کچھ صفحات خاص کر رکھے تھے جن میں طلباء کے مضامین اصلاح کرنے کے بعد شائع کرتے تھے۔

اسی طرح آپ کی خواہش تھی کہ جامعہ سلفیہ سے فارغ ہونے والے طلباء عربی میں خوب مہارت حاصل کرنے کے بعد یہاں سے نکلیں، اس کے لئے آپ نے جامعہ میں کئی پروگرام شروع کروائے، ایک پروگرام کے تحت عالم عرب کے کسی مشہور عالم وخطیب کی کیسٹ لگائی جاتی جس کو طلباء سنتے اس سے عرب کے لہجہ کو سمجھنے اور سیکھنے میں مدد ملتی، عربی زبان میں ترقی ہوتی، اسی طرح کا ایک دوسرا پروگرام بھی آپ نے شروع کیا تھا جس کے تحت جامعہ سلفیہ کا کوئی استاذ بعد نماز عشاء تشریف لاتا اور بچے اس کے ساتھ بیٹھ کر عربی بول چال کی مشق کرتے تھے۔ لیکن افسوس کی بات یہ رہی کہ یہ دونوں پروگرام طلباء کی عدم دلچسپی کی وجہ سے بند ہوگئے۔

استاذ محترم نے جامعہ سلفیہ کی زندگی میں بہت سارے کارنامے انجام دیے، ادارۃ البحوث الاسلامیۃ کو ترقی دی اور خود بخود ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں اور کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور سیکڑوں کتابیں طبع کروائیں۔ مجلّہ ''صوت الامۃ'' کے تاحیات مدیر رہے اور اسے پابندی سے نکالتے بھی رہے، جبکہ ہندوستان جیسے ملک میں کسی عربی مجلّہ کا پابندی کے ساتھ شائع کرنا ایک مشکل امر ہے، اور آپ نے ایک اہم کارنامہ یہ بھی انجام دیا کہ جامعہ سلفیہ میں مختلف اوقات میں متعدد کامیاب سیمینار کروائے جس سے جامعہ سلفیہ کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا اور اس کی شہرت کو چار چاند لگا۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں وہاں تین کانفرنسیں ہوئیں، پہلی کانفرنس دعوت اور تعلیم کانفرنس تھی جو ۱۹۸۰ء میں منعقد ہوئی، اور دوسری کانفرنس دس دن کی جو منعقد ہوئی اور تیسری کانفرنس میرے آخری سال میں منعقد ہوئی جو ابن تیمیہ کانفرنس کے نام سے تھی جس میں باہر سے بہت سارے مہمان تشریف لائے تھے، اور میری ڈیوٹی اس سال جامعہ سلفیہ کے دار الضیافہ میں لگی تھی، اور ان تمام کانفرنسوں اور سیمیناروں کے روح رواں آپ ہی تھے اور ان سب کو کامیاب بنانے کا سہرا آپ ہی کے سر جاتا ہے جس سے آپ کی بے پناہ علمی، ادبی، تحقیقی اور انتظامی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے اور آپ کی لیاقت

وقابلیت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

اور یہ شاید پہلے یا دوسرے یا آخری کانفرنس کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک مجلس کی نظامت کے دوران علی گڈھ کے پروفیسر محمد معین فاروقی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی اوران کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ وہ پروفیسر حیوانات ہیں، اور جب پروفیسر معین فاروقی صاحب مائک پرتشریف لائے توانہوں نے کہا کہ میں پرفیسر حیوانات نہیں بلکہ حیوانیات ہوں، اور جب آپ اپنا مقالہ پیش کر کے چلے گئے تو استاذ محترم نے دوسرے مہمان کو بلانے سے پہلے کہا کہ بھائی میں نے حیوانیات ہی کہا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوکہ تشدید ذرا شدید ہوتی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حاضر جواب بھی تھے۔

بلاشبہ آپ نے جامعہ سلفیہ کی کافی خدمت کی اور اس کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ ۱۹۶۸ء سے لے کر تاحیات اس سے وابستہ رہے، اور مختلف سیمناروں، کانفرنسوں اور پرگراموں میں اس کی نمائندگی کی، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف آپ کا خاص مشغلہ رہا، اس کی ترقی کے لئے برابر کوشاں رہے اور اس کے تعارف نیز مساعدات جمع کرنے کے لئے بارہا باہر کا سفر بھی کیا۔

جامعہ سلفیہ سے ۱۹۸۸ء میں فراغت کے بعد میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں آ گیا، اور اگست ۱۹۸۸ء میں ہی اجمل خاں طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور تعلیم کی ابتدا کی، اب بظاہر ڈائرکٹ رابطہ تو استاذ محترم سے منقطع ہو گیا لیکن خط وکتابت اور ملاقات کے ذریعہ رابطہ کا تسلسل جاری رہا۔ لہٰذا جب بھی آپ کسی بھی مناسبت سے تشریف لاتے اور جامعہ سلفیہ کے طلباء کو پتہ چلتا تو آپ سے ملاقات کرنے ضرور جاتے، ۱۹۸۹ء کا واقعہ ہے کہ آپ کسی کام کے سلسلے میں علی گڈھ آئے ہوئے تھے اور آفتاب ہال کے موریسن ہاسٹل میں قیام پذیر تھے، جب ہم چند طلباء آپ سے ملنے گئے تو آپ ہم سب کو اپنے ساتھ ہوٹل لے گئے اور شمساد مارکیٹ میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی روایات کے مطابق چائے ونمکین سے ہم لوگوں کی ضیافت کی۔

یہ علی گڈھ میں آپ سے پہلی اور آخری ملاقات تھی اس کے بعد آپ سے ملاقات تو نہ ہوسکی البتہ خط وکتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ جنوری ۱۹۹۰ء کی بات ہے موسم سرما کی تعطیل کے بعد یونیورسٹی جب دوبارہ کھلی اور بی یوایم ایس ایڈمیشن ٹسٹ کے پوزیشن ہولڈرس طلباء کے ناموں کا اعلان ہوا تو اللہ کے فضل وکرم سے پہلا نام میرا ہی تھا اور مجھے پہلی پوزیشن حاصل ہوئی تھی، جس کی وجہ سے مجھے میرٹ اسکالرشپ بھی ایوارڈ ہوا یہ میرے لئے بے انتہا خوشی کا موقع تھا لہٰذا مجھے جو خوشی ہوئی سو ہوئی، میں اس کو الفاظ میں نہیں بیان کرسکتا ہوں۔ البتہ اس کی اطلاع خط کے ذریعہ میں نے فوراً ازہری صاحب کو دی میری اس کارکردگی پر آپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا، اور آپ نے صرف اپنی خواہش پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جامعہ سلفیہ کے نوٹس بورڈ میں میرے نام سے ایک اعلان آویزاں کیا اور سارے طلباء کو اس کی اطلاع دی اوران سب کو بھی خوشی میں شریک کیا، جس کا مقصد طلباء میں جوش ولگن پیدا کرنا اوران کی ہمت افزائی تھی آپ ابناء جامعہ سلفیہ کی کارکردگی سے ہمیشہ بہت زیادہ خوش ہوتے تھے اور ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ ابناء جامعہ ہر میدان میں آگے بڑھیں اور سبقت لے جائیں، اسی وجہ سے گاہے بگاہے مسجد جامعہ میں آپ طلباء کو جمع

کرتے تھے اور ان کو مفید مشوروں اور نصیحتوں سے نوازتے تھے۔لطف کی بات تو یہ ہے کہ آپ کو یہ واقعہ زندگی بھر یاد رہا کیوں کہ مکہ میں ۱۴۲۴ھ میں آخری ملاقات کے دوران ایک مجلس میں آپ نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔

اسی طرح علی گڈھ میں زمانہ طالب علمی کے دوران ایک دوسرا خط میں نے آپ کو اور لکھا تھا جس میں علی گڈھ یونیورسٹی میں غیر نصابی سرگرمیوں (Extra Curricular Activites) کے سرٹیفکٹس کے فوائد سے آپ کو آگاہ کیا تھا، اور یقیناً آپ اس امر سے بخوبی واقف تھے کیوں کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری آپ نے علی گڈھ سے حاصل کی تھی، اور آپ سے درخواست کی تھی کی جامعہ سلفیہ میں جو میری تین غیر نصابی سرگرمیاں تھیں (۱) امین الخطابۃ اردو (۲) امین الخطابۃ عربی (۳) ناظم ندوۃ الطلبۃ ان تینوں کے انگلش میں سرٹیفکٹس بنوا کے بھیج دیجیے، تو آپ نے فوراً میری اس خواہش کی تکمیل کی اور تینوں سرٹیفکٹس الگ الگ انگلش میں تیار کرا کے میرے پاس بھیجا۔اسی پر بس نہیں بلکہ میں نے ۱۹۹۰ء میں دو مضامین کا ترجمہ کر کے آپ کے پاس بھیجا اور آپ سے گزارش کی کہ اس کی اصلاح فرما کے محدث میں شائع کر دیجئے گا، تو آپ نے ہنسی خوشی ان دونوں مضامین کی اصلاح کی اور محدث میں شائع بھی کرایا ایک مضمون نومبر ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں جب کہ دوسرا مضمون جنوری ۱۹۹۰ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ طلباء خصوصاً محنتی طلباء کا خاص خیال رکھتے تھے اور ان کی کسی بھی قسم کی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے تاکہ یہ بچے میدان علم وعمل میں آگے بڑھتے رہیں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ان کے کام کے لئے وقت نکال ہی لیتے تھے اور بلا وجہ معذرت نہیں کرتے تھے۔

علی گڈھ میں میں کل ڈھائی سال زیر تعلیم رہا اور بی یوایم ایس مکمل نہ کر سکا کیوں کہ جب میں تعلیمی سال ۱۹۹۰۔۱۹۹۱ء میں بی یوایم ایس فرسٹ پروف میں تھا تو ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ء کو گھر پر مجھے اطلاع ملی کہ میرا داخلہ ام القری یونیورسٹی مکہ میں ہو گیا ہے۔اس وقت یونیورسٹی میں موسم سرما کی تعطیل تھی اور میں چھٹی کے بعد یونیورسٹی واپس آنے والا تھا، اس اطلاع سے جہاں مجھے ایک طرف خوشی حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف علی گڈھ میں تعلم ترک کر کے ام القری یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے سلسلے میں تردد اور تذبذب کا شکار ہو گیا۔میرے والد محترم کی قطعی رائے تو مکہ جانے کی تھی البتہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا لہٰذا میں نے احباب، متعارفین اور اساتذہ کرام سے مشورہ کرنے کا ارادہ کیا۔اور اسی نیت سے ۲۶ جنوری ۱۹۹۱ء کو بنارس گیا اور یہ میرا بنارس کا جامعہ سلفیہ سے فراغت کے بعد دوسرا سفر تھا۔میں نے اساتذہ کرام سے ملاقاتیں کیں اور سب سے مشورہ کیا، استاذ محترم ازہری صاحب سے خصوصی طور سے ملا اور ان سے اس موضوع پر دیر تک گفتگو کی، اور ان سے کہا کہ میرا مقصد صرف حج وعمرہ اور زیارت کا ہے اور ایک سال بعد پھر واپس آجاؤں گا لیکن ان سب کے باوجود آپ کی رائے یہی تھی کہ میں مکہ نہ جاؤں اور علی گڈھ میں ہی تعلیم جاری رکھوں اور وہ اس بات کے سخت مخالف تھے کہ میں ام القری یونیورسٹی میں داخلہ لوں۔اور یہ آپ کی صرف تنہا

رائے نہیں تھی بلکہ میرے اکثر احباب واعزہ ومتعارفین کی یہی رائے تھی، چند ہی لوگ اس حق میں تھے کہ میں مکہ جاؤں، لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، اکثریت کی رائے کی مخالفت کرتے ہوئے ۲۸ فروری ۱۹۹۱ء کو میں مکہ مکرمہ آگیا اور ام القری یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اور پھر یہیں کا ہوکر رہ گیا اور ابھی تک اسی پاک سرزمین پر مقیم ہوں اور اس کے صاف وشفاف سرچشمہ سے سیراب ہو رہا ہوں۔ ڈاکٹریٹ کا آخری مرحلہ چل رہا ہے رسالہ تیار کرنے میں مصروف ہوں۔ اللہ تعالی جلد از جلد اسے پورا کرنے کی توفیق دے اور کامیابی سے نوازے۔ آمین۔

مکہ مکرمہ تو خیر پوری دنیا کے مسلمانوں کا قبلہ، مرجع اور ملتقی ہے، یہاں تو ہر سال پوری دنیا سے لاکھوں مسلمان حج وعمرہ ادا کرنے آتے ہیں، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں بھی علماء، فقہاء اور مفکرین آتے رہتے ہیں لہٰذا استاذ محترم بھی کسی نہ کسی غرض سے وقتاً فوقتاً مکہ تشریف لاتے تھے اور آپ سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ گاہے بگاہے ام القری یونیورسٹی کے ہندوستانی اہل حدیث طلباء کے ساتھ آپ کی میٹنگ بھی ہوتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ کے ساتھ پہلی میٹنگ میری موجودگی میں محترم عزیر شمس کے فلیٹ میں عزیزیہ مکہ مکرمہ میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں طارق بن زیاد ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اس میٹنگ میں آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر روشنی ڈالی تھی، اور یہ کہا تھا کہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کو بقاء کا مسئلہ درپیش ہے اور وہ اس کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں، اور یہ بھی بہت بڑی بات ہے، ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی مسائل میں الجھا دیا جاتا ہے، وغیرہ۔

اسی طرح کی ایک دوسری میٹنگ طلباء جامعہ کے ساتھ آپ کی کنور شکیل کے فلیٹ میں شامیہ میں ہوئی تھی جس میں نصاب تعلیم اور جماعت اسلامی وغیرہ کا بھی تذکرہ آیا تھا، اس مناسبت سے استاذ محترم نے فرمایا تھا کہ جماعت اسلامی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ پڑھایا ہے خود تحریر کرکے پڑھایا ہے۔ ہم لوگوں کو بھی ان کے نقش قدم کی اتباع کرنی چاہیے اور تصنیف وتالیف کے میدان میں آگے آنا چاہیے اور آپ نے مولانا صدرالدین صاحب کی ایک کتاب، اسلام کیا ہے؟ کا حوالہ دیتے ہوئے اس طرز کی کتاب بھی تحریر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

اس کے بعد بہت دنوں تک آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، دن گزرتے گئے اور پھر جب میرا داخلہ ۱۴۱۶ھ ۱۹۹۶ء میں ماجستیر (ایم اے) میں ہوا اور سنہ منہجیہ مکمل ہونے کے بعد رسالہ (Thesis) کے لئے موضوع اختیار کرنے کا مرحلہ آیا تو میں نے اس سلسلہ میں مشورہ کے لئے آپ کو ۱۴۱۷ھ ۱۹۹۷ء میں ایک خط لکھا جس کا آپ نے جواب عنایت فرمایا اور لکھا کہ چونکہ یہ موضوعات خود آپ کے سوچے ہوئے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ انہیں میں سے کسی پر کام کریں۔

آپ کا یہ خط اب بھی میرے پاس محفوظ ہے اور آپ کی یادگار ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ میں آپ کا ایک ادنیٰ شاگرد تھا اور آپ میرے قابل صد احترام استاذ، اور عمر میں آپ ہمارے والد صاحب سے بھی بڑے تھے اس کے باوجود آپ نے مجھ کو آپ سے مخاطب کرکے خط لکھا، یہ

آپ کی انتہائی تواضع وخاکساری تھی جس سے آپ کے اعلیٰ اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

بعد ازاں جب میں نے ۱۴۱۸ھ ۱۹۹۸ء میں اپنے موضوع سے متعلق مواد جمع کرنے کے لئے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا تو بنارس بھی گیا اور یہ میرا بنارس کا تیسرا سفر تھا، ایک بار پھر آپ سے ملاقات ہوئی اور تحریک شہیدین موضوع سے متعلق مصادر ومراجع پر بحث و گفتگو ہوئی، اور جب میں نے آپ سے یہ کہا کہ میں چند مستند مصادر ومراجع چاہتا ہوں تو آپ نے مجھ سے پوچھا کہ مستند سے تمہاری کیا مراد ہے؟ پھر آپ نے میری رہنمائی فرمائی۔

مکہ مکرمہ میں میری آپ سے آخری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب آپ رابطہ عالم اسلامی کی عالمی مساجد کونسل کی میٹنگ میں شرکت کے لئے مکہ آئے ہوئے تھے اور انٹر کانٹینینٹل (Inter Continenteal) ہوٹل میں مقیم تھے یہ ۱۴۲۴ھ ۱۹۹۴ء کی بات ہے، اس وقت میرے رسالہ کا مناقشہ ہو چکا تھا لہٰذا میں اپنا رسالہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو دکھلایا، اور اس کی طباعت کے سلسلے میں بھی گفتگو کی۔ آپ نے کئی جگہ سے رسالہ دیکھا اور اپنی خوشی ومسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا ہے کہ ماخذ کا حوالہ دے دیا ہے اور طباعت کے حوالہ سے آپ نے فرمایا کہ جامعہ سلفیہ والے تم کو کچھ نہیں دیں گے۔ لہٰذا تم یہیں سے طباعت کی کوشش کرو کیوں کہ دولت کی ضرورت ہر شخص کو ہوتی ہے۔

ہندوستان میں آپ سے میری آخری ملاقات ۱۴۲۶ھ اگست ۲۰۰۵ء میں ہوئی تھی، جب میں جامعہ سلفیہ بنارس گیا تھا، اور میرا یہ بنارس کا فراغت کے بعد چوتھا سفر تھا، وہاں پہونچنے پر معلوم ہوا کہ ازہری صاحب کی طبیعت ناساز ہے اور آپ کا آپریشن ہوا ہے۔ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے آپ کی عیادت کا ارادہ کیا اور ساتھ ہی سوچا کہ ڈاکٹریٹ کے موضوع کے بارے میں بھی کچھ گفتگو کرلوں گا، لہٰذا میں آپ کی رہائش پر گیا اور نام بتلا کے اجازت کا طلب گار ہوا، آپ نے کہا کہ پوچھو کون عبدالمنان؟ تو میں نے کہا کہ عبدالمنان مکہ والے، پھر مجھے اجازت ملی اور میں اندر گیا، آپ لیٹے ہوئے تھے، اٹھ کر بیٹھ گئے، میں نے حال چال دریافت کیا، اور دعا کی۔ آپ نے بھی میری خیریت وعافیت دریافت کی تھوڑی دیر موضوع کے متعلق بھی گفتگو ہوئی۔ میرا ارادہ شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں ہندوستان اور سعودیہ کے تعلقات پر لکھنے کا تھا، اس کے بعد میں واپس آ گیا کیوں کہ آپ کی علالت کی وجہ سے میں نے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔

استاذ محترم مکہ مکرمہ برابر آتے جاتے رہتے تھے لیکن افسوس اس بات کا ہے اور رہے گا کہ مکہ مکرمہ میں برسہا برس سے قیام پذیر ہونے کے باوجود میں آپ کی کوئی خاص خدمت نہ کر سکا اور یہ میری بدقسمتی رہی کہ صرف ایک بار ہی آپ کی خدمت کا موقع ملا جب کہ میں آپ کو اپنی گاڑی سے ڈاکٹر جمال اختر کے گھر عزیزیہ سے انٹر کانٹینینٹل ہوٹل ام الجود لے گیا، جہاں اس میں میری کوتاہی ومشغولیت کا دخل ہے وہیں اپنوں کی کوتاہی، بے وفائی وبے توجہی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ جو آپ کی آمد کی اطلاع کو مخفی رکھتے تھے

اور دوسروں کو اس کی خبر نہیں دیتے تھے۔

استاذ محترم نے امریکی صدر جارج بش کے دوسرے دور میں امریکی حکومت کی دعوت پر امریکہ کا سرکاری دورہ بھی کیا تھا، اور آپ بھی اس علماء وفقہاء گروہ کے ممبر تھے جن کو امریکی صدر جارج بش کی ضیافت کا شرف حاصل ہوا تھا، علماء کے اس سرکاری دورہ کو لے کر ہندوستان میں کافی لے دے ہوئی تھی اور بہت سارے لوگوں نے اس پر انگلی اٹھائی تھی اور سخت قسم کے اعتراضات کئے تھے، آپ نے بھی اس کا جواب مجلہ صوت الامۃ میں "زيارة اغضبت المتوهمين ودولة اذلت السالمين" کے عنوان سے اداریہ لکھ کر دیا تھا، واضح رہے کہ اس دورہ میں اس وقت کے ناظم اعلیٰ جناب عبداللہ سعود بھی شامل تھے۔

اس زیارت کا اصل ہدف ومقصد کیا تھا اور امریکی حکومت نے کس وجہ سے ہندوستانی علماء وفقہاء کو اپنے خرچ وسرپرستی میں امریکہ کی زیارت کروائی تھی، اس کا علم تو صرف اللہ یا پھر امریکی حکومت اور زائرین کو ہے۔ میری تو اس موضوع پر کسی سے ڈائرکٹ گفتگو نہیں ہوئی ہے، ہاں اتنا ضرور میں کہوں گا کہ اگر سارے علماء اور خصوصاً محترم ازہری وناظم اعلیٰ صاحب امریکی حکومت کی اس دعوت کو ٹھکرا دیتے تو میری ناقص رائے میں بہت بہتر ہوتا۔ کیوں کہ اس زیارت کے بعد ہی بہت سارے امریکی وفود نے جامعہ سلفیہ کا دورہ کیا جن میں عورتیں بھی شامل تھیں اور جو ننگے سر وننگے پاؤں ہاف اسکرٹ میں پورے جامعہ میں گھومتی تھیں یہ اس زیارت کا اثر تھا کہ ذمہ داران جامعہ سلفیہ اس طرح کے وفود کو جامعہ سلفیہ میں داخل ہونے سے نہ روک سکے، اور نہ ہی کوئی شرط عائد کر سکے بلکہ بلاشرط داخلہ کی اجازت دے دی۔

محترم قارئین: استاذ محترم ازہری صاحب کے تعلق سے جو واقعات میرے ساتھ پیش آئے اور جو میرے تاثرات تھے ان کو بلا کم وکاست آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر آپ کی شخصیت ایک بے مثال، منفرد اور ہمہ جہت شخصیت تھی، اور آپ بیک وقت عالم وفاضل، مؤلف ومترجم، مدرس ومربی، معلم ومفکر ہونے کے علاوہ منتظم ومدبر، دور اندیش، دانا اور دوررس تھے۔ آپ نے اپنے قیمتی وگراں مایہ افکار ونظریات اور اعمال وکردار کے ذریعہ امت اسلامیہ اور خصوصاً جماعت اہل حدیث کی کافی خدمت کی ہے، آپ کے سیکڑوں گراں قدر وبیش قیمتی مقالات ہیں کئی قیمتی تالیفات وتراجم ہیں، آپ بہت ساری تنظیموں کے ممبر تھے

آخر میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرے۔ نیز آپ کی خدمات کو قیامت کے دن نیکیوں کے میزان میں رکھے اور ہم شاگردوں کو آپ کے نقش قدم پر چلنے اور آپ کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اللهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه، ونور قبره ووقه من عذاب القبر ومن عذاب النار۔ آمین۔

☆☆☆

مولانا صہیب حسن بن فضل حق مبارکپوری
جامعہ ابی ہریرہ الاسلامیہ لال گوپال گنج الہ آباد

استاذ الاساتذہ، مفکر اسلام، ادیب العصر
علامہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ

مفکر اسلام، علامۂ زماں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ برصغیر ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ان قدآور شخصیات میں سے تھے جن کا شمار انگلیوں پر ہوتا ہے، آپ عظیم دانشور، ممتاز مصنف ومؤلف اور مترجم، عربی واردو کے بلند پایہ ومایہ ناز ادیب، کہنہ مشق انشاء پرداز، ماہر تعلیم، میر کارواں بے مثال مربی، بیباک خطیب، حق گو، زیرک، معاملہ فہم، ذہانت وفطانت سے لبریز، محقق ومدبر خالص سلفی فکر کے حامل اور اس کے داعی، کشادہ ذہن، متواضع وخاکسار باغیرت وباحمیت پروقار وبارعب شخصیت کے مالک، علم وعمل کے پیکر اور جامع الصفات انسان تھے۔

آپ کی وفات حسرت آیات سے ملک وملت کی تعمیر وترقی اور افراد کی ذہن سازی میں ایک عظیم خلا پیدا ہوگیا ہے، اور دور دور تک آپ کا کوئی مثیل وبدیل نظر نہیں آتا۔

ابتدائی تعلیم

آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ عربیہ (مئو) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والدین کی خواہش کے مطابق آپ نے حفظ کرنا شروع کیا، آپ کے حفظ قرآن کی ابتداء سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس نسخے میں آپ نے حفظ کی ابتداء کی اس کا ناشر کوئی ہندو پنڈت تھا، آپ کے استاذ حافظ صاحب نے غیر مسلم ناشر کا نام دیکھ کر وہ نسخہ واپس کرنے اور دوسرے نسخے میں حفظ کرنے کو کہا، آپ نے والد محترم سے یہ بات کہی تو انھوں نے بڑی دانشمندی کی بات کہی جس سے ہونہار بیٹے کی ذہن سازی ہوئی اور حافظ جی کو سکوت اختیار کرنا پڑا۔ والد صاحب نے کہا: (حافظ صاحب سے کہو کہ قرآن میں تو شیطان اور فرعون کے بھی نام آئے ہیں، اس کی بابت آپ کیا کہیں گے؟) یہ ایسا حکمت پر مبنی سوال تھا جس پر سوائے خاموشی کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ (بروایت ڈاکٹر عبدالعلی ازہری حفظہ اللہ) آپ نے کم وبیش تین سال کی مدت میں حفظ قرآن سے فراغت حاصل کرلی۔

زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کی ذہانت وفطانت کا بڑا چرچا تھا، آپ اپنے سارے معاصرین واقران پر بھاری اور ان سب کے درمیان ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

آپ کے بعض اقران کا بیان ہے کہ "حافظ مقتدیٰ غضب کا علم رکھتے تھے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان کا علم کتنا وسیع ہے۔

جامعہ ازہر (مصر) میں:

حصول علم کا شوق آپ کو جنون کی حد تک تھا، یہ

حرص وشوق آپ کو ازہر لے گیا، یہ ۱۹۶۳ء کے اواخر کی بات ہے، وہاں آپ نے بڑے بڑے اساطین علم وفن اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا اور مسلسل تین سال تک اپنی علمی تشنگی بجھاتے رہے، قیام مصر کے زمانے میں قاہرہ اردو ریڈیو سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۶۶ء میں ازہر سے ایم اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ وہاں گزار کر وطن لوٹ آئے

ازہر جانے کے بعد بہت سے لوگ مصر کی عامیانہ وسوقیانہ طرز زندگی کے اسیر ہو کر کلین شیو، پتلون اور سگریٹ نوشی کے عادی ہو جاتے ہیں اور حد یہ ہے کہ ان قبیح عادات کو اپنا سرمایۂ افتخار بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی یہ خوبی رہی کہ آپ نے اپنا امتیازی وصف برقرار رکھا دینداری اور مجد وشرافت جو آپ کا خاندانی ورثہ تھا اسے کبھی ضائع نہ ہونے دیا۔

ازہر جانے سے آپ کا علمی فائدہ بہت زیادہ ہوا، وہاں کے گزرے ہوئے ایام آئندہ کی علمی زندگی کے لئے ایک ٹھوس بنیاد ثابت ہوئے۔ جیسا کہ آپ نے ایک بار کلاس میں اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: (ہم لوگ علمی لیاقت اور ذہانت وفطانت میں۔ یہاں کے معروف ومشہور لوگوں میں سے تھے، ازہر جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ کچھ زیادہ ہی جاہل ہیں)

مرکزی دار العلوم جامعہ سلفیہ (بنارس) میں:

جامعہ ازہر سے آنے کے بعد ۱۹۶۸ء میں آپ نے کارگاہ علم وحیات میں قدم رکھا اور جامعہ سلفیہ سے وابستہ ہوئے، یہ وابستگی زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہی جو بیالیس سال کی طویل عرصے کو محیط ہے۔

جامعہ سے منسلک ہونے کے بعد ابتدائی دور میں ہی آپ نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی (اے۔ ایم۔ یو) سے پی ایچ ڈی کر لی اور لفظ ''ڈاکٹر'' آپ کے نام کا جزء لاینفک بن گیا جب کہ اس سے پہلے آپ ''حافظ صاحب کہے جاتے تھے۔

جامعہ سلفیہ کے لئے آپ ہر طرح سے مخلص تھے، آپ کو اس سے قلبی لگاؤ اور والہانہ محبت تھی، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی آپ کو بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے آفر ملا تو آپ نے قبول نہ کیا اور جامعہ کی خدمت کو ترجیح دی، آپ عرصہ دراز تک جامعہ کے ریکٹر رہے اور اسے عالمی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔

درس وتدریس:

آپ فن تدریس کے رمز شناس اور تعلیم وتربیت کے اصولوں سے پوری طرح آگاہ تھے، عموماً تفسیر، عربی ادب اور تاریخ ادب عربی اور فلسفہ وغیرہ مضامین آپ کے زیر درس رہتے (راقم نے آپ سے تفسیر کی مختلف کتابیں اور احمد حسن زیات کی تاریخ الادب العربی پڑھی ہے) ان علوم کی کتابوں کو آپ بڑی خوش اسلوبی سے پڑھاتے، عبارت خوانی طلبہ سے کراتے، غلط پڑھنے پر بہت دلبرداشتہ ہوتے، اصلاح فرماتے اور تصحیح عبارت پر بہت زور دیتے، مشکل الفاظ کی تشریح میں کئی کئی مترادفات بول جاتے، عبارت کا ترجمہ اور اس کی تفہیم بڑے سہل اور دلنشیں انداز میں کرتے،

سوال کرنے سے خوش ہوتے اور ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیتے اور عموماً مراجع بھی بتلا دیتے، ایک بار راقم نے نحو کے کسی مسئلہ کی وضاحت چاہی تو پوری طرح وضاحت فرمادی اور دوسرے دن مرجع بھی سامنے لاکر رکھ دیا۔

افادہ وتربیت کی غرض سے بسا اوقات خارج درس کی بھی باتیں کرتے، دورانِ تدریس ایسا لگتا کہ آپ کی نگاہ پست ہے اور آپ کسی کو دیکھ نہیں رہے ہیں لیکن جیسے ہی کوئی طالب علم خلاف ادب نقل وحرکت کرتا فوراً تاڑ جاتے اور تنبیہ فرماتے۔

تصنیف وتالیف:

آپ کا قلم بڑا سیال واقع ہوا تھا، آپ اس میدان کے عظیم شہسوار اور اس کے پورے واقف کار تھے، دلوں کو دستک دینے والا اچھوتا اندازِ تحریر نیز مشکل ترین بات کو سلیقہ مندی اور آسان انداز میں پیش کرنا اور حشو و زائد سے پاک جچی تلی بات کہنا آپ کا امتیازی وصف تھا۔

جن کتابوں کو آپ نے عربی میں منتقل کیا یا جن کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا ان کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ یہ آپ کی اپنی تالیفات ہیں، کسی بھی عبارت یا سطر سے ترجمہ کی بو نہیں آتی، یہ وہ وصف وامتیاز ہے جو خال خال لوگوں کو حاصل ہوتا ہے، انہی خوش نصیبوں میں ایک آپ بھی تھے، آپ کی تالیفات وتراجم، تعلیقات وحواشی اور تحقیقات بیالیس تک پہنچتی ہیں، ہم بطور نمونہ ہر نوعیت کی ایک دو کتابوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں:

- ''تاریخ ادب عربی'' یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے جس میں عربی زبان وادب کی تاریخ اور مختلف ادوار میں اس کے ارتقائی مراحل کو اس دور کی نثر ونظم کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے، اور ضمناً شعراء کے تراجم بھی بیان کردیئے گئے ہیں، اس خشک موضوع کو ڈاکٹر صاحب نے جس سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، جیسا کہ ایک بار آپ نے کلاس میں فرمایا: (اس کتاب کو میں نے آسان زبان میں لکھا ہے)
- ''خاتون اسلام'' اس کتاب میں عورتوں کے مقصد وجود اور ان کی ذمہ داریاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مسائل کی بابت مخالفین کے اعتراضات کا بڑی خوش اسلوبی اور منطقی انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ ایک بار جامعہ سلفیہ میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مہمان استاذ نے علم کلام پر اپنے لکچر کے دوران کہا تھا: (یہ کتاب علم کلام کا ایک بہترین نمونہ ہے)
- ''عظمت رفتہ'' اور ''رسالت کے سائے میں'' یہ دونوں کتابیں عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں، ان دونوں کے مولف مصر کے معروف صاحب قلم ڈاکٹر عبدالحلیم عویس ہیں جو جامعہ سلفیہ میں ایک سے زائد بار آچکے ہیں۔
- ''راہ حق کے تقاضے'' یہ کتاب شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی معروف کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" کی تلخیص کا ترجمہ ہے، تلخیص کا کام آپ کے ایک معروف محقق شاگرد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی نے انجام دیا ہے۔
- "حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولي الله في التجديد" یہ کتاب مولانا اسماعیل سلفیؒ کی

انتہائی معرکۃ الآراء کتاب ''تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی'' کا عربی ترجمہ ہے، اس کتاب میں بڑے محققانہ انداز میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے پوری زندگی کتاب وسنت کی نشر واشاعت میں گزاری اور ہمیشہ تقلیدی جمود کے خلاف نبرد آزما رہے، لہٰذا ان کے بارے میں یہ باور کرانا کہ انہوں نے حنفیت کی ترویج واشاعت کی، بہت بڑا الزام ہے۔

- ''رحمۃ للعالمین'' یہ سیرت نبویہ ﷺ کے موضوع پر ۳ رجلدوں پر مشتمل علامہ قاضی سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ کی لاجواب وبے مثال تصنیف ہے جو نبی اکرم ﷺ کی محبت میں ڈوب کر لکھی گئی ہے۔اس کتاب کا عربی ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے اسی نام سے کیا ہے۔

علاوہ ازیں آپ نے بکثرت علمی وتحقیقی اور بامقصد مضامین تحریر کئے جو ملک وملت کی تعمیر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، آپ کے عربی وار دو مضامین کی تعداد کم وبیش چھ سو (۶۰۰) تک پہنچتی ہے۔

جامعہ سلفیہ بنارس سے شائع ہونے والی تین ۳۰۰ سے زائد کتابوں کا عرض ناشر اور مقدمہ آپ ہی کا لکھا ہوا ہے اور ان میں سے اکثر کی تصحیح ومراجعہ کا کام بھی آپ ہی نے انجام دیا ہے۔

دیگر اہم مطبوعات اور بہت سے مصنفین ومولفین کی علمی کاوشوں پر مقدمے وتقاریظ نیز کانفرنسوں کے خطبۂ صدارت اور سیمیناروں کے لئے مقالے تحریر کرنا آپ کے علمی کارناموں کا روشن باب ہے۔

ایک بار راقم نے الفاظ جدیدہ پر مشتمل ایک جامع (عربی اردو) قاموس (لغت) لکھنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: (ہاں جی! ہونا تو چاہئے) لیکن شاید دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ کر سکے۔

خطابت

اس میدان میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، تڑکنا، بھڑکنا، غصہ میں آجانا، نرم پڑجانا، آواز کا اتار چڑھاؤ، اشاروں سے کام لینا، اصل موضوع کی پابندی کرنا اس سے دور نہ ہٹنا، موضوع کے مطابق نصوص اور معنی خیز اشعار پیش کرنا اور اس طرح سامعین کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز رکھنا آپ کی خطابت کا امتیازی وصف تھا۔

جمعیت کی کانفرنسوں اور جامعہ کے سیمیناروں میں نظامت کے فرائض عموماً آپ ہی انجام دیتے تھے۔

شہر اور اس کے مضافات کے جلسوں میں بھی شرکت کرتے لیکن ایسے مواقع کم آتے، وقفے وقفے سے خطبۂ جمعہ کا اہتمام کرتے اور کبھی جامعہ کی مسجد میں بھی خطبہ دیتے، ندوۃ الطلبہ کی افتتاحی واختتامی تقاریب، ہفتہ واری انجمنوں اور گاہے گاہے جامعہ کی مسجد میں نمازوں کے بعد خطاب کرتے، اس نوعیت کے خطاب میں اصلاح وتربیت، پند ونصائح اور مفید مشوروں کا پہلو غالب ہوتا۔

آپ طلبہ سے کہا کرتے: ''پوری تیاری کے ساتھ اسٹیج پر آیا کرو اور بلا جھجک اپنی بات پیش کرو، اسٹیج پر آنے کے بعد تیاری کے ساتھ نہ آنے کا شکوہ کرنا اصول

خطابت کے خلاف ہے"۔

اخلاق وعادات:

آپ خود بھی آداب شریعت کے پابند تھے امت اوراس کے نونہالوں کو بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتے تھے۔اذان ہوتے ہی لکھنا پڑھنا بند کر کے نماز کی تیاری میں لگ جاتے، ہرنماز میں عموماً اور فجر میں خصوصاً امام سے قریب داہنی طرف پہلی صف میں رہتے۔

جملہ امور بالخصوص تعلیم وتربیت کے معاملہ میں غایت درجہ اصول کے پابند تھے، خلاف ضابطہ امور دیکھ کر بپھر جاتے اوراسی حالت میں اپنے مخصوص فطری انداز میں اصلاح کرنا شروع کردیتے، بسا اوقات ہم طلبہ اس کیفیت کی زد میں آتے تو ہمیں ایک قسم کا روحانی سرور حاصل ہوتا کیونکہ مقصد اصلاح ہوتا تھا نہ کہ کچھ اور، بعض لوگ آپ کی اس انفعالی کیفیت کو بدخلقی کا نام دیتے ہیں جو قطعاً درست نہیں، کیونکہ جو شخص علم وادب کے اتنے بلند مقام پر فائز ہو اور بغرض اصلاح وتربیت اپنے مخصوص فطری انداز میں مثالی مربی کے فرائض انجام دے رہا ہو اس کے اس مخلصانہ عمل کو بدخلقی کا نام دینا بجائے خود بدخلقی ہے۔هدى الله قائل هذا القول

بے مثال مربی:

یقیناً آپ ایک قابل اتباع اور بے مثال مربی تھے، نماز میں خارجی حرکتیں دیکھنے پر تنبیہ فرماتے اور نماز کو خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرنے پر زور دیتے۔

اکثر طہارت ونظافت کی تلقین کرتے رہتے، ایک بار آپ نے فرمایا: (اپنے کپڑوں کو چیک کرتے رہا کرو، بدبو کا احساس ہوتے ہی اسے نکال دیا کرو، لیکن تم لوگ ایسا نہیں کرتے۔

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

(تم لوگوں کے نقش پا کی شوخی کا پتہ تو نہیں چلتا البتہ بدبو ضرور آتی ہے)

بکثرت کھیل کود میں وقت لگانے کو ناپسند کرتے، آپ کا نظریہ تھا کہ زمانہ طالب علمی کی چند سالہ زندگی میں ہی ہر طرح کے کھیل کود کا شوق پورا کرنا حصول مقصد میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، لہٰذا کھیل کود لکھنے پڑھنے میں معاون ہونے کی حد تک ہونا چاہئے۔گویا بقول شاعر آپ کا نظریہ یہ تھا۔

إنما اللعب بغير درس حرام
وكذا الدرس بغير اللعب

یعنی سبق پڑھے اور یاد کئے ہوئے بغیر کھیل کود حرام ہے (سبق) یاد ہو جائے تجھ کو تو کھیل) اوراسی طرح بغیر کھیل کود اور جسمانی ورزش کے ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں مشغول رہنا بھی درست نہیں۔

ایک بار آپ نے جامعہ کی مسجد میں سارے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے ناصحانہ انداز میں فرمایا: (کاش آپ لوگ اپنے اوقات کا صحیح استعمال کریں، مذاکرہ کریں، مشکل الفاظ کی تحقیق کریں، نئے سبق کا مطالعہ کریں، پڑھے ہوئے اسباق کا کم ازکم پانچ بار اعادہ کریں۔مضامین لکھیں، ترجمہ کرنے کا ڈھنگ سیکھیں، یہاں اساتذہ کی

پوری ایک ٹیم ہے ان سے استفادہ کریں، ہمارے زمانہ طالب علمی میں ہم لوگوں سے کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ بابو! فلاں موضوع پر ایک مضمون لکھ لاؤ، اس کے برعکس آپ لوگوں کو یہاں ایک صالح ماحول میسر ہے اس کی قدر کریں اور اپنے اوقات کو یونہی ضائع نہ کریں، جو کچھ پڑھیں دقت نظری کے ساتھ پڑھیں، ایک موضوع پر پانچ کتابیں پڑھنے کے بجائے ایک کتاب کو پانچ بار پڑھیں، اسی کے ساتھ عبادت وریاضت کی طرف بھی پوری توجہ رکھیں اور مخصوص اوقات میں اللہ تعالیٰ سے علم وعمل کی توفیق کی دعاء بھی کریں) پھر آپ نے علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر پڑھا ؎

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

(ان ارشادات وتوجیہات میں سے کچھ باتیں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے موقعہ بموقعہ کلاس میں فرمائی تھیں، تسلسل کے لئے ہم نے سب کو یکجا کردیا ہے)

حضرت الاستاذ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی تربیت کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ کسی کے اندر کوئی خوبی کی بات دیکھتے تو محفل ومجلس یا کلاس میں برملا اس کا اظہار کرتے۔ چنانچہ راقم نے ایک دوبار اپنی اصلاح کی غرض سے آپ سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں گفتگو کرنے کی کوشش کی جس پر آپ نے خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے عربی ہی میں جواب دیا اور ایک بار کلاس میں سارے ہم سبق ساتھیوں کے درمیان ہمت افزائی کرتے ہوئے میری جانب اشارہ کرکے فرمایا: (یہ مولوی صاحب کچھ عربی جانتے ہیں) ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا یہی وہ جملہ ہے جو مجھے بار بار ابھارتا رہتا ہے کہ میں عربی زبان سے تاحیات اپنا تعلق جوڑے رکھوں اور اپنی معمولی بساط کے مطابق ہی سہی اس عظیم عالی اور اسلامی زبان کی ہر ممکن خدمت کروں۔ وباللہ التوفیق

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے شریر طلبہ کی تربیت کا ایک انداز یہ بھی اپنایا تھا کہ انہیں ہفتہ دو ہفتہ یا مہینہ بھر کے لئے صلاۃ فجر کا امام مقرر فرما دیتے جس سے ان کی روحانیت کو جلا ملتی اور وہ اپنی شرارتوں سے باز آجاتے اور کبھی اپنی آفس میں بلاکر خصوصی طور پر تنبیہ فرماتے۔

غیر ملکی اسفار:

آپ نے متعدد بار سعودی عرب اور خلیجی ممالک کا سفر کیا، ایک بار انڈونیشیا، پاکستان، لندن اور دو بار امریکہ کے سفر پر گئے۔ امریکہ کے پہلے سفر میں آپ کے فاضل شاگرد ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ (سابق شیخ الجامعہ جامعہ سلفیہ بنارس) آپ کے ہم سفر تھے۔

حرف آخر

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ غیر معمولی اور عالمی شخصیت کے حامل تھے، آپ کی وفات سے ایک عہد اور علمی تحریک رخصت ہوگئی، آپ فخر ملت اور آبروئے جماعت تھے، آپ کے بعد آپ کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا، آپ کی وفات کے بعد آپ کے صلبی اولاد ہی نہیں بلکہ ہم سب تلامذہ ایک مشفق مربی سے محروم ہوگئے اور پوری جماعت اہلحدیث اور جامعہ سلفیہ دونوں یتیم ہوگئے، اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کا نعم البدل عطا فرمائے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

مولانا نورالعین سلفی
کلیہ فاطمۃ الزہراء للبنات، مئو

یاد ایک شفیق استاذ کی (رحمہ اللہ)

میری ناقص یادداشت کے مطابق یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے جب میں مدرسہ فیض عام میں داخل ہوا۔ دوسری جماعت میں میرا داخلہ ہوا تھا اور حافظ مقتدیٰ حسن صاحب رحمہ اللہ کا آخری سال تھا۔ لیکن سوء اتفاق کہئے کہ تعلیمی سال مکمل ہونے سے دو ماہ قبل فیض عام سے دارالحدیث منتقل ہوگئے اور وہیں سے سند فراغت حاصل کی۔ فراغت کے بعد اگلے سال بحیثیت مدرس پھر فیض عام واپس آ گئے۔ فیض عام سے جانے آنے میں کیا عوامل کارفرما تھے؟ یہ نہیں معلوم۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ بعد کے دور میں ازہری صاحب رحمہ اللہ کبھی کبھی بڑے درد اور دکھ کے ساتھ اس المیہ ذکر کیا کرتے تھے جس کے وجود سے ہمارے ادارے کم ہی خالی ہوں گے یعنی جوہرِ قابل کی ناشناسی اور ناقدری۔

قدر شناسی:

۱۹۶۲ء میں جب حافظ صاحب بحیثیت استاذ فیض عام واپس آئے تو اس وقت میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا اور ہماری جماعت کی دو کتابیں حافظ صاحب رحمہ اللہ کے زیر درس تھیں، لیکن تدریس کا یہ سلسلہ چند ماہ سے زیادہ باقی نہیں رہ سکا۔ اس لئے کہ اس دوران ''جامعہ ازہر'' جانے کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ اس ناچیز کو حافظ صاحب سے اخذ وتحمل کا موقع تو بہت کم ملا۔ لیکن شاگردی کا شرف اولیٰ حاصل ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تادم حیات ان کی نظر عنایت ناچیز پر باقی رہی۔ جب میں دارالتعلیم مبارکپور میں مدرس تھا تو اس زمانے میں ازہری صاحب نے ناچیز کو جامعہ سلفیہ بنارس آنے کی ترغیب دی لیکن تقدیر کا فیصلہ جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں جانے کا ہو چکا تھا۔

ازہری صاحب رحمہ اللہ کی علمی، تحقیقی، تصنیفی، قومی، ملی اور جماعتی خدمات پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور لکھتے رہیں گے۔ آپ کے برادر صغیر ڈاکٹر اظہر صاحب حفظہ اللہ نے جو ''محمدیہ طبیہ کالج'' منصورہ مالیگاؤں کے پرنسپل ہیں ان کا ایک مضمون ''مجلّہ صوت الحق'' میں شائع ہوا ہے۔ یہ درد بھرا مضمون میں نے دوبار پڑھا، مضمون بڑا رقت آمیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بھائی کے قلم سے جس سادگی کے ساتھ اندروں کی عکاسی ہوگئی ہے وہ کسی اور کے قلم سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ جو درد اور کرب ازہری صاحب کو اپنے ابناء واخوان کو بنانے اور سنوارنے میں تھا اس سے کم درد ان کو اپنے روحانی بیٹوں کو سنوارنے میں نہیں تھا۔ وہ ہمہ وقت افراد کی تیاری اور شخصیت سازی کی فکر میں رہتے تھے۔

ہمارے اداروں میں جہاں ہیرے اور جواہر پارے تیار کئے جاتے ہیں وہیں ناقدری کا بھی ایک المیہ ہے، ازہری صاحب پہلی ہی منزل میں اس المیہ سے دوچار ہوچکے تھے، شاید اسی تلخ تجربہ نے ان کے اندر علم وتحقیق کے ساتھ قدرشناسی اور شخصیت سازی کا جذبہ بھی بیدار کر دیا تھا۔

آج عالمی سطح پر اگر نگاہ اٹھا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اعداء اسلام کی نگاہیں اچھے دماغ اور اچھی صلاحیتوں کی تلاش میں رہتی ہیں، صلاحیتوں کے حصول میں ان کے یہاں رنگ ونسل اور دین ودھرم کوئی مانع نہیں ہے، اچھا دماغ جہاں پایا اٹھالیا۔ اور اپنی مخصوص تربیت کے ذریعہ اس کو استعمال کیا۔

اس کے برعکس ہمارے پاس اچھے دماغ اور اچھی صلاحیتیں موجود ہیں، انھیں مزید تربیت دینا اور نکھارنا تو درکنار، ہم انھیں ضائع اور برباد کرتے ہیں، کہیں مذہب ومسلک کی جنگ ہے تو کہیں ذات اور برادری کی تفریق ہے اور کہیں اقتدار کی لڑائی ہے اور اس میں صلاحیتیں برباد ہورہی ہیں۔

شخصیت سازی

ایک سچا، ہمدرد اور مخلص مسلمان جب ان حالات کا جائزہ لیتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور ہم کیا کررہے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ قوم وملت کے تئیں حساس اور مضطرب دل رکھتے تھے اور شاید یہ درد وکرب ان کی عمر کی رفتار کے ساتھ فزوں تر ہوتا گیا، ان کی مجلسوں میں جب کبھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا تو موضوع گفتگو قومی، ملی اور جماعتی مسائل ہوا کرتے تھے۔

اسی جذبہ کے تحت انھوں نے دور سے قریب سے اور پاس بیٹھا کر بہت سارے افراد کی تربیت اور شخصیت سازی کی، ان کے تربیت یافتگان میں مدرسین، مقررین، مترجمین اور مصنفین کی ایک بڑی تعداد ہے۔ جن میں کتنے جوار رحمت میں پہنچ گئے اور کتنے آج بھی زبان وقلم اور درس وتدریس کے ذریعہ قوم وملت اور جمعیت وجماعت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ "شکر اللہ سعیهم"۔

دوران تعلیم یا زمانۂ تعلیم سے قریب کسی شاگرد کی تربیت تو قرینہ قیاس ہے۔ لیکن کوئی ایسا شاگرد جس کی شاگردی پر چالیس سال کا عرصہ گذر چکا ہو اس کی تربیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ازہری صاحب رحمہ اللہ اپنے ایک ایسے ہی شاگرد کو ایک مضمون کا املاء کرا رہے ہیں اور ساتھ ہی قواعد املاء کی رہنمائی بھی کررہے ہیں۔ تربیت کی راہ میں موصوف کی نگاہ عمر پر نہیں جاتی تھی۔ تربیت کا یہ جذبہ کہاں دیکھنے کو ملے گا؟ اب تو ہماری پستی کا یہ حال ہوگیا ہے کہ اچھے ذہین اور لائق شاگردوں سے اساتذۂ کرام ہی حسد کرنے لگتے ہیں۔

درد ملت:

ازہری صاحب رحمہ اللہ زبان وادب اور کتاب وسنت کا گہرا علم رکھتے تھے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو اسلام اور اہل اسلام سے قلبی محبت تھی۔ دینی اجتماعات

اور جلسوں میں بارہا ان کا خطاب سننے کا اتفاق ہوا۔ بعض لوگ تبصرہ کرتے، پوری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سمجھ میں آئے کیسے؟ یہاں کہنے کے لئے مضامین کا انبار ہے، ہر موضوع دامن دل کھینچ رہا ہے کہ مجھے موضوع بحث بنایا جائے۔ اسی کشمکش میں بعض گوشے تشنہ طلب چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے۔

اس لئے کہ یہاں تو ایک ہی مجلس میں بہت کچھ کہنے اور بہت کچھ دینے کی فکر دامن گیر ہے اگر ایک ہی موضوع پر بولتے رہیں اور بہت سے پہلو مخفی رہ جائیں تو دوسروں کے کہنے سے اپنے کو تشفی کیسے ہو؟ اور دعوتِ حق کا اپنا فریضہ ادا کیسے ہو؟

آپ دیکھیں گے کہ آپ کی تحریر اور مقالات کی ہر سطر درد ملت میں ڈوبی ہوئی ہے، دعوت وارشاد اور اصلاح وتربیت کا یہ جوش جنوں دیکھنے کو کم ملے گا۔

استغناء:

حالات وظروف ہمارے سامنے ہیں، کتنے صاحب علم وفضل ایسے ملیں گے جن کی آنکھیں درہم ودینار کی چمک دمک میں خیرہ ہوگئیں اور اپنی علمی وجاہت کو حصول دنیا کا ذریعہ بنالیا۔ بلڈنگیں ہیں، جائدادیں ہیں، کاروبار اور تجارت ہے، گاڑیاں ہیں، لیکن آپ؟ تو آپ کو اللہ نے زبان سے، قلم سے، علم سے، شاگردوں کی کثرت سے، علمی خدمات سے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ذاتی شہرت سے خوب نوازا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو کیا نہیں بنا لیتے؟ لیکن ایک مکان پر قناعت ہے اور بس، نہ بلڈنگیں ہیں، نہ تجارت ہے، نہ ادارے ہیں۔

استغناء کا یہ عالم تھا کہ ایک بار میں اپنے ایک کام سے دولت خانے پر موصوف سے ملنے گیا، اذنِ باریابی حاصل ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک اور مولانا صاحب بھی آگئے۔ بات میں بات نکلتی گئی مولانا صاحب نے کہہ دیا آپ بنارس چھوڑ کر مئو آجائیں اور یہاں ایک اپنا ادارہ قائم کریں، ابھی جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ بے ساختہ جواب دیا: چھوڑو جو میں کرتا ہوں کرنے دو اداروں کا حال میں جانتا ہوں۔

ایک خط کا جواب

مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہے لیکن امید ہے کہ انیس سو اکیاسی بیاسی کا زمانہ رہا ہوگا جب جامعہ سلفیہ بنارس میں طلبہ کی پہلی اسٹرائک ہوئی تھی اس سے پہلے میں جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں پہنچ چکا تھا۔ رمضان سے قبل اسٹرائک ہوئی تھی اور میں عید کی مناسبت سے گھر آیا ہوا تھا، عید بعد جامعہ محمدیہ جارہا تھا اتفاق سے میری ہی کیبن میں چار پانچ طلبہ بھی تھے، لمبا سفر تھا آپس میں طلبہ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے سفر تمام کر رہے تھے، اس میں جامعہ سلفیہ کا موضوع بھی چھڑ گیا۔ جامعہ سلفیہ کا ایک فرزند ہونے کے ناتے مجھے بھی جامعہ سے عقیدت تھی، بعض باتیں مجھے غیر معقول لگیں، خاموشی بہتر سمجھ کر میں اوپر کی برتھ پر جاکر سو گیا منماڈ قریب آیا تو انھیں بچوں نے مجھے جگایا۔ اس لئے بہت ممکن ہے وہ مجھے پہچانتے رہے ہوں۔ خیر جامعہ پہنچنے کے بعد میں نے مناسب جانا کہ بچوں کے تاثرات سے ذمہ داروں کو مطلع کر دیا جائے کہ خیر خواہی کا یہی تقاضا

ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو ایک خط لکھا۔ ڈاکٹر صاحب خط کا جواب دینے میں بہت تیز تھے، فوراً انھوں نے جواب دیا جواب تو محفوظ نہیں ہے لیکن آپ کا جملہ بھولتا نہیں ہے۔ آپ نے لکھا ''بہت اچھا کیا بتا دیا جن باتوں کا مجھے شک تھا تمہارا خط پا کر یقین ہو گیا، اللہ کا شکر ہے کہ میں اس وقت جامعہ میں نہیں تھا باہر تھا''۔

اپنی وضع!

ازہری صاحب رحمہ اللہ کی اپنی ایک خاص وضع تھی جس کی زندگی بھر انھوں نے پاسداری کی، ان کے علمی رعب وجلال کی وجہ سے لوگ کیا؟ ان کے ابناء و اخوان بھی براہ راست بات کرنے سے گھبراتے تھے۔ ان کا یہی علمی رعب جامعہ سلفیہ کے بنانے اور سنوارنے میں مفید ثابت ہوا۔

جامعہ سلفیہ سے وابستگی

۱۹۶۸ء میں جامعہ سلفیہ بنارس کے فارغین کا پہلا بیچ نکلا۔ جس میں ہم آٹھ طلبہ تھے۔ فضیلت کے دو سالوں میں چھ امتحان دینے کا اتفاق ہوا۔ جس جذبۂ مسابقت کے ساتھ طلبہ امتحان کی تیاری کر رہے تھے وہ نا قابل بیان ہے اس زمانہ میں سالانہ امتحان سخت سردیوں میں پڑتا تھا۔ بعض طلبہ اپنا لحاف اور بستر باندھ کر الماری میں رکھ دیتے تھے اور چادر اوڑھ کر ننگی چارپائی پر سو جاتے تاکہ سردی لگنے پر آنکھ کھل جائے اور امتحان کی تیاری کریں۔ کہنا یہ ہے کہ بزرگوں اور مؤسسین جامعہ کے اخلاص اور دعاؤں کی یہ برکت تھی کہ پہلے دن ہی سے جامعہ سلفیہ کے طلبہ میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ازہری صاحب رحمہ اللہ کے جامعہ سلفیہ سے وابستہ ہونے کے بعد اس علمی ماحول میں چار چاند لگ گیا۔

تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف آپ کا خاص مشغلہ تھا، ایک ایک منٹ آپ کا قیمتی تھا وقت کا ضیاع آپ کو کسی طرح برداشت نہیں تھا۔ آپ کی آفس کے پاس اگر کوئی کھڑا ہو کر بات کرتا تو آپ اسے بھی نہیں برداشت کر پاتے، کام میں ڈسٹرب ہوتا ہے۔ آپ کا یہ علمی، تحقیقی اور تصنیفی ذوق آپ کے شاگردوں میں آہستہ آہستہ روحانی طور پر منتقل ہوتا رہا اور آپ ایسے باذوق شاگردوں کی ہر طرح تشجیع اور توجیہ کرتے رہے۔ عرب جامعات خصوصاً جامعہ اسلامیہ میں زیادہ سے زیادہ داخلہ کی راہ آپ نے ہموار کی اور اس میں کامیابی ہوئی۔ اس طرح چند سالوں میں رجال کار کی اتنی بڑی جماعت میدان عمل میں آ گئی کہ جامعہ سلفیہ کی تاسیس کے موقع پر حضرت مولانا عبدالمتین صاحب بنارسی تغمده الله برحمته نے اپنی پرمغز اور جامع تقریر میں اقبال کا ایک شعر پڑھا تھا وہ صادق آ گیا۔

آفتابِ تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

اللہ تعالیٰ ان مرحومین کی حسنات، علمی، دینی اور جماعتی خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین



مخلص الرحمٰن
جے۔این۔یو۔نئی دہلی

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری اور عربی صحافت

استاذ محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ ایک ممتاز عالم دین، مشہور صحافی اور نمایاں ادیب تھے، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت بڑی ہمہ گیر اور ان کی خدمات ہمہ جہت تھیں، تقریباً چالیس سال کی زندگی میں انہوں نے مختلف میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے جن کی مثال عصر حاضر میں بہت کم ملتی ہے۔ آپ کی حیات وخدمات پر اہل قلم نے خوب لکھا اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ میں اس مقالہ میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ان کی صحافتی خدمات پر مختصر روشنی ڈالنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

عربی صحافت میں ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی:

ڈاکٹر صاحب کو صحافت بالخصوص عربی صحافت سے بڑا لگاؤ تھا، آپ کے جامع ازہر کے علمی اور ادبی ماحول میں تعلیم حاصل کرنے اور پھر قاہرہ ریڈیو کے شعبۂ اردو میں ایک مترجم اور اناؤنسر کی حیثیت سے خدمت انجام دینے نے آپ کے صحافتی ذوق پر ایک اچھا اثر ڈالا۔

چنانچہ آپ جامع ازہر سے واپسی کے بعد ۱۹۶۸ء میں جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لئے مامور ہوئے۔ اپنے ادبی اور صحافتی ذوق کی بنا پر انہوں نے جامعہ سلفیہ سے منسلک ہونے کے ساتھ ہی دوسرے اساتذہ کے تعاون سے عربی زبان میں ایک ماہنامہ کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا جو ابتداء میں "صوت الجامعة" کے نام سے شائع ہوا جس کی شروعات ۱۹۶۹ء میں ہوئی۔ پھر کچھ قانونی دشواریوں کی وجہ سے اس کا نام "مجلة الجامعة السلفية" رکھا گیا۔ اور آخر میں یہ "صوت الامة" کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب اس مجلّہ کی شروعات سے اکتوبر ۲۰۰۹ء تک مدیر رہے اور مسلسل اپنے اداریے اور دیگر قیمتی مضامین سے اس ماہنامہ کو زینت بخشتے رہے۔ مضامین کے علاوہ آپ جامعہ سلفیہ میں ہونے والی ساری اہم سرگرمیوں، سیمیناروں اور کانفرنسوں کی تفاصیل بھی قلمبند فرماتے تھے۔

آپ کو خاص دلچسپی عربی صحافت وادب میں تھی لیکن آپ اردو مضمون نگاری میں اپنے ہم عصروں سے پیچھے نہیں رہے۔ آپ نے جامعہ سلفیہ سے شائع ہونے والا اردو ماہنامہ ''محدث'' میں بکثرت مضامین لکھے ہیں، اس کے علاوہ آپ دیگر جرائد اور مجلات میں اردو اور عربی میں وقتاً فوقتاً لکھتے رہے ہیں۔ اردو اور عربی میں آپ کے مضامین کی تعداد ۵۰۰ سے زائد ہے۔

صحافت کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کی مہارت:

ڈاکٹر ازہری صاحب صحافت کے میدان میں ایک بلند وبالا مقام کے حامل ہیں۔ بلکہ آپ کی زندگی کی

سب سے اہم اور نمایاں کارکردگی صحافت اور مضمون نگاری ہے، آپ نے اپنے صحافتی ذوق کی وجہ سے تقریباً چالیس سال تک عجمی ماحول میں عربی صحافت کا چراغ جلائے رکھا اور بلاناغہ عربی زبان میں مختلف اہم اور حساس موضوعات پر مضامین قلمبند فرماتے رہے، میں نے ایک بار آپ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''صحافت اور مضمون نگاری ایک ایسا مشغلہ ہے جو وہی مسلسل اور برقرار رکھ سکتا ہے جو اس میں فرحت اور خوشی محسوس کرے ورنہ یہ اکتا دینے والا مشغلہ ہے'' اور آپ نے اس کو عملی زندگی میں ثابت کر دکھایا، اور اسی دلچسپی اور دل جمعی کا نتیجہ ہے کہ آپ کے مضامین ہزاروں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں اور جو فکری اور فنی ہر اعتبار سے مکمل باوزن اور بصیرت افروز ہیں کیونکہ آپ بحث وتحقیق اور مقالہ نگاری کے اصول اور ضوابط سے پوری طرح واقف تھے، ان کے سارے مقالات اور مضامین میں منہجیت اور معیار ہوا کرتا تھا۔

آپ کی نمایاں خاصیت یہ ہے کہ آپ کے مضامین کسی ایک میدان میں محدود نہیں ہیں، آپ نے جس موضوع اور جس پہلو کو بھی اختیار کیا اس کو کما حقہ عوام اور خواص کے سامنے تحریری شکل میں پیش کیا، چنانچہ آپ کے مضامین پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے عقیدہ، سیرت وسوانح، تاریخ، حدیث وفقہ، دعوت وارشاد اور زبان وادب کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے حساس اور سلگتے ہوئے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔

اگر ڈاکٹر صاحب کے اداریوں پر نظر ڈالی جائے تو بخوبی یہ کا اندازہ ہوگا کہ آپ وقت کے انتہائی حساس اور اہم ترین مسائل پر روشنی ڈالتے تھے، اس طرح ایک دور اندیش اور بالغ نظر صحافی ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی نبھاتے تھے۔

عربی صحافت میں آپ کا اسلوب:

ڈاکٹر ازہری صاحب نے مختلف علمی اور ادبی ماحول سے مستفید ہو کر اپنی علمی پیاس بجھائی اور عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کی۔ آپ جن علمی اور ادبی ماحول سے مستفید ہوئے ان میں مئوناتھ بھنجن کے متعدد اسلامی مدارس، عرب دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹی، جامع ازہر، اور ہندوستان کی معروف یونیورسٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شامل ہیں، اس کے علاوہ آپ کا مسلسل مطالعہ اور محنت ولگن نے آپ کی صحافتی اور تحریری صلاحیت میں چار چاند لگادیا، یہاں تک کہ آپ بالغ نظر صحافیوں اور ہندوستان کے بڑے ادیبوں میں شمار ہوگئے اور آپ کے مقالات ومضامین کو علمی اور ادبی حلقوں میں مقبولیت ملی۔

اگر آپ کے عربی طرز تحریر پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ آپ کو ایک عجمی ہونے کے باوجود عربی زبان وادب میں مہارت تامہ حاصل تھی، ایسا لگتا ہے کہ آپ کے پاس عربی زبان کا ایک خزانہ موجود تھا، جب آپ قلم ہاتھ میں اٹھاتے تو سیاق وسباق کے مطابق الفاظ اپنے آپ نوک قلم پر آجاتے، اسی طرح عربی زبان میں اسماء اور افعال کے مطابق صلات کا استعمال کرنا غیر عرب

کے لئے ایک مشکل امر ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کو اس میں بھی مہارت حاصل تھی، آپ کی عربی عبارت پڑھ کر کہیں عجمیت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ آپ اپنی تحریر میں بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے اور بکثرت مترادفات کے استعمال سے بھی بچتے تھے اور آپ کی تحریر اور مضمون نگاری میں کوئی تکلف اور تصنع نہیں پایا جاتا تھا، اس کے باوجود آپ کی عبارت میں سلاست، جاذبیت اور ایک طرح کی چاشنی ہوا کرتی تھی جو پڑھنے اور سننے والوں کو خوش کردے۔

مذہبی اور دینی موضوعات پر مضمون نگاری ایک خشک میدان سمجھا جاتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے یہ ثابت کردکھایا کہ اگر زبان وادب پر پکڑ ہو تو ہر موضوع کو دلچسپ اور پرکشش انداز میں قلمبند کیا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس کو پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ نے مذہبی اور دینی مسائل کو بھی کس خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے جو آپ کی تحریری صلاحیت کا کمال ہی کہا جاسکتا ہے، ایک مضمون میں آپ انسان کے مقام ومرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"والإسلام في تكريمه هذا للإنسان لايفرق بين عنصر وعنصر، وجنس وجنس، بل يؤكد أن الجميع سواء في حق التكريم وإلى هذا يهدي قول النبي ﷺ كلكم من آدم وآدم من تراب، لافضل لعربي على اعجمي إلا بالتقوىٰ"

اسی میں آگے فرماتے ہیں:

"فالتسامح والصفح الجميل هو السياسة الإسلامية التي رسمتها النبوة في العلاقة بين الناس بعضهم مع البعض، وخصوصا بين المسلمين وغيرهم وترى هذه السياسة مطبقة في علاقات النبي ﷺ بالمشركين وغيرهم في معاهداته وفي حروبه وأبرز مثال لهذا التسامح ماوقع في صلح الحديبية، وهو الصلح الذي عقد بين النبي عليه السلام وبين المشركين عند ما اراد ان يحج فمنعوه وأبوا ان يدخل البيت الحرام، وقد كان أساس هذا الصلح شططا من جانب المشركين ولكن الحكمة النبوية السامية قد آثرت الصبر والسماحة فحقنت الدماء التي كانت توشك أن تراق" (صوت الامۃ جولائی ۲۰۱۰م ودیسمبر ۱۹۷۲م)

غرضیکہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب ایک عالم دین اور داعی شرع متین ہونے کے ساتھ ایک کامیاب ادیب اور بالغ نظر صحافی اور مضمون نگار تھے جنھوں نے عربی ادب اور صحافت میں ایک مقام اور مرتبہ بنالیا جس کی وجہ سے دنیائے علم وادب آپ کو تا قیامت یاد رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دینی خدمات اور علمی وادبی ورثہ کو آپ کی مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

☆☆☆

شیخ اسعد اعظمی
رئیس التحریر مجلہ صوت الامۃ، بنارس

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری اور جامعہ سلفیہ

''ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری اور جامعہ سلفیہ'' یہ ایک ایسا موضوع ہے جو اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر رکھتا ہے۔ یہ درحقیقت کسی پی ایچ ڈی کے رسالہ کا موضوع ہے یا کسی مستقل وضخیم تصنیف کا۔ تقریباً (۴۲) سال تک یہ شخصیت اور یہ ادارہ اس طرح لازم وملزوم بنے رہے کہ ایک کا تصور دوسرے کے تصور کو مستلزم ہوتا اور ایک کا تذکرہ دوسرے کے تذکرے کے بغیر ادھورا رہتا۔ جامعہ سلفیہ جماعت اہل حدیث کا مرکزی دارالعلوم ہے، اس ادارہ کو جماعت کے اعیان واکابرین نے اپنے خون جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا ہے اور اس کی خاطر ایک سے بڑھ کر ایک قربانیاں دی ہیں۔ اس کے منتظمین ومدرسین کی ایک طویل فہرست ہے جن کی شبانہ روز محنتوں کا اس ادارہ کو بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار رہا ہے۔ بہتوں نے تادم واپسیں اپنے آپ کو اس سے مربوط رکھا، بعض نے اس سے قلبی وفکری تعلق تو بحال رکھا مگر میدان عمل تبدیل کیا۔ صاحب تذکرہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ نے ۱۹۶۸ء میں یعنی جامعہ کے افتتاح کے صرف دوسال بعد یہاں قدم رکھا تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے اور اسی ادارہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ میرے علم کی حد تک اتنی طویل مدت تک اس جامعہ سے عملی وابستگی کسی اور کے حصے میں نہیں آئی ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ اس طویل مدت میں حالات ہمیشہ یکساں رہے ہوں اور سب کچھ حسب منشا چلتا رہا ہو، اور ایسا ہونا بھی مشکل ہے۔ سرد وگرم کا سامنا ہر انسان کو کرنا پڑتا ہے۔ "تجری الرياح بما لا تشتهي السفن" کا کون انکار کرسکتا ہے۔ لیکن مستقل مزاجی کی دولت سے جو مالا مال ہو اور جس کا مقصد محض خدمت ہو وہ راہ کی چھوٹی چھوٹی رکاوٹوں کو اہمیت نہیں دیتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ کو اپنے دل میں بسالیا تھا اور اسے ہی اپنا مسکن ومستقر اور اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ کام کے ایام اور چھٹی کے ایام ان کے یہاں برابر تھے، بلکہ ان کے یہاں چھٹی کا کوئی دن تو کجا کوئی وقت بھی نہیں تھا۔

''تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تجدیدی مساعی'' نامی کتاب کی تقدیم میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''۱۹۶۷ء میں جامعہ ازہر مصر سے تعلیم ختم کر کے ہندوستان واپس آیا تو ۱۹۶۸ء سے جامعہ سلفیہ بنارس میں تقرر ہوا، اور اس کے در و بام سے ایسی انسیت ہوئی کہ تادم تحریر (۲۰۰۸ء) اسی جگہ شب وروز گزر رہے ہیں۔'' (تحریک آزادی فکر.....تقدیم، ص:۹)

شیخ الحدیث علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ سے متعلق ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

”......جب جامعہ سلفیہ میں خدمت کے لیے آنے کا موقع ملا تو نصیحت اور رہنمائی حاصل کرنے کے لیے حاضری دی، تدریسی میدان کی دشواریوں اور اپنی بے مائیگی کے تصور سے دل میں جو اندیشے تھے انھیں حضرت نے مشفقانہ نصیحتوں سے دور فرمادیا۔

شاید آپ کی دعاؤں ہی کے نتیجہ میں مجھے بنارس میں ایسا تفرغ واطمینان حاصل ہوا کہ آج تک اس کی حلاوت باقی ہے اور میری نظر میں کام اور تعطیل کے ایام یکساں ہیں۔ تفرغ وطمانیت کے اس ماحول میں کبھی تکدر پیدا ہوتا ہے، لیکن اسے زندگی کا لازمہ سمجھ کر برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

(ماہنامہ محدث بنارس، شیخ الحدیث نمبر: جنوری-فروری ۱۹۹۷ء، ص:۱۴۶)

انتقال سے چار پانچ سال قبل کی بات ہے، جب آپ کی سب سے چھوٹی بچی جو آپ کے ہمراہ بنارس میں رہتی تھی اس کی بھی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال کی ہوگئی تو آپ مع اہلیہ یہاں بچ رہے۔ کبرسنی میں یہ تنہائی بہت شاق گزر رہی تھی، کوئی حل سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ وقتی طور پر آپ نے یہ طے کیا کہ کچھ دنوں دہلی میں اپنے صاحبزادے ڈاکٹر فوزان احمد کے یہاں قیام کریں، بایں طور کہ اہلیہ وہیں رہیں اور ڈاکٹر صاحب ماہ دو ماہ پر بنارس آجایا کریں اور ضروری امور نپٹا کر دہلی واپس چلے جائیں۔ اسی ارادہ کے ساتھ آپ عازم سفر ہوئے اور دہلی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ گزرے ہوں گے کہ آپ بنارس واپس لوٹے اور ہر طرح کی مشقتوں کو جھیلتے ہوئے جامعہ میں قیام کو ترجیح دیا۔ دہلی میں اگرچہ آپ کا اپنا گھر تھا، ہر طرح کا آرام تھا، فیملی تھی، مگر جامعہ سے ہٹ کر کسی اور جگہ آپ کو سکون نہیں ملتا تھا۔

بارہا یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کسی شخص نے جامعہ کے تعلق سے لب کشائی کی اور اس کی کسی کمی یا کوتاہی کا تذکرہ کردیا تو آپ فی الفور اپنا ردعمل ظاہر کرتے اور جامعہ کی طرف سے پورا دفاع کرتے۔ بعض اوقات اس سلسلے میں جذباتی ہوجاتے۔

آپ نے وکیل الجامعہ، رئیس الجامعہ، مدیر ادارة البحوث، مدیر صوت الأمة ..وغیرہ کی حیثیت سے جامعہ میں منصبی فرائض نبھائے، شیخ الجامعہ کے منصب کے لیے بھی آپ سے اصرار کیا گیا مگر آپ نے معذرت کی۔ آپ جامعہ کے مدرس بھی رہے، سفیر بھی، ترجمان بھی، نمائندے بھی۔ جامعہ میں منعقد ہونے والے سیمیناروں، کانفرنسوں اور تمام قسم کے پروگراموں کی تنظیم وتنسیق کی باگ ڈور آپ کے ہاتھوں میں ہوا کرتی تھی۔ جامعہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف کے روح رواں آپ ہی تھے اور اس شعبے کے ذریعہ علمی دنیا میں جامعہ کا خوب نام روشن کیا۔ ملک اور بیرون ملک کی قد آور علمی شخصیتوں کو جامعہ سے جوڑنے کے لیے آپ کے پاس متعدد پروگرام ہوا کرتے تھے جس سے جماعتی حلقوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مکاتب فکر کے لوگوں میں بھی جامعہ کا ایک وقار قائم ہوا اور افادہ واستفادہ کی راہیں ہموار ہوئیں۔

یہ سب محض سرخیاں ہیں جن کی تفصیل کے لیے ضخیم رجسٹر درکار ہیں، مگر یہاں صرف ان ہی اشاروں اور سرخیوں پر اکتفا کرتے ہوئے یہ عرض ہے کہ اس تحریر کا مقصد کسی سے موازنہ کرنا یا اونچا نیچا ثابت کرنا ہرگز نہیں۔ بلکہ

ازہری صاحب کی زندگی کا تو یہ وہ روشن پہلو ہے جو دو اور دو چار کی طرح غیر متنازع بلکہ واقف کاروں کے نزدیک بدیہیات و مسلمات میں سے ہے۔ بلکہ اس عنوان کے تعلق سے میرا منصوبہ تو یہی تھا کہ صرف ان ہی واقف کاروں کے بیانات و تاثرات ہی کو جمع کر دیا جائے جو اس عنوان کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں، اور ابھی بھی اس عنوان کا اصل مواد یہی تاثرات و بیانات ہی ہیں جن کی تمہید کے طور پر یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت پیش آئی جو قدرے طویل ہو گئیں، مگر یہ کچھ زائد فوائد کو بھی متضمن ہیں، اس لیے یہ مفید طوالت ہے۔

ذیل میں اہل فکر و دانش کی تحریروں کے چند اقتباسات بطور نمونہ مندرج کیے جاتے ہیں جو اس موضوع کی خاطر خواہ وضاحت کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اقتباسات مضامین و مقالات سے ماخوذ ہیں، تین اقتباس تعزیتی خطوط سے لیے گئے ہیں، جنہیں آخر میں رکھا گیا ہے:

۱۔ مولانا عبد الحنان فیضی: شیخ الحدیث و مفتی و استاذ جامعہ سراج العلوم السلفیہ، جھنڈا نگر، نیپال۔ سابق استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

''ہمارے ممدوح ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ جامعہ ازہر سے جب وطن واپس آئے تو جامعہ سلفیہ بنارس کے بالغ نظر اور مردم شناس ناظم مولانا عبد الوحید سلفی رحمہ اللہ نے آپ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور علمی، تدریسی، دعوتی، قلمی اور انتظامی صلاحیتوں کو پوری آزادی کے ساتھ اجاگر کرنے کے لیے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو جامعہ سلفیہ کا وقیع پلیٹ فارم دیا اور محترم ازہری صاحب ناظم مرحوم کی آرزوؤں کے مطابق جامعہ کی خدمت میں لگ گئے اور آخری سانس تک جامعہ کی متنوع خدمت انجام دیتے رہے۔

جس وقت ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ جامعہ سلفیہ تشریف لائے وہ جامعہ کا بالکل ابتدائی دور تھا، ابھی اس کے قیام پر چند برس ہی گزرے تھے، علم و ادب کے اس گلشن کو ایک ہونہار، جفاکش اور مخلص مالی کی ضرورت تھی اور اللہ نے اس کا انتظام ازہری صاحب کی شکل میں کرا دیا، بلاشبہ جامعہ سلفیہ بنارس کو ان کی تشریف آوری سے ایک نئی زندگی ملی اور اس کے عروج و ترقی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ موصوف نے عرب و عجم کے اندر جامعہ سلفیہ کو متعارف کرانے میں انتہائی نمایاں کردار ادا کیا، عرب و عجم کی بہت ساری کانفرنسوں اور علمی مجالس میں تشریف لے جا کر جامعہ کے شایان شان نمائندگی فرمائی۔ اور اس کے علمی شعبہ ''ادارۃ البحوث العلمیۃ'' کی سرپرستی فرما کر اور عربی، اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں سیکڑوں علمی، دعوتی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کرا کے جامعہ کے علمی وقار میں اضافہ کیا اور یہ حقیقت ہے کہ جامعہ سلفیہ کو بام عروج تک لے جانے میں محترم ازہری صاحب کا رول بڑا اہم رہا ہے اور ان کے احسانات سے جامعہ کبھی بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔'' (ماہنامہ السراج: اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء، ص: ۱۹)

۲۔ مولانا عبداللہ سعود بن عبد الوحید سلفی: ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ، بنارس

''....اس وقت ہم کو جن اساتذہ کرام نے پڑھایا ان میں محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب بھی تھے، ڈاکٹر صاحب جب آئے تھے ان کا استقبال ہوا تھا، ایک قابل باصلاحیت استاد کی حیثیت سے ہر کوئی ان کو جانتا تھا

، بہت جلد آپ کو عربی ماہنامہ کا ذمہ دار بنا دیا گیا اور جامعہ کی معنوی ترقی میں آپ میرے والد محترم، اس وقت کے ناظم اعلی کے دست وبازو بن گئے ۔ ۱۹۷۸ء میں آپ کو وکیل الجامعہ بنایا گیا ،جس کے لیے ڈاکٹر صاحب بہت ہی مناسب شخصیت ثابت ہوئے ،عرب دنیا سے ربط مضبوط کرنے میں ڈاکٹر صاحب نے اہم رول ادا کیا ہے ،عربی خط وکتابت کے لیے ڈاکٹر صاحب خود اپنے ہاتھ سے خط ٹائپ کرتے تھے ، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب میں نے جامعہ میں ۱۹۹۴ء میں کمپیوٹر لگایا، اس کے بعد سے ڈاکٹر صاحب کو آسانی ہوگئی۔ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میں نے کئی سفر کیے ہیں ،دو تین بار سعودیہ کا سفر کیا ہے اور امریکہ کے سفر میں بھی ہم دونوں ایک ساتھ تھے ، ہمارے دوسرے ساتھی لوگ الگ الگ کمرہ میں رہتے تھے ،مگر میں یہ کوشش کرتا کہ ہم دونوں ایک ہی کمرہ میں رہیں ، میں نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور آپ کی قدر میرے دل میں سب سے زیادہ تھی، آپ میرے والد محترم کے بہت قریبی تھے یہ نسبت بھی میرے دل میں ہمیشہ رہی۔

(محدث، بنارس: نومبر ۲۰۰۹ء ص:۷)

ایک دیگر استاذ کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

آپ کو ہر تصنیف پر جامعہ سے تنخواہ کے علاوہ معاوضہ بھی دیا گیا جبکہ ہمارے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے کبھی معاوضہ نہیں لیا ہے۔ (ص:۸-۹)

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت عالمی شہرت یافتہ شخصیت تھی ، آپ عالم بھی تھے ،ادیب بھی تھے ،مؤرخ بھی تھے اور خطبہ بھی دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ منتظم بھی تھے ،

ایک بار آپ نے مجھے ایک سند دکھائی جو سعودیہ کی طرف سے صوت الامۃ کی بہترین ایڈیٹری پر آپ کو دی گئی تھی۔یہ آپ کے اچھے صحافی ہونے کا اعتراف تھا۔۱۱رمئی ۱۹۹۳ء کو جب آپ کو راشٹر پتی بھون میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ذریعہ اشوکا ہال میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا تو اس وقت میں بھی آپ کے ساتھ موجود تھا، کتنا اچھا لگ رہا تھا ، آپ کے ساتھ دو آدمیوں کو پاس دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے ، ڈاکٹر صاحب کی بیش بہا علمی تصنیفات، ترجمے اور کتابوں پر تبصرے آپ کی باوقار علمی شخصیت کے غماز ہیں۔ (ص:۱۰)

ڈاکٹر صاحب نے بہت سی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی ، جامعہ کے اندر جتنے اہم اور بڑے پروگرام ہوئے سب میں ڈاکٹر صاحب کا عظیم حصہ ہے ، جماعت کی آخری دونوں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنسوں میں آپ ہی صدر مجلس استقبالیہ رہے۔ہمارے یہاں جلسوں اور مدرسہ کے سالانہ پروگراموں میں ہماری خواہش رہتی کہ ڈاکٹر صاحب ہی صدارت فرمائیں...

اقتدار والے اپنے اقتدار میں گم ہیں ،ان کو کسی کے مشورہ کا پاس نہیں ،ہمیں جو کرنا ہے کریں گے۔اب تو اقتدار اور کرسی کو باقی رکھنے کا گر بھی آ گیا ہے،جس کو مخالف پاؤ اس کو باہر کرو۔اپنی تعریف لکھواؤ اور اس کو چھاپو، آج دنیا میں ترقی اور نیک نامی اس کا نام ہے....

ہمارے ڈاکٹر صاحب اس سے مختلف تھے ،ہم لوگ چارٹرم سے آپ کو صدارت قبول کرنے کے لیے کہہ رہے تھے ، یہ منصب صاحب منصب کے لیے ہے، آپ کی

بھی سوچ تھی، آج وہ ہم میں نہیں رہے، یہ منصب پھر خالی ہو گیا'' (ص:۱۱)

(محدث بنارس۔نومبر ۲۰۰۹ء)

۳۔مولانا حفیظ الرحمٰن اعظمی عمری: استاذ جامعہ دار السلام، عمرآباد

''....قاہرہ سے واپسی کے بعد میدان کار کی تلاش شروع بھی نہیں ہوئی تھی، جامعہ سلفیہ بنارس جو اس وقت مرکزی دار العلوم کہلاتا تھا اس کے افتتاح کو ایک ڈیڑھ سال ہی کی مدت گزری تھی، اس کے لائق ناظم اعلیٰ مولانا عبد الوحید عبد الحق رحمانی کی جوہر شناس نگاہوں نے ازہری صاحب کو تاک کر گرفتار کرلیا۔ ۱۹۶۸ء میں جامعہ سلفیہ سے وفا کا جو عہد و پیمان استوار ہوا وہ ۲۰۰۹ء تک یعنی آپ کے سفر آخرت تک پورے اکتالیس سال برقرار رہا: ؏

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

جامعہ سلفیہ سے وابستہ ہوئے تو اپنے آپ کو اس میں ایسا داخل اور شامل کر دیا کہ اس کے خادم، ناظم (۱) معلم، ترجمان، سفیر، صدر...غرض ہر حیثیت سے اس کی ڈوب کر ٹوٹ کر بھرپور خدمت انجام دی۔ سلفیہ کا ترجمان ''صوت الأمة'' آپ کے دم قدم سے جاری ہوا۔ اخیر دم تک آپ ہی اس کے روح رواں رہے، زبان و بیان پر آپ کو دسترس تھی اور قلم پر ایسی گرفت کہ آپ کا اشہب قلم ہر حساس مسئلے کو لے کر سرپٹ دوڑتا چلا جاتا۔''

(ماہنامہ راہ اعتدال، عمرآباد: دسمبر ۲۰۰۹ء ص:۴۴)

۴: مولانا شمیم احمد ندوی: ناظم اعلی جامعہ سراج العلوم السلفیہ، جھنڈانگر، نیپال

''.......پھر جامعہ سلفیہ کا رخ کیا، وہاں پر ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ اس سے قبل انہیں ۱۹۶۹ء ہی میں جب جامعہ سلفیہ بنارس سے ایک عربی مجلّہ ''صوت الامۃ'' نکالنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو اس کا مدیر مسئول بنایا گیا تھا، کیوں کہ جامعہ سلفیہ کے ذمہ داران کو اس عربی مجلّہ کو ملک و بیرون ملک اور بلاد عربیہ میں مقبول بنانے کے لیے اس سے بہتر اور معتبر نام نہیں مل سکتا تھا، انہوں نے اپنی خداداد علمی وادبی صلاحیتوں سے مجلّہ کو دنیائے علم وادب میں روشناس کرایا اور اس کی مقبولیت کو چار چاند لگائے۔

جامعہ سلفیہ کے سابق ناظم اعلیٰ مولانا عبد الوحید سلفی رحمہ اللہ نے ایک ماہر و کامیاب جوہری کی طرح اس نایاب ہیرا کی قدر و قیمت کا بروقت اندازہ کرلیا تھا۔ لہٰذا ۱۹۸۷ء (۲) میں ان کو جامعہ کا ریکٹر بنا دیا گیا، انہوں نے اپنے اس منصب سے جامعہ کو بہت فائدہ پہونچایا اور ملک و بیرون ملک اس کے تعارف کو بہت وسیع کیا اور اس کی نیک نامی و شہرت میں گراں قدر اضافہ کیا، ان کو بھی جامعہ

---

(۱) جامعہ دار السلام عمرآباد وغیرہ میں سکریٹری اور ناظم کے دو الگ الگ عہدے ہوتے ہیں۔ سکریٹری کا اطلاق اس عہدے دار پر ہوتا ہے جس کے لیے ہمارے شمالی ہند میں عموماً ناظم کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور ناظم بول کر وہ لوگ غالباً ناظم تعلیمات یا وہ ذمہ دار مراد لیتے ہیں جسے ہمارے یہاں شیخ الجامعہ یا صدر مدرس کہا جاتا ہے۔ موصوف نے ازہری صاحب کے لیے ناظم کا لفظ اسی مفہوم کے اعتبار سے استعمال کیا ہے۔

(۲) یہ سہو ہے۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۷۸ء میں وکیل الجامعہ بنائے گئے تھے نہ کہ ۱۹۸۷ء میں، جیسا کہ مولانا عبداللہ سعود صاحب ناظم اعلی جامعہ سلفیہ بنارس کی اس تعلق سے صراحت گزر چکی ہے۔ افسوس کہ اس سہو کا ارتکاب متعدد افراد کی طرف سے ہوتا چلا آرہا ہے۔

سے جو لگاؤ تھا اس کو ناپنے کے لیے ابھی تک کوئی پیمانہ نہیں بنا ہے، عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ انہوں نے جامعہ سلفیہ کی خدمت میں صرف کیا، جامعہ کے شعبۂ نشر واشاعت- جہاں سے سینکڑوں اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں- کے بھی نگران اعلیٰ بنائے گئے اور اس طرح اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ جامعہ سلفیہ کی خدمت اور اس کی تعمیر وترقی میں صرف کیا، فاضل وقت کو کتابوں کی تصنیف وتالیف، ترجمہ وتبییض، کتابوں کے مقدمات تحریر کرنے اور ''صوت الامۃ'' کا افتتاحیہ لکھنے میں صرف کیا۔ اس طرح ان کا وقت بہت ہی مصروف اور علمی مشاغل سے معمور گزرا۔''

(ماہنامہ السراج: اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء ص:۱۶)

۵۔ مولانا عبد الرزاق عبد الغفار سلفی: فاضل جامعہ سلفیہ بنارس، مقیم دبئی، متحدہ عرب امارات

''جامعہ سلفیہ بنارس کے ناظم اول مولانا عبد الوحید عبد الحق سلفی رحمہ اللہ کی دور بینی اور مردم شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ ان کی نظر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جیسے دانا وبینا اور دور اندیش ومعاملہ فہم شخص پر پڑی اور پھر منتخب کر لیا اور جامعہ سلفیہ بنارس کے تمام خارجہ امور کو ان کے ہی سپرد کر دیا، تا کہ وہ اپنے حسن تدبر وتدبیر سے جامعہ کے خاکوں میں مناسب رنگ بھر سکیں اور اس کے مستقبل کو روشن بنا سکیں۔

ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ میں بڑائی تھی دانائی تھی، یہی وجہ ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس کو مرکزی مقام دلانے میں خواہ اندرون ملک کا معاملہ ہو یا بیرون ملک کا، اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کا مرکزی کردار رہا ہے۔ بڑی لگن اور خلوص سے جامعہ کے کاز کو آگے بڑھانا، لوگوں سے رابطے پیدا کرنا اور پھر ان سے خط وکتابت کرنا، ہر ماہ ''صـــوت الأمة'' میں نئے نئے مضامین شائع کر کے عالم اسلام میں پھیلانا اور جامعہ سلفیہ کے نام کو روشن کرنا، اس کے مورال کو بلند کرنا اور اردو صحافت کے ساتھ ساتھ عربی صحافت کا اعلیٰ معیار قائم کرنا، یہ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی انتھک اور بے لوث کوششوں کے نتیجہ میں ہی ہو سکا۔''

(نور توحید: نومبر- دسمبر ۲۰۰۹ء ص:۱۷-۱۸)

۶۔ مولانا عبد اللہ عبد التواب مدنی: صدر مرکز التوحید، جھنڈا نگر، نیپال

''گذشتہ چالیس برسوں سے جامعہ سلفیہ بنارس کے در و دیوار پر جس شخصیت کی چھاپ سب سے زیادہ نمایاں اور روشن نظر آتی ہے وہ بلاشبہ علامہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی ذات والا صفات ہے، جن کی زندگی کی ہر ساعت صرف اور صرف جامعہ سے منسوب رہی، آپ جس وقت جامعہ تشریف لائے وہ ابتدائی ایام تھے، اساتذہ کرام کی بالیاقت جماعت موجود تھی، جن سے آپ کو حوصلہ ملا، منتظمین جامعہ نے تشجیع کی، آپ نے قدم آگے بڑھائے، مختلف شعبہ جات کی نگہداشت کی۔ بحیثیت وکیل الجامعہ، جامعہ کے تعلقات ذی علم شخصیات اور تعلیمی ورفاہی جامعات وجمعیات سے استوار کیے، شعبہ اشاعت کو امتیاز بخشا، سیکڑوں کتب کی اشاعت کے لیے راہ ہموار کی، ان پر مقدمات لکھے اور اس باب میں وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال برصغیر کی اردو دینی دنیا میں مفقود ہے، ''مجلہ صوت الامۃ'' کی ادارت آپ کے ہاتھوں میں آئی، جس کے اوراق پر آپ کے علمی نقوش ثبت ہوتے رہے، طلبۂ جامعہ کی تربیت کے باب میں حضرت ازہری رحمہ اللہ کا ایک

خاص انداز تھا، وہ اپنے مخصوص مزاج کی بنیاد پر طلبہ سے بے تکلف ہو ہی نہیں سکتے تھے، اسی لیے ان کی موجودگی میں مجلس کا وزن قائم اور اعتبار و وقار باقی رہتا۔''

(ماہنامہ نور توحید: نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء، ص:۴)

۷۔ مولانا ابوالعاص وحیدی: پرنسپل جامعہ عربیہ قاسم العلوم، گلرہا، بلرام پور

''محترم ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کا جو دینی و جماعتی منہج فکر تھا، وہ مختلف انداز سے اس کے فروغ و اشاعت کی بھی کوشش کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں مختلف مکاتب فکر کے اصحاب علم اور دینی وعصری جامعات کے مفکرین کو مدعو کیا اور جامعہ سلفیہ کے حوالہ سے تحریک اہلحدیث اور سلفی منہج فکر کو متعارف کرایا، اسی بنا پر میرا احساس ہے کہ سلفیت کا جو تعارف جامعہ سلفیہ کے ذریعہ ہوا ہے اس میں ازہری صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف اعتبار سے جامعہ سلفیہ کے عروج وارتقاء میں بھی ازہری صاحب کی مختلف کوشش اور لگن شامل رہی ہے....''

(ماہنامہ السراج: اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء ص:۵۳)

۸۔ مولانا عبدالمنان سلفی: وکیل الجامعہ واستاذ جامعہ سراج العلوم السلفیہ، جھنڈا نگر، نیپال

''۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ جب مصر سے ہندوستان واپس آئے تو جامعہ سلفیہ بنارس میں تعلیمی افتتاح کا یہ دوسرا سال تھا، جامعہ سلفیہ بنارس کے بالغ نظر ناظم مولانا عبدالوحید سلفی رحمہ اللہ کی مردم شناس نگاہ نے ڈاکٹر ازہری کی خفیہ صلاحیتوں کو تاڑ لیا اور اس گلشن رسول کی آبیاری کے لیے آپ کو منتخب کر لیا اور آپ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، ڈاکٹر ازہری رحمہ اللہ کو بھی اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جامعہ سلفیہ بنارس کی شکل میں ایک باوقار پلیٹ فارم عطا کیا اور موصوف جامعہ سلفیہ کی خدمت میں جی جان سے جٹ گئے، تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف اور ترجمہ کا سلسلہ بھی شروع ہوا، اور جب ۱۹۶۹ء میں جامعہ سے عربی ماہنامہ نکالنے کا فیصلہ ہوا تو آپ کو اس کا مدیر مسئول منتخب کیا گیا اور شیخ الجامعہ استاذ محترم مولانا عبدالوحید سلفی رحمہ اللہ آپ کے معاون مقرر کیے گئے، پھر جب آپ کی سربراہی میں علمی کاموں کا اور جامعہ سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور اس مقصد سے ادارۃ البحوث العلمیۃ کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کے ڈائرکٹر اور نگراں مقرر کیے گئے، اسی طرح جامعہ کے تعلیمی وتربیتی نظام کو بہتر سے بہتر بنانے اور ملک وبیرون ملک جامعہ کے تعارف کے لیے آپ کو وکیل الجامعہ کا منصب تفویض کیا گیا، اس طرح اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ڈاکٹر صاحب نے جامعہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔''

(ماہنامہ السراج: اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء۔ص۲۴)

اسی مضمون میں آگے ایک جگہ **''ازہری صاحب اور جامعہ سلفیہ''** کا عنوان لگا کر مولانا عبدالمنان صاحب لکھتے ہیں:

''یہ عنوان اہم بھی ہے اور نازک بھی، اہم اس معنی میں کہ اس حوالہ سے کچھ لکھے بغیر آپ کا سوانحی خاکہ مکمل ہی نہیں ہو سکتا کہ آپ کی تمام تر علمی، دعوتی، تدریسی اور تصنیفی سرگرمیوں کا محور ومرکز جامعہ سلفیہ ہی رہا ہے اور آپ نے اپنی ساری خدمات اسی کے پلیٹ فارم سے انجام دیں۔ اور نازک بایں طور کہ اس حوالہ سے بعض ایسے تلخ

حقائق ہیں کہ جن کا ذکر بعض لوگوں کی دل آزاری کا باعث ہوگا، خیر میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ عقلمنداں را اشارہ کافی است۔

حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ۴ر دہوں تک جامعہ سلفیہ اور ڈاکٹر ازہری دونوں لازم وملزوم رہے ہیں، یعنی کسی ایک کا ذکر دوسرے کے بغیر تشنہ اور نامکمل قرار پائے گا، ازہری صاحب جب جامعہ سلفیہ تشریف لائے تو یہ ننھا منا پودا تھا، وہاں تعلیمی سلسلہ شروع ہوئے محض دو برس ہی گذرے تھے۔ ازہری صاحب نے آنے کے بعد اس ننھے منے پودے کو اپنے خون جگر سے سیراب کر کے اسے ایک تناور درخت کی شکل دی، اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں اس کے فروغ وترقی کے لیے وقف کر دیں، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، سفر وحضر ہر وقت اور ہر موقع پر جامعہ کے علمی ارتقاء کے منصوبے تیار کرتے، بالغ نظر اور مردم شناس ناظم جامعہ مولانا عبد الوحید سلفی رحمہ اللہ سے تبادلۂ خیالات کرتے اور مل جل کر انہیں عملی جامہ پہناتے، ناظم صاحب رحمہ اللہ بھی ڈاکٹر صاحب پر پورا اعتماد کرتے، ان کے مشوروں کو اہمیت دیتے اور ان کی تجاویز اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے، اس میں ادنی بھی مبالغہ نہیں کہ جامعہ سلفیہ بنارس نے چند برسوں میں ترقی اور عروج کے جس مقام پر قدم رکھا تھا اس میں سب سے بڑا دخل انہیں دونوں بزرگوں کی مخلصانہ کوشش اور عمل پیہم ہی کا تھا۔

جامعہ سلفیہ بنارس اور اس کے ذمہ داران نے بلاشبہ ڈاکٹر ازہری کو اپنے علمی، فکری، دعوتی اور انتظامی جوہر دکھانے کا موقعہ اور پلیٹ فارم دیا تھا، مگر یہ حقیقت ہے کہ ازہری صاحب نے جامعہ سلفیہ کو اس سے کہیں زیادہ لوٹایا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ بعض حساس اور ذمہ دار حضرات نے برملا کہا کہ ازہری صاحب جامعہ سلفیہ سے نہیں بلکہ جامعہ ازہری صاحب سے ہے۔ ممکن ہے اس میں کوئی مبالغہ ہو مگر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ جامعہ سلفیہ کی تعمیر وترقی میں سب سے اہم رول ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ ہی کا ہے جنہوں نے اپنی بھاری بھرکم اور قد آور علمی شخصیت، اپنے ذاتی اثر ورسوخ اور جہد پیہم سے جامعہ کو ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا اور دیکھتے دیکھتے اسے برصغیر کے نمایاں اور چنیدہ تعلیمی، دعوتی اور نشریاتی اداروں کی فہرست میں ممتاز مقام دلایا۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں دینی اداروں کی تاریخ میں اکثر وبیشتر اس قسم کے تاریخی گھپلے اور گھٹالے ہوتے رہے ہیں کہ خون جگر کسی نے جلایا، محنت اور جدوجہد کسی نے کی اور سہرا کسی اور کے سر باندھ دیا جاتا ہے اور ایسے مخلصین اور ان کی مساعی جمیلہ کو بھول کر بھی نہیں یاد کیا جاتا، امید کہ جامعہ سلفیہ اپنے اس محسن عظیم کے حوالہ سے اس غلطی کا اعادہ نہ ہونے دے گا"

(ماہنامہ السراج: اپریل تا جولائی ۲۰۱۰ء۔ ص:۳۰-۳۱)

۹۔ مولانا عبد الواجد فیضی: نائب مدیر ماہنامہ نوائے اسلام، دہلی

"...یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے۔ ہندوستان آنے کے بعد آپ کی علمی وادبی شخصیت پر حضرت مولانا عبد الوحید عبد الحق سلفی رحمۃ اللہ علیہ ناظم جامعہ سلفیہ بنارس کی نظر پڑی اور آپ نے ڈاکٹر موصوف کو جامعہ سلفیہ کے لیے منتخب فرمایا اور ۱۹۶۸ء میں آپ عربی ادب کے لیے استاد منتخب ہوگئے۔ آپ کی عربی زبان وادب کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے جامعہ

سلفیہ بنارس نے ۱۹۶۹ء میں ''صوت الامۃ''(۱) کے نام سے عربی ماہنامہ شروع کیا اور آپ کو اس کا مدیر اور نگراں بنا دیا گیا۔ آپ اس کی ادارت زندگی کی آخری سانس تک فرماتے رہے اور یہ دینی عربی مجلہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم فل اور ۱۹۷۵ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی اور دوران تیاری مقالہ آپ ایک سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی ادب بھی پڑھاتے رہے۔ جامعہ سلفیہ بنارس میں آپ کی ذات ایک ممتاز ماہر علم وفن اور انتظامی امور میں قابل فخر محسوس کی گئی اور آپ کو جامعہ کا ریکٹر بنا دیا گیا اور آپ جامعہ سلفیہ کی نمائندگی ہند و بیرون ہند کرتے رہے جس سے جامعہ کو پروان چڑھانے میں کافی مدد ملتی رہی''

(نوائے اسلام، دہلی۔ نومبر ۲۰۰۹ء۔ ص: ۴۷-۴۸)

تعزیتی خطوط سے:

۱۰- مولانا انیس الرحمٰن صاحب عمری مدنی: سابق استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

''...موصوف کی وفات یقیناً جامعہ سلفیہ کے لیے بڑا نقصان ہے۔ موصوف نے جامعہ کی ترقی وتعارف کے لیے جو محنتیں کیں وہ ناقابل فراموش ہیں...''

۱۱- ڈاکٹر عبد الباری خاں: ناظم جامعہ اسلامیہ خیر العلوم، ڈومریا گنج، یوپی

''...محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے انتقال سے صرف ان کے اہل خانہ اور اراکین جامعہ سلفیہ بنارس کو ہی صدمہ نہیں پہنچا ہے، بلکہ اہل حدیثان ہند کا ہر فرد سوگوار ہے۔ وہ ایک مایہ ناز ہستی تھی، اور آپ بہت ساری خوبیوں کے مالک تھے، اللہ نے ان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ان کی رحلت سے علمی دنیا کو اور خصوصا جامعہ سلفیہ بنارس کو سخت نقصان پہنچا ہے...آپ جامعہ سلفیہ بنارس اور جماعت اہل حدیث ہند کے مخلص اور بے لوث خادم تھے۔ آپ جیسی عبقری شخصیت کا ملنا بہت مشکل نظر آتا ہے...''

۱۲- مولانا نور العین سلفی: استاذ کلیہ فاطمۃ الزہراء، مئو

''...حافظ صاحب موصوف جامعہ سلفیہ کے قدیم مخلصین اور محسنین میں سے تھے، انھوں نے اپنی مخلصانہ کوششوں سے جامعہ سلفیہ اور جماعت وملت کو بہت کچھ دیا ہے۔ موصوف کی جدائی سے جامعہ سلفیہ اور جماعت میں جو خلا پیدا ہوا ہے دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کا نعم البدل عطا فرمائے۔''

ان ہی چند تاثرات اور افادات پر اکتفا کرتے ہوئے ہم اللہ رب العالمین سے دعا کرتے ہیں کہ موصوف نے اس عظیم دینی وعلمی ادارے کی جو بھی خدمت انجام دی اسے اور آپ کی دیگر تمام نیکیوں کو قبول فرمائے۔ آپ کی رحلت سے جامعہ، جماعت اور ملت کا جو خسارہ ہوا ہے اس کی بھر پائی کی سبیل پیدا کر دے۔ آپ کی بشری لغزشوں کو درگزر فرمائے۔ اور جنت الفردوس میں آپ کو جگہ دے۔ آمین

☆☆☆

(۱) ابتدا میں اس مجلہ نام صوت الجامعہ تھا، اس کے بعد مجلۃ الجامعۃ السلفیۃ کے نام سے شائع ہوتا رہا اور آخر میں صوت الامۃ کے نام شائع ہونے لگا اور اب تک اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔

مولانا عبدالسلام سلفی
امیر صوبائی جمعیۃ اہل حدیث، ممبئی

مفکر اسلام ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

کچھ بکھری یادیں

جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس میں ۱۹۸۰ء کے رواں تعلیمی سال میں داخلہ ملا وہ ہمارا عالمیت کا پہلا سال تھا۔ اسی سال جامعہ میں ''مؤتمر الدعوۃ والتعلیم'' کے عنوان سے ایک عظیم کانفرنس منعقد ہونے جارہی تھی جس کا چرچا پورے ملک میں تھا۔ جامعہ سلفیہ کا یہ پہلا ملک گیر سطح کا پروگرام تھا۔ اس دعوتی وتعلیمی کانفرنس میں امام حرم سماحۃ الشیخ محمد بن عبداللہ السبیل بھی تشریف لارہے تھے، امام کعبہ کی کسی کانفرنس میں شرکت ہی اس کی عظمت، افادیت اور مقبولیت وشہرت بڑھانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ آج سے تیس سال پہلے کسی ادارہ یا اسٹیج پر امام حرم کی آمد تو اور بڑی اہمیت کی بات تھی۔

لوگ ملک کے ہر گوشے سے بہ شوق فراواں دیوانہ وار امام صاحب سے ملاقات وزیارت کے لئے عازم سفر تھے، اس طرح کانفرنس کی ایک لہر بن گئی۔ بہت سارے احباب جماعت جنہوں نے عرصہ سے اپنی مرکزی درسگاہ دیکھنے کا شوق وجذبہ دلوں میں نہاں رکھا تھا وہ بھی اس موقع کو غنیمت سمجھ رہے تھے، اس لئے ہر طرف کانفرنس کا چرچا ہی چرچا تھا۔ ادھر جامعہ میں بھی موتمر کی تیاریوں کی ہماہمی تھی ارباب جامعہ واساتذہ کرام ہر سطح پر کانفرنس سے متعلق تیاریوں میں پورے حوصلے کے ساتھ لگے تھے، انہیں میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی پروقار، سنجیدہ وبارعب شخصیت بھی تھی۔ آپ کانفرنس کے مسائل میں قائدانہ رول کررہے تھے کبھی ذمے داران جامعہ، کبھی اساتذۂ جامعہ، کبھی دیکھا گیا کہ ترانۂ جامعہ کی مشق کرتے ہوئے طلبہ کے ساتھ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اس کانفرنس میں ہی نہیں بلکہ جامعہ کے تمام شعبوں میں بنیادی رول ہوتا تھا، تدریس میں ایک موقر استاذ تھے۔ شعبۂ تالیف وترجمہ کے نگرانِ اعلیٰ تھے جامعہ کے ماہانہ عربی مجلّہ ''صوت الامۃ'' کے مدیر تھے اور وکیل الجامعہ ہونے کی حیثیت سے جامعہ کے تمام داخلی وخارجی امور ومفادات کے محافظ تھے آپ نے جامعہ کی بھرپور خدمت کی جس کے لازوال اثرات اس پر ثبت ہیں۔

جامعہ اور اس کے تعلیمی وتربیتی ودعوتی مشن سے عملی وقلبی لگاؤ اور قربانیوں کی بنیاد پر اس کی شناخت بن گئے اسی وجہ سے منتظمہ کمیٹی نے بالاتفاق آپ کو جامعہ کا عظیم

منصب منصب صدارت تفویض کردیا جس کے ڈاکٹر صاحب تاحیات صدرر ہے۔ یہ درحقیقت جامعہ کی خدمات کے ساتھ آپ کی علمی حیثیت کا کمیٹی کی طرف سے ایک ایماندارانہ اعتراف تھا۔

ڈاکٹر ازہری صاحب جامعہ کے مسائل سے نبرد آزماہوتے ہوئے جماعت وجمعیت اور ملت کے مسائل پر گہری نظر اور پکڑ رکھتے تھے، ان کا بھر پور تجزیہ کے ساتھ حل پیش کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کو مفکر جماعت وملت تسلیم کیا گیا۔ آپ میں سلفیت اور مسلک عمل بالکتاب والسنۃ کی غیرت بھی بدرجہ اتم تھی۔ جامعہ سے مسلکی تناظر میں شائع شدہ کتابوں پر آپ کے گراں قدر مقدمات اس پر خصوصی شاہد ہیں۔ ساتھ ہی ۲۰۰۱ء میں صوبائی جمعیت اہل حدیث ممبئی کی طرف سے ’’دین رحمت کانفرنس‘‘ میں بھی آپ کی سلفی غیرت کا ایک نمونہ مشاہدہ میں آیا۔ دین رحمت کانفرنس (ممبئی) میں ایک مجلس بعد نماز عصر تا مغرب سوال وجواب کے لئے مختص تھی۔ سوالوں کا جواب دینے کے لئے علماء کبار اور بعض دانشواران کا ایک بورڈ بنایا گیا تھا تا کہ ہر میدان کے سوال کے لئے اکسپرٹ جواب دینے کے لئے موجود ہوں۔ اس مجلس کے ایک رکن ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بھی تھے۔ سیشن بڑی کامیابی سے چل رہا تھا بورڈ کے ایک دانشور اکسپرٹ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے امت کے تفرقہ باز فرقوں میں جماعت اہلحدیث کو بھی شمار کیا اور یہ بھی کہا کہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کے ساتھ اہل حدیث بھی ایک فرقہ ہے ان نسبتوں سے بچ کر صرف مسلمان کہنا چاہئے انہوں نے جماعت اہل حدیث کو تقلیدی فرقوں میں شمار کرکے پوری کانفرنس کے اہلحدیث علماء اور عوام میں بے چینی پھیلادی۔ کچھ نوجوان کم پڑھے لکھے، اصول اسلام سے نابلد مگن ہو گئے کہ ہاں اہلحدیث بھی ایک فرقۂ مذمومہ ہے۔ مولانا محمد مقیم صاحب فیضی جو اس مجلس کی نظامت کررہے تھے انہوں نے اس کا مختصر علمی انداز میں جواب دے کر سلسلۂ سوال وجواب کو آگے بڑھادیا لیکن بے چینی عوام کی سطح پر ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مزید تفصیلی وضاحت کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی تا کہ جماعت اہلحدیث کے تئیں پھیلی تشویش اور کنفیوژن ختم ہو۔ میں نے اس وقت جمعیت کے ذمے دار ہونے کی حیثیت سے فوری فیصلہ لیا کہ اسٹیج پر بیٹھے اپنے اکابرین علماء سے مشورہ لے کر اس مسئلہ کی وضاحت کی جائے تا کہ کانفرنس میں عوامی سطح پر پھیلے شبہات کا دفعیہ ہوجائے۔ مشہور عالم دین مولانا عبدالحمید صاحب رحمانی کا نام اس کے لئے تجویز ہوا۔ اس کانفرنس میں آپ کا موضوع بھی ’’سلفیت کا امتیاز‘‘ ہی تھا، رحمانی صاحب کی گفتگو سے عوام وخواص سب مطمئن ہو سکتے ہیں، سارے بڑے علماء نے تائید فرمائی ڈاکٹر صاحب نے بھی اس تجویز کی تائید فرمائی مزید آپ نے کہا کہ اس اسٹیج پر وہ اس کام کے لئے سب سے بہتر ہیں۔ انہیں موقع دیا جائے، یہ ڈاکٹر صاحب کی سلفی غیرت کی دلیلوں میں سے ہے۔ یہ بات اس لئے تذکرہ میں آگئی کہ کچھ لوگ ان کی سلفی غیرت کے تعلق سے کمزور رائے رکھتے ہیں، ہر عالم کا ایک اسلوب اور اس کا طریقۂ کار ہوتا ہے تھوڑی گہرائی

سے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک بلند پایہ صحافی وقلمکار تھے اردو، عربی دونوں زبانوں پر یکساں دسترس رکھتے تھے زبان وقلم کا بھرپور ادیبانہ استعمال کرتے تھے، آپ کی تحریریں فصاحت وبلاغت سے لبریز ہوتی تھیں، آپ کی گراں قدر علمی تصنیفات اور تحریریں جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہیں وہ اس کی بین دلیل ہیں۔ حالات حاضرہ پر بھی زبردست لکھتے تھے کاش انہیں جمع کیا جاتا تاکہ استفادہ آسان ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب ایک اچھے خطیب بھی تھے قلم کے ساتھ آپ کی زبان بھی سشتہ اور رواں تھی۔ سنجیدہ علمی، اصلاحی مستند محاضرہ اور خطاب کرتے تھے۔ خطبۂ جمعہ تو معمولات کا ایک حصہ تھا اسی لئے ملکی سطح کی کانفرنسوں میں آپ صف اول میں ہوتے تھے۔ تربیتی محاضرہ کے ساتھ اکثر صدارتی خطبے پیش فرماتے تھے جو بڑے قیمتی ہوتے تھے، آپ عموماً سرنیچے کئے فکر وتفکر کی دنیا میں مشغول رہتے دیکھنے میں ایسے لگتے کہ آپ خطیب نہیں ہوں گے حقیقت یہ ہے کہ آپ کے زبان وقلم میں دریا کی روانی تھی بقول شاعر ؎

جو چپ بیٹھوں تو اک کوہِ گراں معلوم ہوتا ہوں
زبان کھولوں تو اک دریا رواں معلوم ہوتا ہوں

ڈاکٹر صاحب جامعہ کے طلبہ وفارغین کے ساتھ مشفقانہ ومربیانہ سلوک کرتے تھے، جیسی جن طلبہ میں صلاحیت دیکھتے ویسی رہنمائی فرماتے حقیقی معلم ومربی کا یہی طریقہ ہوتا ہے اس کی بہت ساری مثالیں ہیں۔ اس وقت جامعہ اسلامیہ مدینہ میں جامعہ کے فارغین کی ایک بڑی تعداد کو داخلہ ملتا تھا، دیکھا جاتا کہ طلبہ سفر کے اخراجات کے متحمل نہیں ہیں۔ طلبہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں پہنچتے وہ فوراً دفتر مالیات کو ایک آرڈر کرتے کہ ان طلبہ کو بطور قرض مطلوبہ رقم فراہم کردی جائے خود میرے ساتھ بھی آپ کا برتاؤ بڑا مربیانہ واصولی ہوتا تھا۔ ۱۹۸۴ء میں بھدوہی میں ایک بڑی کانفرنس ہورہی تھی جس میں بین الجامعات مسابقہ بھی ہونا طے تھا اس کانفرنس کے مقابلے میں حصہ لینے کے لئے جب جامعہ کے طلبہ کے نام کی تجویز ہونے لگی تو رفیق مکرم شیخ ابوالمکرّم سلفی مرحوم کے ساتھ میرا نام بھی ڈاکٹر صاحب نے تجویز کیا جس کی تائید مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری نے بھی فرمائی۔ ان تاریخوں میں گھر میں ایک اہم شادی تھی جس کی وجہ سے میں نے معذرت کردی جامعہ کی طرف سے مولانا ابوالمکرّم سلفی نے اس مقابلہ میں حصہ لیا اس طرح جامعہ نے پہلا درجہ اور انعام حاصل کیا۔ فللہ الحمد

جامعہ میں یہ مولانا ابوالمکرّم کا آخری سال تھا فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان کے ساتھ خصوصی تعاون فرمایا اور اپنی علمی وقلمی سرپرستی میں ایک عرصہ تک رکھا۔ فجزاه الله عنا وعن جميع اخواننا السلفين۔

جب میں ۱۹۸۵ء میں جامعہ سے عالمیت وفضیلت مکمل کرکے اپنے وطن نوگڈھ آگیا کچھ دنوں کے بعد دیکھتا ہوں ڈاکٹر صاحب کا ایک مکتوب آیا۔ اس تحریر سے ڈاکٹر صاحب نے الدار السلفیہ ممبئی جانے کے لئے طلب فرمایا تھا جہاں جامع شعب الایمان للبیہقی پر

تخریج وتحقیق کا کام محقق جماعت ڈاکٹر عبدالعلی ازہری کی قیادت ونگرانی میں چل رہا تھا۔ ایک دو روز بعد امرتسری دوراں مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری کا بھی ایک خط ملا۔ آپ نے صوبائی جمعیت اہلحدیث مشرقی یوپی میں بحیثیت مبلغ کام کرنے کے لئے طلب فرمایا تھا۔ اس وقت صوبائی دفتر شہر بنارس میں تھا اور مولانا صوبائی جمعیت کے کلیدی ذمہ دار تھے۔ میں جلد ہی بنارس آ گیا مولانا صفی الرحمٰن صاحب کو ڈاکٹر صاحب کا گرامی نامہ دکھایا تو آپ نے ڈاکٹر صاحب کی تجویز کی تائید فرمائی اور کہا کہ تمہارے لئے ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ازہری کی ماتحتی میں تحقیق وتخریج کا علمی کام بہت مفید ہوسکتا ہے تم بلا تردد ممبئی چلے جاؤ صوبائی جمعیت کے لئے کوئی تجربہ کار مبلغ مل جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب سے ایک تحریر لے کر الدار السلفیہ ممبئی پہنچ گیا۔

ڈاکٹر ازہری صاحب کا جمعیت اہل حدیث۔ جو اہلحدیثان ہند کی سوسالہ قدیم دعوتی، تربیتی ورفاہی تنظیم ہے۔ سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا اس کی سرگرمیوں اور اہداف سے متفق تھے اس کی کوششوں کی قدردانی وحوصلہ افزائی فرماتے تھے ساتھ ہی اس میں اصلاح کے تقاضوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالتے تھے۔ ذمے داران کو ہدایات بھی کرتے تھے، مرکزی جمعیت کے دستور سے لے کر اس کے سامنے آنے والے خارجی وداخلی مسائل پر ذمے دارانہ رائے دیتے تھے۔ مرکزی جمعیت سے گہری وابستگی کی یہ بڑی دلیل ہے کہ اس کی تین اہم آل انڈیا کانفرنسوں میں صدر مجلس استقبالیہ منتخب ہوئے اور آپ نے اس ذمے داری کو اس کے شایان شان نبھایا۔

میوناتھ بھنجن میں منعقدہ ۲۷ویں آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس ۱۹۹۵ء، پاکوڑ جھارکھنڈ میں منعقدہ ۲۸ویں آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس ۲۰۰۴ء، رام لیلا گراؤنڈ دہلی میں منعقدہ ۲۹ویں آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس ۲۰۰۸ء ان مذکورہ بالا آل انڈیا اہلحدیث کانفرنسوں میں آپ کے گراں قدر خطبے ہوئے جو مطبوع ہوکر بڑی تعداد میں تقسیم بھی ہوئے۔

ممبئی سے بھی ڈاکٹر صاحب کا رشتہ قدیم تھا۔ تعلیمی دعوتی اور جماعتی مسائل کے کے لئے آنا جانا ہوتا تھا۔ صوبائی جمعیت اہلحدیث ممبئی کی سرگرمیوں سے بھی آپ واقف تھے اور اظہار اطمینان بھی فرماتے تھے جب صوبائی جمعیت کے پروگرام میں شرکت فرماتے جس میں ائمہ ومدرسین نیز مستفیدین جامعات کے لئے آپ کا تربیتی محاضرہ ہوتا اس میں صوبائی جمعیت کو آپ تلقین وتاکید کرتے تھے کہ یہ سلسلہ مسلسل جاری رکھنا چاہئے تاکہ افادیت کا سلسلہ قائم رہے، اور ہمارے ائمہ اس طرح کے پروگراموں سے استفادہ کریں۔

ان کے علاوہ صوبائی جمعیت کی طرف سے منعقدہ دین رحمت کانفرنس جو ۲۰۰۳ء میں بی کے سی کے ایک وسیع گراؤنڈ پر منعقد ہوئی اور دوسری کانفرنس ''جماعت اہل حدیث اور آزادی وطن'' کے عنوان سے ۲۰۰۷ء میں منعقد ہوئی، یہ کانفرنس شانمکھا نند ہال (سائن) میں ہوئی، یہ ایر

کنڈیشن ہال اور ایشیا کا بڑا ہال شمار ہوتا ہے جس میں تقریباً چار ہزار لوگوں کی ایک ساتھ گنجائش موجود ہے۔ ممبئی کے بڑے سیاسی وثقافتی پروگرام اکثر اسی جگہ ہوتے ہیں۔

ممبئی کے ان دونوں اہم پروگراموں میں ڈاکٹر صاحب کی شرکت رہی اور بڑی مفید رہی۔ دین رحمت کانفرنس میں آپ اور ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب مبارکپوری ایک ساتھ بذریعہ ٹرین تشریف لائے جبکہ کانفرنس کے ذمے داران کی یہ خواہش تھی کہ یہ دونوں مہمان ہماری بڑی علمی ہستیاں ہیں جن کی مشغولیات متنوع اور کثیر ہیں بذریعہ ہوائی جہاز آجائیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیجنے سے سختی سے منع کردیا۔ آپ نے کہا اس سے کانفرنس پر بڑا مالی بوجھ پڑے گا ہم لوگ اس اہم جماعتی کانفرنس کے لئے وقت نکال لیں گے۔ حسب پروگرام آپ لوگ کانفرنس سے ایک دن پہلے ہی آگئے۔ آپ لوگوں کو اسٹیشن سے لینے کے لئے جو رضا کاران مامور تھے سوء اتفاق غلط فہمی سے وی ٹی (سی ایس ٹی) کے بجائے کرلا ٹرمنس چلے گئے آپ لوگوں کو تقریباً وی ٹی میں ایک گھنٹہ حیران ہونا پڑا۔ جب دوسرے ذمے داران وی ٹی پہنچے اور معذرت کے ساتھ شرمندگی کا اظہار کیا تو ڈاکٹر ازہری صاحب نے بڑی کشادہ قلبی سے عفو ودرگذر اور صبر کا مظاہرہ فرمایا اور ذمے داراوں کو احساس غفلت وشرمندگی سے نکالا۔ آپ دونوں مہمانوں نے کہا کہ ہم لوگ یہاں تک دین اور دعوت کے لئے آئے ہیں اس راستے میں صبر لازمی اور باعث اجر ہے۔ ہم لوگ اس تکلیف سے کچھ بھی نالاں نہیں ہیں بلکہ اجر کے امیدوار ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب اور ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب کی میزبانوں کے دلوں میں قدر وعظمت اور بڑھ گئی۔

اسی دین رحمت کانفرنس میں جماعت وجامعہ کی مستند ومعتبر ہر دلعزیز شخصیت ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری کا انتقال ہوا۔ کانفرنس میں آپ کا موضوع خطاب "قضاوقدر" تھا۔ آپ نے اس پر ایک جامع خطاب فرمایا لیکن اس کے بعد قضاوقدر نے آپ کو سفر آخرت پر بھیج دیا۔ اور کانفرنس کو سوگوار بنادیا۔ خطاب کے بعد اسٹیج پر ہی آپ نے اندرونی بے چینی کا ذکر کیا بلا تاخیر رضا کاران نے "فوزیہ اسپتال" پہنچایا جہاں آپ کو بچانے کی ساری امکانی کوشش رائیگاں ہوگئیں اور وقت موعود آگیا۔ اللهم اغفرله وارحمه

یہ فوزیہ اسپتال جماعت کے ایک مخیر غیرت مند انور لکڑاوالا کی ملکیت ہے آپ کی طرف سے کانفرنس کے لئے ہر طرح کی طبی خدمات کا یہاں نظم قائم تھا۔

دوسری اہم کانفرنس جو ۲۰۰۷ء میں اس وقت منعقد ہوئی جب پورے ملک میں آزادی وطن کی تقریبات چل رہی تھیں اس وقت اراکین صوبائی جمعیت ممبئی نے طے کیا کہ آزادی وطن میں جماعت اہلحدیث کے رول پر ایک اہم کانفرنس ہونی چاہئے۔ کانفرنس اپنی مقررہ تاریخ میں منعقد ہوئی بحمد للہ بڑی کامیاب رہی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کانفرنس میں جو مقالہ پڑھا وہ بڑا وقیع، قیمتی اور مقبول تھا۔ یہ مقالہ کانفرنس میں بڑی تعداد میں تقسیم بھی کیا گیا۔ اسی کانفرنس میں صوبائی جمعیت اہلحدیث کے

آرگن ''الجماعۃ'' کا اجراء بھی ڈاکٹر ازہری صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

آبروئے جماعت ڈاکٹر وصی اللہ محمد عباس مدنی حفظہ اللہ نے بھی مکہ مکرمہ سے اس کانفرنس کو خطاب فرمایا تھا۔

بعض احباب کا اس عنوان پر ملاحظہ تھا کہ آزادی وطن کے لئے جولڑائیاں ایک طویل مدت تک جاری رہیں اس میں مذہبی ومسلکی اکائیوں کی تقسیم کاری نہیں تھی اور نہ یہ مناسب ہے کہ اس طرح کی بات ہو، بات یقیناً صحیح ہے لیکن اس وقت اس کے سوا چارہ کار نہیں رہ جاتا جب انگریزوں کے نمک خور اپنے آپ کو اصل مجاہد آزادی گنانا شروع کریں اور حقیقی مجاہدین اور ان کے قیادی رول کے خلاف تاریخ سازی کریں کہ جہاد آزادی کا اصل کردار سامنے لایا جائے اس کانفرنس میں آزادی وطن کے لئے جماعت کے مجاہدانہ بے جوڑ کردار کو مختلف مستند حوالوں کے ساتھ تفصیل سے اہل علم نے رکھا اور یہ باور کرایا گیا بالخصوص نوجوانان اہلحدیث کو کہ ان کے اسلاف نے اس ملک سے غاصب انگریزوں کو بھگانے کے لئے کتنا بڑا رول کیا تھا اور کیسی کیسی قربانیاں دی تھیں۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔

یہ کانفرنس درحقیقت ''اہلحدیث اور سیاست'' جیسی عظیم فکری تاریخی سلسلے کی ایک جھوٹی سی کڑی اور امتداد تھی۔

ڈاکٹر صاحب سے صوبائی جمعیت ممبئی کے دعوتی وتربیتی پروگراموں کو موثر بنانے کے لئے گاہے بگاہے میں مشورہ لیتا رہتا تھا ہمیشہ آپ آسانی نرمی کا پہلو اختیار کرنے کی تلقین فرماتے اور تنفیری عمل سے روکتے تھے، یسـرا ولاتـعسرا بشرا ولاتنفرا کو پیش نظر رکھنے کی ہدایت کرتے تھے۔

۲۰۰۸ء کے سالانہ تعطیل کے موقع پر نوگڈھ کے کچھ جماعتی بھائیوں کی خواہش ہوئی کہ عام روایتی جلسوں سے ہٹ کر کچھ اجلاس عام ہوں ساتھ ہی علاقہ کے ائمہ، علماء وفارغین کے لئے تربیتی ورکشاپ بھی منعقد ہو اس وقت بھی ڈاکٹر صاحب تین دنوں کے لئے مئی کی سخت گرمی میں تشریف لائے اور نوگڈھ میں کئی مقامات پر آپ کا تربیتی خطاب ہوا۔ آپ نے ان پروگراموں میں ۱۹۶۱ء کی نوگڈھ کانفرنس کے ثمرات بھی اہل علاقہ کے سامنے رکھا آپ نے بتایا کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی نوگڈھ کانفرنس سے آزادی کے بعد جماعت کی نشاط ثانیہ ہوئی۔ اور جماعت کے لئے ایک مرکزی دار العلوم کے قیام کا فیصلہ بھی اسی نوگڈھ کانفرنس میں ہوا، جو جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس کی شکل میں قائم ہے اور پوری جماعت کے لئے باعث فخر وسرور ہے۔ اس سفر میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہمارے فاضل ساتھی مولانا مظہر علی مدنی حفظہ اللہ بھی تھے سدھارتھ نگر ضلع کی سطح پر اہل علم کی ایک بڑی تعداد نے آپ سے استفادہ کیا اور مختلف مسائل پر مشورے حاصل کئے۔

ڈاکٹر صاحب کی یاد میں یہ چند متفرق وبے ربط باتیں جو نوک قلم پر آئیں میں نے اس لئے لکھ دی ہیں تا کہ آپ کی شفقتوں کو یاد رکھا جاسکے اور آپ کے مثالی نمونوں کے نقوش کی پیروی کی جاسکے۔ اللهم اغفرله وارحمه وعفه واعف عنه

☆☆☆

مولانا فضل اللہ سلفی
بھوارہ مدھوبنی، بہار

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

اور ایک یہ بھی پہلو

یہ دنیا اپنے تمام تر مافیہا کے ساتھ فانی ہے، خود اسے بقائے دوام حاصل نہیں تو پھر مافیہا کیسے باقی رہے گا۔ سب موجودات ومخلوقات کو بالآخر ختم ہو جانا ہے۔ کل من علیھا فان قرآن کا بیان ہے انبیاء ورسل، صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین، فقہاء وادباء ومورخین اور بڑے بڑے مفکرین ومبصرین نیز شاہ وگدا کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے کو ایک مقررہ مدت کے بعد ہمیشہ کے لئے اس دنیائے فانی سے چلا جانا ہے۔ مگر یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ اپنی جسمانی موت کے باوجود کچھ لوگ اپنے کارنامے وکمالات اور محاسن ومیزات کے سبب لوگوں کے دل ودماغ پر موجود رہتے ہیں۔ ان کو کبھی فراموش کیا ہی نہیں جاسکتا ہے۔ وہ انمٹ نقش بن جاتے ہیں اور جدا ہو کر بھی سب کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔ سب تو ایسے نہیں ہوتے اور ویسے بھی سب ایسے نہیں ہوتے، موت تو سب کی ہوتی ہے، مگر کہلاتی اس کی ہے...... جس کا زمانہ کرے افسوس، جس کا وجود اور ہست وبود اپنی معنویت، شخصی وقعت وواقعیت، قدر ومنزلت اور نفع وافادیت کا احساس تو دلاتا ہی رہتا ہے، مگر بعد از مرگ بھی اپنی انفرادیت اور کارنامے ومتنوع کمالات کے سبب لوگوں کے دل ودماغ پر اس کا اثر ونفوذ باقی رہتا ہے۔ ایسی ہی باکمال وبے مثال، نادرونابغۂ روزگار شخصیات میں سے تھے، جمعیت وجماعت کے ناز، مفکر ومدبر، مبصر ومحرر، مولف ومترجم اور جداگانہ قسم کے مدرس وخطیب صدر جامعہ سلفیہ بنارس ووکیل (سابقا) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمة واسعة وغفر له۔ جن کی شخصیت بڑی بارعب، عبقری اور علمی وفکری تھی، ان کا مجسم اور ہیولی ان کے جامع ومانع اندرون کا مظہر تھا۔ ان کے جسمانی طول وعرض اور قد وقامت سے صرف نظر۔ لیکن بلاشبہ وبنا مبالغہ کبیر إذا التفت علیه المحافل ہندوستان میں منعقد ہونے والی بڑی بڑی کانفرنسوں، اجلاسوں اور مختلف پروگراموں میں ان کی شرکت نہ کہ صرف (بہت حد تک) کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی، بلکہ اپنی بارعب وموثر اور علمی وفکری شبیہ کے سبب، ازہری صاحب سب پر چھا بھی جاتے تھے، اکثر وبیشتر اپنے صدارتی خطاب میں ان کی نکتہ دار گفتگو اور انداز بیان حاضرین وشرکاء کو اپنی طرف مائل کر لیتے اور آپ کا خطاب قطعت جهيزة قول کل خطیب کے درجہ میں ہوتا تھا۔ ایک صدر اجلاس کی حیثیت سے ان کے

صدارتی کلمات اور مخصوص لب ولہجہ میں ان کا اظہار بڑے دنوں تک ان کی یاد آباد کر کے رکھے گا، یہ ان کا فطری انداز واپنا حظ تھا، آپ واقعتہ کوئی نامور خطیب نہیں تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بڑے بڑے خطیبوں میں ''نامور'' تھے۔ بہ قول غالب۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

وہ جو تھے ہمارے ازہری صاحب -رحمہ اللہ- بالکل اسی کے مصداق جس کی تفصیلات آپ کے سامنے ان شاء اللہ آتی رہیں گی۔

جسمانی ساخت، آواز وانداز اور لب ولہجہ سب میں ہی ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ بارعب ہی نظر آتے تھے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے
بروقت تو کوئی نہیں- آئندہ -وما ذلك على الله بعزيز

تصنیف وتالیف، تدریس وتقریر، جمعیت وجامعہ (سلفیہ بنارس) کی تنظیم وتدبیر اور ملک وبیرون ملک میں منعقد ہونے والے اجلاس وپروگرام میں شرکت وغیرہ جیسی متنوع مصروفیات والی اس بارعب شخصیت کا ایک اور پہلو ہے، جس کی طرف عموماً ذہن نہیں جاتا اور بہ ظاہر لگتا بھی نہیں کہ ان کی طبیعت ومزاج میں ایسا امتزاج رہا ہوگا۔ مگر ہے یہ بات بالکل سچ کہ وہ تھے ظریف وبذلہ سنج بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی ظرافت وبذلہ سنجی میں متانت وسنجیدگی، نکتہ آفرینی، (اکثر) زیر لب ہنسی اور خاموش قسم کی ضحک کی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے، جب مادر علمی جامعہ سلفیہ۔ بارس۔ میں جمعیت ابنائے جامعہ کی تشکیل کا ایک پروگرام زیر صدارت ازہری صاحب -رحمہ اللہ- منعقد ہوا۔ نظامت کا فریضہ (سابق استاذ جامعہ ولاحق ناظم عمومی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند شیخ اصغر علی السلفی -حفظہ اللہ- انجام دے رہے تھے۔ اس پروگرام میں شیخ عبدالسلام صاحب رحمانی -حفظہ اللہ- شیخ عبدالوہاب صاحب خلجی -حفظہ اللہ- (سابق ناظم جمعیت) اور شیخ صلاح الدین مقبول احمد۔ حفظہ اللہ۔ وغیرھم بھی موجود تھے۔ بعد نماز عصر جامعہ کے دارالحدیث میں تقریباً پورے ہندوستان سے آئے ہوئے فارغین کے مجمع میں ازہری صاحب علیہ الرحمہ نے حمد وثنا کے بعد اپنے صدارتی خطبہ میں شاعر مشرق علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھنا شروع کیا:

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری، نہ میری ضرب ہے کاری

کسی بات پر قدرے ناراض پہلے سے تھے، اسٹیج پر تشریف لائے اور گھن گرج کے ساتھ یہ شعر پڑھتے ہوئے دہرا کر بولے ''مس آدم'' یہ انگریزی والا (لفظ) MIS نہیں ہے اس مجمع کا پھر تو جو حال ہوا، وہ شرکاء کو آج بھی یاد ہوگا۔ پورے مرعوب ماحول کو یکلخت بدل ڈالا اور سبھوں نے دیر تک ان کا صدارتی خطاب سنا۔ دوران خطاب وتکلم ازہری صاحب اس طرح کے الفاظ وجملوں کو داخل کر کے خشک ماحول میں ظرافت کی حلاوت پیدا کر دیتے تھے۔

۲۸ رفروری و ۱ رمارچ ۲۰۰۹ء کو کلکتہ میں ''الہدیٰ'' ایجوکیشن اینڈ ویلفیر سوسائٹی کے زیر اہتمام دین رحمت کانفرنس کے دوسرے دن تیسری اور آخری نشست کے دوران قـاعة الإستراحة جہاں پروگرام کے مدیر شیخ ذکی انور سلفی نے آرام کے علاوہ خورد ونوش کا نظم کرا دیا تھا اور وہاں ان کے کئی شاگردان موجود تھے، میں ازہری صاحب شیروانی اتارتے ہوئے تشریف لائے۔ کہا گیا کہ ''یہاں تشریف رکھئے......'' جواب میں فرماتے ہیں، تشریف رکھنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا، میری شیروانی کے اندر پہلے کوئی تشریف فرما ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ''کوئی'' کیڑا ہے، جو داخل ہو گیا تھا اور آپ اسٹیج پر سے یہاں چلے آئے تھے یہ تقریباً طے بات ہے کہ عموماً کثرت اشتغال سے ذہن میں انقباض پیدا ہوتا ہے اور منتشر دل ودماغ فکاہات کا اباء کرتا ہے مگر یہ ڈاکٹر صاحب کی جداگانہ طبیعت مزاج کا عجیب (بہ ظاہر متضاد) پہلو تھا۔

۱۴ و ۱۵ ر مارچ ۲۰۰۹ء کو مدرسہ اسلامیہ بھوارہ مدھوبنی بہار کے زیر اہتمام ''اسلام امن وانسانیت کا علمبردار'' پروگرام میں شرکت کے لئے استاذ محترم شیخ عبدالسلام صاحب مدنی (جامعہ سلفیہ بنارس) کے ساتھ ڈاکٹر صاحب بہ حیثیت صدر تشریف لائے اس پروگرام میں تقریباً پورے ہندوستان کے نامور علماء وخطباء (شیخ حافظ سلیمان صاحب میرٹھی، شیخ عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری، شیخ اصغر علی امام مہدی السّلفی، شیخ عبدالسلام سلفی ممبئی، شیخ حمید اللہ بستوی، ڈاکٹر عبدالحلیم صاحب۔ شیخ ابوالقاسم عبدالعظیم وشیخ مظہر علی مدنی مئو، شیخ معروف صاحب سلفی وشیخ ذکی انور سلفی۔ کلکتہ، اور شیخ محمد علی صاحب سلفی وشیخ خورشید عالم صاحب مدنی۔ پٹنہ وغیرھم کے علاوہ بھی دیگر...... ازہری صاحب ظہر کی نماز کے وقت قیام گاہ سے بذریعہ سیارہ نکلے، راقم الحروف ان کے ہمراہ تھا، فرماتے ہیں ''تمہارا یہ پروگرام کل ہند نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے۔ شیخ یہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔ فرمایا کہ سعودی عرب سے شیخ عبداللہ الغفیلی / عمید شئون الطلاب جامعہ اسلامیہ مدینہ، بھی تو آرہے ہیں، بس ہو گیا اصطلاحی اعتبار سے بین الاقوامی، موجود سبھی لوگ اس بات پر ہنسے، تدریسی عمل کے درمیان کی بھی اس طرح کی بہت ساری مثالیں ہیں، جن سب کو بیان کرنے کی بہت ضرورت نہیں ہے۔ مقصد بیان یہ ہے کہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کی شخصیت بڑی ہمہ جہت تھی اور اس کے کئی پہلو ہیں، جن میں سے ایک آپ کے سامنے ہے۔ ضرورت ہے کہ ان سبھی پہلوؤں پر بحث ہو، تاکہ پوری شخصیت کا ایک توسیعی مطالعہ کیا جا سکے۔ جن کی بے شمار ومتنوع خدمات اور کارنامے وکمالات ہوں ان کو تو آخر اسی طرح ہی نہ یاد رکھا جا سکے گا؟ اور ہم سب کی طرف سے یہی ان کی سچی قدر واحترام ہے۔ تـقـبـل الله جـمـيـع مسـاعـيـه وجعلها ذخرا له يوم القيامة۔

☆☆☆

مولانا ابوظفر قاسمی

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ تعالیٰ

چند اجتماعی وانفرادی اوصاف

ہر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہیں، اول: اجتماعی، دوم: انفرادی وذاتی، عام طور پر یہ چیز دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک شخص کی اجتماعی زندگی اچھی ہوتی ہے، مگر انفرادی وذاتی طور وہ غیر معیاری ہوتا ہے، اور کبھی اس کے برعکس ہوتا ہے کہ کوئی انفرادی وذاتی طور پر اچھے اوصاف واخلاق کا حامل ہوتا ہے مگر اجتماعی طور پر وہ غیر مناسب ہوتا ہے بلکہ اجتماعیت کے لئے وہ کبھی کبھی مضر ثابت ہوتا ہے۔

ایسے افراد خال خال نظر آتے ہیں جو ملک وملت اور جمعیت وجماعت کے لئے اجتماعی وانفرادی دونوں اعتبار سے مفید اور سودمند ہوتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ اجتماعی وذاتی دونوں سطح پر عمدہ اوصاف واخلاق کے مالک تھے، میں اس مقالہ میں بڑے اختصار کے ساتھ اپنی معلومات، تجربات اور تعلقات کی بنیاد پر جناب ازہری صاحب کے چند اجتماعی وانفرادی اوصاف واخلاق پر روشنی ڈال رہا ہوں تاکہ قارئین کو اندازہ ہوجائے کہ ادب وصحافت اور علم وتحقیق کے ساتھ وہ قابل قدر اجتماعی روش اور عمدہ ذاتی اخلاق سے متصف تھے۔

اجتماعی اخلاق واوصاف:

جناب ڈاکٹر ازہریؒ کی اجتماعی زندگی کے دو مظاہر تھے اول: جمعیت وجماعت، دوم: جامعہ سلفیہ بنارس، ان دونوں مظاہر کے حوالہ سے ان کے اجتماعی، اخلاقی وجماعتی مزاج پر روشنی ڈال رہا ہوں۔

ڈاکٹر ازہریؒ جماعت اہل حدیث کے ایک ممتاز فرد تھے۔ ان کے اندر پورے طور پر جماعتی مزاج پایا جاتا تھا۔ ان کو پختہ یقین تھا کہ مسلک اہل حدیث مذہب اسلام کی صحیح ترین تعبیر وتشریح کا نام ہے جو عہد نبوی، عہد صحابہ اور عہد تابعین کے اعتقادی وفقہی مزاج کا ترجمان ہے۔ ڈاکٹر ازہریؒ نے مختلف دینی وعصری درسگاہوں سے استفادہ کیا، پھر بھی ان کے دینی وجماعتی مزاج میں کوئی انحراف نہیں آیا، انھوں نے ہندوستان کے مختلف مدارس سے کسب فیض کیا۔ پھر دو سال کے تدریسی عمل کے بعد جامعہ ازہر مصر میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد کچھ دنوں تدریسی مصروفیت رہی، پھر دو یا تین سال مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں رہ کر ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ اس طرح دینی وعصری اداروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کے پاس اس طرح ڈگریاں ہوتی ہیں وہ فکری وعملی طور پر آزادی کے شکار ہوجاتے ہیں، ان کے اندر تجدد پسندی آجاتی ہے، وہ شکل وصورت اور وضع قطع میں ماڈرن بن جاتے ہیں اور

علمائے دین کو روایت پرست اور دقیانوس کے القاب سے نوازتے رہتے ہیں، مگر ہمارے ممدوح ڈاکٹر ازہریؒ اپنی زندگی میں فکری و عملی اباحیت میں مبتلا نہیں ہوئے، انھوں نے اپنی زندگی میں پورے طور پر خالص اسلامیت اور منہج سلفیت کی حفاظت کی اور فکری و عملی طور پر تجدد پسندی سے محفوظ رہے، ان کے اس دینی مزاج اور جماعتی اخلاق کا اندازہ ان کے تراجم وتالیفات سے واضح طور پر کیا جاسکتا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ ازہری صاحبؒ کے تراجم و تالیفات میں ان کے دینی و جماعتی مزاج کا عکس بھی ہے اور ان کے جماعتی اخلاق کی تشکیل میں ان کا دخل بھی ہے، اس سلسلہ میں خاص طور پر علامہ محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی کتاب ''تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تجدیدی مساعی'' قابل ذکر ہے، جس کا عربی ترجمہ جناب ازہری صاحب نے بنام "حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولى الله الدهلوى فى التجديد" کیا ہے، اس کتاب کے مطالعہ وترجمہ نے ڈاکٹر ازہریؒ کی فکری تربیت اور ذہنی تشکیل میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

محترم ڈاکٹر ازہریؒ کا جو دینی و جماعتی منہج فکر تھا، وہ مختلف انداز سے اس کے فروغ واشاعت کی بھی کوشش کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے جامعہ سلفیہ بنارس میں مختلف موضوعات پر عالمی کانفرنس وسیمینار منعقد کیے، جن میں مختلف مکاتب فکر کے اصحاب علم اور دینی وعصری جامعات کے مفکرین کو مدعو کیا اور جامعہ سلفیہ کے حوالہ سے تحریک اہلحدیث اور سلفی منہج فکر کو متعارف کرایا، اسی بنا پر میرا احساس ہے کہ سلفیت کا جو تعارف جامعہ سلفیہ کے ذریعہ ہوا ہے اس میں ازہری صاحب کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مختلف اعتبار سے جامعہ سلفیہ کے عروج وارتقاء میں بھی ازہریؒ صاحب کی مختلف کوشش اور لگن شامل رہی ہے، مگر یہ قابل ذکر تلخ حقیقت ہے جسے احباب جماعت جانتے ہیں کہ جناب ازہریؒ صاحب نے اپنی زندگی کا آخری حصہ بڑے درد وکرب کے ساتھ گذارا ہے۔

جناب ڈاکٹر ازہریؒ کے جماعتی اخلاق کے سلسلہ میں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ وہ اگرچہ علمی وادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے، اس کے باوجود ضلعی، صوبائی اور مرکزی سطح پر جماعتی تنظیم سے عملی طور پر وابستہ رہے وہ جماعتی تنظیم کو قائم ودائم اور بار آور دیکھنا چاہتے تھے۔

انفرادی وذاتی اوصاف:

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کے جماعتی اخلاق کے ضمن میں کئی ایسے امور کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق ان کے ذاتی اخلاق و اوصاف سے بھی ہے جیسے مومنانہ شکل و صورت، وضع قطع اور طرز فکر وغیرہ، مگر اس عنوان کے تحت کچھ خالص ذاتی اخلاق واوصاف کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جن سے بہت سے موجودہ علماء وصحافی محروم نظر آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز صلوات خمسہ وغیرہ کی پابندی ہے، میرا جب بھی جامعہ سلفیہ بنارس جانا ہوا یا کسی کانفرنس وسیمینار میں ان کے ساتھ شریک ہوا تو ان کو تمام نمازوں میں صف اول میں اس طرح پایا کہ وہ کسی رکعت میں مسبوق نہیں رہتے تھے، موجودہ بدعملی کے دور میں یقیناً جناب ازہریؒ صاحب کا یہ وصف بڑا اہم ہے، علماء

طلبہ اور دعاۃ و مبلغین کو اس پر خصوصی توجہ دینا چاہئے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں امام مالکؒ نے موطا میں ذکر کیا ہے کہ وہ مختلف صوبوں کے گورنروں کو صلوات خمسہ کی مواظبت و محافظت کی تاکید کرتے رہتے تھے اور انہیں لکھتے رہتے تھے کہ ان اھم امور کم عندی الصلوٰۃ فمن ضیعھا فھو لما سواھا اضیع میرے نزدیک سب سے اہم کام نماز ہے جو شخص نماز کو ضائع کرنے والا ہوگا وہ ہر چیز کو ضائع کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صلاۃ اور دوسری تمام دینی عبادات کی محافظت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ازہری صاحب کے ذاتی اخلاق میں دوسری اہم چیز تدریسی وصحافتی کاموں میں انہماک اور پابندی اوقات ہے، وقت پر نماز میں حاضری، وقت پر درسگاہ میں جانا، وقت پر آفس میں آنا اور وقت پر کھانا اور دیگر معمولات، یقیناً انسانی زندگی میں پابندی اوقات اور کاموں میں توجہ وانہماک کی بڑی اہمیت ہے، اس سے مختلف علمی و دینی کام جلدی اور اچھے انداز میں ہوتے ہیں، اسی لئے مذہب اسلام اپنے ماننے والوں میں پابندی اوقات کا مزاج پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر ازہریؒ جلال و جمال دونوں اوصاف سے متصف تھے، البتہ ان کی شخصیت میں رعب وجلال کا پہلو غالب تھا، میں نے خود مشاہدہ کیا ہے کہ صلاۃ کے دوران طلبہ ان کے بغل میں کھڑے ہونے سے گھبراتے تھے اور جامعہ کے اساتذہ مرعوبیت کی وجہ سے بڑے ادب وتواضع کے ساتھ ان سے ملتے تھے، وہ اپنی علمی مصروفیات کی وجہ سے کم آمیز بھی تھے اور مجلسی آدمی نہیں تھے، اسی لئے دوسروں کے لئے ہم نشینی کے مواقع بہت کم فراہم کرتے تھے، دراصل کسی بھی سنجیدہ اور مصروف شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ مجلسی نہ ہو۔

یہ تو ازہری صاحب کا جلالی پہلو تھا، اسی کے ساتھ ان کا جمالی پہلو بھی قابل ذکر ہے، وہ کم آمیز ضرور تھے جس کی وجہ ذکر کی گئی ہے، مگر جب لوگ ان سے ملاقات کرتے تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، ان کی احوال پرسی کرتے اور حسب موقع چائے وغیرہ سے ضیافت کرتے، مجھ جیسے خردوں کے ساتھ ازہریؒ صاحب کا یہی سلوک ہوتا تھا، جامعہ سلفیہ بنارس میں جب بھی میں نے آفس میں ان سے ملاقات کی ہے انھوں نے مسکراتے ہوئے مجھ سے گفتگو کی ہے اور کبھی کبھی چائے وغیرہ سے نوازا بھی ہے، ایک بار ازہریؒ صاحب سے میں نے ملاقات ان دنوں کی ہے جب وہ ''رحمۃ للعالمین'' کا عربی میں ترجمہ کررہے تھے، میں نے ان سے کہا کہ اس کتاب کی جلد دوم میں بعض امور محل نظر ہیں، جیسے قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے جہاں رسول اللہ ﷺ کے اہل وعیال اور اولاد واحفاد کا ذکر کیا ہے تو انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسن عسکریؒ (جنھیں اہل تشیع گیارہواں امام کہتے ہیں) کے یہاں ایک لڑکا محمد پیدا ہوا تھا جو چار سال کی عمر میں غار میں روپوش ہوگیا، حالانکہ صحیح تحقیق یہ ہے کہ حسن عسکریؒ لاولد فوت ہوئے تھے، ان کے یہاں کوئی لڑکا نہیں پیدا ہوا تھا، یہ افسانہ محمد بن نصیر نامی ایک شخص نے گھڑا ہے، اہل تشیع کی ایک شاخ فرقۂ نصیریہ اسی کی طرف منسوب ہے، اس نے یہ افسانہ اس لئے گھڑا تھا کہ بارہویں امام کا تصور باقی رکھا جاسکے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

نے ”منہاج السنۃ“ میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

دوسری بات میں نے ازہری صاحب سے یہ کہی کہ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ نے حضرت حسین رضی اللہ کے تذکرہ میں جہاں یزید بن معاویہؓ کا ذکر کیا ہے انھیں یزید پلید کہا ہے، یزیدؒ کے بارے میں یہی نقطۂ نظر مولانا محمد رئیس ندویؒ کا بھی ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنی غیر مطبوع کتاب ”قول سدید برائے محبان یزید“ میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔

چونکہ مذکورہ دونوں باتیں محققین کے منہج کے خلاف ہیں اس لئے میں نے ازہری صاحبؒ سے کہا کہ ان دونوں مقامات پر مختصر حاشیہ ضرور لگا دیجئے گا وہ میری باتیں سن کر خاموش رہے، مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں جلال میں نہ آجائیں مگر مسکراتے ہوئے کہا کہ تم لوگ تو اسی طرح کی باریکیاں نکالتے رہتے ہو، میں نے ”رحمۃ للعالمین“ کا عربی ایڈیشن نہیں دیکھا ہے، معلوم نہیں کہ انھوں نے ان قابل مواخذہ مقامات پر حاشیہ لگایا ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر ازہریؒ صاحب کی ایک اور ذاتی خصوصیت یہ تھی کہ وہ حد درجہ نظیف الطبع تھے، ان کی نظافت پسندی کے اثرات ان کے مزاج، لباس اور آفس وغیرہ تمام چیزوں میں دکھائی دیتے تھے، اس حقیقت کا اعتراف ہر اس شخص کو ہے جس کا سابقہ ان سے رہا ہے۔

جناب ڈاکٹر ازہریؒ کے ذاتی اخلاق واوصاف کے متعلق سے ان کی خردنوازی بھی ہے، جس کا تجربہ ان کے شاگردوں کے علاوہ ان معاصر علماء کو بھی ہے جو عمر میں ان سے چھوٹے ہیں، وہ اپنے شاگردوں اور عزیزوں کی علمی رہنمائی کرتے، علمی کوششوں پر ان کی ہمت افزائی کرتے اور مفید مشوروں سے نوازتے۔

ذاتی طور پر مجھے خود ان کی شفقت وعنایت اور خرد نوازی کا کئی بار تجربہ ہوا ہے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ۱۹۹۶ء میں میرے کاغذات جمعیۃ احیاء التراث کویت بھیجے گئے مجھے اس موقع پر بعض ممتاز شخصیات کے توصیہ کی ضرورت تھی، میرا بنارس جانا ہوا تو میں نے جناب ڈاکٹر ازہریؒ سے کہا کہ میرے تعلیمی وتدریسی، دعوتی وتبلیغی اور ملی وجماعتی کاموں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک عربی توصیہ لکھ دیجئے، اس وقت انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ آپ تو خود دوسروں کے لئے توصیہ لکھتے ہیں، آپ کو توصیہ کی کیا ضرورت ہے، میں مایوس اور بددل ہو کر واپس آ گیا، ان دنوں میں سراج العلوم کنڈو بونڈیہار میں مدرس تھا، واپس آنے کے بعد یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ جناب ازہریؒ نے عربی میں میرے بارے میں ایک خصوصی توصیہ لکھ کر بائی پوسٹ جامعہ کے پتہ پر بھیج دیا، جو مجھے ایک ہفتہ کے اندر موصول ہو گیا، مجھے بڑی خوشی ہوئی اور ان کی اس خردنوازی پر میرے دل سے ان کے لئے دعائیں نکلیں، مجھے اب تک ان کی اس خردنوازی کا واقعہ یاد ہے جو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

یہ تھے ڈاکٹر ازہریؒ کے جماعتی، ذاتی واخلاقی اوصاف جو یقیناً ملت وجماعت کے لئے مشعل راہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشیں معاف فرمائے، ان کی نیکیاں قبول کرے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے اور انھیں جنت الفردوس کا مکین بنائے۔ آمین

☆☆☆

مولانا ابوالقاسم عبدالعظیم مدنی
جامعہ اسلامیہ فیض عام۔ مئو

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ
کچھ علمی اور سماجی یادیں

پرائمری اور منشی کے بعد ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۵ء کے بیچ عربی درجات میں جامعہ عالیہ عربیہ کے ایام طالب علمی کے دوران ازہریان ثلاثہ محترم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، جناب مولانا مظہر احسن ازہری، جناب ڈاکٹر عبدالعلی ازہری اور جناب ڈاکٹر نورالحسن انصاری میں سے کسی ایک دو کا سالانہ ورود مسعود جامعہ میں بالترتیب بنارس، سعودی عرب، نائیجیریا اور دہلی سے ہوجایا کرتا تھا اور ہم طلبہ خوفاً وطمعاً ان حضرات کے دیدار سے پل بھر مشرف ہوجایا کرتے تھے، طمعاً تو اس لئے کہ ہمارے شہر کی عظیم ہستیاں ہیں جو ممالک بعیدہ سے تشریف لائی ہوئی ہیں، اور خوفاً اس لئے کہ کبھی کبھی طلبہ کو ان کا خطاب بھی سننا پڑتا یا امتحانی مراحل سے گزرنا پڑتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالعلی ازہری۔ حفظہ اللہ۔ نے ہمارا ازھار العرب کا امتحان بھی لیا تھا، ڈاکٹر نورالحسن انصاری نے آلات جدیدہ سے جائز استفادہ کی اپنے خطاب میں ترغیب بھی دی تھی اور لاؤڈ اسپیکر سے اذان ونماز کے جواز وناجواز پر افسوس کے ساتھ علمائے مئو کے دوطرفہ فتاوے اور آراء کا حوالہ بھی دیا تھا۔

اس دور میں جامعہ ازہر اور اس کے معائب ومحاسن کی معلومات سے ادنی سا بھی شغف نہ تھا، صرف اتنا تھا کہ وہ مصر میں ایک بڑا تعلیمی ادارہ ہے اور ان حضرات نے وہاں جا کر تعلیم حاصل کی ہے۔ ملک وبیرون ملک میں ملازمت کر رہے ہیں، ایام تعطیل میں اپنے گھر آجایا کرتے ہیں۔

ہاں جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ازہری اساتذہ کے جم غفیر سے استفادہ کا موقع ملا تو ایک روز عظمت کے حامل اسی قدیم خیال یا حسن ظن کی روشنی میں کلیۃ اللغۃ کے استاذ بلاغت شیخ جلال ازہری جو قزوینی کی الایضاح ہمیں پڑھا رہے تھے، سے ازہر کے بارے میں گفتگو ہوئی تو انہوں نے میرے حسن ظن کو اس طرح دھکا لگایا کہ بول اٹھے: "یا ابنی! ازھر کان وازھر الآن: والمنخنقة والموقوذة والمتردية والنطيحة وما أكل السبع" اور میں اس برجستگی پر ششدر رہ گیا۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری۔ رحمہ اللہ۔ کی سلامات وتحیات کے سوا کوئی قابل ذکر یاد میرے ایام عالیہ سے وابستہ تو نہیں، ان کی جملہ یادیں جامعہ سلفیہ کے دوسالہ ایام اور اس کے بعد کے دور کی ہیں، جن میں سے چند علمی وسماجی یادیں حسب ذیل ہیں۔

ا۔ وجہ تسمیہ

آپ کا نام ''مقتدیٰ حسن'' کیوں رکھا گیا، اس سلسلے میں قصبہ کراکت ضلع جونپور (یو، پی) کے اہل حدیث عالم جناب حکیم مولوی مقتدیٰ حسن ۔ رحمہ اللہ۔ جو اپنے تقلیدی مضافات وماحول میں غیر شائستہ لقب سے پکارے جاتے تھے اور جامعہ عالیہ عربیہ کے قدیم فضلاء اور والد ازہری جناب محمد یاسین ۔ رحمہ اللہ۔ کے ہم سبق اور دوست تھے، نے جامعہ سلفیہ میں ایک ملاقات میں مجھ سے بیان کیا کہ جانتے ہو ازہری صاحب کا نام مقتدیٰ حسن کیوں پڑا؟ یہ میرے ہی نام پر ہے، میں ان کے والد صاحب کا ہم سبق اور دوست تھا، بلکہ اکثر ان کے گھر اور محلہ میں بھی ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ میں جب عالیہ سے رخصت ہونے کو ہوا تو انہیں دنوں آپ کی ولادت ہوئی تھی اور فرط محبت سے میری ہی یاد میں میرے دوست نے اپنے لخت جگر کا نام مقتدیٰ حسن رکھ دیا۔ اللہ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین

۲۔ طلبۂ مئو کی گھر آمد ورفت اور عام رخصتیں

شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانی۔ رحمہ اللہ۔ بڑے ہی سنجیدہ مزاج اور رحمدل انسان تھے۔ طلبہ کی جمعرات اور جمعہ کی رخصتیں بآسانی یا ایک دو انکار کے بعد منظور فرمالیتے، اہل مئو اس میں کچھ زیادہ ہی تیز طرار واقع ہوئے تھے۔ بیشتر حالات میں ایک دو روز مزید ناغہ کردیتے۔ ازہری صاحب پر یہ عادت زیادہ ناگوار اور بار گزرتی، ایک مرتبہ کہنے لگے: شیخ الجامعہ صاحب! آپ مئو کے طلبہ کو چھٹی نہ دیا کریں، چھٹی کے لئے انہیں میرے پاس بھیج دیا کریں۔ شیخ الجامعہ اس مشورے پر کبھی کبھی عمل کرلیا کرتے تھے۔

۳۔ دیوان ضیاء انصاری مئو کی ترتیب وتدوین پر اظہار مسرت:

میں بھی جامعہ سلفیہ میں مئو کا ہی ایک طالب علم تھا۔ اخراجات ومصارف کے لئے منی آرڈر کا انتظار تو تھا نہیں، ہفتہ دو ہفتہ پر گھر آمد ہو جایا کرتی تھی، اور کام چل جاتا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں ایک مرتبہ جمعرات وجمعہ کی چھٹی لے کر گھر آیا۔ معلوم ہوا کہ والد محترم کے دوست اور محلہ اورنگ آباد کے شہرت یافتہ شاعر جناب ضیاء انصاری مئوی مرحوم کی یاد میں ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہونے جا رہا ہے۔ اچانک خیال آیا کہ مشاعرہ بیاد ضیا انصاری منعقد ہوگا۔ مگر اس سے ان کی یاد کیا وابستہ ہوگی۔ کسی ایک نے بہت کیا تو ان کی ایک آدھ غزل پڑھ دیا، باقی سب تو اپنی اپنی دفلی اور اپنا اپنا راگ الاپیں گے۔ کیوں نہ میں ان کا دیوان مرتب کردوں۔ ضیاء انصاری اور ان کے گھر سے کئی طرح سے گھریلو تعلقات تھے ہی، دوسرے ہی روز سے اس کام میں جٹ گیا اور دوڈھائی ہفتہ میں مشاعرہ کا دن آنے سے پہلے ان کا ایسا دیوان مرتب ہوگیا جس پر مزید اضافہ اب تک نہ ہوسکا۔ مشاعرہ کے صدر یا صدر استقبالیہ جناب وصی احمد نعمانی (حال ایڈوکیٹ سپریم کورٹ دہلی) تھے اور حاجی عبدالعلی نگینہ کے دولت کدہ پر مقیم تھے۔ اجازت لے کر بمع دیوان ان سے ملاقات کی۔ مشاعرہ بیاد ضیاء پر ان سے گفتگو ہوئی۔ برجستہ اعتراف کیا کہ اس میں

ضیا کا تو کچھ ہونے کا نہیں۔ میں نے مرتب دیوان پیش کیا اور کہا: دیکھئے یادگار ضیا تو یہ ہے۔ میں نے اس کے جمع وترتیب کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ بہت خوش ہوئے۔ خوب شاباشی دی۔ کچھ کچھ اشعار بھی منتخب کر کے نوٹ فرمایا اور دوران خطبہ انہیں جدت پسندی کے ساتھ سنایا۔

رخصت صرف دو روز جمعرات اور جمعہ کی۔ لیکن ٹھیک بائیسویں روز جامعہ پہونچا۔ ازہری صاحب کی ڈانٹ سے بچنے اور طلبہ کے روبرو سرشاری ذلت سے محفوظ رہنے کی ایک ترکیب سوچی۔ بنارس اتر کر جامعہ جانے کے بجائے محلہ باکھڑ بلی میں آپ کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ دستک دی، آپ نیچے اترے اور اپنے مخصوص ومعروف انداز میں کہنے لگے: ہاں جی! کیا ہے؟ دو روز کے لئے گئے تھے نا؟ کتنے دن پر آئے ہو؟ تین ہفتہ کے بعد!! معذرت پیش کرنے اور حقیقت حال سے آگاہ کرتے ہوئے میں نے جھولے سے دیوان نکالا اور آپ کے ہاتھوں میں رکھ دیا۔ الٹ پلٹ کر دیکھا۔ نہایت خوش ہوئے۔ بولے: چلو جی کام کیا ہے نا، بیکار وقت ضائع نہیں نہ کیا ہے، بائیس روز کیا، ایک بائیس اور بھی چل سکتا ہے، لڑکے اس طرح وقت کو کام میں لیں تو افسوس نہیں ہوتا۔ اچھا جاؤ محنت سے پڑھنا۔

جامعہ پہنچا تو احباب کا ایک ہی بات پر گویا اجماع ہو چکا تھا کہ کل جب ازہری صاحب سے ملاقات ہوگی تو پتہ چلے گا، سب کے کل پرسوں اور دیگر ایام بھی بیت گئے طرح طرح کی تاویلیں، میں نے لاف وگزاف کیا۔ اللہ معاف کرے۔ ازہری صاحب کی مجال ہے، وہ کیا پھٹکاریں گے ذرا پھٹکاریں تو!! ہفتہ عشرہ کے بعد معاملہ کا انکشاف ہوا اور احباب کو دیوان دکھایا تب سبھی مطمئن ہوئے اور معاملہ کی نزاکت سمجھ گئے۔

۴۔ ابکار المنن فی تنقید آثار السنن کی تحقیق وتخریج:

۱۹۸۸ء/۱۴۰۸ھ میں جامعہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف ونشر واشاعت کو ابکار المنن مولفہ محدث کبیر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی کی جدید اشاعت درکار تھی۔ اس کے لئے ناظم جامعہ مولانا عبدالوحید صاحب سلفی بنارسی اور وکیل الجامعہ ومسئول شعبۂ نشر واشاعت ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری۔ رحمہما اللہ۔ نے باہم مشورے سے اس علمی تراث کے احیاء اور تحقیق وتخریج کے لئے مجھ ناچیز کو منتخب کیا اور دو چار سطری ایک مبہم ومجمل رقعہ کے ذریعہ مجھے اس کا مکلف کیا۔ میں نے اپنی صوابدید کے مطابق کتاب کے ۲۵۔ ۳۰ صفحات پر کام کر کے ازہری صاحب کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے پھر کچھ اجمالی ہدایت فرمادی اور کام آگے بڑھانے کو کہا۔ چونکہ یہ دور جماعت اہل حدیث مئو کے لئے ابتلاء وآزمائش اور بالخصوص میرے اور عم محترم مولانا عبدالحکیم مجاز اعظمی۔ رحمہ اللہ۔ کے لئے، ایک عیدگاہ کی زمین پر مدرسہ کی تعمیر کے تعلق سے نہایت پر آشوب دور تھا۔ جس کے ناجواز کی سب سے پہلے آواز میں نے اٹھائی تھی، بعدہ عم محترم نے اس کی تائید کی تھی جب کہ صغار وکبار علما وعوام

نے سکوت اختیار کر لینا غنیمت جانا تھا۔ اس لئے میں بھی نمونہ پیش کرنے کے بعد مطمئن تھا کہ ابکار المنن اب چھپنے سے تو رہی۔

بالآخر چند ماہ بعد جامعہ کی طرف سے دو اساتذہ میرے پاس بطور نمائندہ یہ خبر لے کر پہنچے کہ کتاب جامعہ سے شائع نہیں ہوگی، آپ اس کی اشاعت کا دوسرا انتظام کرلیں، میں نے کہا: دو آدمی کو بھیج کر اتنا کہنے کی کیا ضرورت تھی، دو سطر کا ایک رقعہ ہی کافی تھا۔ لیکن بتایا گیا کہ کسی تحریری ثبوت سے بچنے کے لئے ہی تو ہمیں بھیجا گیا ہے۔

میں ذاتی طور پر مسرور تھا کہ میں نے نمونہ سے زیادہ کچھ کیا ہی نہیں ہے، جامعہ کو افسوس تھا کہ میری محنت کسی دباؤ کی وجہ سے اکارت جارہی ہے، بہرکیف مشیت الٰہی کچھ اور تھی، چند ماہ گزرتے گزرتے جامعہ نے دوبارہ فیصلہ کیا کہ ابکار المنن بہرحال شائع ہوگی۔ کمپوزنگ کا کام شروع ہوگیا۔ ازہری صاحب اور صدیق محترم احمد مجتبیٰ سلفی نظر ثانی کرنے لگے خبر ملی کہ موجودہ اوراق کی کمپوزنگ ہوچکی ہے، اگلا حصہ جلد از جلد بھیج دیں، یقین نہیں ہورہا تھا۔ ہفتہ عشرہ میں کمپوز شدہ فرمے بھی آگئے۔ میں نے بسم اللہ سے کام کا دوبارہ آغاز کردیا۔ شب وروز کی محنت شاقہ، ماحول کی پراگندگی اور مدرسہ کی ڈیوٹی مستزاد۔ پھر بھی اتنا کام بھیج دیا کرتا تھا کہ کمپوزنگ چلتی رہے۔ توریہ، ایہام اور کنایہ کا ایسا دور تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ چھ ماہ مسلسل کبھی کسی عارضہ سفر ومرض کے سبب دو چار روز کی تاخیر ہوجاتی اور ازہری صاحب پوچھتے تو کہہ دیتا کہ بس ایک نظر دیکھ رہا ہوں۔ دو چار دن میں ان شاء اللہ پہنچ جائے گا۔

الغرض کتاب کی تحقیق وتخریج۔ شیخین کی نظرثانی، کمپوزنگ اور رفتہ رفتہ طباعت کا سارا کام ایک ساتھ چلتا رہا، لیکن کبھی کام نہ ہونے کا احساس ہونے نہیں دیا، ایک مرتبہ ازہری صاحب ابکار المنن کا ذکر فرمارہے تھے، میں نے اپنے توریہ وایہام وکنایہ کا سارا ماجرا کہہ سنایا اور اپنی کچھ ضروری تعلیقات کے حذف کئے جانے پر افسوس کا اظہار کیا تو اولاً انگشت بدنداں رہ گئے اور کہنے لگے: میاں! مقصد یہ نہیں تھا کہ کتاب کی خوب تحقیق ہوجائے، بلکہ صرف کہیں کہیں ایک دو تعلیق کے ذریعہ حق اشاعت کا جواز مقصود تھا، لیکن تم نے تو اتنا زیادہ کردیا تھا کہ بہت کچھ حذف کرنے کے باوجود متعینہ بجٹ ختم ہوگیا اور جامعہ کو مزید بارگراں ہونا پڑا۔ میں نے کہا: یہی بات پہلے بتائے ہوتے تو میں بھی زیادہ زحمت میں نہ پڑتا۔(۱)

۵۔ حیات ابوالمکارم (مقالۂ فضیلت) کی ترتیب وتدوین:

اس مقالہ بلکہ اس کتاب کی تالیف وتصنیف کے محرک محترم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ہی تھے اور کس طرح یہ مقالہ ان کی فرط مسرت کا باعث بنا، پورا واقعہ کتاب کی تمہید "سخن زیر لب" ص۳-۴)

(۱) یہ کتاب جامعہ سلفیہ سے ۱۴۱۰ھ/۱۹۹۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی، پھر مکتبہ دار القبس ریاض سے دوبارہ ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء میں نہایت عمدہ ودیدہ زیب شائع ہوچکی ہے۔

ہیں موجود ہے، (۱)، قارئین وہیں سے پڑھ لیں۔ (۲)

جزاھم اللہ

۶۔تذکرہ علمائے اہل حدیث کی ترتیب وتدوین سے شغف

ازہری صاحبؒ کو جماعت اہل حدیث کے علماء کے تذکرے کی ترتیب وتدوین سے اتنا شغف تھا کہ آپ نے اس کے لئے مئو وبنارس وغیرہ میں اہل علم پر مشتمل متعدد کمیٹیاں بنا رکھی تھیں، آپ ان کی میٹنگوں میں ذاتی طور پر شریک بھی ہوا کرتے۔ مئو کی کمیٹی بھی دسیوں افراد پر مشتمل تھی جس کی کئی نشستیں دو تین سال کے عرصہ میں ہوئیں۔ میں بھی ان میں شریک ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے ذمہ مولانا قائم علی عباسی مئوی (متوفی ۱۳۴۱ھ) پر لکھنا منتخب کیا تھا، اور ان سے متعلق بہت کچھ مواد جمع کرلیا تھا۔ جب عرصہ بیت گیا اور کسی کی طرف سے کوئی مثبت اقدام نہ ہوسکا اور ازہری

---

(۱) حیات ابوالمکارم کی محولہ عبارت یہ ہے:

حیات ابوالمکارم مئوناتھ بھنجن کے مشہور سلفی واہل حدیث عالم ''مولانا ابوالمکارم محمد علی بن مولانا فیض اللہ مئوی داناپوری'' -رحمۃ اللہ علیہ- کی حیات وخدمات پر مشتمل وہ علمی مقالہ ہے جو آج سے ۳۴ رچونتیس سال قبل ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء میں جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس میں فضیلت کی سند حاصل کرنے کے لئے سال دوم میں تحریر کیا گیا تھا، اور جس کی اشاعت کی تاخیر نے حقیقت سے ناواقف علماء ومشائخ اور احباب کو مجھے مطعون کرنے کا بار بار موقع بھی دیا۔

مقالہ کے عنوان کے محرک وکیل الجامعہ/استاذ محترم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ تھے۔ بعض احباب درس کے ہمراہ میں نے بھی آپ سے مقالے کا عنوان دریافت کیا تو برجستہ کہا کہ: ''تم مئو کے ہو، نا۔ مولانا ابوالمکارم پر لکھ ڈالو''۔ اگر حافظہ میں خطا نہ ہو تو شاید ۶، ۷ سات ماہ بعد مقالہ پیش کرنے تک اس موضوع پر میری اور ان کی کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ پھر ماہ ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں سند لینے کے لئے جب میں نے بنارس جاکر انہیں ان کے دفتر میں اسے پیش کیا تو ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''وہی مقالہ، مولانا ابوالمکارم'' بولے: ''لکھ لیا؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں''۔ پھر ہاتھ میں لیا تو کہنے لگے: ''اتنا ڈھیر سا'' میں نے کہا: ''ہاں'' کہنے لگے: ''اس روز کے بعد پھر تم کبھی ملے نہیں، کبھی ذکر بھی نہیں کیا، کبھی کچھ پوچھا بھی نہیں''۔ میں نے لجاجت سے کہا: ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر، ضرورت محسوس نہیں ہوئی، بس لگ گیا''۔ بولے: ''اجی! میں نے تو سمجھا تم بھی اسے چھوڑ چکے، دراصل میں نے یہ عنوان پہلے کئی لڑکوں کو پیش کیا، کسی نے تین چار صفحہ لکھا، تو کسی نے سات آٹھ صفحہ، سب سے زیادہ صلاح الدین مقبول نے لکھا، بارہ پندرہ صفحہ، اور تم نے تو ماشاء اللہ کمال کردیا، اچھا جاؤ''۔ پھر الحمدللہ چند روز بعد ہی ۴ رذی الحجہ۔ ۶ رنومبر کو شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ کے بدست سند بھی مل گئی اور میں بخوشی گھر واپس آ گیا۔

اگلے سال برسات ۱۹۷۹ء کی بات ہے ایک روز عصر بعد زور کی بارش کے بعد آسمان صاف ہوا تو گھر کے دروازے پر دستک ہوئی، دیکھا تو ازہریان ثلاثہ (محترم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، جناب مولانا مظہر احسن ازہری اور جناب ڈاکٹر عبدالعلی ازہری، جو ان دنوں اتفاق سے بالترتیب بنارس، سعودی عرب اور نائیجیریا سے وطن میں فروکش تھے) دروازہ پر قدم رنجہ فرما ہیں، علیک سلیک کے فوراً بعد والہانہ انداز سے، پہلے ازہری نے کہا: ''میں ان دونوں کو صرف اس لئے ساتھ لایا ہوں کہ تمہارا مقالہ انہیں دکھادوں''۔ پھر گھر میں تشریف لائے تو کسی تکلف سے پہلے مقالہ طلب کیا، اور دیکھنے دکھانے میں لگ گئے۔ راقم الحروف کو موقع مل گیا اور جو میسر ہوا ضیافت میں پیش کیا۔ الحمدللہ تینوں حضرات نے خوب خوب ہمت افزائی کی۔ فجزاھم اللہ عن العلم واھلہ خیرا۔ (ع۔ل)

(۲) حیات ابوالمکارم ھمار یسرچ سنٹر مئوناتھ بھنجن سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوچکی ہے۔

صاحب مایوس ہو چلے تو آخری مجلس میں آپ نے کہا: ابوالقاسم! تم تو کچھ کرو، تم تو کچھ کیا کرتے تھے ابھی آپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ تعس عبدالدرھم والدینار قسم کے ایک صاحب جن کے فتنوں کا سد باب اگر چہ محال تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے برجستہ بول پڑے: ''ارے کچھ ملتا ہے تب نہ کرتے ہیں۔ یہاں تو کوئی ایسی امید نہیں ہے'' یہ جملہ نہ صرف ازہری صاحب کو برا لگا بلکہ کئی لوگوں نے اس کی کڑواہٹ محسوس کی، اور مہینوں تک ملاقات میں مجھ سے اس کی تلخی کا ذکر کرتے رہے، ازہری صاحب نے بھی کئی مرتبہ مجھ سے اس پر بیزاری اور برہمی کا اظہار فرمایا، اور کہتے رہے: ان لوگوں سے بہتر تو مولوی یونس (میرے ہم سبق شیخ محمد یونس عبدالمتین سلفی مدنی بنارسی سابق شیخ الجامعہ جامعہ سلفیہ۔ بنارس) ہیں جنھوں نے کتنے بنارسی علماء کے تذکرے ''محدث'' میں شائع کر دیئے کبھی کہتے ان لوگوں سے بہتر تو مولوی مقتدیٰ (مولوی مقتدیٰ بشیر اللہ مئوی عمری، استاذ جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو) ہیں کہ چاہے جیسے بھی ہوا ''تذکرۃ المناظرین'' ایک چیز تیار تو کر ڈالی، انھوں نے کیا کیا سوائے شر انگیزی اور فتنہ و فساد کے۔ البتہ اپنی سستی یا تاخیر کے سلسلے میں میں نے آپ کو جو معذرت پیش کی اسے آپ نے ایک حد تک قبول فرما لیا۔ لیکن یہ تاکید کی کہ اس کام سے بالکل غافل مت ہو جانا۔ ''حیات ابوالمکارم'' اور ''فضیحت ننگ'' دونوں کتابوں میں میں نے اس قرض کا کچھ حصہ چکانے کی کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اکمال کی توفیق عطا فرمائے۔

چند سماجی یادیں

اللہ تعالیٰ مجھے اور محترم جناب ازہری صاحب کو معاف فرمائے اور حاسدین و کاسدین کی مجرمانہ سرگرمیوں کو نیکیوں میں بدل دے، میرے اور ازہری صاحب کے درمیان تین ایسے تلخ مواقع آئے جن میں ملکوتیت و بشریت کا فرق نمایاں ہو کر رہا۔ ان میں سے صرف ایک موقع کا ذکر یہاں ہو رہا ہے:

یہ موقع عیدگاہ کے تعلق سے غلط فہمی کا ہے۔ مغربی جماعت اہل حدیث مئو کی ایک عیدگاہ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، ازہری صاحب کو اس عیدگاہ کے تعلق سے میرے بارے میں غلط فہمی پیدا کرائی گئی۔ میں آپ سے مذکورہ بالا پر آشوب دور میں جب بھی ملاقات کے لئے جاتا آپ مجھ سے کچھ بیزار نظر آتے۔ اور مجھے اس تعلق سے تین ملاقاتوں میں سخت اور سست بھی کہا۔ میں نے ایک بار عرض کیا کہ آج آپ تیسری مرتبہ مجھے ڈانٹ پلا رہے ہیں۔ مجھے اس پر افسوس ہے۔ کاش آپ مجھ سے اس بارے میں کچھ سوالات کر لیتے۔ پھر میں دو تین سال تک مئو میں آپ کے دولت کدہ پر ملاقات کے لئے جانے سے گریز کرتا رہا۔

فضیحت ننگ کے اسالیب و مناہج پر اظہار مسرت، اور جماعت کی مصالحتی روش سے بیزاری:

عراقیات اور صدامیات کے سلسلۂ اشاعت سے میرے خلاف زہر آلود فضا قائم ہو چکی تھی ''فضیحت ننگ'' کی اشاعت نے جلتی پر پٹرول کا کام کیا۔ میں نے مخالفین کی زہر افشانیاں بھسم کر دینے کی جو پلاننگ کی تھی''

تقریباً پورے طور پر کامیاب رہی۔ لیکن ہوا خواہوں کی ہوا خواہی ایک طرف، میرے رفقاء اور بہی خواہان بھی بہت سے خدشات و وساوس کے شکار ہو گئے۔ سب سے زیادہ جامعہ سلفیہ کے اساتذہ کو فکر لاحق ہوئی۔ لیکن اللہ رب العزت والجلال نے ان تمام احتمالات اور شرور وفتن سے مجھے محفوظ رکھا۔ میں نے ان کتابوں میں جماعت اہل حدیث کے منہج و مسلک کے دفاع میں ایسی ساری مصلحت پسندیوں کو بالائے طاق رکھا جن کو جماعت گزشتہ نصف صدی سے اپنائے ہوئے ہے۔ فمن عفا و اصلح اور ادفع بالتی ھی احسن تو مجھے بھی معلوم ہے اور اسی کے لئے میں نے ''سلیقۂ اختلاف'' شائع کی ہے۔ مگر جزاء سیئة سیئة مثلها اور جزاء سیئة بمثلها کو بھی میں بنیادی اور اساسی ضرورت سمجھتا ہوں۔ ''فضیحت نگ'' میں میں نے اسی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مذکورہ بالا غلط فہمی کے بعد جب میں دو چند سال تک ازہری صاحب کی زیارت کے لئے مئو میں ان کے دولت کدہ پر نہیں گیا تو ایک مرتبہ جب ہم لوگ بنکر کالونی کے اجلاس عام سے رات کے آخری پہر لوٹ رہے تھے۔ ازہری صاحب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے برجستہ کہا: ابوالقاسم! ارے کیا ابھی بھی تم مجھ سے ناراض ہو؟ میں نے عرض کیا: حضرت میں آپ سے ناراض نہیں کچھ حالات ہیں۔ پھر آپ نے کہا: سنو جی! تمہارا ہی طریقہ ٹھیک ہے۔ ''فضیحت نگ'' والا طریقہ۔ مصلحت پسندی نے جماعت کو بہت نقصان پہونچایا۔ لوگوں کو جماعت کے مقابلے جری کر دیا۔ میں نے بحیثیت مطالعہ اپنے طلبہ(۱) کی کسی کتاب کو پورا نہیں پڑھا ہے لیکن اس کتاب کو میں نے دوبار پڑھا ہے۔ پھر آپ نے ان اندیشوں کا ذکر کیا جو اساتذۂ جامعہ کو پیدا ہوئے تھے۔

الحمد للہ پھر میرے آپ کے تعلقات پورے طور پر بحال ہو گئے حتی کہ ایک متنازع معاملے کے نپٹارے کے لئے آپ نے مجھے اپنا نمائندہ بھی بنایا۔

یہ تھیں چند اہم یادداشتیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری مغفرت کرے اور ہمارے حسن تعلقات کو اعلیٰ علیین میں ملاقات کا وسیلہ بنائے۔ آمین

☆☆☆

(۱) یہاں یہ بات واضح کر دینی مناسب ہے کہ جامعہ سلفیہ بنارس سے میں نے صرف فضیلت کی دو سالہ تعلیم حاصل کی ہے۔ وہاں پر میرے کل اساتذۂ کتا یہ ہیں: شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانی، مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی الهوی، مولانا رئیس احمد ندوی، مولانا عبدالسلام مدنی، شیخ انیس الرحمٰن اعظمی مدنی اور ماسٹر محمد اکبر بناری۔ رحمہم اللہ و حفظہم، ازہری صاحب اور مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری رحمہما اللہ اس وقت درجۂ عالمیت کے اساتذہ تھے بایں سبب ان حضرات سے باضابطہ شرف تلمذ حاصل نہیں ہے لیکن میں نے ان دونوں حضرات سے کافی استفادہ کیا ہے اور جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ میری کتاب ''حیات ابوالمکارم'' کا عنوان تو خود ازہری صاحب ہی کا تجویز کردہ ہے۔

مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ - ایک عظیم شخصیت

مئوناتھ بھنجن کی زرخیز زمین سے ماضی قریب میں جو عظیم شخصیات پیدا ہوئی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمۃ اللہ علیہ وغفرلہ وادخلہ الجنۃ الفردوس الاعلیٰ وانزل علیہ شآبیب رحمتہ- کی شخصیت کئی حیثیتوں سے ممتاز اور عظیم ہے۔ اہل قلم ان کی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کریں گے اور ان کا حق ادا کرنے کے لئے اپنی جولانی قلم دکھائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے زور قلم کے ساتھ فراغت وفرصت بھی درکار ہے۔ اور میں ان دونوں ہی میں کوتاہ دامن ہوں۔ پھر بھی مختصر تاثرات حوالۂ قرطاس کررہا ہوں ورنہ ان کا حق اس سے کہیں زیادہ ہے۔

جامعہ سلفیہ بنارس کے پانچ سالہ طالب علمی کے زمانہ میں راقم سطور، ڈاکٹر ازہری صاحب مرحوم سے دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ قریب تھا، اس کی وجہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی حفظہ اللہ اور شیخ احمد مجتبیٰ سلفی حفظہ اللہ تھے جو ان دنوں مدینہ منورہ میں زیر تعلیم تھے۔ اور انہوں نے اپنے بہت سے معاملات جس میں مجھے مخاطب فرماتے اس میں ازہری صاحب رحمہ اللہ کا حوالہ اور ان سے مشورہ کا حکم دیتے تھے اور کبھی بالعکس بھی ہوتا تھا۔ بایں طور میں ازہری صاحب سے نسبتاً زیادہ مانوس رہا اور ان کی عظمت اور رعب وداب، جو طلبہ واساتذہ اور ذمہ داران سب پر طاری رہتا، کے باوجود کسی قدر بے تکلف بھی ہوگیا تھا۔ اور اسی کا ثمرہ تھا کہ آپ کو قریب سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ آپ سے مستفید بھی ہوا۔ جامعہ سلفیہ کی طالب علمی اور اس کا ذکر جمیل، یا ازہری صاحب مرحوم اور میں بحیثیت طالب علم، یا طلبہ اور ازہری صاحب کی تدریس، ندوۃ الطلبہ اور ازہری صاحب، مجلس ثقافت برائے طلبہ اور ازہری صاحب، صحافت مجلّہ ''المنار'' اور ازہری صاحب، طلبہ کی تربیت اور ازہری صاحب مرحوم، مکتبہ عامہ اور ازہری صاحب مرحوم۔ الغرض بے شمار عناوین علمیہ، ثقافیہ، تربویہ، توجیہیہ، تنبیہیہ، تادیبیہ وتوبیخیہ، تذکیریہ، تدریسیہ دسیوں ایسے مضامین ہیں جو خالص طالب علمی کے زمانہ سے متعلق ہیں اور ہر ایک مستقل باب وکتاب کا متقاضی ہے۔ اور مطلوب بھی ہے کہ ایسی عظیم شخصیت اور بلند قامت ہستی جو عظیم ترین جامعہ کے لیل ونہار ہی میں چھپی ہوئی نہیں ہے، بلکہ تعلیم وتربیت کے ہزاروں گُر اس میں پنہاں ہیں۔ کاش کہ کوئی حوصلہ مند، باہمت فارغ البال جامعہ اور ازہری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خوشہ چیں موجودہ اور آنے والی نسلوں تک اس امانت کو من وعن پہنچادیتا۔

محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمۃ اللہ علیہ کو جامعہ سلفیہ بنارس میں غالباً پہلی بار دیکھا اور پہلی مرتبہ سنا بھی

تھا، یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے، جب کہ ان کی شخصیت اکثر علمی حلقوں میں معروف ومشہور ہوچکی تھی اور آپ کی صحافت اور حسن انتظام کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ اس وقت میں مادر علمی دارالحدیث مئو میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا، انہی دنوں یہ بھی سنا کہ کوئی عظیم علمی شخصیت مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ کی ہے جنہوں نے عربی زبان میں سیرت طیبہ پر مقالہ لکھ کر سیرت کے عالمی مقابلہ میں اول انعام حاصل کیا ہے۔ اور بنارس کے مشہور محلّہ بجرڈیہہ کے تاریخی و کامیاب مناظرہ کے اثر سے ایک پورا کنبہ مسلک سلفیت سے منسلک ہوگیا ہے۔ اور یہ مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ بنارس کے جامعہ سلفیہ میں استاذ ہیں۔ یہیں سے داعیہ پیدا ہوا، خواہشات نے انگڑائی لی اور عربی کی تیسری جماعت مکمل کر کے جامعہ سلفیہ دیکھنے کا شوق فراواں لئے عازم سفر بنارس ہوا۔ شوق سفر کو مہمیز لگانے میں استاذ محترم شیخ احمد مجتبیٰ سلفی کے مشورے اور ترغیب کا بہت دخل تھا۔

الغرض ''دیر آید درست آید'' کے طور پر اچانک جامعہ سلفیہ بنارس دیکھا اور دیکھتا رہ گیا، اس عالمی شہرت یافتہ سلفیان ہند کے دلوں کی دھڑکن عظیم مرکزی ادارہ بلکہ تحریک سے ایسی وابستگی اور دلبستگی رہی کہ اسی دن سے یہ اپنا عظیم مادر علمی رہا اور اور آج بھی ہے۔ اور بعد کے ادوار میں اسلامک یونیورسٹی مدینہ منورہ سعودی عرب سے فراغت کے بعد وہاں تدریسی خدمات انجام دینے کا موقع وشرف بھی حاصل ہوا۔ جس میں میرے ممدوح ڈاکٹر ازہری مرحوم اور اس وقت کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید سلفی رحمہ اللہ اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی حفظہ اللہ وتولاہ کی ترغیب اور اصرار بلکہ زور وجبر کا بڑا دخل تھا۔ جامعہ سلفیہ میں تدریس کے ان ایام میں شب وروز کیسے گذرے اور ازہری صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے افادہ واستفادہ اور قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے کتنے مواقع آئے اور آپ کی شخصیت سے جماعت و جامعہ کو کس قدر فائدہ پہنچا۔ وہ تمام چیزیں میرے ذہن و دماغ کے پردے پر آج بھی ثبت ہیں اور میری آنکھوں کے سامنے ان مشاہداتی مناظر کا پرتو بھی بعینہ موجود ہے، لیکن یہاں تفصیل کی قطعاً گنجائش نہیں۔ جامعہ کے لئے آپ کے دل میں کس قدر فکرمندی تھی اور اس کے لیے کس طرح کی کاوشیں اور کوہ کنی کرتے تھے اور اپنے اور غیروں کی پرواہ کئے بغیر جامعہ کے مصالح ومقاصد کے ساتھ اپنے آپ کو آں مرحوم نے کس طرح سے منسلک اور متعلق کر رکھا تھا، وہ تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ اور ایک مستقل موضوع، اور ایک الگ عنوان بھی ہے، جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جامعہ سلفیہ کو ازہری صاحب کی شخصیت سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ آپ جامعہ کے لیے ایک علامت اور لازم وملزوم کی حیثیت سے جانے وپہچانے جاتے تھے۔ اور میرے علم کی حد تک مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے تمام اہم معاملات میں بھی آپ کسی نہ کسی طور پر دخیل تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولانا عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر ہوا کرتے تھے۔

بعد کے ادوار میں راقم سطور جب ۱۵/اکتوبر ۲۰۰۱ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کا خادم وناظم عمومی منتخب ہو کر دہلی منتقل ہوا اس وقت بھی آپ جمعیت کے سلسلے

میں اور خود جامعہ سلفیہ سے تدریسی سلسلہ منقطع کرنے کے سلسلے میں اہم مشورے اور رہنمائی سے نوازتے رہے۔
مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی نظامت علیا کی ذمہ داریاں جن حالات میں سنبھالنے کی نوبت آئی اور جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اسے صفحۂ قرطاس پر ثبت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔لیکن اس سلسلے میں آپ نے جو مشورے دیئے اور نشیب وفراز کی نشاندہی کی وہ آپ کی جمعیت کے تئیں قلبی ہمدردی، اور حددرجہ لگاؤ پر دال ہے اور ان کی تعمیر وترقی کے لیے آپ کی گہری دلچسپی کی دلیل بھی۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند میں تنظیمی، دعوتی، دینی، اصلاحی اور عام معاملات میں بسااوقات آپ کی رہنمائی سے مسائل کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی رہی۔خصوصاً اٹھائیسویں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس جس کے آپ صدر استقبالیہ منتخب کئے گئے تھے۔اس کے لیے آپ کی فکر مندی، اس سلسلہ میں خصوصی شغف ودلچسپی اور عملی جدوجہد لائق ذکر ہے۔کانفرنس سے ایک ماہ قبل سے ہی مسلسل رابطہ بنائے رکھنا اور تقریباً ہر روز تبادلۂ خیال کرنا اور اس راہ کی دشواریوں اور اندیشوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر اسے دور کرنے کی تاکید کرنا اور مخصوص انداز اور بلیغ پیرایہ میں اس کے نشیب و فراز کو سمجھا دینا، کام سے لگاؤ اور ذمہ داری کو بدرجۂ اتم ادا کرنے پر شاہد عدل ہے۔خصوصاً کانفرنس سے ایک ہفتہ قبل ہی پاکوڑ کے لیے رخت سفر باندھ لینا، وہاں رات دن ایک کردینا، پل پل کی خبر رکھنا، وہاں کے حالات و انجازات سے مطلع کرنا، رکاوٹوں کی پرواہ کئے بغیر میدان سے لے کر غیر تربیت یافتہ رفقاء کار کی ناہمواریوں پر نظر رکھتے ہوئے ذمہ داران جمعیت سے اپنے منصب ومقام کی پرواہ کئے بغیر ہمہ وقت رابطہ میں رہنا اور مناسب حل ڈھونڈھنے اور ہموار کرنے میں مکمل اعتماد بحال رکھنے کی کوشش کرنا اس انانیت وانارکی کے زمانہ میں لائق تحسین ہی نہیں انتہائی قابل مدح وستائش ہے اور لائق عمل بھی، ورنہ آج کے زمانہ میں کبرونخوت اور عجب وانا کی جو حالت بعض مدعیان علم وعمل میں ہے اور اس سے جو فتنہ وفساد رونما ہورہا ہے، یہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔انہیں ایام میں جمعیت کے بارے میں بہت قریب سے آپ کے افکار و خیالات ،جمعیت کے تئیں آپ کے تصورات اور رجحانات کو جاننے کا اتفاق ہوا۔مجھے یاد ہے کہ جب استقبالیہ کی صدارت کے لیے راقم نے آپ سے اتصال کیا تو آپ نے اپنے خاص اسلوب میں اس سلسلے کی نزاکتوں اور اختیار وانتخاب کو جس طریقے سے بیان فرمایا وہ بذات خود جمعیت سے متعلق ان کے تجربات کا غماز تھا اور مجھے ان کی صلاحیت کا معترف ہونا پڑا۔اور اس کی روشنی میں بہت سے معاملات اور حالات کو سمجھنے اور برتنے کا موقع ملا۔

پاکوڑ کانفرنس جس کے آپ صدر استقبالیہ تھے، اپنے نظم ونسق، انتظام وانصرام، حجم وضخامت، کمیت وکیفیت، ایام ولیالی، علماء ومعززین جماعت کی کثرت، حضور ودلجمعی اور جوق درجوق اور فوج درفوج پورے ہندوستان سے ہی نہیں بلکہ دیگر تیرہ ملکوں سے "زرافات و وحدانا" کانفرنس اور جلسہ گاہ کی طرف والہانہ امنڈتے ہوئے چلے آنا اپنے آپ میں ایک بے مثال اور عدیم النظیر تاریخی عمل ہے۔

اسی کانفرنس کے سلسلہ میں مولانا مختار احمد ندوی

رحمہ اللہ نے کانفرنس سے ایک ماہ قبل جمعیت کے وفد سے اپنی آفس میں فرمایا تھا کہ ''کانفرنس ایک ماہ بعد منعقد ہوگی اور کیسی ہوگی اللہ کو معلوم ہے۔ مگر سردست اس کا فائدہ یہ ہے کہ اہل حدیث کا بچہ بچہ اس کانفرنس کی گونج سے جاگ چکا ہے''۔ یہ کانفرنس بڑی بابرکت ثابت ہوئی اور پورے ہندوستان کی جماعت میں ایک عام بیداری وتوانائی محسوس کی گئی اور اس کے ذکر سے آج بھی مسرت وشادمانی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اس کی شان وشوکت اور جلال وجمال نظروں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔

چند دن قبل تیرہواں آل انڈیا مسابقۂ حفظ وتجوید و تفسیر قرآن کریم جسے مرکزی جمعیت نے صوبائی جمعیت اہل حدیث آندھرا پردیش حیدرآباد کے تعاون سے منعقد کیا ہے، اس کے ناظم اعلیٰ محترم جناب حافظ عبدالقیوم صاحب پاکوڑ کانفرنس کو عظیم اور بے مثال کانفرنس کہہ کر دیر تک اس کے ذکر جمیل وجلیل کو بیان کرتے رہے۔

قابل ذکر بات یہ کہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نورہ اللہ مرقدہ واعلی اللہ درجتہ کے لیے یہ کانفرنس ان شاء اللہ تمام متعلقین و منتسبین کے ساتھ صدقۂ جاریہ ہوگی۔ اس مناسبت سے ان کی تمیقات وتحریرات بشکل خطبہ استقبالیہ سے کچھ اقتباسات وخیالات حوالۂ قرطاس کرنا چاہتا ہوں۔ انتیسویں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس جن حالات میں منعقد ہوئی اور اس کی جس طرح منظرکشی ہوئی ہے اور جس قدر اعتراضات ہوئے تھے حتی کہ کانفرنس کے التوا تک کی بات ہوئی تھی اس پس منظر میں آپ نے جس دردمندی کے ساتھ اپنے خطبۂ استقبالیہ کا اختتام فرمایا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

''ہندوستان میں جماعت اہل حدیث مختلف جماعتوں کے بیچ کام کررہی ہے، ہر جماعت اپنی شبیہ بہتر بنانے کی کوشش کررہی ہے، ایک مدبر کا فرض ہے کہ جماعت کے وقار کو بہتر بنائے، اور نازک وقت میں ایسا کوئی اقدام نہ خود کرے نہ کسی اور کو کرنے دے کہ جماعت کا وقار مجروح ہو۔

جب مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ نے کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کرلیا تھا تو ایسی صورت میں یہ بین الجماعات معاملہ بن گیا، لہذا مذکورہ فیصلہ کی تنفیذ ہی واحد حل تھا نہ کہ شوریٰ وعاملہ کے باہر کے عناصر سے متاثر ہوکر کانفرنس کے التواء کی بات کرنا۔

اعتراضات کا ہونا معیوب نہیں، لیکن وہ صرف جمعیۃ سے خاص نہیں، دوسری جگہوں پر بھی انہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن ان خرابیوں کی اصلاح کا وقت اور طریقہ ہوتا ہے، اگر آپ صحیح وقت پر اور درست طریقہ سے اصلاح کا عمل شروع نہ کریں گے تو ہر حرکت فساد کا سبب بنے گی۔

اصلاح کے عمل کو موثر بنانے کے سلسلہ میں ایک اور نقطہ قابل توجہ ہے، اور وہ یہ کہ جو چیز قابل اصلاح قرار پا رہی ہے، وہ اپنے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہو، کسی اور کی طرف سے تلقین وتوجیہ کا نتیجہ نہ ہو، اگر اس نقطہ پر دھیان مرکوز رہے تو اصلاح کے عمل سے پیدا ہونے والی تلخی کا اندیشہ باقی نہ رہے گا، بلکہ ہمارا مخاطب اقدام سے مطمئن اور اصلاح کے لیے آمادہ رہے گا''۔

ازہری صاحب رحمۃ اللہ علیہ جمعیت وجماعت کو

ہر ناحیہ سے بہتر اور ترقی پذیر دیکھنا چاہتے تھے۔لیکن اس راہ کی دشواریوں کو بھی محسوس کرتے تھے۔ وہ بجا فرماتے تھے کہ ناظم صاحب آپ کی امنگیں اور پلاننگ اور اقدام بہت اچھی چیز ہے مگر آپ کو لوگ کرنے نہیں دیں گے۔ کبھی فرماتے کہ یہ آپ لوگوں کے دل گردے کا کام ہے جوان حالات میں بھی یہ کام کرلے گئے۔ جماعت کی بدقسمتی ہے کہ اس کے پاس ان اعمال کی قدر نہیں ہے۔ جب کوئی کام انجام پا جاتا تو خوش ہوتے اور تحسین فرماتے اور کسی بھی آڑے وقت میں انتہائی دردمندی اور فکر مندی کے ساتھ پیش آمدہ مسائل پر بے لاگ تبصرہ فرماتے۔ اس کی سنگینی اور مضرت کو بیان کرتے، ایسا لگتا تھا کہ آپ مکمل بیزار ہیں یا دلبرداشتہ ہوکر کنارہ کشی میں ہی عافیت محسوس کریں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہی نہیں کہ اس کے کر گذرنے کا مشورہ دیتے بلکہ براہ راست ذاتی طور پر تعاون بھی فرماتے۔

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ہندوستانی اہل حدیث طلبہ کے خلاف بعض لوگوں نے ریشہ دوانی کی اور بعض اہل حدیث طلبا کا داخلہ ماجستر میں رکوادیا گیا۔ اور پتہ چلا کہ ایک لمبی فہرست عمادہ کے پاس گئی ہے تاکہ انہیں بڑی خوبصورتی سے لیسانس کرتے ہی نکال دیا جائیگا اور اپنے صفوں میں امتیازی نمبر اور پوزیشن لانے کے باوجود داخلے سے محروم کردیئے جائیں گے۔ اسی زمانہ میں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ ایک انتہائی متعصب شخص نے جالیات کے دعاۃ کے خلاف موقع ملتے ہی حکام خصوصاً وزارت داخلہ کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ ان واقعات کی اطلاع ڈاکٹر ممدوح محترم ازہری صاحبؒ کو میں نے بذات خود دی اور ان کو مرکزی جمعیت کے وفد کے ساتھ بلاد حرمین شریفین مملکت سعودی عرب جانے کا مشورہ دیا۔ حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے حامی بھرلی، چنانچہ امیر محترم حافظ محمد یحیٰی دہلوی، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ اور راقم پر مشتمل وفد نے سعودی عرب کے لیے رخت سفر باندھا اور وہاں چند قضایا و امور پر خصوصی توجہ دی گئی، اور انہیں قابل حل بنانے کی بھرپور جدوجہد ہوئی۔

راقم سطور کو ایک موقر ادارہ وزارت الأوقاف کویت کی دعوت پر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ ہر جگہ ان کی پروقار شخصیت ہمارے لیے افادیت کا پہلو لیے نظر آئی اور وہ ہر گام پر ہمیں مفید علمی توجیہات اور تنظیمی و جماعتی مشوروں سے نوازتے رہے۔ وہاں کا سفر بھی افادہ وفیضان سے خالی نہ رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ لوگوں کے نامناسب اقدامات پر نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ قدغن لگادیا۔

ڈاکٹر صاحب کو جماعت و جمعیت سے بعد ہمدردی تھی، پختہ لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی جماعتی، تنظیمی اور منہجی نزاعات کے تصفیہ کے لیے سفر کی پیش کش ہوئی، جماعت و جمعیت سے گہری وابستگی کے سبب انکاری نظر نہ آئے۔ ایک بار ہندوستان کی معروف خوبصورت ریاست کیرلا میں بدقسمتی سے بعض غیر منہجی لوگوں نے وہاں کی جماعت میں تفرقہ و دراڑ ڈالنے کی سعی نامسعود کی۔ اس کی خبر پاتے ہی چار آدمیوں پر مشتمل مرکزی جمعیت کا ایک اعلیٰ سطحی وفد کیرلا کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے ارکان میں ڈاکٹر ممدوح مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ (صدر جامعہ سلفیہ

بنارس)، ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس مبار کپوری رحمہ اللہ (جو مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے نائب امیر اور جامعہ سلفیہ بنارس کے شیخ الجامعہ تھے)، ڈاکٹر فضل الرحمٰن مدنی حفظہ اللہ شیخ الجامعہ، جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں اور بشمول راقم سطور قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا موقر شخصیات نے نزاعی مسائل کے حل کی سعی کی اور غیر منہجی افراد کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن بدقسمتی سے وہ معاملہ لاینحل عقدہ کی شکل میں باقی رہا۔ اس طرح ہمیں دسیوں اسفار ازہری رحمہ اللہ کی معیت میں پیش آئے اور سب میں استفادہ کا موقع ملا۔

ڈاکٹر ازہریؒ مرحوم بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ میدان تحریر وتدریس میں ان کا طرز واسلوب منفرد وممتاز تھا۔ تاریخ ادب عربی کا ماہر اور حکومت ہند سے ایوارڈ یافتہ، عربی مجلہ صوت الأمة کا ایڈیٹر، فن صحافت میں کامل مہارت رکھنے والا، فن درس وتدریس کی گُر سے آگاہ، ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔ اس کی قدآور شخصیت اپنے ممتاز خصائل وعادات اور علمی وتدریسی عظمتوں کی بنیاد پر ناقابل فراموش گردانی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اتنی یادیں، اتنی ملاقاتیں، اتنے واقعے اور جلسے اور درسی وتدریسی مراحل کے ایام جو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گزرے ہیں ایک مختصر تاثراتی مقالے میں ان سب کا تفصیلی و تکمیلی تذکرہ نہیں کیا جاسکتا، صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ:

ہائے کیا دور زندگی گزرا
واقعے ہوگئے کہانی سے

ڈاکٹر ازہری مرحوم کا خوشہ چیں ہونے کا شرف ہی میرے لیے تاریخ کا محفوظ رکھا جانے والا سرمایہ ناز ہے۔ میں اپنے ادنی مطالعے، ذاتی مشاہدے وتجربے کی بنیاد پر یہی کہہ کر اپنی بات ختم کروں گا کہ اس قحط الرجال اور پامالی اقدار کے زمانے میں ڈاکٹر ازہری مرحوم کی شخصیت مغتنم تھی۔ اور ان کے یوں اچانک چلے جانے سے عظیم خلا محسوس ہو رہا ہے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔ ان کے پسماندگان بھائی سلمان، عزیزم ڈاکٹر محمد فوزان، عزیزہ نکہت وعفاف اور ان کی والدہ اور ان کے تمام اہل خانہ کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین

محترم جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری جنہوں نے جماعت وجمعیت اور علم وہنر کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی، ایسی باعظمت شخصیت پر ''افکار عالیہ مئو'' کا خصوصی شمارہ منظر عام پر آرہا ہے، جس پر افکار عالیہ کے تمام متعلقین ومنتسبین اور اس کے مدیر ودیگر ذمہ داران ہمارے بہت زیادہ شکریہ ومبارک باد کے مستحق ہیں۔ اور بجا طور پر جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن، جماعت کا قدیم ترین ادارہ، جو اپنی مردم خیزی اور علوم کتاب وسنت کی خدمات جلیلہ کے لیے معروف ومشہور ہے، ہم سب کی طرف سے شکر وستائش کا سزا وار ہے۔ ہم ان کے لیے دعا گو ہیں اور نیک خواہشات ہر وقت نچھاور کرتے رہتے ہیں۔ خصوصاً مدیر محترم جناب مولانا عبداللطیف صاحب اثری حفظہ اللہ اور ناظم اعلیٰ شیخ مظہر احسن ازہری حفظہ اللہ کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے اس حقیر کو چند کلمے لکھنے کی تاکید وتلقین کی۔

فجزاهم الله خيرا۔

☆☆☆

مولانا رضاء اللہ عبدالکریم المدنی
نئی دہلی

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

ہندوستان کے جن قصبوں، شہروں اور علاقوں کو ماضی کے عراق وایران کے مشہور قصبات وشہروں کی ہمسری کا دعوی رہاہے ان میں مئوناتھ بھنجن کو بجاطور پر پیش کیا جاسکتا ہے، اس شہر کی زرخیزی، علمی بیداری اور برتری کو اگر مسلّمات میں گنا جائے تو بے جانا نہ ہوگا۔ اگر سہیلؔ نے خطۂ اعظم گڑھ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ ؂

جوذرہ یہاں سے اٹھتاہے وہ نیر تاباں ہوتا ہے

اس وقت مئوناتھ بھنجن اس میں شامل تھا، اور آج اس سے الگ ہوکر بھی مئوناتھ بھنجن کو یہ کہنے کا حق ہے کہ: ؂

جوذرہ یہاں سے اٹھتاہے وہ نیر تاباں ہوتا ہے

اس دعوی کی دلیل کے طور پر مختلف علوم وفنون کے وہ اساطین جو اس شہر علم سے اٹھے اور ان سے دور و نزدیک کے امصار و دیار مستفید ہوئے اگر بطور مثال بھی ذکر کئے جائیں تو بلاشبہ ؂

سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کیلئے

ماضی قریب میں جن اہل علم نے اپنی ہمہ جہتی، بیدار مغزی، محنت ولگن اور امت مسلمہ کی بے لوث خدمت میں نام پیدا کیا اور جوامت مسلمہ سے لیا اس سے کہیں زیادہ متعدد علوم وفنون میں واپس کیا ان میں ایک عظیم نام استاذ گرامی قدر، ادیب عصر، حضرت مولانا مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کا بھی ہے۔

استاذ گرامی قدر کی زندگی کے مختلف گوشوں پر ''مجلہ افکار عالیہ'' کے مدیر حضرت مولانا عبد اللطیف صاحب نے حضرت مولانا مظہر احسن ازہری حفظہ اللہ وتولاہ کی نگرانی میں یقیناً اہل علم سے مناسب، مفید اور ضروری معلومات پر مشتمل مضامین لکھائے ہوں گے اس لئے ان گوشوں کو چھوڑ کر صرف اپنے چند تجربے ہی ذکر کروں گا۔

ازہری صاحب کو دیکھنے کا اتفاق تب ہوا جب میں دہلی سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے جامعہ سلفیہ بنارس حاضر ہوا۔ میرے لئے یہاں کے تمام اساتذہ اجنبی تھے۔ ایک شخصیت تھی حضرت مولانا محمد ادریس آزاد رحمانی املو رحمہ اللہ کی، جن کی تحریریں میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا اور ان کو جماعتی رسائل کے واسطے سے جانتا تھا۔ یوں تو سارے اساتذہ اپنے وقت کے ماہر، دیدہ ور اور ممتاز حضرات تھے لیکن ازہری صاحب سے تیسری سال اور وہ بھی صرف ایک کتاب اور وہ بھی ان کے اختصاص سے جدا کتاب ''هداية الحكمة'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ درس میں نہ تو غیر ضروری باتیں ہوتی تھیں اور نہ ہی غیر ضروری مباحث اور قال اقول، مصنف کی بات کو سیدھے اور سادہ انداز میں سمجھاتے اور چلے جاتے، اساتذہ وطلبہ میں جو بے تکلفی ہوتی ہے اور کبھی کلاس سے باہر کی باتیں بھی زیر بحث آجاتی ہیں اور کبھی کبھی طلبہ پڑھنے کے موڈ میں نہیں ہوتے تو

غیر ضروری سوالات وغیرہ کر کے استاد کو پڑھانے سے باز رکھتے ہیں اگر چہ ایسا دیگر اساتذہ کے ساتھ ہوتا تھا لیکن آپ کے ساتھ کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔

کم آمیزی اور اپنی توجہ، خاص امور پر مرکوز رکھنا یہ ان کا خاصہ تھا۔ دن بھر جامعہ کے اوقات کار سے بھی زیادہ آفس میں رہنا اور اکیلے لکھتے پڑھتے رہنا یہ ان کا روز کا معمول تھا۔

بہت کم طلباء تھے جو ان کے پاس آیا جایا کرتے ورنہ اکثر ان کی نظر سے بچ کر چلنے کی کوشش کرتے۔ عالمیت کے بعد فضیلت سال اول میں یہ خیال دل میں بہت کثرت سے آنے لگا کہ پڑھنے کے بعد کیا کروں، زندگی میں باعزت روزگار کی بات نے اس قدر پریشان کیا کہ ہم درخواست لے کر ازہری صاحب کے پاس پہنچ گئے، ہم کمپوزنگ سیکھنا چاہتے ہیں۔ چند سوالات کیے، کچھ ہدایتیں دیں، اجازت مل گئی اور ہم اپنا بہت سارا وقت اس میں دینے لگے، سیکھ گئے، فراغت بھی ہوگئی، خدمت میں حاضر ہوئے، پوچھا فراغت تو ہوگئی کیا حکم ہے۔ جواب ملا رمضان کے بعد آؤ اور پریس میں سہیل صاحب کے ساتھ کام کرو، ہم دو ساتھی تھے عابد علی گونڈوی صاحب اور میں، دونوں رمضان کے بعد آئے، کام بھی کیا، سردی کا موسم تھا، رہنے کے لیے کوئی مناسب بندوبست نہ ہوسکا، بیمار ہوگئے، اس لیے چلے گئے۔

وقت گزرتا گیا، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد جامعہ حاضر ہوئے۔ تمام اساتذہ سے ملاقات اور مشورے ہوئے۔ ڈرتے ڈرتے ازہری صاحب کے آفس میں بھی حاضر ہوئے، سلام کیا نظر اٹھائی، جواب دیا، کہا: بیٹھو!

کیا کر رہے ہو!

عرض کیا نظر میں دو تین ادارے ہیں ان میں سے کسی ادارے کو اپنی سرگرمیوں کے لئے انتخاب کرنا ہے لیکن تجربہ ہے نہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں۔ تفصیل معلوم کی، مشورہ دیا، بریلی چلے جاؤ، وہاں جماعت کو ضرورت بھی ہے اور وہاں کام کرنے کے مواقع بھی ہیں، پھر اپنے وطن سے قریب رہوگے۔

اور اس طرح المعهد الاسلامي السلفي رچھا بریلی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا، یہاں آکر جو تجربات ہوئے وہ بڑے تلخ تھے۔

اسی زمانہ میں ''محدث'' بنارس میں ایک غزل برائے اشاعت بھیجی، مدیر تھے استاذ گرامی حضرت مولانا صفی الرحمٰن صاحب، غزل چھاپی بھی اور حوصلہ افزائی بھی کی، اس غزل کا تعلق اس وقت کے حالات سے تھا، اس میں ایک مصرع یوں تھا ؎

میرے چارہ گر ترا شکریہ مجھے کس شہر کا پتا دیا

اس میں چارہ گر ازہری صاحب ہی کی ذات گرامی تھی۔ بریلی میں اہل بدعت سے جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ان میں ایک مسئلہ نجدیت، کا بھی تھا، چونکہ اہل بدعت جماعت کو ایک مہذب گالی کے طور پر نجدی کہتے ہیں اور ان کے عوام کا یہ عقیدہ ہو چکا ہے کہ نجدی مسلمان نہیں ہوتے۔ بار بار کی تکرار سے متاثر ہو کر ایک کتاب ''فتنوں کی سرزمین نجد یا عراق'' لکھی اور ازہری صاحب کے پاس مسودہ لے کر حاضر ہوا آپ نے پڑھا اور اس پر تقریظ لکھ دی، کتاب چھپی آپ تک پہونچی، بہت خوش ہوئے۔ اسی درمیان بریلویوں کی طرف سے ایک کتاب ''مسئلہ قرأت'' نامی منظر عام پر آئی، لکھنے والے نے اپنی پوری بریلوی خصوصیات کا مظاہرہ کرتے

ہوئے چیلنج کیا، میں نے اس کا جواب لکھا، اس تعلق سے بنارس بعض کتابوں کے لئے آنا جانا بھی ہوا، کتاب کے مقدمہ میں میں نے آپ کا تذکرہ کیا تھا، کتاب پڑھی بہت خوش ہوئے اور ایک ''انتر دیشی'' خط مطبوعہ بطور رسید اور حوصلہ افزائی ارسال فرمایا جو آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔

بریلوی دنیا کا سب سے منافع بخش کاروبار وہ ہے جو نیاز و فاتحہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس سے متعلق ایک کتاب ان کے یہاں ایک بریلوی پاکستانی مولوی کی بہت مشہور ہے۔ ''طریقہ فاتحہ مع ثبوت فاتحہ'' جماعت کے بعض افراد نے یہ کتاب لا کر دی اور بتایا کہ آج کل رضا خانیوں میں اس کی بہت پزیرائی ہے اور اس کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے میں نے اس کا جواب لکھا۔ بنارس گیا آپ کو دکھایا پسند کیا اور اس پر مقدمہ لکھا۔

جب بھی بنارس حاضری ہوتی حوصلہ افزائی فرماتے، حالات پوچھتے اور نیک مشورے دیتے، ایک بار دل میں خیال آیا، اکثر بریلوی مولوی مفتی احمد یار بدایونی کی کتاب ''جاء الحق'' کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ان میں سے اکثر کا مبلغ علم یہی کتاب ہے۔ اس کا جواب لکھنا چاہئے ازہری صاحب سے مشورہ ہوا، اس بات کو تو سراہا کہ اس کتاب کا جواب لکھا جائے لیکن اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی، فرمایا پوری کتاب کا جواب ایک ساتھ لکھو گے تو وقت بھی بہت لگے گا اور کتاب ضخیم بھی ہو جائے گی، جس کا چھاپنا اور خریدنا دونوں مشکل ہوگا، ایسا کرو کہ ایک ایک بحث کا رد لکھتے جاؤ اور چھپواتے جاؤ، بات پسند آئی دو تین مسائل کا جواب لکھا، خبر ملی کہ پاکستان میں اس کا جواب چھپ گیا ہے۔ اس لئے درمیان ہی میں کام بند ہو گیا۔

ابتداءً جماعت میں خصوصاً جماعت کی میٹنگوں میں حاضر ہونے کو ناپسند کرتے تھے لیکن جب قیادت کی تبدیلی ہوئی تو اکثر مجالس میں حاضری دیتے۔

بنگلور کی میٹنگ میں اس وقت آپ کی ناراضگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی جب پاکوڑ کانفرنس کے تعلق سے بعض لوگوں نے اعتراضات کیے اور پھر ذمہ داروں نے اسے مجلس استقبالیہ کے سر تھوپنا شروع کیا، چونکہ مجلس استقبالیہ میں میں اور ازہری صاحب اور ایک اور صاحب ہی تھے جنہوں نے پروگرام ترتیب دیا جس میں بلا اطلاع ذمہ داروں نے بر وقت تبدیلی کر کے سارا پروگرام اناڑی کے حوالے کر دیا اور جب اس سے لوگوں کو شکایت ہوئی تو ان لوگوں نے اپنی چمڑی بچانے کے لیے مجلس استقبالیہ کو مورد الزام ٹھہرایا، اس پر ازہری صاحب نے جو بیان دیا اس پر خود امیر جمعیت کو یہ کہہ کر معافی مانگنی پڑی، معاف کیجئے گا ہمیں نہیں پتا تھا کہ مجلس استقبالیہ کی ذمہ داری آپ پر تھی۔

اسی بنگلور اجلاس میں جب میں نے یہ تجویز رکھی کہ جمعیت ایک شعبہ ایسا ترتیب دے جس کا کام جماعت پر ہونے والے حملوں کا مناسب اور معقول جواب دینا ہو تو سب سے زبردست تائید جس نے کی، وہ ازہری صاحب ہی تھے۔

وہ جماعت کے بے لوث خادم تھے۔ ہر بڑی کانفرنس میں شرکت، خطبہ استقبالیہ اور اپنے پر مغز خطاب سے جماعت کو نوازتے رہے۔

آخر میں جب قائدین جماعت کی غلط پالیسیوں کے سبب سمجھ دار اور باغیرت اشخاص الگ ہونے لگے انتشار کو ختم کرنے کی اپیلیں بار بار کی جانے لگیں اور خاص مقاصد کے لیے جماعت کو استعمال کیا جانے لگا تو متعدد لوگوں نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ آپ نے کئی بار عدم شرکت کا ارادہ بھی کیا مگر بیرون ملک بیٹھے ایک

شخص کے کہنے پر آپ شریک ہوتے رہے۔ اوراس بارے میں آپ کو کچھ لوگوں سے بہت سی وہ باتیں سننی پڑیں جن کے آپ عادی نہ تھے۔ یہ بات آج تک معمہ ہے کہ آپ اپنی طبیعت کے برخلاف ان متنازع کانفرنسوں میں شریک کیوں ہوتے رہے؟

اللہ ان کی مغفرت فرمائے ہوسکتا ہے آپ کی کم آمیزی اور عام لوگوں سے اپنے کو تھوڑا ریزرو رکھنے کی پالیسی کے سبب عام لوگوں کی بات آپ تک نہ پہنچتی ہو اور کچھ لوگ آپ کو چکنی چپڑی باتیں بتا کر اور آپ کی جماعتی حمیت کا فائدہ اٹھا کر آپ کو استعمال کرتے ہوں۔

بہر حال:

ازہری صاحب اگر چہ کم آمیزی کے خوگر تھے اور ہر ایک سے ملنا پسند نہ کرتے تھے اور آنے والے سے تھوڑا سخت لہجے میں بات کرتے تھے، بنابریں سارے لوگ اس کو ان کی سختی و درشت مزاجی خیال کرتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایسا صرف اس لئے کرتے تھے کہ لوگ بلا وجہ ان کا وقت برباد نہ کریں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ انہوں نے جس قدر کام کیا وہ تبھی ممکن ہو پایا کہ انہوں نے اپنے وقت کا مناسب اور پورا پورا استعمال کیا اور کسی کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ بلا وجہ ان کا وقت برباد کرے۔

صبح سے لے کر شام تک ان کا شیڈول متعین تھا اور وہ اس میں تبدیلی بلا خاص وجوہات کے قبول نہ کرتے تھے۔

جو لوگ ان کے قریب رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جس قدر وہ سخت گیر نظر آتے تھے اتنے سخت گیر نہ تھے۔ ان کے مزاج میں بڑوں بزرگوں اور علماء کے لیے خلوص بھی تھا محبت بھی اور احترام بھی تھا، خطیب الہند حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری و مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی بستوی کے ساتھ آپ کے رویہ کو ہم نے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان حضرات کی بات بھی نہیں ٹالتے ہیں مفید مشورے بھی دیتے ہیں اور ان کا کام کرنے کے لیے اپنے شیڈول میں تبدیلی بھی کر لیتے ہیں۔

جماعت کے منہج، کام، تاریخ، اصول، مردان کار، ان تمام مسائل سے نہ صرف وہ بخوبی واقف تھے بلکہ اس کی تشریح وتوضیح کو دین کا کام جانتے تھے۔

حضرت مولانا عبد اللہ صاحب محدث غازی پوری کے رسالہ ''ابراء اہلحدیث والقرآن الخ'' پر جب میں کام کر رہا تھا اس رسالہ کی اہمیت کے بارے میں ان سے گفتگو ہوئی آپ نے میری اس بات کی پوری فراخ دلی کے ساتھ تائید فرمائی کہ جماعت اہلحدیث کے منہج کو سمجھنا اور اس کے دفاع کا کام کرنے والوں کے لیے جن کتابوں کا پڑھنا بے حد ضروری ہے ان میں یہ کتاب صف اول کی کتاب ہے۔

اور جب میں نے اس کتاب کو ایڈٹ کر کے اور اس پر ایک مقدمہ لکھ کر ''معاندین اہل حدیث کے الزامات کی حقیقت'' کے نام سے چھاپا اور آپ کو پیش کیا تو بہت خوش ہوئے۔

مئو کے ایک جلسہ میں شرکت کے لیے میں دہلی سے بنارس گیا اور وہاں سے مئو جانا تھا اتفاق سے مئو سے جامعہ عالیہ کے چند اساتذہ بھی بنارس آپ کو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے، صدارت آپ کی تھی۔ طے پایا مئو ساتھ چلیں گاڑی کا سفر ایک ہی جگہ سب کی سیٹ یہاں سے وہاں تک بات چیت ہوتی رہی جماعتی مسائل، مدارس کے مسائل، علماء کے مسائل، طلباء کے مسائل سب ہی زیر بحث آئے مختلف تجویزیں سامنے آئیں۔

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب اس وقت جماعت ایک عجیب قسم کی صورت حال سے دو چار ہے جس کی وجہ سے بہت نقصان ہو رہا ہے، کہنے لگے: کیا؟ میں نے کہا بہار اور بنگال میں جماعت کی تعداد بہت اچھی ہے اور وہاں کے لوگوں کو دینی تعلیم کا شوق بھی ہے لیکن بدقسمتی سے وہاں کے اداروں کا تعلیمی معیار بہت گھٹیا ہے، وہاں کے بچے جب یہاں آتے ہیں تو یوپی کے مدارس میں ان کا داخلہ نہیں ہو پاتا اور اس طرح ان کی اکثریت دیگر مسالک کے مدارس کا رخ کرتی ہے اور اس کا نقصان جماعت کو ہوتا ہے۔

کہنے لگے کیا کیا جائے، میں نے کہا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ کچھ ادارے ایسے قائم کیے جائیں جن میں تعلیم کے لیے معیار کی یہ سخت پابندیاں نہ ہوں، بلکہ ہر عمر ہر علاقہ اور ہر جماعت اور ہر طرح کے طالب علم کو داخلہ دیا جائے۔ ایک دو سال میں زبان اور قوعد پر محنت ہو اور باقی سالوں میں قرآن وحدیث کی ٹھوس تعلیم ہو جس سے ہماری مساجد کے ائمہ وخطباء فراہم ہوسکیں اور ان حضرات کیلئے تعلیم کا نظم بھی ہو جائے اور ان کو دوسروں کی جھڑکیاں نہ کھانی پڑیں۔

کہنے لگے مشورہ غلط نہیں ہے صورت حال سے نپٹنے کے لیے مناسب تجویز ہے لیکن ایسا کہیں ہوا ہے؟ میں نے کہا ہاں دہلی میں حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب ملتانی رحمہ اللہ کے مدرسہ کا کچھ ایسا ہی نظم تھا جس کے ذریعہ انہوں نے ہزاروں لوگوں کو مسلک سلف کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

کہنے لگے بہت بہتر۔

آپ کے ساتھ سفر کرنے کا زیادہ نہیں صرف دو چار بار ہی موقع ملا مگر جامعہ سلفیہ کے آفس والے ڈاکٹر صاحب سے یہ سفر کے ہمسفر ڈاکٹر بالکل الگ محسوس ہوئے۔

ممبئی کی جس کانفرنس میں اخی فی اللہ رضاء اللہ محمد ادریس کا انتقال ہوا۔ اس کی صبح کو ازہری صاحب اور ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب میری عیادت کے لئے آئے اور کافی دیر بیٹھ کر دلاسہ دیتے رہے۔ ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب نے ازہری صاحب سے کہا ڈاکٹر صاحب! یہ بالکل احتیاط نہیں کرتے ہیں لمبے لمبے سفر اور وہ بھی نان اے سی میں اور پھر اکیلے کرتے ہیں، میں منع کرتا ہوں۔ ازہری صاحب نے فرمایا میاں مولانا صحت کا خیال رکھو جب صحت ہی نہ ہوگی تو کام کیا کرو گے۔

یہ ان حضرات کی خردنوازی، محبت اور ذرہ نوازی تھی، وہ حضرات بڑے محنتی، جفاکش اور جماعت کے لیے بے چین رہنے والے تھے۔

آج ان کی غیر موجودگی میں یہ چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو ان کی یادوں کا دریچہ وا ہے اور ایک ایک کرکے ان کی یادیں آرہی ہیں، اور دل کو تڑپا رہی ہیں۔ اللہ تعالی نے ان کو بلا کی ذہانت، خطابت اور نکتہ رسی دی تھی اور سب سے عظیم تر حصہ جو ان کو اللہ نے دیا تھا وہ تھا ان کا وہ ملکہ جس کے بل پر اردو کو عربی، اور عربی کو اردو کا جامہ پہنا دیا کرتے تھے اور پڑھنے والے کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی ایسی کتاب پڑھ رہا ہے جو کسی دوسری زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔

جس طرح اردو ادب کا مطالعہ ان کا وسیع تھا اسی طرح عربی ادب کا مطالعہ اور معلومات بھی ان کی نہایت وسیع تھی۔ اس پر مزید یہ کہ ان کو ان دونوں زبانوں کو برتنے کا نہایت عمدہ سلیقہ تھا۔ حركة الانطلاق الفكري يارحمة للعالمين عربی کا جس نے مطالعہ کیا ہوگا وہ ہماری اس بات سے سو فیصد اتفاق کرے گا، اسی طرح ''رسالت کے سایہ میں'' پڑھ کر آدمی ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ وہ کوئی ایسی کتاب پڑھ رہا ہے جو کسی دوسری زبان سے ترجمہ کی گئی ہے۔

ان کا علمی، تصنیفی، اور ترجمہ کا کام اس لائق تھا کہ اس کو شایان شان طریقہ پر شائع کیا جاتا اور ان کے منصوبہ پر جس کا خاکہ انہوں نے تیار کر رکھا تھا اور آگے کام جاری رکھا تھا اس خاکے میں بھی مناسب و معتبر رنگ بھرا جائے مگر افسوس جامعہ جس کے لیے انہوں نے ساری زندگی لگادی اور جماعت جس کے لیے وہ بے تاب اور بے چین رہے دونوں نے ان کو بہت حد تک بھلا دیا۔ جن لوگوں نے ان کو اپنے مفاد میں ان کی خود داری کے خلاف استعمال کیا، رو دھوکر ان کو یقین دلاتے رہے، ان کو اس عظیم شخصیت کے شایان شان نہ سہی نام ہی کے لیے ایک نمبر تک نکالنے کی توفیق نہ ہوئی۔

مجھے کیا کسی کو بھی یہ امید نہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب اتنی جلدی ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ وہ دہلی آئے ہوسپٹل میں ایڈمیٹ رہے، حالات ملتے رہے، احباب بنارس نے ایک اجلاس رکھا جس میں مجھے حاضر ہونا تھا ڈاکٹر صاحب کی صدارت کا اعلان ہو چکا تھا۔ میں بذریعہ ٹرین روانہ ہوا، احباب کے فون آتے رہے ڈاکٹر صاحب سخت علیل ہیں دہلی سے مئو کے لیے روانہ ہو چکے ہیں پھر پتہ چلا اسی ٹرین میں ڈاکٹر صاحب بھی ہیں (۱) اور ان کے ہمراہ کئی اشخاص ہیں لیکن بنارس پہونچنے سے قبل ہی یہ اطلاع بھی مل گئی کہ ڈاکٹر صاحب اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ رنج و غم، افسوس و ملال، ٹرین بنارس رکی مگر اتنا وقت نہ مل سکا کہ دیکھ پاتا وہ مئو کے لیے روانہ ہو گئے۔ بنارس کے احباب نے جلسہ ملتوی کر دیا اور اس طرح شام تک ہم بھی مئو پہنچ گئے اور مشکل سے نماز جنازہ ملی، بہت سارے لوگ نماز جنازہ سے محروم رہ گئے، کئی بار نماز ہوئی۔

اور اس طرح وہ آفتاب علم، مہتاب جماعت ہمیشہ کے لیے ہم سے روٹھ کر چلا گیا ان کا اٹھ جانا صرف ایک عالم کا اٹھ جانا نہیں تھا۔

اسلاف میں جب کسی کی وفات کا سانحہ پیش آتا تھا تو یہ سوال ہوتا تھا کہ فلاں چلا گیا اپنے بعد کس کو چھوڑ گیا مورخین اس سوال کا جواب دیتے اور اپنی دینی کتابوں میں قلم بند کرتے رہے ہیں لیکن افسوس ہم اس زمانہ میں ہیں جس میں اگر یہی سوال کیا جائے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے جیسا کس کو چھوڑا تو جواب یہی ہوتا ہے کسی کو نہیں۔

آج گہرائی، گیرائی، محنت، لگن، تڑپ، اور اپنے اسلاف کے مشن سے وابستگی کے ساتھ اپنی عمدہ، نفیس اور معتبر زبان سے علم و ادب کی خدمت کرنے والا مدبر، مفکر اور ماضی و حال کے ساتھ مستقبل پر اچھی نظر رکھنے والا پوری جماعت میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

فانا للہ وانا الیہ راجعون اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کی لغزشوں سے درگذر کرتے ہوئے جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔ ان کی یادیں چالیس سال پر محیط ہیں ان کو بھلانا ممکن نہیں ہے۔

جان کر من جملہ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

☆☆☆

---

(۱) ڈاکٹر صاحب دہلی سے بذریعہ ٹرین نہیں بلکہ بذریعہ ایمبولینس روانہ ہوئے تھے۔

مولانا محمد مقیم فیضی
ممبئی

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری رحمہ اللہ
کچھ بکھری ہوئی یادوں کی روشنی میں

زندگی کی صبح وشام پر آدمی کا اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ رہوار عمر منزل خمسین تک آیا ہی چاہتا ہے اب بیتے دنوں کی یادیں دھندلانے لگی ہیں مگر حافظے کی دھندلی تہوں سے یہ بات اچانک ابھر آئی جیسے کسی موقعہ کے انتظار میں بیٹھی ہو۔ عربی کے ابتدائی درجات میں پڑھ رہا تھا علاج کی غرض سے کلکتہ چلا گیا، واپس آیا تو کافی دیر ہو چکی تھی، مدارس کا تعلیمی سال کب کا شروع ہو چکا تھا، داخلے بند ہو چکے تھے، مگر موہوم سی امید کے سہارے بنارس پہنچ گیا، رحمانیہ میں داخلہ کہاں ملتا معذرت ہوگئی اور مجھے کوئی خاص ملال بھی نہیں تھا تاہم جامعہ سلفیہ ہی میں قیام رہا، ہمارے جوار کے طلبا وہاں زیر تعلیم تھے، یہ وہ زمانہ تھا کہ ازہری صاحب کا شہرہ ہر طرف پھیلا ہوا تھا مگر ان کے مزاج کے متعلق جو تذکرہ سنا تھا وہ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ مگر اپنا مزاج بھی بچپن سے کچھ عجیب وغریب واقع ہوا تھا یہ ٹھان لیا کہ ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملنا ہے لہٰذا ان کے آفس کا پتہ کر کے سیدھے ملنے چلا گیا حسن اتفاق کہ وہ تنہا تھے، اندیشوں کے برخلاف بڑی شفقت سے پیش آئے۔ آواز میں ایک طنطنہ ضرور تھا مگر طبیعت کے وقار کے ساتھ ساتھ لب ولہجے میں بڑی شگفتگی تھی، اس زمانے میں کسی کی ذات وصفات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت کہاں تھی البتہ ان کی شخصیت سے مجھے عظمت کا احساس ہوا۔ انہوں نے آمد کی غرض وغایت معلوم کی اور اپنی نصیحتوں سے نوازا اب ان میں سے کوئی بھی جملہ حافظہ میں محفوظ نہیں ہے مگر ایک سبق یہ ضرور ملا کہ سنی سنائی باتوں پر کوئی نظریہ قائم کرنا صحیح نہیں ہوتا، کوئی ضروری نہیں کہ کسی شخصیت کے بارے میں جو تجربہ زید کا ہو وہی عمرو کا بھی ہو۔ اس کے بعد تو جب جب مجھے ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری رحمہ اللہ سے ملنے کی سعادت نصیب ہوئی انہیں ایک خوش طبع، نیک خو، پر وقار اور انسانیت نواز شخص کے روپ میں ہی دیکھا، ان دنوں جب جامعہ رحمانیہ میں داخلہ نہیں مل سکا تو میں نے چراغ العلوم بنارس میں داخلہ لے لیا، اس کے بعد دہلی چلا گیا، پھر مئوناتھ بھنجن کے جامعہ اسلامیہ فیض عام سے فارغ ہوا۔ فراغت کے بعد اپنے کاغذات جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ بھیجے وہاں سے جواب آیا کہ اتنی مدت میں (جو خط میں درج تھا) فلاں فلاں کاغذات اور بھیج دو۔ وہ جواب فیض عام کے پتے پر ہی آیا تھا، اس وقت کے ہمارے مشفق اساتذہ اور ذمہ داران جامعہ نے اسے اپنی میز کی زینت بنائے رکھا اور ان کی خیر خواہی کا تقاضا یہی ہوا کہ متعلقہ شخص کو اس سے مطلع کرنا بے سود ہے، لہٰذا مجھے اس کی خبر بھی نہ ہوسکی، جب سال بھر کا عرصہ گزر جانے کے بعد میں اپنے کسی کام سے مئو گیا اور اپنی مادر علمی میں اساتذہ سے ملنے گیا تو میرے کرم فرما اور مربی اور انتہائی محترم استاذ نے یہ خط میرے حوالے کیا کہ میاں لو یہ تمہارا خط آیا ہے میں نے اسے

سنبھال کر رکھا تھا۔ میں نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ ان کا اور ان کی کرم گستری کا شکریہ ادا کیا۔ اسی طرح کی کرم فرمائی کا مظاہرہ اس وقت بھی کیا گیا جب جامعۃ الملک سعود ریاض کے معہد اللغۃ میں پڑھ رہے تھے، وہاں بھی اساتذہ اور ذمہ داران جامعہ سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے مگر آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ہم جس جامعہ سے آئے ہیں اس کا الحاق جامعۃ الملک سعود کے ساتھ باقاعدہ طور پر ہو۔ اس کے لئے ایک عرصے تک ہمارے رفیق درس مولانا وجیہ الدین فیضی بھی کوشاں رہے اور بعد میں میں نے بھی کوشش کی کہ کسی طرح جامعہ فیض عام کے ذمہ داران لازمی اوراق ہمارے حوالے کردیں اور ہم اس کا الحاق جامعۃ الملک سعود سے کرادیں جو اس زمانے میں ہمارے لئے آسان کام تھا مگر افسوس کہ بار بار ہمیں وعدوں سے بہلایا گیا اور ہم بصد حسرت ویاس ریاض سے واپس آگئے مگر وہ کاغذات ہمارے ہاتھ نہیں آسکے۔ ایسا نہیں کہ انہیں ہم سے کوئی پرخاش تھی حاشا وکلا بس یہی ان کا طریقۂ کار تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس ضمن میں تمام طلباء کے ساتھ مساوات کے قائل تھے۔ ہاں خوب یاد آیا اس خط میں یہ لکھا گیا تھا کہ دو معروف شخصیتوں کا توصیہ بھیج دو اگر چہ تاریخ گزر چکی تھی مگر آپ جانتے ہیں کہ امید بڑی ظالم ہوتی ہے اور دل میں اشتیاق بہت تھا کہ سعودی جامعات میں داخلہ مل جائے اس لئے نئے سرے سے اس پر محنت ہونے لگی، اس سلسلے میں بنارس گیا لوگوں نے بتایا کہ اگر ازہری صاحب کا توصیہ مل جائے تو داخلے کا امکان بڑھ جائے گا، لہٰذا ان کی خدمت میں حاضر ہوا پھر بڑے تپاک سے ملے اور جب میں نے وہ خط انہیں دکھایا تو انہیں بڑا غصہ آیا کہنے لگے مولانا یہ تو بڑا ظلم ہوا، یہ بڑی غیر ذمہ داری کی بات ہے، یہ تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی منظوری تھی اگر آپ نے وقت پر مطلوبہ کاغذات بھیج دئے ہوتے تو داخلہ یقینی تھا میں نہیں سمجھتا تھا کہ فیض عام والوں کا اپنے طلباء کے ساتھ یہ رویہ ہوگا، ہمارے یہاں تو عالم یہ ہے کہ ہم خود جامعہ کی طرف سے طلباء کے کاغذات بھیجتے ہیں اور ان کے لئے ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں اور جب منظوری آجاتی ہے تو بہر صورت اس طالب علم سے رابطہ کرکے اسے خبر دیتے ہیں چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا اب آپ ایسا کریں کہ جامعہ اسلامیہ کے علاوہ اور بھی جامعات میں کوشش کردیکھیں انہوں نے توصیہ دینے سے تو یہ کہہ کر معذرت کردی کہ بھائی مولانا میں آپ سے واقف نہیں پھر میں عام طور پر کسی کو توصیہ دیتا بھی نہیں ہوں اس کے لئے صحیح مقام مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند ہے آپ وہاں کے ناظم اعلیٰ سے توصیہ لے لیں اور بھی کئی مفید مشوروں سے انہوں نے نوازا اور اپنی مصروفیتوں کے باوجود مجھ جیسے معمولی طالب کے لئے انہوں نے اپنا کافی وقت صرف کیا اور مجھے مطمئن کرکے وہاں سے روانہ کیا، اس وقت توصیہ نہ پانے کے باوجود ان کے حسن اخلاق کے باعث ان کی ہمدردی اور خیر خواہی کا سکہ دل میں بیٹھ چکا تھا۔

اس کے بعد بہت سے مواقع آئے کہ ان سے سامنا ہوا، ممبئی کی دین رحمت کانفرنس جو انہیں کا تجویز کردہ نام تھا اس کا میں کنوینر تھا اس لئے ان سے استفادے کا موقع یہاں بھی ملا۔ اس کے بعد مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی دو کانفرنسوں کے وہ صدر مجلس استقبالیہ تھے اور میں کنوینر تھا، پاکوڑ کی آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس میں کئی دنوں ساتھ رہا۔ مختلف امور پر تبادلۂ خیالات ہوا جمعیت کی مختلف میٹنگوں میں بھی ان سے استفادے کا موقع ملا، وہ

ایک انتہائی تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص تھے، علم وفضل کے علاوہ ان کے اندر حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم تھی۔ ظاہری اعتبار سے بڑی بارعب شخصیت کے حامل تھے مگر اندر سے بہت نرم تھے اور اگر کوئی اچھی بات کسی چھوٹے کی طرف سے آجائے تو اس کی تحسین کرنے سے باز نہیں آتے تھے اور دوران بحث ومناقشہ اگر کوئی صحیح بات ان کے سامنے آجاتی تو خواہ کسی کی طرف سے بھی ہو اور ان کی رائے کے برعکس بھی ہو تو اسے فوراً تسلیم کر لیتے تھے اور ان کی بزرگی اس کی قبولیت میں مانع نہیں ہوتی تھی۔ خود کئی مرتبہ میرے ساتھ بھی یہ معاملہ پیش آیا کہ میں نے ان کی خدمت میں کوئی بات رکھی اور اپنی رائے کے برعکس انہوں نے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اسے قبول کرلیا کہ ہاں مولانا یہ بڑی بنیادی بات ہے۔

ان کی تقریر وتحریر کا کمال موضوعیت تھا جو بھی موضوع اٹھاتے تھے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیتے تھے ان کی تحریریں اور تقریریں دونوں حسن ترتیب سے مزین ہوتی تھیں، وہ عربی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے اور ان کے کمال کا اعتراف ایک زمانے کو تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر پہلو سے ایک بڑے آدمی تھے اور ان کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ چھوٹوں کو بڑائی تک پہنچانے کی ہر ممکن سعی فرماتے تھے، نہ جانے ان کے کتنے شاگردان کے حسن التفات اور نظر عنایت کے باعث صاحب کمال ہو گزرے اور عرب وعجم کی آنکھوں کا تارا بنے، ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنہیں اس کا اعتراف ہے اور وہ اپنے محسن کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ انہیں میں سے ایک ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب پریوائی بھی ہیں جو اپنے استاد کے بڑے ثنا خواں رہے ہیں اور میں نے دیکھا کہ استاد اور شاگرد دونوں کو ایک دوسرے سے یکساں لگاؤ تھا اور عنایت و ارادت کا یہ سلسلہ دوطرفہ تھا۔ جبکہ دوسرے کچھ لوگ ایسے بھی ملے جو سخت منکر احسان تھے، نظر اپنی اپنی، خیال اپنا اپنا، اعلیٰ ظرفی اور تنگ نظری دونوں کا اپنا مستقل وجود ہے، ہاں اعلیٰ ظرفی پر یاد آیا کہ پاکوڑ کانفرنس کے موقع پر مقامی ذمہ داروں سے بسا اوقات بعض معاملات پر مستقبل کے اندیشوں اور تیاریوں میں بعض اصلاح طلب پہلوؤں کی وجہ سے میرا شدید اختلاف ہو جاتا تھا اور ڈاکٹر صاحب کو بھی کمی کا احساس ہوتا تھا مگر ہمیشہ صبر وتحمل اور تسامح اور درگذر کی تلقین فرماتے، یہ دیکھا گیا کہ بعض جلسوں میں ڈاکٹر صاحب جیسی عظیم شخصیت کے مقابلے میں عوامی خواہش پر تنازل اختیار کرتے ہوئے ذمہ داران اجلاس کسی مالشیئے کو ترجیح دے رہے ہیں، اس کی خوب ناز برداری ہو رہی ہے اور اس کی تنک مزاجیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، دوسرا آدمی ہوتا تو کب کا اسٹیج چھوڑ کر چکا ہوتا مگر ڈاکٹر صاحب انتہائی حلم اور بردباری کے ساتھ ایسے حالات سے سرخرو ہو کر نکلتے تھے اور ذمہ داران کے متعلق زبان حال سے اور کبھی کبھی قال سے بھی یہ کہتے ہوئے رخصت ہوتے کہ

مجبوریاں کچھ تو رہی ہوں گی
یوں ہی کوئی بے وفا نہیں ہوتا

سچ کہا ہے کسی نے

رنج میں آتا نہیں نیکوں کی پیشانی پہ بل
دھوپ کی تیزی میں سبزے کی لہک جاتی نہیں

بات ان کی خردنوازی کی چل رہی تھی کلکتہ کی ایک کانفرنس میں سیرت طیبہ کے موضوع پر میرا خطاب تھا۔ تقریر کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مولانا آپ نے جو واقعات بیان کئے ہیں وہ بڑے موثر اور مستند اور سب کے

Scanned by CamScanner

لئے یکساں مفید تھے، آپ انہیں قید تحریر میں لائیے اور کہیں نہ کہیں شائع کرادیجئے اس طرح یہ قیمتی مواد محفوظ ہو جائے گا، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ دیکھئے ڈاکٹر صاحب نے پوری تقریر سماعت فرمائی اور اس کے بعد مزید حوصلہ افزائی یہ کہ میں اسے لکھ بھی دوں مگر افسوس میں لکھنے کے معاملے میں بڑا بے توفیق واقع ہوا ہوں، منتظم کانفرنس مولانا ذکی احمد مدنی کے بارہا مطالبے کے باوجود میں ان خطابات کو قلمبند نہیں کر سکا۔

ازہری صاحب کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ علمی وقار و تمکنت کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جو علماء کے شایان شان نہ ہو، میں نے ان کی شان قلندری اور بے نیازی کا ایک واقعہ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا ہے، ممبئی کے کامران ہوٹل میں ان کا ایک شاگردان سے ملنے آیا اور جاتے جاتے ایک لفافہ انہیں تھمانے لگا کہ حضور اس میں ایک حقیر سا تحفہ ہے۔ اس لفافے میں رقم تھی ڈاکٹر صاحب بہت خفا ہوئے، کہنے لگے میں تمہیں ایسا آدمی دکھائی دیتا ہوں کیا، تم تو مجھے رسوا کرنا چاہتے ہو غرضیکہ اس پر بہت جز بز ہوئے اور وہ لفافہ اسے واپس کر دیا تھوڑی دیر کے بعد غصہ فرو ہوا تو سمجھا بجھا کر اور خوش مزاجی کے ساتھ رخصت فرمایا۔

جب آخری وقت وہ صاحب فراش تھے تو انہیں دیکھنے دہلی کے بترا ہاسپٹل گیا تھا زندہ دلی اور حوصلے پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا وہی بانکپن جو ان کے مزاج کا خاصہ تھا چہرے سے عیاں تھا، ہلکی سی نقاہت ضرورت تھی مگر طبیعت کے وقار و تمکنت اور وضعداری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا گفتگو میں وہی فطرت نظر آتی تھی، بہت سے جماعتی مسائل میں اسی طرح فکر مند تھے جیسے سدا نظر آتے تھے۔ لگتا تھا جلد ہی اچھے ہو جائیں گے مگر کچھ ہی دنوں کے بعد جب انہیں وطن واپس لے جا رہے تھے تو دیکھا کہ حالت یکسر بدل گئی تھی، چہرے پر اضمحلال تھا، زبان خاموش تھی مگر آنکھیں نہ جانے کیا بول رہی تھیں اور بڑی شدت سے بول رہی تھیں آج مجھے ان کی آنکھیں ہر دن سے بڑی نظر آرہی تھیں، وہ رخصت ہو رہے تھے، اور وہی دیدار ان کا آخری دیدار ہو گیا پتہ نہیں کیوں ان کی موت کا یقین ہی نہیں حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے پھر ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت جلد ہم سے رخصت ہو گئے ابھی تو جماعت کو ان کی بہت ضرورت تھی، کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود وہ دنیا کو اپنے اپنے سے لگتے ہیں اور ہر کوئی انہیں خود سے قریب محسوس کرتا ہے ازہری صاحب سے ہمیں بڑا حوصلہ ملتا تھا مگر وائے افسوس کہ جماعت اہل حدیث یکے بعد دیگرے اپنے بہت سے باکمالوں سے محروم ہو گئی۔ مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری مولانا رئیس الاحرار ندوی اور بہت سے بزرگ ہم سے رخصت ہو گئے وہ جب ہمارے درمیان موجود تھے تو ہمیں بڑا اطمینان تھا، ہمارے حوصلے بلند تھے اور ان کی ذات سے حالات کی مختلف کروٹوں میں بڑی توقعات وابستہ ہوتی تھیں مگر افسوس کہ ہمارے جماعتی نظام میں جانشینی کی صلاحیتیں پیدا کرنے کی گنجائش بہت کم ہے اس لئے جو عظیم شخصیت گزر جاتی ہے اس کا خلاء پر کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ رب کائنات ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری رحمہ اللہ کو پوری جماعت اور ملت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے کہ بے شک وہ جماعت کے سپوت اور ملت کا گرانقدر سرمایہ تھے۔

اللهم اغفرله وارحمه ونورله فی قبره

☆☆☆

مولانا محمد جرجیس کریمی
ادارہ تحقیق وتصنیف علی گڈھ

ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہریؒ

جھارکھنڈ کے ایک گاؤں میں

ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہریؒ جماعت اہل حدیث میں موجودہ دور کی نمایاں شخصیات میں سے تھے۔ ان کے انتقال سے یقیناً جماعت میں ایک خلا محسوس کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین۔

ڈاکٹر موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ عربی اور اردو کے ایک بہترین مصنف تھے۔ جامعہ سلفیہ بنارس کے چوٹی کے اساتذہ میں سے تھے، جامعہ مذکور کے ریکٹر تھے اس کے علاوہ جماعت وجمعیت کی بہت سی ذمہ داریاں ان پر رہی ہوں گی۔ ان مختلف حوالوں سے ان کی شخصیت میں پوشیدہ خوبیوں کو ان کے تلامذہ اور متوسلین اجاگر کریں گے۔ راقم سطور اس مختصر تحریر سے ڈاکٹر وحافظ موصوف کی زندگی کے اس دور کی یاد تازہ کرنا چاہتا ہے جو پچاس سالہ قدیم ہے۔ جب انھوں نے صوبہ جھارکھنڈ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں مسلسل سات سال تک تراویح کی نماز پڑھائی تھی۔ مذکورہ گاؤں کے لوگوں کو آج بھی ان کی اقتداء میں پڑھی ہوئی تراویح یاد آتی ہے اور ان کے تذکرے لوگوں کی زبانوں پر ہیں اور مرحوم کا نام عقیدت واحترام سے لیتے ہیں۔

اس دور افتادہ گاؤں کا نام ہے ٹوپاٹار تھانہ نرائن پور ضلع دمکا (جام تاڑا) جھارکھنڈ، اس وقت یہ گاؤں جماعت اہل حدیث کا علمی وجماعتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔

بات ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء کی ہے ڈاکٹر موصوف ابھی نوجوان تھے۔ ۱۸-۲۰ سال کی عمر کے تھے۔ اور شاید تعلیم سے فراغت پا چکے تھے۔ وہ اپنے ہم سبق مولانا احمد حسین لال چند ڈیہہ کے ساتھ صوبہ جھارکھنڈ پہونچے، گاؤں مذکور میں رمضان المبارک کے موقع پر تراویح پڑھانے پر متعین ہوگئے اور مسلسل سات سال تک انھوں نے وہاں تراویح پڑھائی۔ رمضان المبارک کے مہینے میں وہ وہاں تشریف لاتے اور پھر وہ وطن مئو چلے جاتے تھے۔

یہ بات بہت سادہ سی لگتی ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے صوبہ جھارکھنڈ کے ایک گاؤں میں تراویح پڑھائی تھی مگر مذکورہ گاؤں اور اس کے محل وقوع کے پس منظر سے اس کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔

موجودہ صوبہ جھارکھنڈ کے چار اضلاع دمکا (جام تاڑا) گری ڈیہہ، دیوگھر اور دھنباد کے باہم متصل علاقوں میں ۸۰-۹۰ اہل حدیث گاؤں آباد ہیں۔ اور آج سے پچاس ساٹھ سال قبل وہاں کوئی قابل ذکر تعلیمی ادارہ موجود نہیں تھا مگر بعض شخصیات نے انفرادی طور پر وہاں کی اہل حدیث آبادی پر خصوصی طور پر اپنے دعوتی واصلاحی اثرات مرتب کیے ہیں جو ہنوز محسوس کیے جاتے ہیں اور ان کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ انہیں شخصیات میں مولانا ابوالفلاح عابد حسین گنگوہی

ہیں۔ مولانا موصوف ''بوڑھا مولانا'' سے معروف تھے اوران کی تمام تر علمی، اصلاحی اور جماعتی سرگرمیوں کا مرکز یہی گاؤں ٹوپاٹار تھا یہیں وہ سکونت پذیر تھے۔

بتایا جاتا ہے کہ ان کی اتنی مقبولیت تھی کہ وہ لوگوں کے وہ تنازعات حل کرتے تھے جو عدالتوں میں زیر سماعت ہوتے تھے اور محترم جج صاحبان ان کے فیصلے کو برقرار رکھتے تھے بلکہ بعض مواقع پر فریقین کو لکھتے کہ جاکر ''بوڑھا مولانا'' سے معاملہ فیصل کرالیں۔ موصوف کی اس علاقے میں بدعات وخرافات کے خاتمہ کے سلسلے میں اور مسلک اہل حدیث کی ترویج واشاعت میں وسیع خدمات ہیں، ڈاکٹر حافظ ازہری صاحب ۱۹۵۵ء میں ٹوپاٹار پہونچے گویا انھوں نے ''بوڑھا مولانا'' کی نگرانی میں چھ سال تک تراویح پڑھائی، مولانا موصوف علاقے کی جماعت اور لوگوں کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ ڈاکٹر ازہری صاحب مولانا کے ساتھ رات میں قیام کرتے اور انھیں کے ساتھ کھانا تناول کرتے تھے۔ یقیناً مولانا نے وہاں کی جماعت کے بارے میں ڈاکٹر ازہری کو تفصیلات بتائی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ محترم ازہری صاحب اس علاقے کے لوگوں سے اپنے خصوصی لگاؤ اور انسیت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ اس علاقے میں بعد میں کئی مدارس وجامعات قائم ہوئے۔ ڈاکٹر ازہری صاحب ان کی بہی خواہی کرتے اور ان کے لئے توصیات عنایت کرتے تھے۔

مولانا ابوالفلاح عابد حسین گنگوہی مرحوم کی جملہ خدمات میں ایک بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اس گاؤں میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی اور اس کے لئے ایک بڑی جائیداد حاصل کی۔ مذکورہ گاؤں میں دو ایکڑ اور ایک دوسرے گاؤں ٹرمنڈا (پھلجھریا گری ڈیہہ) میں ساڑھے تین ایکڑ اراضی جن میں کچھ قابل کاشت اور کچھ قابل تعمیر مکان خریدیں اور جماعت کے لئے وقف کیں۔ ان اراضی پر آج بھی ایک ہی نام سے دو مدرسے دارالفلاح ٹوپاٹار اور دارالفلاح ٹرمنڈا قائم ہیں۔ اور چل رہے ہیں۔ مذکورہ گاؤں سے تعلق کی وجہ سے ان دونوں مدرسوں سے ڈاکٹر ازہری صاحب کو خصوصی تعلق تھا اور ان کی تعمیر وترقی کے خواہش مند تھے بعد میں جب موصوف جامعہ سلفیہ بنارس کے ریکٹر بنے اور اس علاقے کا دورہ کیا تو خصوصی طور پر وہ ان دونوں مدارس کو دیکھنے کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں سے طویل گفتگو کی۔ خاص طور سے ٹوپاٹار مدرسہ کے لئے اپنی سرپرستی کی پیش کش بھی کی تھی انھوں نے کافی دیر تک وہاں قیام کیا۔ اور لوگوں سے جماعت وجمعیت کے احوال معلوم کئے۔ ماضی کے حوالے سے اس گاؤں کے مختلف اشخاص کے بارے میں تفصیلات پوچھیں جن میں سے اکثر مرحوم ہوچکے تھے۔ ڈاکٹر موصوف صاحب کا اس علاقے میں آخری سفر یکم نومبر ۲۰۰۰ء میں ہوا تھا۔

ٹوپاٹار گاؤں جماعتی مرکز ہونے کے تعلق سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں گاؤں گاؤں میں عیدگاہیں نہیں تھیں بلکہ ایک عیدگاہ ٹوپاٹار میں تھی جہاں بیس تیس گاؤں کے لوگ عیدین کی نماز ادا کرتے تھے۔ اگرچہ اس وقت آج کے مقابلے میں آبادی کم تھی مگر بیس تیس گاؤں کے لوگوں سے بہرحال ایک بڑی جماعت ہوجاتی تھی۔ ڈاکٹر ازہری صاحب وہاں تراویح پڑھاتے تھے تو یقیناً عید کی نماز بھی ادا کی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہاں کی جماعت کو دیکھنے اور سننے کا ان کو موقع ملا ہوگا۔

۱۹۶۰ء تک ''بوڑھا مولانا'' نے اس علاقے کی جماعت کی دینی وجماعتی رہنمائی کی۔ ان کے انتقال کے بعد مدرسہ قائم رہا مگر ان کی جیسی کوئی دوسری نمایاں شخصیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک خلا پیدا ہوگیا۔ اس دوران میں

علاقے کے بعض نوجوان طلباء جن میں سے اکثر اسی مدرسہ دارالفلاح کے پروڈکٹ تھے مئوسہارن پور اور دہلی حصول تعلیم کے لئے گئے اور ستر کی دہائی میں وہ فارغ ہوکر آئے۔ ان میں سے مولانا عبدالرشید شائقی (موجودہ امیر صوبہ جھارکھنڈ) مولانا شفاء اللہ فیضیؒ (سابق ناظم جامعہ محمدیہ ڈابھا کھند) قاری جمال الدین مظاہری (استاذ جامعہ محمدیہ) مولانا عبدالخالق جامعیؒ (استاذ جامعہ محمدیہ) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ لوگ فارغ ہوکر آئے تو انھوں نے اپنے لئے میدان کار تلاش کیا۔ علاقے میں اس کا بہترین موقع تھا لہٰذا انھوں نے ایک مدرسے کی تاسیس کی تحریک چلائی اس تحریک کے روح رواں مولانا عبدالرشید شائق اور قاری جمال الدین مظاہری تھے۔ آغاز میں ان نوجوانوں کی کوشش تھی کہ ٹوپاٹار کے مدرسے کا احیاء کریں کیونکہ وہاں ایک بڑی جائیداد وقف تھی جس سے بآسانی مدرسہ کے اخراجات پورے ہوجاتے مگر ایک قانونی رکاوٹ کی وجہ سے ایسا نہ ہوسکا مولانا عابد حسین گنگوہی مرحوم نے اپنے انتقال سے قبل مدرسے کی جائیداد سے متعلق سرکاری دستاویز میں یہ وصیت کردی تھی کہ مدرسے کا انتظام وانصرام ٹوپاٹار کے ہی لوگ دیکھیں گے۔ نئے مدرسہ کی تحریک چلانے والے کلی اختیارات چاہتے تھے بنابریں اس پر اتفاق نہیں ہوسکا اور ۱۹۷۷ء میں جامعہ محمدیہ ڈابھا کیند کی صورت میں دوسرا مدرسہ وجود میں آیا۔ دونوں مدرسوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ ایک کلومیٹر کی دوری ہے بنابریں جماعت کے باشعور علماء کا خیال تھا کہ دونوں مدرسے ضم ہوکر کام کریں تو جماعت کے لئے یہ زیادہ مفید ہوگا۔ اس طرح کا احساس حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کو بھی تھا لہٰذا انھوں نے ایک بار اس کی کوشش کی کہ دونوں اداروں میں انضمام ہوجائے مگر ایسا نہ ہوسکا۔

مدرسہ دارالفلاح ٹوپاٹار کے تعلق سے دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ ''بوڑھا مولانا'' نے مدرسہ کے لئے جو اراضی خریدی تھی وہ نہ صرف دو گاؤں میں تھی بلکہ دو ضلعوں میں تھی اگرچہ دونوں گاؤں کے درمیان محض تین چار کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ ٹوپاٹار ضلع دمکا کا ایک گاؤں ہے اور ڑمنڈا اگری ڈیہہ ضلع کا ایک گاؤں ہے۔ بعد میں وہاں بھی ایک مدرسہ اسی نام سے قائم ہوگیا اور چل رہا ہے۔ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے اپنے سفر ۲۰۰۰ء کے دوران میں اس کی بھی کوشش کی کہ کم از کم یہ دونوں مدرسے جو ایک ہی نام سے اور ایک ہی شخصیت کے حوالے سے قائم ہیں ایک ہوجائیں اور مل کر کام کریں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کے باوجود ڈاکٹر ازہری صاحب نے ان تینوں مدرسوں کی تعمیر وترقی کے سلسلے میں رہنمائی بھی فرمائی، مشورے بھی دیئے اور توصیات بھی لکھیں۔ وہ ہمیشہ کوشاں رہتے کہ یہاں کی جماعت منظم ہو اور ترقی کرے۔

مولانا احمد حسین ڈاکٹر ازہری صاحب کے ہم سبق تھے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ پانچ سال تک انھوں نے جامعہ فیض عام مئو میں ایک ساتھ تعلیم پائی تھی انہی کی معیت میں وہ ٹوپاٹار وارد ہوئے تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر ازہری صاحب جوجوانی کی عمر میں بھی سنجیدہ اور خوش خلق تھے، مہمان نوازی کرتے تھے اگرچہ اس وقت ان کے گھر کے معاشی حالات بہت مستحکم نہیں تھے مگر ان کے گھر جانے سے وہ خوش ہوتے تھے اور ضیافت کرتے تھے۔

ٹوپاٹار میں ڈاکٹر ازہری صاحب کی اقتدا میں تراویح پڑھنے والے اکثر لوگ اب اللہ کے پیارے ہوچکے ہیں۔ کچھ لوگ ابھی باحیات ہیں ان کا بیان ہے کہ ڈاکٹر ازہری صاحب اچھے اخلاق کے تھے۔ ملنسار اور متدین تھے، ختم تراویح پر انہیں کچھ نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ انھوں نے از

خود کبھی کسی متعین رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔ جو مل جاتا اسی پر راضی رہتے تھے۔ گاؤں کے سبھی لوگ ان کے مداح ہیں۔

مولانا زکریا فیضی مدھوپور نے بتایا کہ مولانا ازہریؒ ٹھوس فکر کے تھے اور جماعت کے لوگوں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے، اس علاقے میں مدرسہ رحمانیہ مدھوپور اور جامعہ محمدیہ ڈابھا کیند کے لئے انہوں نے توصیات لکھیں مولانا زکریا فیضی صاحب سے ان کی مراسلت بھی ہوتی تھی۔ مگر مولانا نے بتایا کہ ان کے خطوط محفوظ نہیں ہیں۔

مولانا محمد الیاس مدنی صاحب (صدر جامعہ محمدیہ ڈابھا کیند) جو ڈاکٹر ازہری کے شاگرد ہیں نے بتایا کہ مولانا طلباء کے لئے انتہائی شفیق تھے اور ان کے مسائل میں حقیقی دلچسپی لیتے تھے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مولانا کے مزاج میں تھوڑی سختی بھی تھی مگر حقیقی معنی میں وہ طلباء کے لئے شفیق تھے۔ اس علاقے کے حوالے سے انھوں نے مزید بتایا کہ یہاں کے مختلف اداروں کے ذمہ داران سے ان کے روابط تھے اور اچھے مشورے دیتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لئے جانے والوں کو کبھی وہ ٹالتے نہیں تھے ڈاکٹر ازہری صاحب ایک بڑے ادارے کے منتظم تھے جہاں مختلف صوبوں کے طلباء زیر تعلیم تھے طلباء میں بعض اوقات علاقائی بنیاد پر گروہ بندی بھی ہونے لگتی ہے اور بعض اوقات اساتذہ بھی اس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر ازہری صاحب اس طرح کی عصبیت سے پاک تھے۔ وہ ہر جگہ کے طلباء کو ایک نظر سے دیکھتے تھے۔

راقم سطور کو ڈاکٹر ازہری صاحب سے تین بار ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ پہلی بار ۱۹۸۹ء میں ملاقات ہوئی جب ناچیز اپنے لئے ایک توصیہ کی خاطر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فیض عام مئو کے عالمیت کی سند سے ناچیز سعودی جامعات میں داخلہ کا خواہش مند تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے بلاتردد توصیہ عنایت کردیا۔ نہ ٹالا اور نہ کئی بار اپنے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

دوسری ملاقات علی گڑھ میں ''شاہ ولی اللہ'' (۱) سیمینار کے موقع پر ہوئی۔ ناچیز نے ان کی خدمت میں اپنی چند تالیفات پیش کیں۔ شکریہ کے ساتھ انھوں نے قبول فرمایا اور حوصلہ افزائی کے کلمات کہے۔

تیسری ملاقات ڈومریا گنج میں ۱-۳ مارچ ۲۰۰۵ء میں ''مدارس میں قرآن کی تدریس اور اس کا منہج'' کے موضوع پر منعقد سیمینار کے موقع پر ہوئی۔ ناچیز نے ان کی موجودگی میں اپنا مقالہ پیش کیا تو اسٹیج پر ہی انھوں نے ماشاء اللہ کے کلمات سے نوازا جو ان کی پسندیدگی اور حوصلہ افزائی کی دلیل ہے۔

ڈاکٹر ازہری صاحب تصنیف وتالیف کے آدمی تھے لہٰذا وہ قلم کاروں کی عزت کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ مولانا محمد اسحاق سلفی ڈابھا کیند کی زبانی معلوم ہوا کہ ان کی خواہش تھی کہ یہ ناچیز جامعہ محمدیہ ڈابھا کیند میں رہ کر تصنیف وتالیف کی خدمات انجام دے ان کی یہ خواہش مدرسہ اور جماعت کی خیر خواہی پر مبنی تھی۔

مولانا کے انتقال پر اس علاقے میں خاص طور سے ٹوپاٹار، نرائن پور اور مدھوپور میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت نصیب کرے۔ (آمین)

☆☆☆

(۱) پروفیسر ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب کی قیادت میں شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں شاہ ولی اللہ پر کئی سیمینار منعقد ہوچکے ہیں غالباً ''حدیث پر شاہ صاحب کی خدمات'' کے موضوع پر سیمینار کے موقع کی بات ہے جب ڈاکٹر ازہری صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔

ڈاکٹر ابوتحریر سلفی
نئی دہلی

محمد یاسین و بلقیس نعمان

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (۱۹۳۹۔۲۰۰۹) نے علم و دانش کی دنیا میں جو جگہ بنائی اس میں ان کے والدین (حاجی محمد یاسین اور بلقیس نعمان) کی علم دوستی، قربانی اور دوراندیشی کا ایک اہم حصہ ہے۔ جنھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت خصوصاً ڈاکٹر ازہری مرحوم کی علمی زندگی کا خاکہ اس انداز سے تیار اور ترتیب دیا تھا کہ ایک عالم نے ان کی فکر و فہم سے اکتساب کیا۔ پاک دل اور پاک باز والدین نے حالات کی سنگلاخی اور معیشت و معاش کی غیر یقینی صورت حال کے باوجود بھی اولاد کی تعلیم پر کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور اس راہ میں ہر قسم کا تعاون پیش کیا اور ذاتی آسائش کو بھی تیاگ اور تلانجلی دیا جس کی وجہ سے ان کی اولاد ''انجم کی ہم قسمت'' اور ''گھر ''سرمایۂ عزت'' ہوا۔ انھوں نے خواب بنے، اس میں رنگ بھرا اور اس کی تعبیر بھی دیکھ لی۔ ڈاکٹر ازہری نے مئو، قاہرہ اور علی گڑھ کے علمی چشموں سے سیراب ہونے کے بعد جامعہ سلفیہ، بنارس کے پلیٹ فارم سے تعلیم، تدریس اور تصنیف و ترجمہ کے میدان میں جو اجلے نقوش ثبت کیے وہ کافی دنوں تک رہروان علم کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ ان کی دیگر اولاد نے ڈاکٹر ازہری جیسی شہرت تو نہیں پائی لیکن الگ الگ میدانوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ شفیق الرحمان کی مکتبی تعلیم کی کمی کو ذاتی مطالعے نے پورا کیا۔ عبدالرحمان انصاری مئو سے نکلے تو مالیگاؤں میں رخت سفر کھول دیا، بیچ میں پڑاؤ تھا بنارس، کبیر کے شہر میں حافظ و سعدی کی زبان میں ایم اے کیا۔ محمدیہ طبیہ کالج، مالیگاؤں میں ایک طویل عرصے تک لائبریرین کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد اب سبک دوش ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر اظہر حسن نے چمن سرسید سے ایم ڈی کیا، فی الحال محمدیہ طبیہ کالج، مالیگاؤں سے وابستہ ہیں، مدرس ہیں، مسیحا ہیں اور میر مجلس بھی، جہان طب و صحت کی کئی بلند منزلیں ابھی ان کی منتظر ہیں۔ بیٹیوں میں امیہ سب سے چھوٹی لیکن سب سے زیادہ تعلیم یافتہ، ایم۔اے، معلّمہ فیض عام گرلس اسکول ۔ رشیدہ اور ساجدہ کو علمی ماحول ملا اور روایت کو آگے بڑھایا۔ رضیہ کی اولاد میں مدارس کے فارغین سب سے زیادہ، ذکیہ کے یہاں بھی علم سے رشتہ برقرار ہے، عطیہ نے کچھ ہی حد تک اس روایت کا پاس رکھا اور خالدہ نے زمین شور میں سنبل اگایا۔

محمد یاسین اور بلقیس نعمان کی کوششوں سے ان کی اولاد میں درس گاہ کی دہلیز سے دعا سلام تو سب کا رہا، بس فرق اتنا ہے کہ کسی نے اعلیٰ تعلیم پائی اور کسی نے ادنیٰ۔ ادب

شعر سے دلچسپی اور گنگنانا تو سب کو آتا ہے لیکن سر تال کی دولت سب کے حصے میں نہیں آئی۔ ہم نے بچپن میں ننیہال میں بیت بازی کی محفلیں اور علمی مسائل کی مجلسیں دیکھی ہیں اور اب بھی دو چار دیوانے اکٹھا ہو جاتے ہیں تو دولت کدہ دانش کدہ لگنے لگتا ہے۔ ایسے والدین کے بارے میں جاننے کا اشتیاق کسے نہیں ہوگا۔ آج جب ازہری صاحب کے علمی وفکری نقوش ونشانات کے حوالے سے ''افکار عالیہ'' کا یہ خاص شمارہ ترتیب دیا جا رہا ہے تو استاذ محترم مولانا عبداللطیف اثری صاحب نے ازہری صاحب کے والدین کے بارے میں کچھ لکھنے کا حکم دیا تو یہ تحریر وجود میں آئی۔

کچھ ہوا تیز تھی کھلی تھی کتاب
ایک پچھلا ورق پلٹ آیا

حاجی محمد یاسین (وفات ۷/جنوری ۱۹۸۶)

حاجی محمد یاسین کی پیدائش گذشتہ صدی کی دوسری دہائی کے دوران ڈومن پورہ (حبہ) میں ہوئی تھی۔ اس وقت مئو میں دینی اور دعوتی سرگرمیوں کا عہد شباب تھا، خاص طور پر ان کے محلے میں اسلامیات کے فضلاء کی ایک قابل ذکر تعداد موجود تھی جن کے علمی مجہودات کا اعتراف اہل علم آج بھی کرتے ہیں۔ ان کے والد کا نام محمد سعید (وفات ۱۹۴۴) تھا جو کپڑوں کی تجارت کرتے تھے اور اس سلسلے میں ان کا مئو کے آس پاس کے اضلاع جیسے بنارس اور جونپور میں برابر آنا جانا رہتا تھا۔ محمد یاسین کے والدین نے اپنے اس تنہا چشم وچراغ کی تربیت کافی ناز سے کی تھی۔ ان کے خاندان میں پڑھنے لکھنے کی روایت تو نہیں ملتی ہے لیکن انھوں نے قرآن ناظرہ پڑھنے کے ساتھ اردو پڑھنے اور لکھنے میں واجبی صلاحیت پیدا کر لی تھی اور زندگی بھر مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی تحریروں کے کچھ نمونے موجود ہیں جن میں ایک خاص قسم کی پختگی جھلکتی ہے اور جن سے ان کی تحریری صلاحیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط نقل کر رہا ہوں جس پر تاریخ تو درج نہیں ہے لیکن ۱۹۷۶ میں سفر حج سے متعلق ہے اور مکہ پہنچنے کے بعد ازہری صاحب کو لکھتے ہیں۔

عزیزم بابو مقتدیٰ سلمہ

بعد سلام و دعا، معلوم ہو کہ ہم لوگ ۱۱/اکتوبر کو خیریت سے مکہ میں پہنچے۔ بمبئی سے جہاز ۲/اکتوبر کو روانہ ہوا اور ۴۸ گھنٹہ چلنے کے بعد انجن میں کچھ خرابی ہو جانے کی بنا پر ۱۲ گھنٹے رکا رہا اور پھر وہاں کے لیے روانہ ہوا تو جدہ میں جمعرات کو پہنچا اور جمعے تک جدہ کی بندرگاہ پر رکا رہا، سنیچر کی شام کو مکہ پہنچے اور رات میں معلم صاحب کے مکان پر کھانا کھایا گیا اور وہیں سے خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور پھر سعی کرنے کے بعد غسل کرنے کے بعد معلم صاحب کے مکان پر باہر سب لوگ سو گئے۔''

حاجی محمد یاسین نے معمولی تعلیم کے باوجود بعض امور کا جس انداز سے اہتمام کیا اس سے ان کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کو یاداشت اور اہم واقعات کو قلم بند کرنے کا شوق تھا۔ انھوں نے اس زمانے میں اپنی اولاد کی تاریخ پیدائش وغیرہ لکھنے کا اہتمام کیا جب ان کی جیسی تعلیمی صلاحیت کے حامل افراد اپنی اولاد کی تاریخ پیدائش کی تعیین

کے لیے سیلاب، کرفیو، کسی عظیم شخصیت کی وفات، ملکی یا عالمی سطح پر رونما ہونے والے اہم واقعات ہی کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ انھوں نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "بلاغ المؤمنین" کے اردو ترجمے "مصباح المؤمنین" (مترجم، مولانا عبد السلام بستوی رحمۃ اللہ علیہ) کے آخر میں چند سادہ اوراق پر چارٹ بنا کر ترتیب سے اپنی اولاد کی تاریخ پیدائش (شمسی وقمری دونوں) اور چند نونہالوں کی تاریخ وفات کو نام، وقت، دن، تاریخ، مہینے اور سال کے ساتھ نہایت نفیس انداز میں تحریر فرمایا ہے جس سے ان کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اہم شخصیات کی تاریخ وفات کے ساتھ واقعات وحوادث کو بھی لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ مذکورہ کتاب پر علامہ ثناء اللہ امرتسری اور بانی پاکستان محمد علی جناح کی تاریخ وفات بھی درج ہے اور حکیم عبد الرشید انجم کے یونانی نسخے بھی لکھے ہوئے ہیں جو بوقت ضرورت استعمال میں لائے جاتے تھے۔

حاجی محمد یاسین ایک جفاکش بنکر تھے اور ساڑی صنعت میں ان کی دلچسپی تھی، بنائی، رنگائی اور دیگر جزئیات کے بارے میں مکمل معلومات تھی اور کرگھے پر ساڑی تیار کرنے کے ساتھ پارچہ بافی کی صنعت سے متعلق خارجی اور داخلی دونوں امور میں ان کی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ بنکروں کے معاملات ومسائل سے ان کی گہری دلچسپی تھی اور ان کے حل کے لیے اس وقت مقامی سطح پر ہونے والی کوششوں میں فعال کردار ادا کرتے تھے۔ مئو میں بنکروں کو متحد کرنے کی پہلی منظم کوشش ہندستان کی آزادی سے کچھ ہی پہلے ہو چکی تھی۔ مشہور کمیونسٹ رہنما اور مئو اسمبلی حلقے کے سابق ممبر اسمبلی ڈاکٹر زیڈ اے احمد (۱۹۰۷-۲۰۰۰) نے اپنی آپ بیتی "میرے جیون کی کچھ یادیں" (نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی ۲۰۰۹، ص ۱۹۴ تا ۱۹۸) میں اس تحریک کے آغاز اور اثرات کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے بعد شہر میں بنکروں کے مسائل کو لے کر تحریکیں چلتی رہیں اور ستر کی دہائی میں جب سوت کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا تو بنکر سڑکوں پر نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ مئو میں بھی اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا تھا جس میں انھوں نے پڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اپنی ہنرمندی کا استعمال کرتے ہوئے چرخہ کا وہ حصہ بنایا تھا جس کو مئو کی بولی میں "نٹاوا" کہتے ہیں، اور اسی کو لے کر احتجاج میں شریک ہوئے تھے۔ خالی "نٹاوا" اس بات کا استعارہ تھا کہ مہنگائی نے بنکروں سے سوت بھی چھین لیا ہے۔

مئو کی بنکر کوآپریٹیو سوسائٹی (بی سی ایس) کے قیام میں ان کا تعاون تھا اور کافی عرصے تک اس سے وابستہ بھی رہے۔ ایک بار کسی بات پر اختلاف ہوا تو اس سے الگ ہو گئے لیکن بعد میں پھر جوائن کر لیا تھا۔ سیاسی اور سماجی امور میں بھی ان کی شرکت کا پتہ چلتا ہے۔ انتخابی سیاست میں ان کا رجحان بائیں بازو کی سیاست کی طرف تھا اور ان کا محلّہ جس کو کبھی مئو کا "ماسکو" کہا جاتا تھا وہاں بھی سرخ پرچم کافی دنوں تک لہراتا رہا اور جب ملک میں ذات پات، منڈل اور کمنڈل کی سیاست نے زور پکڑا اور اس پارٹی کے رہنماؤں نے زمینی حقائق کو سمجھنے میں دیر کی تو مئو کے ساتھ

پورے صوبے بلکہ ملک سے ان کا اثر رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا۔

شہر کے روایتی پیشے میں مہارت رکھنے کے ساتھ روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے چھوٹے بڑے امور میں بھی ان کو ماہر فن سے مدد لینے کی ضرورت کم ہی پیش آتی تھی۔ بوقت ضرورت کارپینٹر کا کام بھی کر لیتے تھے اور راجگیر مستری کے ہنر سے بھی واقف تھے۔ بقرعید کے موقعے پر بکرے کی قربانی کا کام اتنی نفاست اور کم وقت میں کر دیتے تھے کہ ان پر اہل ہنر کا گمان ہوتا تھا۔ کاشتکاری کے عمل سے بھی آشنا تھے اور کبھی کبھی سبزیاں وغیرہ بھی اگاتے تھے۔ شکار کے شوقین تھے اور مچھلی کا شکار تو پابندی سے کرتے تھے اور اس کے لیے جن اوزار و آلات کی ضرورت پیش آتی ہے سب ان کے گھر میں موجود تھے اور اکثر ان کے دست ہنر کے نمونے۔ عمدہ کھانا کھانے کا شوق تھا اور کھانا بہت اچھا بناتے بھی تھے خصوصاً کچھ مخصوص موسمی ڈش جیسے انگشتی بڑے اہتمام سے تیار کرتے تھے۔ مولانا عبد الحمید رحمانی جامعہ فیض عام، مئو میں طالب علمی کے دوران ازہری صاحب سے دوستی کی وجہ سے ان کے گھر پر برابر آتے جاتے تھے، آج بھی ان کے کھانا بنانے کے انداز اور کھلانے کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انگشتی تو انھیں کے ہاتھ کی ہوتی تھی۔

حاجی محمد یاسین عالم دین نہیں تھے لیکن علماء سے ربط رکھتے تھے۔ مئو کے دینی اجتماعات میں ان کی شرکت رہا کرتی تھی۔ خاص طور پر جماعت اہلحدیث کی جانب سے منعقد ہونے والے اجلاس میں ان کی سرگرم موجودگی رہا کرتی تھی۔ دعوتی اور تبلیغی دورے پر مئو تشریف لانے والے جماعتی علماء کے اعزاز و اکرام میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ ان کی علم دوستی، علماء نوازی اور جماعتی حمیت کا ذکر مولانا مختار احمد ندوی نے البلاغ ممبئی میں شائع ہونے والے اپنے کالم ''مختارات'' میں کیا تھا، جو علامہ ثناء اللہ امرتسری کے سفر مئو سے متعلق ہے اور جس کو اکثر لوگوں نے سن رکھا ہے۔ علماء کی صحبت اور ان کی تقریروں کو سننے ہی کا اثر تھا کہ عقیدے کی صحت پر کافی زور دیا کرتے تھے اور کتاب وسنت کے خلاف کچھ بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے محلے کے علماء کو دیکھا تھا اور ان کی صحبتوں سے استفادہ بھی کیا تھا اور انھیں لوگوں کو دیکھ کر نہایت سخت اور سنگین حالات میں بھی اپنی اولاد کی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہر طرح کی قربانی پیش کی اور اس باب میں ایک روشن مثال قائم کی۔

گھریلو اور سماجی معاملات و مسائل میں بھرپور شریک ہونے کے باوجود زندگی بھر مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا۔ دینی کتب کے ساتھ ادبی اور ہلکی پھلکی کہانی کی کتابیں بھی زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ مولانا امرتسری کی تفسیر ثنائی کا پابندی سے مطالعہ کرتے تھے۔ حکیم محمد سعید (پاکستان) کے سفرنامے اور ان دیگر کتابوں کو بھی پڑھا تھا۔ ان کو پڑھنے کے ساتھ پڑھوا کر سننے میں بھی دلچسپی تھی۔ میری والدہ کا بیان ہے کہ میں نے ان کو کئی ایک کتابیں اور چند رسالے و اخبارات کو خود پڑھ کر سنایا تھا۔ سابق امریکی صدر جان ایف کنیڈی کے قتل کی خبر شائع ہوئی تو اخبار لائے اور گھر پر

پڑھوا کر سنا۔ کتب بینی کا یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا، انتقال کے وقت بھی ان کے بستر پر ایک ڈائجسٹ موجود تھا جس کا مطالعہ انھوں نے اپنی زندگی کی آخری رات میں کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو فریضۂ حج ادا کرنے کی توفیق بخشی تھی۔ اپنی اہلیہ بلقیس نعمان اور بہو نورالنساء (زوجہ ڈاکٹر ازہری مرحوم) کے ہمراہ ۱۹۷۶ء میں دیار پاک کا قصد کیا اور حج کا فریضہ ادا کیا۔ حج کے واقعات بڑی عقیدت کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اللہ نے ان کو صحت سے نوازا تھا۔ حج کے زمانے میں بھی ان کی چستی اور نشاط سے بھرپور معمولات کو دیکھ کر ڈاکٹر عبدالرحمان الفریوائی نے ازہری صاحب کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔ ''۱۴ حاجیوں پر مشتمل قافلہ میں آپ کے والدین بہت ہی صحت مند اور نشیط ہیں۔ مکان گرچہ حرم سے کچھ دور پڑتا ہے لیکن ہر وقت نماز میں شریک ہوتے ہیں۔''

حاجی محمد یاسین کچھ دن مالیگاؤں اور بنارس میں بھی رہے لیکن ان کے خون میں مئو گردش کرتا رہتا تھا۔ اس لیے ہر طرح کی آسائش اور آرام کے باوجود ان شہروں میں ان کی دلچسپی کا سامان کم تھا۔ خاص طور پر ان کے مجلسی ذوق کی تسکین بھی کم ہی ہو پاتی تھی اور ذاتی ہنر کے استعمال کرنے کا موقع بھی کم ہی ملتا تھا۔ وہ مزاج کے سخت تھے لیکن اپنے پوتے اور نواسوں کے ساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا، کہیں بھی جاتے ان کے ہمراہ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا تھا اور کچھ سالانہ سیر وتفریح کے ایسے مواقع اور مقامات تھے جہاں اکثر افراد کی حاضری رہتی تھی۔

حاجی محمد یاسین پستہ قد تھے لیکن ان کے عزائم نہایت بلند تھے۔ گھنی داڑھی تھی، لنگی اور کرتا ان کا لباس تھا۔ کبھی کبھی پائجامہ بھی پہن لیتے تھے اور ٹوپی بھی۔ کاندھے پر بڑا سا رومال، جس کو مئو میں گمچھا کہا جاتا ہے، ہمیشہ رہتا تھا جو الگ الگ کاموں میں استعمال ہوتا تھا۔ وضو کرنے کے بعد اسی سے ہاتھ منہ صاف کر لیتے اور نماز پڑھتے وقت اسی کو سر پر رکھ لیتے تھے۔ غسل کرنے کے بعد اسی سے تولیہ کا بھی کام لیتے تھے اور بازار سے آتے وقت کبھی کبھی اس میں موسمی پھل، سبزی، گڑ یا کوئی اور سامان بھی رکھ لیتے تھے۔ کوئی محنت طلب کام ہوتا تو اس کو اس انداز سے کمر پر باندھ لیتے تھی کہ اردو محاورہ ''کمر کس کر باندھنا'' یاد آجاتا تھا۔ جب دھوپ کی تمازت میں اضافہ ہوتا تو اس کو ایک خاص انداز سے تہہ کر کے سر پر رکھ لیتے تھے جو سائبان کا کام دیتا تھا اور جاڑے کے ابتدائی ایام میں اسی کا عمامہ باندھ لیتے تھے جو زمستانی ہوا سے بچاتا تھا اور جب موسم کی شدت میں اضافہ ہوتا تھا تو اپنے توانا جسم کو ایک سفید سی چادر میں چھپا لیتے تھے۔

حاجی محمد یاسین ایک باہمت، بلند حوصلہ شخص اور پریکٹیکل انسان تھے، ان کے خمیر میں محنت سے پیسہ کمانے کی خواہش تھی۔ حالات کی سنگلاخی ان کے پاؤں کو ڈگمگا نہیں سکی۔ لفظ ''جفا کش'' ان کے پورے Persona کو مکمل طور پر درشاتا ہے۔ ان کے خاندان میں لکھنے پڑھنے کی روایت دور تک نہیں ملتی ہے لیکن انھوں نے اپنے تدبر اور محنت سے جس نسل کی تربیت کی اس کے

ثمرات اور اثرات ملک کے ساتھ باہر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ایک بھرے پرے خاندان کی کفالت کے ساتھ حتی الامکان اپنی اولاد کو تعلیم سے نوازا اور بعض کو اس مقام تک پہنچایا جہاں بہتوں کے پر جلتے ہیں۔محنت،قربانی،تیاگ اور تربیت کر کے ان کے تابناک مستقبل کی عمارت تیار کی جس کا اجر ان کو ملتا رہے گا،ان شاء اللہ۔رہا نام کا سوال تو ڈاکٹر مقتدیٰ حسن کے ساتھ ''محمد یاسین'' کا نام دنیا کے اکثر علمی حلقوں تک پہنچ گیا ہے۔کتنے لوگ صرف اخبارات و رسائل میں پکی روشنائی سے چھپا ہوا نام دیکھنے کی حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے لیکن رب کائنات نے اپنے اس سادہ دل بندے کو اس اعزاز سے ایسا نوازا کہ معاصرین رشک کرتے تھے۔

اولاد کے ساتھ ان کا رشتہ تا حیات مشفقانہ رہا۔بیٹیوں کی برابر خبر گیری کرتے رہتے اور ان کے دکھ سکھ میں ساتھ رہتے تھے۔ان کی اولاد کی تعلیم اور تربیت کے لیے فکر مند رہتے تھے۔میرا بچپن ننیہال میں گزرا ہے اور میں نے ان کی شفقت اور سختی دونوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔پہلے پہل انھیں کی انگلی پکڑ کر مدرسہ عالیہ عربیہ میں داخل ہو اور مولوی عبدالباقی مرحوم (کھیدو پورہ) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور جب کبھی راستے میں مولوی صاحب سے ملاقات ہو جاتی اور میں ہمراہ ہوتا تو فوراً پوچھتے تھے کہ یہ پڑھتا ہے کہ نہیں۔وہ تربیت کے سلسلے میں زبان سے کم اور ہاتھ سے زیادہ کام لیتے تھے۔آج بھی طفلانہ شرارتوں پر ان کے ''تادیبی اسلوب'' کی یاد آتی ہے تو دل خوف کے بجائے سرور سے جھوم اٹھتا ہے،بس ایک حسرت رہ گئی کہ ان کے ساتھ رہنے کا موقع کم ملا۔ایک غیر علمی پس منظر اور معمولی تعلیمی صلاحیت کے باوجود اپنی اولاد کی تعلیم،ترقی اور تابناک مستقبل کے لیے کافی جتن کیا اور اپنے خاندان جس کی شناخت محض ''سیف وسناں'' تھی اس میں ''لوح وقلم'' کا تمغہ لگا کر پورے منظرنامے کو تبدیل کر دیا۔ان کی شخصیت کا یہی روپ مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے۔

بلقیس نعمان (وفات ۲۹/اکتوبر ۲۰۰۶)

ازہری صاحب کی والدہ بلقیس نعمان کا خاندان 'ایں خانہ ہمہ آفتاب است' کا مصداق تھا ان کے والد مولانا ابوالعرفان محمد نعمان اعظمی،سید نذیر حسین محدث دہلوی کے متاخرین تلامذہ میں سے تھے اور اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد بھی۔انہوں نے مئو سے بہت دور عمر آباد (مدراس) میں اپنا علمی آشیانہ بنایا اور ایک خلق کثیر نے ان سے دین کے رموز اور دعوت کے اصول سیکھے۔انھوں نے دو شادیاں کی تھیں۔بلقیس نعمان ان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں جو پہلی بیوی کے بطن سے تھیں۔ان کی تعلیم تو بس واجبی تھی لیکن گھر کے علمی ماحول نے ان کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔قرآن اور دینی کتابیں تو گھریلو مدرسے اور کچھ بھائی بہن سے پڑھی تھیں لیکن مستقل مطالعے کی عادت نے اس کو جلا بخشی۔انھوں نے اپنے گھر کے علمی و دینی ماحول سے بہت کچھ سیکھا تھا اور سب کا سب اپنے نئے گھر میں منتقل کر دیا تھا۔ان کے آنے

کے بعد اس گھر کی تقدیر بدل گئی تھی جہاں علم کبھی ایک اجنبی شے تھا وہاں علم کا چراغ جلایا جس سے کئی چراغ جلے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے مئو میں سرکاری ہنر کرگھہ اسکول سے بنائی کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔

بلقیس نعمان کا تعلق پہلی جنگ عظیم کے دور کی نسل سے تھا، ان کی عملی زندگی کا آغاز تقریباً اسی وقت ہوا جب ملک کے ادبی مطلع پر کئی ستارے اپنی تابانی بکھیر رہے تھے۔ شمالی ہندستان تعلیم نسواں کے لئے کمر کس رہا تھا، ''انگارے'' کی آنچ تو ان کے دامن تک نہیں پہنچی تھی اور انھوں نے ''آنچل سے پرچم'' بنانے کی کبھی کوشش بھی نہیں کی لیکن کرگھے پر ساڑی بن کر اور مئو میونسپلٹی کے ایک الیکشن میں پولنگ ایجنٹ کی ذمے داری ادا کر کے عورت کے سماجی و معاشی کردار کے حوالے سے اپنے زاویۂ نظر کو پیش کر دیا تھا۔ وہ ایک حوصلہ مند خاتون تھیں، کڑے سے کڑے وقت میں بھی ہمت نہیں ہارتی تھیں، خانگی امور، تعلیمی اخراجات، اولاد و اقرباء کے مسائل سب دوش بہ دوش چل رہے تھے، ان کے اندر بچپن ہی سے خود اعتمادی آگئی تھی۔ والدہ کا انتقال، والد کی شہر سے بہت دور تدریسی مشغولیت نے ان کے اندر راستہ اور سمت سفر خود طے کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ نشیب و فراز خوب دیکھے، عسرت کی دھوپ ان کو جھلسا نہ سکی اور عشرت کی چھاؤں بے عمل نہ بنا سکی۔ ان کی اولاد نے تعلیم کے میدان میں جو کامیابی حاصل کی اور تعلیمی نقشے پر جو جگہ بنائی اس میں ان کی تربیت، روشن دماغی، عصری آگہی اور شبانہ روز کی محنتوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

بلقیس نعمان کی کتابت سے کتنی شناسائی تھی، یہ تو نہیں معلوم، لیکن جب خطوط املا کراتی تھیں تو رشک آتا تھا، مضمون ان کے ذہن میں مرتب اور مربوط ہوتا تھا، ایک خاص انداز سے املا کرا رہی ہیں جیسے رک رک کے بہہ رہا ہو دریا۔ صوتی زیر و بم سے دلی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا تھا، القاب و آداب اور آغاز و اختتام کے اسلوب سے علمیت جھلکتی اور جھانکتی تھی۔

بلقیس نعمان کا حافظہ بڑا قوی اور ذہن تو گویا واقعات و حوادث کا مینا بازار تھا، ضرورت، ذوق اور ذائقے کے لحاظ سے اس میں سے مواد نکلتا تھا اور اپنا کام کر جاتا تھا، کہانیاں تو خوب سنیں، تاریخی اور تفریحی دونوں، قصص النبیین تو ہم نے بہت بعد میں عربی جماعت کے ابتدائی درجے میں پڑھی، لیکن اس کے تقریباً تمام اہم واقعات ہمیں ازبر تھے صرف نانی کی زبانی سن کر۔ اصحاب کہف کا طول طویل قصہ کئی راتوں کی غذا ہوا کرتا تھا، حضرت یوسف کے قصے سناتی تھیں تو سارے کردار نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے تھے، لگتا تھا کہ خود زلیخا اور عزیز مصر سے رسم و راہ ہو، بن یامین کٹورے سمیت حاضر ہیں اور ماہ کنعاں کن انکھیوں سے سارے مناظر کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ان کا کہانی سنانے کا انداز انوکھا تھا جس کی وہ بانی تھیں اور شاید خاتم بھی۔ بڑے ماموں (ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری مرحوم) نے بستر اسپتال، دہلی میں علالت کے دوران بتایا کہ جب قاہرہ یونیورسٹی میں نصاب تعلیم میں مشہور کتاب ''الف لیلہ ولیلہ''

ے کچھ قصے مصری استاذ سے پڑھنے کا موقع ملا تو عہد طفلی کی یادیں ذہن کے پردے پر رقص کرنے لگیں اور حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ آج دریائے نیل کے دامن میں جو کہانی نصاب میں پڑھ رہے ہیں، اسی کو دریائے گنگا کے دیش میں واقع بنکروں کے ایک قصبے میں اپنی ماں سے سن رکھا تھا۔ پتہ نہیں لوک ادب کی اصطلاح سے وہ کتنا واقف تھیں لیکن ان کے ذہن میں لوک کہانیوں کا نگار خانہ رقصاں تھا۔ ان کی کہانیوں کے کردار میں بڑا تنوع ہوتا تھا، پریوں کے دیش کے شہزادے اور گاؤں کی کٹیا کے کسان بھی، جن کو مٹی کا دیا بھی میسر نہیں تھا۔ کہانیوں کا تانا بانا عام طور پر اخلاق، شجاعت، ولولہ اور حسن سلوک کے موضوعات سے بنا جاتا تھا۔ اب تو کہانیاں بازار کی بھیڑ میں کھو رہی ہیں کیوں کہ کہنے والے نہیں رہے اور ترقی کی چمک دمک نے زندگی اور زمانے کی ترجیحات کو بدل دیا ہے۔

بلقیس نعمان کے مزاج میں سختی نہیں تھی لیکن عقیدے میں سخت تھیں اور صحتِ عقیدہ کا خاص التزام تھا، سماج میں رائج بدعقیدگی اور خوش اعتقادی قطعاً گوارہ نہیں تھی، اس سلسلے میں بڑی بے باک تھیں، کہیں بھی ٹوک دیتی تھیں، گھر کے ماحول میں کتاب وسنت پر عمل کی خوشبو رچی بسی تھی، مئو تو جلسے جلوس کا شہر ہے، سو دینی اجتماعات واجلاس میں خوب شرکت ہوئی۔ ۱۹۲۷ کی آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس، ۱۹۳۸ میں انجمن تہذیب البیان (مدرسہ عالیہ عربیہ) کا جلسہ اور ۱۹۶۸ میں مدرسہ عالیہ کی صد سالہ تقریب کی روداد ان کی زبانی خوب سنی۔ علامہ ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا عبدالرؤف جھنڈا نگری کی تقریروں سے ان کی دینی معلومات میں وسعت پیدا ہوئی، فکر روشن ہوئی، کتاب وسنت پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، دین کے نام پر پھیلی ہوئی اور پھیلائی جارہی بکواس سے واقفیت ہوئی اور اس کی وجہ سے اولاد کو جس اسلام کی نعمت ملی وہ آلودہ نہیں بالکل نتھرا ہوا تھا۔ اس کا فائدہ کیا ہوا، اس کا احساس اس وقت شدید تر ہو جاتا ہے جب دہلی میں بھانت بھانت کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اعلی تعلیم کے باوجود ان کی دینی معلومات کے افلاس پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے کہ خرافات کی کیسی کیسی ابابیلوں نے ذہنوں میں بسیرا کر رکھا ہے۔

بلقیس نعمان ایک سماجی خاتون تھیں۔ گھر اور خاندان کے بہت سے لوگ اپنے اہم معاملات میں ان سے مشورہ کرتے اور مطمئن بھی رہتے تھے، انھوں نے ایک طویل عمر پائی اس دوران نشیب بھی دیکھے اور فراز بھی، ان کے عمل، برتاؤ اور رویے میں اس قسم کا اعتدال تھا جس پر کبھی کبھی روکھے پن کا گمان ہوتا ہے، ہم نے ان کے اپنے انداز اور اسلوب میں بہت کم فرق دیکھا، سماج میں بھرپور رہنے کے باوجود کچھ سماجی عادتیں ان میں نہیں تھیں جیسے غیبت اور عیب جوئی، جس نے تو اب سماج میں باقاعدہ ایک آرٹ کی شکل اختیار کرلی ہے وہ اس سے دور اور بہت دور تھیں۔ اختر الایمان کی مشہور نظم ''یادیں'' کا ایک بند ان کے سماجی کردار کے حوالے سے بار بار ذہن میں آرہا ہے۔

راہ نورد شوق کو رہ میں کیسے کیسے یار ملے
ابر بہاراں، عکس نگاراں، خال رخ دلدار ملے
کچھ بالکل مٹی کے مادھو، کچھ خنجر کی دھار ملے
کچھ منجدھار میں، کچھ ساحل پر، کچھ دریا کے پار ملے
ہم سب سے ہر حال میں لیکن یوں ہی ہاتھ پسار ملے
صرف ان کی خوبی پہ نظر کی، اس آباد خرابے میں
دیکھو! ہم نے کیسے بسر کی، اس آباد خرابے میں

بلقیس نعمان سند یافتہ نہیں تھیں لیکن علم، معلومات اور مطالعے میں موجودہ کئی معلمات سے فائق، تعلیم کے موضوع پر بات کرتے وقت کسی کو وقت نہیں ہوتی تھی، دینی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم کی درجہ بندی سے بھی واقف۔ جدید تعلیمی نظام کی ترتیب میں ایم فل کہاں ہے، ایم.ڈی کا نمبر کب آتا ہے، پی ایچ ڈی کون سی بلا ہے، کن لوگوں کو بی.یو.ایم.ایس کہا جاتا ہے اور کیا پڑھنے کے بعد لوگ ایم بی بی ایس بنتے ہیں، یہ سب ان کو معلوم تھا اور خوب معلوم تھا۔ وائس چانسلر کا لفظ تو ان کی معاصر خاتون مشکل ہی سے ادا کر پاتی تھیں لیکن ان کو اس کے مقام و مرتبے کا اندازہ تھا، ہم نے خود جب پہلی بار ان کی زبان سے انگریزی کا یہ خوبصورت لفظ سنا تو اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔ کتنی شخصیات کا نام تو پہلی بار انہیں کی زبانی سنا، شاہ فیصل، رضا شاہ پہلوی، ملکہ فرح دیبا، شیخ ابن باز، مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری، تقی امینی، مختار الدین آرزو، سید حامد۔ فضا ابن فیضی کے دادا مولانا ابوالمعالی محمد علی فیضی پر ایک مقالہ لکھنے کے دوران میں نے ان سے کچھ دریافت کیا، مرحوم کے عمامے اور عصا کا ذکر اس انداز سے کیا کہ سراپا آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ ان کی زبانی تحریک خلافت کا ذکر سنا، ان کے والد اس تحریک میں کافی سرگرم تھے، مئو کی خلافت کمیٹی نے جب قومی عدالت قائم کی تو اس کے نو پنچوں میں سے آپ بھی ایک پنچ تھے۔ اس پس منظر میں محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں کا ذکر بھی کیا کرتی تھیں، غالباً ان کو دیکھا بھی تھا، جوہر کا یہ شعر ان کی زبان سے تو بارہا سنا۔

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بلقیس نعمان کے نزدیک تعلیم کے نام پر قدیم و جدید کی تفریق بالکل نہیں تھی، وہ حصول تعلیم پر زور دیتی تھیں، اولاد کی تعلیم کا تانا بانا تو آپ ہی نے تیار کیا تھا جس کو دیکھ کر ان کی فکر کا پتہ چلتا ہے۔ ہاں، اس بات پر ان کا اصرار بلکہ تاکید تھی کہ تعلیم خواہ کتنی ہی اعلیٰ اور تعلیم گاہ کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو، دین اور دین کے شعائر سے لاپرواہی کے لئے جواز فراہم نہیں کر سکتی ہے۔ اس باب میں ان کی نصیحت بلیغ اور فیصلہ بے لاگ ہوتا تھا۔ جے این یو میں داخلہ لینے کے بعد جب پہلی بار گھر گیا تو مبارک باد دینے کے بعد نصیحت کی، وہی جو ایک صدی قبل لسان العصر اکبرالہ آبادی نے ملت کے تمام نوجوانوں کو کی تھی۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
پر ایک سخن بندۂ عاجز کی رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

بلقیس نعمان کتاب دوست تھیں، کتابوں کو سلیقے سے رکھنا اوراس سے زیادہ سلیقے سے مطالعہ کرنا ان کا شوق تھا، کتابوں کی خاندان اور قبیلے کا کوئی امتیاز نہیں، حفیظ جالندھری کی ''شاہنامۂ اسلام''، ابوبکر جابر الجزائری کی ''عقیدۃ المومن'' کا اردو ترجمہ، رضا شاہ پہلوی کی ''وطن کے لئے میرے عزائم''، روسی ناول نگار الیکنڈر پشکن کا ناول ''کپتان کی بیٹی'' ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری کی ''خاتون اسلام'' اور ثناء اللہ عمری کی ''بات ایک مسیحا نفس کی'' جیسی متنوع بلکہ متضاد کتابیں مطالعے میں رہیں، لیکن ''اسلامی وظائف'' اور ''دستور المتقی'' سے ایک خاص قسم کا لو اور لگاؤ تھا، سو اس کو ہمیشہ پڑھتے ہوئے دیکھا، مزاج مذہبی تھا لیکن تقشّف سے دور، ذہن کے پردے پر ان کی جو سب سے پرانی تصویر نقش ہے وہ نماز فجر کے بعد باآواز بلند تلاوت کلام پاک میں مصروف، نماز بڑے خشوع خضوع کے ساتھ پڑھتی تھیں، رکوع و سجود طویل ہوتے تھے، مصلے پر گفتگو کرنے سے احتراز کرتی تھیں، عشاء کی نماز کچھ زیادہ ہی طویل، ہم جب ان سے ملنے یا کسی کام سے جاتے تھے تو اس کا خیال رکھتے تھے کہ نماز عشاء شروع کرنے سے پہلے ہی نمٹ لیں، مبادا دیر ہوگئی تو پھر دیر ہی دیر، طفلانہ حرکتوں سے مجبور اگر کبھی مصلے ہی پر ٹوک دیتے تو ناراض ہو جاتیں اور کہتیں کہ کتنی جلدی ہے، انتظار نہیں کر سکتے ہو تو نماز سے پہلے آیا کرو۔

بلقیس نعمان اپنی اولاد میں ازہری صاحب کو سب سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں اور پیار سے ان کو 'بابو' کہا کرتی تھیں۔ ازہری صاحب حافظ ہوئے، مولوی، مولانا بنے، ازہری ہوئے اور ڈاکٹر، لیکن ماں کے لئے وہی رہے، علمی کانفرنسوں میں اعتماد کے ساتھ بولنے والے، علماء اور دانشوروں کی مجلس کے میر مجلس ازہری صاحب بھی جب ماں کے دامن میں ہوتے تھے تو بس وہی ہو جاتے جس کا ذکر اقبال نے اپنی والدہ مرحومہ کے مرثیے میں کیا ہے

زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے اپنی کتاب ''مختصر تاریخ ادب عربی'' (جلد اول) اور ڈاکٹر اظہر حسن نے اپنی تصنیف ''امراض جلد'' میں تعلیم کی راہ میں اپنے والدین کی عظیم قربانی اور بے مثال محنت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

''والد محترم محمد یاسین سعید اور والدۂ محترمہ بلقیس نعمان کے نام جن کی بے پناہ محبت، عظیم قربانیوں اور پرخلوص دعاؤں کے طفیل اللہ تعالی نے مجھے علم سے محبت اور علماء سے عقیدت کی توفیق عطا فرمائی''۔ رب ارحمهما كما ربياني صغيراً۔ (مقتدیٰ حسن)

''والد محترم مرحوم حاجی محمد یاسین اور والدۂ محترمہ بلقیس نعمان کے نام جن کی دعاؤں اور محنتوں کے نتیجہ میں علم کا سلسلہ جاری رہا''۔ (اظہر حسن محمد یاسین)

☆☆☆

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کی آخری تحریر*

طنز و مزاح کی ایک کتاب

پچھلے دنوں اپنے وطن مئو گیا تو وہاں سے "مٹھی بھر سچ" لے کر آیا، یہ عنایت ہے محترم امیر حمزہ صاحب کی، موصوف تعلق اور محبت رکھتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یاد رکھتے ہیں، اس دور میں اتنا سب کچھ بہت ہے، اللہ تعالیٰ اس تعلق کو باقی رکھے۔ میں موصوف کی منظوم و منثور نگارشات سے واقف اور ان کا قدرداں ہوں، گیسوئے اردو کی مشاطگی کرنے والے جو حضرات بھی آج میدان میں ہیں ان کی قربانیوں کی قدر کرنا اور ان کے حوصلہ کی داد دینا ہمارا ادبی واخلاقی فرض ہے، اور معاملہ صرف قدر شناسی کا نہیں بلکہ ایسے حضرات کے ساتھ تعاون کا بھی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق بخشے۔

مٹھی بھر سچ کے صفحات ۲۴۰ ہیں، طباعت صاف اور کاغذ درمیانی ہے، سرورق پر نام سے اوپر "طنزیات" اور اندرونی ٹائٹل پر کتابی سلسلہ (۲) کے اوپر "فکاہیہ" درج ہے، ان اصطلاحات کی جانب مختصر اشارہ آگے آئے گا۔

عنوان کتاب کی مناسبت سے امیر حمزہ نے اندرونی ٹائٹل پر ایک قطعہ درج کیا ہے:

سہمے سہمے سچائی کے نعرے میری مٹھی میں
بیٹھے ہیں دنیا کے سب ناکارے میری مٹھی میں
حالانکہ میں پیر، پیمبر، ولی، قطب، ابدال نہیں
پھر بھی پھول کے بدلے ہیں انگارے میری مٹھی میں

رباعی کا آخری مصرعہ حقیقت کو واشگاف کر دیتا ہے، شاعر نے بڑی چابکدستی سے حق شناسی وحق پرستی پر زمانے کے ردِعمل کی جانب اشارہ کیا ہے۔

امیر حمزہ کی تخلیقات کا دائرہ ادب اور صحافت دونوں کو محیط ہے، فنی لحاظ سے دونوں اقسام میں فرق ہے، لیکن کسی ایک شخصیت میں دونوں کے جمع ہونے میں تضاد نہیں۔

ادب اور صحافت

ادب اور صحافت کا فرق واضح ہے، ادب کی حیثیت مستقل ہے، اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی

کوئی ادب پارہ درحقیقت اس قدرتی سرجوش اور اندرونی تموج کا نتیجہ ہوتا ہے جسے ادیب دبا دینے سے قاصر رہتا ہے اور جو ایک طوفانی ندی کی طرح کنارے توڑتا اور اپنے تند و تیز بہاؤ میں ایک اپنا راستہ، ایک اپنی نہج اختیار کرتا ہوا بہنے لگتا ہے۔

لیکن صحافت کے مسئلہ کی نوعیت اس سے جداگانہ ہے، یہاں شعوری طور پر ایک اور خاص مقصد کے پیش نظر دربا

*ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر خاصی طویل ہے اس لئے اس کی تلخیص ہی کی اشاعت ممکن ہوسکی۔

میں سے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالنے کی سعی ہوتی ہے،اور نتیجۃً اس سارے عمل پر شعوری کاوش کا تسلط قائم رہتا ہے۔ پس اگر چہ ایک ادبی اور غیر ادبی تحریک کا مقصد ایک ہی ہے (یعنی سخن ہائے گفتنی کو ناظر تک پہنچانا) تاہم ان دونوں کے طریق کار میں ایک نمایاں بعد ہے،اور جہاں ادیب کو دوران تخلیق میں ناظرین کے وجود کا احساس نہیں ہوتا، وہاں صحافی نہ صرف اپنے ناظرین کے مزاج کو ہر دم پیش نظر رکھتا ہے، بلکہ انہیں متاثر کرنے کے لئے اپنے طریقِ کار میں مناسب لچک پیدا کرنے پر بھی مستعد رہتا ہے۔

ادب اور صحافت کے اس بنیادی بعد پر نگاہ رکھیں تو ادبی اور صحافتی مزاج کا فرق بھی واضح ہو سکتا ہے۔ (اردو ادب میں طنز و مزاح ج ۳۵۸)

جدید صحافت اور مزاح

ظریفانہ انداز میں جب بات کہی جاتی ہے تو اس سے ردعمل کو تحریک نہیں ہوتی، بلکہ عموماً تصویر کا ایک مخصوص رخ دکھا کر اخبار کے نظریے کی اشاعت کا موجب بھی ثابت ہوتی ہے، اسی لئے جدید صحافت میں مزاح کو اس قدر اہمیت ملی ہے کہ یہ نہ صرف سنجیدہ مسائل سے ناظر کو ایک لحظہ کے لئے ہٹا کر ذہنی و دماغی فرحت وانبساط کے مواقع مہیا کرتا ہے، بلکہ ہنسی ہنسی میں اخبار کے اصل کالم بھی اس واقع کو ایک مخصوص عینک سے دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ (ایضاً ص ۳۶۳)

صحافتی مزاح اور نیا دور

۱۹۴۷ء سے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع ہوا جس معاشرے کی برق رفتار تبدیلیوں نے نمایاں اثرات مرتسم کئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے نتیجہ میں جس طرح اذہان پر شکست و یاس کے تسلط کے نتیجہ میں لوگ تمسخر واستہزاء کی طرف مائل ہو گئے تھے، اسی طرح ۱۹۴۷ء کے افسوسناک حالات اور فضا پر شکست وریخت کے تسلط کا نتیجہ یہ نکلا کہ اخبارات کے فکاہی کالم کی مانگ یک لخت بڑھ گئی ہے، اور لوگ سنجیدہ خبروں کے مطالعے کے فوراً بعد کچھ ایسی ہلکی پھلکی اور طنزیہ ومزاحیہ باتیں پڑھنا پسند کرتے ہیں جو فضا کی سنجیدگی کو کم کرکے ان کے تھکے ہوئے دل ودماغ کو فرصت کے چند لمحات بہم پہنچائیں۔ (ایضاً ص ۳۹۳)

سنجیدہ مضامین کی طرح طنز ومزاح میں بھی قارئین کا لحاظ ضروری ہوتا ہے، اسی لئے ادباء کا مشورہ ہے کہ ایک طناز صحافی کو سب سے پہلے اس بات کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے کہ وہ جو بات کہے اس انداز سے کہے کہ ناظرین کا ایک بڑا طبقہ اسے سمجھ سکے، نہ صرف سمجھ سکے بلکہ اس پر قہقہے بھی لگا سکے، چنانچہ اس کے عمل میں شعوری کاوش کی فراوانی ہوتی ہے، اور وہ دوران تخلیق میں ناظرین کے وجود کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ (ایضاً ص ۳۶۰)

طنز و مزاح سے متعلق کچھ اور باتیں آئندہ آئیں گی، مگر فی الحال ''مٹھی بھر سچ'' سے متعلق چند باتیں عرض کرنا ہے۔

عرض ناشر میں وضاحت ہے کہ یہ مجموعہ امیر حمزہ صاحب کے مضامین کا مختصر انتخاب ہے جو مختلف اخبارات کے لئے لکھے گئے ہیں۔

ان تحریروں کے امتیاز و افادیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: یہ تحریریں ایک طرف معاشرتی نشیب و فراز کا آئینہ ہیں، تو دوسری طرف عوام کو بیدار کرنے کی

قلمی تحریک بھی۔

مجموعہ کا پہلا مضمون ''ضمیر اور انتر آتما'' کے عنوان سے معنون ہے، آج کے حالات کو سامنے رکھا جائے تو طنزیہ تحریر کے لئے مذکورہ عنوان میں بڑی وسعت ہے، مصنف نے دو صفحات میں بنیادی طور پر سیاسی پارٹیوں کو سامنے رکھا ہے، اور جو ناہمواریاں ان کے اصول اور کارکردگی میں ہیں ان پر طنز کیا ہے، پھر ضمیر کے تعلق سے محکمہ تعلیم کی طرف رخ موڑا ہے۔

''اسی میں سے تھوڑی سی انتر آتما لے کر کسی طرح محکمہ تعلیم بھی کام چلالیتا ہے جس کے ذریعہ بچوں کو مفت تقسیم کی جانے والی کتابیں حکومتیں اضلاع میں بھیجتی ہیں، وہ کتابیں بچوں کو نہ مل کر کتاب فروشوں کی دوکانوں پر فروخت کی جارہی ہیں، اور ان کتابوں کی قلت دکھا کر اس پر چھپی ہوئی قیمت سے زیادہ پر بچوں کو فروخت کی جارہی ہیں ان دوکانداروں کے پاس یہ کتابیں کہاں سے آئیں؟ یہ کوئی انتر آتما ہی بتا سکتی تھی، اے کاش انتر آتما زندہ ہوتی''۔

ادب وشعر میں ''رمزیت'' معروف ہے طنز ومزاح کی صنف میں اس سے بہت آسانی ہوتی ہے، رمزی اسلوب میں لکھنے والا جو چاہتا ہے کہہ دیتا ہے اور تحریر کی چاشنی میں اس سے اضافہ ہوتا ہے۔ امیر حمزہ صاحب نے ''خونیں رشتہ'' کا عنوان قائم کر کے اپنے شہر میں مچھروں کو موضوع بنایا ہے اور اس ننھی مخلوق کی ستم رانیوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کی غفلت کی جانب بھی اشارہ کردیا ہے، ایک پورا پیراگراف رمزیہ اسلوب میں مچھروں کی داستان کے لئے تمہید کا کام کررہا ہے۔

''زندہ قومیں ہمیشہ متحرک رہتی ہیں، اور ہندوستانی قوم ایک زندہ قوم ہے، اس لئے ہمیشہ متحرک رہتی ہے، بالخصوص ہندوستان کا مانچسٹر کہے جانے والے مئو کے لوگ تو رات کو سوتے وقت بھی متحرک رہتے ہیں، کسی سے گفتگو کرتے وقت بھی متحرک رہتے ہیں، کھانا کھاتے وقت بھی متحرک رہتے ہیں، یہاں تک کہ عبادت کے وقت بھی انہیں متحرک رہنا پڑتا ہے، یہ لوگ خود متحرک نہیں رہتے، بلکہ انہیں متحرک کیا جاتا ہے تاکہ وہ کسی لحہ انجماد اور تعطل کا شکار نہ ہوں......انہیں متحرک رکھنے میں ایک معمولی سا جانور نمایاں کردار ادا کرتا ہے، اور انہیں کسی بھی لحہ خودرفتہ اور غافل نہیں ہونے دیتا''۔الخ

امیر حمزہ نے اپنی تعارفی تحریر میں مزدوروں سے اپنے لگاؤ کا ذکر کیا ہے، ''مٹھی بھر سچ'' کے مختلف مقامات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، مئو کی بنکر آبادی کے لئے ان کے دل میں درد ہے، اور غریب مزدوروں کی حق تلفی جس کی طرف سے ہوتی ہے اس پر موصوف کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے ہیں، مذکورہ کتاب میں ایک تحریر کا عنوان ہی ''فاقہ ڈے'' رکھا ہے، اس میں مختلف نام سے جوڑے مختلف اوقات میں منائے یا سنے جاتے ہیں ان کا دلچسپ ذکر ہے، بین القوسین جو توجیہ ذکر کی ہے اس کا لطف الگ ہے۔

''مٹھی بھر سچ'' میں طنز کے بہت سے نمونے موجود ہیں اور اپنی اپنی جگہ سب دلچسپ ہیں، پچھلے دنوں اردو، بی ٹی سی اور ٹیچروں کی تقرری کا مسئلہ زوروں پر تھا، آج بھی یہ ذکر ہے لیکن مدھم آواز میں، اس معاملہ میں کئی پہلو غور طلب اور جواب طلب بنے ہوئے ہیں، امیر حمزہ نے اس کے بعض پہلوؤں کو سامنے رکھ کر جو طنز کیا ہے اسے ملاحظہ فرمائیے:

''چنانچہ جب ماضی میں اردو ہندی مترجم رکھے گئے

تو اس بات کا پورا اہتمام کیا گیا کہ ایسے لوگ ہی اس نوکری پر رکھے جائیں جنہیں قاعدے سے اردو نہ آتی ہو، اور ایسا ہی ہوا بھی (اس طرح واقعی اردو کی ترقی کا خطرہ ٹل گیا، اسی دور میں جب اردو ٹیچروں کی تقرری ہوئی تو اس میں ایسے امیدواروں کو کامیابی حاصل ہوئی، اور انہیں لوگوں کو رکھا گیا جو اردو کے علاوہ کچھ بھی پڑھا سکیں''۔

تمثیل میں طنز کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو: ''جس طرح گیسٹک کے مریض کے وضو کی کوئی ویلی ڈیٹی نہیں ہوتی، ٹھیک اسی طرح عوام اور رہنماؤں کے درمیان اعتماد کی کوئی ویلی ڈیٹی نہیں ہوتی، وہ کب ٹوٹ جائے کچھ کہا نہیں جاسکتا، کیونکہ وہ اعتماد زلزلوں کی بستی میں بنے ہوئے مکان جیسا ہوتا ہے''۔

ذیل کے طنز میں اقدار کی پامالی پر افسوس کا اظہار بھی ہے: ''پھر یوں ہوا کہ بدلتے وقت نے سب کچھ بدل ڈالا، اور آنکھ کا وہ پانی مرگیا جو تہذیبی روایت کو زندہ رکھے ہوئے تھا، اب ''مساوات'' غالب آ گئی ہے، اتفاق واتحاد کو فروغ ملا ہے، اب کوئی چھوٹا کوئی بڑا نہیں رہا، بچے بوڑھے اور جوان ماں بہن اور بیٹیاں سب ایک ساتھ بیٹھ کر ٹی.وی دیکھتے ہیں، اس سے جہاں مساوات کی اعلیٰ قدروں کو فروغ ملا ہے، وہیں اتحاد ویگانگت میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا ہے''۔

ہمارے معاشرے میں تربیت کا فقدان اپنا رنگ دکھا رہا ہے، ہر لکھنے اور بولنے والے کو اس کا قلق ہے، طنز نگار اپنے اسلوب میں اصلاح کی بات کرتا ہے، اور یہ تمنا رکھتا ہے کہ کاش ہماری تحریر سے کوئی نہ کوئی معاملہ سدھر جائے، امیر حمزہ نے اپنی کتاب میں ''میں کچھ بولی؟'' کے زیر عنوان اپنے انشائیہ میں بڑا کارگر طنز کیا ہے، اس تحریر کا پہلا پیراگراف آپ کتاب میں پڑھئے گا، میں دوسرے پیراگراف کے بعض حصے نقل کرتا ہوں، پہلے پیراگراف میں فضا میں قلابازی کا ذکر ہے، اسی پس منظر میں ذیل کی تحریر پڑھیں: ''ہماری اپنی اولادوں نے تہذیبی قلابازیوں کا مظاہرہ کیا، ہم کچھ بولے؟ اس تہذیبی قلابازی میں ہمارے پرکھوں کی دستار گر گئی، ہم کچھ بولے؟ وہ زبانیں جو کلمہ توحید پڑھتی ہیں، ان زبانوں پر گندی گندی گالیاں رواں دواں ہوگئیں، ہم کچھ بولے؟ ہماری بیٹیوں کے سر دوپٹے کا بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں رہے، ان کا آنچل ڈھلک گیا، ہم کچھ بولے؟ جو نسل ہمارا سرمایہ تھی اور جسے دوسری قوموں کی قیادت کرنی تھی وہ مغرب کی دیوانی ہوگئی اور نئے چراغوں کے بدلے سارے پرانے چراغ بیچ دیئے، ہم کچھ بولے؟ گھروں میں ٹیسٹ میچ کے بہانے ٹی وی آیا، پھر سیریل کے بہانے ڈش آیا، پھر سی ڈی پلیئر آیا، پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے ٹی وی دیکھا جانے لگا ہم کچھ بولے؟ ہماری اولاد آگ کی طرف بڑھتی رہی، ہم کچھ بولے؟ پھر وہ آگ کی ڈش بن گئی، ہم کچھ بولے؟ وہ زبان جو ہماری ماں کی زبان تھی اسے دوسروں نے کاٹا، اور ہمارے بیٹوں نے بھی ہماری ماں کی زبان سے آنکھیں پھیر لیں ہم کچھ بولے؟

اسی طرح موصوف نے سوالات کے انبار میں ہماری غیرت اور ہمارے احساس کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

امیر حمزہ کے ادبی ذوق سے ان کے قارئین واقف ہیں، مزاحیہ کتاب میں مختلف مقامات پر اس کا اظہار ہوا ہے۔

امیر حمزہ نے کتاب میں ایک عنوان ''مچھروں کا جلیان والا باغ'' کا قائم کیا ہے، اور اس میں رشتوں کے اقسام کا ذکر کیا ہے، پھر لکھا ہے کہ انسان اور مچھر کے مابین خون کا

رشتہ بھی قائم ہے، کیونکہ مچھر کشی کے لئے محلول اور اگر بتیاں تیار کی جاتی ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں کہ: اگر مچھروں کی نسل یکسر ختم ہو جائے تو بہت سی کمپنیاں دیوالیہ ہو کر بند ہو جائیں گی، اور ان میں کام کرنے والے بے روزگار ہو جائیں گے، اس طرح کم از کم مچھروں کی نسل ملک کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کا ذریعہ تو بنی ہوئی ہے، جب کہ ملک کے قومی لیڈر لوگوں کو روزگار کا وعدہ کر کے بھی انہیں روزگار نہیں دے پاتے''۔

امیر حمزہ نے اپنی تحریر میں اردو محاوروں، تلمیحات، کنایات اور تشبیہات سے بھی خوب کام لیا ہے، تمام کی مثال پیش کرنے کا مختصر تحریر میں موقع نہیں، ایک مضمون کا عنوان ''دیواروں کے کان یا......'' رکھا ہے، اس میں ہر بات دیوار ہی کے تعلق سے کہی گئی ہے۔

اپنی تحریر کو موثر بنانے کے لئے امیر حمزہ نے موقع بہ موقع ضرب الامثال اور محاورات کا استعمال کیا ہے، موصوف کی اس کاوش سے عبارت میں حسن بھی پیدا ہو گیا ہے، بعض مثالیں درج ہیں:

ہنسی اور خوشی نعمت ہے

انسان کو اپنی متنوع ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے یقیناً سنجیدگی اور پیہم عمل کی ضرورت ہے، لیکن سنجیدگی کی اس کیفیت کو تاثیر و دوام عطا کرنے کے لئے ذہن کا بوجھ اتارنے کی بھی ضرورت ہے، اسی لئے قدرت نے انسان کو ایک ایسی نعمت بھی بخشی ہے جس سے کام لے کر وہ کائنات کی خوفناک سنجیدگی اور زندگی کی صبر آزما کشمکش پر ہنس کر، مسکرا کر بلکہ قہقہہ لگا کر اپنی اس دیوانہ وار پیش قدمی میں دھیما پن پیدا کر سکتا ہے جو زندگی کے تیز بہاؤ سے ہم آہنگ ہے۔

(اردو ادب میں طنز و مزاح از وزیر آغا ص ۲۸)

عربی زبان کا ایک مقولہ:

ہنسی اور مزاح کو انسانی معاشرہ میں باہمی ارتباط کا ذریعہ مانا جاتا ہے، اس کا اظہار اس جملہ سے ہوتا ہے: اضحك تضحك لك الدنيا، وابك تبك وحدك یعنی ہنسی خوشی میں لوگ آپ کے ساتھ ہیں، لیکن اگر آپ آمادۂ بکا ہیں تو کوئی آپ کا ساتھ نہ دے گا، ویسے فضائل اخلاق میں داخل ہے کہ انسان کے دکھ درد میں بھی انسان اس کا ساتھ دے، اور اس کا غم ہلکا کرے۔ (ص ۳۰)

اکثر اطباء کا بیان ہے کہ ہنسی اور مزاح صرف نفسیاتی دباؤ کے مقابلہ ہی کے لئے مفید نہیں، بلکہ اس سے جسم میں موجود قوتِ مدافعت میں سرگرمی آتی ہے، بڑھاپے کے اثرات محدود ہوتے ہیں، عارضۂ قلب کا اندیشہ کم ہوتا ہے، اور عمومی طور پر نفسیاتی اور جسمانی حالت بہتر ہوتی ہے اور زندگی کی سرگرمیوں پر توجہ کی صلاحیت بڑھتی ہے۔ (الدراسات الاسلامیہ یولیو۔ ستمبر ۲۰۰۴ ص ۱۴۱)

فکاہت کا مفہوم

فکاہت عربی زبان کا لفظ ہے جسے اردو میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، مشہور لغت ''لسان العرب'' میں اس لفظ کی تشریح کچھ اس طرح ہے: فكه القوم بالفاكهة، لوگوں کے سامنے پھل پیش کرنا، فاكهة سے بطور تشبیہ شیرینی بھی مراد لی جاتی ہے، فكههم بملح الكلام عمدہ اور دلچسپ کلام پیش کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، فكه الرجل کے معنی

ہیں طبیعت کی عمدگی اور مزاح پسندی، تفاکہ کے معنی تمازح کے ہیں، خلاصہ یہ کہ عمدہ اور پر مزاح گفتگو اس مادہ میں ملحوظ ہے۔ (الدراسات الاسلامیۃ ص ۴۹)

فکاہت کا بنیادی عنصر مضحک خیال یا اس کی تعبیرات ہیں، فکاہت کے سہارے انسان بذلہ سنجی اور خوش کلامی کی کوشش کرتا ہے، فکاہت کا ایک مقصد مخاطب کو ہنسانا اور خوش کرنا ہوتا ہے، ہنسی یا ضحک کے مختلف اقسام ہیں، مشہور مصری ادیب وناقد عباس محمود العقاد نے ضحک کی دس سے زائد اقسام ذکر کی ہیں، ان میں ایک قسم خوشی کی ہنسی کی، ایک تحقیر وتمسخر کی ہنسی کی اور ایک مزاح ومسرت کی ہنسی کی ہے۔ (ایضاً ص ۵۰)

فکاہی ادب کی تاریخ

انسانی ثقافت پر نظر ڈالیں تو مزاحیہ ادب کی تاریخ طویل ہے، اسی وجہ سے قدیم عہد کے فلاسفہ میں افلاطون و ارسطو، اور جدید عہد کے فلاسفہ میں شوپنہادر اور برگسان وغیرہ کی اس صنف پر توجہ تھی۔ عرب ادباء اور فلاسفہ میں جاحظ اور ابوحیان توحیدی وغیرہ اور جدید دور کے مغربی ادیبوں میں بودیرا اور جارج الیٹ کی اس پر توجہ تھی، فلاسفہ وادباء کی اس توجہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہنسی اور مزاحیہ ادب کی اہمیت ہے، بچوں کی تعلیم وتربیت میں اور زندگی کے آلام ومصائب کا بوجھ کم کرنے میں اس صنف کی تاثیر بہت زیادہ ہے۔ (الدراسات الاسلامیہ ص ۴۲)

اسلامی اور عربی ادب میں فکاہت پر توجہ دی گئی ہے، اور علماء نے اس صنف پر کتابیں لکھی ہیں، دربار میں اس طرح کے لوگوں کی پذیرائی تھی۔

ہر زمانہ میں انسانی معاشرہ میں ایسے لوگوں کا وجود رہا ہے جو دوسروں کے لئے سامان تفریح فراہم کرتے ہیں، ان کا ادبی ذوق اور ترکیب کلام کا ملکہ قوی ہوتا ہے۔

راقم سطور کو مصر میں تعلیم کے دوران قاہرہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں ایم، اے کے مرحلہ میں جن نامور اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا ان میں دو استاد ایسے ہیں جن کا مزاحیہ ادب اور لوک ادب پر مستقل کام ہے، اور دونوں میدانوں میں ان کی شخصیت کو اعتبار حاصل ہے۔

ڈاکٹر شوقی ضیف کی کتاب "الفکاھۃ فی مصر" معروف ہے، تاریخ الادب العربی کا ان کا جو سیٹ ہے اس میں بھی اس صنف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری شخصیت ڈاکٹر عبدالحمید یونس کی ہے، ان کا لوک ادب اور فکاہی ادب دونوں پر کام ہے انھوں نے عربی ادب کی معروف فکاہی شخصیت ''جحا'' کے فکاہی نوادر پر گفتگو کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس طرح کے نوادر میں تمسخر کے ساتھ ساتھ فنی لحاظ سے فکاہی طور پر کسی تجربہ یا عملی دانائی کو پیش کیا جاتا ہے، نیز سماجی زندگی پر تنقید بھی ہوتی ہے، اسی لئے اس طرح کے نوادر میں ہیرو کی شخصیت ان لوگوں میں سے کوئی ایک ہوتی ہے جو اپنے تجربات اور زندگی کی تگ ودو کے لئے جانے جاتے ہیں، جحا کا کردار اسی طرح کی شخصیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ (ایضاً ص ۶۰)

مزاح

مغربی مصنفین میں اسٹیفن لیکاک (Stephen Leacock) نے مزاح کی تعریف میں لکھا ہے کہ مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فنکارانہ

اظہار ہو جائے۔

طنز

طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے، اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے، طنز نگار جس چیز پر ہنستا ہے، اس سے نفرت کرتا اور اسے تبدیل کر دینے کا خواہاں ہوتا ہے، اس کے برعکس مزاح زندگی اور ماحول سے انس اور مفاہمت کی پیداوار ہے۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے اس سے محبت کرتا اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ (ایضاً ص ۴۸)

مزاح کے اقسام

مزاح کی چار صورتیں بیان کی جاتی ہیں: بے ضرر لطائف، افادی لطائف، مضحک مزاح اور خالص مزاح۔

بے ضرر لطائف کا مقصد الفاظ یا افکار کی جادوگری سے سامان انبساط بہم پہنچانا ہے۔

افادی لطائف کسی جنسی یا تشدد آمیز خواہش کی تسکین کرتے ہیں، یہ لطائف کسی نہ کسی کے خلاف

مضحک سے حصول مسرت کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ قوت تخیل میں بچت سے پیدا ہوتی ہے۔

خالص مزاح کے ذریعہ حصول مسرت کو قوت جذبات میں بچت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ نظریہ فرائڈ کا ہے، ایسٹ مین نے اس مسئلہ کو بالکل مختلف زاویے سے دیکھا اور مزاح کو ایک قطعاً علیحدہ انسانی جبلت قرار دے دیا، اس نے لکھا کہ مزاح کھیل کی جبلت ہے، اور اس کا بڑا کام یہ ہے کہ انسان کو صدمہ یا مایوسی کا ہنس کھل کر مقابلہ کرنے کی ترغیب دے۔

اچھا مزاح نگار

ایک اچھے مزاح نگار کو فطرت کی طرف سے نہ صرف ایک بلند ذوق مزاح ہی ودیعت ہوتا ہے، بلکہ ایک ایسی نظر بھی حاصل ہوتی ہے جو زندگی کے موہوم ترین مضحک پہلوؤں تک رسائی پا لیتی ہے۔ (اردو ادب میں طنز و مزاح ۳۶۰)

طنز اور مزاح کی الگ الگ قسمیں ہیں، اور فنی لحاظ سے ان میں باہمی فرق ہے لیکن سماج کے لحاظ سے دونوں کی اہمیت ہے، چنانچہ طنز سماج اور انسان کے رستے ہوئے زخموں کی طرف ہمیں متوجہ کر کے بہت بڑی انسانی خدمت سرانجام دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف خالص مزاح بھی ہماری بجھی ہوئی پھیکی اور بدمزہ زندگیوں کو منور کرتا اور ہمیں مسرت بہم پہنچاتا ہے، اور اس طرح افادیت کے نقطہ نظر سے دونوں ہمارے رفیق اور غم گسار ہیں۔

جب معاشرہ بھوکا ہو تو اس میں طنز کو فروغ ملتا ہے، اور تخریب، نشتریت اور برہمی کے عناصر ابھرتے ہیں۔ دوسری طرف فارغ البالی کے دور میں ماحول سے یگانگت اور انس بڑھ جاتا ہے اور اسی لئے خالص مزاح کو عروج نصیب ہوتا ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مزاح کی طرح طنز بھی موازنہ، مبالغہ، لفظی بازی گری اور تحریف وغیرہ کے حربے استعمال کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ مزاح کے برعکس طنز میں نشتریت کا پہلو ضرور غالب رہتا ہے اور یہ اپنے نشانۂ تمسخر کے خلاف نفرت کے جذبات کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ (ایضاً ص ۵۹)

(ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری)

مولانا مظہر احسن ازہری
ناظم اعلیٰ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

جن کے وجود سے یہ فضا مشکبار تھی

ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری اب اس دنیا میں نہیں رہے انا للہ وانا الیہ راجعون یہ خبر ایسی بجلی بن کر گری کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، سامنے کی ہر چیز تاریک نظر آنے لگی، تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ قلب وجگر نے کام کرنا بند کر دیا ہے، جہاں تھا، وہیں بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے لئے کسی سے کچھ کہنے یا سننے کی طاقت نہ رہی، گھر کے لوگ پریشان ہو گئے، حیرت واستعجاب کی تصویر بنے سامنے کھڑے رہے، وہ مجھ سے کچھ سننے کے منتظر تھے، بڑی مشکل سے میں اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکا، اور "ان العین تدمع والقلب یحزن، ولا نقول الا مایرضی ربنا، وانا بفراقک لمحزونون" کہہ کر قضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا کہ:

"مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ ست"

آنکھیں ہیں آج ان کے تصور میں اشکبار
جن کے وجود سے یہ فضا مشکبار تھی

حافظ صاحب خاکسار کے ہم عمر تھے سال پیدائش ہم دونوں کا ۱۹۳۹ء ہے، بہت حد تک وہ میرے ہم مزاج وہم خیال بھی تھے، اسی وجہ سے ہم دونوں کی رفاقت اور دوستی پانچ دہائیوں سے زیادہ مدت تک برقرار رہی، اس طویل المدت رفاقت کے دوران کی اتنی ساری باتیں آج مجھے یاد آ رہی ہیں کہ میرے لئے ان کو ضبط تحریر میں لانا مشکل ہے۔

وفات سے قبل مئو میں اپنے آخری قیام کے دوران اپنی جسمانی تکلیف سے پریشان رہتے تھے، مقامی معالج ڈاکٹروں کی تجویز کردہ دوائیں اپنے برادر عزیز، عزیزم ڈاکٹر اظہر حسن (پرنسپل محمدیہ طبیہ کالج منصورہ، مالیگاؤں) کے مشورہ سے استعمال کر رہے تھے کبھی کچھ راحت کا احساس ہوتا، اور کبھی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا، مگر حافظ صاحب بڑے ہی صبر وضبط کے ساتھ معمول کے مطابق لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے، مدینہ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں مقالہ پیش کرنا تھا، اس کی تیاری میں دل وجان سے لگے رہتے، اس سلسلہ میں بحث وتحقیق یا مراجعہ کے لئے کچھ کتابوں کی ضرورت پڑتی تو بعد نماز عصر یا مغرب، مسجد کے مشرقی دروازہ پر جہاں اکثر ہماری ملاقات ہوتی تھی مطلوبہ کتابوں کے بارے میں مجھ کو بتا دیتے اور وہ کتابیں ان تک پہونچ جاتیں۔

مئو سے بنارس جانے سے صرف ایک روز قبل جب ہماری ملاقات ہوئی تو انھوں نے کچھ دیر ساتھ بیٹھنے اور چائے پینے کی خواہش ظاہر کی، اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی،

حافظ صاحب جب بھی مئو تشریف لاتے تو اکثر ہم لوگ اسی طرح ساتھ بیٹھتے اور اپنے کچھ ذاتی معاملات اور کچھ قوم وملت اور جماعت کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیال کر لیتے، مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی بڑے درد وکرب بھرے لہجہ میں مخاطب ہوئے، اور مجھے تاکید کرنے لگے کہ میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھوں اور اپنے علاج کے سلسلہ میں کوئی کوتاہی نہ کروں، مجھے بڑا تعجب ہوا کہ خود اپنے مرض (جس کی صحیح تشخیص اب تک کوئی بھی حکیم اور ڈاکٹر نہیں کر سکا تھا) اور اس مرض سے ہونے والی تکلیف و پریشانی سے زیادہ میری صحت کے بارے میں فکرمند ہیں، دراصل یہ حافظ صاحب کے خلوص ومحبت اور ان کے جذبۂ ایثار کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے، اس کے بعد وہ مسکراتے ہوئے اپنے مرض کے سلسلہ میں کہنے لگے کہ جہاں تک میری پریشانیوں کی بات ہے تو میں بنارس پہونچتے ہی اپنا پھر مکمل چیک اپ کراؤں گا، لیکن کسے معلوم تھا کہ اس چیک اپ کی رپورٹ لاعلاج بلکہ جان لیوا مرض کی شکل میں آئے گی؟ حافظ صاحب! مئو سے بنارس اور بنارس سے دہلی کچھ اس طرح گئے کہ پھر انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوا، قوم وملت کی پاسداری کرنے والا اور جماعت کی آبرو، اس کا ایک غیرت مند سپوت ۳۰ راکتوبر ۲۰۰۹ء کو اس دارفانی سے رخصت ہو گیا۔

انسان کی شخصیت اور اس کے مستقبل کو بنانے، سنوارنے میں گھریلو ماحول اور خاندانی پس منظر کا بڑا اہم رول ہوتا ہے، بڑے خوش قسمت تھے ہمارے حافظ صاحب اور ان کے خالہ زاد بھائی جناب ڈاکٹر حافظ عبدالعلی (پروفیسر مسلم کالج لندن) کہ انھیں اپنے والدین کی طرف سے مثالی محبت وشفقت، صحیح اسلامی تربیت کے ساتھ ساتھ نانیہال کی طرف سے نجابت، فطری ذہانت اور دین وعلم کی علم برداری کا ایسا شوق و جذبہ ملا جس نے انھیں ایک اعلیٰ مقام پر پہونچا دیا اور عالم باعمل، مربی، مفکر، ادیب، صحافی درس وتدریس کے ماہر اور دعوتی میدان کے رہنما کی حیثیت سے ملک اور بیرون ملک ان کی ایک پہچان بن گئی۔

ابھی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا، حافظ صاحب کے آبائی مکان سے بالکل متصل ایک بڑا اور پختہ کنواں تھا، آپ کو جلسہ اور تقریر کا اس قدر شوق تھا کہ وہ محلّہ کے بچوں کو جمع کر کے اسی کنویں پر انجمن کیا کرتے تھے، قراءت ہوتی، خوب نظمیں پڑھی جاتیں اور دوسرے مقررین کے ساتھ حافظ صاحب بھی اخبار اہل حدیث اور دیگر اسلامی پرچوں کی مدد سے مختلف موضوعات پر تقریر کیا کرتے تھے، اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اخبار اور پرچوں سے یاد کر کے تقریر کرنے والا شخص اپنے وقت کا بہترین قلم کار اور مقرر بن جائے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی تحریر اس قدر پختہ اور اسلوب اتنا پیارا تھا کہ لوگ اسے پڑھنے کے لئے منتظر رہا کرتے، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ لوگ آپ کی تقریر کے اتنا گرویدہ تھے کہ حقیقت بیانی اور حالات حاضرہ پر تبصروں کو سننے کے لئے جلسہ گاہ میں آخر تک بیٹھے رہتے، خاص کر صدارتی بیان تو ایسا جامع ہوتا کہ پروگرام کی جملہ تقاریر کی باریکیاں واضح ہو جاتیں اشکالات و پیچیدگیاں حل ہو جاتی اور مقرر اپنی تقریر کے ذریعہ کیا پیغام دینا چاہتا ہے، سامعین اس سے اچھی طرح واقف ہو جاتے۔

مئو میں تعلیم کے ابتدائی مرحلہ میں حافظ صاحب حفظ قرآن کے شعبہ میں داخل ہو گئے اور میں شعبۂ عربی سے متعلق ہو گیا، ہم عصری تو ہمیں حاصل رہی مگر ہم ایک

دوسرے کے ہم سبق نہ بن سکے۔ (۱) اس کے باوجود ہم لوگ بعد نماز مغرب ڈومن پورہ پچھم کی جامع مسجد میں جمع ہوجاتے، اپنے رفقاء درس کے ساتھ اپنے اہم اسباق کی تکرار کرتے، اسی محلہ کے ایک مشہور عالم دین، واعظ، اور ادیب وشاعر مولانا عبدالرحمٰن آزاد رحمہ اللہ کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحی شاد رحمہ اللہ زیادہ تر شام کو اسی مسجد میں تشریف فرما ہوتے، موصوف اپنے والد ہی کی طرح بہترین خطیب اور کامیاب مقرر تھے، شاعر تھے اور شعر گوئی میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی، برجستہ اور بیک وقت اردو، فارسی اور عربی میں شعر کہا کرتے تھے، مسجد میں مطالعہ اور تکرار کے دوران موصوف ہمارے قریب ہی بیٹھے رہتے، مولانا ابوالکلام آزاد کے بڑے مداح تھے، ان کی مشہور کتابوں کو اس طرح اور اتنی بار پڑھا تھا کہ جگہ جگہ سے ان کتابوں کی عبارتیں انہیں ازبر ہوگئی تھیں، قرآن کے فہم وتدبر پر خاص توجہ دیتے، یہی وجہ تھی کہ موصوف تفسیر ابن جریر، تفسیر قرطبی اور ترجمان القرآن سے ہمیں بڑے دقیق نکتے سناتے رہتے۔ تعلیم وتعلم اور کسب وعطا کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ ہم لوگ مولانا کے بہت قریب ہوگئے، اور ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ان سے کچھ بے تکلف بھی ہوگئے، مولانا شکار کھیلنے کے شوقین تھے اور چڑیوں کا شکار ان کا محبوب مشغلہ تھا، چنانچہ وہ اپنی شکاری مہم میں اب ہمیں بھی شریک کرنے لگے، لیکن اس معاملہ میں وہ بہت محتاط رہتے، اور بار بار شکاری مہم میں ہمیں ساتھ لے جانے سے پرہیز کرتے کہ کہیں ہم لوگ بھی انہیں کی طرح شکاری نہ بن جائیں، جب کبھی مدرسہ میں چھٹی رہتی اس دن ہم سب اپنے اپنے گھروں سے اجازت لے کر صبح سویرے اپنی اپنی سائیکل پر مولانا کے ساتھ شکار کے لئے نکل جاتے، دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد نصیب کا جتنا شکار ملتا، اس پر قناعت کر کے شام کو گھر واپس آجاتے، حافظ صاحب کو چڑیوں اور مچھلی کا شکار کھیلنا پسند تھا۔

ہم نے منظم اور باقاعدہ طور پر تعلیم کی شروعات مدرسہ عالیہ عربیہ سے کی، اور عربی کی تیسری اور چوتھی جماعت تک پڑھ کر وہاں سے فیض عام چلے گئے، میں آخر تک فیض عام میں رہا اور وہیں سے میں نے ۱۹۵۹ء میں فراغت بھی حاصل کی جب کہ حافظ صاحب اپنی تعلیم کے آخری مرحلہ میں جامعہ اثریہ دارالحدیث چلے گئے اور علامہ شائق رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ختم بخاری کا شرف حاصل کیا، مدرسہ فیض عام کے ناظم اعلیٰ اور استاذ الاساتذہ مولانا احمد صاحب رحمہ اللہ مجھے دارالعلوم دیوبند بھیجنا چاہتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ میں وہاں سے منطق وفلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد فیض عام میں رہ کر درس وتدریس کی خدمت انجام دوں، لیکن میں اس کے لئے تیار نہیں ہوا، کیونکہ فراغت کے بعد میں اپنے اندر عربی ادب کا رجحان دیکھتے ہوئے فاضل ادب کا امتحان دینا چاہتا تھا، محترم ناظم صاحب (جو استاذ الکل فی الکل ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے دور اندیش اور بے حد مشفق ومہربان بھی تھے) اس کے لئے بھی راضی ہوگئے، اور فرمایا کہ فاضل ادب کی کتابیں کہاں سے اور کس طرح دستیاب ہوسکتی ہیں اس کی معلومات حاصل کر کے مجھے بتاؤ، ہم اس کا پورا بندوبست

(۱) قاہرہ جانے کے بعد جامعہ ازہر میں البتہ یہ کمی پوری ہوگئی اور ہمارا داخلہ ایک ساتھ اور ایک ہی کلیہ، کلیۃ اللغۃ یعنی شعبۂ عربی ادب میں ہوگیا۔ (ڈاکٹر عبدالعلی ازہری بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہوگئے تھے)

کریں گے، چنانچہ مئو کے دو بڑے مدرسوں (دار العلوم و مفتاح العلوم) اور اس وقت کے کئی مشہور و بڑے کتب خانوں سے رابطہ کیا گیا۔ لیکن ہر جگہ سے مایوسی ہوئی، اور کورس کی اہم کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی نہیں مل سکی۔ اور میں مجبوراً ڈاکٹر عبدالعظیم مرحوم (جو جناب حاجی سعید صاحب کے فرزند اور ڈاکٹر عبدالرحیم مرحوم کے برادر تھے) کے ساتھ ٹانڈہ چلا گیا، اور مدرسہ کنز العلوم سے فاضل ادب پھر فاضل دینیات کی تیاری۔ کے امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے عالم فاضل دینیات و فاضل ادب کا امتحان جامعہ اسلامیہ فیض عام ہی سے فارم بھر کر ریگولر امیدوار کی حیثیت سے پاس کیا۔

فراغت اور الہ آباد بورڈ سے فاضل ادب و فاضل دینیات کے امتحانات پاس کرنے کے بعد ہمیں مدرسہ عالیہ اور فیض عام میں تدریسی خدمات کا موقع ملا، مدرسہ عالیہ میں میری تقرری کے بعد حافظ صاحب بھی فیض عام میں مدرس ہو گئے، مگر ہماری تدریسی خدمات کی مدت مختصر رہی، کیونکہ ہندوستان سے باہر کسی عرب ملک کی یونیورسٹی میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہمارے اندر انگڑائیاں لے رہا تھا اس طرح مصر میں موجود دنیا کی مشہور ترین اسلامی یونیورسٹی ''جامعہ ازہر'' پہونچنے کی کوشش میں ہم لگ گئے، اس زمانہ میں مدینہ یونیورسٹی کا بڑا چرچا تھا، کثرت سے طلباء وہاں جا رہے تھے ہم لوگوں نے بھی کوشش کی، درخواست لکھی، متعدد خطوط بھیجے، مگر جواب تک نہ آیا، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ نہ تو ہمارے پاس کسی بڑے تعلیمی ادارہ کی شہادۃ تھی اور نہ ہی کسی باثر اور صاحب رسوخ شخص کی سفارش درخواست کے ساتھ منسلک تھی، اس طرف سے جب ہمیں کوئی امید نظر نہیں آئی تو میں نے ایک دوسرا فیصلہ کیا، اور حافظ صاحب سے مشورہ کئے بغیر ایک خط بڑی مشکل سے تیار کر کے شاہ سعود بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے نام پوسٹ کر دیا اور جامعہ ازہر میں بھی داخلہ کی غرض سے ایک درخواست مصر بھیج دی، مدینہ یونیورسٹی کی طرف سے کسی جواب کا تو ہم انتظار ہی کرتے رہ گئے مگر شاہ معظم ملک سعود رحمہ اللہ کا جواب دیوان ملکی سے بلا تاخیر موصول ہوا، جس میں شاہ معظم کی طرف سے حصول علم دین کے جذبہ اور شوق کی ستائش کی گئی تھی اور کچھ اس انداز میں حوصلہ افزائی کی گئی تھی کہ ناکامی اور مایوسی کی تلخیاں یکسر زائل ہو گئیں، آخر میں اپنی علمی شہادات اور اس کے ساتھ دیگر ضروری کاغذات بھیجنے کا حکم تھا، مگر اس سے قبل ازہر کی طرف سے منظوری کا خط آچکا تھا، اور فوراً دہلی میں مصری سفارتخانہ پہونچنے کی تاکید کی گئی تھی، چونکہ بچپن ہی سے ازہر اور ازہر کی شان وعظمت کا تصور ذہن میں موجود تھا اور اس کی شہرت نیز تعلیمی دائرہ کی وسعت کے بارے میں برابر سنتا اور پڑھتا رہتا تھا، اس لئے ذاتی طور پر میں نے ازہر میں داخلہ کو اپنی خوش قسمتی سمجھا اور دہلی پہونچ گیا۔ دہلی میں مشہور صحافی وشاعر قابل احترام شخصیت جناب مولانا عبدالحکیم مجاز اعظمی اور اپنے مشفق ومہربان جناب ڈاکٹر نورالحسن جو حافظ صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلی ازہری کے ماموں تھے اور تعلیمی امور میں حافظ صاحب کے بیحد مخلص اور بہترین مشیر بھی تھے، کے یہاں قیام کیا، داخلہ کا خط دیکھ کر ان دونوں حضرات نے خوشی کا اظہار کیا، اور اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا، جس سے میری ہمت اور حوصلہ میں مزید اضافہ ہوا

جس دن میں ان کے یہاں پہونچا اسی دن شام کو ڈاکٹر نورالحسن صاحب نے فرمایا کہ کل سفارت خانہ چلنا

ہے، اور میں خود تمہارے ساتھ چلوں گا، یقین کریں جناب ڈاکٹر صاحب کی یہ بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی، اور دوسرے دن صبح کو دس بجے سے پہلے ہم دونوں مصری سفارت خانہ کے لئے نکل پڑے چونکہ ایک مخلص رہنما کی رہنمائی حاصل تھی، اس لئے منزل تک پہونچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی، سفارت خانہ میں ثقافتی امور کے فرسٹ سکریٹری جناب یونس متیٰ صاحب نے انٹرویو شروع کیا، موصوف پر مصری عامی زبان کا لب ولہجہ غالب تھا، اس لئے ان کے سوالات بمشکل سمجھ میں آتے، پھر بھی جس قدر میں سمجھ پاتا، اس کا جواب کتابی عربی میں دیتا رہا، الحمد للہ انٹرویو کامیاب رہا، اور مجھے فوراً سفر کی تیاری کرنے کو کہا گیا ازہر کے لئے وظیفہ کی منظوری کا خط لے کر میں مئو واپس آ گیا، ہندوستان میں اس وقت ازہر کے دو مبعوث اور نمائندے شیخ عبدالتواب اور شیخ عبدالوہاب رحمہما اللہ رہا کرتے تھے، اول الذکر کا قیام بریلی میں تھا، تو دوسرے شیخ عبدالوہاب رحمہ اللہ دارالعلوم دیوبند میں تھے شروع میں ازہر سے جو پہلا خط آیا تھا، اس میں دونوں نمائندوں میں سے کسی ایک سے رابطہ کرنے یا ان سے ملنے کے لئے کہا گیا تھا، لیکن چونکہ مراسلات کے ذریعہ براہ راست ازہر اور مصری سفارت خانہ سے میرا کام ہو گیا، اس لئے ہندوستان کے دونوں مندوب سے میں ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا لیکن بعد میں قاہرہ میں ان دونوں حضرات سے متعدد بار ملنے کا موقع ملا۔

حافظ صاحب کو جب میں نے سفارت خانہ کا خط دکھایا تو انھیں کچھ ملال سا ہوا، لیکن میں نے یقین دلایا کہ مدینہ یا قاہرہ، تنہا سفر کرنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا، اکیلے بیرونی سفر کی نہ میرے اندر ہمت ہے اور نہ طاقت۔ آپ کی رفاقت ومعیت میں شاید میرے اندر بھی اس مشکل سفر کا حوصلہ پیدا ہو جائے، سفر بعید ہے اور اس سفر کی راہ میں ہنوز بڑی دشواریاں ہیں۔ اگر ہم مل کر جد وجہد کریں گے تو راہ کی تمام دشواریوں پر بآسانی قابو پالیں گے، حافظ صاحب پختہ عزم وارادہ کے مالک تھے اور ان کے اندر بروقت فیصلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت تھی پہلے تو کچھ دیر خاموش رہے پھر غور وفکر کے بعد منظوری اور سفر سے متعلق ضروری کارروائی میں شرکت کے لئے راضی ہو گئے، ان کے داخلہ کی جلد از جلد منظوری کے لئے میں نے یہ تجویز رکھی کہ آپ شیخ عبدالتواب صاحب سے ملنے کے لئے فوراً بریلی چلے جائیں، اور میں نے ان کو ازہر کا وہ خط دے دیا جس کا مضمون یہ تھا ر جاء الإتصال بأحد المبعوثين لجامعة الازهر......

دوسرے ہی دن حافظ صاحب بریلی کے لئے روانہ ہو گئے، شیخ محترم سے جب ملے تو وہ بہت خوش ہوئے اور یہ سوال کیا کہ آپ جس مدرسہ کے فارغ ہیں کیا وہاں کے تمام طلبہ آپ ہی جیسی صلاحیت رکھتے ہیں؟

پہلی ہی ملاقات میں ہفتوں اور مہینوں کے مراحل طے ہو گئے، شیخ نے یہ خوشخبری سنا دی کہ آپ کا نام پہلی فرصت میں جامعہ ازہر بھیج دوں گا، ایک عربی شیخ وہ بھی ازہری عالم سے ملنے کا حافظ صاحب کا یہ پہلا اتفاق تھا، اس لئے وہ اپنی اس ملاقات کو ایک یادگاری ملاقات بنانے کے لئے مزید دو روز وہاں ٹھہر گئے، بریلی سے مئو واپسی کے بعد حافظ صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ سفر کامیاب رہا، اور ہمارا مقصد پورا ہو گیا، اب ہمیں پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے فوری کارروائی شروع کر دینی چاہئے چونکہ اس سلسلہ میں خود ہمیں کوئی معلومات نہیں تھی اور نہ ہی ابتداءً

ہمیں کوئی ایسا آدمی مل سکا جو ہماری کچھ مدد اور رہنمائی کرتا، ہم جس کے پاس بھی جاتے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا اور معذرت کر لیتا، ابھی ہمارا ضلع اعظم گڈھ تھا اور محمد آباد گہنہ تحصیل۔ ہم دونوں اپنے ضلع اور تحصیل کا چکر لگاتے رہے، اور وہاں کورٹ اور کچہری میں کام کرنے والوں کے ذریعہ پاسپورٹ سے متعلق معلومات حاصل کر کے ہر روز کوئی نہ کوئی کام کر لیتے، بالآخر اللہ کی مدد شامل حال ہوئی اور اعظم گڈھ کے ریاض نامی ایک شخص کے مخلصانہ اور رضا کارانہ تعاون سے اپنے کاغذات لکھنؤ بھجوانے میں کامیاب ہو گئے، آج یہ سب باتیں بڑی عجیب معلوم ہوں گی، کیونکہ آج کل پاسپورٹ بننے اور بنوانے کا کام اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہر کوئی خاص کر ہمارا نوجوان طبقہ اس سلسلہ کی تمام باریکیوں تک سے اچھی طرح آگاہ ہے، اور بڑی آسانی سے پاسپورٹ بنواتا رہتا ہے مگر ۱۹۶۰ء کے آس پاس بہت ہی کم لوگ بین الاقوامی پاسپورٹ بنوایا کرتے تھے اس لئے اس سلسلہ کی معلومات بھی بہت محدود تھیں ہمیں اپنے بین الاقوامی پاسپورٹ بنوانے کے لئے بہت پاپڑ بیلنے پڑے، برادر عزیز حافظ عبدالعلی جب ہماری مہم میں شریک ہوئے اور ہمارے ساتھ مصر جانے کے لئے تیار ہوئے تو ان کے پاسپورٹ کی کارروائی میں بڑی آسانی ہوئی کیونکہ اس سلسلہ کی تمام ضروری معلومات کا علم ہمیں ہو چکا تھا۔

ہم تینوں کے مصر جانے کی بات جب عام ہوئی تو طرح طرح کے تبصرے شروع ہو گئے، اور لوگ خاص طور پر اپنے لوگ بہت ہی تلخ، مایوس کن اور حوصلہ شکن باتیں اس طرح کرنے لگے کہ حافظ صاحب کے والد محترم (الحاج محمد یاسین رحمہ اللہ) سن کر بہت رنجیدہ ہوتے اور ہم سے کہتے کہ تم لوگ اپنا ارادہ بدل دو اور مئو ہی میں رہ کر اپنی علمی صلاحیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرو لیکن جب ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کا جنون کی حد تک ہمارا جوش و جذبہ دیکھتے تو خاموش ہو جاتے، اسی دوران لکھنؤ سے رجسٹرڈ ڈاک سے ہم دونوں کے پاسپورٹ آ گئے۔ حافظ عبدالعلی کی طرف سے درخواست تاخیر سے دی گئی تھی اس لئے انہیں پاسپورٹ بھی بعد میں ملا۔ پھر کیا تھا، خوشی کے ساتھ ساتھ ہمارے عزم وارادہ میں مزید استحکام پیدا ہو گیا، اور ہم اپنے سفر کے دوسرے مرحلہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے حافظ صاحب کے والد محترم مستقل ہمیں اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہتے اور قدم قدم پر ہمت افزائی کرتے رہتے، میرے والد محترم (الحاج عبدالمنان رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ) چونکہ طویل علالت کے باعث مستقل صاحب فراش تھے اس لئے اس سلسلہ میں وہ ہماری کوئی مدد نہ کر سکے البتہ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں جامعہ ازہر کے لئے مصر جانا چاہتا ہوں تو کہا کہ ''مصر کیوں جا رہے ہو، مدینہ کیوں نہیں جاتے؟ میں نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ ان شاء اللہ، مصر کے بعد مدینہ منورہ ضرور جاؤں گا، کہا: جاؤ، اللہ کامیاب کرے، اللہ نے والد محترم کی یہ دعا سن لی اور قبول کر لی، کہ میرے لئے مصر سے سعودی عرب جانے کی راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ اور سعودی عرب میں غیر متوقع طور پر ایک طویل مدت تک قیام کرنے اور وہاں رہ کر بار بار حج وعمرہ کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی، فللّٰہ الحمد (اللہ میرے حج کو حج مبرور بنائے اور جو طواف وعمرے کئے اسے قبول فرمائے)

سفر مصر کی تیاریاں اپنے طور سے ہم کرتے رہے، لیکن سفر کی گھڑی آنے سے قبل ہی ۱۹۶۲ء میں اللہ نے والد محترم کا سایۂ عاطفت ہمارے سر سے اٹھا لیا، اور وہ اللہ کو

پیارے ہوگئے (اللّٰھم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وادخله فسیح جناته)

سفر سے متعلق جو تیاریاں ضروری تھیں جب وہ مکمل ہوگئیں تو ہم دونوں نے سفر کا فیصلہ کیا اور ۲۳/مارچ ۱۹۶۲ء کو مئو کے حجاج کرام کے ساتھ (جن میں ہمارے محلّہ کے حاجیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی) حافظ عبدالعلی (ڈاکٹر حافظ عبدالعلی ازہری) سے یہ کہتے ہوئے بمبئی کے لئے روانہ ہوگئے کہ ہم آپ کے لئے ''مقدمة الجیش'' ثابت ہوں گے، ان شاء اللہ آپ بھی اپنے طور پر پوری کوشش کریں ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ اٹلی کے لارولائن کے بحری جہاز میں، اعظم گڈھ کی ایک ٹراویل ایجنسی کے ذریعہ ہماری سیٹ بک ہو چکی تھی، بمبئی میں اس ایجنسی کے ہیڈ آفس پہونچ کر صرف سیٹ کنفرم، اور بعض دوسری کارروائی مکمل کرانا باقی تھا یہاں بھی جناب حافظ صاحب کی خود اعتمادی کام آئی اور یہ کام بھی بمبئی میں بہت آسانی کے ساتھ ہوگیا، مقررہ تاریخ میں یعقوب قلی نے جو حجاج کرام کے درمیان ایک بہترین خدمتگار قلی کی حیثیت سے مشہور تھے ہم دونوں کو پورٹ تک لے جاکر جہاز پر سوار کرادیا۔

جہاز کی صفائی ستھرائی اور اس کا حسن انتظام قابل ستائش تھا، حجاج کرام (جنہیں بحری جہاز کے سفر کا تجربہ ہوچکا تھا) کے مشورہ کے مطابق ہم اپنے ساتھ جو بیڈنگ اور بستر لے گئے تھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں پڑی، کیونکہ کیبن میں ضرورت کی ہر چھوٹی بڑی چیز موجود تھی، یہاں تک کہ صابن اور تولیہ بڑے سلیقہ سے اپنی جگہ رکھے ہوئے ملے، کھانے پینے کا اتنا اچھا انتظام کہ ہم جب بھی ڈائننگ ہال میں جاتے تو کسی پرتکلف دعوتی پروگرام کا احساس ہوتا، ہرلحاظ سے ایک ہفتہ کا ہمارا یہ سفر بے حد خوشگوار رہا، آٹھویں روز ہم پورٹ سعید پہونچ گئے، کسٹم کے دوران ہم بہت پریشان ہوئے، کیونکہ ہمارے ساتھ محترم شیخ عبدالتواب صاحب کا بہت زیادہ سامان تھا، بمبئی میں سفر سے صرف ایک دن قبل یہ سب سامان صوفی عبدالرحمٰن نامی ایک بزرگ کے ذریعہ ہمیں ملے تھے، چائے اور مرادآبادی برتن وغیرہ زیادہ مقدار میں تھے اس لئے کسٹم آفیسر کو یہ شبہ ہوا کہ ہم تجارت کی غرض سے یہ سب کچھ اپنے ساتھ لائے ہیں، فصیح اور عامیہ زبان کے فرق کی وجہ سے مفاہمت میں بھی دقت پیش آرہی تھی۔

کسٹم پر کام کرنے والے لوگوں کو ہر قسم کے افراد سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، اور اس طرح کے معاملات کا انھیں خوب تجربہ ہوجاتا ہے، ہم جس آفیسر کے پاس تھے اتفاق سے اس کے یہاں کئی دوسرے آفیسرز بھی آگئے اور صورت حال معلوم کرنے کے بعد، ان سبھوں نے متفقہ طور پر یہ مشورہ دیا کہ تم لوگ ازہر کے ہونے والے طالب علم ہو اور تم لوگوں کا تعلق ہندوستان سے ہے اور ''نہرو۔ ناصر بھائی بھائی ہیں'' اس تعلق سے تم لوگوں کی پوری مدد ضروری ہے لہٰذا "لنا اورلغیرنا" کو مدنظر رکھتے ہوئے، جتنا سامان تمہارا ہے سب الگ کرلو، باقی جو کسی دوسرے کی امانت ہے، یہیں چھوڑ دو۔ ہم اس کی فہرست اور رسید بنا کر دے دیتے ہیں، جس کی امانت ہے وہ کسٹم کی رقم ادا کرکے اپنا پورا سامان لے جائے گا مجبوراً ہمیں اس کے لئے تیار ہونا پڑا۔ اور شیخ صاحب کے اہل خانہ میں سے ذمہ دار شخص کے نام رسید وغیرہ بنوائی، آفیسران نے اپنے چند ماتحتوں کو یہ حکم دیا کہ وہ ہمیں قاہرہ جانے والی بس پر سوار کرادیں، بس اسٹاپ پہ مالیزیا کے محمد صالح نامی ایک طالب سے ہماری ملاقات ہوئی، جو کئی سال سے قاہرہ میں مقیم تھے اور اکثر

وبیشتر ہندوستانی طلبہ کو اچھی طرح جانتے تھے، عبدالودود اعظمی صاحب کے نام ہم اپنے ساتھ ایک خط لے کر گئے تھے، جب ہم نے ان کا نام لیا تو محمد صالح صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرا ان سے اچھا تعارف ہے، اطمینان رکھو میں تم لوگوں کو ان کے پاس پہونچا دوں گا چنانچہ قاہرہ میں میدان التحریر پہونچنے کے بعد وہ سید ھے ہمیں ''مدینۃ البعوث الاسلامیۃ'' (جوازہر کے غیر ملکی طلبہ کا ایک بہت بڑا ہاسٹل ہے) لے گئے اور جناب عبدالودود اعظمی صاحب کے پاس ہمیں پہونچا دیا، اعظمی صاحب کے یہاں جناب محمد شعیب نگرامی، معین الدین اعظمی، محمد شمیم اعظمی اور کئی دوسرے ہم زبان سے بھی ملاقات ہوئی، یقین کریں یہ تمام حضرات، خلوص ومحبت جس سلوک اور حسن استقبال میں اپنی مثال آپ تھے، اہل وعیال اور عزیز واقارب کو چھوڑنے کا غم، وطن سے دوری کا احساس اور سفر طویل کے بعد کسٹم پر پیش آنے والی ناقابل فراموش صعوبتوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہم بھول گئے، دوسرے دن ہمیں ایک بزرگ اور نیک سیرت انسان شیخ محمد لقمان صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، موصوف کا تعلق مغربی بنگال سے تھا، اور بہت زمانہ سے قاہرہ میں مقیم تھے ازہر کی طرف سے انہیں ہندوستانی طلبہ کی صحیح رہنمائی کے لئے ذمہ دار بنایا گیا تھا، لیکن داخلہ سے متعلق ہر معاملہ میں وہ صرف مشورہ ہی دے سکتے تھے، عملی طور پر ان کے لئے کچھ کرنا ممکن نہیں تھا، قاہرہ کی ایک مشہور جگہ ''موسکی'' میں ان کے پاس کوئی بھی جاتا تو بڑے تپاک سے ملتے اور خود اپنے ہاتھ سے چائے تیار کر کے اسے پلاتے اور دعائیں بھی دیتے۔

ہم لوگوں نے جب اپنے داخلہ کی بات کی تو کہا کہ ازہر اور اوقاف کے وزیر ڈاکٹر محمد البہی (غالباً یہی نام تھا) کے زیر سرپرستی ازہر میں تطور اور تنظیم جدید کا کام چل رہا ہے، اس کام کی تکمیل کے بعد ہی نئے داخلے کی کارروائی اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگا کچھ دنوں تک ہم یونہی بیکار بیٹھے رہے، مگر اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ عربی جرائد واخبار کے مطالعہ اور عربوں سے میل جول کے نتیجہ میں ہمیں اپنی عربی درست کرنے کا بہترین موقع مل گیا۔

ہم جن شہادات کی بنیاد پر داخلہ کے طالب تھے وہ عربی فارسی بورڈ الٰہ آباد کی عالم اور فاضل کی ڈگریاں تھیں، درس نظامیہ کی سند فضیلت بھی اس کے ساتھ منسلک کی تھی، مگر ان ڈگریوں کی بنیاد پر ازہر میں اب تک کسی کا داخلہ نہیں ہوا تھا، اور نہ ہی ان ڈگریوں کا ازہر میں ابھی تک معادلہ ہوا تھا، اس لئے یہ معلوم نہ تھا کہ ہندوستان میں سرکاری علمی اداروں میں مذکورہ ڈگریوں کی کیا حیثیت ہے؟ ہم کافی پریشان ہوئے اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں؟ کیونکہ ہمارے پاس دوسرے مستندات نہیں تھے جسے ہم پیش کرتے، داخلہ تو یقینی تھا مگر سوال مرحلہ کا تھا، ''کلیۃ اور دراسات علیا'' کے بجائے ثانویۃ میں داخلہ ہمیں قطعاً منظور نہ تھا، صلاح ومشورہ کے بعد میں نے ٹانڈہ میں اپنے مشفق استاذ گرامی جناب مولانا ظہور الحق صاحب (گورکھپور یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے ہیڈ جناب ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی کے بھائی) کے پاس خط لکھا۔ مولانا بہت ذی علم تھے، اردو، عربی اور انگریزی پر انہیں عبور حاصل تھا، ان کے تعلقات بھی بہت وسیع تھے، خاص کر امتحانات عربی فارسی بورڈ الٰہ آباد کے ڈائریکٹر جناب شبیر احمد غوری صاحب سے مولانا کے مراسم بہت اچھے تھے، اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے خط میں ازہر میں داخلہ سے متعلق درپیش دشواریوں

کا تذکرہ کیا، پھر یہ گزارش کی کہ موصوف اس سلسلہ میں جناب غوری صاحب سے ایک ایسا خط لکھوا کر بھیج دیں جس میں یہ وضاحت ہو کہ امتحانات عربی فارسی بورڈ الہ آباد کی عالم و فاضل کی ڈگریاں، ہندوستانی یونیورسٹیوں کی کن ڈگریوں کے مساوی ہیں، چنانچہ بورڈ سے مطلوبہ خط ہمیں بہت جلد دستیاب ہوگیا، ایک ہفتہ کے اندر ہی ڈگریوں کا معادلہ ہوگیا۔ اور مصر کے سرکاری گزٹ میں اس معادلہ کی رپورٹ بھی شائع ہوگئی۔ غوری صاحب کے اس خط سے ہمیں بڑی مدد ملی اور ہمارا داخلہ ''دراسات علیا'' میں ہوگیا۔ اب تک ازہر کے دراسات علیا میں کسی ہندوستانی لڑکے کا داخلہ نہیں ہوا تھا (بورڈ نے جو خط ہمیں عنایت کیا اس کا مضمون اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔ اللہ تعالیٰ جناب غوری صاحب اور استاذ مکرم مولانا ظہور الحق صاحب کو جزائے خیر دے (آمین) کہ ان کی شفقت ومہربانی اور ان کے ناقابل فراموش تعاون کے طفیل ہمیں بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد استاذ مکرم مولانا ظہور الحق صاحب علی گڈھ چلے گئے اور مسلم یونیورسٹی سے پی. ایچ. ڈی کر کے وہیں لکچرر ہوگئے۔

برادرم حافظ عبدالعلی کے بعد سید سعید احسن عابدی بھی قاہرہ پہونچ گئے، عابدی صاحب کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب ہم ٹانڈہ میں مدرسہ کنز العلوم میں الٰہ آباد کے عالم، فاضل کے امتحانات کی تیاری کر رہے تھے، اس تعلق سے وہ ہمارے بہت قریب ہوگئے۔ زیادہ تر وقت ہم لوگوں کا ایک ساتھ گزرنے لگا۔

کلیۃ اللغۃ میں داخلہ مکمل ہوتے ہی ہم سب جامعہ ازہر جانے لگے، اور کلاسوں میں حاضری دینے لگے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا کیونکہ ازہر کے ایک بہت ہی لائق وفائق اور قدآور استاذ ڈاکٹر فتح اللہ بدران نے ہمیں ''کلیۃ اللغۃ'' سے ''کلیۃ اصول الدین'' میں منتقل ہونے پر مجبور کردیا۔ اس طرح ہم عربی زبان وادب اور نقد وبلاغۃ کے بجائے اسلامی علوم وفنون کے ماہر اور تجربہ کار اساتذہ سے استفادہ کرنے لگے، ان میں سے بعض ایسے اساتذہ تھے جن کے محاضرہ میں ہم ضرور شریک ہوتے، جیسے فتح اللہ بدران، ڈاکٹر عبدالواحد وافی ڈاکٹر احمدین، ڈاکٹر غلاب اور شیخ محمد الغزالی وغیرہم (رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃ وتغمدھم بغفرانہ) جب کہ بعض دوسرے ایسے بھی اساتذہ تھے کہ کلاس تو درکنار، ان سے ملاقات کرنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا، جب کبھی ان سے ملاقات ہوجاتی تو ان کے موضوع سے متعلق ضروری کتابیں اور اہم مراجع معلوم کرلیتے، اور اپنے طور سے ان کا مطالعہ کرکے حتی المقدور اس موضوع کی تیاری کرلیتے، کلیۃ اللغۃ چھوڑنے کے بعد، عربی زبان وادب اور نقد وبلاغۃ جیسے اہم علوم وفنون سے محرومی اور تشنگی کے احساس کی تلافی ہم نے اس طرح کی کہ مصر کی سرکاری عصری یونیورسٹی ''جامعۃ القاہرۃ'' کے ''کلیۃ الآداب'' میں داخلہ لے لیا، یہاں بھی ہمارا داخلہ دراسات علیا ہی میں ہوا۔ اور یہاں سے ''ماجستیر'' کے پہلے اور تمہیدی سال کا امتحان پاس کرلیا، جس کے بعد ہمیں (ایم۔اے) کا رسالہ یعنی تھیس، لکھنے کا حق حاصل ہوگیا۔ لیکن چونکہ ازہر میں ہمارے ماجستیر کا کورس مکمل ۶۶-۱۹۶۵ء میں مکمل ہوچکا تھا۔ اور ہمیں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کی منظوری بھی مل گئی تھی۔ مشرف بھی مقرر ہوگئے تھے اور تھیس کے موضوع کی تسجیل بھی ہوگئی تھی اس لئے چند مخلص بہی خواہوں نے یہ مشورہ دیا کہ قاہرہ یونیورسٹی کے رسالہ کو چھوڑ کر ازہر میں پی۔ایچ۔ڈی کی

TRUE COPY

Office of the
Inspector of Arabic Madrasas, U.P.
&
Registrar Arabic and Persian
Examination,
Uttar Pradesh ALLAHABAD

To

Whom it Concerns

As students of Arabic and Persian Madrassas as such do not take admission in schools and colleges of general Education, nor vice versa, the quiestion of equivalency of these examinations has never arose.

However Government has recognised the titles of Kamil (Persian) and of Alim (Arabic) awarded upon passing the Persian Examinations as qualifications to be deemed equivalent to a graduate of an Indian University for purposes of election from Graduate constituencies.

Further the standard of Fazil Examination (which is next higher to Alim) is in no way inferior to that of M.A. Examination of Indian Universities in Arabic. It may be superior to that.

Hence the standard of Alim examination is nearly equal to that of an M.A. in Arabic. so that title of Alim Examination may be recognised as equivalent to a B.A. Honours of an Indian University in Arabic.

Sd/- S.A. Khan Ghori
Inspector of Arabic Madrasas,
Uttar Pradesh
Registrar Arabic and Persian
Examination,
Uttar Pradesh
14.3.63

تھیس پر توجہ مرکوز کر دینی چاہئے۔

ریڈیو قاہرہ کو اپنے اردو اور ہندی پروگرام کے لئے کچھ مترجمین اور اناؤنسروں کی ضرورت محسوس ہوئی معتبر ذرائع سے اس کا علم ہمیں بھی ہو گیا دوسروں کی طرح ہم لوگوں نے بھی قسمت آزمائی کی اور انٹرویو میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس طرح ہم تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ریڈیو قاہرہ پر بھی ترجمہ اور اناؤنسری کے فرائض انجام دینے لگے۔

حافظ صاحب نے قاہرہ میں نہایت منظم زندگی گزارنے کا اپنا معمول بنالیا تھا۔ ہر کام کے لئے ان کے یہاں وقت مقرر تھا۔ مصر کی قومی جنرل لائبریری جانا، محاضرات کے لئے کلیۃ پہونچنا، پھر ریڈیو اسٹیشن پہونچ کر اناؤنسری کے فرائض انجام دینا، یہ روزمرہ کا معمول تھا، ہاسٹل میں رات اور صبح سویرے کا وقت مطالعہ اور لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے، مطالعہ کے ساتھ ساتھ لکھنے کا عمل جاری رکھتے۔ کالیداس یا (اچھی طرح یاد نہیں) کسی اور تاریخی کتاب کا ایسا جامع ترجمہ کیا کہ ہندوستانی سفارت خانہ میں انفارمیشن سروس اور شعبہ ثقافتی امور سے نکلنے والا مجلہ ''صوت الشرق'' میں ترجمہ شائع ہوا ڈاکٹر صاحب نے مصر کی چند اہم شخصیات خاص کر محمود عباس العقاد اور طہٰ حسین کو اتنا پڑھا کہ ان کی زندگی کے گوناگوں پہلو کی باریکیاں تک ان کے دسترس سے باہر نہیں رہیں، کثرت مطالعہ کا ان پر نمایاں اثر یہ دیکھنے میں آیا کہ جب کسی موضوع پر گفتگو کرتے تو بڑے ہی سلیقہ مندی اور پروقار انداز میں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے۔ قاہرہ میں ہم تینوں (حافظ صاحب، حافظ عبدالعلی اور خاکسار) ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب ہو گئے اور ہمارے درمیان رفاقت، صداقت اور اخوت کا جو رشتہ تھا وہ مزید مستحکم ہو گیا۔ ہم میں سے ہر ایک دوسرے کا مستقل معاون و مددگار اور مونس و غم خوار بنا رہا۔ حافظ صاحب صبر و شکر کے مجسم پیکر تھے، ہمت و پامردی اور استقلال کی صفات ان کے اندر بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں، اس کا اندازہ صرف اس بات سے آپ لگا سکتے ہیں کہ قاہرہ پہونچنے کے بعد ''مدینۃ البعوث'' میں رہنے کے لئے جب ضروری کارروائی شروع ہوئی تو ہم سے میڈیکل کرانے کو کہا گیا، حافظ صاحب کے طبی معائنہ کے دوران ایکسرے میں ان کے ایک قدیم مرض کا تھوڑا بہت اثر دکھائی پڑا۔ پھر کیا تھا ڈاکٹر نے مرض کے اس اثر کو ختم کرنے کے لئے علاج کا طویل کورس لکھ دیا۔ ہاسٹل سے کچھ دور عباسیہ میں سینہ کے امراض ''مستوصف الصدر'' نامی ایک سینٹر تھا حافظ صاحب مستقل وہاں جاتے اور ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق پابندی کے ساتھ اپنا علاج کرتے رہے، دواؤں میں انجکشن بھی تھا، جسے ایک روز کے ناغہ سے میں مستقل لگاتا رہا، مئو میں ڈاکٹر چکرورتی (جو اس وقت کافی مشہور اور مقبول تھے) ہمارے فیملی ڈاکٹر تھے محترم والد صاحب کا علاج بڑی توجہ اور مستعدی سے کرتے تھے، انھوں نے مجھے انجکشن لگانا بھی سکھا دیا تھا، والد صاحب اور بعض دوسرے لوگوں کو انجکشن لگاتے لگاتے بہت حد تک مجھے اس کام میں مہارت ہو گئی تھی، یہی چیز قاہرہ میں حافظ صاحب کے علاج میں کام آئی۔ علاج میں حافظ صاحب کی پابندی اور مستقل مزاجی پر ہم تعجب کرتے، مگر وہ اپنی دھن کے پکے تھے، جو بھی کام شروع کرتے اسے تکمیل تک ضرور پہونچاتے، ان کی یہ مستقل مزاجی کام آئی۔ اور علاج کے کورس کی مدت ختم ہوتے ہوتے پوری طرح مرض کا ازالہ ہو گیا تھا، اور حافظ صاحب مکمل صحت یاب ہو چکے تھے۔ اس کے بعد حافظ صاحب بہت محتاط انداز میں زندگی گزارنے لگے، اور ان کا یہ

معمول زندگی کے آخری لمحہ تک برقرار رہا، عرق النساء کی بیماری میں جب وہ خود مبتلا ہوئے اور بڑی صاحبزادی بتول کی کڈنی خراب ہوگئی تو مت پوچھئے کہ علاج کے سلسلہ میں انھیں کتنی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا؟ مگر وہ برابر صبر وشکر کا مظاہرہ کرتے رہے، اور اپنی پریشانی کے متعلق کسی سے کچھ کہنا اپنے وقار کے خلاف سمجھا، ۱۹۶۷ء میں جب حافظ صاحب نے وطن واپسی کا فیصلہ کیا تو ہم دونوں ذرا پریشان ہوئے مگر ہنستے، مسکراتے سفر کی تیاریوں میں ان کا ساتھ دیتے رہے۔ آخرکار جب تیاری مکمل ہوگئی اور سفر کی گھڑی آن پہونچی تو نمناک آنکھوں سے قاہرہ ایرپورٹ پر ہم نے حافظ صاحب کو الوداع کہا، ایرپورٹ سے واپسی کے بعد میں کئی روز تک اندرونی طور پر بہت مضطرب اور پریشان رہا۔ اور یہ سوچ سوچ کر میری فکر میں اضافہ ہوتا رہا کہ جب حافظ صاحب تنہا گھر پہونچیں گے تو میرے اہل خانہ خاص کر میرے اہل وعیال کیا کہیں گے؟

حافظ صاحب کے ہندوستان پہونچتے ہی مرکزی دارالعلوم بنارس کے ذمہ داروں کو یہ معلوم ہوگیا کہ حافظ مقتدیٰ حسن ازہر سے اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس آ گئے ہیں تو تاخیر کئے بغیر ان لوگوں نے حافظ صاحب سے فوراً رابطہ کیا اور انھیں دارالعلوم میں درس وتدریس کی خدمات کے لئے راضی کرلیا، دارالعلوم کے ناظم اعلیٰ محترم مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ بڑے دوراندیش اور اعلیٰ اخلاق وکردار کے مالک تھے، وہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور انتظامی امور میں غیر معمولی صلاحیت کے باعث صحیح معنی میں دارالعلوم جیسے عظیم تعلیمی ادارہ کی نظامت کے مستحق تھے، جناب ناظم صاحب اور حافظ مقتدیٰ حسن کے خیالات میں بڑی یکسانیت ویگانگت تھی، دونوں ہی دارالعلوم کے نظام اور اس کے تعلیمی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کا جذبہ رکھتے تھے، دونوں کی فکر مثبت اور جذبات وخیالات تعمیری تھے، اس لئے یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہوگئے، ناظم صاحب کے خلوص ومحبت سے حافظ صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے دارالعلوم کی خدمات کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیا، دارالعلوم کی تعمیر وترقی اور تعلیمی معیار کو اعلیٰ مقام تک پہونچانے کے لئے رات دن کام کرنے لگے، دیگر اساتذۂ کرام کے باہمی تعاون سے طلبہ کے دلوں میں تفسیر وحدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کی غیر معمولی رغبت پیدا کردی۔ طلبہ بڑی مہارت اور خود اعتمادی کے ساتھ عربی بولنے اور لکھنے لگے، بعد میں وہ جہاں کہیں بھی گئے انھیں علمی میدان میں امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ جامعہ اور جماعت کے مفاد کے لئے اور زیادہ یکسوئی کے ساتھ کام کرنے لگے، حافظ صاحب کے وطن واپسی کے بعد میں بھی سعودی عرب چلا گیا اور پھر برادرم حافظ عبدالعلی نائیجیریا روانہ ہوگئے، اور کانو کی ایک عظیم یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دینے لگے، قاہرہ میں نہایت قیمتی کتابوں کا ہمارا ایک بڑا سرمایہ تھا، جسے ہم ہندوستان منتقل نہ کرسکے اور یہ قیمتی سرمایہ (جو کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھا ہوا تھا) ضائع ہوگیا، جس کا ہم دونوں کو کافی افسوس ہوا۔

سالانہ چھٹی میں جب ہم مئو آتے تو حافظ صاحب سے ملاقات ہوتی بلکہ چھٹی کے مختصر ایام میں متعدد بار ہم ایک دوسرے سے مئو یا بنارس میں ملتے، نجی معاملات کے ساتھ ساتھ جماعت، مدارس اور حالات حاضرہ کے کسی اہم موضوع پر گفتگو ہوتی۔ سعودی عرب سے بھی ہماری مراسلت کا سلسلہ جاری رہا، اور ہم نے ایک دوسرے کو اتنے

خطوط لکھے کہ اگر انھیں جمع کردیا جائے تو ایک ضخیم دستاویزی کتاب تیار ہوجائے، سعودی عرب سے جب میں مستقل طور پر گھر واپس آ گیا تو ہماری ملاقات بہت آسان ہوگئی اور اکثر وبیشتر ہم ایک دوسرے سے ملنے لگے۔

حافظ صاحب! مسلم معاشرہ میں لگاتار بڑھتی ہوئی بے راہ روی، انارکی، دین بیزاری اور طرح طرح کی برائیوں کی طرف سے بڑے فکر مند رہتے، منظم طریقہ سے کسی موثر اصلاحی کوشش نہ ہونے سے اور بھی رنجیدہ ہوتے، وہ معاشرہ کی اصلاح اور عوام وخواص میں دینی بیداری پیدا کرنے کے لئے خود کام کرنا اور دوسروں کو کام کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے خاکسار کے غریب خانہ پر محلّہ کے علماء کی ایک میٹنگ بلائی، جس میں حاضرین مجلس کو اپنے دین اور معاشرہ سے متعلق ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور لوگوں کی دین بیزاری ختم کرنے کے لئے باہم مل جل کر کام کرنے کی ترغیب دی، میٹنگ میں حاضرین کی تعداد اچھی خاصی تھی، سبھی لوگوں نے اصلاح معاشرہ اور دینی بیداری کے لئے باقاعدہ تحریک کی ضرورت سے اتفاق کیا اور اس میدان میں کام کرنے پر آمادگی بھی ظاہر کی، تحریک کے مطابق کام شروع ہوا، اور شہر کی مسجدوں میں یہ اصلاحی اور دعوتی پروگرام ہونے لگے، حافظ صاحب اگر مئو میں رہتے تو وہ بھی پروگرام میں ضرور شریک ہوتے ان پروگراموں کے مثبت اور مفید نتائج سے ہمیں بڑا حوصلہ ملا، بعد میں یہی تحریک "مجلس ندائے وقت" کے نام سے اس طرح مشہور اور مقبول ہوئی کہ لوگوں کو اس کے سالانہ پروگرام کا شدت سے انتظار رہتا، مجلس کے سالانہ اجلاس میں حافظ صاحب اور ڈاکٹر عبدالعلی ازہری ضرور شریک ہوتے، پروگرام کے موضوع کے لحاظ سے مئو اور بیرون مئو کی مشہور ہستیوں کو بھی بلاتفریق مذہب وملت مدعو کیا جاتا۔

مجھے یاد ہے کہ حافظ صاحب نے ایک موقع پر اپنی فراست کی بناپر مجلس کے کارکنوں میں بکھراؤ پیدا ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، آج آپ کا اندیشہ ایک حقیقت بن کر سامنے آ گیا، حافظ صاحب کی حیات مستعار ختم ہوتے ہی مجلس کی پالیسی بدل گئی، کام کرنے والوں کے موقف بدل گئے اور ان کے کام کرنے کے انداز بدل گئے اور حکم الاکثر حکم الکل کے فارمولہ پر عمل ہونے لگا۔

مجلس کے لئے میری کچھ قربانیاں تھیں لیکن اسے یکسر نظر انداز کر کے ناقدری کی عجیب طرح ڈال دی گئی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔

حافظ صاحب کو درس وتدریس میں بڑا ملکہ حاصل تھا، تربیت کا بھی خاص خیال رکھتے اور طلبہ کو زیادہ سے زیادہ علمی فیض پہونچانے کی کوشش کرتے، تعلیم وتربیت کے علاوہ وہ مصلح ومفکر بھی تھے، اور بہترین صحافی وادیب بھی، اور ہر ایک میدان میں ان کے کام بھی نمایاں ہیں، ان کے یہاں وقت کی بڑی اہمیت اور قیمت تھی، وہ وقت کو اغلی من الذھب سمجھ کر اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے، ایک منٹ بھی بیکار ضائع ہوجاتا تو انھیں افسوس ہوتا۔ وہ ہمہ وقت کام کرتے رہنے کے خوگر تھے، بیماری میں بھی بیکار بیٹھنا انھیں گوارہ نہیں تھا، وہ چند روز بیمار رہ کر اس دار فانی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے رب سے جاملے۔

غفر الله له وتغمده بواسع رحمته وأسكنه في فسيح جناته۔ آمین

☆☆☆

شیخ صلاح الدین مقبول احمد
الجهراء، كويت

شيخنا الدكتور مقتدىٰ حسن الأزهرى رحمه الله
فى سطور

ولادته ونشأته:

مدينة "مئو نات بهنجن" (من ولاية "يوبى" الهند) معروفة منذ قرون بصناعة النسيج من جانب، وبكونها مركزا للعلم، وموطنا للعلماء من جانب آخر۔

وهى تتميز -فى نظرى- بميزة، لاتوجد فى غيرها من مدن الهند، وهى:

احتضانها لثلاث مدارس سلفية كبيرة: (الجامعة العالية العربية، والجامعة الإسلامية -فيض عام- والجامعة الأثرية دار الحديث) تخرج فيها منذ نشأتها ألوف الطلبة، الوافدين إليها من مختلف ولايات الهند، ثم رجعوا إليها دعاة مهتدين، عاملين فى مجال التعليم والتربية، والدعوة والإرشاد، والتصنيف والتأليف، وكان العديد من شيوخنا فى المراحل الدراسية المختلفة فى الهند، من خريجى هذه المدارس:

﴿فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلاً﴾ [الأحزاب:٢٣]

فى هذه المدينة العلمية والصناعية، وفى أسرة سلفية محافظة، ولد الدكتور مقتدى حسن بن محمد ياسين بن محمد سعيد، فى الثامن من شهر أغسطس ١٩٣٩م ونشأ فيها وترعرع بين العلماء على حب العلم والدين۔

مراحله الدراسية وشهاداته العلمية:

بدأ فى الدراسة بداية مباركة، فحصل على شهادة حفظ القرآن الكريم من مدرسة دار العلوم بمئو، فرع "مرزاهادى فوره" سنة ١٩٥٣م۔

ثم أكمل مراحله الدراسية المختلفة فى المدارس السلفية بمئو، وحصل على شهادة "الثانوية" من الجامعة العالية العربية سنة ١٩٥٩م، وتخرج فى الجامعة الأثرية۔ دارالحديث- سنة ١٩٦٢م

وحصل على شهادات (مولوى، وعالم، وفاضل) الرسمية، من الهيئة التعليمية فى حكومة "يو.بى" أيضا، فى الفترة مابين سنة ١٩٥٩-١٩٦٢م

ولمواصلة دراسته العليا رحل إلى مصر، والتحق بجامعة الأزهر، وحصل على شهادة

(١) مصادر ترجمته:

- معلومات شخصية عن الدكتور مقتدى حسن الأزهرى
- جهود مخلصة فى خدمة السنة المطهرة: للدكتور عبدالرحمن الفريوائى (٢٧٣-٢٧٧)
- علوم الحديث (مطالعة وتعارف): إشراف الشيخ عبدالمعيد المدنى (١٥-١٦)

الماجستير من كلية أصول الدين سنة ١٩٦٦م، وسجل "الدكتوراه" ولكنه لم يتمكن من مواصلة الدراسة هناك، فرجع إلى الهند.

ثم حدا به الشوق -أيام تدريسه بالجامعة السلفية- إلى إكمال دراسته العليا، فحصل على شهادة (ايم، فل) سنة ١٩٧٢م، ثم على شهادة "الدكتوراه" في الأدب العربي سنة ١٩٧٥م من جامعة على كره الإسلامية بالهند، ومن الجامعة نفسها حصل على شهادة الثانوية في اللغة الإنجليزية سنة ١٩٧١م، وعلى شهادة الكلية المتوسطة في الانجليزية سنة ١٩٧٣م

وبهذا انتهى مشواره الدراسي الطويل، وإن دل هذا على شئ، فإنما يدل على نهمته العلمية، وهمته العالية في الطلب، وجهده المتواصل الدؤوب لتكوين شخصيته العلمية.

ومن شيوخه الكبار في مراحله الدراسية المختلفة:

"الشيخ عبدالعلى، والشيخ عبدالمعيد، والشيخ عبدالرحمن، والشيخ حبيب الرحمن الفيضي، والشيخ عظيم الله، والشيخ عبدالله شائق، والشيخ أبوالقاسم الفيضي، والشيخ شمس الحق السلفي، والدكتور على عبدالواحد وافي، والدكتور شوقي ضيف وغيرهم، أحسن الله لهم الجزاء".

وروده إلى الجامعة السلفية:

انضم إلى هيئة التدريس بالجامعة السلفية (بنارس – الهند) سنة ١٣٨٧هـ =١٩٦٨م، فتفرس فيه أمينها العام الاول: الشيخ الفاضل عبدالوحيد بن عبدالحق السلفي (١) النبوغ والكفاءة، والهمة والإرادة، مع التنظيم والإدارة،

(١) هو: الشيخ الجليل والفاضل النبيل: عبدالوحيد بن عبدالحق بن عبدالرحمن السلفي (١٩٢٤- ١٩٨٩م) انحدر من أسرة سلفية ثرية في مدينة بنارس معروفة بتجارة الحرير على مستوى الهند.

هذه هي الأسرة الكريمة التي كانت تشرف على "الجامعة الرحمانية" (بنارس) ثم تولت أيضاً تأسيس "الجامعة السلفية" في بنارس سنة ١٩٦٣م، تحت إشراف جمعية أهل الحديث لعموم الهند، فاختير أول أمين عام لها، وبقي على منصبه حتى وفاته.

وقد تولى الشيخ منصب الأمين العام للجامعة الرحمانية من (١٩٦٠-١٩٦٦م) ثم للجامعة السلفية ايضاً من ١٩٦٣-١٩٨٩م)

وكذلك تولى منصب الأمير لجمعية أهل الحديث لعموم الهند من (١٩٧٩-١٩٨٩م)

وقد شارك في المؤتمرات الإسلامية، والندوات العلمية في داخل الهند وخارجها، وعقد هو كذلك عدة مؤتمرات وندوات تحت إشراف الجامعة السلفية وجمعية أهل الحديث.

وكان الشيخ عبدالوحيد ذا أرومة كريمة، وجيها ذاهيبة ووقار، شفوقا عادلا في تقييم الأمور، وأولا واخيرا أنه كان إداريا محنكا، أولى اهتمامه البالغ بتطوير الجامعة السلفية في عهده، حتى احتلت مكانة مرموقة بين مدارس شبه القارة الهندية، ونالت شهرة عالمية، لتميزها بمنهجها الدراسي المؤسس على الكتاب والسنة وفق فهم السلف الصالح.

ولاريب أن الفضل في ذلك يرجع -بعد الله عزوجل- إلى هذا الشيخ الجليل، وإلى مستشاريه المخلصين: أمثال شيخنا الأستاذ عبدالوحيد بن أبي القاسم الرحماني (شيخ الجامعة سابقا) وشيخنا الدكتور مقتدى حسن فجزاهم الله خير ما يجازى به عباده الصالحين.

وبعد الشيخ عبد الوحيد السلفي تولى منصب الأمين العام للجامعة السلفية، عالم هذه الأسرة الكريمة، الأخ الفاضل النابه الشيخ: شاهد جنيد السلفي حفظه الله فقام بواجباته تجاهها خير قيام.

ثم جاء دور زميلنا الفاضل، الأمين العام الحالي للجامعة، الأخ الشيخ: عبدالله سعود بن عبد الوحيد السلفي حفظه الله = = =

فاختاره وكيل الجامعة السلفية، وجعله رئيس تحرير مجلتها "صوت الأمة" (الآن) منذ إنشائها ١٩٦٩م وفوض إليه الإشراف على "إدارة البحوث الإسلامية" التي بلغت إصداراتها حتى الآن، أكثر من أربع مائة كتاب، مابين صغير وكبير ومجلدات، في العربية والأردية والهندية والإنجليزية، وكتب الدكتور على أغلب هذه الكتب مقدمات نفيسة تحت عنوان "كلمة الناشر"۔

إنتاجاته العلمية:

في ميدان الصحافة: كان يستمر بكتابة "الافتتاحية" لمجلة "صوت الأمة" بنارس الهند منذ نشأتها سنة ١٩٦٩م، وغيرها من المقالات في الجرائد والمجلات، التي بلغ عددها زهاء خمسمائة مقال في العربية والاردية۔

- **في ميدان التاليف: الف كتبا كثيرة، من أهمها:**

- تاريخ الادب العربي (بالاردية) (خمسة أجزاء)
- موقف الإسلام من المرأة (بالأردية)
- حقيقة الأدب ووظيفته (بالأردية)
- الثقافة الإسلامية والمسلمون
- مسئولية الشباب المسلم في العصر الحاضر
مشكلة المسجد البابري في ضوء التاريخ والكتابات المعاصرة

- **في ميدان الترجمة: نقل كتبا كثيرة من العربية إلى الأردية، من أهمها:**

- اقتضاء الصراط المستقيم: لشيخ الإسلام ابن تيمية.
- مختصر زاد المعاد: لإمام الدعوة محمد بن عبدالوهاب.
- إصلاح المساجد: للشيخ جمال الدين القاسمي.
- ويقوم باختصار فتاوى شيخ الإسلام ابن تيمية باللغة الأردية.

- **ونقل كتبا كثيرة إلى العربية، منها:**

- قرة العينين في تفضيل الشيخين (بالفارسية) للشاه ولي الله الدهلوي.
- رحمة للعالمين (في سيرة الرسول الامين) (بالاردية) للقاضي محمد سليمان المنصور فوري (ثلاثة اجزاء)
- حركة الانطلاق الفكري وجهود الشاه ولي الله في التجديد (بالاردية) للشيخ محمد إسماعيل السلفي.
- حجية الحديث الشريف (بالاردية) له أيضا۔

تلامذته:

زاول التدريس في الجامعة الإسلامية (فيض عام) بمئو سنتين من (١٩٦٠- ١٩٦٢م) وذلك قبل التحاقه بجامعة الأزهر بالقاهرة.

== = (وهو ابن الامين العام الاول) وهو يبذل جهده لخدمة هذا الصرح العلمي العظيم، الذي يعتبر منار السلفية في الهند، عند العلماء الثقات من العالم الإسلامي۔

ومن هذا المكان البعيد أبث دعائي لأخي الشيخ عبدالله سعود، أن يوفقه الله تعالىٰ لبذل المزيد من جهده المبارك، ووقته الثمين، لتطوير الجامعة، حتى ترقى في مجال التعليم والتربية على مستوى العصر، وأن يجعله "خير خلف لخير سلف"۔ وأقول أخيرا- لا آخرا- : "إن الخير من معدنه لا يستغرب"

ودرس مادة الأدب العربى فى جامعة على كره الإسلامية، لمدة سنة، وذلك أثناء إقامته هناك للحصول على شهادة "الدكتوراه"۔

وقام بالتدريس بالجامعة السلفية منذ (١٣٨٧هـ=١٩٦٨م) وقد درس عليه أغلب من التحق بها من الطلبة وهم ألوف، وينتشرون فى داخل الهند وخارجها، ويقومون بواجب التعليم والتربية، والدعوة والإرشاد، والإفتاء والإفادة، والإمامة والخطابة، والتأليف والترجمة، والبحث والتحقيق۔

فهو كان أستاذ الأساتذة حقا، وها أنا كاتب هذه السطور (صلاح الدين مقبول احمد) تلمذت عليه، بدأت الكتابة باللغة العربية تحت إشرافه (١)

عضويته للمجالس والهيئات والجمعيات:

شارك فى كثير من المؤتمرات الإسلامية، والندوات العلمية فى داخل الهند وخارجها، ببحوثه ودراساته، وكذلك أسهم فى عقد كثير من المؤتمرات والندوات والمواسم فى رحاب الجامعة السلفية (بنارس، الهند)

وزد إلى ذلك أنه اختير عضوا لعديد من المجالس العلمية، والهيئات الإسلامية، والجمعيات الأدبية والثقافية، منها:

- مجلس جامعة على كره الإسلامية بالهند۔
- هيئة الأحوال الشخصية الإسلامية لعموم الهند
- المجلس التنفيذى لجمعية أهل الحديث المركزية بالهند۔
- رابطة الأدب الإسلامى بالهند
- جمعية المثقفين للتوعية الإسلامية بالهند۔
- الجمعية التعليمية للجامعة المحمدية فى ممباى۔

هذا وهو كان يرأس تحرير مجلة 'صوت الأمة" ويشرف على "إدارة البحوث الإسلامية" بالجامعة السلفية" وقد كان وكيل الجامعة ورئيسها۔

أخيرا-لا آخرا-:

إنه يحتل مكانة مرموقة بين الكتاب والأدباء فى شبه القارة الهندية، ويفوق أقرانه فى كثرة الكتابات حول المناسبات الإسلامية والثقافية والأدبية، وله تجربة طويلة فى مجال الصحافة والتحرير، والترجمة والتاليف، وهو معروف بيننا بتنظيم جهده، واستثمار وقته فى النافع المفيد۔ عسى الله ان يتقبله قبولا حسنا۔



(١) هو من شيوخى الفضلاء فى الجامعة السلفية، الذين لهم أثر بالغ فى تعيين اتجاهاتى العلمية والدعوية. كنت أدعو الله تعالى -وانا طالب- أن اكون خادما لهذه الجامعة الحبيبة التى قضيت فى رحابها زهاء ثمانى سنوات، من أى موقع كان، وقد تحقق لى ذلك- والحمدلله- بقيت هناك بعد التخرج فيها نحو سنة ونصف سنة، أنتظر التحاقى بالجامعة الإسلامية بالمدينة الطيبة، وأخدم المكتبة العامة لها، وأشم عبيرها وأزيجها، وأكتب فى مجلتها خول أعلام السلفين فى الهند، تحت عنوان "شخصية فى سطور" وكل ذلك تيسر لى -بعد فضل الله ومنه- بعناية شيخنا الدكتور مقتدى حسن رحمه الله، وبموافقة الأمين العام للجامعة السلفية حينذاك: الشيخ الفاضل النبيل: عبدالوحيد بن عبدالحق السلفى- رحمه الله تعالى- فلا أنسى كريم فضلهما أبداً۔

ابن افضال عالیؔ

ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری کی ادبیات شناسی

ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری (۱۹۳۹۔۲۰۰۹) بنیادی طور پر عربی کے اسکالر تھے اور ان کی اسکالرشپ کا دائرہ دینیات اور ادبیات کے ساتھ صحافت تک پھیلا ہوا ہے۔ دین، ادب اور صحافت کے باہمی تعلقات اور دائرۂ عمل کے بارے میں اہل علم کے خیالات الگ الگ ہیں۔ ازہری صاحب نے ادب وصحافت دونوں کو دین کی تفہیم اور تبلیغ کے لیے استعمال کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے دین کے مختلف پہلوؤں پر لکھا اور خوب لکھا، صحافت سے تو خیر ان کا پیشہ ورانہ تعلق تھا، دو چار دس سال نہیں مکمل چار دہائی تک اور وہ بھی عربی صحافت سے جو ہندستان میں کچھ زیادہ ہی پتہ ماری اور جگر کاوی کا کام ہے۔ ان کے انتاجات میں ادبی سرمایہ کم وکیف دونوں لحاظ سے اتنا اہم ہے کہ اس پر بغیر کسی تکلف کے گفتگو کی جا سکتی ہے۔

ازہری صاحب کی تعلیم ان کے شہر، مئو ناتھ بھنجن (یو۔ پی) میں ہوئی جہاں ان سے سینیر علماء کی اکثریت دین ودعوت کے مشن سے وابستہ تھی اور ادب کا عمدہ ذوق بھی رکھتی تھی، بعض علماء تو ایک سے زیادہ زبانوں میں شعر بھی کہتے تھے۔ انھوں نے خود ابتدا میں شعر گوئی کی طرف بھی توجہ دی اور فضا ابن فیضی سے اصلاح بھی لی۔ اعلی تعلیم کے لیے قاہرہ اور علی گڑھ گئے جہاں کی دانش گاہوں نے ان کی ادبی فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے کے ساتھ ان کے ثقافتی کینوس کو وسعت بھی عطا کی۔ قاہرہ میں قیام کے دوران ان کو مشہور عربی ادیب اور ناقد ڈاکٹر شوقی ضیف سے تھوڑا بہت استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ جدید عربی ادب کی شخصیات ور جحانات سے ان کی پہلی پہلی شناسائی یہیں ہوئی، کیوں کہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں مئو کے مدارس میں عربی ادب کے نام پر معلقات ومقامات ہی کی تعلیم ہوتی تھی اور اب بھی جدید عربی ادب کا قابل ذکر حصہ شامل نصاب نہیں ہوسکا ہے۔ جامعہ ازہر میں ان کا میدان اور موضوع دینیات تھا تاہم دلچسپی اور ذاتی مطالعے کی وجہ سے عربی ادبیات میں بھی کمال پیدا کر لیا۔ قاہرہ سے واپس آنے کے بعد جامعہ سلفیہ بنارس سے منسلک ہو گئے اور پھر ریسرچ کرنے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے، علی گڑھ میں ان کا قیام مختصر لیکن با ثمر رہا۔ ان کے ایم۔ فل کے ڈزرٹیشن کا موضوع تھا" منصور الفقیہ۔ حیاته و شعره" اور حافظ ابن عبدالبر القرطبی کی کتاب "بهجة المجالس" (حصہ دوم) کی تحقیق پر ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ان کے سپروائزر علامہ عبدالعزیز میمنی کے شاگرد، پروفیسر مختارالدین احمد آرزو تھے۔ اس دوران مذکورہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں عربی زبان وادب کی تدریس کا موقع بھی ملا اور دوسری علمی، ادبی ا

ر ثقافتی سرگرمیاں بھی جاری رہیں، جن کا ذکر اپنے ایک عربی مضمون میں کچھ یوں کرتے ہیں:

''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں عربی ادب اور اسلامیات کے شعبے سے وابستہ ریسرچ اسکالرس نے ایک عربی انجمن قائم کی جس کا بنیادی مقصد عربی زبان کی تعمیم اور ادبی ذوق کو بالیدگی عطا کرنا تھا اور عربی زبان و ادب سے وابستہ اسکالرس کے اندر نشاط و تازگی پیدا کرنے کے ساتھ جدید اور بہترین اسلوب میں عربی لکھنے کی مشق بھی ۔انجمن کے باقاعدہ اجلاس منعقد ہوتے تھے جن میں مذکورہ شعبے کے اساتذہ بھی عربی زبان میں پیش کئے جانے والے علمی اور ادبی مقالات کو سنتے اور بحث میں حصہ لیتے تھے،بعض عرب اساتذہ نے پروگرام میں شرکت فرما کر، ادبی وثقافتی موضوعات پر مقالے پیش کر کے اور اپنی آراء و ملاحظات کے ذریعے انجمن کے مقصد کے حصول میں مدد کی جس سے شرکت کرنے والوں کو بھی فائدہ پہنچا، مجھ کو بھی متعدد اجتماعات میں شریک ہونے اور مقالات پیش کرنے کا موقع ملا جن میں سے ایک کا عنوان تھا،مستقبل اللغة العربية في الهند''۔(۱)

ازہری صاحب افادی ادب کے قائل تھے اور ادب کی مقصدیت پر ان کا اصرار تھا۔ دین اور ادب کے حوالے سے ان کے خیالات '' حقيقة الادب و وظيفته في ضوء تصريحات الا دباء و النقاد'' (جامعہ سلفیہ بنارس ۱۹۹۰) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ چار کم سو صفحات پر مشتمل اس مختصر رسالے کا اسلوب دفاعی ہے اور اس میں '' در جواب آں غزل'' کی کیفیت ہے۔ مذکورہ کتاب میں انھوں نے مغرب و مشرق کے نامور ادیبوں کی تحریروں کے اقتباسات پیش کر کے اپنے دعوے کو تقویت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ادب کے دائرے اور تقاضے کے حوالے سے دوہرے معیار کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

''بہت سے لوگ ادب کی دین سے نسبت پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں،ان کا خیال ہے کہ ادب کا دائرہ دین کے دائرے سے وسیع تر ہے اور ادب کو دینی مقصد کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور نہ دین کے تقاضے کو ادب کے ذریعے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو مغربی ادب کو مثالی ادب قرار دیتے ہوئے مشرقی ادیبوں کو اس کی تقلید کی تلقین کرتے ہیں، حالانکہ مغربی ادب کو ماضی میں دینی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا گیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔مغربی ممالک کے ادیبوں نے عیسائیت کے فروغ اور تحفظ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔(۲)

ادب کے مفہوم کی وضاحت اور ادب پارے کی تخصیص میں ملک اور مذہب کی بنیاد پر پائی جانے والی تفریق کے پس منظر میں یہ سوال اہم ہے۔''عیسائی مصنفوں کی تحریروں میں رذائل کے خلاف کھلی جنگ نظر آتی ہے تاہم یہ کتابیں اہم ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اسلام انھیں برائیوں کے خلاف گزشتہ چودہ صدی سے برسرپیکار ہے لیکن اس موضوع سے متعلق تصانیف کو ادب تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔''(۳)

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، (رئیس التحریر) صوت الجامعة، جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ، جامعہ سلفیہ، بنارس، ص ۶

(۲) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، حقيقة الادب و وظيفته في ضوء تصريحات الا دباء و النقاد، جامعہ سلفیہ، بنارس، ۱۹۹۰، ص ۴۳

(۳) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، حقيقة الادب و وظيفته في ضوء تصريحات الا دباء و النقاد، جامعہ سلفیہ، بنارس، ۱۹۹۰، ص ۲۲

یہ تو ثقافتی استعمار ہے، مشہور فلسطینی دانشور ایڈورڈ سعید کی تحریروں میں اس پر علمی بحث موجود ہے۔ ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے انھوں نے اعلی ادب کی تخصیص کردی ہے اور ان کے مذکورہ بالا خیالات سے کلی یا جزوی اتفاق کے باوجود اعلی ادب کے بارے میں ان کی اس رائے سے مکمل اتفاق مشکل ہے۔ ''موجودہ زمانے میں رائج تنقیدی نظریے کے برخلاف حقیقت میں ناصحانہ اور معلمانہ ادب ہی اعلیٰ ادب ہے۔تفریحی ادب اور ادب برائے ادب خالی خولی کھلونا ہے جس کے اندر روح ہے نہ زندگی کی حرارت اور مقصد'' (۱)

مذکورہ اقتباس میں دو اصطلاحات کا استعمال ہوا ہے ناصحانہ ادب اور تفریحی ادب جس کی تشریح تو انھوں نے خود نہیں کی ہے تاہم ان کے خیالات سے واقفیت کے بعد ان کو سمجھنے کے لئے ذہنی توانائی صرف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔لیکن ''ہی'' لفظ کا استعمال کر کے بحث کا دروازہ تقریباً بند کردیا ہے جو دین اور ادب دونوں کی صحت کے لئے مفید نہیں۔ادب کی موجودہ صورت حال کے پس منظر میں ان کا یہ مشورہ ان کی ادبی فکر اور ان کے نزدیک ادب کے دائرے اور تقاضے کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔

'' یہ رجحان ادب اسلامی کے علمبرداروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ ادب کی تعریف اور ان معروف قدیم ادیبوں کی تحریروں کو سامنے لانے کی کوشش کریں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اخلاق اور دین کی خدمات انجام دی ہیں اور ان کے انتاجات میں جودت اور ابتکار بھی ہے۔اس ضمن میں ان نقادوں کے شبہات کو رد کرنے کی ضرورت ہے جن کا خیال ہے کہ ادب کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے۔(۲)

مذکورہ بالا اقتباسات سے ازہری صاحب کی ادبی فکر اور ان کے نزدیک ادب کا دائرہ دونوں واضح ہوگیا ہے، رہا ان کی ادب شناسی کا سوال تو اس کو جاننے کے لئے ہمارے پاس جو مواد ہیں ان میں مختصر تاریخ ادب عربی کی پانچ جلدوں کے علاوہ مختلف جرائد ومجلات جیسے صوت الجامعة (بنارس) مجلة المجمع العلمی الهندی (علی گڑھ) برہان (دہلی) معارف (اعظم گڑھ) دعوت (دہلی) وغیرہ میں شائع ان کے مضامین ومقالات ہیں جن میں انھوں نے عربی ادب کی متنوع اور ممتاز شخصیات کے فکر وفن پہ لکھا ہے۔''مختصر تاریخ ادب عربی'' ان کی مستقل تصنیف ہے اور اس کی تالیف میں مصنف نے سب سے زیادہ ڈاکٹر شوقی ضیف کی کتاب سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کے ساتھ دوسری اہم کتابوں سے استفادہ کر کے کتاب کو مفید سے مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے۔

''مجھ کو علمی و ادبی نشاط سے معمور قاہرہ جیسے شہر میں چار سال قیام کرنے کا موقع ملا اور اس دوران تاریخ ادب عربی کے نفیس مراجع تک رسائی ہوئی تو اس میدان میں کمی کا احساس ہوا۔ہندستان واپسی کے بعد جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے استفادہ کرنے اور وہاں تدریسی خدمات انجام دینے کا موقع ملا تو اس دوران یہ احساس شدید تر ہوگیا کہ اس موضوع پر طلبہ کے لئے اردو زبان میں ایک کتاب کی ضرورت ہے۔اس وقت احمد حسن الزیات کی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو چکا تھا لیکن میں نے اپنی کتاب

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، حقیقة الادب و وظیفته فی ضوء تصریحات الا دباء و النقاد، جامعہ سلفیہ، بنارس، ۱۹۹۰، ص ۳۸

(۲) ایضاً: ص ۵۸

کے لئے ڈاکٹر شوقی ضیف کی کتاب کو نمونہ بنایا کیونکہ ابھی تک اس موضوع پر جو کتابیں آئی ہیں ان میں یہ سب سے اچھی ہے، مجھے قاہرہ یونیورسٹی میں ایم اے سال اول کے دوران ان سے استفادہ کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔'' (۱)

ادب کی تاریخ صرف تخلیق اور تخلیق کار کا سپاٹ بیانیہ نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں سماجی پس منظر، سیاسی عوامل اور اس عہد کی مجموعی صورت حال کی داستان بھی ہوتی ہے جس میں ادب پارہ جنم لیتا ہے۔ ازہری صاحب نے اس کتاب میں ہر عہد کے سیاسی نظام اور معاشرتی اقدار کو اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے ادبی صورت حال کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مثبت تبدیلیوں کے ساتھ سماج میں جاری سیاسی چپقلش، اقتدار کی رسہ کشی، علاقائی امتیاز اور نسلی تفاخر کی تصویر بھی پیش کی ہے اور دولت و ثروت کی بہتات نے معاشرہ کو کن حالات سے دوچار کیا اور ان کے اثرات ادب پر کیا پڑے؟ یہ تمام مسائل و موضوعات اس کتاب میں موجود ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ جو جاہلی دور سے بحث کرتا ہے اس میں اس خطے کی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور دینی صورت حال کے ساتھ ادبی منظرنامے کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ اسلامی عہد پر مشتمل ہے جو آغاز اسلام سے بنو امیہ کے عہد حکومت کے ادبی تاریخ سے بحث کرتا ہے۔ اسلام نے انسانی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کے ساتھ ادب و ثقافت میں کیا اضافہ کیا، قرآن کے نزول اور اس کے ادبی و بلاغی اعجاز نے عربی ادب کے دامن کو کتنی وسعت عطا کی، حدیث نبوی کے وسیع ذخیرے نے عربی زبان کو کتنے نئے نئے الفاظ و اصطلاحات سے واقف کرایا، اس عہد کے دوران عربی زبان و ادب میں افکار، الفاظ اور اصناف کی سطح پر کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں، مصنف نے ان تمام موضوعات پر سلیقے سے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

عباسی دور کو عربی ادب کا عہد زریں کہا جاتا ہے اور یہ کچھ بیجا بھی نہیں ہے کیوں کہ عربی زبان و ادب کے کئی اہم اور معتبر نام اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعر و ادب کے ساتھ اسلامی علوم میں بھی جدت کا انداز نظر آتا ہے۔ کہیں عقلیات کی موج تند جولاں نے پورے دینی نظام پر ضرب لگانے کی کوشش کی تو کہیں الٰہیات کے تراشے ہوئے لات و منات نے دین کو چیستان بنا کر رکھ دیا لیکن اسی کے متوازی علم و دانش کی ایک اور لہر چل رہی تھی جس نے مثبت انداز میں اسلامی علوم کی نشر و اشاعت کی اور اسلامی علوم و افکار کو ہر قسم کے افراط و تفریط سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ اس سماج میں فکری سطح پر جو بوقلمونی تھی ادب میں اس کا بھرپور انعکاس نظر آتا ہے۔ شاعری کے موضوعات میں جدت، قدیم موضوعات کو نئے انداز سے برتنے کی مثالیں اور اصناف میں تنوع کے ساتھ اوزان و قوافی میں بھی جدت کا رنگ جھلکتا ہے۔ نثر اور اسالیب نثر کے ارتقاء پر اچھی بحث ہے، مصنف نے شعر و نثر کے میدان میں ہو رہے تطورات کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کی کچھ شاخوں جیسے موسیقی اور غناء وغیرہ کی صورت حال کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس سے تخلیقی سطح پر تنوع نظر آتا ہے۔ شعراء کے حالات زندگی بیان کرتے وقت ان واقعات و حوادث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے

(۱) پروفیسر نثار احمد فاروقی (رئیس التحریر) ثقافۃ الھند، انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز، دہلی ۱۹۹۱ء ص ۵۲

شخصیت اور شاعری کی تفہیم میں آسانی ہوتی ہے۔ انھوں نے ادبی تخلیقات کا انتخاب اس انداز سے کیا ہے کہ اس سے اس عہد کے ادبی رجحانات اور عہد بہ عہد ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ نمونۂ کلام کے انتخاب میں مصنف کی دقت نظر جھلکتی ہے اور ان کی ادبیات شناسی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب کی جامعیت، ایجاز اور شگفتگی پوری کتاب میں جلوہ گر ہے۔ یہ کہنا شاید قرین انصاف نہیں ہوگا کہ انھوں نے اس کتاب میں عربی ادب کی تاریخ کو اپنے مخصوص نظریے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ انھوں نے اپنے تاثرات اور تبصرے میں ادب کے افادی پہلو کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ مذکورہ کتاب میں ہر عہد کی سیاسی وسماجی صورت حال پر تبصرہ کے ساتھ اس دور میں مذہب واخلاق کی حالت اور ان کے بارے میں شعراء اور ادباء کے خیالات پر فوکس کیا گیا ہے۔ فکر وفن پر تبصرہ کے ساتھ اخلاقی محاسن ومعائب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اسی کتاب کی پانچویں جلد میں ایک ذیلی عنوان قائم کیا ہے'' وہابی سلفی دعوت کے شعراء اور اس کے تحت دو شعراء محمد بن اسماعیل حسنی صنعانی اور ابن مشرف الاحسائی (۱۲۱ تا ۱۲۴) کا ذکر کیا ہے۔ آئندہ صفحات میں عربی ادب کے بارے میں ان کے تاثرات کا ذکر کریں گے جن کو تاثراتی تنقید بھی کہہ سکتے ہیں، جن سے ان کے ادبی شعور کو سمجھنے کا موقع ملے گا۔

تاریخ ادب عربی کی پہلی جلد میں مسئلہ انتحال پر ایک طویل اور دلچسپ بحث ہے۔ انھوں نے ابن سلام الجمحی ،نولڈک، آل ورڈ، طٰہٰ حسین، مارگلیوتھ اور مصطفیٰ صادق رافعی کے افکار وخیالات کا تجزیہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

'' جاہلی شاعری میں بہت سے موضوع اشعار موجود ہیں، لیکن یہ چیزیں متقدمین علماء کی نظر سے اوجھل نہیں تھیں، انھوں نے اشعار کو تنقید کے سخت ترین معیار پر پرکھا اور داخلی وخارجی طور پر اطمینان حاصل کرکے موضوع و موثوق بہ الگ کیا، اس لئے کسی موہوم نظریہ کی بنیاد پر پوری جاہلی شاعری کو مشکوک و غیر معتبر نہیں قرار دیا جاسکتا، متقدمین علماء نے جن اشعار کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار کیا ہے ان کے بارے میں ہم کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ صحیح ہیں، البتہ جن اشعار کو انھوں نے معتبر قرار دیا ہے انھیں ضرور قبول کریں گے بشرطیکہ وہ علمی بنیادوں پر پورے اتر جائیں، اگر کسی شاعر کی طرف منسوب کوئی شعر اس کے تاریخی حالات سے میل نہ کھائے، یا اس کے قبیلہ سے دور کے مقامات کا اس میں ذکر ہو اور اشعار پر اسلامی ذہن کی چھاپ ہو تو ایسے اشعار کو ہم بھی موضوع قرار دینے میں تامل نہیں کریں گے۔'' (۱)

فرزدق، جریر اور اخطل کا شمار اموی عہد کے باکمال شعراء میں ہوتا ہے، خصوصا نقائض میں ان کا مقام کافی بلند ہے۔ تاریخ ادب عربی کی دوسری جلد میں ان کے فکر وفن کے ساتھ اس وقت کے معاشرے میں نقائض کی صنف کے وجود کے معاشرتی محرک پر بھی علمی بحث ہے۔ اس اقتباس سے مذکورہ تینوں شعراء کے کلام کے معائب اور محاسن اور عربی شاعری میں ان کے مقام ومرتبے کا پتہ چلتا ہے۔

'' اخطل کو الفاظ کے صیقل وتنقیح کا بڑا دھیان رہتا

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مختصر تاریخ ادب عربی جلد اول، جامعہ سلفیہ بنارس، ص ۹۵

تھا،اس خصوصیت میں وہ زہیر کے جاہلی مکتب فکر سے قریب نظر آتا ہے۔فرزدق کو الفاظ کی تنقیح پر اتنی توجہ نہ تھی،جس کی وجہ سے اس کے کلام میں قاعدہ سے انحراف اورشذوذ کی مثالیں بکثرت نظرآتی ہیں،اس کی طبیعت میں خشونت وصلابت اور مزاج میں تمرد کی جوصفت موجودتھی اس کے نتیجہ میں یہ شذوذ پیدا ہوا،البتہ اس کے الفاظ بڑے پرشکوہ اور باجلال ہوتے تھے،اور جریر کے اسلوب میں الفاظ کی شیرینی اور موسیقی کی حلاوت نمایاں ہے۔اس کا ذوق بے حد صاف ستھرا اور مہذب ہے اس کے اندر یہ وصف قرآن کریم کے اثر سے پیدا ہوا ہے،چونکہ اس کی طبیعت میں رقت ولطافت تھی اس لئے اشعار میں بھی اس کا اثر ظاہر ہے،انھیں سن کر سامعہ کوسکون اور دل کولذت کا احساس ہوتا ہے۔''(۱)

اسلامی تاریخ میں عباسی دورعلمی اورفکری تنوع اور ترقی کے لحاظ سے ممتاز ہے،اس عہد میں عربوں کا یونان، ایران اور ہندستان کی ثقافت سے امتزاج ہوا جس کا اثر زندگی کے مختلف شعبے پر پڑاتو بھلا ادب اس سے کیسے اچھوتا رہ سکتا ہے،زبان و ادب میں معنوی اورفکری لحاظ سے وسعت پیدا ہوئی۔ بشار، ابو نواس،ابو تمام، ابن المقفع،جاحظ اور ابن قتیبہ جیسے نامور شعراء و ادباء پیدا ہوئے۔اس عہد میں عربی نثر نے ارتقاء کے جومرحلے طے کئےاس کااندازہ اس اقتباس ہوتا ہے:

''زندگی کی تبدیلی اور ارتقاء سے نثر کا بھی ارتقاء ہوا،مختلف قسم کے افکار وخیالات اور جذبات ورجحانات کو عربی نثر نے قبول کیا اوراس اختلاط وتاثیر کے بعد وہ ایک نئے رخ پر چل پڑی۔اس میں فلسفہ اور نئے علوم کو قبول کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہوئی اور اب نثر کی متعدد شاخیں وجود پذیر ہوگئیں مثلاً علمی نثر،فلسفیانہ نثر،تاریخی نثر اورادبی نثر۔اسی کے ساتھ اس نثر نے لغوی وشرعی علوم کو بھی اپنے دامن میں جگہ دی اوراس طرح ایک بڑا لغوی ودینی سرمایہ وجود میں آگیا۔متکلمین نے اپنی فکری کاوشوں سے فلسفیانہ نثر کو بام عروج پر پہنچا دیا اور بالکل اچھوتے موضوعات ومباحث کوقارئین کے سامنے پیش کیا۔تمدن کی ترقی کے نتیجہ میں ذہن میں وسعت وبالیدگی پیدا ہوئی تو اس کا اثر اسلوب وطرزادا پر بھی پڑا،عام طور پرادیبوں نے مبہم الفاظ اور گنجلک مفہوم کو ترک کردیا،اسی طرح انھوں نے نامانوس بدوی الفاظ کے استعمال سے بھی گریز کیا اور ساتھ ہی یہ کوشش کی کہ زبان و بیان کا حسن اور تاثیر برقرار رہے،اس نوعیت کی کوشش کے نتیجہ میں فن بلاغت کو بھی ترقی ہوئی اور اس فن میں دیگر زبانوں کی ادب سے بھی استفادہ کیا گیا۔''(۲)

عباسی عہد کے دوممتاز ادیبوں جاحظ اورابن قتیبہ کے بارے میں انھوں نے جولکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے،جاحظ کو انھوں نے ''معتزلی فکر کا پختہ پھل'' کہا ہے، جاحظ کے مقابلے میں وہ ابن قتیبہ کی فکر سے قریب تر ہیں تاہم دونوں کےفکروفن کے بارے میں ان کے تاثرات نہایت متوازن ہیں۔ابن قتیبہ کی''عیون الاخبار'' کی روشنی میں ان کے ادبی اسلوب پرتبصرہ اوراس کے ساتھ ساتھ جاحظ کے اسلوب سے موازنہ کرتے ہوئے دونوں کے اسلوب میں یکسانیت اورفرق کوجس کمال احتیاط سے

(۱)ڈاکٹرمقتدیٰ حسن ازہری،مختصرتاریخ ادب عربی جلددوم،جامعہ سلفیہ بنارس،ص ۱۵۳ (۲) ایضاً جلدسوم،ص ۲۴۳

بیان کیا گیا ہے، اس سے ازہری صاحب کے ادبی اسلوب کی پرکھ اور شعور کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔

"عیون الاخبار" کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ابن قتیبہ کا عمدہ ادبی اسلوب ہے، الفاظ کا انتخاب انہوں نے بڑی مہارت سے کیا ہے، اور معانی کی ادائیگی میں ہمیشہ وضاحت کا خیال رکھا ہے، تعبیر پر ان کی قدرت نمایاں ہے، جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے الفاظ ساتھ دیتے ہیں، ان کے کلام میں موسیقی بھی ہے جس سے سننے والا محظوظ ہوتا ہے۔ الفاظ پر ابن قتیبہ کی توجہ جاحظ کی طرح ہے، بعض مقامات پر جاحظ کے ساتھ اتنی گہری مشابہت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر بتایا نہ جائے کہ ابن قتیبہ کی عبارت ہے تو خصائص کلام پر نظر رکھنے والے بھی دھوکہ کھا جائیں گے، چھوٹے چھوٹے جملے عبارت و الفاظ میں تقابل، الفاظ کا باہم ربط وغیرہ ایسی صفات ہیں جنہیں ابن قتیبہ اور جاحظ دونوں کے یہاں یکساں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ البتہ جاحظ کے یہاں کہیں کہیں استطراد ہے یعنی اثنائے کلام میں وہ کسی اور موضوع کی طرف بھی نکل جاتا ہے، لیکن ابن قتیبہ استطراد سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن ان کے یہاں ایک دوسری کمی ہے، یعنی ان کے کلام میں معاشرہ کے مختلف طبقات کی وہ تصویر نظر نہیں آتی جو جاحظ کے یہاں نمایاں طور پر موجود ہے۔ ابن قتیبہ کا جاحظ کے ساتھ تقابل کرنا مناسب نہیں، عربی ادب میں جاحظ کا درجہ زیادہ اونچا ہے، لیکن ابن قتیبہ کے لئے یہ فخر کافی ہے کہ انہوں نے عربی نثر کو ایک واضح عمدہ اسلوب دیا۔"(۱)

عباسی عہد میں علمی ترقی ہوئی اور عربی ثقافت کا دائرہ وسیع ہوا تو شاعری بھی نئے نئے موضوعات سے آشنا ہوئی اور قدیم موضوعات کو نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش بھی کی گئی، اس عہد کے شعراء میں ایک اہم نام ابونواس کا ہے۔ فن خمریات میں اس کے کمال کا اعتراف سب لوگ کرتے ہیں ذرا اس کے بارے میں ان کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں۔

"فن خمریات میں کمیت وکیفیت دونوں لحاظ سے پوری عربی شاعری میں ابونواس کا مقام سب سے برتر ہے، اس کے نغمے شراب اور تعیش کے لئے وقف نظر آتے ہیں، خمریات کا فن اسی کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوا اور اسی نے مستقل فن کی حیثیت دی، اپنی ذہنی صلاحیتوں اور زبان وبیان پر قدرت کے سبب اس موضوع پر معنی آفرینی کا عمدہ نمونہ پیش کیا، اس نے اپنے اشعار میں شراب کے پیمانوں مٹکوں، مجلسوں اور اس کی لذت وخوشبو وغیرہ کا ذکر بڑی مہارت کے ساتھ کیا ہے، اس کی نظر میں زندگی اسی شراب اور لہو ولعب سے عبارت ہے۔"(۲)

انھوں نے عربی شاعری کا مطالعہ ذرا وسیع تناظر میں کیا ہے، عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں اور نئی ثقافت سے امتزاج کے بعد عربی شاعری نے کیا اثر ڈالا اور دوسرے ادب سے کس طرح متاثر ہوئی اس کو باقاعدہ تقابلی مطالعہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے۔ فکر کے ساتھ اصناف سخن کی سطح پر تبدیلی اور تبادلے کا جو عمل جاری تھا اس کی بھی گونج سنائی دیتی ہے۔

"دسویں صدی ہجری تک ایران کے علماء اور شعراء فارسی کے مقابلہ میں عربی سے زیادہ قریب تھے، فارسی کے شعراء بھی عربی بحروں اور اصناف سخن کو ترجیح دیتے تھے، بشار کے عہد سے عربی صنف مزدوج فارسی میں

(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مختصر تاریخ ادب عربی جلد چہارم، جامعہ سلفیہ بنارس، ص ۲۵۷،۲۵۶

(۲) ایضاً جلد سوم، ص ۸۸

مثنوی کے نام سے معروف ہوئی، فارسی قصیدہ کا موضوع و انداز بھی عربی قصیدہ جیسا رہا، اسی طرح غزل، رباعی اور مسمط وغیرہ اصناف پر بھی عربی کا اثر رہا۔"(۱)

گزشتہ صفحات میں عباسی عہد میں نثر کے ارتقاء پر ایک طویل اقتباس پیش کیا جا چکا ہے، تبدیلی کا سفر جاری رہتا ہے، عربی نثر میں آگے چل کر اور تنوع پیدا ہوا، مقامات اسی تبدیلی کا مظہر ہیں، ایک زمانے تک مدارس کے نصاب کا حصہ مانے جانے والے ادب کے یہ شہ پارے اب مدارس کے نصاب میں کم ہی نظر آتے ہیں لیکن اپنے عہد میں ان کی جو ادبی اہمیت تھی، عربی ادب کے کسی بھی مورخ کو اس سے صرف نظر کرنا آسان نہیں ہے۔

"مقامات (حریری) میں جناس اور محسنات بدیعیہ کے ساتھ ساتھ شیرینی بھی ہے، ان کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا حریری نے عربی زبان کے تمام الفاظ کو کسی برتن یا بکس میں جمع کر لیا ہے، پھر ان کو برتن سے نکال کر اپنے سامنے ڈھیر کر لیا ہے اور ضرورت کے مطابق ان سے منتخب کر کے مسجع کلام پیش کرتا جاتا ہے جس کی موسیقی قارئین کو مسحور کر دیتی ہے۔"(۲)

ازہری صاحب نے جدید عربی ادب کی ممتاز شخصیات میں محمود سامی البارودی، احمد شوقی، حافظ ابراہیم، عباس محمود العقاد اور طٰہٰ حسین کے فکر و فن پہ بھی لکھا ہے۔ خاص طور پر امیر الشعراء شوقی کے فکر و فن پہ ان کا طویل علمی مقالہ شوقی شناسی کے باب میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ طٰہٰ حسین کے بارے میں لکھا ہے کہ "طٰہٰ حسین کی عظمت ان کی شخصیت کی انفرادیت میں پوشیدہ تھی، عربی ادب کی تاریخ میں ابوالعلاء المعری کے علاوہ کوئی ان کے مشابہ نہیں ہے۔"(۳) ان کی شخصیت اور ادبی خدمات کے اعتراف کے ساتھ ان کی خودنوشت "الایام" کے بارے میں ان کے تاثرات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ الایام کا شمار جدید عربی ادب کی عمدہ ترین آپ بیتیوں میں ہوتا ہے، جس میں انھوں نے فطری انداز میں اپنے عہد طفلی و جوانی کی محرومی، بد قسمتی اور جدوجہد کے واقعات کی تصویر کشی کی ہے۔

"یہ کتاب ادب واقعی کا ایک نمونہ ہے جس نے طٰہٰ حسین کو عالمی فکر کی عبقری شخصیات جیسے اسٹنڈل اور ٹالسٹائی کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ طہ حسین نے اس کتاب میں جرأت اور سچائی کے ساتھ اس نابینا بچے کے احساسات اور جذبات کی عکاسی کی ہے جو توجہ اور شفقت سے محروم تھا، اس کتاب میں مصر بالخصوص دیہی مصر کے ثقافتی اور معاشرتی حالات پر سخت تنقید ہے۔ اس کتاب میں ان کے بچپن، بصارت کے جانے کی کہانی، خاندانی زندگی کے مصائب، مکتب اور ازہر کی تعلیمی زندگی، تقدیر اور سماج سے ان کی کشمکش کا ذکر ضمیر غائب کے ساتھ عمدہ ترین غنائی اسلوب میں ہے۔"(۴)

ازہری صاحب کوئی نظریہ ساز ادیب یا ناقد تو نہیں تھے لیکن اپنے ادبی مذاق کی روشنی میں انھوں نے ادب اور ادب کے مقصد کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ غور و فکر کی دعوت دینے کے ساتھ ان کے ادبی شعور کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔



(۱) ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، مختصر تاریخ ادب عربی جلد پنجم، جامعہ سلفیہ بنارس، ص ۲۸۳ (۲) ایضاً جلد پنجم ص ۳۰۸
(۳) پروفیسر مختار الدین آرزو، (رئیس التحریر) مجلة المجمع العلمی الهندی، علی گڑھ، جون ۱۹۷۶) ص ۱۸۶ (۴) ایضاً ص ۱۸۶

مولانا محفوظ الرحمٰن سلفی
جامعہ سلفیہ بنارس

میرے ماموں، میرے محسن، میرے استاذ

ڈاکٹر صاحب میرے ماموں بھی تھے اور استاذ بھی۔ ۱۹۸۰ء میں میں نے جامعہ سلفیہ میں داخلہ لیا اور فراغت کے بعد سے اب تک اسی ادارہ سے وابستہ ہوں۔

ڈاکٹر صاحب بہت ہی سنجیدہ، سلجھے ہوئے، رحمدل، منکسر المزاج، حد درجہ متواضع، صوم وصلوٰۃ کے پابند اصول کے پکے اور بات کے سچے تھے۔ تقویٰ کی صفت آپ میں نمایاں تھی۔ غریبوں اور محتاجوں کا بہت خیال رکھتے تھے، منکرات پر بیحد ناراض ہوتے۔ اور اچھائیوں کی قدر کرتے۔

ڈاکٹر صاحب میرے مربی اور محسن تھے۔ میرے بچوں کی بھی برابر خبر گیری کرتے رہتے۔ بہت سے لوگ اپنے مسائل میرے ہی ذریعہ حل کرواتے، لوگوں کے معاملات اور ضروریات کو لے کر ان کے سامنے مجھے جانے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

شہر مئو

مئوناتھ بھنجن آپ کا آبائی وطن تھا۔ مئو کے تین بڑے مدارس میں آپ نے تعلیم حاصل کی تھی، آپ کے جملہ رشتہ دار واحباب اسی شہر میں۔ ان سب وجوہ کی بناء پر آپ کو اہل مئو سے ایک خاص لگاؤ تھا، چونکہ مئو طبی سہولیات میں کافی پیچھے ہے، اس لئے مئو کے اکثر لوگ علاج کے سلسلے میں بنارس کا رخ کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں اہل مئو کے بہت کام آتے، ایسے مریضوں کو اپنے یہاں ٹھہراتے اور اگر کوئی مریض ایسا ہوتا جو سیڑھی چڑھنے سے معذور ہوتا تو اس کے لئے اس کا کوئی متبادل انتظام فرماتے، اگر کوئی شخص اسپتال میں زیر علاج ہوتا اور آپ کو معلوم ہوجاتا تو فوراً مجھے ساتھ لیتے اور اس کی عیادت کرتے۔ اس سلسلے میں شہر بنارس کے ایسے لوگوں سے رابطہ کر کے سفارش کرواتے جن کے اس اسپتال یا ڈاکٹر سے تعلقات ہوتے، جمعہ کے خطبے اور امام العیدین ہونا بھی مئو سے لگاؤ کی ایک بڑی دلیل ہے۔

آپ کے والد نے حفظ کے لئے مدرسہ عالیہ کا انتخاب کیا تھا لیکن حفظ کے استاذ حافظ احمد مجتبیٰ صاحب کی سختی کی وجہ سے ان کے پاس حفظ نہ کر سکے۔ اور ایک روز قرآن مجید مدرسہ ہی میں چھوڑ کر گھر آ گئے، پھر دوبارہ اس مدرسہ کا رخ نہیں کیا۔

آپ کا بیان ہے کہ اس موقع پر ابا جان نے کہا تھا کہ اب تم پڑھ نہیں سکتے، لیکن میرے اندر پڑھنے کا جذبہ تھا۔ میں خود سے شاخ دار العلوم واقع مرزاہادی پورہ میں داخل ہوگیا۔ وہاں قاری خلیل صاحب مدرس تھے وہیں حفظ مکمل ہوا۔

آپ کا بیان ہے کہ وہ زمانہ بڑی عسرت وتنگی کا تھا، والد صاحب کے ذمہ پورے گھر کی کفالت تھی۔ بنائی کر کے تعلیم دلانا ایک مشکل امر تھا۔ چنانچہ تعلیمی اخراجات مکمل کرنے کے لئے گھریلو کام سے فراغت کے بعد شام کو دریا جاتا، وہاں سے کوئلہ سمیٹ کر لے آتا اور اس کو بازار

میں بیچ کر کاپی کتاب وغیرہ خریدتا۔

مصر جانے کے سلسلے میں جو پریشانی اٹھائی لوگوں کی مخالفت اور طعن وتشنیع کو جس صبر وہمت سے برداشت کیا، اس کو سن کر آنکھوں میں آنسو آجاتا ہے۔ پہلی بار جس طرح مصر پہونچے اور اخراجات جس طرح پورے ہوئے، قرض کہاں سے لیا اور اس ادائیگی کس طریقے پر ہوئی یہ ایک طویل داستان ہے۔

جامعہ سلفیہ سے متعلق

جامعہ سلفیہ بنارس میں آپ ۱۹۶۸ء میں تشریف لائے، یہ جامعہ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ آپ یہاں کے اولین مدرسین میں سے تھے آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھا اور مرکزی دار العلوم کو اس مقام پر پہونچایا جس مقام پر وہ اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ اس کا معیار نہایت ہی اعلیٰ ہو۔ اس کی تعلیمی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے تھے، آپ نے اس کے لئے کتنی قربانیاں دیں، اپنے قیمتی اوقات کا کتنا حصہ اس کے لئے صرف کیا اسے کما حقہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا معیار بلند کرنے کے لئے عصری جامعات کے ذمہ داران سے مشورہ کیا اور اسی کی روشنی میں یہاں کا نصاب تعلیم تیار کیا۔ جن دنوں آپ علی گڈھ سے پی۔ایچ۔ڈی کررہے تھے ان ایام میں بھی آپ نے جامعہ سلفیہ کے کاموں کو ترجیحی بنیاد پر کیا۔

درس وتدریس

آپ کی درسی خدمات تقریباً چالیس سالوں پر محیط ہیں۔ اس دوران آپ نے بہت سے علوم وفنون خصوصاً عربی ادب وزبان کا درس دیا۔ علوم قرآن، فن تفسیر، اصول فقہ جیسے موضوعات بھی آپ کے زیر درس رہے۔ درس کے لئے ہمیشہ آپ پوری ومطالعہ تیاری کرتے تھے، مطالعہ کا وقت متعین تھا۔ بعض کتب کی تدریس پر کئی سال گذر گئے لیکن پھر بھی بغیر مطالعہ کے درس نہیں دیا۔ طلبہ کی مطلوبہ معلومات کا پورا خیال رکھا اور اسی کے ساتھ ان کے معیار کا بھی لحاظ کیا۔ ہر کتاب اور فن سے متعلق نوٹس تیار کرتے اور اسے طلبہ کو دیتے طلبہ کی طرف سے مزید کا تقاضا ہوتا تو اسے بھی پورا کرتے۔

بعض طلبہ جو تعلیم میں کمزور ہوتے ان کا خاص خیال رکھتے ایسے طلباء کو بعد نماز عصر اپنے دفتر میں بلاتے اور اضافی درس دیتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسے طلباء پھر پڑھنے میں بہتر ہوجاتے، عربی ادب کی تدریس میں تمرین کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے۔ جو طلبہ اس میں کمزور ہوتے یا تمرین کی مشق نہ کرپاتے ایسے طلباء کو بھی بعد نماز عصر وقت دیتے اور ان کو ترجمہ وتعریب کا ڈھنگ سکھاتے، اس کا اثر بڑا اچھا ہوتا، کچھ ہی دنوں کے بعد ایسے طلباء اس کام کو بحسن وخوبی خود سے انجام دینے لگتے۔

تدریس سے متعلق آپ کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ زیر درس کتاب سے متعلق دوسری کتب سے طلبہ کو واقف کرانے اور اس کا اسلوب ومنہج بتانے کے لئے طلبہ کو لے کر لائبریری تشریف لاتے، اور ان کتب سے طلبہ کو متعارف کراتے، ان سے استفادہ کا ڈھنگ بتاتے، اور اس کے مطالعہ پر آمادہ کرتے۔ ایسی قربانی (یعنی طلباء کو لائبریری لے کر آنا) بہت کم مدرسین میں دیکھی جاتی ہے۔

لائبریری

جامعہ سلفیہ بنارس کا اپنا ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے، جو اپنی ترتیب وتنظیم کے لحاظ سے مدارس عربیہ کے دیگر کتب خانوں کے درمیان امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کتب خانہ سے ڈاکٹر صاحب کو بیحد دلچسپی تھی، اس

کو معیاری و مفید بنانے کی فکر ان کو ہمیشہ رہی، ہدیہ میں ملنے والی کتاب بھی لائبریری میں داخل کر دیتے، مختلف مکتبات کو جدید کتب کے حصول کے لئے بے شمار خطوط لکھے، جہاں سے بھی ممکن ہو سکا ہے کتاب حاصل کی ہے۔

کتب خانہ سے آپ کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ غالباً ۱۹۹۸ء میں آپ نے ماہنامہ محدث بنارس میں ''بنارس میں جامعہ سلفیہ اور اس کا کتب خانہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس میں لائبریری کی پوری تاریخ کا ذکر کیا۔

خاکسار چونکہ اسی لائبریری سے وابستہ ہے، بنا بریں میری وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو حد درجہ آسانی تھی۔ لائبریری کی تنظیم و ترتیب اور اس سے متعلق جملہ معلومات نیز کتب کی فوری فراہمی سے آپ کافی سہولت محسوس کرتے تھے، اور اس کو بعض لوگوں سے بیان بھی کرتے۔

ادارۃ البحوث الاسلامیہ

ادارۃ البحوث الاسلامیہ، جامعہ سلفیہ بنارس کا اشاعتی تحقیقی ادارہ ہے، ڈاکٹر صاحب اس کے مدیر اور نگراں تھے۔ منتظمین ادارہ کو آپ سے اس سلسلے میں جیسی توقعات تھیں وہ صد فی صد پوری ہوئیں، کتابوں کی اشاعت اور مختلف جگہوں سے اس کی فراہمی یہ سب ایسے امور ہیں جن کو وہی آدمی سمجھ سکتا ہے جس کو اس میدان کا تجربہ ہو، پوری کتاب کو پڑھنا، پھر اس کو اشاعت کے لئے منتخب کرنا، اس کے لئے مقدمہ یا عرض ناشر تحریر کرنا، اس سے متعلق تمام مسائل کو حل کرنا بڑا کٹھن کام ہے، لیکن اس راہ میں جو بھی دشواریاں پیش آئیں ڈاکٹر صاحب نے اس کا حل نکالا۔ وہ زمانہ بہت ترقی یافتہ زمانہ نہیں تھا۔ کتابیں بذریعہ قلمی کتابت طبع ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اکثر کتابوں کی پروف ریڈنگ و تصحیح کا کام بلا معاوضہ کرتے تھے۔

کتابوں کا نام تجویز کرنے میں آپ کو بڑی مہارت تھی، اکثر کتابیں بغیر نام کے طباعت کے لئے آتی تھیں، آپ نام کا انتخاب کرتے اور مصنف اس پر خوش ہوتا تھا۔ مولانا محمد رئیس ندوی مرحوم کی اکثر کتب کا نام آپ ہی نے تجویز کیا ہے۔ کتابوں کی طباعت کے سلسلے میں آپ کی کوشش یہ رہتی تھی کہ کم سے کم ہر موضوع کی ایک بنیادی کتاب ضرور چھپنی چاہئے۔ آپ نے بہت سی کتب کا ہندی وانگلش ترجمہ بھی کرایا۔

صوت الامۃ

جامعہ کے عربی ماہنامہ ''صوت الامۃ'' کے آغاز سے تاحیات مدیر رہے۔ یہ مجلّہ اب اپنی عمر کی تینتالیسویں منزل میں ہے کسی مجلّہ کو اتنے طویل عرصہ تک پابندی کے ساتھ شائع کرنا (اور وہ بھی عربی زبان میں) یہ ڈاکٹر صاحب کے عزم و حوصلہ، صحافت اور زبان وادب سے دلچسپی کی دلیل ہے۔

اس مجلّہ کی ترتیب وانتخاب مضامین کے لئے اپنی اوقات کا ایک بڑا حصہ صرف کرتے، ایک شمارہ منظر عام پر آنے کے بعد دوسرے شمارہ کی تیاری میں لگ جاتے۔ مضامین کے حصول کے لئے ملک و بیرون ملک کے اہل قلم برابر سے رابطہ رکھتے۔

ہر شمارہ کے لئے آپ اس کا اداریہ وقت اور ماحول کی مناسبت سے تحریر فرماتے اس کے مقالات قرآن وحدیث کے علاوہ اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ عربی زبان وادب کے شاہکار نمونے ہوتے تھے۔ آپ کے مقالے کی یہ خصوصیت تھی کہ محض لفاظی پر مبنی

نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہر مقالہ ایک فکر کا حامل ہوتا تھا اس لئے عوام وخواص میں بے حد مقبول تھا۔ خالص علمی وادبی موضوعات کے علاوہ ان موضوعات پر بھی آپ نے خامہ فرسائی کی ہے جن کا تعلق عصری حالات اور اسلام کے خلاف عالمی سازشوں سے تھا۔

ڈاکٹر صاحب عربی کے ساتھ ساتھ اردو کے بھی اچھے مقالہ نگار تھے، اردو میں مختلف موضوعات پر کئی سو مضامین قلمبند کئے ہیں (۱) اور مشہور ومعروف شخصیات سے لے کر گمنام شخصیت پر بھی لکھا ہے۔ اگر آپ نے ایک طرف شاہ فیصل جیسی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے تو دوسری طرف جنرل ضیاء الحق، علامہ ابن باز، علامہ البانی، شیخ الحدیث مبارکپوری اور دیگر علماء ومشائخ ودیگر عام افراد پر بھی لکھا ہے، چنانچہ آپ کا ایک مضمون جامعہ سلفیہ کے ایک گمنام خادم کی رحلت پر بھی ہے، اور ایک مضمون ''جواں سال بیٹے کی جدائی'' بھی ہے، سعودی عرب اور اس سے متعلق معلومات، ''سعودی عرب کی دینی خدمات''، ''سعودی فرمانروا''، ''سعودی حکومت کی تعلیم پر توجہ''، اس طرح کے درجنوں مضامین ہیں جو سعودی حکومت کی خدمات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، انسانی حقوق پر بھی مستقل لکھتے رہے۔

آپ کا ذوق مطالعہ

کتابوں کا مطالعہ آپ کے معمولات میں داخل تھا، اخبارات ورسائل کے عاشق اور دلدادہ تھے۔ میں نے آپ کے ساتھ بارہا سفر کیا، کبھی یہ نہیں دیکھا کہ بغیر کتاب کے سفر کیا ہو، کویت سے شائع ہونے والا مشہور مجلہ "المجتمع" کا تازہ شمارہ سفر میں ہمیشہ ساتھ ہوتا تھا۔ ضخیم سے ضخیم کتاب بہت جلد پڑھ لیتے تھے۔ پڑھنے میں اس بات کا ضرور خیال رکھتے تھے کہ جو چیز بھی مطالعہ کرتے سمجھ کر کرتے تھے، صرف عبارت خوانی مقصود نہ ہوتی۔

ہفتہ میں ایک روز جمعہ کو بعد نماز مغرب میرے ساتھ بیٹھتے تھے اور صرف کتابوں اور ہفتہ بھر میں اخبارات میں آئی ہوئی خاص خبروں، اور جدید طبع ہونے والی کتب موضوع بحث ہوتے۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند

مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند سے آپ کا لگاؤ زندگی بھر رہا، اور مرکزی جمعیت کے تمام ارکان سے ہمیشہ ربط وتعلق رہا، جب جمعیۃ انتشار کا شکار ہوئی تو اس کے لئے بڑے فکرمند رہا کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند حقیقی معنوں میں ایک تحریکی اور فعال ادارہ بنے، متواتر تین بار آپ اس کی کانفرنس میں صدر استقبالیہ بنے۔

دیگر تنظیموں سے تعلق

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے علاوہ دوسری تنظیموں سے بھی آپ کے تعلقات تھے دینی تعلیمی کونسل اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے رکن بھی تھے۔ غیر مسلم تنظیموں سے بھی آپ کے تعلقات تھے، بنارس میں مختلف تنظیموں کے تحت منعقد ہونے والے پروگراموں میں آپ نے شرکت بھی کی ہے۔ غیر مسلم حضرات آپ کی تقریر کو بہت پسند کرتے تھے، بنارس میں خاص طور پر مذہب اسلام سے متعلق معلومات کے لئے آپ ہی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

خطوط کے جوابات

ڈاکٹر صاحب کا ایک امتیازی وصف یہ بھی تھا کہ

(۱) آپ کے مضامین ومقالات کی مکمل فہرست اس شمارے میں شامل ہے۔

وہ خطوط کا جواب ضرور لکھتے بلکہ اس معاملہ میں بے حد مستعد تھے، خط کسی طالب علم یا غیر معروف آدمی کا ہوتا تو بھی اس کا جواب دیتے۔ خط پر تاریخ ضرور رقم کرتے، بیرون ملک کے خطوط میں عربی تاریخ کا اہتمام کرتے تھے۔

اہل علم کی قدردانی

ڈاکٹر صاحب علم وعلماء کے مقام سے بخوبی واقف تھے، اسی لئے آپ اہل علم کے ہمیشہ قدرداں ومعترف رہے، اس سلسلے میں جہاں اکابرین کی تصنیفات کی تعریف کرتے وہیں جامعہ کے فارغین اور چھوٹوں کے علمی کام پر تشجیعی کلمات سے نوازکران کی ہمت افزائی فرماتے۔

سفر

ڈاکٹر صاحب نے اندرون ملک کے علاوہ متعدد بار بیرون ملک کا بھی سفر کیا ہے۔ سفر کے سلسلے میں آپ بے حد محتاط تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے تمام سامان پر ایک نظر ضرور ڈالتے، اور ایسی ضروری اشیاء جس کا کہیں بھی کام پڑسکتا ہے کبھی نہیں بھولتے۔ مثال کے طور پر ہر سفر میں ناخن تراش، چاقو اور ٹارچ، ضروری دوائیں ساتھ لے کر جاتے تھے۔ سفر میں ٹرین کے متعینہ وقت سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے اسٹیشن پہونچ جاتے۔ ٹرین کے اندر آپ بڑے محتاط طریقے سے بیٹھتے۔ بغل میں بیٹھنے والوں سے الجھتے نہیں تھے، بلکہ آپ خاموشی کے ساتھ اپنا کام یعنی مطالعہ میں مصروف۔ کئی سفر میں میرا ساتھ رہا، میں نے دیکھا کہ آپ کے سفر کے اس انداز سے سنجیدہ اور پڑھے لکھے حضرات متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ایسا بھی واقعہ آیا کہ بعض نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہیں۔

کھانا پینا اور دوسرے معمولات

ڈاکٹر صاحب ضرورت پڑنے پر روکھا سوکھا کھانا بھی کھالیتے تھے، لیکن عام طور پر اچھی غذا کا استعمال کرتے تھے۔ عموماً کھانا وقت سے تناول فرماتے تھے، کھانے کے بعد پھل اور کوئی میٹھی چیز ضرور کھاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد لیٹنا اور شام کے کھانے کے بعد اپنی راہداری میں ٹہلنا بھی آپ کا معمول تھا۔ عصر کی نماز کے بعد چائے پابندی سے پیتے تھے۔ ان سب کے باوجود آپ کبھی گھریلو ذمہ داریوں کو نہیں بھولے، جیسی ضرورت اور جس وقت بھی ہوتی آپ گھریلو امور کے لئے حاضر رہتے۔

ڈاکٹر صاحب درجنوں کتاب کے مصنف اور درجنوں کتاب کے مترجم تھے۔ کتاب کی تالیف میں ایک بات جہاں تحریر کرنی ہوتی اس کو مؤکد کرنے یا مزید شہادت کے لئے دوسری معاون کتابیں تلاش کرنے کے لئے لائبریری آیا کرتے تھے، اور گھنٹوں ورق گردانی کرتے، مطلوبہ مواد نہ ملنے پر کتاب گھر لے جاتے، خلاصہ یہ کہ جب تک آپ کی بحث نہ مل جاتی تب تک ورق گردانی کرتے رہتے تھے، لیکن جب مطلوبہ مواد مل جاتا تو خوشی کی انتہا نہ رہتی جب کافی محنت کے بعد کوئی مواد ملتا تھا تو مجھے بلا کر اسے ضرور دکھاتے تھے۔

تاریخ ادب عربی کی چوتھی اور پانچویں جلد کی تصنیف میرے سامنے ہوئی ہے اس کی تالیف میں آپ نے کافی محنت کی ہے۔ ایک ایک شعر کا ترجمہ کرنے کے لئے لغت کی کئی کئی کتابیں دیکھ ڈالتے، نیز اس کے لئے عربی ادب کی اصطلاحات اور محاورات کی کتابوں کو بھی دیکھتے اس کے بعد شعر کا مفہوم اردو زبان میں لکھتے تھے۔ یہ

کتاب بہت سے عصری جامعات میں نصاب یا بطور معاون داخل ہے۔ بنگلہ زبان میں بھی ترجمہ ہوا (پہلی جلد کا) اور وہاں بھی داخل نصاب ہے۔

بعض کتب کی تصحیح و تعلیق میں میں نے آپ کی معاونت کی اور یہ میری خوش قسمتی ہے۔ پہلی کتاب "حجیۃ الحدیث النبوی" ہے جو علامہ محمد اسماعیل سلفی گوجرانوالہ کے حجیت حدیث پر لکھے ہوئے مقالات کے مجموعہ کا عربی ترجمہ ہے۔ یہ کتاب حال ہی میں کویت سے طبع ہوکر آ گئی ہے۔

دوسری کتاب شاہ ولی اللہ کی فارسی تصنیف "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ہے اس کتاب کے ترجمہ اور دوسرے امور یہاں تک کہ پروف ریڈنگ تک میں آپ نے کافی محنت کی ہے۔ مذکورہ کتاب چونکہ طباعت کے کئی مراحل سے گزر چکی ہے اس لئے متعدد بار ڈاکٹر صاحب کو اس کے لئے محنت کرنی پڑی۔

تیسری کتاب علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری کی شہرۂ آفاق تصنیف رحمۃ للعالمین ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے لیکن یہاں مذکورہ کتاب کے اردو ایڈیشن سے متعلق بات ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے علامہ عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے صاحبزادے حافظ احمد شاکر صاحب کے ایماء پر ڈاکٹر صاحب نے رحمۃ للعالمین کا ایک اردو محقق ایڈیشن تیار کیا ہے۔ اس کتاب میں توریت و انجیل کے حوالے بکثرت ہیں، ان حوالوں کی تحقیق اور عبارتوں کی تصحیح میں جو کدوکاوش ومحنت کی وہ انہی کا حصہ ہے۔

اقرباء پروری سے احتراز

ڈاکٹر صاحب ایک انسان ہی تھے، معصوم عن الخطا نہیں تھے، معاشرہ کے ہر چھوٹے بڑے فرد سے آپ کا سابقہ پڑتا تھا، آپ کے اعزہ ورشتہ دار بھی تھے، لیکن آپ اقرباء پروری سے کوسوں دور تھے، آپ کا نظریہ یہ تھا کہ خود محنت کرتے جاؤ اور اپنے راستے ڈھونڈ نکالو، جہاں تک رائے اور مشورے کی بات ہے تو اس سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ کسی بھی رشتہ دار کے لئے تعلیمی راہ میں جو مشورہ ہوسکتا تھا اس میں بخل سے کام نہ لیا۔

مئو میں آپ کے اکثر رشتہ دار معاشی تنگی کا شکار تھے اور بہت سے ابھی بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے لئے اس معاملہ کو حل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ آپ کی زبان اور قلم میں بڑی تاثیر تھی، جس سے کہہ دیتے یا لکھ دیتے مجھے پوری امید ہے کہ وہ اس راہ میں ضرور کام آتا لیکن آپ جب تک زندہ رہے اس چیز سے ہمیشہ احتراز کیا۔

کچھ آخری وقت سے متعلق

ڈاکٹر صاحب ۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء کو مئو سے بنارس آئے اور ۱۸/اکتوبر کو برائے علاج دہلی لے جائے گئے، ان ایام میں ڈاکٹر صاحب صابر اور راضی برضا رہے۔ ڈاکٹروں کے صلاح کی پوری پابندی کی۔ حالانکہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ اس کی شدت کو بیان نہیں کیا جاسکتا اس عالم میں بھی آپ نے صبر کا جو مظاہرہ کیا اس سے متعلقین کو بڑا حوصلہ اور سبق ملا، ڈاکٹر اظہر صاحب کا بیان ہے کہ بھائی جان آخری وقت میں ہم لوگوں کو صبر اور زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھا گئے، ان کے اس طرز عمل سے ہم لوگوں کو بڑا حوصلہ ملا اور یہ معلوم ہوا کہ مصائب کے ایام کس طرح گزارے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چند روزہ اسپتال کی زندگی ہمارے لئے قابل نمونہ ہے۔



اعداد وترتیب:
ابو صباحت السلفی، مئو

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ

کے مطبوعہ اردو مضامین ومقالات کی موضوعاتی فہرست

قرآنیات وعلوم حدیث

۱	۱۔	قصہ الغرانیق العلا کی اصل حقیقت	صوت الجامعہ	مئی ۱۹۷۴ء
۲	۲۔	حروف سبعہ کی احادیث	صوت الجامعہ	اگست ۱۹۷۴ء
۳	۳۔	حدیث نبوی کا طبی معجزہ	محدث	دسمبر، جنوری ۸۹۔۱۹۸۸ء
۴	۴۔	قرآن کریم پر غور وتدبر مذہبی فریضہ ہے	محدث	جون ۱۹۹۵ء
۵	۵۔	مرعاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح	محدث	جنوری، فروری ۱۹۹۷ء
۶	۶۔	شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور علوم حدیث کی خدمت	محدث	ستمبر، نومبر ۱۹۹۸ء
۷	۷۔	کتاب الٰہی اور سنت نبوی	محدث	مئی ۱۹۹۹ء
۸	۸۔	ضعیف حدیث پر عمل کے لئے اصرار کا غیر علمی انداز	محدث	مارچ ۲۰۰۰ء
۹	۹۔	بمصطفیٰ برساں خویش را	محدث	مئی ۲۰۰۰ء
۱۰	۱۰۔	سنت نبوی۔ احکام شریعت کا ایک ماخذ	محدث	ستمبر ۲۰۰۰ء
۱۱	۱۱۔	خبر واحد اور خبر متواتر کی حجیت	محدث	نومبر ۲۰۰۰ء
۱۲	۱۲۔	حدیث کی اسناد اور محدثین کی توجہ	محدث	جنوری، فروری ۲۰۰۱ء
۱۳	۱۳۔	اخبار آحاد کو سنت مشہورہ پر پیش کرنے کا قاعدہ	محدث	اپریل، مئی ۲۰۰۳ء
۱۴	۱۴۔	فضلاء مدارس عربیہ میں قرآن فہمی کا ذوق	محدث	اپریل ۲۰۰۷ء
۱۵	۱۵۔	حضرت ابو ہریرہ اور ان کے معترضین	اہلحدیث دہلی	ستمبر ۱۹۷۹ء
۱۶	۱۶۔	بلوغ المرام مترجم اردو کے مقدمہ پر ایک نظر	ترجمان دہلی	فروری، مارچ ۱۹۸۷ء
۱۷	۱۷۔	قرآن ایک کتاب ہدایت	افکار عالیہ مئو	مارچ تا مئی ۲۰۰۴ء

۱۸	۱۸۔	انکار سنت اور علم وفہم کے تقاضے	علوم حدیث مطالعہ وتعارف (مقالات سیمینار علی گڈھ ۱۹۸۵ء	
۱۹	۱۹۔	دینی مدارس میں تدریس حدیث کے مسائل	مجموعہ مقالات سیمینار جامعۃ الفلاح بلریا گنج ۱۹۸۸ء	
۲۰	۲۰۔	مرعاۃ المفاتیح جلد ثانی کے بعض مباحث کا تعارف	راشٹریہ سہارا لکھنؤ ۳ر ستمبر ۲۰۰۰ء شیخ الحدیث نمبر	
۲۱	۲۱۔	تمام المنۃ	راشٹریہ سہارا لکھنؤ ۲۰۰۰ء علامہ البانی نمبر	
۲۲	۲۲۔	حجۃ اللہ البالغۃ کی احادیث ایک تجزیاتی مطالعہ	مقالہ سیمینار علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ۲۰۰۱ء	
۲۳	۲۳۔	التعلیقات السلفیۃ علی سنن النسائی	الاعتصام لاہور خصوصی اشاعت علامہ عطاء اللہ بھوجیانی	

عقائد وسیرت رسول

۲۴	۱۔	عظمت صحابہ اور ہماری سادہ لوحی	محدث	جون ۱۹۸۲ء
۲۵	۲۔	انسانی زندگی پر ایمان کے اثرات	محدث	مئی، جون ۱۹۸۵ء
۲۶	۳۔	اللہ کے سوا غوث پاک کون؟	محدث	مارچ ۱۹۸۹ء
۲۷	۴۔	نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ کی اہمیت	محدث	دسمبر ۱۹۹۱ء
۲۸	۵۔	جامعہ سلفیہ کی سیرت کانفرنس	محدث	فروری ۱۹۹۲ء
۲۹	۶۔	ماہ ربیع الاول اور سیرت طیبہ کے چند قابل توجہ پہلو	محدث	اگست ۱۹۹۵ء
۳۰	۷۔	اسلام اور مسلمانوں سے نفرت یا محبت کا اصل		
۳۱		محرک کیا ہے؟	محدث	مئی، جون ۱۹۹۷ء
۳۲	۸۔	منصب رسالت کی عظمت	محدث	جولائی ۲۰۰۶ء
۳۳	۹۔	بدعت ایک جائزہ	ترجمان دہلی	اکتوبر ۱۹۸۱ء
۳۴	۱۰۔	محسن انسانیت کی شان میں گستاخی کا حکم	ترجمان دہلی	فروری ۱۹۹۳ء
۳۵	۱۱۔	امیت کا شرعی ولغوی مفہوم (۴ قسطیں)	افکار عالیہ، مئو	اکتوبر تا ستمبر ۲۰۰۷ء

احکام فقہیہ

۳۶	۱۔	حرمت کعبہ قرآن کریم کی روشنی میں	محدث	فروری ۱۹۸۸ء
۳۷	۲۔	اسلامی شریعت اور منشیات	محدث	اگست ۱۹۸۹ء
۳۸	۳۔	ماہ رمضان میں احتساب کی ضرورت	محدث	مارچ ۱۹۹۲ء

۳۹	۴۔	اسلام میں بیوہ اور مطلقہ عورتوں کا عقد ثانی	محدث	جولائی ۱۹۹۲ء
۴۰	۵۔	اسلام کا ایک عظیم رکن حج اثرات ومقاصد	محدث	اپریل ۱۹۹۷ء
۴۱	۶۔	اصلاح وتزکیہ کی مثالی عبادت روزہ	محدث	جنوری ۱۹۹۸ء
۴۲	۷۔	رمضان المبارک کا روزہ ایک عظیم عبادت	محدث	جنوری ۱۹۹۹ء
۴۳	۸۔	تزکیہ نفس میں روزہ کی اہمیت	محدث	دسمبر ۲۰۰۰ء
۴۴	۹۔	زندگی کے ہر موڑ پر قربانی کا مطالبہ	محدث	مارچ ۲۰۰۱ء
۴۵	۱۰۔	تعاون وہمدردی اور غمخواری کا مہینہ	محدث	دسمبر ۲۰۰۱ء
۴۶	۱۱۔	انسداد منشیات پر ایک علمی مذاکرہ	محدث	ستمبر ۲۰۰۲ء
۴۷	۱۲۔	روزہ داروں کے لئے چند قابل لحاظ امور	محدث	نومبر ۲۰۰۲ء
۴۸	۱۳۔	حج اور عید قرباں	محدث	دسمبر ۲۰۰۸ء
۴۹	۱۴۔	ماکولات ومشروبات میں حلت وحرمت	محدث	اپریل، مئی ۲۰۰۹ء
۵۰	۱۵۔	اسلام میں مہر کا نظام	اہلحدیث دہلی	جون ۱۹۶۹ء
۵۱	۱۶۔	مسلم پرسنل لاء نمبر اور مولانا عامر عثمانی	ترجمان دہلی	ستمبر ۱۹۷۲ء
۵۲	۱۷۔	ملت اسلامیہ ہند اور شعبۂ مالیات کی تنظیم	ترجمان دہلی	اکتوبر ۱۹۹۳ء
۵۳	۱۸۔	عید اور مسلمان	ترجمان دہلی	اکتوبر ۱۹۸۶ء

اسلامیات

۵۴	۱۔	بزعم خویش	محدث	اگست ۱۹۸۴ء
۵۵	۲۔	دور حاضر میں اسلام کی تعبیر وتشریح	محدث	ستمبر تا نومبر ۱۹۸۴ء
۵۶	۳۔	اسلامی اتحاد کا تحفظ	محدث	نومبر ۱۹۸۵ء
۵۷	۴۔	خیر سگالی کا جذبہ فطری ہے	محدث	فروری ۱۹۸۶ء
۵۸	۵۔	ہمیں منصفانہ انداز فکر کی ضرورت ہے	محدث	اپریل ۱۹۹۰ء
۵۹	۶۔	نقد واحتساب میں اعتدال کی ضرورت	محدث	جنوری، فروری ۱۹۹۳ء
۶۰	۷۔	منفعت ایک ہے اس قوم کی	محدث	مارچ ۱۹۹۳ء
۶۱	۸۔	ہزار بارہ ہے کہسار کی مسلمانی	محدث	دسمبر ۱۹۹۳ء

سیرو سوانح

۸۵	۴۔	ایک گمنام خادم کی رحلت	محدث	دسمبر ۱۹۹۲ء
۸۶	۵۔	ایک اور گمنام خادم کی رحلت	محدث	جنوری ۱۹۹۳ء
۸۷	۶۔	ایک مثالی خاتون کی سیرت	محدث	جنوری ۱۹۹۵ء
۸۸	۷۔	جواں سال بیٹے کی جدائی	محدث	جون ۱۹۹۹ء
۸۹	۸۔	تھی سراپا دین و دنیا کا سبق......	محدث	جولائی، اگست ۱۹۹۹ء
۹۰	۹۔	بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا	محدث	جون تا دسمبر ۲۰۰۳ء
۹۱	۱۰۔	شمع روشن بجھ گئی، بزم سخن ماتم میں ہے	محدث	جون، جولائی ۲۰۰۹ء
۹۲	۱۱۔	مولانا آزاد اور مشترکہ تہذیب	محدث	جولائی، اگست ۲۰۰۸ء
۹۳	۱۲۔	جدید عربی شاعری کا امام محمود سامی البارودی	برہان دہلی	مئی ۱۹۶۹ء
۹۴	۱۳۔	حافظ بن ابراہیم ایک قوم پرست شاعر	برہان دہلی	اکتوبر ۱۹۷۹ء
۹۵	۱۴۔	شریف رضی اور ان کے علمی کارنامے	معارف اعظم گڈھ	ستمبر ۱۹۶۹ء
۹۶	۱۵۔	شوقی اور ان کی شاعری	معارف اعظم گڈھ	مئی تا اگست ۱۹۷۰ء
۹۷	۱۶۔	ابن خلدون اپنے مقدمہ کے آئینہ میں	دعوت دہلی	دسمبر، جنوری ۶۴۔۱۹۶۳ء
۹۸	۱۷۔	ابن قتیبہ الدینوری	دعوت دہلی	ستمبر ۱۹۶۴ء
۹۹	۱۸۔	ابو العباس القلقشندی	اہلحدیث دہلی	فروری ۱۹۶۸ء
۱۰۰	۱۹۔	شیخ ابن باز کی وفات پر عرب شعراء کے منظوم تاثرات	نور توحید نیپال	۱۹۹۹ء اشاعت خاص
۱۰۱	۲۰۔	خطابت اور تصنیف کے میدان کی ایک تابندہ شخصیت	السراج جھنڈانگر	۲۰۰۰ء خطیب الاسلام نمبر
۱۰۲	۲۱۔	ملت کے عظیم خادم شیخ مختار احمد ندوی	البلاغ ممبئی	۲۰۱۰ء اشاعت خاص
۱۰۳	۲۲۔	مثالی ادارہ کے مثالی صدر	راشٹریہ سہارا لکھنؤ	۳ر ستمبر ۲۰۰۰ء شیخ الحدیث نمبر
۱۰۴	۲۳۔	علامہ البانی کی مہارت کا ایک زندہ ثبوت تمام المنۃ	راشٹریہ سہارا لکھنؤ	۲۰۰۰ء علامہ البانی نمبر
۱۰۵	۲۴۔	علوم سلف کی رمز آشنا ایک عظیم شخصیت	الاعتصام لاہور	خصوصی اشاعت عطاء اللہ حنیف
۱۰۶	۲۵۔	عباس العقاد کی تنقیدی خدمات	علی گڈھ میگزین	۷۴۔۱۹۷۳ء
۱۰۷	۲۶۔	پیغمبر عالم کا مصنف	نقوش منظر	از عبد الباقی مظہر

تعلیم وتربیت

۱۰۸	۱۔	سعودی عرب اور تعلیم	صوت الجامعہ	اگست ۱۹۷۳ء
۱۰۹	۲۔	عورتوں کو کتابت سکھانے اور تعلیم کے بارے میں مثالیں	صوت الجامعہ	نومبر ۱۹۷۳ء
۱۱۰	۳۔	عرب دنیا میں تعریب وترجمہ کی جدید کوشش	صوت الجامعہ	فروری ۱۹۷۴ء
۱۱۱	۴۔	سید حامد کی تقریر	محدث	مارچ ۱۹۸۵ء
۱۱۲	۵۔	علوم وفنون میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب	محدث	جولائی ۱۹۸۹ء
۱۱۳	۶۔	اسلامی ثقافت اور مسلمان	محدث	جنوری ۱۹۹۰ء
۱۱۴	۷۔	صحیح اسلامی تربیت کی اہمیت	محدث	جولائی ۱۹۹۳ء
۱۱۵	۸۔	کویت کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر	محدث	اپریل ۱۹۹۴ء
۱۱۶	۹۔	وفود مدارس اہل حدیث کا نمائندہ بیان	محدث	ستمبر ۱۹۹۴ء
۱۱۷	۱۰۔	مسلم ممالک میں صنعت وٹکنالوجی کی اہمیت	محدث	اکتوبر ۱۹۹۵ء
۱۱۸	۱۱۔	مدارس اسلامیہ ہند کی افادیت میں اضافہ کیسے ہوا؟	محدث	نومبر ۱۹۹۵ء
۱۱۹	۱۲۔	جدید علوم طب وسائنس سے متعلق تعلیم وتحقیق	محدث	مئی ۱۹۹۶ء
۱۲۰	۱۳۔	کویت میں مخلوط تعلیم مقبول نہیں	محدث	نومبر ۱۹۹۶ء
۱۲۱	۱۴۔	اہلحدیث مدارس کے مشاورتی اجتماع کا افتتاحی بیان	محدث	جولائی، اگست ۱۹۹۸ء
۱۲۲	۱۵۔	فکری انتشار سے بچنے کی ضرورت ہے	محدث	جولائی ۲۰۰۰ء
۱۲۳	۱۶۔	مسلم نوجوان اور تعمیر ملت کے تقاضے	محدث	مئی، جولائی ۲۰۰۱ء
۱۲۴	۱۷۔	علم مناظرہ اور اس کے آداب وفوائد	محدث	مارچ ۲۰۰۲ء
۱۲۵	۱۸۔	نئی نسل کی بے راہ روی اسباب وعلاج	محدث	اکتوبر ۲۰۰۲ء
۱۲۶	۱۹۔	اولاد کی تربیت وقت کا اہم موضوع	محدث	جنوری ۲۰۰۴ء
۱۲۷	۲۰۔	تعلیم سے متعلق اسلام کا نقطہ نظر	محدث	جون ۲۰۰۵ء
۱۲۸	۲۱۔	نئی نسل کی تعلیم وتربیت *	محدث	جولائی تا ستمبر ۲۰۰۵ء

* یہ مقالہ جامعہ عالیہ عربیہ کے تعلیمی سیمینار بعنوان نئی نسل کی تعلیم وتربیت میں مدارس اسلامیہ کا کردار منعقدہ ۲۶/۲۷ اپریل ۲۰۰۰ء مطابق ۲۰/۲۱ محرم ۱۴۲۱ھ کے لئے لکھا گیا تھا اور سیمینار میں ڈاکٹر صاحب نے خود پڑھا تھا۔ اس مقالہ کے بعض حصے مجلہ افکار عالیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

۱۲۹	۲۲۔	مدارس اسلامیہ کا نصاب اور معیار تعلیم	محدث	اگست ۲۰۰۷ء
۱۳۰	۲۳۔	عربی زبان میں ملکہ حاصل کرنے کا طریقہ	محدث	مارچ ۲۰۰۸ء
۱۳۱	۲۴۔	جامعہ ازہر کے شعبہ دینیات کا نصاب اور طریقۂ تعلیم	دعوت دہلی	مارچ ۱۹۶۶ء
۱۳۲	۲۵۔	مدارس اسلامیہ کے نصاب میں اضافہ کا سوال	ترجمان دہلی	مئی ۱۹۹۶ء
۱۳۳	۲۶۔	اسلامی تربیت مفہوم واہمیت	افکار عالیہ مئو	اپریل تا جون ۲۰۰۸ء
۱۳۴	۲۷۔	مدارس اسلامیہ کی تربیتی ذمہ داری	افکار عالیہ مئو	جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء
۱۳۵	۲۸۔	مدارس کے نص... ونظام تعلیم پر بعض قدیم وجدید تحریریں	الفرقان ڈومریا گنج	اپریل تا ستمبر ۲۰۰۳ء
۱۳۶	۲۹۔	دینی مدارس کا نصاب	عرفان سید حامد ص ۱۷۱	(مرتب: اصغر عباس وشہاب الدین ثاقب)

دعوت وتبلیغ وذرائع ابلاغ

۱۳۷	۱۔	جماعت کی دعوتی خدمات کا تعارف	محدث	مارچ ۱۹۹۰ء
۱۳۸	۲۔	تبلیغ دین میں کتاب وسنت کے علم کی اہمیت	محدث	جون ۱۹۹۱ء
۱۳۹	۳۔	دعوتی اتحاد اور ہمارا عمل	محدث	جون ۱۹۹۲ء
۱۴۰	۴۔	مغربی ذرائع ابلاغ اور برطانوی ولی عہد کا نقطۂ نظر	محدث	اگست ۱۹۹۴ء
۱۴۱	۵۔	اسلامی دعوت سے متعلق جکارتا کانفرنس	محدث	جنوری ۱۹۹۶ء
۱۴۲	۶۔	دعوت کا ایک اہم پہلو دوسروں کی خیر خواہی	محدث	جنوری ۲۰۰۳ء
۱۴۳	۷۔	ذرائع ابلاغ کی موجودہ ترقی اور اسلامی تشخص واقدار	محدث	اگست ۱۹۹۷ء
۱۴۴	۸۔	امریکہ میں مسلمانوں کی دینی تنظیم اور سرگرمیاں	دعوت دہلی	ستمبر ۱۹۶۴ء
۱۴۵	۹۔	سلفی دعوت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کی اہمیت	افکار عالیہ مئو	اپریل تا ستمبر ۲۰۰۹ء

انسانی حقوق

۱۴۶	۱۔	اسلام اور تحفظ انسانیت	صوت الجامعہ	فروری ۱۹۷۳ء
۱۴۷	۲۔	اسلام اور احترام انسانیت	محدث	جنوری ۱۹۹۲ء
۱۴۸	۳۔	حکومت سعودی عرب اور انسانی حقوق کا تحفظ	محدث	دسمبر ۱۹۹۳ء
۱۴۹	۴۔	آبادکاری وانسانی بہبود کے موضوع پر کانفرنس	محدث	اکتوبر ۱۹۹۴ء

۱۵۰	۵۔	عصر حاضر کے علمبرداران تہذیب اور انسانیت کی بہی خواہی	محدث	جولائی ۱۹۹۷ء
۱۵۱	۶۔	امن وسلامتی انسانی معاشرہ کی اولین ضرورت	محدث	ستمبر ۱۹۹۷ء
۱۵۲	۷۔	اقوام متحدہ اور انسانی آبادی کے مفادات	محدث	مئی ۱۹۹۸ء
۱۵۳	۸۔	عصر حاضر میں انسانی حقوق کا مسئلہ	محدث	اکتوبر ۱۹۹۸ء
۱۵۴	۹۔	حقوق مسلم کی پامالی کا عبرتناک انجام	محدث	ستمبر ۱۹۹۹ء
۱۵۵	۱۰۔	انسانی بنیاد پر باہمی تعلقات کی استواری	محدث	نومبر، دسمبر ۱۹۹۹ء
۱۵۶	۱۱۔	انسانی اقدار کو پامالی سے بچانا ہمارا فرض ہے	محدث	اکتوبر ۲۰۰۰ء
۱۵۷	۱۲۔	حقوق انسانی کا تحفظ اور بڑی طاقتوں کی آویزش	محدث	اگست تا اکتوبر ۲۰۰۱ء
۱۵۸	۱۳۔	حقوق انسانی کا تحفظ اور بڑی طاقتوں کی آویزش	محدث	جولائی، اگست ۲۰۰۲ء
۱۵۹	۱۴۔	اسلام اور انسانیت کے مابین رشتہ تلاش کرنا	محدث	فروری ۲۰۰۳ء
۱۶۰	۱۵۔	ذمیوں کے حقوق	محدث	فروری، مارچ ۲۰۰۷ء
۱۶۱	۱۶۔	انسانیت کی بہی خواہی ہمارا فرض ہے	محدث	فروری ۲۰۰۸ء
۱۶۲	۱۷۔	اسلامی سیاست میں رعایا کے لئے فکرمندی	محدث	فروری ۲۰۰۸ء
۱۶۳	۱۸۔	اسلام اور انسانی حقوق	ترجمان دہلی	
۱۶۴	۱۹۔	ڈاکٹر بطرس غالی اور انسانی حقوق کی پامالی	ترجمان دہلی	اکتوبر ۱۹۹۳ء
۱۶۵	۲۰	مساوات اور آزادی کے اسلامی اصول	ترجمان دہلی	نومبر ۱۹۹۴ء

عالم اسلام و سعودی عرب

۱۶۶	۱۔	ایک مثالی مملکت سعودی عرب	صوت الجامعہ	فروری ۱۹۷۳ء
۱۶۷	۲۔	نقوش جاوداں (سعودی عرب بعہد فیصل)	صوت الجامعہ	اگست، اکتوبر ۱۹۷۵ء
۱۶۸	۳۔	نئی اصطلاحیں پرانے مفہوم	محدث	اگست ۱۹۸۲ء
۱۶۹	۴۔	التوعیۃ فی الحج کی دعوتی واصلاحی سرگرمیاں	محدث	فروری ۱۹۸۳ء
۱۷۰	۵۔	افغانی جہاد پر عراقی جارحیت کا اثر	محدث	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء
۱۷۱	۶۔	خلیجی بحران اور مسلمانوں کا ذہنی انتشار	محدث	اپریل ۱۹۹۱ء
۱۷۲	۷۔	مشرقی یورپ کے مسلمان اور ہمارا فرض	محدث	اکتوبر ۱۹۹۲ء

۱۷۳ ۔۸	یمن کی الجھن	محدث	فروری ۱۹۹۵ء
۱۷۴ ۔۹	مسلم ممالک میں صنعت وٹکنالوجی کی اہمیت	محدث	اکتوبر ۱۹۹۵ء
۱۷۵ ۔۱۰	امریکہ کے حادثہ پر عرب صحافت کا ردعمل	محدث	نومبر ۲۰۰۱ء
۱۷۶ ۔۱۱	تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار	محدث	فروری ۲۰۰۲ء
۱۷۷ ۔۱۲	رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کا ایک اہم اور موثر بیان	محدث	مئی ۲۰۰۲ء
۱۷۸ ۔۱۳	رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی چوتھی اسلامی کانفرنس	محدث	جون ۲۰۰۲ء
۱۷۹ ۔۱۴	انقلاب زمانہ کی ایک خوشگوار مثال	محدث	دسمبر ۲۰۰۲ء
۱۸۰ ۔۱۵	رابطہ عالم اسلامی کا مکتوب	محدث	جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء
۱۸۱ ۔۱۶	ملی ترقی کے تقاضے	محدث	مئی ۲۰۰۸ء
۱۸۲ ۔۱۷	ازہر اور قاہرہ بیس سال بعد (روداد سفر)	ترجمان دہلی	جولائی اگست ۱۹۸۷ء
۱۸۳ ۔۱۸	دنیا کی مسلم اقلیات کے موضوع پر ریاض کی ایک اہم......	ترجمان دہلی	اپریل ۱۹۸۶ء
۱۸۴ ۔۱۹	مملکت سعودی عرب کی تعمیری خدمات کو پہچانئے	ترجمان دہلی	اپریل ۱۹۹۳ء
۱۸۵ ۔۲۰	امریکی مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا وزن	ترجمان دہلی	مارچ ۱۹۹۵ء
۱۸۶ ۔۲۱	جامعہ ازہر تنظیم جدید کے بعد	اہل حدیث دہلی	اگست ۱۹۶۳ء

ادیان وتحریکات وسیاست

۱۸۷ ۔۱	مدعیان تہذیب وانصاف	صوت الجامعہ	مئی ۱۹۷۶ء
۱۸۸ ۔۲	مسلم اقلیت کی مشکلات کا موثر حل	محدث	جون، جولائی ۱۹۸۳ء
۱۸۹ ۔۳	نظریۂ ارتقاء کی ایک نئی شکست	محدث	جنوری، فروری ۱۹۸۵ء
۱۹۰ ۔۴	یہودیوں کی مجرمانہ ذہنیت	محدث	اکتوبر ۱۹۸۸ء
۱۹۱ ۔۵	مسئلہ حجاز کا تاریخی جائزہ اور وہابیت کے خلاف پروپیگنڈہ	محدث	نومبر، دسمبر ۱۹۹۰ء
۱۹۲ ۔۶	جدید ہندوستان اور مسلمان	محدث	اگست ۱۹۹۱ء
۱۹۳ ۔۷	آزاد ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ	محدث	جنوری، فروری ۱۹۹۳ء
۱۹۴ ۔۸	یورپ وافریقہ میں محدودیت ووسعت کی نئی لہریں	محدث	دسمبر ۱۹۹۴ء
۱۹۵ ۔۹	عیسائی مشنری سے وابستہ طلبہ کے سامنے کی گئی ایک تقریر	محدث	مارچ ۱۹۹۵ء

۱۹۶	۱۰۔	ملک کی تعمیر وترقی اور جمہوری اقدار کا تحفظ	محدث	جون۲۰۰۰ء
۱۹۷	۱۱۔	قیادت کے بحران کو کیسے ختم کریں؟	محدث	اگست۲۰۰۰ء
۱۹۸	۱۲۔	اسلحہ بندی کا یہ عمل کہاں لے جائے گا؟	محدث	مارچ۲۰۰۳ء
۱۹۹	۱۳۔	مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے اصول ومقاصد	محدث	اپریل تا جون۲۰۰۴ء
۲۰۰	۱۴۔	آزادی سے قبل مسلم جماعتوں کے بارے میں مشاہیر.....	محدث	اکتوبر،نومبر۲۰۰۵ء
۲۰۱	۱۵۔	جدید عالمی نظام کا علمبردار امریکہ، سیاسی علوم کے......	محدث	دسمبر۲۰۰۵ء
۲۰۲	۱۶۔	کیا یہ تجزیہ صحیح ہے؟	محدث	مارچ۲۰۰۶ء
۲۰۳	۱۷۔	انسانیت کی بے کسی (اسلحہ کی عالمی تجارت کے تناظر میں)	محدث	اگست۲۰۰۶ء
۲۰۴	۱۸۔	صہیونی لیڈر کو عثمانی سلطان کا دوٹوک جواب	محدث	جون۲۰۰۷ء
۲۰۵	۱۹۔	انتہا پسند یہودی یورپ سے مسلمانوں کے خاتمہ کیلئے کوشاں	محدث	جولائی۲۰۰۷ء
۲۰۶	۲۰۔	اسلام اور مستشرقین	ترجمان دہلی	فروری۱۹۷۳ء
۲۰۷	۲۱۔	کمیونزم مذہبی نقطۂ نظر سے	ترجمان دہلی	مئی۱۹۸۴ء
۲۰۸	۲۲۔	ہے اگر مجھ کو خطر کوئی	ترجمان دہلی	اکتوبر۱۹۹۳ء
۲۰۹	۲۳۔	تنظیم کی اہمیت وضرورت	ترجمان دہلی	اپریل۲۰۰۶ء
۲۱۰	۲۴۔	سماجی زندگی میں مذہب کا کردار	اہل حدیث دہلی	جولائی۱۹۶۹ء
۲۱۱	۲۵۔	یہود اور ان کا مذہب	برہان دہلی	جولائی۱۹۶۷ء

عورت

۲۱۲	۱۔	صنف نازک اسلام سے پہلے	محدث	فروری۱۹۸۲ء
۲۱۳	۲۔	اسلام میں بیوہ اور مطلقہ عورتوں کا عقد ثانی	محدث	جولائی۱۹۹۲ء
۲۱۴	۳۔	مصر کی تحریک آزادی نسواں اور قاسم امین کا کردار	محدث	نومبر۱۹۹۷ء
۲۱۵	۴۔	نبی رحمت اور حقوق نسواں	محدث	فروری، مارچ۲۰۰۹ء
۲۱۶	۵۔	اسلام میں عورت کی معاملاتی وسیاسی حیثیت	ترجمان دہلی	مئی۱۹۸۲ء
۲۱۷	۶۔	عورت اسلامی معاشرہ میں	ترجمان دہلی	مئی۱۹۸۲ء

ادبیات

۲۱۸	۱۔	عصر اموی کی شاعری پر ایک نظر	صوت الجامعہ	فروری ۱۹۷۶ء
۲۱۹	۲۔	عہد اموی کی وصفیہ شاعری	صوت الجامعہ	مئی ۱۹۷۶ء

۲۲۰

تعارف کتب

۲۲۱	۱۔	سر شاخِ طوبیٰ	محدث	ستمبر ۱۹۹۱ء
۲۲۲	۲۔	نغمۂ کہکشاں ایک تاثر	محدث	فروری ۲۰۰۰ء
۲۲۳	۳۔	علامہ عبدالمجید حریری کی مترجم کتاب ''وعدۂ برحق''	محدث	فروری، مارچ ۲۰۰۴ء
۲۲۴	۴۔	الدر المنثور معروف بہ تذکرۂ صادقہ کا اجمالی تعارف	محدث	اگست تا نومبر ۲۰۰۸ء
۲۲۵	۵۔	ذرائع ابلاغ پر ایک کتاب (میڈیا روپ اور بہروپ)	محدث	جنوری ۲۰۰۹ء
۲۲۶	۶۔	کتابوں کی دنیا (ضعیف ومنکر روایات)	محدث	اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۹ء
۲۲۷	۷۔	قرۃ العینین اور سبب تالیف	افکار عالیہ مئو	ستمبر تا ستمبر ۵۔۲۰۰۴ء
۲۲۸	۸۔	مکہ مکرمہ اور مسجد حرام کی تاریخ پر ایک معتبر تصنیف	افکار عالیہ مئو	جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء
۲۲۹	۹۔	کتاب ''وحی حدیث'' ایک تعارف	افکار عالیہ مئو	جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء
۲۳۰	۱۰۔	چند نئی کتابیں	اہلحدیث دہلی	دسمبر ۱۹۶۴ء
	۱۱۔	مجازات قرآن: شریف رضی	معارف	اگست ۱۹۶۹ء

۲۳۱

متفرقات (دیگر مضامین)

۲۳۲	۱۔	کارناموں کی تشہیر کا مرض	محدث	ستمبر ۱۹۸۹ء
۲۳۳	۲۔	ایک پیر غیور کی جواں ہمتی	محدث	ستمبر ۱۹۹۰ء
۲۳۴	۳۔	مولانا ابوعلی اثری کی کرم فرمائی	محدث	مارچ ۱۹۹۱ء
۲۳۵	۴۔	مسلم صحافت سے متعلق مجلس مذاکرہ جامعہ سلفیہ	محدث	مئی، جون ۱۹۹۳ء
۲۳۶	۵۔	بنارس میں جامعہ سلفیہ اور اس کا کتب خانہ	محدث	مارچ ۱۹۹۸ء
۲۳۷	۶۔	کیا مصطفی لطفی منفلوطی اور اکبر الٰہ آبادی وہابی تھے	محدث	جنوری ۲۰۰۰ء
۲۳۸	۷۔	دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے معیار	محدث	جنوری ۲۰۰۲ء

۲۳۹	۸ـ	زندگی اور اس کے مختلف پہلو	محدث	جنوری، فروری ۲۰۰۶ء
۲۴۰	۹ـ	نواب صدیق حسن خاں پر جامعہ سلفیہ کا علمی مذاکرہ	محدث	مئی، جون ۲۰۰۶ء
۲۴۱	۱۰ـ	جامعہ رحمانیہ میں تقسیم اسناد	محدث	ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۷ء
۲۴۲	۱۱ـ	تعارف کا مثبت انداز	محدث	اپریل ۲۰۰۸ء
۲۴۳	۱۲ـ	بھائیو! خانہ کعبہ عبادت گاہ ہے، سیاسی اکھاڑہ نہیں	ترجمان	دسمبر ۱۹۸۷ء
۲۴۴	۱۳ـ	نوجوان اپنی فکر میں گہرائی پیدا کریں	ترجمان	نومبر ۱۹۸۹ء
۲۴۵	۱۴ـ	توضیح وتشکر	ترجمان	اپریل ۱۹۹۵ء
۲۴۶	۱۵ـ	دار العلوم ندوۃ العلماء کا سانحہ	ترجمان	دسمبر ۱۹۹۴ء
	۱۶ـ	پیغام وتاثرات	افکار عالیہ مئو	مارچ۔مئی ۲۰۰۴ء

۲۴۷

خطبات

۲۴۸	۱ـ	کلمۂ افتتاحیہ بتقریب ملی کنونشن مئو	محدث	اپریل ۱۹۹۳ء
۲۴۹	۲ـ	خطبۂ صدارت مدارس اہل حدیث کے نصاب ونظام تعلیم پر مجلس مذاکرہ	محدث	جون ۲۰۰۱ء
۲۵۰	۳ـ	خطبۂ استقبالیہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس منعقدہ ۱۹۹۵ء بمقام مئو ناتھ بھنجن		مطبوع
۲۵۱	۴ـ	خطبۂ استقبالیہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس منعقدہ ۲۰۰۴ء بمقام پاکوڑ		مطبوع
۲۵۲	۵ـ	خطبۂ استقبالیہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس منعقدہ ۲۰۰۸ء بمقام دہلی		مطبوع
۲۵۳	۶ـ	خطبۂ استقبالیہ عالمی رابطہ ادب اسلامی منعقدہ ۱۹۹۴ء بمقام جامعہ سلفیہ بنارس		مطبوع
۲۵۴	۷ـ	خطبۂ استقبالیہ عالمی سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۹۹۱ء بمقام جامعہ سلفیہ بنارس		مطبوع
۲۵۵	۸ـ	خطبۂ صدارت اجلاس عام مدرسہ اسلامیہ بھوارہ مدھوبنی بہار منعقدہ مارچ		۲۰۰۹ء
	۹ـ	خطبۂ صدارت دار الدعوۃ الٰہ آباد تعلیمی کانفرنس	مطبوع	۲۰۰۸ء

۲۵۶

ہندی مضامین

۲۵۷	1– मानवता के आधार पर आपसी सम्बन्धों का सुधार	समन्वय	जनवरी 2000
	2– इसलाम का समाजिक योगदान	समन्वय	जनवरी 2003

* یہ مضمون افکار عالیہ جولائی۔ستمبر ۲۰۰۶ء میں بھی شائع ہوا ہے۔

اعداد وترتیب
ابوصباحت السلفی، مئو

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کے عربی مقالات ومضامین

صوت الجامعة

بداية	١٩٦٩/١١م
نظرة الى الإشتراكية	١٩٦٩/١م
مكائد اليهود	١٩٦٩/٧م
الأدب الفارسى فى عهداورنك زيب	١٩٦٩/٧م
الإقتصاد فى الإسلام	١٩٦٩/١٠م
لماذا لانحكم الكتاب	١٩٦٩/١م
لن يستقر السلام الابالاسلام	١٩٦٩/٧م
فى الطريق	١٩٦٩/١٠م
شهر محرم والمسلمون	١٩٧١/١م
فى التربية الخلقية	١٩٧١/٧م
الواجب المقدس	١٩٧١/١٠م
الحضارة الغربية: بدايتها ونهايتها	١٩٧٢م
صواع بين الحق والباطل	١٩٧٢م
مكانة الانسان ومسئوليته	١٩٧٢م
كيف نؤدى المسئولية	١٩٧٢م
ويسفك الدماء	١٩٧٣/١٢م
لن نقبل التعديل	١٩٧٣/٣م
قداسة العلم واهله	١٩٧٣/٥م
لابد من الدين	١٩٧٣/٩م
كلمة العدد	١٩٧٣/١٢م
كيف نعلم ولماذا؟	١٩٧٤/٣م
مشاكل اليوم	١٩٧٤/٦م
مواقف خالدة	١٩٧٤/٨م
كم بين هنا وهناك	١٩٧٤/١١م
على مستوى الحكومات والدول	١٩٧٥/٣م
زعيم المسلمين فيصل فى ذمة الله	١٩٧٥/٦م
حديث العدد	١٩٧٥/٨م
مؤتمر رسالة المسجد	١٩٧٥/٨م
صورمن الماضى ومآثر السلفيين فى الهند	١٩٧٥/١٠م
صورمن الماضى ومآثر السلفيين فى الهند	١٩٧٦/٢م
اللغة العربية فى الهند	١٩٧٦/٥م
تحديث بالنعمة	١٩٧٦/٥م

مجلة الجامعة

حديث العدد	١٩٧٦/٨م
خطوة أخرى الى الأمام	١٩٧٦/٩م
المدارس العربية فى الهند	١٩٧٦/١٠م
القاديانية والإستعمار (٣حلقات)	١٩٧٦/١٢م
مبادرة طيبة من الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة	١٩٧٧م

مؤتمر التعليم الاسلامى بمكة المكرمة	١٩٧٧/٥م
ابعد ماأزيح السنار	١٩٧٧/٦م
سياسة ناجحة	١٩٧٧/٧م
النقص مذموم حيثما كان	١٩٧٧/٨م
كتب عليكم الصيام	١٩٧٧/٩م
اذااختل الميزان (٢ حلقات)	١٩٧٧/١٠م
لايعلمون	١٩٧٧/١م
الدار السلفية بومبائى	١٩٧٨/٢م
رحم الله أمير الكويت الراحل	١٩٧٨/٣م
زيارة ميونة	١٩٧٨/٤م
المجلس الأعلى العالمى للمساجد	١٩٧٨/٦،٥م
حديث الشهر	١٩٧٨م
المؤتمر الإسلامى الأسيوى الأول	١٩٧٨م
متطلبات الدعوة الاسلامية فى الهند	١٩٧٨م
دين الاصلاح	١٩٧٨م
حركة النشأة الثانية فى أوربا	١٩٧٨م
لقاءات وانطباعات	١٩٧٨/٣م
المسلمون والقرن الخامس عشر	١٩٧٨/٤م
البغى آخر مدة القوم	١٩٧٨/٥م
الدين والأخلاق	١٩٧٨/٥م
نحن وشهر الصيام	١٩٧٩/٨م
لقاءات وانطباعات	١٩٧٩/٩م
ليشهدوا منافع لهم	١٩٧٩/١٢م
تعريف ديوان شعر بالأردوية	١٩٧٩/١١م
الجامعة السلفية تعقد مؤتمرالدعوة والتعليم	١٩٨٠م
مؤتمر الدعوة والتعليم	١٩٨٠/٢م
حديث عن هذه المجلة	١٩٨٠م
مقررات الندوة الاسلامية	١٩٨٠م
مؤتمر وزراء الأوقاف والشئون الاسلامية	١٩٨١/٩م
حاجة الأمة إلى معرفة التوحيد مستمرة	١٩٨١/١٠م
بالتبشيرأم بالتنفير	١٩٨١/١١م
هل تخرج المدارس الإسلامية	١٩٨١/١١م
محاسبة النفوس وتقويم الأعمال	١٩٨٢/١م
جهازالعروس أم شقاء ها	١٩٨٢/١م
نجاح الدعوةباللين والتفاهم	١٩٨٢/٢م
الشيوعية والإسلام فى... (٣حلقات)	١٩٨٢/٣م
كيف يتم الاتحاد والتعاون	١٩٨٢/٣م
جولة على حدود بنغله ويش	١٩٨٢/٣م
هل تعود المياه إلى مجار يها	١٩٨٢/٨م
التناقض والتضارب فى مجتمعات المسلمين	١٩٨٢/٩م
المرأة والعمل	١٩٨٢/١٠م
من شرور العصبية	١٩٨٢/١١م
المسلمون فى قفص الاتهام	١٩٨٣/١١م
كيلاتعد الصحوة ناقصة	١٩٨٣/١٢م
العقل مستقيما ومنحرفا	١٩٨٣/٣م
وجوب مراعاة الأخرين	١٩٨٣/٤م
ضمير الانسان	١٩٨٣/٦م
المسلمون ودورهم المنتظر	١٩٨٣/٨م
كيف يكره المسلم الكلام عن العقيدة	١٩٨٣/٩م
الافتتاحية (حلقتان)	١٩٨٣/١٠م

تطبيق مبدأ المساواة بين	١٩٨٤/٦م
هذه الأهداف وهذا الأسلوب	١٩٨٤/٢م
كيف ينظرون إلى الأمة العربية	١٩٨٤/٣م
مؤتمر الدعوة العالمين الثانى	١٩٨٤/٥م
مأساة خلقية	١٩٨٤/٦م
بنغال الغربية: أرض الإيمان التوحيد	١٩٨٤/٨م
فى سبيل تحقيق الوحدة	١٩٨٤/٩م
مقارنة لاخيرفيها	١٩٨٤/١٠م
عن ندوة أهل الحديث العلمية	١٩٨٤/١١م
مرحبا بالزائرالكريم	١٩٨٥/١١م
وأن المساجد لله	١٩٨٥/٢م
حتى تؤثر الدعوة أكثر	١٩٨٥/٤م
العناية بالشباب الاسلامى	١٩٨٥/٥م
اقبال على الإسلام	١٩٨٥/٧م
وفد الجامعة السلفية فى الرياض	١٩٨٥/٩م
مايجرى وراء الستار	١٩٨٥/١٠م
اعتداء سافر على الاسلام	١٩٨٥/١١م
محنة المسلمين فى الحكم العلمانى	١٩٨٦/٤م
مأساة لاهور بباكستان	١٩٨٦/٧م
الحاجةالى الدين	١٩٨٦/١١م
ادارة اصلاح المساجد فى بومبائى	١٩٨٦/٢م
خطاب السيد حامد فى بنارس	١٩٨٦/٣م
كيف تهدأ النفوس وتستقيم الأحوال؟	١٩٨٦/٤م
موقف مريح	١٩٨٦/٥م
حفل توزيع الشهادات	١٩٨٦/٦،٥

نشرة الجامعة

تقليد الغرب الأعمىٰ أضر بالشرق	١٩٨٦/٩م
ألم يأن لهذه الاتهامات أن تنتهى؟	١٩٨٦/١٠م
تعريف برسالةجامعية قيمة	١٩٨٧/٥م
تعريف بكتاب فضول	١٩٨٧/٧م
الخطوط العريضة فى طبعتها الجديدة	١٩٨٧/٧م
توطئه لانعقاد الندوة العالمية	١٩٨٧/١١م
يتيهون بالابتعاد عن الاسلام	١٩٨٧/١م
شباب الأمة	١٩٨٧/٢م
ندوة علمية فى سراج العلوم	١٩٨٧/٣م
الحكومة الايرانية تعتدى	١٩٨٧/٣م

صوت الأمة

من صوت الجامعة الى صوت الأمة	١٩٨٨/٣م
طبعة جديدة لكتاب فتح المغيث	١٩٨٨/٣م
جهاد الشعب الفلسطينى	١٩٨٨/٤م
توصيات مؤتمر تكوين الدعاة	١٩٨٨/٤م
التربية الدينية السليمة ودورها	١٩٨٨/٥م
مواجهة التحديات المعاصرة	١٩٨٨/٧م
وأذن فى الناس بالحج	١٩٨٨/٦م
عن الحركة الوهابية	١٩٨٨/٨م
مقياس جائرللموالاة والمعاداة	١٩٨٨/٩م
دع الأخبار تتكلم	١٩٨٨/١١م
الرئيس محمد ضياء الحق	١٩٨٨/١١م
الشيخ محمود أحمد ميرفورى	١٩٨٨/١١م
تعريف بكتاب اهتمام المحدثين ...	١٩٨٨/١١م

عقول مأفونة وأقلام المحدثين ماجورة	١٩٨٩/١م
مشروع دائرة المعارف	١٩٨٩/٢م
فى اعلان الملك عبدالعزيز رحمه الله	١٩٨٩/٣م
التقدم الذى نحلم به والواقع الذى نعيش فيه	١٩٨٩/٤م
كتب عليكم الصيام	١٩٨٩/٥م
الغاية الأسمىٰ لبناء البيت الحرام	١٩٨٩/٦م
المسلمون وتنظيم شئون البذل والانفاق	١٩٨٩/٧م
جهود مخلصة فى مقاومة القاديانية	١٩٨٩/٨م
تعريف بكتاب نصوص من الحديث ...	١٩٨٩/٨م
وفاء بحق العلامة الميمنى	١٩٨٩/٩م
انا لله الخ، لله ماأعطى ولله ماأخذ	١٩٩٠/٢م
بكت العيون دما	١٩٩٠/٣م
هل ضاقت أرض الهند على المسلمين...	١٩٩٠/٤م
من دروس الحج	١٩٩٠/٧م
مدى نجاح تجربة السيدأحمد خان	١٩٩٠/١٠م
رؤية سليمة الى الأزمة الخليجية	١٩٩٠/١١م
موقف الحكومة الهندية من مأساة......	١٩٩٠/١٢م
الى مشكلة المسجد البابرى من جديد	١٩٩١/١م
لم يمت الضمير بعد	١٩٩١/٢م
المؤامرة المنسقة لتشويه التاريخ	١٩٩١/٣م
استنكار المسلمين فى الهند	١٩٩١/٣م
استغلال التاريخ للأغراض السياسية	١٩٩١/٤م
ندوة علمية حول أزمة الخليج	١٩٩١/٤م
فرحة الانتصار ووقفة التأمل	١٩٩١/٥م
اجتماع حول أزمة الخليج بمئو	١٩٩١/٥م
ندوة علمية بالجامعة حول أزمة الخليج	١٩٩١/٥م
تقلبات مدهشة حول أزمة الخليج	١٩٩١/٧م
حكومة خادم الحرمين الشريفين	١٩٩١/٨م
قانون الحفاظ على المعابد	١٩٩١/١٢م
مبادرة طيبة لتعزيز مكانة الأقليات ...	١٩٩١/١٢م
كتاب قيم فى السيرة وترجمته	١٩٩١/١٢م
كتب عليكم الصيام	١٩٩٢/٣م
مسئوليتنا نحن المسلمون	١٩٩٢/٤م
وحشية فى القران العشرين	١٩٩٢/٥م
اجابات على اسئلة حول الدعوة	١٩٩٢/٦م
توحيد صفوف المسلمين فى الهند	١٩٩٢/٧م
محنة المسلمين فى البوسنة والهرسك	١٩٩٢/٨م
مواقف استفزازية منافية لدستور الهند	١٩٩٢/٩م
مأساة افغانستان سلاح المسلم ضد المسلم	١٩٩٢/١٠م
كلمة عن السيرة النبوية العطرة	١٩٩٢/١١م
هموم المسلمين بعد هدم البابرى	١٩٩٣/١م
بعد هدم المسجد البابرى	١٩٩٣/٢م
مساهمة لسيد النواب صديق	١٩٩٣/٣م
الأستاذ عبد النور الندوى إلى رحمة الله	١٩٩٣/٣م
الخمر بين تجارب الأطباء وتصريحات العلماء	١٩٩٣/٥م
من صور البذل والتضحية فى سبيل الدين	١٩٩٣/٧م
أهمية حركة الجهاد والتجديد فى شبه...	١٩٩٣/٨م
ازدواجية المقياس	١٩٩٣/٩م
أمثلة رائعة فى الإيمان والجهاد	١٩٩٣/١٠م
مقتطفات من البحث المقدم إلى مؤتمر كولمبو	١٩٩٣/١١م
من صفات المجاهدين	١٩٩٣/١٢م
كلمة الترحيب بسعادة الأستاذ عبدالرحيم	١٩٩٣/١٢م

محدث العصر الشيخ عبيد الله الرحمانيؒ	١٩٩٤/٢م
مؤتمر علماء أهل الحديث بالهند (حلقتان)	١٩٩٤/٦م
صور من نشاط المدارس الاسلامية فى الهند	١٩٩٤/٨م
قضية المسجد البابرى تبرز من جديد	١٩٩٤/١٢م
دور الزعامة المسلمة فى قضية البابرى	١٩٩٥/١م
كتب عليكم الصيام	١٩٩٥/٢م
خدمة المجتمع البشرى و نو عيتها	١٩٩٥/٣م
ملخص ماورد فى كلمة الاستقبال لمؤتمر...	١٩٩٥/٤م
وضع الأقلية المسلمة فى الهند	١٩٩٥/٦م
فى ساحة السياسة الهندية	١٩٩٥/٧م
تعريف بكتاب "تاريخ الحضارة الإسلامية"	١٩٩٥/٧م
هزة اخرى تصيب المسلمين	١٩٩٥/٩م
هل تتكرر مأساة المسجد البابرى؟	١٩٩٥/١٠م
مؤتمر الدعوة الإسلامية فى آسيا والباسفيك	١٩٩٥/١١م
اجتماع الأبناء القدامى للجامعة السلفية	١٩٩٥/١٢م
الدعوة الإسلامية فى الهند (٣حلقات)	١٩٩٦/١م
الغاية الأسمى لبناء البيت الحرام	١٩٩٦/٤م
ماذا يقولون و كيف يفكرون؟ (٣حلقات)	١٩٩٦/٧.٥م
اتجاهات الديانات الى السعادة أوالشقاوة؟	١٩٩٦/٨م
قراء ة فى كتاب الحمالة الخلقية	١٩٩٧/١م
وماتدرى نفس بأى ارض تموت	١٩٩٨/١م
انا لله وانا اليه راجعون	١٩٩٨/٢م
اعلان موعد الإنتخاب فى الهند	١٩٩٨/٣م
السنة فى مرأة القرآن	١٩٩٩/٢م
هكذاتصان الحقوق وترسى	١٩٩٨م
فضل العلم فى الكتاب والسنة	١٩٩٨/٥م
ماذا تفيد صحافة البلاد	١٩٩٨/٧م
فضل العلم فى الكتاب والسنة	١٩٩٨/٨م
فضل العلم فى الكتاب والسنة	١٩٩٨/٩م
مستجدات فى قضية ايو دهيا	١٩٩٨/١٠م
تقرير موجز عن الملتقى الأول للدعاة فى الهند	١٩٩٨/١١م
الحكمة فى اختيار موضوعات الدعوة	١٩٩٨/١١م
كتب عليكم الصيام	١٩٩٩/١م
السنة فى مرأة القرآن	١٩٩٩/٢م
التسامح الدينى حاجة المجتمع المعاصر	١٩٩٩/٣م
قرن كامل من الإنجاز والعطاء	١٩٩٩/٤م
جهود المملكة فى تنشيط التعليم	١٩٩٩/٥م
انا لله الخ، أى نجم خباسناه وغابا	١٩٩٩/٦م
وفاء بحق الشيخ	١٩٩٩/٨م
التعليم الدينى والدعوة الاسلامية	١٩٩٩/٩م
التعليم الدينى والدعوة الاسلامية	١٩٩٩/١٠م
فتوىٰ علماء المسلمين فى شبه القارة	١٩٩٩/١٠م
الهندية بخروج القاديانى واتباعه	٢٠٠٠/٤ـم
دور محمد حسين فى مقاومة القاديانى ونحلته	٢٠٠٠/٧،٦
مؤسسو حركة ختم النبوة وقادتها	٢٠٠٠/٨م
ندوة علمية حول موضوع علوم الحديث	٢٠٠٠/٩م
شيخ الاسلام ثناء الله الأمرتسرى	٢٠٠٠/١٠م
وجهوده فى مقاومة القاديانية	٢٠٠٠/١١م
زيارة كريمة وترحيب حار	٢٠٠٠/١٢م
شيخ الاسلام ثناء الله الأمرتسرى	٢٠٠١/١م
وجهوده فى مقاومة القاديانية	٢٠٠١/٣ـم
صدى جهود الأمرتسرى فى العالم العربى	٢٠٠١/٦ـ٣

موقف طالبان ومقتضى الحكمة	٢٠٠١/٧م
كتاب شيخ الحرم المكى باللغة الأردية	٢٠٠١/٨م
مؤتمر عن الحفاظ على السنة واسئلة عن ...	٢٠٠١/٩م
عن التعليم الإسلامى فى المدارس	٢٠٠١/١٠م
صوم شهر رمضان وأثره فى حياة المسلمين	٢٠٠١/١١م
عن الدعوة فى منطقة بنارس	٢٠٠١/١٢م
تعريف بكتاب الجيب المحمدية	٢٠٠٢/١م
فى الرد على القاديانية	٢٠٠٢/٤_م
الندوة العالمية عن جهود خادم الحرمين	٢٠٠٢/٥م
خادم الحرمين قائد بصير وزعيم مخلص	٢٠٠٢/٥م
رابطه العام الاسلامى تعقد المؤتمر ...	٢٠٠٢/٦م
مبدأ الايثار والتعاون فى الاسلام	٢٠٠٢/٧م
شغلت البدع المسلمين	٢٠٠٢/٨م
نظرة الى بداية التصوف	٢٠٠٢/٩م
التصوف فى العصر الاسلامى	٢٠٠٢/١٠م
كتاب 'اثر الدعوة الوهابية"	٢٠٠٢/١١م
نظرة الى سلسلة التصوف	٢٠٠٢/١٢م
لعنوا بما قالوا	٢٠٠٣/١م
لعنوا بما قالوا	٢٠٠٣/٢م
شيخ الاسلام ابن تيميةؒ يشرح حكم شاتم الرسول	٢٠٠٣/٣م
شيخ الاسلام ابن تيميةؒ يشرح حكم شاتم الرسول	٢٠٠٣/٤م
أثناء مؤتمر دين الرحمة غشيت الرحمة...	٢٠٠٣/٥م
أثناء مؤتمر دين الرحمة غشيت الرحمة ...	٢٠٠٣/٦م
أثناء مؤتمر دين الرحمة غشيت الرحمة...	٢٠٠٣/٧م
طبعة جديدة لكتاب اتحاف النبيه...	٢٠٠٣/٨م
طبعة جديدة لكتاب اتحاف النبيه...	٢٠٠٣/٩م
مساهمة المدارس الاسلامية فى المجتمع المعاصر	٢٠٠٣/١٠م
نقاط حول التعليم	٢٠٠٣/١١م
العناية بكتاب الله العزيز واجب ...	٢٠٠٣/١٢م
الاسلام الذى ندعو اليه	٢٠٠٤/٣_١
المؤتمر الثامن والعشرون لجمعية ...	٢٠٠٤/٤م
الاسلام الذى ندعو اليه	٢٠٠٤/٥م
عود على بدء / ايضا كلمة الإستقبال	٢٠٠٤/٧_٦
السنة المصدر الثانى للتشريع	٢٠٠٤/٨م
لمحة عن نشاط المسلمين فى بنارس	٢٠٠٤/٩م
زيارة اغضبت المتوهمين، ودولة أذلت المسالمين	٢٠٠٤/١٠م
افتتاحية العدد	٢٠٠٤/١١م
أعمال نموذجية وخطوات بناءة	٢٠٠٤/١٢م
الطريقة الجشتية فى التصوف	٢٠٠٥/١م
آراء الصوفية فى الميزان	٢٠٠٥/٢م
نقاط تجدر بالتفكر	٢٠٠٥/٣م
تقديم كتاب سيرة البخارى باللغة العربية	٢٠٠٥/٤م
السيرة النبوية وأهميتها فى فهم الاسلام	٢٠٠٥/٥م
السيرة النبرية وأهميتها فى فهم الاسلام	٢٠٠٥/٦م
عقيدة البداء عند الشيعة	٢٠٠٥/٧م
رائد العلم وقائد الدولة الى رحمة الله	٢٠٠٥/٨م
الحوار هو الطريق الأسلم	٢٠٠٥/٩م
مؤتمر وحدة الأمة الاسلامية	٢٠٠٥/١٠م
دستور جمهورية الهند الأساسى	٢٠٠٥/١١م
كتاب "مقدس رسول" نموذج فريد......	٢٠٠٥/١٢م
كتاب "مقدس رسول" نموذج فريد......	٢٠٠٦/١م
صفحات تذكارية بمناسبة زيارة خادم الحرمين	٢٠٠٦/٢م

كتاب 'مقدس رسول' ٢٠٠٦/٣م
الندوة العلمية عن الأمير صديق حسن ٢٠٠٦/٤م
الجامعة السلفية تعقد ندوة علمية... ٢٠٠٦/٦،٥
كلمة العدد ٢٠٠٦/٧م
......تعريف بكتاب فهارس الأسفار ٢٠٠٦/٨م
......تعريف بكتاب فهارس الأسفار ٢٠٠٦/٩م
صاحب المنهج الفريد فى خدمة الحديث... ٢٠٠٦/١٠م
صاحب المنهج الفريد فى خدمة الحديث... ٢٠٠٦/١١م
صاحب المنهج الفريد فى خدمة الحديث... ٢٠٠٦/١٢م
صاحب المنهج الفريد فى خدمة الحديث... ٢٠٠٧/١م
صاحب المنهج الفريد فى خدمة الحديث... ٢٠٠٧/٢م
معوقات فى سبيل الوحدة ٢٠٠٧/٢م
عن المؤتمر العالمى الثامن للاعجاز ٢٠٠٧/٣م
ماذا تغنى الديمقراطية، ومتى يغاث الضعفاء ٢٠٠٧/٤م
افتتاحية العدد ٢٠٠٧/٥م
قمة الرياض تذكير بالمسئوليات... ٢٠٠٧/٦م
ادعاء مراعاة القيم والحقوق ٢٠٠٧/٧م
ادعاء مراعاة القيم والحقوق ٢٠٠٧/٨م
حديث العدد ٢٠٠٧/٩م
رمضان المبارك شهر البر والتقوىٰ ٢٠٠٧/١٠م
عود على بدء كتاب مقدس رسول ٢٠٠٧/١١م
قراءة فى تقرير الأمين العام لمنظمة... ٢٠٠٧/١٢م
وأتموا الحج والعمرة لله ٢٠٠٨/١م
الاسلام هو الطريق الوحيد لتحقيق ... ٢٠٠٨/٢م
الاسلام هو الطريق الوحيد لتحقيق ... ٢٠٠٨/٣م
الاسلام هو الطريق الوحيد لتحقيق ... ٢٠٠٨/٤م
الاسلام هو الذى قضى على التعصب ٢٠٠٨/٥م
توجيهات الاسلام السديدة فى ... ٢٠٠٨/٦م
المسارعة إلى الخيرات مع الاهتمام بالمظهر ٢٠٠٨/٧م
المؤتمر الإسلامى العالمى للحوار ٢٠٠٨/٨م
المؤتمر الإسلامى العالمى للحوار ٢٠٠٨/٩م
المؤتمر الإسلامى العالمى للحوار ٢٠٠٨/١٠م
هل تدل هذه الكلمات على شئ ٢٠٠٨/١١م
المؤتمر الإسلامى للحوار ٢٠٠٨/١٢م
المؤتمر الإسلامى العالمى للحوار ٢٠٠٩/١م
المؤتمر الإسلامى العالمى للحوار ٢٠٠٩/٢م
افتتاحية العدد ٢٠٠٩/٣م
عناصر مهمة فى تنشيط الدعوة إلى الله ٢٠٠٩/٤م
مؤتمر وزارة الأوقاف بالكويت ٢٠٠٩/٥م
مجالات الوقف المؤثرة فى الدعوة إلى الله ٢٠٠٩/٦م
مجالات الوقف المؤثرة فى الدعوة إلى الله ٢٠٠٩/٧م
مجالات الوقف المؤثرة فى الدعوة إلى الله ٢٠٠٩/٨م
مجالات الوقف المؤثرة فى الدعوة إلى الله ٢٠٠٩/٩م
مجالات الوقف المؤثرة فى الدعوة إلى الله ٢٠٠٩/١٠م

مجلة المنار

رجال الغد وبناة المستقبل ١٩٧٩م
الصحافة فى خدمة الدعوة ١٩٨١م
احداث تتكلم ١٩٨٤م
دعاة الغد ١٩٨٥م

تعریف بکتاب العلل للدار قطنی ١٩٨٧م

المحنة التی یمر بها المسلمون فی الهند ١٩٨٩م

انا لله وانا الیه راجعون لله ماأعطی ولله ما أخذ ١٩٩٠م

تعریف بکتاب زوابع فی وجه السنة ١٩٩٢م

مسئولیة تحصیل العلم والدعوة الی الله ١٩٩٤م

تعریف بکتاب تاریخ الحضارة الاسلامیة ١٩٩٥م

اجتماع الأبناء القدامی للجامعة السلفیة ١٩٩٦م

مؤتمر علماء المسلمین بندوة العلماء لکنؤ ١٩٩٨م

السنة فی مرأة القرآن ١٩٩٩م

فتوی علماء المسلمین فی شبه القارة الهندیة ٢٠٠٠م

کیف یکون تقویم المدارس الاسلامیة ٢٠٠٠م

عن التعلیم الاسلامی فی المدارس ٢٠٠١م

الکاتب الاسلامی الکبیر الاستاذ أنور الجندی ٢٠٠٢م

الاسلام الذی ندعو الیه ٢٠٠٣م

مستجدات فی المسجد البابری ٢٠٠٤م

الحوار هو الطریق الاسلم ٢٠٠٥م

مکتبة تضم ألفا وثلاث مائة...... ٢٠٠٦م

ادعاء مراعاة القیم والحقوق ٢٠٠٧م

المؤتمر الاسلامی العالمی للحوار ٢٠٠٨م

المجمع العلمی الهندی

منصور الفقیه حیاته وشعره ١٩٧٧م

تقویة الایمان

المجاهد الکبیر محمد اسماعیل الشهید ١٩٨٦م

☆☆☆

طلبۂ مدارس کے میگزین اوران کے لئے پیغامات

مجلّہ کا نام	ادارہ	جلد	صفحات
مجلّہ تہذیب	جامعہ عالیہ عربیہ، مئو	۶	۹
مجلّہ تہذیب	جامعہ عالیہ عربیہ، مئو	۸	۱۳
مجلّہ فیضان	جامعہ اسلامیہ فیض عام	۷	۵
مجلّہ فیضان	جامعہ اسلامیہ فیض عام	۸	۷
مجلّہ معیار	جامعہ اثریہ، مئو	۱	۱۰
مجلّہ معیار	جامعہ اثریہ، مئو	۷	۹
مجلّہ معیار	جامعہ اثریہ، مئو	۹	۸
مجلّہ معیار	جامعہ اثریہ، مئو	۱۰	۸
مجلّہ معیار	جامعہ اثریہ، مئو	۱۱	۱۱
مجلّہ معیار	جامعہ اثریہ، مئو	۱۲	۱۵
مجلّہ البیان	دار التعلیم مبارکپور		۱
مجلّہ الریاض	ریاض العلوم دہلی	۱	۶
مجلّہ الریاں	ریاض العلوم دہلی	۲	۶
مجلّہ الضیاء	سراج العلوم بونڈھیار	۱	۱۸
مجلّہ الاصلاح	المعہد الاسلامی، بریلی	۱	۷
مجلّہ طوبیٰ	جامعہ امام ابن تیمیہ بہار	۱	۱۱
مجلّہ طوبیٰ	جامعہ امام ابن تیمیہ بہار	۱۲	۵
مجلّہ المنار	جامعہ اسلامیہ ممبرا		۱۲
سووینیر	جامعہ محمدیہ مالیگاؤں		۲

☆☆☆

اعداد:
ابوفہمی انصاری۔ بنارس

جامعہ سلفیہ بنارس ودیگر اداروں کی مطبوعات پر

ڈاکٹر ازہریؒ کے مقدمات وتقریظات

درج ذیل فہرست سے متعلق ضروری باتیں:

- جامعہ سلفیہ کی مطبوعات (اردو، عربی) میں حروف تہجی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ دوسرے اداروں کی مطبوعات میں یہ اعتبار ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔
- بعض کتابوں کا ذکر مکرر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی دوسری یا تیسری اشاعت کے لئے سابقہ مقدمہ کے علاوہ دوسرا مقدمہ لکھا ہے۔
- جامعہ سلفیہ کی اکثر مطبوعات پر مقدمہ عرض ناشر کے عنوان سے ہے۔

مطبوعات جامعہ سلفیہ (اردو)

نمبر شمار	نام کتب	مصنف/مولف/مترجم	صفحات	سن	طبع
۱	آسان طریقۂ حج	احمد مجتبیٰ مدنی	۸	۱۴۱۸ھ	ط،۱
۲	اساس دین	ابوبکر جابر الجزائری/ترجمہ: عبدالمعید سلفی	۷	۱۴۰۴ھ	ط،۱
۳	اتباع سنت اور تقلید ائمہ اربعہ کی نظر میں	علامہ البانی وعبدالرحمٰن عبدالخالق ترجمہ:	۵	۱۴۰۳ھ	ط،۱
۴	اسعاد العباد بحقوق الوالدین والأولاد	نواب صدیق حسن خان	۳	۱۴۲۰ھ	ط،۳
۵	اسلام اور پیغمبر اسلام اہل انصاف......	احمد بن حجر آل بوطامی/اقبال احمد سلفی	۴	۱۴۰۸ھ	ط،۱
۶	اسلام میں نماز جمعہ کا حکم	محمد رئیس ندوی	۴	۱۴۱۶ھ	ط،۱
۷	اسلامی تربیت	عبدالوہاب حجازی	۱۰	۱۴۰۶ھ	ط،۱
۸	اسلامی علوم میں اعضاء کی پیوندکاری	ترجمہ: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۲	۱۴۰۸ھ	ط،۱
۹	اسلامی علوم میں ہندوستانی مسلمانوں...	جماعۃ من العلماء	۲	۱۴۰۸ھ	ط،۱
۱۰	اعجاز القرآن	ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن	۱		ط،۱
۱۱	امام محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اور......	ابوالمکرم عبدالجلیل	۷	۱۴۲۲ھ	ط،۱
۱۲	انارۃ المصابیح لأداء صلوۃ التراویح	محمد ابراہیم میر سیالکوٹی	۲	۱۴۰۵ھ	ط،۲

۱۳	اہل حدیث اور سیاست		نذیر احمد رحمانی	۲	۱۴۰۵ھ	ط۲،
۱۴	اہل حدیث اور سیاست		نذیر احمد رحمانی	۳	۱۴۰۲۱ھ	ط۳
۱۵	اسلامی تربیت		عبدالوہاب حجازی	۱	۱۴۲۴ھ	ط۲
۱۶	بدعت اسباب ونتائج		فضل اللہ انصاری	۳	۱۴۱۰ھ	ط۱
۱۷	بعض اسلام دشمن تحریکیں		محمد شعیب نگرامی	۳	۱۴۱۰ھ	ط۱
۱۸	پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم		عبدالمبین منظر	۲	۱۴۱۱ھ	ط۱
۱۹	تاریخ ادب عربی	۱	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری	۲	۱۹۷۵ھ	ط۱
۲۰	تاریخ ادب عربی	۱	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری	۱	۱۴۰۶م	ط۲
۲۱	تاریخ ادب عربی	۲	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری	۲	۱۹۸۲م	ط۱
۲۲	تاریخ ادب عربی	۳	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری	۲	۱۴۱۳ھ	ط۱
۲۳	تاریخ ادب عربی	۴	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری	۲	۱۴۲۲ھ	ط۱
۲۴	تاریخ ادب عربی	۵	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازھری	۲	۱۴۲۲ھ	ط۱
۲۵	تاریخ اسلام		سلام اللہ صدیقی	۲	۱۴۱۴ھ	ط۱
۲۶	تصحیح العقائد بابطال شواھد الشاھد		محمد رئیس ندوی	۲	۱۴۱۸ھ	ط۱
۲۷	تعلیم الصلوۃ		ثناء اللہ سلفی	۳	۱۴۲۳ھ	ط۱
۲۸	تقلید اور عمل بالحدیث		سید مہدی علی خان بہادر	۳	۱۴۰۳ھ	ط۲
۲۹	تقویۃ الایمان	مکمل	شاہ اسماعیل شہید دھلوی	۲	۱۴۰۷ھ	ط۱
۳۰	تقویۃ الایمان		شاہ اسماعیل شہید دھلوی	۴	۱۴۲۱ھ	ط۲
۳۱	تنویر الآفاق فی مسئلۃ الطلاق		محمد رئیس ندوی	۶	۱۴۰۷ھ	ط۱
۳۲	ثعلبہ بن حاطبؓ ایک مظلوم صحابی		عداب محمود الحمش / عقیل احمد حبیب اللہ	۴	۱۴۲۱ھ	ط۲
۳۳	جماعت اہل حدیث کی تدریسی خدمات		عزیز الرحمٰن سلفی	۲	۱۴۰۰ھ	ط۱
۳۴	جماعت اہل حدیث کی تدریسی خدمات		عزیز الرحمٰن سلفی	۳	۱۴۱۲ھ	ط۲
۳۵	جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات		محمد مستقیم سلفی	۲	۱۴۰۰ھ	ط۱
۳۶	جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات		محمد مستقیم سلفی	۳	۱۴۱۲ے	ط۲

۳۷	حجیت حدیث	محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ وعلامہ البانی	۳	۱۴۰۵ھ	ط.۱
۳۸	حسن الصناعۃ فی صلاۃ التراویح بالجماعۃ	محمد ابوالقاسم سیف بنارسی	۲	۱۴۱۷ھ	ط.۱
۳۹	خاتون اسلام	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۲	۱۴۰۷ھ	ط.۲
۴۰	خادم حرمین شریفین کا ملت اسلامیہ سے خطاب	ترجمہ: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۲	۱۴۲۲ھ	ط.۲
۴۱	خطبات حرم	محمد بن عبداللہ السبیل/ ابوالمکرم عبدالجلیل	۲	۱۴۲۱ھ	ط.۲
۴۲	خلیجی بحران اپنے صحیح تناظر میں	جماعۃ من العلماء	۲	۱۴۱۲ھ	ط.۱
۴۳	خیار الدعوات	محمد عبدالرحمٰن بقاغازیپوری	۳	۱۴۲۰ھ	ط.۱
۴۴	دعاء کے آداب واحکام	عزیز الرحمٰن سلفی	۳	۱۴۱۴ھ	ط.۱
۴۵	دعاء کے آداب واحکام	عزیز الرحمٰن سلفی	۳	۱۴۱۸ھ	ط.۲
۴۶	دعایۃ الإیمان الی توحید الرحمٰن	نواب صدیق حسن خان/ محمد الاعظمی	۷	۱۴۱۴ھ	ط.۱
۴۷	راہ حق کے تقاضے	ابن تیمیہ/ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۲	۱۴۱۹ھ	ط.۲
۴۸	ردعقائد بدعیہ	نذیر احمد رحمانی	۷	۱۴۱۴ھ	ط.۳
۴۹	رسالت کے سائے میں	ڈاکٹر عبدالحلیم عویس/ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن	۳	۱۴۰۳ھ	ط.۱
۵۰	رسول اکرم ﷺ کا صحیح طریقۂ نماز	محمد رئیس ندوی	۴	۱۴۱۶ھ	ط.۱
۵۱	رمضان المبارک کے فضائل واحکام	علامہ عبیداللہ رحمانی مبارکپوری	۲	۱۴۰۰ھ	ط.۱
۵۲	رمضان المبارک کے فضائل واحکام	علامہ عبیداللہ رحمانی مبارکپوری	۱	۱۴۱۹ھ	ط.۲
۵۳	زکوٰۃ: اہمیت ومسائل	عبداللہ سعود عبدالوحید	۲	۱۴۲۰ھ	ط.۱
۵۴	سکھ مذہب	محمد رفیق خان	۳	۱۴۱۴ھ	ط.۱
۵۵	سلفی دعوت اور ائمہ اربعہ	عبدالرحمٰن عبدالخالق/ عبدالوہاب حجازی	۵	۱۴۰۵ھ	ط.۱
۵۶	سلفی عقائد	احمد بن حجر آل بوطامی/ عبدالمعید سلفی	۵	۱۴۰۵ھ	ط.۱
۵۷	سیرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا	محمد رئیس ندوی	۴	۱۴۲۲ھ	ط.۱
۵۸	سیرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا	محمد رئیس ندوی	۴	۱۴۲۲ھ	ط.۱
۵۹	صحیح اسلامی عقیدہ	جماعۃ من الاساتذۃ	۵	۱۴۲۳ھ	ط.۱
۶۰	ضمیر کا بحران	محمد رئیس ندوی	۳	۱۴۱۷ھ	ط.۱

۶۱	عظمت رفتہ	ڈاکٹر عبدالحلیم عویس/ڈاکٹر مقتدیٰ حسن	۲	۱۴۰۵ھ	ط.ا
۶۲	علوی مالکی سے دو دو باتیں	محمد بن سلیمان بن منیع/محمد رئیس ندوی	۲	۱۴۰۵ھ	ط.ا
۶۳	عورت اور مذاہب عالم	محمد شعیب نگرامی	۸	۱۴۲۲ھ	ط.ا
۶۴	غایۃ التحقیق فی تضحیۃ ایام التشریق	محمد رئیس ندوی	۴	۱۴۱۹ھ	ط.ا
۶۵	غیبت اور مسلم معاشرہ پر اسکے مضر اثرات	حسین العوایشہ/ترجمہ: محمد انس سلفی	۳	۱۴۱۹ھ	ط.ا
۶۶	فتح الباب لعقائد اولی الأدب	نواب صدیق حسن خان/عبدالمعید سلفی	۶		ط.ا
۶۷	فتنۂ انکار حدیث کا ایک نیا روپ	غازی عزیر	۶		ط.ا
۶۸	قادیانیت اپنے آئینے میں	صفی الرحمٰن مبارکپوری	۳	۱۴۰۰ھ	ط.ا
۶۹	قبروں پر مساجد کی تعمیر اور اسلام	علامہ البانی/ترجمہ: محفوظ الرحمٰن	۵	۱۹۸۲ھ	ط.ا
۷۰	قبولیت عمل کے شرائط	محمد منیر قمر سیالکوٹی	۳	۱۴۲۳ھ	ط.ا
۷۱	قرۃ العینین بمسرۃ العیدین	محمد ابراہیم میر سیالکوٹی	۳	۱۴۱۳ھ	ط.ا
۷۲	القول الجمیل فی الکشف عند الدلیل	احسن جمیل عبدالبصیر سلفی	۳	۱۴۱۴ھ	ط.ا
۷۳	قیاس ایک تقابلی مطالعہ	محمد سلیمان الاشقر/ عبدالوہاب حجازی	۴	۱۴۰۴ھ	ط.ا
۷۴	کائنات کا آغاز وانجام	محمد الاعظمی	۳	۱۴۱۸ھ	ط.ا
۷۵	کتاب الکبائر	ابوعبداللہ للذہبی/عبدالوہاب حجازی	۶	۱۴۰۳ھ	ط.ا
۷۶	کمیونزم اور مذہب	ڈاکٹر طارق حجی/ترجمہ: عبدالوہاب حجازی	۴	۱۴۰۴ھ	ط.ا
۷۷	کیا اقلیم ہند میں اشاعت اسلام صوفیاء کی...	غازی عزیر	۲	۱۴۱۴ھ	ط.ا
۷۸	گفتار نسیم	عبدالقدوس نسیم بناری	۱۴	۱۴۱۴ھ	ط.ا
۷۹	اللمحات الی مافی انوار الباری من الظلمات ۲	محمد رئیس ندوی	۸	۱۹۸۲م	ط.ا
۸۰	اللمحات الی مافی انوار الباری من الظلمات ۳	محمد رئیس ندوی	۳	۱۴۰۵ھ	ط.ا
۸۱	اللمحات الی مافی انوار الباری من الظلمات ۴	محمد رئیس ندوی	۳	۱۴۰۶ھ	ط.ا
۸۲	ماسونیت ایک تاریخی دستاویز	محمد صفوت سقا امینی/عبدالوہاب حجازی	۶	۱۴۰۴ھ	ط.ا
۸۳	مجموعہ مقالات سیرت طیبہ کانفرنس	جماعۃ من العلماء	۸	۱۴۱۵ھ	ط.ا
۸۴	محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں......	مولانا محفوظ الرحمٰن	۲۱	۱۴۲۲ھ	ط.ا

۸۵	مولانا محمد جوناگڈھی حیات وخدمات	ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن/عبداللہ اسماعیل سلفی	۳	۱۴۱۶ھ	ط.ا
۸۶	مسائل قربانی مع توضیحات عینی	عین الباری عالیاوی	۲	۱۴۰۸ھ	ط.ا
۸۷	مسائل قربانی مع توضیحات عینی	عین الباری عالیاوی	۳	۱۴۲۳ھ	ط.ا
۸۸	مردے سنتے نہیں	نعمان بن محمود آلوسی/محمد صالح بنارسی	۵	۱۴۰۳ھ	ط.ا
۸۹	مسلم نوجوان اور اسلامی تربیت	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۲	۱۴۲۳ھ	ط.ا
۹۰	مسیحیت کی نقاب کشائی	عبداللہ ترجمان اندلسی/عبدالقیوم محمد شفیع	۴	۱۴۱۷ھ	ط.ا
۹۱	معاویہ بن ابی سفیان ایک مجاہد صحابی	محمد منیر الغضبان	۱۳	۱۴۰۶ھ	ط.ا
۹۲	مؤتمر الدعوۃ والتعلیم نمبر		۷	۱۴۰۱ھ	ط.ا
۹۳	موسم ثقافی نمبر		۸		ط.ا
۹۴	نظم البیان بلطائف البیان	ابوالمعالی محمد علی فیضی	۴	۱۴۱۴ھ	ط.ا
۹۵	نفقۂ مطلقہ	محمد رئیس ندوی	۲		ط.ا
۹۶	نماز جنازہ کے احکام ومسائل	محمد رئیس ندوی	۲		ط.ا
۹۷	نماز میں صحیح صف بندی اور اس کے فوائد	حسین العوالیۃ/ترجمہ: ابوالمکارم املوی	۳	۱۴۲۰ھ	ط.ا
۹۸	وسیلۃ النجاۃ بأداء الصوم والصلوۃ والحج والزکاۃ	نواب صدیق حسن خان	۲	۱۴۰۱ھ	ط.ا
۹۹	وعدۂ برحق	طٰہٰ حسین/ترجمہ: عبدالمجید حریری	۵	۱۴۱۲ھ	ط.ا

(عربی)

١	الأباطيل والمناكير والصحاح والمشاهير	ابو عبدالله الجورقانی/ عبدالرحمن الفريوائی	٣	١٤٠٣ھ
٢	ابكار المنن فی تنقيد آثار السنن	محمد عبد الرحمن /ابو القاسم عبدالعظيم	٤	١٤١٠ھ
٣	ازمة الخليج فی ميزان الشرع والعقل	مجموعة من العلماء	٤	١٤١١ھ
٤	ازهار العرب	محمد بن يوسف السورتی/ ابو القاسم السلفی	٦	١٤١٣ھ
٥	اهمية السيرة الطيبة لعالم البشرية	د۔ نثار أحمد الفاروقی	١٣	١٤١٢ھ
٦	اتحاف الكرام شرح بلوغ المرام	صفی الرحمن المباركفوری	٢	١٤٠٣ھ

٧	الباعث الحثيث فى فضل علم الحديث	عبد الجليل السامرودى/ عبدالرحمن الفريوائى	٨	١٤١٠ه
٨	بحوث الندوة العالمية عن حياة ابن تيمية	مجموعة من العلماء	٢	١٤١٢
٩	البيان المكمل فى تحقيق الشاذو المعلل	حسين بن محسن اليمانى	٢	١٣٩٩ه
١٠	تاريخ الأدب العربى	أحمد حسن الزيات	٢	١٤٢٦ه
١١	تراث المسلمين العلمى فى نظرابن تيمية	د۔ عبدالرحمن الفريوائى	٣	١٤١٤ه
١٢	التذكرة والاعتبار والانتصار للأبرار	ابن شيخ الحزاميين/عبدالرحمن الفريوائى	٦	١٤٠٨ه
١٣	تعريف بكتاب السلفية مرحلة زمنية مباركه	محمد فريز منفيخى	٦	١٤١٥ه
١٤	تقوية الايمان	محمد اسمعيل الدهلوى / عبدالوحيد الرحمانى	٢	١٤٠٦ه
١٥	تيسير العلى القدير لاختصار تفسير ابن كثير	محمد نسيب الرفاعى	٤	١٤٢٢ه
١٦	جائزة الاحوذى فى التعليقات على الترمذى	محمد ثناء الله المدنى	٢	١٤٢٥ه
١٧	جهود اهل الحديث فى خدمة القرآن الكريم	د۔ عبدالرحمن الفريوائى	٢	١٤٠٠ه
١٨	جهود مخلصة فى خدمة السنة المطهرة	د۔ عبدا لرحمن الفريوائى	٢	١٤٠٠ه
١٩	جهود مخلصة فى خدمة السنة المطهرة	د۔ عبدا لرحمن الفريوائى	٢	١٤٠٠ه
٢٠	الجهاد فى الإسلام لدفع العدوان	ابن تيميه/ د۔ عبدالرحمن الفريوائى	٦	١٤١٢ه
٢١	الحجة على تارك المحجة	ابو الفتح المقدسى/ د. محمد ابراهيم البنارسى	٢	١٤١٩ه
٢٢	حركة الانطلاق الفكرى و جهود الشاه ولى الله	محمد اسماعيل السلفى/د. مقتدىٰ حسن	٢	١٣٩٦ه
٢٣	حركة الانطلاق الفكرى و جهود الشاه ولى الله	محمد اسماعيل السلفى/د. مقتدىٰ حسن	٢	١٤٠٩ه
٢٤	الحسام الماحق لكل مشرك ومنافق	د. محمد تقى الدين الهلالى	٤	١٤٠٠ه
٢٥	حصول المأمول من علم الأصول	النواب صديق حسن / د. مقتدى حسن	٤	١٣٩٢ه
٢٦	حياة المحدث شمس الحق وأعماله	محمد عزير شمس	٢	١٣٩٩ه
٢٧	حياة المحدث شمس الحق وأعماله	محمد عزير شمس	٢	١٤١٢ه
٢٨	دراسات فى الحضارة الاسلامية العربية	د. عبد العلى	٣	١٤١١ه
٢٩	دروس البلاغة مع شرحه شموس البراعة	د. محمد فضل حق الرامفورى	١	١٤٠٧ه
٣٠	رفع الالتباس على بعض الناس	محمد شمس الحق /محمد عزيز شمس	٥	١٣٩٥ه
٣١	الرواة الذين تكلم عليهم البيهقى فى	كفايت الله السلفى	٢	١٤١٤ه

٣٢	السنة والشيعة	محمد رشيد رضا/ عبدالرحمن الفريوائی	٥	١٤٠٨ھ
٣٣	سيرة الإمام البخاری	محمد عبدالسلام المباركفوری	١٢	١٤٠٦ھ
٣٤	السيرة العلمية لشيخ الإسلام ابن تيمية	د۔عبدالرحمن الفريوائی	٤	١٤١٠ھ
٣٥	شرح العقيدة الواسطية	ابن تيمية/شرح: محمد خليل هراس	١٠	١٤٠٩ھ
٣٦	شرح العقيدة الواسطية	ابن تيمية/شرح: محمد خليل هراس	١	١٤١٩ھ
٣٧	عناية علماء المسلمين بموضوع التوحيد	بديع الدين شاه الراشدی/ علی حسين	٢	١٤١٥ھ
٣٨	فتح المغيث بشرح الفية الحديث	عبدالرحمن السخاوی/علی حسين	٦	١٤٠٧ھ
٣٩	فتح المنان بتسهيل الاتقان	جلال الدين السيوطی/ د۔ مقتدیٰ حسن	٢	١٤٢٣ھ
٤٠	الفوزالكبير فی اصول التفسير	ولی الله الدهلوی/ محمد منيرا لحق	٤	١٤٢٥
٤١	قراءة فی كتاب الحالة الخلقية للعالم الإسلامی	د. مقتدیٰ حسن ازهری	٢	١٤٢١ھ
٤٢	القول السديد فی كشف حقيقة التقليد	محمد الأمين الشنقيطی	٢	١٤٠٣ھ
٤٣	مبادئ الاقتصاد الإسلامی	د. عبدالعظيم الإصلاحی	٦	١٤٢١ھ
٤٤	مجموعة من النظم والنثر	محمدشريف سليم	٢	١٤١٨ھ
٤٥	مرعاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح	العلامة عبيد الله الرحمانی المباركفوری	٢	١٤٠٥ھ
٤٦	مؤتمر الدعوة والتعليم (عددخاص)		٥	١٤٠٠ھ
٥٧	الموسم الثقافی (عدد خاص)		٧	١٤٠١ھ
٤٨	المقريزی حياته بيئته وآثاره	د. السيد كفيل احمد القاسمی	٥	١٤١٥ھ
٤٩	نزهة النظر فی توضيح نخبة الفكر	ابن حجر العسقلانی/عبدا لسلام المدنی	١	١٤١٨ھ
٥٠	نظرة الی مواقف المسلمين من احداث الخليج	د. مقتدیٰ حسن الأزهری	٤	١٤١١ھ
٥١	النواب صديق حسن بين المعارضة والتائيد	عبدالمعيد سلفی	٢	١٤١٠ھ
٥٢	وجهتان متضادتان فی الشيخ محمد بن عبدالوهاب	ترجمة: د. رضاء الله	١٢	١٤٢٥ھ
٥٣	الوهابيون والحجاز	محمد رشيد رضاء/عبدالرحمن الفريوائی	١١	١٤٠٩ھ
٥٤	فتح المنان بتسهيل الاتقان	جلال الدين السيوطی/ د.مقتدیٰ حسن	٣	١٤٠٩ھ

دیگر اداروں کی مطبوعات

۱۔	فتنوں کی سرزمین نجد یا عراق	مولانا رضاء اللہ عبدالکریم بدایونی
۲۔	مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین
۳۔	سلفیت کا تعارف اور اس سے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ	ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس مبارکپوری
۴۔	نغمۂ کہکشاں	حیرت بستوی
۵۔	تذکرۃ المناظرین	مولانا محمد مقتدیٰ اثری
۶۔	الفرقان بین اولیاء الرحمٰن واولیاء الشیطان	ترجمہ: مولانا ابوالمکرم عبدالجلیل سلفی
۷۔	نقوش حرم	محمد فاروق اعظمی جلگاؤں
۸۔	احباب دیوبند کی کچھ تازہ کرم فرمائیاں	مولانا رضاء اللہ عبدالکریم مدنی
۹۔	عشرۂ مبشرہ	مولانا ایمن مدینی
۱۰	عظمت صحابہ	مولانا ایمن مدینی
۱۱۔	ایام خلافت راشدہ	مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری
۱۲۔	فقہ الحدیث	مولانا حافظ عمران ایوب لاہوری
۱۳۔	مشکوٰۃ المصابیح	ترجمہ: مولانا محمد صادق خلیل
۱۴۔	سیرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ	مولانا عبدالمبین منظر
۱۵۔	تاریخ اہل حدیث	ڈاکٹر بہاء الدین صاحب
۱۶۔	شعاع حرم	حیرت بستوی
۱۷۔	ماکولات ومشروبات	مولانا رفیع اللہ مسعود تیمی
۱۸۔	گلوبلائزیشن	عبدالرزاق عبدالغفار گونڈوی
۱۹۔	فکر اقبال	ابن احمد نقوی
۲۰	سنن ابی داؤد مترجم	ترجمہ: مجلس علمی دارالدعوۃ دہلی
۲۱۔	زادالخطیب	مولانا حافظ محمد اسحاق زاہد
۲۲۔	تحفظ سنت کانفرنس مئی ۲۰۰۱ء پر ایک نظر	مولانا محمد رئیس ندوی
۲۳۔	فرقہ بندی سے نجات	مولانا عبدالمبین منظر

ڈاکٹر ازہریؒ خطوط کے آئینہ میں

(ڈاکٹر ازہریؒ نے بے شمار خطوط لکھے ہیں ان خطوط سے ایک تاریخ مرتب ہوسکتی ہے بطور نمونہ چند خطوط شائع کئے جارہے ہیں۔ (ادارہ))

ڈومن پورہ مئو
باسمه تعالى

سيدى وأستاذى الدكتور المحترم متعنا الله بطول بقائكم

سلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد: فارجو أن تكونوا على أتم الصحة والعافية والسعادة والرخاء، ثم من دواعى السرور والابتهاج أنى قد تشرفت بخطابكم الكريم الذى تكرمتم فيه بإبداء توجيهات نافعة ومشورات قيمة فى الأمور التى تهمنى وخاصة فى مجلة صوت الجامعة، والحق أنى كنت أتمنى منذ زمن كثير أن أبدى لسيادتكم رغبتى فى استطلاع رأيكم السامى حتى أتمكن من إخراج المجلة على أحسن مايمكن، وأنا إن شاء الله أتمسك بكل ما أشرتم وتشيرون على فى أمر المجلة، فإن لى فى ذلك نفعا وفخرا

وخطابكم الكريم قد أفادنى بأن سيادتكم قد تعرضتم لبعض الأمراض واستمر المرض إلى أن حصل التاخير فى السفر إلى البلد، وهذا الخبر قد آسفنى وأقلقنى والله تعالىٰ أسأل أن يعجل ويديم لسيادتكم الصحة الكاملة ويوفر لكم الراحة والعافية، وهو سميع الدعوات ومجيبها.

هذا، و إنى أذكر إلى الآن ما تكرمتم بإشارته علىّ من أن المقالات التى تنشر فى المجلة يلزم أن لاتكون معظمها من جامعة عليكره كيلا يجد الناس سبيلا للقول أو الطعن فى المجلة ومديرها، ولكن السبب الذى اضطرنى فى هذه المرة لفعل ما لاحظتم هو أنه كان من المقرر أن يخرج عدد جمادى الأولىٰ قبل هٰذه العطلة الصيفية، وبما أنى قد كنت وصلت إلى الجامعة متأخرا ولم يكن لدى من المقالات ما أسد به فراغ الصفحات، و بما أنى لم أستطع أن أحصل على بعض مقالاتكم حين مغادرتى لعليكره وجدت نفسى مكرها على أن أنشر بعض المقالات الطويلة كاملة مع أنى كنت أحب أن أختصرها، وإنى قدسررت جدا بتنبيه سيادتكم إياى على هذا الخطأ الفنى فى ترتيب المجلة، وإنى أحاول فيما يأتى أن أتفادى مثل هذه الأخطاء، وفى نفس الوقت أرجو من سيادتكم أن تتكرموا بإبداء توجيهاتكم الرشيدة نحو ترتيب المجلة و إخراجها حتى أتمكن من أداء مسئوليتى على طريقة مرضية، وبهذا الصدد ألتمس من سيادتكم أن تتكرموا بإعطاء بعض مقالاتكم القيمة لنشرها فى المجلة، فإننى بعد ذلك لا أكون فى حاجة إلى أن أطلب مقالات الآخرين من جامعة عليكره، وفى نفس الوقت يرتفع مستوى المجلة حينما تنشر فيها مقالات سيادتكم العلمية.

أما بالنسبة لعملى فى كتاب بهجة المجالس وتصحيحه فأقول بأن أقوم الآن بتخريج بقية الأحاديث والأقوال المنثورة مستعينا بالمراجع التى ظفرت بها فى بنارس فى مكتبة الجامعة و فى بعض المكتبات الشخصية، وإنى سوف أحضر إلى عليكره لعرض العمل الذى أكمله فى بنارس وللحصول على مزيد من توجيهاتكم وارشاداتكم النافعة، وإنى على يقين أن العمل سيتم فى هذه السنة إن شاء الله إذا استمر اهتمامكم وعنايتكم الكريمة.

وجامعة نهرو بدلهى فسمعت أن الاختبار يجرى هناك فى آخر شهر يونيو، ولكن إلى الآن لم يصلنى أى خبر من جهة مسئولة وإنى قد تقدمت بطلبى هناك على أمل أن سيادتكم تكونون ضمن لجنة الاختبار، وهذا هو الامر الذى يسهل لى بعض التسهيل أما فى الصورة الاخرى فليس لى كبير أمل فى القبول هناك.

أما بالنسبة لمطبع الجامعة فسأكتب إلى سيادتكم عن جميع ما سألتم عنه حينما أرجع إلى الجامعة والمؤسف أن الاضطرابات الطائفية قد نشبت الآن فى بنارس منذ أيام ومن الممكن أن هذا الحادث المرير قد يؤخر وصولى إلى بنارس ومع ذالك أكتب التفصيلات اللازمة بعد عودتى إلى الجامعة.

وختاما أقدم إلى سيادتكم أجزل الشكر وأخلص الاحترام، وأبلغ أطيب التحيات إلى الأهل والأسرة وأرجو للجميع كل الخير والسعادة،

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

تلميذكم مقتدىٰ حسن
۱۹۷۲/۶/۲۱ء

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی دارلعلوم
ریوری تالاب وارانسی
فی ٦/١٠/١٩٧٢م

إلی أستاذی الأفخم السید ادکتور المحترم
أستاذ و رئیس القسم العربی بجامعة علی کره

سلام علیکم ورحمة الله وبرکاته وبعد:

فأتشرف بإحاطة سیادتکم علما بأن الامتحان السنوی للجامعة السلفیة قد انتهیٰ فی یوم ٢٥/شعبان ٩٢ھ وقد أعلنت العطلة السنویة لهذا العام علی أن تفتح الجامعة وتعاود نشاطها الدراسی فی ١٠/شوال القادم. وکان فی ودی أن أتشرف بمقابلتکم فی هذه العطلة و لکنی اضطررت إلی البقاء فی الجامعة طوال شهر رمضان نظرا إلی ان مطبعة الجامعة قد بدأت طبع کتابین وهما: مجموعة النظم والنثر (فی الادب) وحصول المأمول (فی أصول الفقه) والمسئولون قد کلفونی بالإشراف علی الطبع والتصحیح وبناء علی ذلک لایمکن لی الحضور فی الجامعة والاستفادة من إرشاداتکم وتوجیهاتکم فی شهر رمضان والمنوی أن أتشرف بمقابلة سیادتکم فی أول شهر شوال، إن شاء الله

هذا وقد ذکر لی أمین عام الجامعة السلفیة أنه قد تقدم بطلب إلی سیادتکم وإلی مسجل الجامعة الاسلامیة للحصول علی قبول شهادتی الجامعة السلفیة "العالمیة" و "الفضیلة" فأرجو من حضرتکم التکرم بالتوصیة وبذل الجهود الممکنة حتی تقبل شهادتنا فی جامعتکم المؤقرة و یمکن للطلبة المتخرجین فی جامعتنا الالتحاق فی کلیة الطب والقسم الانجلیزی و تسنح لهم الفرصة للتقدم ومواصلة الدراسات العلیا:

إن المسئولین فی الجامعة السلفیة لهم أمل کبیر فی أن فضیلتکم تتکرمون بتسهیل مشاکلهم وتحقیق أهدافهم فی سبیل قبول الشهادات فی الجامعة الإسلامیة بعلیکره، وإنی علی یقین أن أملهم هذا فی موضعه وسوف ینجحون فی مرامهم.

وختاما أقدم إلی حضرتکم وإلی الأهل والأسرة أطیب التحیات و أزکی التمنیات بمناسبة حلول شهر رمضان المبارک وأرجو من الله تعالیٰ أن هذا الشهر سیکون للجمیع شهر الخیر والیمن والسعادة وشهرا تتحقق فی الآمال وتسعف الحاجات.

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

تلمیذکم

مقتدیٰ حسن

٦/١٠/١٩٧٢م

باسمه تعالیٰ

مركزى دارلعلوم ،بنارس
في ۲۹/۷/۱۹۷۲م

سيدى و أستاذى الدكتور المحترم

سلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد فقد سبق أن أرسلت إلى سيادتكم رسالة على عنوان پٹنه، والأمل أنها وصلت إليكم.

أما هذا الخطاب فأتشرف برفعه إلى فضيلتكم بخصوص أنى قد تلقيت برقية من جامعة نهرو بدلهي الجديده تفيد بأن المسئولين هناك قد قرروا إجراء اختبار للذين تقدموا بطلبهم للحصول على وظيفة "المحاضر" في الجامعة وذلك في يوم ۷ من شهر أغسطس. وإني لاأعلم من يكون من الممتحنين هناك، ولكن عندى رغبة و أمل لو حصلت على هذه الوظيفة.

فلو كان لدى سيادتكم علم بالممتحن، ولايكون لديكم مانع من التوصيته لديه في حقى فأرجو أن تتكرموا بالتوصية والتوسط حتى يبدى هو رأيه لصالحي في الاختبار، وإني سوف أذهب إلى دلهي في يوم ۵ من شهر أغسطس و أتشرف بمقابلة سيادتكم في العودة.

أما بالنسبة لأجرة طبع بحثي في المطبعة عندنا فهم أخبروني أنهم يأخذون على طبع كل صفحة من هذا المقياس ۱۵ خمس عشرة روبية، وبما أن صفحات البحث تبلغ إلى ۶۴ صفحة تكون الأجرة ۹۶۰ روبية.

وأخيرا أهدى سلامي إلى فضيلتكم وإلى الأهل والأسرة وأرجو للجميع كل الخير والسعادة والرخاء.

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته
تلميذكم
مقتدیٰ حسن
دارالعلوم۔ بنارس

باسمہ تعالی

۲۰/۲/۱۹۷۵ء

حضرۃ الاستاذ المحترم الدکتور المعظم *۔ متعنا اللہ بطول بقائکم

سلام مسنون۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ مرسلہ لفافہ مع تبصرہ موصول ہوا، کمپوزنگ میں نے شروع کرادی ہے، عبدالمعید خاں صاحب والے مضمون اور تھوڑا حصہ عرشی صاحب کے مضمون سے لے کر میں شمارہ نمبر دو کے ابتدائی دوفرمے چھپوارہا ہوں، پھر آگے ایک فارم فائنل پروف ریڈنگ کے لئے عرشی صاحب کو رامپور بھیج دوں گا، واپسی پر اسے بھی چھپوادوں گا، عرشی صاحب کے مضمون کے لئے ۲۰۰ آف پرنٹس کے لئے بھی انتظام کرلیا ہے۔

میرے لئے یہ چیز بے حد اطمینان بخش ہوگی کہ پہلا شمارہ مکمل ہوکر یہاں سے چلا جائے، تاکہ کسی طرح کے ضیاع ونقصان کا اندیشہ ختم ہوجائے۔ اب تک جتنے فارم چھپ چکے ہیں اور جو کاغذ خریدے گئے ہیں ان کا بل ارسال کررہا ہوں۔ بقیہ بل کام کی تکمیل کے بعد بھیجا جائے گا۔

آپ کی تشریف آوری کی خبر سے بیحد مسرت ہوئی۔ مگر گستاخی معاف، یہ معلوم ہوتو اطمینان ہوگا کہ آنجناب کا سفر صرف میگزین کے لئے ہورہا ہے یا کوئی اور ضرورت ہے، اگر کوئی دوسری ضرورت ہوتو بہتر ہے ورنہ صرف میگزین کے لئے اتنے طویل سفر کی زحمت برداشت فرمائیں تو مجھے اس پر تشویش ہے، میں بسروچشم آپ کی آمد کے لئے منتظر ہوں لیکن اگر اس سفر کا باعث ہمارے پریس کی کوتاہی ہوتو یہ میرے لئے دلی رنج کا باعث ہوگا۔

میری بیماری اس وقت بے حد شدید ہے، پیر کا درد ہر وقت رہتا ہے اور کبھی کبھی بہت زیادہ ہوجاتا ہے، بنارس یونیورسٹی میڈیکل کالج کے ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے یعنی یہ کہ کسی بھی وقت چارپائی سے نہ تو اٹھوں نہ چلوں پھروں۔ ایسی صورت میں رسالہ کا کام بھی بند ہے، خدا کرے جلد شفا ہوجائے تو پھر اس کو مکمل کروں۔

گھر پر تمام افراد کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں اور عزیزان کو دعائیں۔

والسلام

آپ کا ادنی شاگرد

مقتدیٰ حسن

* مطبوعہ خطوط میں جہاں بھی حضرۃ الاستاذ یا استاذ گرامی لکھا گیا ہے اس سے مراد پروفیسر مختارالدین آرزوؔ ہیں جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ عربی کے پروفیسر وصدر تھے اور ڈاکٹر صاحب کے مقالہ کے نگراں تھے۔ ڈاکٹر صاحب حد درجہ ان کا احترام کرتے تھے اسی طرح آرزو صاحب نہ صرف یہ کہ آپ کے مداح تھے بلکہ آپ کے متعلقین کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کے زیادہ تر خطوط انہیں سے مل سکے ہیں۔

باسمہ تعالی

مرکزی دارالعلوم
ریوڑی تالاب، وارانسی
۳؍جنوری ۱۹۷۵ء

استاذ گرامی حضرت الاستاذ ڈاکٹر صاحب قبلہ۔زیدت فیوضکم

سلام مسنون۔امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔مرسلہ رجسٹرڈ لفافہ موصول ہوا، مجھے آنجناب کے والا نامے کا شدید انتظار تھا، کئی مرتبہ مدرسہ کے نائب ناظم صاحب بھی میگزین کی بابت دریافت کر چکے تھے،اس لئے میں بیحد منتظر تھا کہ آپ کچھ تحریر فرمائیں تو پھر ان لوگوں کو جواب دے سکوں۔اس وقت سکریٹری صاحب سفر حج پر گئے ہوئے ہیں اور ان کی جگہ پر نائب سکریٹری کام کر رہے ہیں۔

دونوں مضامین جو اس لفافہ میں آئے ہیں انھیں آپ کے حسب الحکم میں میگزین کے دوسرے شمارے میں شامل کرادوں گا، عرشی صاحب کا مضمون عبدالمعید خاں کے مضمون کے ساتھ دوسرے شمارے کے شروع کے ۴۸ میں اور احتشام صاحب کا مضمون راشد صاحب کے مضمون کے بعد۔عرشی صاحب کے مضمون کی مزید دوسو کاپیاں بھی ہدایت کے مطابق طبع کرالوں گا،لیکن یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میگزین کا کام شروع کرانے میں دو تین ہفتے کی تاخیر ہوگی کیونکہ ایک کتاب (شرح مشکاۃ کے علاوہ) زیر طبع ہے اور اس کے ساتھ ہی مرعاۃ کا کاغذ ملنے میں تاخیر کی وجہ سے کمپوزنگ کے کام میں تعطل پیدا ہو گیا ہے، کاغذ آجانے پر یہ دشواری ختم ہو جائے گی۔

میگزین کے پہلے شمارے کی تکمیل کب تک ہوگی، امید کہ تحریر فرمائیں گے، یہاں پر مطبوعہ فارموں کو رکھنے کا چونکہ معقول انتظام نہیں ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں انھیں رکھے رکھے ہی کوئی ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ مجھے آنجناب کے سامنے شرمندگی اٹھانی پڑے۔یہاں مدرسہ میں نظم کے بارے میں آپ سے کیا عرض کرسکتا ہوں۔

دارالعلوم کے کاموں سے فراغت کے اوقات میں میں اپنے رسالہ کی تکمیل و تبییض کا کام کرتا ہوں اور ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ جلد اسے مکمل کرلوں، غیر معمولی تاخیر سے مجھے شرمندگی ہے اور اس میں میرا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔

کفیل صاحب یہاں آئے تھے، ان کے لئے مجھ سے جو کچھ ممکن ہو سکے گا دریغ نہ کروں گا، آپ کی ہدایت کے بعد یہ میرا فرض ہے، ان شاءاللہ کوتاہی نہ ہوگی۔

یونیورسٹی کی اس جگہ کا بروقت مجھے علم نہ ہو سکا تھا اس لئے درخواست نہیں دی تھی۔سعودی عرب کے رابطہ کی جانب سے میری تقرری معرض التواء میں ہے اس لئے کہ جو اسکیل ان لوگوں نے بتائی ہے اس کو قبول کرنے میں مجھے تامل ہے، ممکن ہے سکریٹری صاحب وہاں سے اس معاملہ کو طے کر کے آئیں۔

امید ہے گھر پر سبھی لوگ بخیر و عافیت ہوں گے، جملہ افراد کی خدمت میں سلام و احترام عرض ہے

والسلام
تلمیذکم مقتدیٰ حسن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استاذی المحترم حضرۃ الدکتور أبقاکم اللّٰہ منبعا للعلوم و مصدرا للفیوض

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔

ایک لفافہ مشتمل بر مضمون مکتوب نورالحسن صاحب ارسال کر چکا ہوں امید کہ پہونچ چکا ہوگا۔ اس رجسٹرڈ لفافہ کے ساتھ میگزین کے شمارہ نمبرا کے ابتدائی صفحات پر مشتمل ایک فارم ارسال ہے، ایڈیٹوریل کے دو یا تین صفحات مزید موجود ہیں، جب یہ فارم تصحیح کے بعد طبع ہو جائے گا تو اس کی کمپوزنگ بھی کرادوں گا۔ بلاک کا پروف بھی ساتھ ہی ارسال ہے، اس پر عبارت ملاحظہ فرمائیے پھر سن پیدائش یا سن وفات کے بارے میں بھی تحریر فرمائیے کہ کس طرح رکھا جائے۔ تصویریں کچھ دھندلی آئی ہیں لیکن مزید صاف اور واضح ہو جائیں گی بلاک کی نیچے والی لکڑی کو کچھ گھسنا پڑے گا۔

میرا خیال یہ ہے کہ جب ایڈیٹوریل کی طباعت مکمل ہو جائے تو پھر پہلے شمارے کی بینڈنگ کرالی جائے یعنی سلائی وغیرہ ہو جائے صرف کور باقی رہ جائے جسے بعد میں تیار کرا کر لگا دیا جائے۔ یہ عرض اس لئے کر رہا ہوں کہ چھپائی کے بعد بغیر سلائی کے تمام اوراق رکھے ہوئے ہیں، ان میں کا جو حصہ باہر پڑا ہے وہ میلا ہو رہا ہے، اگر سلائی ہو جائے گی تو محفوظ ہو جائے گا۔

اگر پہلا شمارہ مطبوعہ آخری مضمون پر ختم کر دیا جائے تو کل ۱۱ فارم کی ضخامت ہوگی۔ اور اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ابوزہرہ والے مضمون کو بھی اسی شمارے میں شریک کر لیا جائے۔ بقیہ حالات اچھے ہیں۔ گھر پر تمام افراد کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں، عزیزان کو دعائیں۔

پروف اور ان کی اصل دونوں ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
تلمیذکم مقتدیٰ حسن
۲ رستمبر ۷۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترم مولانا عبداللطیف اثری صاحب/ حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض ہے کہ ابوالاشبال صاحب کا مضمون ’’محدث‘‘ میں اشاعت کے لئے کمپوز ہوا تھا، اور میں نے اس پر ایک نوٹ بھی لکھا تھا، لیکن شاید اسے ’’محدث‘‘ والے شائع نہ کریں، اس لئے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں، اگر مناسب معلوم ہو تو اسے ’’افکار عالیہ‘‘ میں مع نوٹ یا بغیر نوٹ شائع کر دیں۔ البتہ اگر نوٹ شائع کریں تو اسے ادارہ ’’افکار عالیہ‘‘ کی طرف سے کیجئے۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ تمام اساتذہ کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

والسلام
مخلص
مقتدیٰ حسن
۱۳ رفروری ۰۶ء

نوٹ: مضمون کی تصحیح ضرور کرلیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجامعۃ السلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس

۱۶ر جولائی ۷۷ ۱۹ء

حضرۃ الاستاذ المکرّم عالی جناب ڈاکٹر صاحب۔ زید مجدکم

سلام و نیاز۔ گرامی نامہ موصول ہوا، مجھے اس بات سے بیحد خوشی ہے کہ آپ کو میں نے صحیح صورت حال سے باخبر کردیا، میں ادارے کی اس کمزوری کو اسی لئے نہیں بتا تا تھا کہ لوگ اچھا نہیں سمجھیں گے، لیکن جب مجبوری ہوئی تو عرض کیا، ایک بات یہ بھی عرض کردوں کہ مجلّہ کی تیاری کے بعد میں نے ریل پارسل سے بھیجنے کی بات بھی بتادی تھی، لیکن خط لکھ کر پوچھنے کا تکلف اس لئے انھوں نے کیا کہ اس طرح کچھ اور وقت مل جائے گا۔ بہر کیف اب وہ بھیجنے کی تیاری میں ہیں، چاہے ثناء اللہ کے ذریعہ یا پارسل سے، خدا کرے جلد پہونچ جائے۔

نخبۃ الادب حصہ دوم کی طباعت کا آپ نے ان کے خط میں تذکرہ فرمایا تو وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ اس سلسلہ میں کیا کرنا ہے مجھے کچھ علم نہیں۔ میں نے کہا کہ اصل میں جو اسباق کتاب سے خارج کردیئے گئے تھے ان پر مشتمل دوسرا حصہ طبع کرانا ہے۔

آپ سے یہ گزارش ہے کہ ماسٹر عبدالمنان صاحب کو نخبۃ الادب طبع سابق سے صرف وہ اسباق علیحدہ کرا کر بھجوادیجئے جن کی طباعت ہونی ہے اور یہ بھی لکھ دیجئے کہ وہ اس کام کو ابھی شروع کرادیں، اس کے بغیر پھر معاملہ التواء میں پڑ جائے گا۔ میں اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

مزید مضمون فرزانہ کے نام کا چھاپنے کا علم نہیں تھا ورنہ اب تک کوئی انتظام کردیتا، اب ان شاء اللہ جلد ہی شائع کروں گا، مضمون دیکھ لوں تب کہ کون سا موجود ہے اور کیسا ہے۔

شمارہ نمبر ۲ کے لئے ایک نوٹ آپ کا تحریر فرمودہ نور القبس المختصر من المقتبس پر اور وفیات میں ایک مضمون ابوزہرہ پر موجود ہے۔

اپنے مقالہ پر نظر ثانی کا ارادہ تو آپ کی ہدایت کے بعد ہی سے مصمم ہے اور اسی وجہ سے کتاب بھی اپنے پاس ہی رکھتا ہوں لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ابھی اس سلسلہ میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی ہے جس پر ندامت ہے۔ میں اس کی طباعت کے لئے آپ کی ہدایت کے مطابق لکھوں گا۔

ادھر پچھلے دنوں عربی ادب کی تاریخ پر شوقی ضیف کی کتاب کی تلخیص میں نے اپنے نام سے شائع کی ہے جو جاہلی دور سے متعلق ہے۔ اسی طرح مسلکی اختلافات سے متعلق ایک اردو کتاب کا عربی ترجمہ بھی میں نے کیا تھا جو شائع ہوا، یہ دونوں چیزیں آپ جب بنارس ہندو یونیورسٹی شعبہ عربی کے لئے لیکچرر کے انٹرویو کی غرض سے تشریف لائیں گے تو نذر خدمت کروں گا۔ میں بھی اس جگہ کا امیدوار ہوں اور عبدالمنان صاحب کے بھائی ابو حاتم بھی جو اسی شعبہ میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ آپ کو میں نے اطلاعاً لکھ دیا کہ ممکن رہے تو ضرور توجہ فرمائیں گے۔

محترمہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں بہت بہت سلام و احترام اور گھر کے دوسرے افراد کو بھی سلام نیز ڈاکٹر صدر الحق کو، عزیزان کو دعائیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ناچیز شاگرد

مقتدیٰ حسن

بسم الله الرحمن الرحيم

إلى أخي الكريم وصديقي المخلص العالم الفطين محمد عمران أعظمي عمري

مصحح دائرة المعارف بالجامعة العثمانية بحيدر آباد حفظه الله وتولاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد:

فقد تشرفت منكم. كنعمة غير مترقبة (كما يقال بالأردية) بكتابين في يومين متعاقبين، فجزاكم الله خيرا على هذه الكتابة اللطيفة والقصيدة الرائعة، بالعربية وبالأردية.

كنت عارفا ومعترفا بعلو منزلتك ورسوخ قدمك في العلم والادب، ولكن كتابكم المشار اليه قد كشف لي المزايا الأدبية العظيمة الخفية الاخرى التي ماكنت ملما بها الى الآن، وبذلك تاكد لدى أن مشيكم مكبا على الوجه أيام الشباب لعله جعلكم ترفعون رأسكم اليوم في مجال البحث والتحقيق.

ان الموضوع الذي أثرتموه بكتابكم، والسر الذي أبحتموه في قصيدتكم هو موضع عناية كل مسلم فاهم غيور، ولكن الظروف كممت الافواه، وأخرست الالسن، اني معجب جدا بالقصيدة الاردية، وكذا القصيدة العربية التي رددتم بها على الرجل، انها حقا قطعة أدبية رائعة فاقت في وصف المشاعر والاحاسيس، وصدقت في تصوير الواقع المرير الذي يمر به المسلمون، والمرارة تشتد كثيرا اذا رأينا الى ان المسلمين الى القريب كانوا حاكمين في البلاد، والى الآن يبذلون كل الوسع في تعمير هذه الارض التي لم تعرف كلمة التوحيد وأصول العدل والمساواة الا اذا وطئتها اقدام المسلمين

اني نظرت في امر نشر القصيدة وكذلك شاورت اخواني المدرسين في الجامعة فهم جميعا أعجبوا بالقصيدة، وأثنوا على منشئها، ولكنهم لم يشيروا على بنشرها، ولذا اعتذر اليكم الآن وأنتظر الوقت الذي يسمح بنشرها ولعله يكون قريبا.

كان نبأ وفاة القرينة الكريمة وصلني في حينه وتألمت به اشد التالم وعزيتكم في ذلك الوقت، ودعوت الله ولا أزال أدعو لكم بالسلامة والعافية والرخاء والسعادة والعزة والطمأنينة

أما اصابتكم بالنوبة القلبية وعافاكم الله فما عرفت عنها الا بكتابكم هذا، فتمنيت انها لم تقع وما عرفتها! عجل الله لكم الشفاء، وأدام لكم الصحة والعافية ان مثل هذا المرض ينبغي– بل يجب– ان ياخذ له الانسان كل حذر وحيطة، وفي الوقت نفسه ينفي الهموم عن نفسه، ويعيش دائما فرحان جاذلا.

اما زيارتكم لمئو فانها بغية اسرتكم وبغيتنا أيضا:

بلاد بها نيطت على تمائمي   واول ارض مس جلدي ترابها

وحبنا لهذه الزيارة تقوى لانكم تشرفون بهذه المناسبة الجامعة السلفية ايضا، فمرحبا بكم في اى وقت، ساعات كان او اياما او شهورا او مازاد.

ان احوالي التي سالتم عنها طيبة ولله الحمد، بلغت سن التقاعد، ولكن لاأزال أعمل في الجامعة، وأحاول انجاز الاعمال التي تسند الي، وكما تعرفون، ان الاسرة متوزعة، ابن في المملكة العربية السعودية مع اسرته وابن آخر في الجامعة الملية الاسلامية بدهلي، يحضر رسالة الدكتوراه عن الاستاذ الميمني: حياته وآثاره، وفي الوقت نفسه يزاول بعض الاعمال الخاصة بقسم اللغة العربية، وبقية اعضاء الاسرة بخير، وأختكم ايضا بخير، وتهدى اليكم السلام وأطيب التمنيات، ولاتزال تذكر أبويكم وتدعو لهما ولكم جميعا بالخير والسلام

وختاما أتقدم إليكم بالشكر الجزيل على كتابكم، وأقدم اليكم المعذرة على عدم نشر القصيدة في المجلة في الظروف الراهنة وأقدم اليكم والى كل عزيز لديكم اطيب التحيات واخلص التمنيات

والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته

أخوكم: مقتدیٰ حسن الأزهرى

في يناير ٢٠٠٣م

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إلى الأخ الفاضل صاحب الفكر السامي والنثر البليغ والشعر الحكيم

محمد عمران الأعظمي حفظه الله وأكرمه بكل خير وسعادة

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته وبعد:

فقد تشرفت برسالتكم المؤرخة في ٣٠ تموز ٢٠٠٣م، ومن الألقاب التي سبقت اسم هذا العاجز ما لايطابق الواقع، فشكرا على هذا التعبير، رسالتكم تكون "مغذية" لا جائعة، واني مع ما ألاقي في قراء تها أستمتع بها، وأثني عليكم في الغياب، ان الأخطاء المطبعية أراها لازمة لكل كتاب و مؤلف من الكتب والمؤلفات البشرية، وهي في الحقيقة اختبار لذهن القارئ وفكره، واني أهنئكم على الكتابات الثى تنشئونها – بأسلوب واقعي أو فكاهي – عن شخصيتكم وقرينتكم – رحمها الله – وأعمالكم وبلدكم، وهذه الكتابات تنير في الحقيقة الطريق للمشتغلين بالعلم والبحث، وتساهم في تدوين التاريخ الثقافي للمسلمين بالهند.

أنتظر بفارغ الصبر مقالكم الذى كتبتم عن تفسير البقاعي، رحمه الله، فشكرا جزيلا متواصلا على ماتكرمتم به من تلبية طلبي المتواضع، وجزاكم الله تعالىٰ كل خير، أما الأطروحات العشر فلا أبوح بأمرها أمام أحد، ولكني أرجو أن تسجلوا بعض التفاصيل عنها حتى تعد ضمن أعمالكم العلمية، ويكون الناس منها على علم.

سررت جدا بحل مشكلة البنت العزيزة على مايرام، والله تعالىٰ هو المسئول لأن تكون حياتها الزوجية من الآن والى الابد حياة سعيدة ذات رخاء وكرامة ووئام وتآلف: جمع الله بينهما بكل خير.

رسالتكم المشار اليها تضمنت بشرى قدومكم الى مئو والى بنارس، والجامعة السلفية تتشرف باستقبالكم الحار وترحيبكم بكل حفاوة وتكريم، ولكن هذا العاجز سوف يغادر الى دهلي لعدة أيام، فالأسف على حرماني ذلك اللقاء، ولكني على يقين أن الله تعالىٰ يتيح فرصة أخرى للاجتماع.

استفسرت عن روبيات الاشتراك، فأجاب القسم الخاص بالاشتراكات بأن الذى وصل عنده هو مائة وعشر روبيات، وقد سجل اسم المشترك، وبدأ الارسال.

وكذلك حولت موضوع شراء مطبوعات الدائرة بعض التخفيض الى الجهة المختصة بذلك، وهي تتصرف في الامر حسبما ترى.

وكذلك سررت جدا باجادة الابن العزيز محمد فوزان الاعظمي فن الاشتغال بالكمبيوتر، كتب الله له النجاح التام، ورزقه السعادة الدائمة والمهارة المتزايدة.

وحينما تصلون الى الجامعة السلفية في الموعد الذى حددتموه تجدون بعض المدرسين يهيئون لكم الاقامة، ويوفرون لكم ما تريدون ان شاء الله تعالىٰ.

وسلامي إلى أولادكم والأحباب وجميع من تريدون، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

أخوكم:

مقتدىٰ حسن الأزهري

في ١٠/أغسطس ٢٠٠٣م

جمعیۃ اہل حدیث ہند اور اس کی خدمات

ڈاکٹر ازہریؒ کی نظر میں

''یہ جمعیۃ جماعت اہل حدیث کی نمائندہ تنظیم ہے۔ اس نے ملک میں ہر سطح پر عظیم خدمت انجام دی ہے اس سے وابستہ افراد نے معاشرہ کو توحید اور اتباع سنت کے جذبہ سے بہرہ ور کیا۔ بدعات کو مٹا کر سنتوں کو رواج دیا۔ قرآن وحدیث کی اشاعت و تدریس کے لئے موثر نظام قائم کیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میدان جہاد میں شجاعت و جوانمردی کے جوہر دکھائے۔ اس تنظیم نے ملک کے طول وعرض میں انتہائی ناہموار حالات میں اتنی عظیم خدمات انجام دی ہیں کہ اس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جا رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیگر جماعتوں کے انصاف پسند علماء نے ان خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ایک طرف اس تنظیم نے توحید الٰہی واتباع سنت رسول کا جذبہ پیدا کیا اور دوسری طرف اسلام کے خلاف سر اٹھانے والے فتنوں اور باطل تحریکوں کی سرکوبی کی اور اس حقیقی اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا جس پر خیر القرون میں مسلمان عمل پیرا تھے''۔

(افکار عالیہ، مئو)

''جماعت اہل حدیث اور اس کی تنظیم آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس نے اپنی استطاعت کے مطابق مختلف محاذوں پر کام کا آغاز کیا دعوت وتبلیغ کا کام انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر شروع ہوا۔ جماعت کے تبلیغی اجلاس صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اس میں غیر مسلموں کو بھی باقاعدہ اسلام کی دعوت دی جاتی تھی اور اسلامی تعلیم کی اہمیت وفضیلت کو واضح کیا جاتا تھا۔ بحث ومناظرہ کی باقاعدہ مجلسیں آراستہ ہوتی تھیں اور متعین موضوعات پر کئی کئی دن مناظرہ کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تبلیغ ومناظرہ کے میدان میں جماعتی صحافت کا کردار بے حد موثر تھا۔ اخبار ''اہل حدیث'' امرتسر، ''اخبار محمدی'' دہلی اور دوسرے جماعتی اخبارات ہر مسئلہ کا بروقت نوٹس لیتے تھے اور کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی بات قارئین تک پہونچاتے تھے۔ تبلیغ کے ساتھ جماعت نے تصنیف پر بھی پوری توجہ دی۔ قرآن وحدیث کی تعلیمات کو آسان اردو زبان میں پیش کیا اور عقیدہ وعمل کی تفصیلات سے عامۃ الناس کو باخبر کیا۔ تفسیر ابن کثیر اور صحاح ستہ کے اردو ترجمے کئے، بدعات وخرافات کی تردید پر مستقل رسالے اور کتابیں تصنیف کیں۔ اسی طرح اور بھی دوسرے علمی واصلاحی کارنامے انجام دیئے۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ یہ کوششیں اور کارنامے اس دور کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا کر رہے تھے، اور ان کے ذریعہ تربیت واصلاح کا عمل مکمل ہو گیا تھا، لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ ملک کی دوسری مسلم جماعتیں اگر جماعت اہل حدیث کے ساتھ تعاون کرتیں یا توحید وسنت کی اشاعت اور شرک وبدعت کی تردید میں اہل حدیث ہی کی طرح مخلصانہ جدوجہد کرتیں تو ملت اسلامیہ کا موجودہ منظر نامہ دوسرا ہوتا، اور کتاب وسنت کی تعلیم کو سن کر پیشانیاں شکن آلود نہ ہوتیں۔

(خطبۂ استقبالیہ اجلاس عام مئوناتھ بھنجن ۱۹۹۵ء)

''مرکزی جمعیت اہلحدیث ایک صدی سے زیادہ پرانی تنظیم ہے، اور اس کی اپنی ایک تاریخ ہے، اخبار ''اہل حدیث امرتسر'' کے صفحات پر نظر ڈالئے گا تو آپ کو جمعیت کی کارکردگی اور آئندہ کے منصوبوں کے متعلق ایسی باتیں نظر آئیں گی جن سے واضح ہوگا کہ ہمارے بزرگ ملک وملت سے متعلق مسائل کا واضح ادراک رکھتے تھے۔ اور انھیں انسانیت کے مسائل کو حل کرنے کا حوصلہ تھا۔

سب سے پہلا میدان علوم شرعیہ کی تدریس کا ہے، اور دوسرے میدان اسی کے تابع ہیں۔ کیونکہ جب تک علوم کتاب وسنت کا صحیح ادراک نہ ہوگا دین کی خدمت صحیح طور پر انجام نہ پاسکے گی، اللہ کے فضل وکرم سے جماعت کے اندر دینی مدارس معتدبہ تعداد میں موجود ہیں۔

دوسرا میدان دعوت وتبلیغ کا ہے، اس میں بحمد اللہ ہمارے علماء کا خاصا تجربہ ہے، البتہ انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلوں کے اس دور میں معاملہ کوئی نگاہ سے دیکھنا ہوگا تاکہ تبلیغ کا عمل زیادہ موثر ہوسکے۔ مختلف چینلوں سے دیگر مذاہب کے لوگ اور مسلم فرقے اپنے اپنے پروگرام پیش کررہے ہیں، کہیں کہیں ناخوش گوار یا غیر منطقی انداز آجاتا ہے۔ اسلام میں دعوت کا عمل عبادت ہے جس کا مقصود انسانی معاشرہ کی خیر سگالی ہے، لہذا داعیان اسلام کو اپنی حیثیت، زمانے کا مزاج اور انسانیت کی ضرورت سامنے رکھ کر اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

تیسرا میدان تصنیف، تحقیق اور ترجمہ کا ہے، جمعیت نے اس سلسلہ میں اب تک جو کام کیا ہے وہ قابل ستائش ہے، مگر اس میں ماضی کی خدمات کو سامنے لانے کی سعی مشکور زیادہ ہے، تنظیم کے حجم کو دیکھتے ہوئے ہمیں مستقبل پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے۔ تصنیف وتحقیق کا میدان وسیع ہے، ہمیں حالات اور قارئین کا لحاظ کرکے اس کی تکمیل کرنا ہوگی۔ میرے خیال میں تصنیف کا ایک شعبہ اسلام کے مثبت تعارف پر مشتمل ہونا چاہئے اور دوسرا شعبہ دفاع ومناظرہ کا ہو جس میں باطل ادیان وفرق کے خیالات کا جائزہ لیا جائے، لیکن اپنی مرضی کی زبان اور اسلوب نہ استعمال کیا جائے، مخاطب اگر خود ایسا کرے بھی تو صبر وتحمل سے کام لیا جائے، اور استدلال کی قوت سے مخاطب کو قائل کرنا چاہئے، تصنیف کے لئے موضوعات کی کثرت ہے اور قارئین کو متوازن تحریروں کا انتظار ہے، جو لوگ تند وتیز لہجہ میں بات کرتے ہیں وہ اپنے آپ اور مسلک حقہ دونوں پر زیادتی کرتے ہیں۔ مخاطب اگر حق بات کو سمجھتا نہیں، یا اپنے غلط موقف پر اصرار کررہا ہے تو رحم ودرگزر کے قابل ہے، داعی جب تک ایسے مخاطب کا اعتماد حاصل نہ کرے گا، دعوت کے میدان میں کامیابی نہ ہوگی۔

جنگ آزادی اور جماعت اہل حدیث

ہم ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں، ہماری وطن دوستی کا تقاضہ ہے کہ آپس میں بیجا مسابقت کے جذبہ کو فروغ نہ دیں، لیکن چند برسوں سے دیکھا جارہا ہے کہ جنگ آزادی جیسے قومی مسئلہ میں بھی ہمارے اندر تقسیم وافتراق نمایاں ہے، یعنی ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنی ترجمانی نہیں کررہے ہیں، بلکہ کوشش یہ ہے کہ سرفروشی وجانبازی کی تمام داستانوں کو کسی ایک جماعت یا مذہب کے کھاتے میں ڈال دیا جائے، مگر یاد رکھئے ایک انصاف پسند، غیر جانبدار اور بابصیرت مورخ ایسی کسی کوشش کو بنظر استحسان نہ دیکھے گا، بلکہ ہماری انانیت وخودغرضی پر آنسو بہائے گا۔

کتنی خوش گوار بات تھی کہ جنگ آزادی میں نسل ومذہب کی تفریق کے بغیر ہم نے حصہ لیا اور اپنے مقصود عزیز کو حاصل کیا، لیکن یہ صورت حال کتنی الم انگیز ہے کہ آج آزاد ہند کا ایک شہری دوسرے شہری کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہا ہے، اور متہم کرنے کی کوشش کررہا ہے کہ آزادی کی جنگ میں اس کا حصہ نہ تھا، یا وہ کسی اور فریق کے ساتھ تھا۔

ہمارے بزرگوں نے آزادی کی لڑائی میں ریاکاری سے نہیں اخلاص سے حصہ لیا تھا، اس لئے ان کے یہاں شاید ناموں کی فہرست نہ ملے، لیکن ان کی قربانی کی عظمت یہ ہے کہ ملک کی فضا اور اس کے در ودیوار بلکہ ذرہ ذرہ ان کی سرفروشی کی داستان سنا رہا ہے اور سناتا رہے گا، کاغذ کی روشنائی خشک ہوجائیگی، لیکن آزادی کے متوالوں کے خون کی گرمی اور طراوت باقی رہے گی۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء کی اہمیت ہے لیکن جماعت اہلحدیث نے اس میں ۱۸۳۱ء کا بھی اضافہ کیا ہے، بالاکوٹ کے میدان میں جو نفوس قدسیہ سربکف اترے تھے ان کے بارے میں دجالوں کے قلم کچھ بھی لکھیں، لیکن انھوں نے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائی تھی، اور ملک کی سرزمین کو انگریز سامراج کے وجود سے پاک کرنا ان کا اولین مقصد تھا۔

ملک کی آزادی میں جماعت اہل حدیث کی شرکت کے

موضوع پر خامہ فرسائی مجھے تحصیل حاصل جیسا عمل لگتا ہے، جماعت کے مجاہدین برصغیر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے اور اخلاص کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کررہے تھے اور ان کی مہم کیا تھی، نیز انگریز بہادر کا ان کے ساتھ برتاؤ کیا تھا؟ مفاد پرست اہل قلم جو بھی لکھیں لیکن انصاف پسند مصنفین نے اس موضوع پر اتنا مواد فراہم کردیا ہے کہ مزید کچھ نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں، پھر بھی خوشی کی بات ہے کہ بعض ادارے آج بھی اس موضوع پر توجہ دے رہے ہیں، مسلکی اور جماعتی جھکاؤ کے بغیر اس موضوع پر جو کچھ لکھا جائے گا اس کی اہمیت ہوگی، کیونکہ یہ ان اصحاب صدق وصفا کی داستان ہے جو دنیا میں ایک عظیم مقصد کے لئے زندہ رہے، اور پھر جان جان آفریں کے حوالہ کردی۔

دہشت گردی کے بارے میں جماعت کا موقف

زمانہ کے ساتھ موضوعات بھی بدلتے رہتے ہیں اور بعض موضوعات پر گفتگو کبھی کبھی فیشن بن جاتا ہے اور الفاظ واصطلاحات میں حد درجہ خلط ملط ہوجاتا ہے۔ آج کے دور میں دہشت گردی کا موضوع کچھ اسی طرح کا ہے۔ جن لوگوں کی اصل شناخت ظلم وجارحیت، فتنہ وفساد، قتل وغصب اور استحصال وموقع پرستی سے ہوتی ہے، وہی انسداد دہشت گردی کے میدان کے چمپین بنے ہوئے ہیں اور زمانہ کو باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہی امن وآشتی کے علمبردار ہیں۔

کسی دین کو سمجھنے کے لئے سب سے معتبر ذریعہ اس کی اپنی کتاب اور اپنا دستور ہے، ماننے والوں کے کردار کا درجہ بعد میں آتا ہے۔

انفرادی خدمات

ہندوستان ایک وسیع وعریض ملک ہے اور اس کے اکثر حصوں میں جماعت اہل حدیث کے افراد موجود ہیں، اور ان کی تعداد بھی کئی کروڑ ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مسلم آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کوئی ایک تنظیم یا ادارہ سب کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا، اسی صورت حال کے پیش نظر جماعت کے افراد نے ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی یا تصنیفی ادارے قائم کئے ہیں، ان میں سے اکثر کا حال اچھا ہے"۔

"جماعت اہلحدیث دہلی

دار الحکومت دہلی کی مرکزی حیثیت اور اہمیت کو جماعت اہلحدیث نے بھی محسوس کیا اور ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ ساتھ یہاں بھی اپنی مذہبی سرگرمی جاری رکھی۔ ۱۹۰۶ء میں "آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس" کے قیام کے بعد سے تاہنوز یہی سرگرمیوں کا مرکز رہی، تنظیم کا موجودہ نام "مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند" ہے۔

مختلف اوقات میں اس تنظیم کو بھی نشیب وفراز کا سامنا رہا افراد کی طرح تنظیموں کی زندگی بھی نقص وکوتاہی سے خالی نہیں ہوتی۔ لیکن عقائد اعمال کی اصلاح میں اس تنظیم کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دل میں وسعت اور نظر میں گہرائی ہو تو اسی شہر میں ایسے شواہد مل جائیں گے جن سے جماعت کی تاریخ میں تابندگی پیدا ہے۔

آزادی سے پہلے کی اسلامی درسگاہوں میں شیخ الکل مولانا سید نذیر حسینؒ کی درسگاہ، اور مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ کا نام لینا کافی ہے۔ ان درسگاہوں نے قرآن وحدیث کی تدریس کا جو معیار قائم کیا، توحید واتباع سنت کی اشاعت میں جس اخلاص کا مظاہرہ کیا اور شرک وبدعت کے استیصال میں جو ثبات قدمی دکھائی اس کی مثال مشکل ہے۔ آج بھی اس شہر میں متعدد اہلحدیث ادارے تعلیم وتربیت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان "ستاروں" کو اکٹھا کردیا جائے تو یہ "ماہ مبین" بن سکتے ہیں۔

تدریس کے علاوہ یہاں دعوتی سرگرمی بھی جاری رہی، اور خاندان ولی اللہی نے دعوت کے میدان میں جو شمع روشن کی تھی اس کی لو کو جماعت کے علماء اونچی کرتے رہے۔

تصنیف وصحافت کے میدان میں بھی جماعت کے علماء نے شہر دہلی کا حق ادا کیا، اور ایسے شاہکار پیش کئے جن پر علمی دنیا کو فخر ہے۔ تنہا مولانا عبد السلام بستوی رحمہ اللہ کی تصانیف، مولانا محمد جوناگڈھی رحمہ اللہ کی تصانیف اور ان کا "اخبار محمدی" نیز "اہلحدیث گزٹ" اور "محدث" دہلی نے جو نقوش ثبت کئے ہیں وہ ہمیشہ درخشاں رہیں گے۔

(خطبۂ استقبالیہ ۲۹ ویں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس، نئی دہلی)



سردار شفیق
مئوناتھ بھنجن

متاعِ گراں مایہ

حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ کی وفات پر

فغاں کہ اک گل سرسبد تازہ تر نہ رہا
تھی جس سے زینتِ گلشن وہ خوش نظر نہ رہا

جلی قلم سے لکھا تھا جسے مشیت نے
جبینِ لوح پہ وہ حرف معتبر نہ رہا

دیارِ ہند و عرب میں بھی جس سے تابانی
کہاں سے ڈھونڈھ کے لائیں کہ وہ گہر نہ رہا

اسی پہ سجتی تھی دستار علم و دانش کی
ہمارے سامنے کوئی بلند سر نہ رہا

کتاب و سنتِ نبوی تھیں حرز جاں کی طرح
جہانِ شعر و ادب سے بھی بے خبر نہ رہا

برس کے کام دنوں سمیٹ لیتا تھا
وہ راہِ شوق کا راہیِ تیز تر نہ رہا

شعورِ نکتہ رسی جس کا، آگہی کی دلیل
وہ منتظم، وہ معلم، وہ دیدہ ور نہ رہا

اک ایک لمحے کو سونے سے تولنے والا
خود اپنے کام سے فارغ وہ عمر بھر نہ رہا

ہزاروں صفحوں پہ بکھرے ہیں اس کے شہ پارے
مگر وہ صاحبِ گنجینۂ ہنر نہ رہا

بڑے سکوں سے رہے اس کی نرم چھاؤں میں ہم
چمن ہے نوحہ کناں، وہ گھنا شجر نہ رہا

مئو کا لختِ جگر ، نورِ چشم سلفیہ
وہ زخم خوردہ جماعت کا چارہ گر نہ رہا

طبیعت اس نے وہ باغ و بہار پائی تھی
کدورتوں کا کوئی داغ ، قلب پر نہ رہا

ہلا کے رکھ دیا اس حادثے نے لوگوں کو
کسی کو ہوش و حواسِ شب و سحر نہ رہا

اداسیوں کی سیاہی میں گھر گیا ہے چمن
وہ پہلے جیسا چمکدار بام و در نہ رہا

تو اپنے فضل و کرم کا دریچہ وا کردے
الٰہی! اس کو بہشتِ بریں عطا کردے

☆☆☆

غنی احمد غنی
مئوناتھ بھنجن

نقیب آگہی

علامہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہریؒ

تو نقیبِ آگہی مشہور تھا
جہل کی تاریکیوں سے دور تھا
تیرا سینہ علم سے معمور تھا

جذبۂ اظہار اس منزل میں تھا
لب پہ رہتا تھا وہی جو دل میں تھا
رونقِ محفل تو ہر محفل میں تھا

سر بکف رزمِ حق باطل میں تھا
حق کا وہ احساس تیرے دل میں تھا

حلقۂ یاراں ترا دیوانہ تھا
ہو عداوت غیر سے ایسا نہ تھا

تھا تو اک دیوانۂ احیائے دیں
پڑھ کے شرح رحمۃ للعالمین
معترف تیری عرب کی سرزمیں

محفلِ غم ہو کہ ہو بزمِ طرب
دیدنی تھا تیرا اندازِ ادب
تیرا ہر طرزِ عمل تھا منتخب

جلوہ گاہ نور تھا سینہ ترا
ہر عمل تھا مثلِ آئینہ ترا

گفتگو کا تیری وہ انداز تھا
تجھ پہ تیرے دوستوں کو ناز تھا

تھا مکمل پیکرِ دین و ادب
تذکرہ ترا نہ تھا کچھ بے سبب
معصیت گاہِ عجم سے تا عرب

ایک جادو تھا تیری تقریر میں
ہر بیاں ڈوبا ہوا تاثیر میں
تھی وہ رعنائی تری تحریر میں

عجز میں ترا کوئی ثانی نہ تھا
تجھ کو سودائے ہمہ دانی نہ تھا

تجھ کو افکارِ سلف سے پیار تھا
تو سراسر خوبیٔ کردار تھا

● ــــــــ عتیق اثرؔ

سریر آرائے بزمِ حرف

اِک فرد وہ جو مجمعِ افراد تھا گیا ۞ اک شہرِ علم وفن کی جو بنیاد تھا ،گیا
شمعِ ادب نما سریر آرائے بزمِ حرف ۞ شریں صفاتِ علم کا فرہاد تھا ،گیا
نقاش تھا ہنر کا وہ خود اپنی ہی مثال ۞ یا کہیے فن کا مانیؔ و بہزادؔ تھا ،گیا
وہ سرو قد بہ آں ہمہ کوتاہ قامتاں ۞ تنہا کھڑا بہ صورتِ شمشاد تھا، گیا
آوازِ اہلِ حق رہا با صوتِ جامعہ ۞ شہ زور تھا قلم کا وہ شہزاد تھا، گیا
مردِ عجم تھا اہلِ عرب کا مزاج داں ۞ نکتہ شناسِ اعشیٰؔ وعبادؔ تھا ، گیا
خودساختہ قیود میں کچھ لوگ رہ گئے ۞ وہ اپنی فکر و نطق میں آزاد تھا ، گیا
یوں اس کی اقتدا سے تھے خوش حال مقتدی ۞ پر مقتدیٰ بھی شاد کہ ناشاد تھا ، گیا
چھائی فضاؔئے [1] شہر پہ حیراں سی خامشی ۞ کاشانۂ مجازؔ [2] جو آباد تھا ، گیا

پابستگیٔ گیسوئے فن چاہیئے اثرؔ
ناموسِ علم و فکر کا ہمزاد تھا ، گیا



[1] فضا ابن فیضی [2] مجازؔ اعظمی۔ ماضی قریب کے سلسلۂ انتقال کی اہم ترین شخصیتیں ہیں۔

عکس حیات
ڈاکٹر حافظ مولانا مقتدیٰ حسن ازہریؒ

- نام: مقتدیٰ حسن ● والد کا نام: محمد یسین ● والدہ کا نام: بلقیس خاتون
- تاریخ پیدائش: ۸/اگست ۱۹۳۹ء مطابق ۱۳۵۸ھ
- جائے پیدائش: محلہ ڈومن پورہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی
- تعلیم: پرائمری درجات منشی اور عربی کے چار درجات (ثانویہ ۱۹۵۷ء) جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن۔
- حفظ قرآن کریم: ابتداء جامعہ عالیہ میں اور تکمیل شاخ دار العلوم مرزا ہادی پورہ۔
- دو تین سال عربی کی تعلیم (عالمیت) جامعہ اسلامیہ فیض عام، مئو
- فضیلت وفراغت: جامعہ اثریہ دار الحدیث، مئوناتھ بھنجن ۱۹۶۱ء-۱۳۸۰ھ
- امتحانات عربی وفارسی بورڈ الٰہ آباد:

مولوی (معقولات):	۱۹۵۹ء	فرسٹ ڈویژن
عالم:	۱۹۶۰ء	فرسٹ ڈویژن
فاضل (دینیات):	۱۹۶۲ء	سکنڈ ڈویژن

- تدریسی خدمات: ● مدرسہ اسلامیہ بھوارہ بہار۔ ● جامعہ اسلامیہ فیض عام، مئو
- علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ (شعبہ عربی) ایک سال ● جامعہ سلفیہ بنارس ۱۹۶۸ء تا ۲۰۰۹ء
- روانگی مصر: ۱۹۶۳ء اصول الدین فیکلٹی سے ماجستر (ایم اے)
- قاہرہ ریڈیو کے شعبۂ اردو میں مترجم Translator اور اناؤنسر ۲ سال
- ہندوستان واپسی ۱۹۶۷ء میں
- علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۲ء میں ایم فل۔ ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی
- علی گڈھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۷۱ء میں ہائی اسکول اور ۱۹۷۳ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔
- ۱۹۶۸ء ادارۃ البحوث الاسلامیۃ قائم ہوا اور آپ اس کے مدیر بنائے گئے اور ۲۰۰۶ء تک اس عہدے پر رہے۔
- المجمع العلمی الھندی کے اصل روح رواں بھی رہے جو ڈاکٹر مختار الدین آرزو کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اور جامعہ سلفیہ کے پریس میں چھپتا تھا۔
- ۱۹۶۹ء سے تاحیات صوت الجامعۃ۔ مجلۃ الجامعۃ السلفیۃ۔ نشرۃ الجامعہ۔ صوت الامۃ کے ایڈیٹر۔
- ۱۹۷۷ء یا ۱۹۷۸ء میں پہلی بار حج کیا۔ اس کے بعد متعدد بار حج وعمرہ کیا۔

- ۱۹۷۸ء میں جامعہ سلفیہ بنارس کے ریکٹر منتخب ہوئے اور ۲۰۰۶ تک اس عہدہ پر رہے۔
- ۱۹۹۲ء عربی زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ۔
- ۲۰۰۲ء میں پریوائی ایوارڈ
- ہندوستانی اساتذہ:

قاری خلیل الرحمٰن۔ مولانا ابوالقاسم محمد علی قدسی۔ مولانا عبدالعلی۔ مفتی عبدالعزیز عمری۔ ابوعبیدہ عبدالمعید بنارسی۔ مولانا عبدالرحمٰن نحوی۔ مولانا محمد احمد ناظم جامعہ فیض عام۔ مولانا عظیم اللہ صاحب مئوی۔ مولانا عبداللہ شائق مئوی۔ مولانا حبیب الرحمٰن فیضی۔ مولانا محمد سلیمان رحمانی۔ مولانا شمس الحق سلفی۔ مولانا عبدالرحمٰن بن شیخ الحدیث عبیداللہ مبارکپوری۔ مولانا محمد الاعظمی۔ پروفیسر مختارالدین آرزو۔

- مصری اساتذہ: شیخ محمد غزالی۔ شیخ فتح اللہ بدران۔ ڈاکٹر محمد غلاب۔ ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی۔ ڈاکٹر شوقی ضیف۔ ڈاکٹر غنیمی ہلال۔ ڈاکٹر رزق۔ انور الجندی
- اردو مقالات ومضامین کی تعداد: ۲۷۵
- عربی مقالات ومضامین کی تعداد: ۳۶۰
- تصنیفات وتراجم تحقیق وتعلیق۔ تہذیب واختصار کی تعداد: ۵۵
- کتابوں پر لکھے گئے مقدمات وتقریظات کی تعداد: ۲۱۹
- طلبہ کے میگزینوں کی تعداد جن کے لئے پیغامات لکھے: ۱۹
- مجلہ افکار عالیہ میں شائع شدہ تحریروں کی تعداد: ۱۹
- جن مجلات ورسائل میں آپ کے مقالات (اردو عربی) شائع ہوئے۔ محدث۔ صوت الجامعہ اردو۔ اہل حدیث۔ ترجمان۔ افکار عالیہ۔ المنار۔ راشٹریہ سہارا۔ برہان۔ معارف۔ دعوت۔ نور توحید۔ السراج۔ الاعتصام لاہور۔ علی گڈھ میگزین۔ نقوش منظر۔ الفرقان ڈومریا گنج۔ صوت الجامعہ۔ مجلة الجامعة۔ نشرة الجامعة۔ صوت الامة۔ مجلة المنار۔ المجمع العلمی الهندی۔ تقویة الایمان۔
- مناصب۔ رکن: علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔ مسلم پرسنل لابورڈ۔ مجلس شوریٰ مجلس عاملہ مرکزی جمعیة اہل حدیث ہند۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ۔ دینی تعلیمی کونسل۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی۔ جمعیة المثقفین للتوعیة الاسلامیة۔ تعلیمی کمیٹی جامعہ محمدیہ مالیگاؤں۔ ادارہ اصلاح المساجد۔ مجلہ افکار عالیہ۔
- مدیر: صوت الامة وادارة البحوث الاسلامیہ جامعہ سلفیہ۔ ● وکیل جامعہ سلفیہ بنارس۔ ● صدر جامعہ سلفیہ بنارس۔
- اسفار: سعودی عرب۔ کویت۔ متحدہ عرب امارات۔ قطر۔ بحرین۔ نیپال۔ مصر۔ انڈونیشیا۔ پاکستان۔ امریکہ۔ برطانیہ۔
- وفات: ۳۰؍اکتوبر ۲۰۰۹ء مطابق ۱۰؍ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ بروز جمعہ بوقت ۵ بج کر ۱۵ منٹ
- تدفین: قبرستان ڈومن پورہ۔ بعد نماز مغرب

Quaterly Majallah **AFKAR-E-ALIA** MAU

منہج سلف صالحین کے فروغ کے لئے کوشاں



IDARA TAHQEEQAT-W-NASHRIYAT-E-ISLAMI
JAMIA ALIA ARABIA
MAUNATH BHANJAN, MAU - 275101 (U.P.) INDIA

PRINT MEDIA, MAU - 9889711005